رجسٹرڈ نمبر پی ۲۹۴

صوبہ بہار میں علم ادب، تعلیم اور زبان کا ترجمان

جنوری فروری سنہ ۱۹۴۰ء

ندیم

مرتبہ

سید ریاست علی ندوی

"ندیم" کے بہار نمبر ۱۹۴۰ء کی ایک جھلک

دکھا رہا ہوں مضامین نو کا پھر انبار خبر کرو میرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

بلند پایہ مقالات

عنوان	مضمون نگار
۱. مولانا شبلی اردو شاعر کے لباس میں	حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ
۲ بہار کی بہار	ادیب شہیر حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر صدق لکھنؤ
۳ سپاہی کی بیٹی	ادیب جلیل ڈپٹی سید وصی احمد بلگرامی
۴ بہار اور اردو	حضرت حمید عظیم آبادی
۵ فاتح بہار بختیار خلجی	پروفیسر مولانا سید ابو ظفر ندوی
۶ فاتح پلاموں نواب داؤد خاں	جناب سید رضا قاسم صاحب مختار پلاموں
۷ صوبہ بہار کا آخری ہندوستانی گورنر کلیان سنگھ	جناب پروفیسر سید حسن عسکری ایم۔ اے
۸ صوبہ بہار کا ایک اجمالی مرقع	جناب سید شاہ قاسم علی صاحب رئیس گیا
۹ غدر ۱۸۵۷ء میں گیا کے سیاسی حالات	جناب خواجہ جلال الدین صاحب وکیل
۱۰ مولانا سید عبدالغنی وارثی	مولانا سید مناظر احسن گیلانی صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ
۱۱ ایک عظیم آبادی شاعر جس پر اکبر آباد نے قبضہ کر لیا	جناب ایم۔ اے حمید تاج محلی
۱۲ عصر حاضر میں بہار کے شعراء	جناب بہزاد فاطمی بی۔ اے
۱۳ فردوسی و دقیقی	پروفیسر طاہر رضوی ایم۔ اے
۱۴ اقبال کی شاعری (مرتبہ جناب عبدالمالک آروی)	حضرت "ذبو" جانس بہاری
۱۵ کیا موجودہ پیران ہند کا "تصوف" اسلامی ہے؟	پروفیسر مولانا سید مظفر الدین ندوی ایم۔ اے
۱۶ نو خیز عراق اور اس کا پہلا بحری بیڑا	مولانا مسعود عالم ندوی کیٹلاگر اورینٹل لائبریری پٹنہ
۱۷ تاریخ صقلیہ پر ایک نظر	جناب ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی
۱۸ گوتم بدھ کے قتل جنوبی بہار	جناب سید اظہر الحق قادری
۱۹ میتھلی زبان کے چند گمنام شعراء	جناب جی آر قیس شیخپوروی
۲۰ پورنیہ میں علم و ادب کا چرچا	جناب محمد سلیمان صاحب بی۔ اے وکیل
۲۱ صوبہ بہار کا ایک بہادر باغی	جناب خواجہ عبدالقیوم صاحب
۲۲ سرمایہ داری	جناب محمد مظفر حسن صاحب ایڈوکیٹ
۲۳ مصر کی موجودہ سیاسی تشکیل	جناب منصور کاکوی
۲۴ عالم علی عظیم آبادی	مولوی مختار الدین صاحب آرزو
۲۵ صوبہ بہار کی ایک ممتاز فاضلہ	مولانا سید محمد تقی صاحب اشرف المتعمی
۲۶ خضر بانو	جناب عبدالوکیل صاحب عزیزی

منیجر

ندیم کے بہار نمبر ۱۹۴۰ء کے چند دیگر ابواب

آثار عتیقہ

۱۔ [illegible] کی سرگذشت اور اسکے چند آثار — مولانا حافظ سید عبدالرؤف صاحب ندوی
۲۔ روضہ سلطان فریدالدین شیر شاہ — جناب سید محمد صابر صاحب قمر قادری
۳۔ مسجد شیر شاہی مغل پورہ پٹنہ سٹی۔

آثار علمیہ ادبیہ

۱۔ نقش سلیمانی، یعنی مکتوب علامہ سید سلیمان ندوی از لندن، بنام مولانا عبدالماجد
۲۔ چند مشاہیر کے مکاتیب بنام حسن واروی
۳۔ مکاتیب اقبال بنام مسعود عالم ندوی۔ (۴) مکتوب اجمل (مسیح الملک مرحوم) بنام سید ریاست علی ندوی
۵۔ ایک نوجوان جوانمرگ ادیب کے چند نقوش۔ یعنی مکاتیب نورالہدیٰ بنام سید ریاست علی ندوی۔
۶۔ منشی سجاد حسین مرحوم، ایک بہاری نوادر لکھنؤ کی نظر میں۔ مکتوب منشی سید خلیل احمد صاحب ... بنام ... مرحوم
۷۔ مکتوب خیال بنام حضرت امداد عظیم آبادی۔ (۸) مکتوب انور علی یاس بنام رائے ارام کشن داس

دور حاضر میں صوبہ بہار کے مشاہیر

عنوان بالا سے دور حاضر کے ممتاز اکابر بہار کے مختصر سوانح حیات

افسانے

حسب ذیل افسانے بہار نمبر کے لئے موصول ہوئے ہیں

۱۔ فرض کی قربانگاہ پر۔ حضرت جمیل مظہری۔ (اسکی ایک جھلک پچھلے بہار نمبر میں دکھائی گئی تھی اس نمبر میں وہ اپنے انجام کو پہنچا)
۲۔ بھرنہیں کہ رسیدیم" الیاس اسلام پوری
۳۔ عورت اور شدت" پروفیسر مسلم
۴۔ بھوک۔ حضرت سہیل عظیم آبادی
۵۔ شادی۔ جناب سید آفتاب حسن ام۔ایس۔سی علیگ
۶۔ وطن کی قربانی۔ جناب جی۔ آر قیس شیخپوری
۷۔ سوز ناتمام۔ جناب رحمت علی تعابر
۸۔ مکافات عمل جناب محزون عبدالکریم آزاد
۹۔ امتحان۔ جناب وحشی آروی
۱۰۔ خودکشی۔ جناب ملک فضل امام شیدا
۱۱۔ تاریک گناہ۔ جناب ملک مظفرالدین حشر
۱۲ محبت والوں کی نئی دنیا۔ جناب عبدالقیوم
۱۳۔ دماغ کی شکست۔ جناب شبلی ابراہیمی

۱۲۔ آئینہ ۔ جناب مجتبیٰ احمد ۔
۱۳۔ سراب ۔ جناب سید محمد حسین عالم ۔
۱۵۔ ڈاکہ ۔ جناب سید شاہ محمد ایوب
۱۶۔ کہاں سے کہاں تک ۔ جناب سید عبدالرافع

تصویر جذبات

۱۔ خطاب بہ جواں مرگ دوست ۔
۲۔ ترک محبت ۔ جناب سید نسیم الدین احمد صاحب
۳۔ پریم نیند ۔ جناب محمد شریف عالم صاحب

منظومات و غزلیات

۴۔ بادۂ عرفان ۔ حضرت عرفان اسلام پوری
۵۔ آزادی پسند خاتون سے ۔ جناب حکیم ظفر پھلواروی
۶۔ صبح کا ستارہ ۔ جناب محمد عبدالغنی شمس ۔
۷۔ اعتبار محبت ۔ جناب ذکی اورنگ آبادی
۸۔ کلام صبر ۔ جناب سید بدرالدین احمد صبر رضوی
۹۔ سلطان المجاہدین ۔ حضرت نوح ناروی
۱۰۔ بادۂ میکش ۔ حضرت میکش عظیم آبادی ۔
۱۱۔ کیف سحرگاہی ۔ جناب نصیرہ راز ۔
۱۲۔ ماضی ۔ جناب نسیم سوز ۔
۱۳۔ چاند سے ' جناب تبسم کاکوی ۔
۱۴۔ یہ دنیا ۔ جناب اختر قادری ایم ۔ اے
۱۵۔ گنگا کے گھاٹ پر کسی کی یاد ۔ جناب قیصر عثمانی
۱۶۔ قطعہ تاریخ بہار نمبر ۱۳۵۸ء

۱۔ جذبات مبارک ۔ حضرت مبارک عظیم آبادی
۲۔ میری شاعری اور سامعین ۔ حضرت رضی عظیم آبادی
۳۔ عالم بر افسانہا و اردو ما ہیچ ۔ خان بہادر نواب ڈپٹی سید احمد علی خاں صاحب رئیس عظیم آباد ۔

حضرت آزاد عظیم آبادی ۔ حضرت شفق عمادی ۔ حضرت تمنا وحضرت سر سر کاری ۔ حضرت حمید عظیم آبادی ۔ حضرت عابد نقوی ۔ اور جناب کشتہ وغیرہ کے منظومات عنقریب دفتر میں آنے والے ہیں ۔

تصاویر

جن مضمون نگاروں ' افسانہ نویسوں اور شعرائے کرام کے اسماء آپ نے اوپر دیکھے اور نیز آئندہ جن کے مضامین آنے والے ہیں ان میں سے بیشتر کی تصویریں دفتر میں آگئی ہیں ۔ ان شاء اللہ ان کے بلاک بنا ۔ ہوکر وہ تصویریں شائع کی جائیں گی ۔

موعودہ مضامین

ذیل میں چند اسمائے گرامی ہیں جنھوں نے اپنے مضامین عنایت کرنے کے وعدے فرمائے ہیں اور امروز فردا میں ان کے مضامین آنے والے ہیں

۱۔ جناب سر خواجہ محمد نور صاحب (سابق جج پٹنہ ہائیکورٹ) چیرمین پبلک سروس کمیشن ۔
۲۔ جناب قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر پٹنہ ۔ (۳) جناب رازق الخیری مدیر عصمت دہلی ۔
(۴) جناب ڈپٹی سید ولی الرحمٰن صاحب ولی ایم ۔ اے (۵) مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی (۶) جناب سید حسن امام وارثی رئیس گیا ۔

ان سطروں کی کتابت کے بعد ذیل کے چند موعودہ مضامین اور افسانے بھی آ گئے " ہر بونگ کانفرنس " (حضرت ...) " تلاش " (کامریڈ انیس الرحمٰن) ، ... (رضا اردوی) " کامریڈ ... " (خواجہ عنایت اللہ) " جنات " (کامریڈ خیر النساء بیگم) " دل اور عقل " (حضرت سر سر کاری) " تیر سے تیز " (جوہر فریدی) " نیرنگ شباب " (اشرف اصدقی) " حضرت صوفی ... کی تاریخ گوئی کا ایک شاہکار " (جناب ... ابدالی) " گنگا کی سیر عظیم آباد کے ایک گھاٹ سے "
[illegible]

بہار نمبر

کا مرقع آپ نے دیکھ لیا

اس کی قیمت ۱۲؍ ہو گی ، اگر آپ "ندیم" کی خریداری قبول کر لیں تو اسی زر چندہ میں یہ نمبر بھی آپ کو دیا جائے گا - خریداری منظور ہو تو چار روپے بذریعہ منی آرڈر روانہ کریں -

منیجر "ندیم" گیا

بہار نمبر کے متعلق ایک ضروری اطلاع

ندیم کے پرچے ہر ماہ ڈاکخانہ سے پچیسوں کی تعداد میں ضایع ہوتے ہیں - پوسٹل سارٹیفکٹ لیکر بھیجنے کے باوجود مرسل الیہ تک نہیں پہنچتے - اور ہر مہینہ بہ کثرت پرچے دوبارہ اور کبھی سہ بارہ بھیجنے پڑتے ہیں - بہر حال یہ بھی ندیم کی عام مقبولیت کی ایک نشانی ہے - لیکن

جب عام پرچوں کا یہ حال ہے تو بہار نمبر کا ضایع ہونا کھلی ہوئی بات ہے - اسلئے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ جس طرح پچھلی مرتبہ بہار نمبر سنہ ۳۶ء خریداروں کی خاطر رجسٹرڈ بھیجے گئے تھے ، اس مرتبہ بھی رجسٹرڈ بھیجے جائیں گے - محصول ڈاک کے اخراجات خریداروں سے لے لئے جائیں گے -

اسلئے مناسب ہے کہ خریدار کی طرف سے ۵ ؍ کے ٹکٹ دفتر میں بھیجے جائیں ، ورنہ اسی قدر رقم بذریعہ وی - پی وصول کر لیجائے گی -

پچھلی مرتبہ یہی طریقہ اختیار کیا گیا تھا اور اس مرتبہ بھی یہی صورت مناسب معلوم ہوئی - اطلاعاً عرض کر دیا گیا -

منیجر "ندیم" گیا

مت سالانہ للعہ — رسالہ "ندیم" گیا — ششماہی ۱۲عہ

یمت فی پرچہ ۶ ر

رسالہ "ندیم" گیا

مرتبہ: سید ریاست علی ندوی

جلد ۱۳ || ماہ ذی الحجہ سنہ ۱۳۵۶ھ و محرم الحرام سنہ ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ جنوری و فروری سنہ ۱۹۳۸ء || نمبر ۱ و ۲

	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
ظرات		سید ریاست علی ندوی	۲ - ۴
فسانہ ومحاضرات	"نان وائیلنس"	حضرت مانپوری	۵ - ۱۸
	بشپ	جناب شفاعت محمود	۱۹ - ۲۱
	عجیب انسان	جناب محمد احسن صاحب پھلوی پوری	۲۲ - ۲۸
	ڈھول کا پول	جناب خواجہ عنایت اللہ صاحب	۲۹ - ۳۴
	جمنا	جناب سید نیر حیدر صاحب رضوی	۳۵ - ۳۸
	ملاپ	جناب نسیم اختر بنت سید فرید الدین صاحب	۳۹ - ۴۱
ظومات	نذر تہنیت بخدمت عزیز ملت	حضرت مبارک عظیم آبادی	۴۲
	آدمی	جناب احمد مصطفی صاحب مجنون بازید پوری	۴۳
	چاندنی رات	جناب محسن اعظم گڑھی	۴۴
مالات	عرب انشا پرداز اور ان کی انشا پردازی	سید ریاست علی ندوی	۴۵ - ۴۸
	علامہ شیخ محمد اقبال مرحوم	جناب سید رضا قاسم صاحب مختار	۴۹ - ۵۲
ند وبحث	پطرس اور چغتائی	جناب ج - الف - عظیم آبادی	۵۳ - ۵۸
سلہ ومناظرہ	تصحیح حضرت تمنا کی توضیح	حضرت حمید عظیم آبادی	۵۹ - ۶۳
تباسات	پیامات		۶۴ - ۶۸
زلیات	تبرکات آزاد	حضرت علامہ فضل حق آزاد	۶۹
	جذبات مبارک	حضرت مبارک عظیم آبادی	۷۰
	تجلیات قیس	جناب جی - آر - قیس شیخپوروی	۷۱
	لمعات سوز ناروی	جناب سوز ناروی	۷۲
	تیری یاد	جناب نجم کاکوی	۷۳
	فلسفہ ہستی	جناب بسمل الہ آبادی	"
احیات	مزاحیات بیخود	مولوی سید ناظر امام صاحب بیخود ندوی	۷۴
ظ وانتقاد	اردو رسالوں کے چند سالنامے	" "	۷۵ - ۷۸
مطبوعات		"	۷۹ - ۸۰

باہتمام سید ریاست علی ندوی ایڈیٹر و پرنٹر و پبلشر ندیم پریس [illegible] شائع ہوا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

ہمارے صوبہ کے عظیم المرتبت اہل علم شاعر ڈاکٹر عظیم الدین صاحب عظیم (ایم۔اے۔ پی۔ایچ ڈی لندن سابق صدر شعبہ مشرقیات پٹنہ یونیورسٹی) کا مجموعہ کلام "گل نغمہ" کے نام سے شایع ہوا ہے۔ جناب ڈاکٹر صاحب موصوف ایک ذی علم خانوادہ کے چشم و چراغ ہیں، علوم مشرقیہ میں دستگاہ انہیں خاندانی وراثت میں حاصل ہوئی ہے۔ ان کا ابتدائی زمانہ تعلیمی فراغت کے بعد اورنٹل کالج لاہور میں گذرا، وہ ڈاکٹر سر اقبال کے ہم جلیس تھے۔ فلسفیانہ و متکلمانہ مذاق کے اتحاد نے دونوں کو شیر و شکر کر دیا تھا، اور دونوں اپنی شاعرانہ استعداد و قوتِ فکر میں ایک دوسرے کے قریب اور ایک دوسرے کے قدرداں تھے، مگر اس وقت تک یہ اُردو ادب کی بدنصیبی تھی کہ ان کے کلام کا کوئی مجموعہ شایع نہ ہو سکا تھا۔ ہم پروفیسر کلیم الدین (پٹنہ یونیورسٹی) کے شکر گذار ہیں کہ انہوں نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور ان کے کلام کو مرتب کر کے اس کا مجموعہ غیر معمولی اہتمام سے شایع کرایا۔ شروع میں مرتب نے اپنے مقدمہ میں اُردو شاعری کے دورِ تغزل پر مشہور عام اعتراضات کر کے ڈاکٹر عظیم کی شاعری کے امتیازی خصوصیات دکھلائے ہیں، ضرورت تھی کہ چند صفحوں میں شاعر کے سوانح حیات بھی قلمبند کر دیئے جاتے۔ اخیر میں چند صفحوں میں نظموں پر تعلیقات درج ہیں۔ کتاب مختلف قسم کے کاغذوں پر اہتمام سے چھاپی گئی ہے۔ مصنف کی زندگی کے مختلف دوروں کے چند فوٹو اور عکس تحریر سے کتاب کی زینت بڑھائی گئی ہے۔ امید ہے کہ یہ مجموعہ اہل ذوق میں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس دسمبر کی آخری تاریخوں میں کلکتہ میں منعقد ہوا۔ نواب کمال یار جنگ بہادر اجلاس کے صدر نشین تھے، اور آنریبل ابوالقاسم فضل الحق وزیر بنگال نے مجلس استقبالیہ کی صدارت کے فرایض انجام دئے۔ نواب کمال یار جنگ بہادر کے خطبہ صدارت میں ہندوستان میں مسلمانوں کے جداگانہ نظام تعلیم کے تیار کرنے کی تجویز اختصار و جامعیت سے پیش کی گئی ہے، اور دکھایا گیا ہے کہ وہ ایسا نظام ہو جس میں اسلامی تہذیب کی امتیازی خصوصیات کا تحفظ ہو، اور اسلامی نظام اجتماعی کا استحکام ہو سکے۔ اس ضرورت کے لئے موصوف نے ایک کمیٹی کے قایم کرنے کی تجویز پیش کی تھی، جو منتخب کر لی گئی ہے اور سُنا ہے کہ اس نے فوری طور پر عملی کام بھی انجام دینا شروع کر دیا ہے، ہم اس کمیٹی کے خدمات کے معلوم کرنے کے منتظر رہیں گے۔

آنریبل فضل الحق صاحب کا خطبہ صدارت اسلامی ہند کی تعلیمی زندگی پر ایک جامع تبصرہ ہے۔ جدید ہندوستان میں اسلامی نظام تعلیم اور تعلیمی تحریکات پر نظر ڈال کر دورِ حاضر میں مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کو دکھایا گیا ہے، اس خطبہ کے فاضلانہ مباحث ہماری بڑی توجہ کے مستحق ہیں —— آنریبل موصوف کے خطبہ میں ایک انکشاف کو ہم نے بڑی حیرت سے پڑھا۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ ہم نے کسی پچھلی اشاعت میں آنریبل موصوف کو اُردو زبان کے متعلق ان کے پٹنہ کی صدارتی تقریر کے حوالہ سے بنگال کے مدارس میں اُردو کی کس مپرسی پر توجہ دلائی تھی، ہمیں اس خطبہ میں اس کا جواب نظر آیا، اور یہ ہم نے حیرت سے دیکھا کہ بنگال کا یہ وزیر اعظم اُردو کو بنگال کے مدارس میں رایج کرنے میں اس وقت تک بالکل بے بس رہا ہے۔ لیکن یہ خوشی کی بات ہے کہ وہ اپنی اس بے بسی کو دُور کرنے کا عزم راسخ رکھتے ہیں۔ اسلئے مستقبل میں ہمیں ان سے بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ موصوف فرماتے ہیں:۔

> " بنگال میں ...... آج اسکولوں کے جدید نظام کی بدولت یہ حالت ہے کہ اُردو سے یک گونہ مغایرت بڑھتی جا رہی ہے۔ اور اس کا خطرہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ اگر پرانی نسل ختم ہوئی، اور حالات کی اصلاح نہیں کی گئی تو غالباً بنگال میں اُردو کا سمجھنے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔ اس کا تدارک صرف اس طرح ممکن ہے کہ کم سے کم مسلمانوں کے لئے اسکولوں میں اُردو کو امتحان کا ایک لازمی ثانوی زبان قرار دیا جائے۔ بنگال میں ابتک یہ تجویز کیوں عمل کا جامہ نہیں پہن سکی، اس کے اسباب میں سب سے بڑا سبب کلکتہ یونیورسٹی کا عدم تعاون ہے۔ جس کو بنگال کے اسکولوں، کالجوں اور نصابوں پر غیر معمولی اختیارات حاصل ہیں، حالانکہ یہ یونیورسٹی نہ صوبے کے ہندوؤں کی باضابطہ نمایندگی کا دعویٰ کر سکتی ہے اور نہ مسلم اکثریت کی نیابت سے اس کو

دُور کا واسطہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں اس پر علیحدہ بحث کرونگا، اس وقت میں صرف اتنا عرض کرونگا کہ اُردو کو کم سے کم مسلمانانِ بنگال کے لیے ایک لازمی مضمون بنانے کا عزم صمیم کر چکا ہوں اور انشاءاللہ عام مسلمانوں کی تائید سے اس میں کامیاب ہونگا ۔"

ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبہ اُردو کی صدارت کے فرائض حضرۃ الاستاذ مولانا **سید سلیمان ندوی** مدظلہ نے ادا فرمائے ۔ اس موقع پر حضرت ممدوح نے اُردو کے مسئلہ پر جس بالغ نظری سے نظر ڈالی ہے، اس سے اس موضوع کا کوئی گوشہ باقی نہیں رہ گیا ۔ ضرورت ہے کہ مرکزی انجمن ترقی اُردو ہند اس کی کاپیاں ہزاروں کی تعداد میں چھپوا کر ہندو اور مسلمان دونوں طبقوں میں تقسیم کرائے، موقع ملا تو کسی آیندہ اشاعت میں ناظرین ندیم کے سامنے بھی اس کو تمام وکمال پیش کیا جائے گا ۔

— x —

انہیں تاریخوں میں مرکزی **انجمن ترقی اُردو ہند** (دہلی) کا پہلا سالانہ اجلاس دہلی میں منعقد ہوا ۔ اس میں راقم سطور قصد مصمم کے باوجود بعض اتفاقی حادثات کے باعث شریک نہ ہو سکا ۔ انجمن کے اجلاس کی صدارت کے لئے نواب مہدی یار جنگ، حیدر آباد سے تشریف لائے تھے، موصوف کے خطبہ صدارت میں اُردو رسم خط کے متعلق یہ رائے آب زر سے لکھنے کے لائق ہے کہ

"رسم خط کے ترک و تبدل کا کوئی سوال نہیں ہو سکتا کہ وہ ترقی کے دھوکے میں تنزل کی ابتدا ہے ۔ اور اولوالعزمی کے نام سے کم ہمتی کی تاویل ہے ۔ ہر زبان کے ساتھ اس کے رسم خط کو ایک فطری تعلق ہے، وہ تعلق منقطع ہو جائے تو زبان اپنی فطری حالت پر قایم نہیں رہ سکتی ۔"

اُردو ٹائپ کے متعلق جناب نواب ممدوح کے ذیل کے ارشاد گرامی کو ہم نے مسرت کی نظر سے دیکھا ہے کہ

"جامعہ عثمانیہ کا سررشتہ تالیف و ترجمہ انٹر ٹائپ، لائنو ٹائپ، اور مانو ٹائپ، ان سب کارخانوں کو ٹائپ کے متعلق مشورے دیتا رہا ۔ چنانچہ حروف تہجی کی تکمیل کر کے اُردو نسخ ٹائپ کا بھی لائنو ٹائپ میں انتظام ہو گیا ہے ۔ اور حال میں اس کا مطبوعہ نمونہ سررشتہ مذکور میں موصول ہوا ہے، جو بہت امید افزا نظر آتا ہے ۔"

— x —

انجمن ترقی اُردو کے اجلاس میں ملک کے مختلف مشاہیر نے اپنے پیامات بھیجے، جنہیں اس اشاعت میں کسی دوسری جگہ نقل کیا گیا ہے ۔ ان میں سے گاندھی جی کے پیام کا آخری فقرہ اُردو کے بہی خواہوں کی نگاہ میں کھٹکا تھا ۔ خوشی ہوئی کہ پنڈت جواہر لال نے لاہور میں اس پر مناسب الفاظ میں اظہار خیال کیا ۔ موصوف نے فرمایا کہ

"انہیں (یعنی گاندھی جی کو) ایسا نہ کہنا چاہئے تھا، بلکہ یوں کہنا چاہئے تھا کہ "اُردو دانوں کو ہندی اور ہندی دانوں کو اُردو پڑھنی چاہئے ۔" زبانوں کے مطالعہ کرنے میں کوئی ہرج نہیں، میں ہندوستانی ہوں، میرے گھر میں اُردو بولی جاتی ہے، یہ میری مادری زبان ہے، مگر میں نے انگلستان میں رہ کر انگریزی پڑھی، اس سے میری مادری زبان میں کوئی فرق نہ آیا ۔"

ہم پنڈت جی کے اس برملا اظہار خیال پر ان کے شکر گذار ہیں ۔

— x —

انجمن کے عام اجلاس کے شروع ہونے سے پہلے چند سب کمیٹیوں کے جلسے ہوئے، جن میں زبان کی ترقی و حفاظت کے مسئلہ پر سود مند غور و فکر کیا گیا ۔ اس اجلاس سے اُردو کی بہی خواہوں میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی ہے ۔ دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ انجمن کے ناظم مولانا **عبدالحق** کی عمر دراز فرمائے کہ اس وقت اُردو کے بازار کی رونق انہی کے دم سے قایم ہے ۔

— x —

سر **شاہ محمد سلیمان** نے انیسٹاین کے نظریہ اضافیت پر علم ہیئت کی روشنی میں نظر ڈالی، اور مشرق کے دماغ نے مغرب کے ایک مسلم الثبوت آزمودہ دماغ پر فتح پائی ۔ فیصلہ کا قلم کسی مشرقی کے بجائے ایک مغربی ماہر علم ہیئت ہی کے ہاتھ میں تھا ۔ شاید یہ واقعہ ان لوگوں کے تخیل میں کچھ جنبش پیدا کرے جو فضل و کمال میں فطری برتری کو مغرب ہی کے لئے مخصوص سمجھتے ہیں ۔ مشرق کے ارباب کمال علوم و فنون میں آج بھی وہی دستگاہ حاصل کر سکتے ہیں جو کبھی مشرق کے لئے طرۂ امتیاز تھا ۔ ضرورت ہے صرف تھوڑے سے ماحول کے بدل جانے کی ۔ کیا عجب کہ وہ زمانہ اب کچھ زیادہ دُور نہ ہو ۔

ناظرین ندیم کے حلقہ میں یہ مسرت سے سُنا جائیگا کہ اس ماہ سے ہمارے شہر کے ممتاز ذی علم جناب **سید حسن امام صاحب** وارثی حسن ندیم کے حصۂ منظومات کی ترتیب کی ذمہ داری میں مدیر ندیم کے شریک کار ہو گئے ہیں، موصوف کو علم ادب کا پاکیزہ مذاق حاصل ہے ۔ ہم موصوف کی اس کرم فرمائی کے شکر گذار ہیں ۔

یہ پرچہ بہار نمبر ۱۹۴۰ء سے پہلے کا آخری پرچہ ہے۔ ان سطروں کے چھپنے کے بعد بہار نمبر ۱۹۴۰ء چھپنا شروع ہو جائیگا۔ کاپیاں خاصی تعداد میں تیار ہو چکی ہیں۔ بہار نمبر تین سو صفحوں سے بالا ضخامت میں ہو گا۔ اور چونکہ ندیم کے اعتبار سے ہر صفحہ میں ۱۰ سطریں زاید ہونگی یعنی گویا وہ مضامین کے اعتبار سے چار سو صفحوں کا ہوگا۔ بہار نمبر کی اشاعت کی متعین تاریخ کون سی ہوگی۔ اس کے متعلق کیا اعلان کیا جا سکتا ہے جبکہ زیر نظر نمبر غیر معمولی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ اس جبری تاخیر کے متعلق ندیم کے منیجر نے اخباروں میں ذیل کا اعلان شائع کرایا تھا:۔

"شہر گیا چند مفتوں سے فتنہ و فساد کا آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ بظاہر شہر میں امن و سکون رہنے کے باوجود شہری باشندے بے خوف و خطر نہیں رہتے۔ انفرادی حملوں اور چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ قایم رہتا ہے۔ اس اثنا میں دو تین مرتبہ کھل کر کاروائیاں بھی ہوئیں۔ اور اس وقت تو پورے شباب سے گرم بازاری ہے۔

شہر میں اس صورت حال کے قایم ہو جانے سے ہر قسم کے کاروبار میں ابتری پھیلی ہوئی ہے۔ ندیم پریس کے ملازمین شہر کی مختلف سمتوں کے محلوں میں رہتے ہیں۔ ذرا سی افواہ کے پھیلنے کی دیر رہتی ہے اور ان کا شہر کے جنوبی یا شمالی محلوں سے آنا دشوار ہو جاتا ہے۔ پھر بار بار بازار کے بند ہو جانے سے کبھی کاغذ کے نہ ہونے کے باعث کام رکا رہا۔ ابھی پٹنہ سے کاغذ منگایا گیا تو شہر میں بلوہ نئے سرے سے پھوٹ پڑا۔ پریس کے کسی ایک ملازم کے نہ پہنچنے سے پورا عملہ بیکار ہو جاتا ہے۔ جنوری و فروری کا مشترک ندیم پورا تیار ہو چکا ہے۔ صرف ٹائیٹل اور دو پتھروں کی چھپائی باقی ہے۔ آج چار دنوں سے معطل رہنے کے بعد یہ سطریں قلم بند کر کے اخبارات میں بھیجی جا رہی ہیں۔

ناظرین اس جبری تاخیر کو معاف فرمائیں اور دعا کریں کہ شہر کے حالات پرسکون ہوں تاکہ باطمینان کام جاری ہو سکے۔"

کارکنان ندیم امکان بھر پوری کوشش کریں گے کہ وہ بہار نمبر کو جلد سے جلد شایع کر کے اس کے بے شمار شائقین کے انتظار کی زحمتوں کو دور کریں۔ والفضل منا و الاتمام من اللہ

ندیم کے ارکان دوامی ملاحظہ فرمائیں

۱ - ادارۂ ندیم ان تمام کرمفرماؤں کا شکر گذار ہے جنہوں نے ندیم کی رکنیت دوامی قبول فرمائی ہے۔

۲ - جن ارکان دوامی کا چندہ اس وقت تک موصول نہیں ہوا ہے وہ براہ کرم ۳۱ مارچ ۱۹۴۰ء سے پہلے اپنی رقم بیباق کر دیں۔

۳ - ندیم کا بہار نمبر ارکان دوامی میں سے صرف انہیں حضرات کی خدمت میں روانہ کیا جائیگا جن کا زر چندہ ماہ مارچ میں بیباق ہو جائے گا

۴ - جن لوگوں کا زر چندہ ۳۱ مارچ تک بے باق نہ ہو جائے گا ان کی رکنیت دوامی کا رشتہ منقطع ہو جائیگا اور جن ارکان دوامی کی کوئی جزئی رقم دفتر میں موصول ہو چکی ہے ان کا حساب سالانہ زر چندہ مبلغ چار روپے کے حساب سے خریداری رجسٹر میں چڑھا دیا جائیگا اور جتنے پرچے ان کی خدمت میں روانہ ہو چکے ہیں، ان کی قیمت سالانہ زر چندہ کے حساب سے وضع کر کے باقی یا فاضل کرا دیا جائے گا۔

۵ - ان ارکان دوامی کا سلسلہ رکنیت دوامی منقطع ہو جائیگا۔ رکنیت دوامی کر رجسٹر سے ان کے اسمائے گرامی کو کاٹ دیئے جانے کی اطلاع شایع کر دی جائیگی۔ تاکہ جن صفحوں میں ان کے رکنیت قبول کرنے کی اطلاع چھپی ہے، انہیں میں منقطع ہونے کی اطلاع بھی چھپ جائے۔

۶ - جو ارباب ذوق رکنیت دوامی قبول کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں، اور اس وقت تک وہ عمل نہ کر سکے ہوں، ان کے لئے ۳۱ مارچ آخری تاریخ ہے۔ وہ چندہ دوامی ویسے دفتر میں بھیج دیں، انہیں وہ سہولتیں حاصل ہوں گی۔

(الف) رسالہ ندیم تا زندگی انکی خدمت میں ہدیۃً روانہ ہوگا۔ (ب) مکتبۂ ندیم کی مطبوعات نصف قیمت پر دی جا سکے گی۔

۷ - مارچ ۱۹۴۰ء کے بعد رکنیت دوامی کا زر چندہ پچیس روپیہ نہ ہوگا۔ یہ اس وجہ رعایتی قلیل رقم محض وقتی حالات کو لحاظ سے [illegible] رکنیت کو مستقل [illegible] قائم ہونگے۔ جن کا اعلان بعد میں کیا جائیگا۔ اور وہ قواعد ویسے ہی ہونگے جیسے دوسرے علمی و ادبی اداروں میں جاری ہو [illegible]

پہلے مارچ ۱۹۴۰ء کا مہینہ رکنیت دوامی کے جاری رکھنے یا اس کو نئے سرے سے قبول کرنے کے لئے ایک مختتم مہینہ ہے۔ اس [illegible] آپ ندیم [illegible] مالی امداد [illegible] کرنے میں [illegible] نہ فرمائیے۔ دوسری جانب اپنے علمی و ادبی ذوق کی تسکین نہایت [illegible]

افسانہ و محاضرا :—

نون وائلنس

از حضرت ماپوری

ایک تو پٹھان اور پٹھان بھی سرحد کا اسپر شیر محمد خاں جیسا جاہل اور جوشیلا پٹھان —— مہاتما گاندھی کے سرحدی دورہ کے موقعہ پر۔ لاکھوں آدمیوں کا اجتماع —— میلوں شاندار جلوس۔ خدائی خدمتگاروں کا فوجی پریڈ— پبلک جلسوں میں ملک کی آزادی پر دھواں دھار تقریریں۔ انقلاب زندہ باد کے فلک شگاف نعرے۔ یہ سب سامان کچھ ایسے تھے کہ شیر محمد خاں کو بھی جوش آ ہی گیا۔ سیدھے کانگریس اوفس میں پہونچا اور خدائی خدمتگاروں کے کپتان فیض محمد خاں کو مخاطب کرکے بولا :۔

شیر محمد خاں :۔ کپتان صاحب کانگریس کے سپاہیوں میں ہمارا نام بھی درج کرلو۔

فیض محمد خاں :۔ صرف نام لکھوانے سے کوئی فائدہ نہیں خدائی خدمتگار بننے سے پہلے ہر طرح کی مصیبت اور تکلیف برداشت کرنے کے لئے تیار رہنا ضروری ہے۔

شیر محمد خاں :۔ تکلیف برداشت کرنا کیا چیز ہے ملک اور قوم کے واسطے ہم جان تک دینے کو تیار ہے یوسف زئی قبیلہ کا آدمی موت سے کبھی نہیں ڈرتا۔ مرنا مارنا تو ہمارے واسطے ایک کھیل ہے۔

فیض محمد خاں :۔ خیر ملک کے واسطے مرنا تو ایک بہادری کا کام ہے لیکن کسی کو مارنا ہمارے اصول کے ایکدم خلاف ہے۔ کانگریس کے سپاہی بننے کے لئے نون وائلنس پہلی شرط ہے۔

شیر محمد خاں :۔ یہ نون وائلنس کیا چیز ہے۔

فیض محمد خاں :۔ ٹھیک ہے پہلے اسکو سمجھ لینا ضروری ہے۔ ہمارے سب سے بڑے سردار کا قول ہے کہ نون وائلنس ہی ایک ایسا حربہ ہے جس کے ذریعہ آزادی کی جنگ میں بڑے بڑے دشمن کو بھی آدمی شکست دے سکتا ہے۔

شیر محمد خاں :۔ ایسا حربہ ہم کو ملے تو دشمن کیا ایک ایک سپاہی کو جہنم واصل کرنے کو ہم تنہا کافی ہے۔

فیض محمد خاں :۔ (مسکرا کر) خان! یہ نون وائلنس تلوار اور بندوق کی طرح کوئی جنگی اسلحہ نہیں جس سے قتل و غارت کا کام لیا جائے۔ یہ تو جنگ اور خون ریزی کا اصول کیا ہے کہ بغیر خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر دشمن پر آدمی فتح پا جاتا ہے۔

شیر محمد خاں :۔ (حیرت سے) خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر دشمن پر فتح تو شاید یہ زہریلی قسم کا کوئی گیس ہے؟

فیض محمد خاں: - سرحدی پٹھانوں کی عقل بھی اُن کے جسم کی طرح موٹی ہوتی ہے بے وقوف آدمی غور سے سن نون والقلم جس کو عدم تشدد اور اہنسا بھی کہتے ہیں اسپر اعتقاد رکھنے والے تلوار بندوق تو کیا ذکر۔ لاٹھی چلانا بلکہ کسی پر ہاتھ اُٹھانا بھی گناہ سمجھتے ہیں تم اگر کانگریسی سپاہی بننا چاہتے ہو تو پہلے اس کا عہد کرو کہ کسی وقت کسی حالت میں بھی کسی پر حملہ یا تشدد نہ کریں گے۔

شیر محمد خاں: - اچھا ہم دل سے اقرار کرتا ہے کہ بلا وجہ ہم کسی پر نہ حملہ کریگا اور نہ مار پیٹ کسی کو کریگا۔

فیض محمد خاں: - وجہ اور بلاوجہ کی شرط یہاں نہیں ملک کی آزادی کی لڑائی میں تم پر اگر ڈنڈے برسیں جیل جانا پڑے۔ طرح طرح کی تکلیفیں پہونچائی جائیں سب کو بلا چون وچرا برداشت کرنا پڑیگا اور اس کے بدلہ لینے کا خیال تک دل میں نہ لانا ہوگا۔

شیر محمد خاں: - ہمارا خیال میں مذہب کا لڑائی ہو یا ملک کے واسطے جنگ دو چار دشمن کو مار کر بہادری کا موت مرنے کے بدلے بزدل فضول ڈنڈے کھا کر اور ذلیل مجرموں کا مانند جیل میں رہ کر بزدلی کا زندگی کون غیرت دار پٹھان پسند کریگا؟

فیض محمد خاں: - اسی غلط خیال کے مٹانے کے واسطے مہاتما جی کو بار بار سرحد کا دورہ کرنا پڑتا ہے۔ ملنگ بابا کا کہنا ہے کہ حقیقت میں دو مردوں پر وہی بزدل حملہ کرتا ہے جس کا دل کمزور ہے۔ مضبوط دل والا ہر قسم کے ظلم و تشدد برداشت کرنے کی طاقت دل میں رکھتا ہے وہ ظلم سہتا ہے مگر کسی پر حملہ یا تشدد نہیں کرتا۔ اصل بہادری کسی کو مارنے میں نہیں بلکہ مار کھانے میں ہے نون والقلم کا مقصد یہ ہے کہ مظلوم ظلم اور سختی یہاں تک برداشت کرے کہ ظالم ظلم و تشدد کرتے کرتے تھک کر اور عاجز ہو کر مظلوم کے آگے جھکنے پر مجبور ہو جائے اور یہ روحانی و اخلاقی فتح صرف نون والقلم ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

فیض محمد خاں دیر تک عدم تشدد کا اصول اور اس کا فلسفہ شیر محمد خاں کو سمجھاتے رہے لیکن گھنٹوں سر کھپانے کے باوجود یہ روحانی اور اخلاقی نکات اس کے بھدے دماغ میں نہ اٹ سکے آخر آخر تک وہ یہی پوچھتا رہا کہ دشمن کو مار بھگانے کا نام بزدلی اور مار کھانے پٹ جانے کا نام بہادری کس طرح ہو جائے گا لیکن اس کے سمجھنے کے باوجود چونکہ اسے یقین تھا کہ خدائی خدمتگار روں ہی کی ایک ایسی جماعت ہے جو ملک کو آزاد کرانے کے لئے اپنی جان تک کی پروا نہیں کرتی اس لئے اپنی تشفی کی غرض سے اور مزید سوال کرنے کے عوض اس نے فیض محمد خاں سے کہا کہ ہم والقلم اور نون والقلم نہیں جانتا ہم کانگریس کا سپاہی بنکر ملک کا خدمت کرنا چاہتا ہے دشمن کو مارنے کہے گا مار ڈالے گا اور مار کھانے کہے گا مار کھائے گا جو حکم دیگا ہم کرنے واسطے تیار ہے۔ فیض محمد خاں نے اس کے جوش و خلوص کو دیکھ کر خدائی خدمتگاروں کے رجسٹر میں اس کا نام درج کر لیا۔ شیر محمد خاں نے خوش ہو کر کہا اب اسوقت ہمارے ذمہ کون کام سپرد کیا جاتا ہے؟ اسکی یہ مستعدی دیکھ کر فیض محمد خاں نے کہا۔ آج شب کو پبلک میٹنگ میں نون والقلم پر مہاتما جی کا لیکچر ہے تم پانچ اور خدائی خدمتگاروں کو ساتھ لئے ہوئے جلسہ گاہ کے صدر پھاٹک پر شام ہی سے جا کر انتظام کرو کہ گیٹ پر بھیڑ نہ ہونے پائے جسکی وجہ سے آنے جانے والوں کے لئے کوئی دقت اور رکاوٹ نہ پیدا ہو۔

شیر محمد خاں حسب ہدایت چار نے دل کر اور دیگر رضاکاروں کے ساتھ گیٹ پر پہونچکر اپنے فرائض کے انجام دینے میں مصروف ہو گیا۔ اور اس سے جہاں تک ہو سکا پوری طاقت کے ساتھ

دولک تمام کے گیٹ پر سے بھیڑ ہٹاتا رہا لیکن ساتھ بجے جلسے میں مہاتما جی کی آمد کی خبر سنتے ہی آدمیوں کا سیلاب جو پھاٹک کی طرف بڑھا تو پھر اب کا ہے کو کسی کے روکے رکتا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کی کشمکش اور جد و جہد کے بعد مہاتما جی سرحدی گاندھی و دیگر حواریں کے ساتھ خدائی خدمتگاروں کے حلقہ میں جب اس گیٹ پر پہونچے تو وہاں پر مجمع کا یہ عالم تھا کہ والنیٹروں کی پوری کوشش کے باوجود خود مہاتما جی کو جلسہ میں جانے کے لئے راہ نہ ملی۔ بھیڑ کی یہ کیفیت دیکھ کر شیر محمد خاں کو خیال ہوا کہ آدمیوں کے اس سیلاب اور اس ریلے میں کوئی جسمانی صدمہ نہ مہاتما جی کو پہونچ جائے۔ یہ خیال آنا تھا کہ جوش عقیدت میں مہاتما جی کو اس کشمکش کی مصیبت سے نجات دلانے کے لئے اس نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ پاس ہی ایک جاٹ کے ہاتھ سے لاٹھی چھین کر جو بے دھڑک مجمع پر چلانا شروع کی تو کسی کا ہاتھ ٹوٹا کسی کا سر کسی کی ٹانگ میں چوٹ آئی کسی کی ناک سے خون بہنے لگا پھر تو ایسی بھگدڑ مچی کہ چند ہی منٹوں میں گیٹ پر سے بھیڑ چھٹنے کا کیا ذکر جلسہ کا پورا میدان صاف ہو گیا۔ شیر محمد خاں فوراً مہاتما جی اور دوسرے لیڈروں کے سامنے دوڑا ہوا پہونچا اور کہنے لگا کہ اب کوئی بھیڑ بھاڑ نہیں اب اطمینان سے چل کر جلسہ میں تقریر فرمائیے۔ اگرچہ اس وقتی ہڑبونگ کے ختم ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد جلسہ گاہ میں پھر لوگوں کی آمد شروع ہوگی لیکن عین جلسہ کے وقت والنٹیر کا یہ مظاہرہ دیکھ کر اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے کے خیال سے مہاتما جی نے اپنی نون والملتن والی تقریر ملتوی کر دی۔

دوسرے صدر کانگریس مولانا ابو... اس افسوسناک واقعہ کے ذکر کے سلسلہ میں تحقیق حال کے خیال سے فیض محمد خاں نے خدائی خدمتگاروں کو مخاطب کر کے کہا۔

فیض محمد خاں :- رات کے ہنگامہ کے متعلق صحیح پتہ نہ چل سکا کہ یہ کس کی شرارت تھی۔

شمشاد خاں :- سنا ایک دوسرا خدائی خدمتگار جلسہ کو درہم برہم کرنے کے لئے یقینی کانگریس کے کسی مخالف نے لاٹھی چلا کر ہنگامہ برپا کر دیا۔

شیر محمد خاں :- (فخریہ تمسخر سے) ہمارے ہوتے ہوئے کسی مخالف کے باپ کا مجال تھا اس جگہ لاٹھی چلاتا۔

فیض محمد خاں :- اگر کسی مخالف کی یہ حرکت نہ تھی تو آخر کس کی شرارت ہو سکتی ہے نون والملتن کی پابندی کی وجہ سے کوئی کانگریسی یا خدائی خدمتگار اس طرح سے والملتن کی حرکت تو کر نہیں سکتا۔

شیر محمد خاں :- (زیر لب مسکرا کر) خیر کسی کی یہ حرکت ہو لیکن اس بھیڑ میں ایسا نہیں کیا جاتا تو آدمیوں کے اس ریلے میں مہاتما جی جیسا نحیف اور کمزور آدمی پس ہی کر رہ جاتا۔

شمشاد خاں :- سب سے بڑی خیریت یہ ہوئی کہ مہاتما جی پر کسی نے وار نہیں کیا۔

شیر محمد خاں :- جی ہاں ہم ایسا بے وقوف تھا کہ اس بھیڑ سے جن کے بچانے کے لئے ہم کو ڈنڈا سے کام لینا پڑا اور انہیں پر ہم الٹا وار کرتا۔

فیض محمد خاں :- کیا تم نے بھی اس ہنگامہ میں رات لاٹھی چلائی تھی؟

شیر محمد خاں :- یہ بھی آپ کیا بھلا ہمارے سوا اور کس کا ہمت تھا کہ ایسا بھاری مجمع کو اکیلا ایک ڈنڈے سے ہٹا کر مہاتما جی کو اس مصیبت سے نجات دلاتے

فیض محمد خاں:۔ عدم تشدد کا عہد کرنے کے بعد یہ تشدد کی حرکت کیسی؟

شیر محمد خاں:۔ کپتان صاحب آپ بھی عجیب آدمی ہے عدم تشدد کا تو مطلب یہ ہے کہ کوئی دشمن یا مخالف ظلم اور زیادتی کرے تو اس کو برداشت کرنا چاہیئے اور اس کا بدلہ کا خیال دل میں نہیں آنے دینا چاہیئے اور رات والے جلسہ میں تو کوئی دشمن تھا اور نہ کوئی ہم پر حملہ کیا جس کا بدلہ لینے کے واسطے ہم ڈنڈا چلایا۔ اب مہاتما جی کے بچانے میں کسی کو چوٹ آجائے تو اسکو ہم کیا کرے۔

فیض محمد خاں کو اس کی عجیب و غریب منطق پر پہلے تو کچھ غصہ آیا مگر اس کے حسن عقیدت کا لحاظ کر کے اسوقت خاموشی اختیار کرلی۔ اتفاق سے اس کے دو ہی ہفتہ کے بعد یوپی کی اسمبلی کے ایک ضمنی انتخاب کے موقعہ پر یوپی کی پراونشل کانگریس کمیٹی نے سرحد سے خدائی خدمتگاروں کا ایک جتھا طلب کیا اور اس جتھے کے ساتھ جانے کی خواہش شیر محمد خاں نے جب ظاہر کی تو اسوقت فیض محمد خاں نے اس سے کہا کہ چونکہ عدم تشدد کی پابندی تم ضروری نہیں سمجھتے اس لئے ایسے ورک کے لئے جس میں جھگڑوں کا احتمال ہو تمہیں جانے کی اجازت نہیں مل سکتی۔ یہ سنکر اپنی گذشتہ غلطی کا اعتراف کرنے کے بعد از سر نو عہد کر کے عدم تشدد کی پابندی کا جب یقین دلایا تو اُسے بھی جانے کی اجازت مل گئی۔

الکشن کے ایک ہفتہ قبل خدائی خدمتگاروں کا یہ جتھا سرحد سے روانہ ہو کر تیسرے روز حلقہ انتخاب کے مرکزی کیمپ میں پہونچا ایک روز آرام کرنے کے بعد یہ سرحدی رضاکار مختلف ٹولیوں میں تقسیم ہو کر مختلف علاقوں میں ورک کیلئے نکل پڑے۔ تقسیم عمل کے مطابق اپنے دو ساتھی خدائی خدمتگاروں اور ایک مقامی ورکر کو ہمراہ لے کر شیر محمد خاں بھی بتائے ہوئے چند مخصوص مواضعات کی طرف روانہ ہو گیا۔ شیر محمد خاں ایک تو خود تنومند اور دیو قامت آدمی اس پر گنبد نما کھدر کی بھاری پگڑی کے علاوہ کئی تھان کھدر کا شلوار جس کا گھیرا غبارہ کی شکل اختیار کئے ہوئے تھا سرکس کے جوکر کی طرح مضحکہ خیز لباس پہنے ہوئے جب ایک بستی میں پہونچا تو تماشا سمجھ کر دیکھنے کیلئے لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔

شیر محمد خاں کے پاس کنڈیڈیٹ کی حمایت میں کانگریس کا پمفلٹ اور کچھ علماء کے دستخطی چھپے ہوئے اشتہارات تھے۔ یہی موقعہ غنیمت سمجھ کر ان اشتہاروں کو تقسیم کرتے ہوئے اپنی سرحدی اردو میں تقریر شروع کر دی:۔

"بائی لوگ! تم اگر ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتا
ہے تو کانگریس امیدوار کو ووٹ دو یہ اشتہار
پڑھو دیکھو تمہارا خود ہندوستان کا مولوی
لوگ کانگریس کو ووٹ دینے کا فتویٰ دیا ہے
اگر مولوی لوگ کا حکم مانے گا تو ایک ایک ووٹ
کے بدلے میں قیامت کے روز ستر ستر ووٹ
کا ثواب ملے گا۔"

چونکہ اس بستی کے زیادہ ووٹر کانگریس کے خلاف تھے اس لئے کسی نے اس کی باتوں کی طرف دھیان نہیں دیا۔ بلکہ بعض منچلوں نے مذاقاً چھیڑ کر کہا "آغا تم آخر ووٹ جا کر بیچو کہاں اس الکشن کے جھنجھٹ میں پڑے ہو۔" اس کے ساتھ ہی ایک اور شریر نے چڑانے کے لئے کہا۔ "بیچارہ اسی بات کی تنخواہ پاتا ہے یہ نوکری نہ بجالائے تو کھائے کیا۔" اس پر آ گیا

پٹھان کو غصہ طیش میں گالی دیکر بولا "تم اگر اپنا باپ کا بیٹا ہو تو ہمارا کانگریس کا دکری ثابت کرد تم سب انگریز کا خوشامدی ہے اسواسطے خوشامدی کو ووٹ دیگا" — اسپر کسی نے کہدیا کہ تم بھی تو کانگریس کے پٹھو ہو۔ یہ سننا تھا کہ غصہ میں آپے سے باہر ہوکر بچھو کہنے والے پر اس طرح جھپٹا کہ اگر دونوں سرحدی ساتھی نون وائلنس یاد دلاکر نہ روکتے اور وہ بھی چھیڑنے والا فوراً وہاں سے نہ بھاگتا تو واقعی اسکی خیریت نہ تھی۔

اسکی اس حرکت پرستی کے دور اندیش لوگ ڈرے کہ یہ اجڈ پٹھان جوش میں آکر واقعی کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھے جو فساد کا باعث بن جائے۔ اپنی بستی سے جلد از جلد اس بلا کو کسی طرح ٹالنے کے خیال سے شیر محمد خاں کے پاس آکر کہا کہ آپ اطمینان رکھیں یہاں کا کل ووٹ آپ ہی کو ملے گا۔ ایک شخص بھی کانگریس کے خلاف نہیں جائے گا۔ شیر محمد خاں اپنی اس کامیابی پر خوش خوش ادھر اپنے کیمپ کی طرف لوٹا، ادھر بستی والے اس بلائے بے درماں کے ٹل جانے پر "رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت" کہتے ہوئے اطمینان کا سانس لیا۔

اسیطرح جس بستی میں الکشن ورک کیلئے یہ شخص پہونچتا کسی نہ کسی بات پر کچھ نہ کچھ فوجداری کا سامان ضرور پیدا ہوتے ہوتے رہ جاتا وہ تو خیریت تھی کہ بات بڑھتے بڑھتے غصہ میں جب کسی پر مکا یا گھونسہ چلانے کے لئے یہ ہاتھ اٹھاتا تو اس کے ساتھی نون وائلنس کی یاد دلا دیتے بیچارہ غصہ پی کر رہ جاتا۔ خیر یہ تو باہر کا پروپگنڈہ ورک تھا۔ اصل اسکی ورکنگ ووٹنگ کے روز الکشن فیلڈ میں دیکھنے کے لائق تھی — کبھی ورکروں کے کیمپ میں کبھی لیڈروں کے خیمہ میں کبھی ووٹروں کے شامیانے کے نیچے کبھی پولنگ کے احاطے کے اندر غرض پورے فیلڈ میں غریب گھن چکر بنا ہوا تھا

اسی دوڑ دھوپ کے درمیان پولنگ گراؤنڈ سے شامیانے کی طرف جاتے ہوئے اتفاقاً راہ میں اس بستی کے چند ووٹروں پر نظر پڑگئی جہاں پہلے روز جھگڑا ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ ان سبھوں کو دیکھ کر شیر محمد خاں دور ہی سے "السلام علیکم بائی صاحب" کہتا ہوا لپکا ان لوگوں نے اس بلا کو اپنی طرف آتے دیکھ کر عمداً رخ پھیر کر چاہا کہ جلدی جلدی قدم بڑھاتے ہوئے دوسری طرف چلدیں مگر "ووٹر بائی! ووٹر بائی" کہتا ہوا ایک کر اُن کے پاس پہونچ ہی گیا۔ اور ان میں سے دو آدمیوں کے بازو اپنے دونوں ہاتھ سے تھام کر بولا "بائی صاحب ادھر کہاں جا رہا ہے؟ ادھر ہمارا کیمپ ہے"۔ ان لوگوں نے ہاتھ چھڑا کر بھاگ جانے کی لاکھ کوشش کی مگر ایک سرحدی پٹھان کی گرفت میں آکر نکل بھاگنا آسان کام نہ تھا شیر محمد خاں یہ کہتا ہوا "چلو بائی نخرہ مت کرو" جب زبردستی کشاں کشاں اپنے کیمپ میں لے آیا تو بجلی کی طرح مخالف کی جماعت میں یہ خبر پھیل گئی کہ دو ووٹروں کو ایک سرحدی پٹھان زبردستی گھسیٹے ہوئے کانگریس کیمپ کی طرف لے گیا یہ خبر پہونچتی تھی کہ فریق کے چند جوشیلے ورکر بپھرتے ہوئے غصہ میں بھوت بنے ہوئے شیر محمد خاں کے پاس پہونچے اور بگڑ کر بولے کہ تم زبردستی ہمارے ووٹر کو پکڑ کر کیوں لائے ابھی انکو ہمارے حوالہ کرو۔ شیر محمد خاں نے بھی کڑک کر جواب دیا۔ یہ اور انکا سب بستی والا ہم کو ووٹ کا وعدہ کیا ہے ہم اپنا ووٹر بائی کو کبھی نہیں چھوڑیگا۔ پھر مخالف کے

ورکر...... دیکھیں تو تم کیسے روکتے ہو" کہہ کر ان دونوں کو کھینچے ہوئے اپنے ساتھ لے چلے۔

کانگریس کیمپ میں آکر اور شیر محمد خاں کے قبضہ سے ووٹروں کو چھین کر لے جانا معمولی ذلت اور شکست کی بات نہ تھی۔ خیمے میں واٹنٹیس روکنے کے لئے احتیاطاً بہت سی لاٹھیاں رکھی ہوئی تھیں ان میں سے ایک موٹی لاٹھی نکال کر شیر محمد خاں نے مخالفوں پر جو چلانا شروع کی تو بھاگتے ہوئے ورکروں کے ساتھ ان دونوں ووٹروں پر بھی دو چار پڑ گئیں۔ کانگریس کے الکشن انچارج نے جو خیمے سے یہ ہنگامہ دیکھا تو باہر آکر ورکروں پر بگڑ کر چلانا شروع کیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے تم لوگ جھگڑا اور فساد کر کے کانگریس کو بدنام کرنا چاہتے ہو' ذرا اس ہنگامہ کو رکو یہ سنتے ہی ایک ورکر نے پاس جا کر کہا کہ آپ کو اس کی کچھ خبر ہے کہ اسوقت تک جتنے ووٹر پاس ہو چکے ان میں ہمارے ووٹ کا نمبر کچھ زیادہ ہے لیکن اب ہمارے ووٹر قریب ختم ہو چکے ہیں اور مخالف پارٹی کے ووٹروں کی تعداد اسقدر زیادہ ہے کہ اگر اطمینان کے ساتھ سب ووٹ گذرے تو صرف اسی علاقے کے ووٹ سے فریق ہمیں شکست دیگا یہ ہنگامہ اور بھگدڑ اس موقعہ پر ہمارے لئے گویا ایک تائید غیبی ہے۔

یہ سنکر مسکراتے ہوئے خدا جانے اس نے کیا کان میں کہا کہ وہی ورکر لپک کر پھر شیر محمد خاں کے پاس پہنچا اور چلا کر کہا خان! یہاں کیا کرتا ہے پولنگ گراونڈ کی خبر لو۔ ہمارے ووٹروں کو ووٹ دینے سے روکا جا رہا ہے' بلکہ دھکے دے دے کر زبردستی ہمارے ووٹر نکالے جا رہے ہیں' یہ سننا تھا کہ دیوانہ را ہوئے بس است' اسی جوش اور غصہ کے عالم میں لاٹھی گھماتا ہوا پولنگ گراونڈ میں پہنچکر جو حملہ بول دیا تو ایک طرف دو رکھیرے ہوئے بانس کو پھاندتے اور چھلانگ مارتے بھاگے جا رہے ہیں۔ ایک طرف ورکر گرتے پڑتے فرار ہو رہے ہیں' پولنگ ایجنٹ اور کلرک الگ راؤٹی میں جا چھپے۔ پولنگ افیسر مع ووٹنگ کی کوٹھری میں کواڑ بند کر کے بند ہو گیا۔ چند ہی منٹ میں پولنگ احاطہ کیا معنے الکشن کا پورا میدان خالی ہو گیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد ہر طرح سے اطمینان کر کے جب کلرک پولنگ ایجنٹ اور پولنگ افیسر اپنی اپنی جگہ پر ووٹ کے لئے پہونچے تو کسی ووٹر کا پتہ نہیں صرف انہیں چند ورکروں کا جمگھٹ تھا۔ اور ووٹ دینے سے رہ گئے تھے۔ ووٹ لیا گیا اس کے بعد ووٹنگ کا وقت ختم ہو جانے پر بکس پر سیل کر کے نہایت ہی احتیاط کے ساتھ پولیس کی نگرانی میں روانہ کر دیا گیا۔ شب کو جب کل تھکے ہوئے ورکر کانگریس کیمپ میں جمع ہوئے تو سب نے متفقہ طور پر شیر محمد خاں کی تعریف کی کہ مخالف کے ورکروں اور ووٹروں کو تنہا ایک ڈنڈے سے ایسا بھگایا کہ پھر لوٹ کر آنے کی کسی کی ہمت نہ پڑی۔ اگر یہ بہادر پٹھان نہ ہوتا تو فریق کا ایک ایک ووٹ پاس ہو جاتا اور کئی سو ووٹ سے ہم لوگ ہار جاتے' کیا خوب کسی نے کہا ہے۔

خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد

شیر محمد خاں نے کہا' خیر مادراں و پدراں ہم نہیں جانتا پہلے یہ بتلاؤ کہ ووٹ کا مردم شماری کب ہوگا۔ کہا گیا کہ آج کے تیسرے روز۔ ہارنے جیتنے کا حال معلوم ہو جائے گا۔

ووٹ شماری کی مقررہ تاریخ پر دس ہی بجے دن سے کلکٹریٹ کے سامنے لوگوں کا اجتماع شروع ہو گیا۔ دو بجے

قریب جب یہ اعلان ہوا کہ ۱۲ ووٹ سے کانگریس کنڈیڈیٹ نے اپنے فریق کو شکست دیدی تو کامیاب فریق کے لوگ خوشی میں مبارک باد کا شور کرتے ہوئے شیر محمد خاں کی طرف دوڑ پڑے اور جوش مسرت میں سب نے چاہا کہ گود میں اٹھالیں مگر پورا زور لگانے کے باوجود وہ پہاڑ ٹس سے مس نہ ہوا اسکے بعد مجمع نے باضابطہ جلوس کی شکل اختیار کرلی' کامیاب امیدوار کی بغل میں شیر محمد خاں موٹر پر بیٹھے دونوں ہاتھوں سے سلام کا جواب تو نہیں بلکہ خود ہی سب کو پیشگی سلام کرتا ہوا جلوس کے بیچ میں روانہ ہوا۔ راستہ میں لوگ ایک دوسرے سے گفتگو کرتے جاتے تھے کہ اس کامیابی کا سہرہ شیر محمد خاں کے سر ہے ہم لوگوں کے لئے خدا نے گویا ایک رحمت کا فرشتہ بھیجدیا ہے پر کسی نے ہنس کر کہا کہ فرشتہ نہیں بلکہ بھاری بھرکم جسم کی وجہ سے رحمت کا دیو کہنا زیادہ موزوں ہے۔

مختصر یہ کہ کئی روز تک پرتکلف دعوتوں کا لطف اٹھانے کے بعد یہ سرحدی رضا کار خوش خوش اپنے وطن روانہ ہوئے۔ الکشن کی اس کامیابی کی خبر تار کے علاوہ اخباروں کے ذریعہ پہلے ہی مل چکی تھی۔ شیر محمد خاں نے پہونچکر جب یو پی کانگریس کمیٹی کے سکریٹری کا خط فیض محمد خاں کو دیا تو اس میں یہ پڑھکر کہ یہ کامیابی صرف شیر محمد خاں کی وجہ سے ہوئی' مسرت کے ساتھ انہیں تعجب بھی ہوا کہ نہ تو الکشن ورک سے واقف نہ اس کے ٹیکٹ سے آگاہ۔ آخر کون سا ایسا کام اس نے کیا جو ساری کامیابی کا سہرا اس کے سر باندھا جارہا ہے تفصیلی حالات معلوم کرنے کے خیال سے جب فیض محمد خاں نے پوچھا

فیض محمد خاں:- ہاں تو کیسے کیا ہوا ؟

شیر محمد خاں:- (ٹوننگ میں آکر) ہوا کیا۔ مار کے آگے بھوت بھاگتا ہے۔ ایک ہی حملہ میں مخالف کے ورکر اور ووٹر سب غائب۔

فیض محمد خاں:- (حیرت سے) کیا تم نے حملہ کیا۔

شیر محمد خاں:- ہم پہلے حملہ نہیں کیا' ہمارا وعدہ کیا ہوا ووٹر چھیننے کے لئے وہی لوگ حملہ کے ارادے سے آیا تھا' تب مجبوراً ہم لاٹھی چلایا۔

فیض محمد خاں:- تو آخر تم نے لاٹھی چلا ہی دی۔

شیر محمد خاں:- (سوال کا مقصد سمجھ کر) لاٹھی چلانا بلکہ گھمانا کہنا چاہئے۔ اب اس لاٹھی گھمانے میں خود ہی کوئی زد پر آجائے تو اس کے زخمی ہونے کا ہم ذمہ دار کیسے ہوسکتا ہے۔

فیض محمد خاں:- (بگڑکر) وہ تو پہلے ہی میں سمجھے ہوئے تھا کہ وہاں جاکر تم ضرور کوئی نہ کوئی حرکت ایسی کروگے جس سے کانگریس کی بدنامی ہو۔ نون وائلنس کے عہد کرکے یہ وائلنس کی حرکت کیسی ؟

شیر محمد خاں:- کپتان صاحب ہمارا سمجھ میں نہیں آتا کہ الکشن کے اس کام پر تو وہاں کا سب کانگریسی ہم کو مبارکباد دیا۔ وہاں کے سکریٹری کے خط میں ہمارا کس قدر تعریف ہے اور آپ بگڑتا ہے کہ نون وائلنس کے خلاف کیا۔ نون وائلنس پر ہم بھی بہت غور کیا۔ ہمارا خیال ہے آزادی کا جنگ میں حکومت سے مقابلہ کا وقت نون وائلنس کا ضرورت پڑتا ہے کیونکہ زبردست طاقت سے لڑائی میں جب جیتنے کا امید نہیں تو نون وائلنس یعنی ہتیار ڈالنے کے سوا جان بچانے کا اور کیا صورت ہے۔ اور الکشن میں نہ آزادی کا جنگ نہ حکومت سے مقابلہ نہ جان کا خوف' یہاں وائلنس اور نون وائلنس کا سوال ہی فضول ہے۔

فیض محمد خاں:- (طیش میں آکر) اچھا یہ حکومت ہی کے

مقابلہ میں تم کو ڈنڈا کھانے کے لئے بھیجا جائے گا۔ پنجاب سے کل ہی خبر آئی ہے کہ وہاں کی حکومت کانگریس کے ایک بلڈنگ کو ہے کر اس طرف سے ایک پبلک روڈ نکالنا چاہتی ہے۔ وہاں کی پروونشیل کانگریس کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ بلڈنگ توڑنے کے وقت ستیاگرہ کیا جائے اور اس ستیاگرہ کے جاری رہنے کے لئے ہر صوبہ سے والنٹیروں کی کافی تعداد طلب کی گئی وہاں ستیاگرہ کے وقت ہاتھ میں لاٹھی وغیرہ تو رہے گی نہیں وہاں جاکر جب پولس کے ڈنڈے کھاؤ گے اور جیل کی سیر کروگے تب نون والقلم کی عادت پڑے گی۔

شیر محمد :۔ بسم اللہ ہم نہایت خوشی سے تیار ہے۔

اس گفتگو کے ایک ہی ہفتہ بعد پنجاب کانگریس کمیٹی کی طلبی پر پندرہ خدائی خدمتگاروں کا پہلا جتھا سرحد سے پنجاب روانہ ہوگیا۔ جس میں شیر محمد خاں بھی شامل تھا۔ وہاں پہونچنے کے دوسرے ہی روز ستیاگرہ کے انچارج لیڈر نے شیر محمد خاں اور اس کے ساتھ اور چار خدائی خدمتگاروں کو ستیاگرہ کا حکم دیا۔ حسب الحکم جیسے ہی یہ پانچوں رضاکار مقررہ جگہ پر پہونچے پولیس پہلے ہی سے انتظار میں کھڑی تھی۔ فوراً پکڑ کر جیل میں لے جانے کے لئے لاری پر بٹھانے لگی۔ چار خدائی خدمتگاروں نے بغیر روک ٹوک خاموشی کے ساتھ پولیس کے حکم کی تعمیل کی لیکن شیر محمد خاں کا ہاتھ جیسے ہی ایک کانسٹبل نے پکڑا اس نے اتنے زور سے جھٹکا دیکر اپنے ہاتھ کو چھڑایا کہ اس سپاہی کی کلائی میں موچ آگئی اس پر اور بھی کئی سپاہی غصہ میں شیر محمد خاں کو دھر پکڑ کر لاری میں بٹھانے کیلئے جو کھینچنا شروع کیا تو اس نے بھی لیڈر انچارج سے نظر بچا کر چپکے سے دو تین گھونسے ایسے رسید کئے کہ کوئی تو پیٹ کوئی کمر کوئی کلیجہ تھام کر بیٹھ گیا۔ یہ دیکھنا تھا کہ کل سپاہی پر ٹوٹ پڑے اور چاروں طرف سے جھپٹ کر ایسا مجبور کر دیا کہ بے بسی میں اس سے اور تو کچھ سوجھی نہیں سب کو لے دے اپنے کو اس طرح دھم سے زمین پر گرا دیا کہ کسی کی ٹانگ اس کی ران کے نیچے آکر کچل گئی۔ کسی کے ہاتھ کی ہڈی مونڈھے کے نیچے دب کر اپنی جگہ سے اکھڑ گئی۔ کسی کی پیٹھ میں خراش کسی کا سر زخمی غرض اس پہاڑ کے گرتے وقت جو جھٹکے میں پڑگیا اسے کچھ نہ کچھ ضرور چوٹ آئی۔ اس کے گرتے ہی پولس سب انسپکٹر نے للکار کر اپنے سپاہیوں کو کہا "شاباش اس موذی دیو کو تم لوگوں نے خوب پچھاڑا" حالانکہ بیچارے سپاہی دھرم دھکے میں پڑکر خود پچھڑ گئے تھے۔

داروغہ نے ہمت دلاتے ہوئے کہا کہ فوراً اسے رسے میں باندھ کر لاری پر ڈالدو۔ اب جو غصے میں اس کے ہاتھ پاؤں باندھنے کے لئے سب پولیس والے لپکے تو اس وقت سامنے جسکی ٹانگ شیر محمد خاں کے ہاتھ میں آئی۔ کھینچکر مروڑ دیا اور رسے سے باندھنے کے لئے جو پاؤں کی طرف گیا۔ اس پر اس نے بھی ایسی لات ماری کہ کئی قدم کے فاصلہ پر جا گرا۔

یہ حالت دیکھ کر سب انسپکٹر صاحب ستیاگرہ کے انچارج کے پاس پہونچے اور فرمانے لگے کہ کام کو یقین دلایا گیا تھا کہ نون والقلم کو مدنظر رکھتے ہوئے باامن ستیاگرہ ہوگا ....لیکن اس سرحدی پٹھان کی حرکتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نون والقلم کا لحاظ اس تحریک میں نہیں رکھا گیا ہے۔ انہیں حرکتوں پر اگر حکام لاٹھی چارج یا فائرنگ سے کام لیتے ہیں تو آپ لوگ پبلک اسٹیج پر اور اخباروں میں بلا کر کے حکام کو بدنام کرتے ہیں۔ اب تک ستیاگرہیوں پر سختی کرنے کا کوئی حکم مجھے نہیں ملا ہے۔ اب میں آپ سے صاف پوچھنا چاہتا

ہوں کہ واقعی امن و سکون کے ساتھ اس ستیاگرہ کا سلسلہ جاری رہے گا یا نہیں۔ آپ لوگوں کا ارادہ ہے تاکہ اسی کے مطابق میں بھی اپنے افسران اعلیٰ سے ہدایت حاصل کروں۔ یہ سنکر انچارج لیڈر نے کہا کہ اس پٹھان کی یہ بیہودہ حرکت اس کا ذاتی فعل ہے۔ ہم لوگ کسی حال میں نون والقلم کی خلاف ورزی کرنے کو تیار نہیں یہ کہکر شیر محمد خاں کو حکم دیا کہ فوراً تم یہاں اپنی جگہ پر چلے آؤ حکم سنتے ہی وہاں سے اٹھکر اپنے سردار کے پاس چلا آیا۔ دارفغہ نے کہا کہ ایسے جوشیلے آدمی کا یہاں موجود رہنا تشویش سے خالی نہیں۔ خدا جانے جوش میں آکر کس وقت کون حرکت کر بیٹھے لاری کے علاوہ سرکاری موٹر بھی یہاں موجود ہے۔ اسی پر لے جہاں مناسب سمجھیں روانہ کردیں۔

چنانچہ اس تجویز کے مطابق شیر محمد خاں ایک خدائی خدمتگار اور دو سپاہیوں کی نگرانی میں بحفاظت تمام وہاں سے پشاور روانہ کردیا گیا۔ دونوں محافظ سپاہی کانگریس اوفس میں شیر محمد خاں کو اتارکر اور فیض محمد خاں کے ہاتھ میں ایک خط دیکر واپس لوٹ گئے۔ اس خط میں فیض محمد خاں نے شیر محمد خاں کی واپسی کی وجہ پڑھکر غصہ میں آگ بگولہ ہو گئے۔ بپھر کر بولے:۔

فیض محمد خاں:۔ کیوں جی! تم اپنی حرکت سے باز نہیں آؤ گے تم نے نون والقلم کو بدنام کرنے کا گویا بیڑا اٹھا لیا ہے۔ خدا کے لیے کانگریس کی جان چھوڑ دو۔

شیر محمد خاں:۔ یوں بگڑنے کا آپ کو اختیار ہے۔ ہم کیا کیا وہاں ہمارے پاس نہ تلوار نہ بندوق نہ لاٹھی۔ آخر کس چیز نے نون والقلم ہم تو ڈرا جس کے پاس لڑائی کا کوئی اوزار نہ ہو وہ والقلم کس چیز سے کریگا۔ ہنستوں کا والقلم ور نون والقلم دونوں ...

فیض محمد خاں:۔ اور یہ لات اور گھونسہ چلایا؟

شیر محمد خاں:۔ تو اب ہاتھ پاؤں ہلانا بھی گویا والقلم میں داخل ہوگیا۔

فیض محمد خاں:۔ بیشک ہاتھ اور پاؤں سے بھی کسی کو تکلیف پہونچانا والقلم میں داخل ہے۔ نون والقلم کا تو منشا یہ ہے کہ لاکھ کوئی ظلم و زیادتی کرے اس کا بدلہ لینے کے لیے کسی کو تکلیف پہونچانے کا خیال تک دل میں نہ آئے

شیر محمد خاں:۔ اور اگر آجائے تو؟

فیض محمد خاں:۔ دل و دماغ اور ہاتھ کو قابو میں رکھے۔

شیر محمد خاں:۔ اور اگر قابو میں نہ رہے تب۔

فیض محمد خاں:۔ (اور زیادہ بگڑکر) تو پھر کانگریس میں رہنے کا اسے کوئی حق نہیں اگر واقعی نون والقلم پر تمہارا عقیدہ نہیں اور اس پر عمل نہیں کرسکتے تو خدائی خدمتگاروں کے رجسٹر سے اپنا نام فوراً کٹوالو۔ (منشی کو بلاکر) رجسٹر سے اس کا نام ابھی کاٹ دو۔

شیر محمد خاں:۔ (اپنی غلطی کو محسوس کرکے) اچھا کپتان صاحب اس مرتبہ ہمارا قصور معاف کرو اب ہم نون والقلم کو اچھی طرح سمجھ گیا۔ آیندہ سے ہاتھ پاؤں ہلانا کیسا زبان تک ہلانے کا قسم لے لو بلکہ کسی بات پر کبھی ہم سر بھی نہ ہلائے گا۔

فیض محمد خاں:۔ (اس تمسخر انگیز گفتگو پر ہنسی کو ضبط کرکے) اچھا تم پھر سے قسم کھا کر جب نون والقلم کی پابندی کا یقین دلاتے ہو تو رجسٹر سے تمہارا نام تو نہیں کاٹا جائے گا مگر بالفعل تم کسی ذمہ دارانہ کام پر باہر نہیں بھیجے جاسکتے۔ جب تک ہر طرح سے آزما کر دیکھ نہ لیا جائے گا کہ کہاں تک تم نون والقلم کی پابندی کرتے ہو اس وقت تک تم کو یہیں اوفس کا کام کرنا ہوگا۔

ہنگامہ پسند اور جوشیلی طبیعت کا آدمی پرسکون اور خاموش زندگی اس کے اقتضائے طبیعت کے خلاف تھی مگر مجبوراً کچھ دنوں کے لئے اوفس میں پڑا رہنا اس نے قبول کیا اب اپنے ساتھیوں کے علاوہ فیض محمد خاں کو یہ یقین دلانے کے لئے کہ ہم نون والقلم کے پکے عامل ہیں ہر جگہ اور ہر شخص کے پاس جا جا کر نون والقلم کی تبلیغ شروع کر دی راستہ میں جہاں دو آدمیوں کو جھگڑتے دیکھا بیچ میں کود کر کہ زور زور سے کہنا شروع کر دیا کہ دشمن کو مارنے پیٹنے دو نون والقلم پر عمل کر کے اس کے بدلے کا خیال تک دل میں نہ لاؤ اسی میں تمہاری اخلاقی فتح ہے۔

ایک بار کہیں جاتے ہوئے راستہ میں چند کتوں کو دانت نکوسے ہوئے ایک دوسرے پر جھپٹ جھپٹ کر جھاؤں جھاؤں کرتے دیکھا یہ خیال کر کے کہ یہ سب کہیں نون والقلم کی خلاف ورزی نہ کر بیٹھیں دور ہی سے تابڑ توڑ ان سب پر اتنے ڈھیلے برسائے کہ سب دم دبا کر بھاگے اور اس طرح سے ایک عمدہ سے بھری ہوئی جماعت کو نون والقلم کی خلاف ورزی سے بچا لیا۔ اسی نون والقلم کی تبلیغ و ہدایت کے سلسلہ میں چائے پینے کے بہانہ سے ایک ہوٹل میں پہنچا دیکھا کہ ایک میز کے گرد کچھ لوگ خدائی خدمتگار اور نون والقلم کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں۔ ایک کرسی کھینچ کر یہ بھی پاس ہی بیٹھ گیا۔ زیر بحث یہ بات تھی کہ نون والقلم واقعی قابل عمل ہے یا نہیں؟

ایک: کمزور اور بزدل ہندوستانیوں کی افتاد طبیعت کے لحاظ سے نون والقلم کی تحریک موزوں ہو سکتی ہے لیکن سرحد کے غیور اور بہادر پٹھانوں کو بزدل بنانے کی نہ معلوم کیوں کوشش کی جا رہی ہے؟

دوسرا: مگر اس سے شیر بھی بکری بن سکتا ہے؟

تیسرا: شیر بکری کیوں نہیں بن سکتا سرکس میں کیا نہیں دیکھا کیسے کیسے ببر شیر بکری کی طرح ہنٹر کے اشاروں پر تعمیل حکم کرتے ہیں۔

چوتھا: سرکس کی مثال یہاں ٹھیک نہیں وہاں ہوتا یہ ہے کہ جب شیر پھنس کر آتا ہے تو پہلے بہت دنوں تک نشہ آور غذاؤں سے اس کا دل و دماغ کمزور اور ماؤف کر دیا جاتا ہے ساتھ ہی بے ضرر جانوروں کے حلقہ میں اس کا پنجرا رکھ کر ایسا ماحول پیدا کر دیا جاتا ہے جس سے دلیری اور شجاعت کی اسپرٹ کم ہوتے ہوتے خودداری اور غیرت کی روح بھی فنا ہو جاتی ہے اس کے بعد ہنٹر اور چابک کی مار کا عادی بنا کر شیر ہونے کا احساس بھی اس کے دماغ سے غائب کر دیا جاتا ہے۔

پانچواں: مگر ان ترکیبوں کے باوجود کئی سال ہوئے لاہور میں سرکس کے ایک بوڑھے اور کمزور شیر کا واقعہ اخباروں میں چھپا تھا کہ پنجرے سے نکلتے ہی شیر نے چابک کی سٹاک کی آواز پر بجلی کی طرح جست کر کے رنگ ماسٹر کے پاس پہونچ کر آن کی آن میں اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا۔ اس کے بعد تماشائیوں کی طرف پلٹ کر کتوں کو مجروح کرتا ہوا گرجتا اور چھلانگیں مارتا خدا جانے کس طرف چلا گیا۔

دوسرا: (اسکی تصدیق کرتے ہوئے) اس واقعہ پر کہ وہ بکری نما شیر کس طرح پھر اپنے اصلی روپ میں آ گیا اسوقت اخباروں میں خوب خوب قیاس آرائیاں ہوئی تھیں مجھے یاد ہے کہ ایک نامہ نگار نے اسی سلسلہ میں شیر دل کے متاثر ہونے پر بحث کرتے ہوئے آخر میں لکھا تھا کہ جب کسی قوم کو دبا کر اس کے

فطری اقتضا کے خلاف اس سے کام لیا جاتا ہے تو کبھی نہ کبھی اس کا ردعمل ہونا ضروری ہے۔ اس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سرحدی شیروں کو بکری بنانے کی کوشش ایکدم فضول ہے۔

چوتھا: (اس کی مزید تائید کرتے ہوئے) آپ بکری کو کہتے ہیں اچھا بکری ہی کو لیجئے۔ جس کے متعلق بعضوں کا خیال ہے کہ وٹامن سے زیادہ اس میں نون وائلنس کے اجزا ہیں وہ بھی اپنے چھوٹی سی سینگ سے اپنے ستانیوالے والوں پر مدافعانہ حملہ کرتی ہے۔ تو قدرت نے جب کسی جانور کو ناخن دار پنجہ کسی کو سینگ عطا کرکے دشمن کی ایذا رسانی سے محفوظ رہنے کا سامان مہیا کر دیا تو انسان ہاتھ پیر اور مدافعتی اسلحہ رکھے ہوئے دشمنوں کے ڈنڈے کھائے عجب طرح کا فلسفہ ہے۔

شیر محمد خاں دیر تک یہ گفتگو غور سے سنتا رہا جب اس نے محسوس کیا کہ ناخندار پنجہ اور سینگ کی دلیل سے اس کا تیسرا ہم خیال کانگریسی قائل ہو جانے کے قریب ہے تو اس سے رہا نہ گیا فوراً بیچ میں کود کر بول اٹھا کہ یہ دعویٰ ایکدم غلط ہے کہ کل جانوروں کو ناخندار پنجہ یا سینگ حملہ سے بچنے یا حملہ کرنے کے واسطے خدا نے دیا ہے۔ بعض جانور کے سر سے سینگ ایکدم غائب ہے۔ اور وہ نہایت صبر و تحمل کے ساتھ ڈنڈے اور لات گھونسے کھاتا ہے اور کان تک نہیں ہلاتا بس ثابت ہو گیا کہ جانوروں میں بھی نون وائلنس پر عمل کرنے والے لوگ ہیں۔ ایسے لوگ نہیں بڑے۔

ایک منچلے نے اس دندان شکن جواب کی داد دیتے ہوئے شیر محمد خاں سے کہا مشکل خان تمہیں ان لوگوں کو قائل کر سکتے ہو۔ شیر محمد خاں نے ڈینگ میں آکر کہا یہ بیچارا کیسا جتن سے کہ شیخ تک کو ہم قائل کر سکتا ہے میکہ کر وہ ان میں سے ایک کو مخاطب کرکے کہا کیا واقعی تم نون وائلنس کے قائل نہیں آؤ اور ہم سے تم بحث کرو۔ اس پر اس نے ہنسکر کہا کہ تم سے ہم کیا بحث کریں، تم اور جتنے نون وائلنس کے قائل ہیں سب بیوقوف اور بزدل ہیں —— شیر محمد خاں نے بگڑ کر کہا خبردار بھلا آدمی جیسا بات کرو۔ بڑا بڑا آدمی اس کا قائل ہے تم سب کو بیوقوف کہا —— اس کے جواب میں اس نے کہا ایک بار کیا ہم سو بار کہیں گے، بیشک وہ سب بیوقوف ہیں۔

نون وائلنس کی یہ توہین شیر محمد خاں کیسے برداشت کر سکتا تھا غصہ میں اٹھ کر زبان کے بدلے اس نے ہاتھوں سے بحث شروع کر دی۔ تان کر ایک گھونسہ رسید ہی کر دیا وہ بھی کوئی بگڑے دل معلوم ہوتا تھا اس کے جواب میں اس نے بھی طمانچہ کا ہاتھ زوروں سے چلایا لیکن قبل اس کے کہ اس کا ہاتھ اس کے گال پر پہونچے۔ شیر محمد خاں نے کمر میں ہاتھ دیکر زمین پر دے مارا۔ اور ساتھ ہی سینہ پر سوار ہو کر اس کا ٹینٹوا دباتے ہوئے کہنے لگا۔ بول کمبخت نون وائلنس کا قائل ہوتا ہے یا پھر تیرا کام تمام کر دیا جائے۔ اپنے سے کئی گنی طاقت والے کو سینہ پر سوار اور اس کی زبردست گرفت میں اپنا گلا دیکھ کر بے بسی میں گڑگڑا کر کہنے لگا کہ خدا کے لئے ہماری جان بخش دو ہم کیا ہمارا پورا خاندان نون وائلنس کا قائل ہو گیا ہم اب کبھی اس کے خلاف کوئی بات نہ بولیں گے ہم اس کی رحم و کرم کی درخواست پر اس نے کہا کہ اسے چھوڑ کر علیحدہ ہوا اس شاندار فتح پر لوگوں کو مخاطب کرکے کہا دیکھا آخر نون وائلنس کا قائل ہی کر کے چھوڑا۔ اس پر ایک منچلے نے نہایت ہی سنجیدہ صورت بنا کر متانت کے ساتھ کہا ایسی زبردست بحث کے بعد کون سمجھدار نون وائلنس کا قائل نہ ہوگا۔

ہوٹل میں زن و الفنس کا سکہ بٹھانے کے بعد وہاں سے نکل کر کسی جگہ اپنے اس شاندار کارنامہ کا ذکر کرتے ہوئے شیر محمد خان جب کانگریس آفس میں پہونچا تو اسے معلوم ہوا کہ ہوٹل والے واقعہ کی خبر یہاں پہلے ہی کسی نے پہونچا دی فیض محمد خان غصہ میں پہلے ہی سے بھرے بیٹھے تھے اس پر نظر پڑتے ہی برس پڑے "تم ایسے ہی اپنی حرکتوں سے کل خدائی خدمتگاروں کو ذلیل کر کے چھوڑے گا" کلرک کو بلا کر کہا ابھی اس کا نام رجسٹر سے کاٹ دو اور اس سے کہہ دو کہ آج ہی یہاں سے جہاں جی میں آئے چلا جائے ہم اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتے۔

اتفاق سے اس وقت سرحدی کانگریس کمیٹی کے خزانچی لالہ ہردیال موجود تھے۔ مکان تو ان کا جالندھر تھا مگر سرحدی علاقوں کی سڑکوں کے ٹھیکہ کے علاوہ چھاؤنی میں فوجی سامانوں کی سپلائی کا ٹھیکہ کی وجہ سے زیادہ تر پشاور یا بنوں میں ان کا قیام رہتا تھا۔ سرحدی کانگریس کمیٹی کو ہمیشہ کافی مالی امداد دینے کے باعث وہاں کی کانگریس کمیٹی کے رکن اعظم تھے۔ شیر محمد خان پر یہ عتاب دیکھ کر نہ معلوم ان پر ترس آیا یا اپنے کام کا آدمی سمجھ کر فیض محمد خان سے کہا کہ واقعی اگر آپ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرنے کے لئے تیار نہیں اور اسے یہاں سے علیحدہ ہی کرنا چاہتے ہیں تو آپ کی اجازت پا کر اسے ہم اپنے یہاں کوئی جگہ دینے کو تیار ہیں۔ فیض محمد خان بولے "بہتر ہے کہ اسے آپ اپنے ہی یہاں رکھئے اگر کسی مخالف کے ہتھے چڑھ گیا تو خدا جانے کانگریس کے خلاف پروپیگنڈا کا کیا کام وہ اس سے لیں۔" چنانچہ لالہ جی شیر محمد خان کو ساتھ لئے ہوئے اپنے یہاں پہونچے اور اپنے ملازم کو بلا کر کہا کہ دو سیر آٹا آدھ سیر گھی اور سامنے والے ہوٹل سے ایک سیر گوشت روزانہ خان صاحب کو مقرر کر دو اور رہنے کے لئے سپلائی اسٹور کی باہر والی کوٹھری ان کے حوالہ کر دو سپلائی اسٹور کا محافظ اور پہرہ دار ان سے بڑھ کر اور کوئی معتمد اور دلیر آدمی نہیں ملے گا۔

لالہ جی کے حکم کے مطابق ان کے رہنے اور کھانے کا انتظام کر دیا گیا اور شیر محمد خان بھی پہرہ دار کے فرائض نہایت ہی مستعدی سے انجام دینے لگا۔ لالہ جی جب کبھی چھاؤنی کے سامان روانہ کرنے کے لئے آرڈر کے مطابق فہرست سے چیزوں کو ملانے کی غرض سے اسٹور میں تشریف لاتے تو کانگریس اور زن و الفنس کی خوبیوں کو شیر محمد خان کے ذہن نشین کرانے کی ضرور کوشش کرتے۔

ایک روز چھاؤنی سے آرڈر آیا کہ چیدوالہ کے علاقہ میں جو فوجی کیمپ لگا ہے اس کے لئے سامان سو کمبل، دو اسٹیچر، وردی اور فوجی پوشاک علاوہ فہرست منسلکہ کے مطابق کل چیزیں فوراً وہاں روانہ کر دو۔ جب سٹور لالہ جی سپلائی اسٹور میں پہونچ کر فہرست کے مطابق اپنے سامنے لاری پر جب کل سامان لدوا چکے تو شیر محمد خان سے کہا کہ چونکہ یہ سب چیزیں دور جائیں گی اس لئے کرپال سنگھ اور سندر سنگھ ان دونوں پیادوں کے ساتھ تم بھی اسی لاری پر جاؤ۔ ایسے مہربان آقا کے حکم کی تعمیل سے انکار کی کوئی وجہ بھی نہ تھی ان دونوں مسلح پیادوں کے ساتھ لاری پر بیٹھ کر شیر محمد خان بھی روانہ ہو گیا۔ پندرہویں میل پر جب ایک پہاڑی کے سامنے سے لاری گذری تو دفعتاً بندوق کے چلنے کی آواز آئی اور آواز سنتے ہی ڈرائیور اور دونوں پیادے جان کے خوف

سے کود کر لاری کے نیچے جا چھپے۔ مگر شیر محمد خاں کرپال سنگھ کی بندوق فوراً اٹھا کر لاری کے سامنے اس انتظار میں کھڑا ہو گیا کہ جہاں کوئی سامنے آیا فوراً اسی بندوق سے اسے نشانۂ اجل بنایا۔ چند منٹ کے بعد بیس پچیس قدم کے فاصلہ پر چند قبائلی پٹھانوں کو سامنے آتے دیکھ کر جیسے ہی چھاتی سے لگا کر بندوق سیدھی کی کہ ان ڈاکوؤں نے اس طرح نون وائلنس! نون وائلنس!! کہنا شروع کیا کہ مجبور ہو کر نشانہ سے بندوق کو تو ہٹا لیا مگر غصہ میں بگڑ کر بولا کہ اگرچہ نون وائلنس کہہ کر ہم کو بے بس کر دیا مگر دیکھو جہاں اس لاری کے نزدیک آیا ہم نہ تمہارا جان کا پروا کریگا نہ اپنا مال کا۔ اسپر ایک نے پشتو زبان میں ہنسکر کہا کہ ہم لوگوں کے پاس بھی بندوق ہے ہم لوگ چاہتے تو پہلے ہی گولی چلا کر تم کو ختم کر دیتے۔ مگر تم ہمارے بھائی ہو ہم کانگریس کا آدمی نہیں ہو کر بھی بلا وجہ کسی کی جان نہیں لیتے اور تم کانگریسی ہو کر نون وائلنس کے خلاف بندوق سے آدمی کی جان لینا چاہتے ہو۔ کانگریس کے سب سے بڑے سردار کو کیا جواب دو گے؟

شیر محمد خاں سوچنے لگا کہ لالہ جی برابر نون وائلنس کی تاکید کرتے ہیں ایسے موقع پر کیا کرنا چاہئے یکایک اس کے ذہن میں ایک بات آئی فوراً لاری کے سامنے جا کر ستیہ گرہ کر کے لیٹ گیا۔ ان لوگوں نے بھی نہایت ہی اطمینان کے ساتھ ایک ایک چیز کو لاری سے اتارنا شروع کیا۔ ایک دو بار شیر محمد خاں کی [illegible] کا [illegible] کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس سے نون وائلنس کی خلاف ورزی کا احتمال بھی ہو۔ اپنے عہد کے مطابق ہاتھ پاؤں تک نہ ہلایا جب کل سامان ایک ایک کر کے وہ سب لے جا چکے تو غصہ میں شیر محمد خاں بدن کی گرد جھاڑتے ہوئے اٹھا اور لاری کے نیچے چھپے ہوئے ساتھیوں سے بگڑ کر بولا تم لوگ کیسا بزدل ہے اور کچھ نہیں تو ستیہ گرہ کر کے ہمارا ساتھ لاری کے سامنے لیٹ جاتا۔ خداداد خاں نے وہیں سے کہا کہ آپ کو معلوم نہیں ہم لوگ بھی ستیہ گرہ ہی کر کے لاری کے نیچے لیٹے ہوئے تھے اب جب وہ سب چلے گئے تو ستیہ گرہ کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ کہتے ہوئے ڈرائیور اور وہ دونوں پیادے باہر آئے۔ کرپال سنگھ نے کہا بھائی شیر محمد خاں تم نے بہت اچھا کیا کہ ایسے نازک وقت میں نون وائلنس پر عمل کیا ورنہ مفت میں تمہارے ساتھ ہم لوگوں کی بھی جان تو جاتی ہی لالہ جی سے اہنسا کی خلاف ورزی پر بات الگ سنتے۔ خیر اب فوراً واپس چل کر لالہ جی سے کہنا چاہئے کہ چھاؤنی کے افسر سے کہہ کر ان ڈاکوؤں کو گرفتار کر کے اور ان کے گھروں سے کل مال برآمد کرائیں۔ چنانچہ یہ سب اسی لاری پر واپس لوٹ کر لالہ جی سے کل چیزوں کے لٹ جانے کا واقعہ بیان کیا۔

لالہ جی انتہائی صدمہ کے باعث پہلے تو کئی منٹ تک چپ رہے۔ اس کے بعد جب تفصیلی حالات پوچھی کہ کس مقام پر، کس طرح اور کن لوگوں نے لوٹا تو شیر محمد خاں جھٹ بول اٹھا لالہ جی! وہ سب کانگریسی معلوم ہوتا تھا کیونکہ جب ہم بندوق چلانا چاہتا تھا تو وہ لوگ نون وائلنس یاد دلا کر آدمیوں کی جان لینے سے روک دیتا تھا۔ اسپر غصہ میں بھوت ہو کر لالہ جی نے ڈانٹنا شروع کیا۔

بزدل ڈرپوک پٹھان! بڑا نون والقلم والا بنا ہے۔ ہمارا مال لوٹا جا رہا تھا اور یہ اپنا کوٹھے پر سے تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس پر شیر محمد خان نے تیور بدل کر کہا لالہ جی! اور جو گالی چاہے آپ ہمکو دے سکتا ہے مگر بزدل کا لفظ ہم سننے کے واسطے تیار نہیں۔ یہ سنکر لالہ جی اور بھی آگ بگولہ ہو گئے۔ بزدل کا پھپھولا پھوڑنے کے لئے اور چلا کر بولے۔ صرف دیکھنے کے لئے یہ ڈیل ڈول ہے جان کے خوف سے مقابلہ کی ہمت تو پڑی نہیں اور کہتا ہے کہ نون والقلم کے خیال سے ہم کچھ نہیں کیا اور اب سپرد ہوئے بہادری کا۔ ذلیل ڈرپوک بزدل پٹھان! ہمیں کب بے وقوف بنانا چاہتا ہے۔ دوبارہ بزدل کا لفظ سنکر شیر محمد خاں آپے سے باہر ہو گیا اچھا بزدلی کا تماشا ہم دکھا دیتا ہے۔ کہتا ہوا لالہ جی پر شیر کی طرح ایسا جھپٹا کہ گدی سے کود کر اگر وہ جلدی سے زینہ کو طے کرتے ہوئے کوٹھے پر چڑھ کر اندر سے کواڑ نہ بند کر لیتے تو والقلم اور نون والقلم کا اسوقت فیصلہ ہی ہو جاتا۔ وہاں سے غصہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا شیر محمد خاں اپنے ایک دوست حمید خاں کے یہاں چلا آیا۔ اور کئی روز تک سوچتا رہا کہ نون والقلم واقعی بہادری ہے یا بزدلی۔

اس کے بعد خدا جانے اس نے کیا دل میں فیصلہ کیا اور یکایک وہاں سے جو غائب ہوا تو دو ماہ تک کچھ پتہ نہ چلا کہ کہاں چلا گیا۔ تیسرے مہینے قبائلی علاقہ سے ایک آنے والے نے کہا کہ شیر محمد خاں آج کل فقیر ایپی کی مجاہد جماعت میں شامل ہو گیا ہے۔

بشپ

از جناب شفاعت محمود صاحب

(۴)

مجلس چہارم

[۳ مہینوں کے بعد —— بشپ عالم نزع میں بستر مرگ پر —— قریب والے کمرے میں بہت سے لوگ دعا خوانی اور گانے میں مصروف ہیں تاکہ —— روح آسانی سے نکلے نجات ہو جائے گناہ دھل جائیں —— !

دروازے پر ہلکے ہلکے دستک ہوتی ہے۔]

بشپ:۔ (کراہ کر) کون ہے؟

آواز:۔ ایک غریب عورت!

بشپ:۔ (آواز پہچان کر) بادشاہ کی ماں؟

خاتون مریم:۔ لوگ مجھے ایسے پہلے ہی کہتے تھے۔

بشپ:۔ آپ کیوں آئیں —— جائیے —— ماں نے میری صلاح سے آپ کو دور نہیں بھیجا۔

مریم:۔ بادشاہ کا حکم ہے میں اس لئے نہیں آئی آج کی بعد ہر سے جنت نے بیت المقدس جاتے ہوئے میرے بھائی کو آپکے نام کا ایک خط دیا تھا میرا بھائی بھی ایک عرصے کے بعد گھر آیا ہے لیجئے یہ ہے وہ خط! سربمہر لفافہ دیکھئے آپکی امانت ٹھیک ہے نا جنت کی آرزو تھی کہ میں خود اسے آپ تک پہونچا دوں راز کے خیال سے میں راتوں رات چپکے سے آئی ہوں۔

بشپ:۔ لائیے! —— اتنی جلدی تو نہ تھی۔

ڈگفن:۔ (اچانک آکر) بادشاہ سلامت آرہے ہیں ملکۂ نونہال اور بہت سے لوگ ساتھ ہیں۔

(مڑ کر)

شریف خاتون آپ یہاں کہاں؟

مریم:۔ یونہی چلی آئی —— میرا بیٹا! بادشاہ بیٹا آرہا ہے، یہیں کہیں چھپ کر ایک نظر اپنے حسین بیٹے کو دیکھ لوں، رات بھر قربان گاہ میں دعائیں کروں اور پو پھٹتے ہی واپس جاؤں۔

ڈگفن:۔ (باہر جاتا ہوا) میں کل بشپ ہونا پسند نہ کرونگا۔

بشپ:۔ (لفافہ ہاتھ میں لئے ہوئے اپنے دل سے):۔

آخر ہنت کا خط آہی گیا، گر ایسے وقت میں کہ
تمام قوتیں جواب دے رہی ہیں، راجہ سکل سے عہد تھا کہ خط
ملتے ہی دیدونگا، موت گلے کا ہار نہ ہوتی تو ہمیشہ کی طرح یہ
عہد بھی ہوا میں اڑا دیتا۔ کیا کروں یہ خط دئے دیتا ہوں
تو ایک عمر کی محنت مٹی میں مل جاتی ہے۔

(زور سے پکارتا ہے)

——— ولجم! ولجم!!

ولجام:- (اندر آکر) کہئے حضور!

بشپ:- دعاخوانوں سے کہو کہ پوری قوت صرف کردیں، پوری آواز سے گائیں، یہ شب آخری شب ہے، ان لوگوں سے کہدو کہ دعا میں کمی ہوئی تو میری روح آئیگی اور ان کے سروں پر مسلط ہوگی۔

[ولجام جاتا ہے]

بشپ:- (پھر چلاتا ہے) سیگرد! سیگرد!!

[سیگرد آتا ہے]

بشپ:- اپنی حیات کے تین دن صرف تین دن، میرے ہاتھ بیچ ڈالو۔

سیگرد:- (مسکرا کر) میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔

بشپ:- تم مذاق کر رہے تھے مجھے سبق مل گیا رحم کرو رحم! صرف تین دن! جو قیمت مانگو دیدوں۔

سیگرد:- میں آپ کی جگہ ابھی مرنا چاہوں تو بھی ناممکن ———

بشپ:- (بات کاٹ کر) ایک ہی دن سہی ——— صبح تک سہی اجالے میں مروں میں نے اپنی زندگی بھر کی کمائی کلیسا میں دعاخوانی کے لئے دیدی ہے مگر

(قہقہہ لگا کر)

——— تم راضی ہوجاؤ تو سب واپس لے لوں اک چند تاریک گھنٹوں کے عوض تمہارے ——— نذر ——— نذر ——— کردوں۔

سیگرد:- آپکے گلے کی رگیں سوکھ رہی ہیں، انار کا عرق لاؤں؟

[جاتا ہے]

بشپ:- (عصا کھٹکھٹا کر) ولجم! ولجم!! ول جم!!

[ولجام آتا ہے]

بشپ:- صرف ۷۶ آدمی دعاخوانی کے لئے کافی نہیں ہیں اوروں کو شامل کرو۔

[ولجم بہت خوب کہتا ہوا جاتا ہے]

سکل:- (اندر آکر) نصیب دشمناں مزاج کیسا ہے؟

بشپ:- زندہ درگور ہوں، آج شب کو میری روح کی کلی کھلے گی۔ اور کل ہی سارے جہان میں خوشبو پھیل جائیگی۔

سکل:- آج ہی رات کو۔

بشپ:- دو گھنٹے کے اندر۔

سکل:- وقت تیزی سے گذر رہا ہے۔

(گھڑی میں بارہ بجتے ہیں)

——— بادشاہ کا رخ یہیں کا ہے" ——— وہ خط آپ کو مل گیا ہے ——— وہ ہنت والا خط! ——— جلدی دلوایے وہ خط!

بشپ:- ذرا رکئے!

(ایک لفافہ دیکر)

اس میں میرے دشمنوں کی ایک فہرست ہے، وعدہ کیجئے کہ ایک ایک سے چن چن کر انتقام لیجئے گا۔

سکل:- میں وعدہ کرتا ہوں ——— مگر وہ خط.....

بشپ :۔ خوش آمدید عالی جاہ!

[شاہ ہاکن آجاتا ہے]

ہاکن :۔ مجھے آپ کی تمام کارستانیاں معلوم ہوگئیں آپ ہمیشہ میرے دشمن رہے مگر آج آپ بستر مرگ پر ہیں میں نے آپ کی تمام خطائیں بخش دیں۔

بشپ :۔ زندہ باد ہاکن! اب میری روح بالکل سبک ہوگئی۔

ہاکن :۔ (سکل صاحب کو دیکھ کر) راجہ صاحب میں اور مجھ میں جو محبت ہے وصل میں نذر خزاں اور ہجر میں بار آور ہوتی ہے۔ میں رخصت ہوتا ہوں۔

بشپ :۔ (عصا ٹیک کر) ٹھہرنا ہوگا۔

ہاکن :۔ (قبضہ پر ہاتھ رکھ کر) غالباً راجہ صاحب کے کافی سپاہی کمینگاہ میں موجود ہیں۔

سکل :۔ قسم کھاتا ہوں آپکے آنے کا گمان بھی مجھے نہ تھا

بشپ :۔ میں عالم پناہ کو صرف شمشیر الفاظ سے روکونگا

ہاکن :۔ اتنے وحشی نہ بنئے۔

سکل :۔ ایک ایک سکنڈ قیمتی ہے ضائع نہ کیجئے۔

بشپ :۔ آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے معلوم نہیں ہوتا آپ لوگ کہاں ہیں؟

سکل :۔ وہ خط دے دیجئے۔

بشپ :۔ میری روح میرے بعد بھی ہلیک کنٹری میں رہیگی

ہاکن :۔ (متبسم ہوکر) اب میں سمجھ گیا کہ اس محفل کا مقصد کیا ہے۔

بشپ :۔ تم دونوں ایک ہو جاؤ، نہیں تو لڑتے لڑتے تباہ ہو جاؤ گے۔

[illegible]

[جوش میں اٹھ کر بستر پر گر جاتا ہے]

سکل :۔ عالم پناہ! مدد کے لئے آواز دیجئے۔ ابھی ان کو نہ مرنا چاہئے۔

بشپ :۔ (مہین آواز میں درد سے رک رک کر) :—

دو — نوں — بر — باد — ہو — جا — ؤ — گے — ول — ہم!

[ولیام آتا ہے]

بشپ :۔ (ولیم کے کان میں) آج تک کے گناہ معاف ہوگئے، مگر آج رات کے گناہوں کے لئے سات حلقے اور ہونے چاہئیں۔

[ولیام جاتا ہے]

بشپ :۔ اب مجھ پر سکون سا طاری ہو رہا ہے۔

سکل :۔ موت کی نشانی ہے —— وہ خط!

بشپ :۔ میں یکایک رحم کا پتلا بن گیا ہوں میں نے ابھی ابھی اپنے دشمنوں کی جو فہرست مہر بہ لب دی تھی اسکو میری آنکھوں کے سامنے اس دہکتی انگیٹھی میں جلا دو خاک سیاہ کر دو۔

[سکل انگاروں پر وہ خط ڈالدیتا ہے بھک بھک جلنے لگتا ہے۔ ہاکن حیران ہے سکل بیتاب ہے، اور شعلوں کی ہر لپک پر بشپ کا چہرہ مسرت سے چمک اٹھتا ہے۔]

سکل :۔ فہرست خاک سیاہ ہوگئی، اب بتائیے وہ جنت والا خط کہاں ہے؟ بولئے اسوقت آپکے دو لفظوں میں انقلاب کی روح ہے۔

بشپ :۔ (موت کی ہنسی ہنس کر) جنت کا خط وہی تھا جسے

ٹارزن

یعنی

عجیب انسان

— از جناب محمد احسن صاحب پھلوبی پوری —

باب ۵۱

پچاس خوفناک آدمی

تھوڑی دیر کھڑے ہوئے کلیٹن اور جین پورٹر اس شیر کی طرف دیکھتے رہے جو دونوں کو اپنا شکار بنا ہی چکا تھا لیکن قسمت نے انہیں بچایا۔

کلیٹن نے دل میں آئی ہوئی باتوں کا اظہار کر کے جین پورٹر نے افسردہ دلی سے کہا "یہ کس کا کام ہے؟"

کلیٹن نے خشک آواز میں جواب دیا "خدا ہی جانے!"

عورت نے کہا "ہمارا کوئی دوست ہے۔ وہ سامنے کیوں نہیں آتا؟ ہمیں مناسب ہے کہ اُسے بلائیں اور اس کا شکریہ ادا کریں!"

کلیٹن نے آواز دی مگر کوئی جواب نہ ملا۔ عورت نے کانپ کر کہا "اف! جنگل بھی کتنا خوفناک اور کتنے مخفی اسرار سے بھرا ہوا ہے! یہاں اپنے اوپر کئے گئے احسان کو بھی دیکھ کر خوف معلوم ہوتا ہے!"

کلیٹن نے کہا "اپنی جھونپڑی میں چلی چلو۔ وہاں تم زیادہ حفاظت میں ہو گی۔ شاید وقت پر میں کوئی مدد نہ کر سکوں۔"

اُنکی آواز رنج و غم میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جین پورٹر نے کہا "تم رنجیدہ نہ ہو کلیٹن۔ میں اپنے الفاظ سے تمہیں رنج پہنچانا نہیں چاہتی تھی۔ تم نے کیا وہی جو تم کر سکتے تھے، جو تم سے ہو سکتا تھا۔ تم ہمیشہ خلیق بہی خواہ اور مجھ پر مہربان رہے ہو۔ تم نے انسان سے بڑھ کر کام نہیں کیا۔ اس میں تمہارا کچھ قصور نہیں ہے۔ میں صرف ایک ہی ایسے آدمی کو جانتی ہوں جو تم سے بڑھ کر کام کر سکتا تھا۔ لیکن وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خیر میں تمہیں رنجیدہ نہیں کرنا چاہتی۔ صرف اتنا سمجھا دینا چاہتی ہوں کہ میں تم سے شادی نہ کر سکوں گی۔ ایسا کرنا میرے لئے اپنے ہی دل کو دھوکا دینے کے برابر ہو گا۔"

کلیٹن نے کہا "میں سمجھ گیا۔ اچھا ہو گا کہ ہم میں سے کوئی بھی اس بات کا ذکر نہ کرے۔ کم از کم متمدن دنیا میں پہنچنے تک اس بات کو بھولے ہی رہنا میرے لئے اچھا ہو گا۔"

دوسرے روز تھیورن کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ وہ ہمیشہ بڑبڑاتا رہتا تھا۔ اُس کے دونوں ساتھیوں نے اُس کے ساتھ اپنے امکان بھر جو ہو سکتا تھا کیا۔ لیکن وہ اُس کی زیادہ مدد نہیں کر سکتے تھے۔ کلیٹن چاہتے بھی نہ تھے کہ زیادہ مدد کی جائے۔ وہ دل ہی دل میں اُس سے ڈرتے تھے اور انہیں ہمیشہ خوف لگا رہتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ عورت

اس جانور کے ساتھ تنہا رہ جائے اور اُسے مصیبت میں مبتلا ہونا پڑے۔

عورت کے پاس شیر کے آنے سے انہیں اتنی پریشانی اور فکر نہ ہوتی جتنی انہیں اس بات کی فکر لگی رہتی تھی کہ اگر وہ تنہا اُسکے ساتھ رہ گئی تو کیا ہوگا!

انھوں نے برچھا شیر کے بے جان جسم سے نکال لیا تھا اور

اب اُس کے پاس رہنے کی وجہ سے انہیں کچھ زیادہ ہمت معلوم ہوتی تھی دوسرے روز صبح کو جنگل میں جب وہ شکار کرنے گئے تو برچھا پاس رہنے کی وجہ سے بجائے جتنی دور جایا کرتے تھے اس سے زیادہ دور نکل گئے۔

جین پورٹر بخار میں مبتلا روسی کا بکنا جھکنا سنتے سنتے گھبرا گئی اور درخت کی سیڑھی سے نیچے اُتر کر وہیں نزدیک ہی زمین پر بیٹھ کر سمندر کی طرف دیکھنے لگی۔ اُسے ہمیشہ یہ امید رہتی تھی کہ کوئی نہ کوئی جہاز ضرور کبھی نہ کبھی دکھائی دیگا۔ سیڑھی سے زیادہ دور جانے کی اُس کی ہمت نہ ہوئی کیونکہ گذشتہ روز شیر کے حملہ آور ہونے کا واقعہ اُس کے دل میں تازہ تھا۔

اُس کی پشت جنگل کی طرف تھی اس وجہ سے اُس نے

اپنے پیچھے گھاسوں کو ہٹتے ہوئے نہ دیکھا اور نہ اُس خوفناک چہرے ہی پر اُس کی نظر پڑی جو لمبے لمبے گھاسوں کے درمیان سے اُسکی طرف جھانک رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی مکار سرخ آنکھیں بڑی غور سے اُسے دیکھ رہی تھیں اور یہ تحقیق کر رہی تھیں کہ وہ تنہا ہے یا اُس کے پاس

کوئی اور بھی ہے۔

ایک لمحہ کے بعد ایک دوسرا سر اُس پہلے سر کی بغل میں دکھائی دیا۔ ایک تیسرا آیا، اس کے بعد چوتھا بھی پہنچ گیا۔ درخت پر جھونپڑی میں روسی نے بکنا اور بڑبڑانا شروع کیا۔ اسکی آواز سن کر سر جس طرح خاموشی سے آئے تھے اُسی طرح اپنی جگہ سے غائب بھی ہوگئے۔ چند منٹ وہ غائب رہے لیکن جب زمین پر بیٹھی ہوئی عورت نے اُس آواز پر کچھ توجہ نہ کی اور اپنی جگہ پر بیٹھی ہی رہی تو وہ پھر جھاڑی میں نظر آنے لگے۔

ایک ایک کرکے بہت سی عجیب ڈراؤنی شکلیں جنگل سے نکل کر عورت کی چاروں طرف جمع ہونے لگیں۔ پتوں کے کھڑکھڑانے کی ہلکی آواز سنکر اُس نے پھر کر پیچھے دیکھا اور جیسے ہی اُس کی نظر اپنے نزدیک کی ہولناک شکلوں پر پڑی۔ وہ خوف زدہ ہوکر ایک چیخ مار کے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ چاروں طرف سے سب اُس پر ٹوٹ پڑے ان میں سے ایک نے اپنے گوریلوں کی طرح کے لمبے لمبے ہاتھوں سے اُسے اٹھا لیا اور جنگل کی طرف بھاگا۔ دوسرے نے اپنا گندہ اور سخت ہاتھ اُس کے منہ پر رکھ کر اُس چیخ کو روک دیا جو اُس کے منہ سے نکلنا چاہتی تھی۔ جین پورٹر ہفتوں سے تکلیف اٹھا رہی تھی۔ گذشتہ ہی روز اُس کے نازک دل کو گہرا دھکا لگا تھا، آج اس خوفناک آفت میں پڑکر وہ خود کو اور نہ سنبھال سکی اور بے ہوش ہوگئی۔

جب اُسے ہوش آیا تو اُس نے خود کو جنگل کے درمیان پایا۔ رات ہوگئی تھی اور اُس کے نزدیک آگ جل رہی تھی جس کی چاروں طرف عجیب شکل کے پچاس آدمی بیٹھے ہوئے کسی ناآشنا زبان میں گفتگو کر رہے تھے۔ ان کے سر اور منہ گھنے بالوں سے چھپے ہوئے ان کے ہاتھ لمبے اور پاؤں ٹیڑھے اور چھوٹے تھے۔ دیکھنے میں وہ بہت ہی بدصورت معلوم ہو رہے تھے۔ وہ کچا گوشت نوچ نوچ کر کھا رہے تھے اور ان کے نزدیک ہی ایک طرف میں گوشت اُبالا جا رہا تھا۔ رہ رہ کر کوئی کہیں ظرف میں سے ایک لمبی نوکدار لکڑی سے گوشت کا ایک بڑا ٹکڑا نکالتا تھا اور اُسے چبانے لگتا تھا۔

قیدی کو ہوش میں آیا ہوا دیکھ کر کھانے والوں میں سے ایک نے اپنے گندہ ہاتھوں سے گوشت کا ایک ٹکڑا اُس کی طرف بھی پھینک دیا۔ اُس کے پاؤں کے نزدیک ہی وہ آ گرا۔ کھانا تو درکنار اُسے دیکھتے ہی جین پورٹر کو متلی آنے لگی اور اُس نے ہاتھ سے اپنی آنکھیں بند کر لیں

جین پورڑ کے پکڑنے والے اُسے لئے ہوئے چند روز مسلسل گنجان جنگلوں سے گذرتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ چلتے چلتے اُس کا پاؤں پھٹنے لگا۔ تکان کی وجہ سے وہ بالکل پژمردہ ہوگئی۔ اور دھوپ سے اُس کا چہرہ سیاہ ہوگیا۔ لیکن اُس کی کیا حالت ہورہی ہے اس پر کسی نے کچھ خیال نہ کیا۔ کبھی کبھی جب چلتے چلتے وہ ٹھوکر کھا کر گر پڑتی تھی یا مجبور ہوکر بیٹھ جاتی تھی تو، مار مار کر دھکے دے دے کر اور کھینچ کھینچ کر وہ لوگ اُسے اُٹھاتے تھے اور زبردستی گھسیٹ کرلے چلتے تھے۔ نصف راستہ طے کرتے اُس کے جوتوں کے تلے پھٹ گئے اور اُسے انہیں پھینک دینا پڑا۔ اس کا لباس تار تار ہوگیا اور کانٹوں کے لگنے کی وجہ سے جابجا جسم سے خون بہنے لگا۔ وہ جسم جو کسی وقت بہت سفید اور نازک تھا اب پھٹے ہوئے چیتھڑوں کے درمیان سے سیاہی مائل اور سخت معلوم ہونے لگا۔

سفر کے ختم ہونے میں دو دن باقی تھے کہ جین پورڑ کی حالت اتنی خراب ہوگئی کہ بہت کوشش کرنے کے باوجود بھی وہ اپنے زخمی جسم کو گھائل پاؤں پر سنبھالنے کے لائق نہ رہی۔ اُس کے تلوں میں جابجا زخم ہوکر خون بہ رہا تھا۔ چہرے پر مردنی چھاگئی تھی اور سخت تکان کی وجہ سے وہ ایسی مجبور ہوگئی تھی کہ کتنی ہی مار کھاتی تھی' اُسے اُٹھانے کی کتنی ہی کوشش کی جاتی تھی' لیکن وہ گھٹنوں کے بل بھی نہیں اُٹھ سکتی تھی۔

پچاس بے رحم جانور اُسے گھیرے ہوئے کھڑے تھے۔ ان میں سے کئی اُسے لکڑیوں سے کھود رہے تھے' چند اُسے اپنی زبان میں گالیاں دے رہے تھے اور چند اُسے مکّوں سے مار اور پاؤں سے پیٹ رہے تھے۔ لیکن وہ خاموش آنکھیں بند کئے زمین پر پڑی ہوئی موت کو بلا رہی تھی کہ وہ آئے اور اُسے جلد مصائب اور تکالیف سے نجات دیدے ابھی شاید اتنے ہی سے اُس کی مصیبتوں کا خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ موت اُس کے پاس نہ آئی۔ ان ظالموں نے اُسے بہت تکلیف پہنچا کر بھی جب دیکھا کہ وہ نہیں اُٹھ رہی ہے تو انھوں نے سمجھ لیا کہ وہ اب چل نہیں سکے گی۔ اُس وقت انھوں نے اُسے ہاتھوں پر اٹھا لیا اور باقی راستہ اسی طرح طے کرنے لگے۔

ایک دن شام کے وقت جین پورڑ کو سامنے ایک بڑے شہر کی شکستہ دیواریں نظر آئیں۔ وہ کون سی جگہ ہے' کہاں اُس کے دشمن اُسے اٹھا لائے ہیں —— اس سے واقف ہونے کی خواہش اُسکے دل میں ذرا بھی نہ ہوئی۔ وہ اتنی غمگین' کمزور اور پژمردہ ہورہی تھی کہ اب اُس کے دل میں ایک ہی آرزو رہ گئی تھی —— موت ان بے رحموں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے وہ جلد اُسے مل جائے گی اس کا اُسے یقین تھا۔

شہر کی دونوں فصیلوں سے گذرنے کے بعد وہ اندر لائی گئی اور اس کے دشمنوں نے اُسے ایک بڑے شکستہ مکان میں پہنچا دیا۔ وہاں پکڑنے والے شیطانوں کی شکل کے سیکڑوں آدمی اُسے دیکھنے کے لئے اس کی چاروں طرف جمع ہوگئے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں جو مردوں کی بہ نسبت کچھ کم بدصورت اور کچھ زیادہ رحمدل معلوم ہوتی تھیں لیکن ان میں سے بھی کسی نے اُس پر کوئی مہربانی نہ کی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ اُسے نہ تو کوئی تکلیف دی اور نہ اپنی تعجب خیز بولیوں میں اُسے گالیاں ہی سنائیں۔ سبھوں نے اُسے حیرت کی نظر سے دیکھا اور اس کے بعد اُسے اس مکان کے زیریں حصہ کے ایک تاریک تہ خانہ میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں کے سنگین فرش پر اُسے چھوڑ کر لوگوں نے اُس کے پاس دو برتن رکھ دئے۔ ایک میں کھانا تھا اور دوسرے میں پانی۔ اس کے بعد دروازہ بند کر دیا گیا۔

ایک ہفتہ وہ اُسی تہ خانہ میں بند رہی۔ اس عرصہ میں اس کے پاس صرف وہ عورتیں آتی تھیں جو آب و داد پہنچانے پر مامور تھیں۔ اُسے رفتہ رفتہ طاقت آرہی تھی۔ وہ اس لئے چھوڑ دی گئی تھی کہ جب اچھی ہو جائیگی اور اُسکی صحت پہلے سی ہو جائیگی تو خداوند آفتاب پر بھینٹ چڑھا دی جائیگی۔ بہت اچھا ہوا کہ اُسے وہ بات معلوم نہ تھی

جس کے لئے وہ یہاں لائی گئی تھی ورنہ شاید جلد صحت یاب نہ ہوتی۔

کلیٹن اور جین پورٹر کو خونخوار شیر کے پنجے سے بچا کر جب ٹارزن جنگل میں واپس گئے تو اس وقت ان کے دل کا وہ زخم پھر تازہ ہوگیا۔ جسے مندمل کرنے کی فکر میں دو برس سے وہ کوشش کر رہے تھے۔

جین پورٹر اور کلیٹن پر ناگہاں ایک ساتھ نظر پڑتے ہی ان کی رگوں میں غصہ سے خون جوش مارنے لگا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے کلیٹن پر تیر کا نشانہ نہ لگایا تھا۔ لیکن جس طرح جلد انہیں غصہ بڑھ آیا تھا اسی طرح فوراً اتر بھی گیا۔ انھوں نے فوراً خود کو سنبھالا اور اُس موت کو ہاتھ ہی میں روک لیا جو انکی انگلیوں سے چھوٹ کر ایک لمحہ کے اندر کلیٹن کو ہمیشہ کے لئے سلا دیتی۔ اب وہ خوش ہو رہے تھے کہ انھوں نے وہی کیا جو مناسب تھا۔

اپنی معشوقہ کو دوسرے کے گلے لگتے دیکھ کر ٹارزن کو غصہ چڑھ آیا اور وہ آپے سے باہر ہوگئے تھے اس میں ان کا کچھ قصور نہ تھا۔ انھوں نے وہی کیا جسے جنگلی رہائش نے انہیں پہلے ہی سے سکھایا تھا اور جسے کرنے کا انہیں اس جنگلی حالت میں اختیار تھا۔ جس لڑکی سے وہ محبت کرتے تھے، جسے دل میں اپنی شریک زندگی منتخب کر چکے تھے وہی دوسرے کی چھاتی سے لگی کھڑی تھی۔ اسے وہ حاصل کر سکتے تھے تو صرف لڑکر اور دشمن کو مار کر۔ اس کے سوا دوسری ترکیب ان کے پاس نہ تھی۔ لیکن ایسے نازک وقت پر فطری انسانی ہمدردی نے ان کے غصہ پر غلبہ پا لیا تھا اور وہ فوراً اپنے سے ایک آدمی کی جان لینے کے عذاب سے محفوظ رہ گئے۔ انھوں نے اس کے لئے خدا کا شکر ادا کیا

ان کا دل نہ چاہا کہ وہ پھر واپس وزیریوں کے گاؤں میں جائیں۔ ان کے غمگین دل میں کسی انسان سے ملنے کی ذرا بھی خواہش باقی نہ رہی۔ انھوں نے سوچا کہ کچھ مدت تو ضرور دھوکے باز اور خود غرض لوگوں سے علیحدہ رہیں گے اور اپنے رنج و غم کے دن تنہا تنہائی میں بسر کریں گے۔

اُس روز رات کو وہ ایپ بندروں کے ڈرم کی جگہ پر سوئے اور اس کے بعد بھی چند روز وہیں رہے۔ دن کے وقت وہ جنگلوں میں شکار کرتے اور شب کو وہاں آکر آرام کرتے تھے تیسرے روز دن کے وقت وہ شکار سے جلد واپس آئے اور سبز سبز گھانس پر لیٹ کر طرح طرح کی باتیں سوچنے لگے۔ ناگہاں ان کے کانوں میں ایک پہچانی ہوئی آواز آئی۔ انہیں معلوم ہوا کہ ایپ بندروں کا ایک گروہ نزدیک ہی جنگل میں چل رہا ہے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ ایسی آواز کسی دوسری مخلوق کی نہیں ہو سکتی۔ تھوڑی دیر کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ ایپ بندروں کی وہ جماعت اسی جگہ آرہی ہے۔ جہاں وہ لیٹے ہوئے ہیں۔

انھوں نے اٹھ کر انگڑائی لی اور ادھر سے آواز کی طرف متوجہ ہوئے۔ آواز اُسی طرف سے آرہی تھی جدھر سے ہوا چل رہی تھی اور اب اُنکی ناک میں ہوا میں ملی ہوئی آنے والوں کی بو بھی آنے لگی تھی۔ وہ میدان سے گذر کر ان کے آنے کی سمت کی مخالف طرف ہٹ گئے اور ایک درخت پر پوشیدہ ہو کر اُن کا انتظار کرنے لگے۔

انہیں زیادہ دیر انتظار میں پریشان نہ ہونا پڑا چند منٹ کے بعد انہیں پتوں کے درمیان سے ایک سر دکھائی دیا۔ اُسکی تیز آنکھوں نے ایک ہی نظر میں سب دیکھ لیا جو دیکھنا تھا۔ اس نے اپنی زبان میں پیچھے آنے والوں کو کچھ آواز دی۔ ٹارزن سمجھ گئے۔ وہ اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا کہ "میدان صاف ہے چلے آؤ۔"

پہلے وہ بندر جو سب سے آگے تھا نیچے گھانس پر کود اس کے بعد اس کے تقریباً سو قد آور اور مضبوط ساتھی میدان میں اتر آئے ان کے ساتھ بہت سے کمسن ایپ بھی تھے اور بہت سے بچے اپنی

ماؤں کی چھاتیوں سے چپکے ہوئے تھے۔

ٹارزن نے ان میں سے بہتوں کو پہچان لیا - وہ اسی گروہ کے تھے جس میں انھوں نے لڑکپن میں پرورش پائی تھی۔ ایپ بندروں میں سے چند جو اس وقت بڑے ہو گئے تھے ان کے لڑکپن میں چھوٹے بچے تھے اور ان کے ساتھ کھیلا کودا کرتے تھے۔ انھوں نے سوچا کہ نہ معلوم دیکھنے کے بعد وہ انہیں پہچان سکیں گے یا نہیں۔ ایپ بندروں کو زیادہ دنوں تک بات یاد نہیں رہتی دو برس بھی ان کے لئے بڑی مدت کے برابر ہوتے ہیں۔

ان کی گفتگو سے انہیں معلوم ہوا کہ ان کا سردار درخت سے گر کر مر گیا ہے اور وہ وہاں آپس کی رائے سے نیا سردار منتخب کرنے آئے ہیں۔ ٹارزن اپنی پتوں کی پوشیدہ جگہ سے نکل کر نیچے کی ایک شاخ پر اُن کے سامنے آگئے۔ سب سے پہلے ایک بندری کی نظر اُن پر پڑی۔ گھبرائی ہوئی غرا کر اُس نے اپنے ساتھیوں کو اس طرف متوجہ کیا۔ چند بڑے بڑے ایپ بندر انہیں اچھی طرح دیکھنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور کئی گردن پھلا کر دانت نکالے خوفناک طرح سے غراتے ہوئے ان کی طرف بڑھے۔

ٹارزن نے اُن ہی کی زبان میں کہا۔ "کرتھ، میں جنگل کا بادشاہ ٹارزن ہوں۔ کیا مجھے پہچانتے نہیں ہو؟ تم اور میں دونوں مل کر اونچی شاخوں پر بیٹھ جاتے تھے اور نیچے شیر پر چھوٹی چھوٹی ڈالیاں اور گٹھلیاں پھینکا کرتے تھے۔ تمہیں یاد ہوگا۔"

جسے ٹارزن مخاطب کرکے بولے تھے وہ تعجب اور زردی کی نظر سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ انھوں نے پھر دوسرے کی طرف دیکھ کر کہا، اور تم میگور! کیا تم بھی اپنے پہلے سردار کو نہیں پہچانتے؟ دیکھو مجھے اچھی طرح یاد کرو۔ میں نے ہی لڑ کر طاقتور کرچک کو مارا تھا اور میں ہی زبردست جنگجو اور مشہور شکاری ٹارزن ہوں۔ کیا میں بہت دنوں تک تمہارے ساتھ نہیں رہ چکا ہوں!

یہ سنکر ایپ بندر آگے بڑھ آئے۔ ان کی صورتوں سے اب غصہ کے بدلے تعجب ظاہر ہو رہا تھا۔ انھوں نے آپس میں کچھ صلاح کی اور کرتھ نے پوچھا "اب تم ہمارے پاس کیوں آئے ہو؟"

ٹارزن نے جواب دیا "تمہارے ساتھ رہنے کے لئے"۔

ان سبھوں نے کچھ مشورہ کیا اور کرتھ نے کہا "تم ہمارے ساتھ رہ سکتے ہو، جنگل کے بادشاہ ٹارزن!"

ٹارزن نیچے کود کر ان خوفناک جانوروں کی طرف بڑھے۔ جب وہ نزدیک پہنچے تو ویسی ملاقات نہ ہوئی جیسی بہت دنوں کی علحدگی کے بعد دوستوں میں ہوا کرتی ہے۔ سب اپنے اپنے کام میں لگ گئے جیسے ان کا آنا بالکل معمولی بات ہو یا وہ اس گروہ کو چھوڑ کر کبھی کہیں گئے ہی نہ ہوں۔

دو میں کم عمر ایپ بندر جو انہیں نہیں جانتے تھے نزدیک آکر اُنہیں سونگھنے لگے اور ایک نے غرا کر اپنے دانت نکالے جیسے اُسے ان کا آنا ناپسند ہو اور وہ یہ جاننا چاہتا ہو کہ ان کا درجہ اس جماعت میں کیا رہے گا۔ اگر ٹارزن غرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ جاتے تو وہ خاموش ہو جاتا اور کچھ نہ بولتا، لیکن آئندہ اس جماعت کے افراد کے سامنے ٹارزن کا درجہ اس بندر سے ہمیشہ نیچا رہتا جس سے ڈر کر وہ ہٹ جاتے۔ وہ پیچھے نہیں ہٹے۔ انھوں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر ایک ایسا مکا اُس کی کھوپڑی پر رسید کیا کہ وہ لڑھک کر دور گھاس پر جا گرا۔ وہ فوراً اٹھا اور ٹارزن اور وہ دونوں پنجوں اور دانتوں سے ایک دوسرے کو نوچتے اور کاٹتے ہوئے آپس میں گتھ گئے۔ اگر اس جوان ایپ بندر کا ارادہ ٹارزن کو نیچا دکھانے یا لڑ کر ہزیمت دینے کا تھا تو وہ پورا نہ ہوا

دونوں کو لڑتے ہوئے دو منٹ بھی نہ ہوئے تھے کہ ٹارزن کی آہنی انگلیاں اپنے دشمن کی گردن پر پہنچ گئیں۔ آہستہ آہستہ اس کا جسم بے حس و حرکت ہونے لگا، اس کا اُچھلنا کودنا بند ہو گیا اور وہ خاموش زمین پر پڑ گیا ٹارزن نے اپنا ہاتھ اُس کی گردن سے ہٹا لیا۔ وہ اُسے ہلاک کرنا نہ چاہتے تھے بلکہ اُسے اور اُس کے ان ساتھیوں کو جو لڑائی دیکھ رہے تھے یہ بتا دینا چاہتے تھے کہ اب بھی اُن میں کافی طاقت ہے اور وہ اُن سبھوں سے مضبوط ہیں۔

وہ جو چاہتے تھے وہی ہوا۔ اس واقعہ کے بعد کم عمر کے ایپ بندر پھر کبھی ان کے پاس نہ آئے اور زیادہ عمر والوں نے کبھی انکے اختیارات میں دست اندازی نہ کی۔ صرف بندریاں اُن سے جھجکتی تھیں اور وہ اگر کبھی نزدیک جاتے تھے تو دانت نکال کر ان کی طرف دوڑتی تھیں، اُس وقت ٹارزن پیچھے ہٹ کر الگ ہو جاتے تھے اور ان سے لڑتے نہ تھے۔ ایپ بندروں کا قاعدہ ہے کہ کوئی نر کبھی بندریوں پر حملہ نہیں کرتا۔ اگر کرتا ہے تو وہی جو دیوانہ ہو جاتا ہے یا اپنی جان سے ہاتھ دھو چکا ہوتا ہے۔

ٹارزن اپنے نئے ساتھیوں کے ساتھ پھر اُسی طرح گھومنے پھرنے اور شکار کرنے لگے، جس طرح پہلے اپنے سردار رہنے کے وقت کیا کرتے تھے۔ وہ اُن کو ایسے مقامات پر لے جاتے تھے جہاں کھانے کی چیزیں کثرت سے ملتی اور آسانی سے دستیاب ہو جاتی تھیں۔ اپنی رسیوں سے پکڑ کر جنگلی جانوروں کا شکار کر کے ایسی ایسی غذائیں بہم پہنچاتے تھے جو اُن کو بڑی مشکل سے کبھی کبھی ہی ملتی تھیں ان باتوں کی وجہ سے رفتہ رفتہ اُن کے ساتھی پھر انہیں اُسی نظر سے دیکھنے لگے جس نظر سے پہلے دیکھا کرتے تھے۔ تقریباً دس روز کے بعد جب ایپ بندروں کی اس جماعت نے دَنْدَم کا میدان چھوڑا تو ٹارزن ان کے منتخب شدہ سردار تھے۔

ٹارزن اپنی اس زندگی سے پوری طرح مطمئن تھے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ خوش بھی تھے۔ حقیقی مسرت سے وہ کبھی بہرہ مند ہوں گے۔ اس کی امید انھوں نے چھوڑ دی تھی مطمئن تھے اس کا یہ مطلب ہے کہ وہاں کوئی چیز ایسی نہ تھی جو انہیں ان کی گذشتہ زندگی کی یاد دلاتی اور انہیں پھر رنجیدہ کرتی۔ انھوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ نہ تو حبشیوں ہی کا کبھی منہ دیکھیں گے۔ انھوں نے انسان سے سدا کے لئے رشتہ توڑ دیا تھا۔ ایپ بندر بنکر انھوں نے زندگی شروع کی تھی اور ایپ بندر ہی بنکر وہ زندگی کا خاتمہ بھی کر دیں گے۔ یہ ان کا ارادہ تھا۔

وہ اپنے دل کو سخت کرنے اور گذشتہ باتوں کو بھول جانے کی بہت کوشش کیا کرتے تھے لیکن انہیں یہ بات ہمیشہ یاد رہتی تھی کہ وہ دوشیزہ جس سے انہیں محبت ہے ان کے رہنے کی جگہ سے تھوڑی ہی دور پر ہے۔ نہ معلوم وہ کس حالت میں ہو گی اور کیسی مصیبت اُس پر آ رہی ہو گی، اس کا خیال انہیں ہمیشہ ستایا کرتا تھا۔ کلیٹن اُس کی حفاظت نہیں کر سکتے تھے، یہ انھوں نے اس وقت دیکھ لیا تھا جب انھوں نے ان کی جان بچائی تھی۔ پھر کیوں انھوں نے غصہ ہو کر اُسے آفت میں ڈالا۔ کیوں نہ اُس کے پاس رہ گئے کہ وقت پر اس کی مدد کر سکتے! اُن کا دل ہمیشہ انہیں اسکے لئے ملامت کرتا تھا۔

جیسے جیسے دن گذرتے گئے ٹارزن زیادہ فکرمند اور غمگین ہوتے گئے۔ بالآخر اپنے دل سے مجبور ہو کر انھوں نے یہ سوچا کہ چل کر کلیٹن اور جین پورٹر کے نزدیک ہی کہیں رہیں اور ان دونوں کی حفاظت کیا کریں۔ وہ جانے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ انہیں ایک ایسی خبر ملی جس سے وہ بہت گھبرا گئے۔ انہیں فوراً یورپ کی طرف روانہ ہو جانا پڑا۔

ٹارزن کے سردار منتخب ہونے کے پہلے ایک ایپ بندر جسے اپنی جماعت میں کوئی مادہ نہ ملی تھی۔ جنگل کی مختلف جماعتوں میں

اس کی تلاش کے لئے باہر گیا ہوا تھا۔ بہت دنوں کے بعد وہ ایک مادہ کی تلاش کر کے اُسے لئے ہوئے واپس اپنی جماعت میں آیا۔ اپنے سفر کا حال سناتے ہوئے اُس نے کہا "میں نے بہت حیرت انگیز چیزیں دیکھی ہیں۔ میں نے ایسے بندروں کا ایک ایسا گروہ دیکھا جس کے افراد کے سروں پر بڑے بڑے بال تھے اور ان کے ساتھ ایک ایسی بندری تھی جس کے جسم کا رنگ بالکل سفید اس اجنبی سے بھی زیادہ صاف تھا۔ یہ کہہ کر اُس نے ٹارزن کی طرف انگلی اٹھائی۔

ٹارزن یکایک چونک اُٹھے۔ انھوں نے تعجب سے پوچھا "کیا ان بندروں کی ٹانگیں چھوٹی چھوٹی اور ٹیڑھی تھیں"؟

اُس نے جواب دیا "ہاں"!

"کیا وہ شیر کی کھالیں اپنی کمروں میں لپیٹے اور اُن میں چاقو لٹکائے ہوئے تھے"؟

"ہاں"!

"اور وہ بندری کیا وہ بہت نازک، کمزور اور گورے رنگ کی تھی"؟

"ہاں"!

"وہ بندری آزاد اور ان ہی لوگوں کی قسم سے معلوم ہوتی تھی یا قید معلوم ہوتی تھی"؟

"وہ لوگ اُسے زبردستی ساتھ لئے جا رہے تھے۔ کبھی تو ہاتھ پکڑ کر کھینچتے تھے اور کبھی سر کے لمبے لمبے بال پکڑ کر گھسیٹتے تھے۔ وہ اُسے بہت مار پیٹ رہے تھے تاہم وہ بہت آہستہ آہستہ ہی چل رہی تھی"۔

ٹارزن نے اپنے دل میں کہا "خدایا! جین کس مصیبت میں پڑ گئی"

پھر انھوں نے دریافت کیا "تم نے ان لوگوں کو کہاں دیکھا تھا اور وہ کس راستے سے جا رہے تھے"؟

بندر نے جنوب کی طرف انگلی اُٹھا کر کہا "جب میں نے انھیں دیکھا تھا اُس وقت وہ اُدھر دوسری ندی کے نزدیک تھے۔ وہ ندی کے کنارے کنارے اُس جانب جا رہے تھے جس طرف آگ کا گولا نکلا کرتا ہے"۔

ٹارزن نے پوچھا "یہ کتنے دنوں کی بات ہے"؟

اُس نے کہا "اندازاً نصف ماہتاب گذر گیا"۔

پھر بغیر ایک لفظ بھی بولے ٹارزن اچھل کر ایک درخت پر چڑھ گئے اور بڑی تیزی سے مشرق کی طرف اُڑ کر شہر کی جانب روانہ ہوئے۔

(باقی آئندہ)

ڈھول کا پول

از جناب خواجہ عنایت اللہ صاحب

خیراتی ہسپتال۔ ڈاکٹر، نرسیں اور ملازم سب مشغول نظر آتے ہیں۔ ہسپتال کی پوری فضا خاموشی اور مستعدی کے ساتھ کام میں مشغول ہے۔

ہسپتال کا نئے مریضوں کے دیکھنے والا کمرہ غریب بیماروں سے بھرا ہوا ہے۔ گھنٹوں سے غریب بیمار ڈاکٹر کا انتظار کرتے کرتے تھک کر مایوس ہو چلے تھے کہ ڈاکٹر صاحب بہت مشغولیت ظاہر کرتے ہوئے کمرہ میں داخل ہو کر اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ اُن کے پہنچتے ہی مریض اپنی اپنی جگہ سے کراہتے ہوئے اُٹھے۔

ایک بیمار کا ایک نوجوان رشتہ دار۔ "جناب ڈاکٹر کیا دس بجے ہیں"؟

ڈاکٹر:۔ "ہاں"۔

نوجوان:۔ ہم لوگ صبح سات بجے سے یہاں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ کے یہاں تشریف لانے کا شاید ٹھیک وقت دس ہے۔

ڈاکٹر:۔ آپ کی بڑی مہربانی۔ مگر آپ ہم لوگوں پر اس سے بھی ایک بڑی مہربانی کر سکتے ہیں یعنی یہاں تشریف لانے کی تکلیف ہی نہ کیا کریں۔

نوجوان:۔ مگر جناب یہ تو ہسپتال ہے اور غالباً ہمارے جیسے غریبوں ہی کے نام پر بنایا گیا ہے۔

ڈاکٹر:۔ ہاں۔ مگر اُن غریبوں کے لیے جو صبر سے بیٹھ کر انتظار کرنے کی تکلیف اُٹھا سکیں۔

نوجوان:۔ ٹھیک ہے۔ امیروں نے غریب کی مجبوری کا نام صبر ہی تو رکھ لیا ہے۔

ڈاکٹر:۔ یہ جگہ غربت اور امارت کے فلسفہ پر بحث کرنے کی نہیں ہے۔ جائیے اپنا رستہ دیکھئے (مریضوں کی طرف دیکھتے ہوئے) چلو آگے آؤ۔

ایک مریض:۔ (آگے بڑھ کر) پیٹ میں سخت درد ہے حضور۔

دوسرا مریض:۔ (بہت لاغر و کمزور) حضور مجھے ہر روز بخار آتا ہے اور دست ہوتے ہیں۔

تیسرا مریض:۔ حضور دن پر دن کمزور ہوتا جا رہا ہوں۔ ہر وقت سر چکراتا رہتا ہے۔ جب کھڑا ہوتا ہوں تو ایسا معلوم....

ڈاکٹر:۔ بکواس بند کرو۔ میں سب کچھ سمجھ گیا۔

ڈاکٹر کی تحکمانہ گرج سے غریب مریض سہم کر چپ ہو گئے اور ڈاکٹر نے تینوں مریضوں پر بیک وقت ایک سرسری نگاہ ڈالی اور تین پرچیاں گھسیٹ کر پھینک دیں جن کو اُٹھا کر

یب اُس کوٹھڑی کی طرف لپکے جہاں وہ قیمتی دوائیں جو صاحب نے اپنی محنت اور دماغ سوزی سے ان کے لئے ئی تھیں ملا کرتی ہیں۔

ان :۔ (اپنے بیمار رشتہ دار سے) اب آپ بھی آگے بڑھئے۔ کافی انتظار کر چکے ہیں۔ اور ڈاکٹر صاحب کو اب فرصت ہو ہی گئی ہے۔

یض :۔ (آگے بڑھ کر) جناب ڈاکٹر صاحب، جب بھی مجھے م ہوتا ہے تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا دم گھٹا جا رہا حکیموں نے اس کو دمہ کا آغاز ۔۔۔۔۔۔

کٹر :۔ جہنم میں جاؤ تم اور تمہارے حکیم۔ جبکہ شہر میں اتنے حکیم ر وپیہ مارے مارے پھرتے ہیں تو پھر تم لوگ کیوں ناحق یہاں ر ہمارا مغز چاٹتے ہو۔ اگر حکیم حکیم ہی بکنا ہے تو جاؤ کسی یم ہی کے دروازہ پر جا کر مرو۔

یض :۔ نہیں حضور میں بہت دور دیہات سے صرف پ سے ہی علاج کرانے کو آیا ہوں۔ مہربانی فرما کر میرا علاج رسے فرمائیں۔

ڈاکٹر نے بغیر کچھ جواب دئے ایک پرچہ پر کچھ جلدی سے گھسیٹ کر پرچہ اُس کے حوالے کر دیا۔

ریض :۔ (ڈرتے ڈرتے) کیا حضور میری نبض اور پھیپھڑوں معائنہ نہ کریں گے۔

اکٹر :۔ بیوقوف! اگر تم اپنا علاج پوری طرح سے معائنہ رانے کے بعد ہی کرانا چاہتے ہو تو کسی ڈاکٹر کو گھر پر بلاؤ۔ یوں یں نے سب کچھ دیکھ ہی لیا ہے۔

مریض کا نوجوان رشتہ دار نزدیک ہی کھڑا سب باتیں ن رہا تھا۔ اُس سے نہ رہا گیا اور وہ بولا۔

نوجوان :۔ آنکھوں سے تو نہیں۔ غالباً کانوں سے دیکھا ہوگا۔ (مریض کی طرف متوجہ ہو کر) بیوقوف آدمی کیا تم یہ نہیں جانتے کہ ہسپتال دراصل غریبوں کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ اُن بڑے بڑے سرکاری عہدہ داروں کے لئے ہے جو ڈاکٹر کی فیس اور دوائی کی قیمت دے تو ضرور سکتے ہیں مگر دینا نہیں چاہتے۔ یا اُن لوگوں کے لئے ہے جو کم از کم ہسپتال کے ڈاکٹروں کو گھر پر بلا کر فیس کی شکل میں کچھ رشوت دے سکتے ہیں۔

ڈاکٹر :۔ نکل جاؤ یہاں سے۔ تم کون ہو۔

نوجوان :۔ ڈاکٹر صاحب! مجھے یقین ہے کہ یہ مکان آپ کی ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ اس لئے اگر میں یہاں اور چند منٹ ٹھیرنے کا ارادہ رکھتا ہوں تو میرا خیال ہے کہ میں غلطی نہیں کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر :۔ (غصہ سے لال پیلے ہو کر) چپراسی! چپراسی! اسکو باہر نکال دو۔

نوجوان :۔ برائے مہربانی۔ چپراسی کے ذریعہ یا آپ خود ایسا کرنے کی تکلیف گوارا نہ فرمائیں۔ آپکو یاد رکھنا چاہئے کہ میں مریض نہیں ہوں بلکہ صرف ایک مریض کا رشتہ دار ہوں۔ اپنے اور اپنے چپراسی کی جسمانی طاقت کو ملاحظہ فرمانے کے بعد ذرا میرے ہاتھ پاؤں پر ایک نظر ڈال لیجئے۔ تب آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ میں اتنی آسانی سے پٹنے والا نہیں ہوں۔

یہ جملہ کہتے ہوئے اُس نوجوان نے ڈاکٹر کو حقارت کی نظر سے دیکھا اور اپنے بیمار رشتہ دار کو ساتھ لیکر ہنستا ہوا کمرہ سے باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر چند لمحہ تک خاموش رہا۔ شاید اُس کا ضمیر کھری کھری سننے کے بعد اسپر ملامت کر رہا تھا۔ مگر وہ

بہت جلد غریبوں کے ساتھ اس سلوک کو جائز ثابت کرنے میں کامیاب ہو گیا اور ذرا زور سے بولا :۔

" بدمعاش " !

دوسرا سین

وہی ہسپتال ـــــ زنانہ وارڈ

بیماروں کے بستر کچھ خلاف معمول تبدیل کئے جا رہے ہیں ۔ تقریباً تمام ملازمین صفائی میں مشغول ہیں دودھ پلانے والی بوتلیں ۔ گلاس شیشے وغیرہ تمام چیزیں سلیقہ سے ہر مریض کے سرہانے رکھی جا رہی ہے ۔

مریضہ ۱ :۔ (چھوٹی لڑکی) نزدیک والی بیمار سے مخاطب ہو کر " بہن آج یہ سب کیا ہو رہا ہے " ؟

مریضہ ۲ :۔ وہ آ رہے ہیں ۔

مریضہ ۱ :۔ وہ کون ؟

مریضہ ۲ :۔ تعجب ہے کہ تم اتنا بھی نہیں جانتیں ۔

مریضہ ۱ :۔ میں واقعی نہیں جانتی ۔ تم تو دیکھتی ہی ہو کہ میں چارپائی سے اُٹھ کر کہیں جا نہیں سکتی ۔ بلکہ اُٹھ کر بیٹھنا بھی میرے لئے سخت مشکل ہے ۔

مریضہ ۲ :۔ تو سن ۔ وزیر صاحب آ رہے ہیں ۔

مریضہ ۱ :۔ کس لئے ؟

مریضہ ۲ :۔ ہسپتال کا معاینہ کرنے کو ۔ اور یہ دیکھنے کو کہ ہم لوگ یہاں کس طرح سے دن گذار رہے ہیں ۔ اور ہمیں کیا کیا تکلیفیں ہیں ۔

مریضہ ۱ :۔ خدا اُن کا بھلا کرے ۔ وہ تو بہت اچھے آدمی معلوم ہوتے ہیں ۔ بہن جب وہ تشریف لائیں تو انکو میری طرف سے اپنی طرف سے اور اُن چھوٹے بچوں کی طرف سے عرض کرنا کہ وہ نرسوں اور ڈاکٹرنی صاحبہ کو ذرا مہربان رہنے کی ہدایت کرتے جائیں ۔ ڈاکٹرنی صاحبہ اتنی بے رُخی سے مجھے سزا نہ دیا کریں ' اور نرسیں بھی ہر معمولی بات پر مجھے طمانچہ نہ ماریں ۔ بہن ! میں اتنی کمزور ہوں کہ میں اپنی چارپائی سے ہل بھی نہیں سکتی ۔ اور ان لوگوں کا یہ حال ہے ۔ اس کے علاوہ وہ اُن غریب چھوٹے چھوٹے بچوں کو نہ مارا کریں ۔ وہ تو بھوک کی وجہ سے روتے ہیں ۔ اس میں ان کا کیا قصور ہے ۔

مریضہ ۱ :۔ مگر کیا وہ اتنی لمبی رام کہانی سنیں گے ۔

مریضہ ۱ :۔ کیا نہیں سنیں گے تو پھر آ کیوں رہے ہیں ۔

مریضہ ۲ :۔ غریب لڑکی مجھے تعجب ہے کہ تم اتنی ناسمجھ ہو ۔ ارے پگلی وہ تو آتے ہیں اپنے دکھاوے کے کاموں کی خوشامدانہ تعریفیں سننے کے لئے ۔ جب وہ آنے والے ہوتے ہیں تو سب کچھ بدل جاتا ہے ۔ اصلیت پر ظاہرداری کا پردہ ڈال دیا جاتا ہے ۔ پورے ہسپتال کا چولا بدل جاتا ہے ۔ ہر جگہ صفائی ستھرائی نظر آتی ہے ۔ بات بات پر بگڑنے والے ڈاکٹر ' رحم و کرم کے پتلے بن جاتے ہیں ۔ پتھر کا دل رکھنے والی نرسیں یکایک معصوم صفت نظر آنے لگتی ہیں ۔

مریضہ ۳ :۔ دیکھو نا بہن ۔ مجھے گذشتہ دو دن سے کوئی دوائی نہیں دی گئی اور تم جانتی ہو کہ کل رات مجھے دودھ بھیجوانا بھی بھول گئے ۔

مریضہ ۴ :۔ اور میرا زخم کئی روز سے نہیں دھویا گیا اسلئے مجھے سخت درد ہو رہا ہے ۔

مریضہ ۲ :۔ آجکل ہسپتال کے تمام ملازمین نمائش میں اس قدر مشغول ہیں کہ ان میں سے کسی کو بھی اپنا فرض پورا

نمایش میں اس قدر مشغول ہیں کہ ان میں سے کسی کو بھی اپنا فرض پورا کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔

بسکٹ اور پھل جو کل بڑے بھائی صاحب دے گئے تھے۔ کل دن بھر چارپائی کے نیچے کھلے پڑے رہے اور برباد ہو گئے۔ کیونکہ میرے نعمت خانہ کو صاف کرنے کے لئے اسکو اٹھوا کرلے جا چکے ہیں

یکایک مریضوں کی سرگوشیاں بند ہو گئیں۔ کیونکہ ایک نرس اور ہسپتال کا ایک ملازم اس کمرہ میں داخل ہوا۔ اور ایک مریضہ کی طرف مخاطب ہو کر نرس نے حکم دیا۔

نرس :۔ اپنے بستر پر سے اتر جاؤ۔

مریضہ :۔ اتر جاؤں۔ کیوں؟

نرس :۔ (چیخ کر) کیوں؟ تم کو یہ کیوں پوچھنے کی کیسے جرأت ہوئی۔ اتر جاؤ۔ ورنہ کمرے سے نہیں بلکہ ہسپتال سے باہر نکل جانے کا حکم دیدونگی۔

اس نادرشاہی حکم نے غریب مریضہ کی زبان بند کردی اور وہ بمشکل تمام بستر کو چھوڑ کر فرش پر آگئی۔ اور نرس کے ہمراہ آنیوالے ملازموں نے بستر کی چادر اٹھالی۔ اور اسی طرح یکے بعد دیگرے ہر مریض سے اسکی چارپائی خالی کراکر اس کا بستر اٹھایا جانے لگا۔ یہاں تک کہ وہ ملازم مریضہ کے پاس پہنچ گیا۔ جو ایک نوجوان بیمار لڑکی تھی جس کا چہرہ بیماری اور مفلسی سے مرجھائے ہوئے گلاب کے پھول کی مانند تھا۔

ملازم :۔ جلدی کرو بہت دیر ہو رہی ہے۔

مریضہ :۔ برائے خدا مجھے چھوڑ دو۔ میں نہیں اٹھ سکتی

ملازم :۔ (بلند آواز سے) مس صاحبہ یہ نہیں اٹھتی۔

نرس :۔ (کمرے کے دوسرے کونے سے) نہیں اٹھتی تو اسکو نیچے پھینک دو۔ اور اپنا کام کرو۔

نوکر :۔ (مریضہ کی طرف دیکھتے ہوئے) شائد تم نے سن لیا ہوگا۔ یہ کہہ کر اس نے مریضہ کو زبردستی پلنگ سے اٹھانا چاہا

مریضہ :۔ (بلند آواز سے نرس کو مخاطب کرتے ہوئے) جناب مس صاحبہ برائے خدا مجھ پر رحم کیجئے اور مجھے میری حالت پر چھوڑ دیجئے۔ کیونکہ حرکت سے مجھے بہت سخت تکلیف ہوتی ہے۔ آپکو تو معلوم ہے کہ میں کروٹ بھی نہیں بدل سکتی۔ علاوہ ازیں چادر اٹھا لینے کے بعد بستر بہت گندہ اور سخت رہ جاتا ہے۔ میرے زخم کو گندگی نقصان پہنچائیگی۔

نرس :۔ (ملازم کو مخاطب کرتے ہوئے) اسکو نیچے پھینک دو۔ اور چادر اکٹھی کرکے جلد لے جاؤ۔ ایسی فضول باتیں سننے کیلئے ہم لوگوں کے پاس وقت نہیں ہے۔

مریضہ :۔ (درد سے کراہتے ہوئے) بھیڑ کا لباس پہنے ہوئے بھیڑیو۔ اس طرح تڑپا تڑپا کر جان لینے سے تو بہتر ہے کہ ایک ہی مہلک وار میں میرا قصہ تمام کردو۔ تاکہ میں ہر روز کئی بار جانکنی کے عذاب سے نجات پاؤں۔ میں غریب ہوں۔ میرے متعلق تم سے کوئی سوال نہیں کریگا۔

عادی مجرموں کی طرح ہسپتال کے ملازمین کے ضمیروں پر کم از کم غریب بیماروں کی کسی سخت سے سخت تکلیف کا کچھ بھی اثر نہیں پڑتا۔ بیچاری مریضہ اپنے زخم کی وجہ سے ابھی ٹھیک طرح سے چارپائی سے اٹھنے بھی نہ پائی تھی اور ایک ہاتھ جس کے سہارے وہ اٹھنے کی کوشش کررہی تھی۔ ابھی بستر ہی پر تھا کہ ملازم نے ایک جھٹکے کے ساتھ بستر کی چادر کھینچ لی۔ جس کا لازمی نتیجہ مریضہ کا منہ کے بل گرنا ہی تھا۔ بیچاری نے متعدد بار اپنے زخم کو بچانے کی کوشش کی مگر لاغر بدن اور ٹوٹے ہوئے دل نے کوشش کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ چوٹ کے صدمے

سے بیماری کے زخم سے خون بہنے لگا۔ مریضہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُس نے آسمان کی طرف نگاہ کی اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر پھر اپنی چارپائی پر بیٹھ کر قسمت کو رونے لگی۔

جب اُس کمرے کی سب چادریں اکٹھی ہو گئیں تو وہ ملازم اور نرس صاحبہ اِس غریب کے زخم سے خون بہتا ہوا دیکھتے ہوئے بھی دوسرے کمروں کو چل دئے۔

مریضہ نمبر ۲ :۔ بہن مت رو۔ پتھر کے دلوں پر تمہارے نرم و نازک آنسو تھیدید نہیں کر سکتے۔ اِن آنکھوں میں آنسوؤں کی بجائے آگ پیدا کرو۔

مریضہ نمبر ۱ :۔ (ہچکیاں لیتے ہوئے) میرے وجود ہی میں آگ کا نام و نشان باقی نہیں رہا۔ میرے بدن کی سب حرارت آنسوؤں کے ٹھنڈے طوفان نے سرد کر دی ہے۔

مریضہ نمبر ۲ :۔ بہن! کیا تو نہیں جانتی کہ سمندر کی تہ میں بھی آگ موجود ہوتی ہے۔ صرف استقلال اور پختہ ارادے کی ضرورت ہے۔ تمہارے ان بہنے والے آنسوؤں میں سے ایک نہ ایک دن آگ کے ایسے غضبناک شعلے نکلنے والے ہیں جو ملک سے ایسے ٹوٹی ہوئی دیواروں پر سفیدی کا پچارا کرنے والوں کی ہستیوں کو جلا کر فنا کر دیں گے۔ اِس لئے اِن آنسوؤں کو ابھی اندر ہی رہنے دو۔ تاکہ جب یہ باہر نکلیں تو آگ کے شعلے اور بجلی کی تڑپ لے کر نکلیں۔

تیسرا سین

سب چیزیں صاف تھیں۔ کمرے چونے سے۔ بستر دھلی ہوئی چادروں سے اور راستے خوشنما گلدستوں سے آراستہ تھے۔

ڈاکٹروں کے چہروں پر فرشتوں کی سی معصومیت اور نرسوں کے لباس اور برتاؤ سے حوروں کی سی نرمی ٹپک رہی تھی۔ تمام مریضوں کو حکم دیدیا گیا تھا کہ وہ سب اپنے اپنے چہرے کو بشاش بنا کر رکھیں۔ وزیر صاحب کی خوبصورت موٹر خوشنما پھولوں اور رنگ برنگ کے غندوں سے سجے ہوئے پھاٹک کے سامنے رکی۔ باوردی باجے والوں کی ایک لمبی قطار نے ترانۂ خوش آمدید بجایا۔ اور آنریبل وزیر استقبال کرنے والوں کے جھرمٹ میں ہسپتال کے معائنے کو چلے۔

وزیر :۔ (مجسٹریٹ کی طرف متوجہ ہو کر) مریضوں کی یہاں اچھی دیکھ بھال ہوتی ہو گی؟

مجسٹریٹ :۔ جی ہاں۔

وزیر :۔ (ایک بیمار کی طرف متوجہ ہو کر) اے نوجوان تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں؟

ڈاکٹر نے اپنا کان مریض کے منہ کے اتنا نزدیک کر دیا کہ اس کا منہ قریباً بند ہو گیا۔ مریض نے کچھ بولنے کی بے حاصل کوشش کی۔ گرچہ اُس کا ارادہ سچ بول کر اس ڈھول کا پول کھولنے کا تھا مگر چاروں طرف سے بڑے بڑے لوگوں کی آنکھوں سے نکلنے والے شعلوں نے اس غریب کے ارادہ کو بھسم کر دیا اور خدا جانے وہ کیا کہہ گیا۔ جس کو وزیر صاحب تو کیا خود ڈاکٹر صاحب بھی نہ سمجھ سکے مگر ڈاکٹر صاحب بولے:۔ "حضور یہ کہتا ہے کہ ہمیں کوئی تکلیف نہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ آپ کی رحمدلی کا شکریہ بھی ادا کرتا ہے کہ حضور نے بیکس اور غریب بیماروں کی دیکھ بھال کی زحمت گوارا فرمائی۔"

وزیر :۔ (مسکراتے ہوئے) نہیں نہیں۔ اسکی کوئی ضرورت نہیں۔ میرا تو یہی فرض ہے۔

اچھا اب مجھے تسلی ہوگئی کہ یہ لوگ نہایت خوش ہیں۔ چلیئے ذرا زنانہ وارڈ بھی دیکھا جائے"۔

سب لوگ زنانے وارڈ میں داخل ہوئے۔

اسوقت پورا وارڈ جنت ارضی کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ کچھ تازے اور خوبصورت پھل اور پھول ہر مریضہ کے سرہانے رکھے ہوئے تھے۔ ہر چیز اپنی جگہ سلیقہ سے رکھی ہوئی ملازمین کی صلاحیت اور فرض شناسی کا اظہار کر رہی تھی۔

وزیر:۔ (مریضہ ملا سے) کیا تم ان پھلوں کو پسند کرتی ہو۔

مریضہ ملا:۔ بہت مگر۔۔۔۔۔ اُسکی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور وہ آگے کچھ نہ بول سکی۔

وزیر:۔ (ڈاکٹر کی طرف متوجہ ہوکر) ڈاکٹر صاحب یہ کیوں روتی ہے۔

ڈاکٹر:۔ (اپنے کان مریضہ کے منھ سے لگاکر) حضور یہ شکریہ اور خوشی کے آنسو ہیں۔ یہ کہتی ہے کہ حضور اتنے مہربان ہیں جس کا شکریہ ادا کرنے کیلئے میرے پاس الفاظ نہیں۔

ملا:۔ (سفید جھوٹ کی قلعی کھولنے کا مصمم ارادہ کرتے ہوئے) جناب عالی۔۔۔۔۔۔

وزیر:۔ (مریضہ کی بات کاٹتے ہوئے) نہیں نہیں شکریہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے تو تمہارے جیسے دکھی عزیزوں کی اس سے بھی زیادہ دیکھ بھال کرنی چاہئے۔

یہ کہتے ہوئے وزیر صاحب آگے بڑھ گئے۔ لڑکی کے دل کے ارمان دل ہی میں رہ گئے، اور ناامیدی اور کس پرسی نے اُسے پھوٹ پھوٹ کر رلا دیا۔ مگر اس کی ہچکیوں کی آواز بجتے ہوئے گیٹ کے نیچے بجنے والے بینڈ کی آواز میں دب کر رہ گئی۔

"جمنا"

از جناب سیّد منیر حیدر صاحب رضوی

بہت دن ہوئے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کل ہی کی بات ہے۔ کہتے ہیں کہ ساحلِ سوتن کے تپتے ہوئے رتیلے ذرات پر دو بچے نہ دولہا دولہن کا کھیل کھیلا کرتے تھے۔ دونوں الگ الگ ہوتیں کوئی اُسے دولہا کہتا اور کوئی دلہن۔ یہاں تک کہ شام کی دنیا پر چھا جاتی اور وہ دونوں بچے بغیر کسی نتیجہ کے اپنے اپنے واپس چلے جاتے ——

یہ فطرت کا ایک استعارہ تھا۔ مجاز کی تاریکیوں سے ڈھکی ایک حقیقت تھی جسے دیکھنے والوں نے دیکھا۔ لیکن نہ کوئی سمجھا کسی نے سمجھنے کی ضرورت سمجھی —— ؟ لیکن قدرت ایک والی داستان پر مسکرا رہی تھی ——

بچپن کا زمانہ کھیل ہی کھیل میں گذر گیا، اُس کے بعد وہ زمانہ اس کے گذرنے میں وقت ہی کتنا صرف ہوتا ہے۔ "جمنا" "پریم" نے بچپن سے گذر کر جوانی کی کروٹ بدلی بھولی آنکھوں میں حیا آئی۔ "تمیز" کی آنکھوں سے "جمنا" اور "پریم" نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ نیز معاشرتی قوانین کی حد بندیاں بننے نظر آئیں۔ "جمنا" گھر میں رہنے لگی اور "پریم" اسکول داخل ہو گیا۔ یہ دونوں اب بھی ملتے تھے، لیکن پہلی جیسی بات نہ تھی ——

دن اسی طرح گذرتے گئے۔ ایک دن شام کو "پریم" سر جھکائے کچھ سوچ رہا تھا کہ ایک بھونرا اُس کے سامنے منڈرا اور کسی پھول کی تلاش میں سارے باغ کو چھان ڈالا۔ رنگ برنگ کے پھول چمن میں کھلے تھے، مگر وہ کسی پھول پر نہ بیٹھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ بھونرا کی خواہش کیا تھی۔ وہ کون سے پھول کی تلاش میں تھا۔ شاید وہ اُسی پھول کی تلاش میں تھا جسے گلچیں نے زر کی لالچ میں کسی دولت مند کے ہار میں گوندھ دیا تھا۔ بھونرے کے سینہ میں بھی ایک ننھا سا دھڑکتا ہوا دل تھا۔ وہ ناکامیاب و نامراد باغ میں بھٹکتا پھرا۔ "پریم" نے بھی یہ تماشا دیکھا۔ کچھ سوچا اور آگے چلا بھونرے کی تلاش میں۔ اس نے دیکھا کہ وہ بھونرا صحنِ باغ سے نکل کر ایک ویرانہ میں اپنی ننھی سی جان اس کھو جانے والے پھول پر قربان کر چکا تھا۔ "پریم" بھونرے کی محبت کے خیال میں محو تھا کہ کسی کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

جمنا —— کیا کر رہے ہو "پریم"

پریم —— ایک لاوارث کی میّت ہے "جمنا" —— میں چاہتا ہوں کہ پھولوں تک اُس کی بیکسی کی موت کی خبر پہنچا دوں اور اُس کے جسم کو تہ خاک کر دوں۔

جمنا —— کیوں "پریم" یہ غریب بھونرا کیسے مر گیا؟

پریم —— اسے نہ پوچھو "جمنا"! تمہارا دل بہت نازک ہے اور اس کا افسانہ بہت درد ناک۔ جانے دو ان باتوں کو۔ کہو کیسی ہو۔ بہت دنوں کے بعد آج تمہارے درشن ہوئے کہو تمہیں بچپن کا زمانہ بھی کچھ یاد ہے۔

جمنا —— واہ! مجھے اور بچپن کا زمانہ یاد نہ ہو کل کی تو بات ہے۔ اب بھی وہی کھیل کھیلتی ہوں۔ دولہا دلہن اب بھی

بناتی ہوں لیکن صرف خیالی تصویر میں۔

پریم ——— مجھے ایک بات کا بہت دُکھ ہوتا ہے "جمنا" جب میں کبھی تنہائی میں یہ سوچتا ہوں کہ نہ معلوم تم مجھسے ہمیشہ ایسا ہی پریم کرو گی یا نہیں۔ "جمنا" مجھ سے کہیں چھین تو نہیں لی جائے گی۔

جمنا ——— نہیں "پریم" ایسا کبھی نہیں ہو سکتا میں نے تمہیں محبت کے لئے چُن لیا ہے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں تمہاری ہو کر رہونگی۔ ہاں "پریم" میں یہ کہنا بھول گئی تھی کہ کل میری چچی مجھے ہمیشہ گھر میں رہنے کو کہہ رہی تھیں۔ اب میں تمہارے ساتھ کہیں باہر گھومنے نہیں جاسکتی، بلکہ اب تمہاری ملاقات بھی مشکل ہے۔ لیکن "پریم" جب تک ہم لوگ زندہ ہیں ہمیں کوئی دوسری طاقت ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کرسکتی۔ میں تمہیں کسی بہانے سے بلاتی رہونگی۔ اچھا اب جاتی ہوں۔ شام ہونے کو آئی گھر والے میرا انتظار کر رہے ہونگے۔ پھر ملنے کی کوشش کرونگی۔

پریم ——— "جمنا" یاد رکھنا، میری محبت بہت زیادہ گہری اور پائدار ہوگی۔

دن بیت گئے۔ "پریم" کا بوڑھا باپ دل کی حرکت رُک جانے سے ابدی نیند سو گیا۔ ایک بوڑھی ماں تھی جو جوان بیٹے کے سہارے پر جی رہی تھی۔ گھر میں فاقہ کی نوبت آئی۔ فاقہ جس کی آسان ترکیب مزدوری ہے۔ "پریم" نے بھی اُسی عمل کی پیروی کی اس کا تعلیمی سلسلہ ختم ہوگیا۔ اور اس نے ایک کمپنی میں ملازمت اختیار کرلی۔ "پریم" دن بھر کی محنت کے بعد گھر چلا جا رہا تھا۔ "جمنا" کے مکان کے پاس پہنچا تو کچھ باجے کی آواز سُنائی دی۔ تھما اور دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ "جمنا" کی پرسوں شادی ہے۔ برات بھرت پور سے آئے گی۔ دولہا وہاں کے ایک بڑے جاگیردار کا لڑکا ہے۔ اور مغربی تعلیم یافتہ بھی۔ نام "کرشن" ہے۔

یہ سُنتے ہی "پریم" کے دل پر ایک بجلی سی گری۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے ٹھٹھک گیا۔ پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر کچھ سوچتا ہوا اپنے مکان میں پہنچا۔ دکھیاری ماں اپنے چاند کا انتظار کر رہی تھی۔ ماں نے کھانے کو کہا لیکن "پریم" درد کا بہانہ کر کے ایک کمرے میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ جذبات سے نڈھال ہو رہا تھا۔ آپ سے آپ کہنے لگا "کیوں جمنا! وہ وعدہ کیا ہوا۔ بس یہی تھی تمہاری محبت۔ ایسا فریب! کسی کو اپنا بنا کر یوں بے وفائی کرنا۔ افسوس تم ایک غریب دل کی اصلی قیمت نہیں لگا سکیں "جمنا" کاش تمہارا دل غریب کا ہوتا تو تمہیں معلوم ہوتا کہ غریب کا دل کتنا نازک ہوتا ہے۔ لیکن تم نے سمجھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ کوئی برباد ہو جائے تو تمہیں اس سے کیا۔ تم تو خوش رہو گی۔ پرسوں شادی ہے۔ مگر نہیں اُس بیچاری کا کیا قصور ——— باپ کی مرضی کے سامنے وہ کیا کرسکتی تھی اُس سے کس طرح کہا جاتا کہ یہ منظور نہیں۔ اچھا تو میں اُس سے مل کر پُوچھ ہی کیوں نہ لوں ———"

ساون کی رُت تھی۔ کسی آنے والے سوگ میں فضا بھی سوگوار تھی۔ "جمنا" مسہری سے اُٹھی۔ الماری کی دراز سے ایک تصویر نکالی۔ یہ دھرم کی پابندیوں کی ایک تصویر تھی۔ سماج کی آہنی زنجیروں کی ایک تصویر۔ یہ تصویر تھی ہونے والے ناتھ کی جس کے نیچے لکھا تھا ——— "کرشن"

"جمنا" کی نظر تصویر پر تھی۔ دل نے کہا "یہ خوبصورت بھی ہیں۔ تعلیم یافتہ بھی اور لکھ پتی بھی ——— بھرت پور ——— اور کتنا سُندر شہر۔ اور یہ اُس شہر کے ایک بڑے تعلقہ کے ہونے والے مالک۔ لیکن یہ سب کچھ سہی۔ "پریم" جیسا ہمدرد تو ان کے پاس نہ "پریم" پریم ہی ہے۔ وہ غریب ہے لیکن دل کا دھنی ہے۔

دولت میں نہیں ملتی۔ غریب کی جھونپڑیوں میں اکثر ملتی ہے۔ تو کیا
میں "کرشن" کی بنکر بھی "پریم" سے محبت نہیں کر سکتی۔
ہاں کیوں نہیں کر سکتی۔ لیکن یہ پاپ تو ہوگا۔ سماج کیا کہیگی۔ دھرم
تو یہ نہیں سکھاتا۔ لیکن نہیں سماج کی مجھے پرواہ نہیں۔ اور "دھرم"
"سماج" کی طرح اندھا نہیں۔ محبت قید نہیں۔ میرا دل قید نہیں
بس یہی فیصلہ ہے اور آخری فیصلہ ——— ہاں "کرشن"
کی کہلاکر بھی "پریم" کی رہونگی۔

"جمنا" غم و اندوہ کی مجسم تصویر "جمنا" کسی کی آواز سے
چونکی۔ آنسوؤں سے اُبلتی ہوئی نظر اُٹھی اور پھر جھک گئی۔ "جمنا"
نے سر جھکا کر پوچھا "تم یہاں کہاں "پریم" اس اندھیری
رات میں۔

پریم ——— ہاں میں۔ تمہارا فریب خوردہ "پریم" ———
سنو! اور خوب غور سے سنو! مجھے جلد بھول جانے والی "جمنا"
میں یہاں صرف تمہیں یاد دلانے آیا ہوں کہ میں وہی "پریم" ہوں
جسے تم نے ایک مرتبہ نہیں بارہا چاندنی راتوں میں، اٹھلی ہوئی فضاؤں
برسات کی رُت میں۔ بادلوں کی گرج میں۔ بجلی کی چمک میں۔ تاریک
راتوں میں۔ باغ میں۔ پھولوں کی کیاریوں پر۔ سبز پتوں کی آڑ
میں۔ گھنی ڈالوں کے درمیان تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا "میں
تمہاری ہوکر رہونگی" کیونکر انکار کروگی "جمنا" ——— قدرت کے
مناظر تمہیں جھٹلا دینگے۔ میرا دل بہت دُکھتا ہے "جمنا" تمہیں
معلوم نہیں۔ لیکن قسم ہے ماں کی ممتا کی۔ جوگی کے ٹمٹماتے ہوئے
دیا کی۔ ڈوبتی ہوئی نیا کی۔ میں نے تم سے ہمیشہ پریم کیا ——— پریم
اور سچا پریم۔ لیکن تم نے اُس کی کوئی قدر نہ کی۔ اُسے تم نے پیروں
سے مسل ڈالا۔ تمہیں اپنے وعدہ کا پاس نہ رہا۔ تم نے میرا دل
دکھایا۔ میرے ہردے کو جلایا۔ اچھا کیا۔ خوب کیا۔ غریب دل کا
مسلنا قدرت اور سماج دونوں ہی کے نزدیک ایک کھیل ہے لیکن "جمنا"
یہ تمہیں نہیں چاہیئے تھا۔

"جمنا" شاید تمہیں یاد نہیں رہا۔ تم "پریم" کو پریم کی بھیک دے
چکی تھیں۔ آج وہی بھیک تم مجھ سے واپس لینا چاہتی ہو۔ کتنی
سنگدل ہو "جمنا" کتنی بے رحم ہو تم ——— سُنا تھا کہ عورتیں
دل کی بہت نازک ہوتی ہیں لیکن نہیں بالکل غلط۔ شاید قدرت نے
عورت کو تراشتے وقت دل کے بدلے ....

جمنا ——— "دیکھئے پرسوں شادی ہے۔ میرے اعزہ آچکے
ہیں۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہے۔ آپ شاید پاپن باغ ہوکر اس خوابگاہ
میں آ گئے۔ خدارا مجھ پر رحم کیجئے۔ ذرا آہستہ بولئے ...."

پریم ——— مجھے تمہارے مہمانوں کی پروا نہیں........

جمنا ——— (آبدیدہ ہوکر) "پریم" تو تمہارا مطلب یہ
ہے کہ میں رسوا ہوں۔ ذلیل ہوں۔ میرے خاندان پر سماج کی انگلیاں
اُٹھیں۔ خیر اگر یہی مرضی ہے تو کہہ ڈالو! جتنا جی میں آئے۔
ہاں "پریم" جاؤ۔ اسوقت تو مجھ بھی میری رسوائی کا بہت
غنیمت ہے۔ "پریم" افسوس ہے کہ تم سراپا "پریم"
ہوکر بھی پریم کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ پریم ایک بار اور صرف ایک
شخص سے کیا جاتا ہے۔ میں نے تمہیں بچپن سے پریم کیا اور اب بھی
اسی پریم کا دیا میرے ہردے کو جگمگا رہا ہے۔ لیکن میں مجبور ہوں
"پریم" ——— تم میری مجبوریوں کو سمجھ نہیں سکتے۔ میں دل سے ہوں تو اس
شادی سے کیسے انکار کر سکتی ہوں۔ میرے ماتا پتا مجھے کیا کہیں گے
میں سماج کو کیا منہ دکھاؤنگی۔ میں کہیں کی نہ رہونگی۔ نہیں نہیں
"پریم" مجھے معاف کرو۔ میں ایک صرف تمہاری خوشی پر اپنے خاندان
کا نام نہیں ڈبو سکتی۔ "پریم" محبت کے یہ معنی نہیں کہ جس چیز سے
تمہیں محبت ہو وہ تمہاری ملکیت ہو جائے۔ یہ تو بچپن کی [illegible]

کہی جائیگی کہ گڑیا مجھے ملنی چاہیئے تھی اُسے کیوں مل گئی - "پریم" افسردہ نہ ہو - یہ بچپن کے بوئے ہوئے محبت کے بیج میرے آنسوؤں سے سینچے جائیں گے - تم یہ نہ سمجھنا کہ پریم کی نیا کسی آنے والے طوفان کے خوف سے بے وفائی کے ساحل پر لگ جائیگی - ہاں "پریم" یہ کبھی ڈوب نہیں سکتی - ان کا ناخدا اسے کھیتا رہیگا - اچھا "پریم" اب جاؤ - دیکھو صبح ہو رہی ہے - ہاں کبھی کبھی ملتے رہنا -"

پریم ——— اچھا "جمنا" اب جاتا ہوں - اور شاید پھر کبھی نہ آسکوں گا - یہ شادی تمہیں مبارک ہو - پرماتما کریں تم مجھے ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ - لیکن ہاں ایک وصیت ہے "جمنا" شاید اُس وقت تم نہ ہو اور اگر ہو تو مجھے موقع نہ ملے - اوہ! کتنا اچھا ہوتا میرے پرماتما اگر میری ہچکی کا آخری رشتہ "جمنا" کی گود میں ٹوٹے - اگر ایسا ہوا تو میں سب کچھ بھول جاؤنگا - اور موت کی ڈراؤنی صورت مجھے کنول کے پھول کیطرح ہنستی ہوئی معلوم ہوگی - "جمنا" میری وصیت ہے کہ تم مجھے بھول جانا -"

جمنا ——— "پریم" زیادہ دل نہ دکھاؤ - تم اسوقت جذبات کی رَو میں بہہ رہے ہو - میرے دل کا اندازہ نہیں لگا سکتے -"

پریم ——— ہاں "جمنا" یہ مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ میں کیا کہہ گیا - خیر اب جاتا ہوں - لیکن میری وصیت یاد رکھنا -

"پریم" یہاں سے اٹھ کر کسی ویرانے میں چلا گیا - تنہائی تھی - فضا خاموش تھی - درخت چُپ کھڑے تھے - پتیاں عالم حیرت میں ساکت تھیں - "پریم" رویا - جی بھر کر رویا - دل کھول کے رویا - سنا جاتا ہے کہ جب دل پر گہرا اثر پڑتا ہے تو دل روتا ہے - آنکھیں نہیں روتیں - ہاں تو "پریم" کے ساتھ بھی ویسا ہی ہوا "پریم" چلا - ماں کی ممتا نے کوشش کی - جنم بھومی نے اشاروں سے بلایا - لیکن "پریم" نے دور ہی سے ان کو پرنام کیا - چرنوں چُومیں - جنم بھومی کی خاک آنکھوں سے لگائی اور طلوع صبح سے پہلے وہ کسی ویرانے میں جا بسا - کئی مہینے گذر گئے - "جمنا" کی شادی ہو گئی - "پریم" کی ماں اکلوتے بیٹے کے سوگ میں مر چکی تھی - اس کے ٹوٹے مکان کی جگہ ایک جوگی کی مڑھیا بن چکی تھی جس میں ایک چھوٹا سا دیا روزانہ شب میں ٹمٹمایا کرتا تھا -

---

گنگا نہان تھا - دُور دُور سے جاتری نہان کی غرض سے کاشی آئے تھے - "جمنا" اور "کرشن" بھی کاشی آئے - گنگا مائی کے دامن میں میلا لگا ہوا تھا - لوگ اشنان کر رہے تھے - جمنا اور کرشن نہان کے بعد واپس جا رہے تھے کہ کچھ لوگوں کی بھیڑ دکھائی دی - دُور سے ایک نیم مردہ مریض گنگا کی ٹھنڈی ترائی پر لیٹا نظر آیا - لوگ اردگرد سے گھیرے تھے - لوگوں نے کہا یہ پاگل تھا - بہت دنوں سے اس دریا کے کنارے دیوانہ وار گھوما کرتا تھا - لیکن "جمنا" نے اپنے "پریم" کو ایک ہی نگاہ میں پہچان لیا - کسی کی آرزو یاد آئی - فوراً مریض کے پاس پہنچی اور اس کا سر اپنے زانو پر رکھا - "پریم" نے آنکھیں کھولیں - "جمنا" کی گود میں سر تھا - نظریں ایک دوسرے کو آخری پیام دے رہی تھیں "پریم" کی آنکھوں میں خوشی کے آنسوؤں کے دو قطرے آئے - لب پر ہلکی سی مسکراہٹ تیری - اور شمع محبت ہمیشہ کیلئے بجھ گئی - "کرشن" نے "جمنا" سے پوچھا "کیا تم اس مرنے والے کو جانتی تھیں جمنا!

"جمنا" جواب میں کچھ نہ کہہ سکی - ہاں آنسوؤں کے دو بڑے بڑے قطرے آنکھوں سے گرے اور رخساروں پر ڈھلک کر رہ گئے -

مِلاپ

از جنابہ نسیمہ اختر بنت سید فرید الدین صاحب انسپکٹر سی۔ آئی۔ ڈی بہار

" کیوں ملول ہے آج تو لڑکی ؟ "

" نہیں تو "

" نہیں تو کیسے - تیرا دن تو اٹکھیلیاں ہی کرتے گذرتا تھا۔ جیسے تجھے کچھ فکر ہی نہیں۔ مگر آج چہرہ اداس ہے۔ رونی صورت بنائے بیٹھی ہے۔ لڑی جھگڑی تو نہیں کسی سے "

" کیوں لڑتی جھگڑتی کس سے میں۔ میں ہوں کون کسی سے لڑنے والی "

" لڑی نہیں تو رونی ضرور ہے۔ "

" ہٹاؤ بھی کہاں کا جھگڑا لے بیٹھیں تم "

" لڑکی ! زیادہ نہ چھپا۔ کڑھ تو رہی ہے رنج و غم سے۔ منہ سے ایک حرف تو نکلتا نہیں ہے ۔ "

" کیسا رنج اور کیسی مصیبتیں "

" میں نے یہ بال دھوپ میں نہیں پکائے - کہہ ڈال۔ دل تو ہلکا ہو جائے گا تیرا "

" کیا کہہ ڈالوں "

" جو چیز تیرے دل کی کلی کو کملائے دے رہی ہے "

" دل کی کلی ! کس کے دل کی کلی - یہاں تو کبھی تھی ہی نہیں "

" نہیں کیسے تھی۔ کیا تو نے اپنے ہی ہاتھوں اسے مسل ڈالا "

" لوگ پاس پڑوس والوں سے دکھ درد کہہ کر دل ہلکا کر لیا کرتے ہیں۔ پھر تو تو میرے دروازہ ہی پر رہتی ہے "

" تو کیا چھوڑ دوں یہ بسیرا ؟ "

" یہ میں کب کہتی ہوں - میں تو اس لئے پوچھتی ہوں کہ شاید تیرے درد کا میں کچھ درماں کر سکوں "

" بھلا تم میرے دکھ سنکر کیا کرو گی ! بس یہی نا کہ زبانی جمع خرچ "

" میں تو دکھے دل کا بوجھ ہلکا کرنا اپنا مذہب خیال کرتی ہوں۔ تو کہہ دیکھ میرے بس میں جو کچھ ہوگا اٹھا نہ رکھونگی "

(۲)

بڑھیا مسلمان تھی اور لیلاوتی ہندو مگر ایسے نازک وقت میں پتھر کے دل بھی موم ہو جاتے ہیں - بڑھیا تڑپ گئی اور لیلاوتی کو کھلایا پلایا - نرم نرم بستر لگا دیا - اور کہا بیٹی دو گھڑی آرام کرے۔ لیلاوتی جو مدتوں زمین پر سویا کرتی تھی گدیلے بستر پر لیٹتے ہی ایسی سوئی کہ تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ ماں باپ سے بچھڑ کر دراصل لیلاوتی آج سوئی تھی۔ بڑھیا کے کوئی اولاد نہ تھی اس لئے لیلاوتی کو مثل اولاد کے رکھا اور اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا جس سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی - بڑھیا کی خوشی کا اندازہ لگانا مشکل تھا - اب اس کے ایک بیٹی تھی - لاڈلی - پیاری - بڑھیا اس پر جان چھڑکتی اور پھولی نہ سماتی -

بڑھیا - لیلاوتی کو خورشید جہاں کے نام سے پکارتی تھی اس کی مصیبت کے دن گذر گئے اور خوشی کی گھڑیاں آئیں -

خورشید جہاں کی عمر اس وقت تیرہ برس کی تھی -

خورشید جہاں رفتہ رفتہ بڑھیا سے مانوس ہو گئی۔ بڑھیا کو

اپنی آپ بیتی یوں سُنائی۔

" میں ایک بڑے گھرانے کی اکلوتی بیٹی تھی۔ میری بھائی بہن نہ تھے۔ والدین نے مجکو بڑے ارمان سے پالا۔ میری ہر خواہش آن کی آن میں پوری کیجاتی۔ ان کا بس نہ تھا کہ مجھکو آنکھوں میں رکھ لیتے۔ کام کاج، محنت مشقت کی عادت کبھی نہ ڈالی گئی۔ پڑھنا لکھنا بھی نہ سیکھا۔ آخر وہ منحوس ساعت آپہونچی کہ ۱۹۳۴ء میں مظفر پور میں زلزلہ آیا اور والدین زلزلہ کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اکیلی میں اُن کا غم سہنے کو زندہ رہ گئی۔

میں دن بھر بھیک مانگتی اور رات کے وقت ایک پیپل کے درخت کے نیچے سو رہتی۔ آخر کب تک۔ برسات کا موسم آیا اور میرا اس پیڑ کے نیچے رہنا مشکل ہو گیا۔

میں بہت دنوں تک اپنے والدین کا انتظار کرتی رہی۔ سمجھتی تھی کہ میرے والدین کہیں گئے ہیں اور چند دنوں میں مل جائیں گے۔ آخر کو انتظار کرتے کرتے بہت دن بیت گئے۔ اور در در بھیک مانگنے کے سوا کوئی سہارا نہ رہا۔ میں اکثر سوچتی کہ میں بغیر ماں کے کیسی تکلیف اٹھا رہی ہوں۔ نہ معلوم ماں چلی کہاں گئیں۔ اکیلے مانگ کے کھانا پڑتا ہے۔ کل سے فاقہ ہے۔ بھوک سے آنکھیں نکلی جاتی ہیں۔ کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ ماں رہتی تو اچھے اچھے کھانے نصیب ہوتے۔ عمدہ عمدہ کپڑے پہنتی۔ کتنے برسوں سے چیتھڑے لگائے پھر رہی ہوں۔ میرے ہی باپ کے پیسوں پر چچا راج رہے ہیں اور مجھے در در کی ٹھوکریں کھانے کو چھوڑ دیا۔ پر مانگا کس کے آگے ہاتھ پھیلاؤں۔ میں آپکے در پر بھی آئی۔ میں نے آپ کو دیکھا مگر خیال آیا کہ یہ بڑھیا بھی تو مسلمان ہے، مسلمانوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے میں طبیعت ہچکچاتی تھی کیونکہ مسلمان ملکیش اور راکشش ہی بتائے گئے تھے۔

یہ سوچ کر آگے بڑھ گئی۔ قسمت کی خوبی تو دیکھیئے، جہاں کسی کے دروازے پر صدا لگائی لوگ نکال باہر کرنے پر کمربستہ نظر آئے۔ " اے واہ ایسے ایسوں کو بھیک دی جاتی ہے! اپاہج نہیں۔ مجبور نہیں۔ پھر بھیک مانگ کر کھانا۔ شرم تو نہیں آتی۔ جیسے کسی کے باپ کی جاگیر پڑی ہے۔ آئی وہاں سے۔" "ملے مائی" " مائی بھگوان اور سے اور دیگا، دکھیاری پر رحم کر۔ بھوک سے نڈھال ہوں، مری جاتی ہوں۔ پران بچالے۔ لچھمی تیرے گھر رہے۔ میں بھکارن بپتا کی ماری ہوں۔ پرمیشور تیرا بھلا کرے۔"

" چل سرک کہہ تو دیا ایسے ہاتھ پیر والے کو بھیک نہیں دی جاتی۔ پھر کیوں سر کھائے جاتی ہے۔ بال بچوں کا گھر ہے۔ نکل یہاں سے۔ دور ہو۔ جاتی ہے کہ نہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ چار پیسے کی نوکری کرے" اب میں بھوکی بھکارن تھی۔ دل میں آیا کہ دنیا دھرم ڈھکوسلے ہیں۔ دنیا میں ان کا نام و نشان نہیں۔ یہ سوچکر کلیجہ پر تیر برس رہے تھے۔ مگر کر ہی کیا سکتی تھی۔ خیال آیا ایک بار اور کسی دروازے پر صدا لگاؤں۔ شاید پانی دانا مل جائے، جونہی دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے خادمہ آگ بگولہ ہو کر گرجتی ہوئی نکلی۔

" کون ہے تو؟ کیا چاہتی ہے؟ آئی ہے کس لئے؟"

میرے پاس اس کا کیا جواب تھا، بلک کر بولی۔" مائی کچھ کھانے کو دیدے۔ اپنے بال بچوں کا صدقہ۔ جیں جیں سب پروان چڑھیں۔ میں نصیبوں جلی مصیبت کی ماری ہوں۔"

" یہ کیا کوئی دھرم شالہ ہے یا اناتھ آشرم۔ جس کا جی چاہے بھوجن کرے۔ جو چاہے براجمان ہو جائے۔ جانے تو کون ہے۔ چور ہے۔ گرہ کٹ ہے۔ بھیدی ہے۔ چل آگے بڑھ"

معلوم ہوتا تھا میرے لئے دنیا رحم و کرم سے خالی تھی۔ ہر طرف سے اسی قسم کے مایوسی کے جوابات ملتے تھے۔ اب میں

آگے بڑھنے والی تھی کہ راستے میں آپ مل گئیں اور آپ کے سوالوں کے جواب میں آنکھوں میں آنسو تیر آئے - وہ خیر ہوئی کہ آپ کی مہربانیوں نے سایہ کیا ورنہ میں کب کی روتی بسورتی دنیا سے چل بسی ہوتی "

یہ دردناک افسانہ سُنا کر بڑھیا نے حیرت اور خوشی کے لہجے میں پوچھا " بیٹی! تم تو کہتی تھیں کہ میں بڑی امیر تھی، تو تمہارا کوئی ایسا رشتہ دار نہ تھا جو تمہاری رکھوالی کرتا -

خورشید جہاں - (ٹھنڈی سانس بھر کر) کیوں نہیں، چچا چچی سب ہی تھے مگر ماں باپ کے مرنے کے بعد کون کس کا خیال کرتا ہے - اور پھر میری جائداد پر بھی تو قبضہ کرنا تھا مجھے دودھ کی مکھی کی طرح نکال نہ پھینکتے تو میں اُن کے راستہ کا روڑا نہ بن جاتی - اب ان لوگوں نے روپیہ پیسہ جائیداد نوکر چاکر سب کو اپنے تصرف میں کر لیا - "

بڑھیا - نوکرانیاں تمہاری کتنی تھیں -

خورشید - بے شمار

بڑھیا - تو سب کیا ہوئیں -

خورشید - کچھ تو چچا کے گھر رہ گئیں اور کچھ مالک کے مرنے کے بعد نوکری کو خیرباد کہہ کر چلتی ہوئیں -

بڑھیا - کیسی بُری تھیں سب -

خورشید - ہاں ماں بُرے وقتوں میں کون کسی کے کام آتا ہے - ایک آیا تھی - میں اُسے بہت چاہتی تھی مگر وہ بھی ماں کے مرنے پر چلی گئی مجھ کو چھوڑ کر -

بڑھیا - تمہارے ماں باپ کا کیا نام تھا میری لاڈلی -

خورشید - ماں کا شکنتلا اور باپ کا گریش چندر -

بڑھیا - اور آیا کا؟ (بڑھیا کو کچھ کچھ شبہ ہو چلا تھا)

خورشید - شریفن -

بڑھیا - (تعجب سے) شریفن!

خورشید - ہاں - وہ میرے دادا کے زمانہ سے تھی، زلزلہ کے بعد اس کا بھی پتہ نہ چلا کہ کہاں گئی اور کیا ہوئی -

بڑھیا - تو میری بچی تب تو میں ہی .... تیری .... ہوں -

اے خدا کس مُنہ سے تیرا شکر ادا کروں کہ تو نے دو بچھڑے ہوؤں کو ملایا .... بیٹی تو میں .... میں ہی تیری ....

شریفن کا چہرہ خورشید جہاں کو دیکھ کر مسرت و شادمانی کا گہوارہ بن گیا - آنکھیں بیٹھی جاتی تھیں جو شاید خورشید کو اپنے اندر بٹھا لینے کو - لب ہلے پھر تھمے - پھر ہلے - بالآخر شریفن کے ایک خیال نے دوسرے پر غلبہ پایا - اور بولی زندگی کی نحیف آواز میں - " بیٹی خورشید میرے سینہ سے لگ جا " وہ لپٹ گئی - بجلی کی لہر ایک کے قلب سے نکل کر دوسرے کے اندر سرایت کر گئی - دو ہستیاں تھیں مگر در اصل ایک - پھر شریفن بول اٹھی -

" بیٹی! شکنتلا در اصل تیری ماں نہ تھی اور نہ گریش چندر تیرا باپ -

خورشید جہاں (تڑپ کر) تو؟

" یہ ایک طویل داستان ہے جسکے بیان کرنے کی نہ مجھ میں سکت باقی ہے اور نہ ضرورت ہے " ——— " برائے خدا کچھ تو کہو ماں؟ "

" کیا کہوں بیٹی خوشی کے مارے مری جاتی ہوں اور ندامت سے بھی جاتی ہوں "

" یہ کیوں ماں " ——— " اس لئے کہ تو وہ انمول موتی ہے جسے پاکر میں نے دنیا کی ساری دولت پالی - اور پھر اسلئے کہ تو ہی وہ انمول موتی ہے جسکو پاکر بھی میں نے کھو دیا تھا .... "

" میں نہیں سمجھی ماں " ——— " تو نہ سمجھیگی میری بھولی " ——— " تو کیا ....

منظومات

نذرِ تہنیت بہ تقرر

بر منصب صدر المہامی سرکارِ عالی اعلیحضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ و سلطانہ

بخدمت عزیزِ ملت جناب سید عبد العزیز صاحب بیرسٹر ایٹ لا سابق وزیر تعلیم و صدر مسلم لیگ صوبہ بہار

از فخرِ بہار، یادگارِ داغ حضرت مبارک عظیم آبادی،

"یہ نظم الوداعی دعوت کے موقع پر جناب سید علی اشرف صاحب ایس ڈی او پٹنہ کے دولتکدہ پر
۳۱ر جنوری سنہ [illegible]ء کو پڑھی گئی، جلسہ میں شہر کے ممتاز عمائد و عہدہ دار شریک تھے۔"

کلاہِ سعادت ترے سر مبارک　　　قبائے شرف زینتِ بر مبارک
ملی تجھکو صدر المہامی دکن کی　　　منائی گئی عید گھر گھر مبارک
کیا منتخب تجھکو شاہِ دکن نے　　　یہ لطفِ شہِ عدل پرور مبارک
دکن کو بشارت، ہوا منتخب وہ　　　سلاکش ہے جس کا سراسر مبارک
ترا مسلکِ صلح کُل کہہ رہا ہے،　　　عمل ہے رواداریوں پر مبارک
ترے کارنامے ہیں وہ کارنامے　　　ترا دیدہ و دل میں ہے گھر مبارک
پھلے پھولے گی تیری صدر المہامی　　　مبارک تجھے فیض گستر مبارک
تجھے روزِ فیروز و سالِ ہمایوں　　　تجھے ساعتِ نیک اختر مبارک
ہمیشہ ظفر ہو تری معرکوں میں　　　یہ سہرا ہمیشہ ترے سر مبارک
مہ و مہر اقبال و اجلال و حشمت　　　چمکتا، دمکتا، منور مبارک
نہالِ تمنا کو تازہ بہاریں　　　بدامانِ مقصد گل تر مبارک
خوشی۔ خوش دلی۔ خرمی۔ شادیانہ　　　مبارک سلامت برابر مبارک

یہ تبریک مژدہ عزیزِ وطن کو،
کہ ہے تہنیت خوانِ سخنور مبارک

"آدمی"

از جناب احمد مصطفٰے صاحب مجنوں، بازید پوری

مقصدِ تخلیقِ آدم کیا سراپا راز ہے
جس کو حل کرنے سے عاجز عقل کی پرواز ہے

ساری مخلوقات میں یہ ایک ہے تنہا وجود
جس کے ذوقِ دید نے پیدا کیا شوقِ نمود،

حُسنِ فطرت ورنہ کیا تھا جو ہر آئینہ تھا
یعنی جلوہ آپ اپنی دید سے بیگانہ تھا

عشق کی تخلیق گرچہ حُسن کا اعجاز ہے
حُسن خود بھی عشق کے اعجاز سے ممتاز ہے،

نالہ بلبل سے ہے رنگِ گلستاں کی بہار
رونقِ بزمِ چمن ہر بوئے گُل کا انتشار

گنبد و محراب کی زینت جبیں سائی سے ہے
بام پر زینت تماشہ کو تماشائی سے ہے،

ایں چنیں گوئی کہ آدم شد ضمیرِ کُن فکاں،
خلق خلّاقِ جہاں خالقِ ہر دو جہاں،

للعجب یہ راز ہے وہ راز جو کھلتا نہیں،
آدمی۔ قسّامِ عالم۔ اور خود اندوہگیں،

جس کے حُسنِ فکر نے دنیا کو رعنائی دیا
وہ مُصوّر آپ ہی تصویرِ حسرت بن گیا،

یہ وہی آدم ہے یارب یا کوئی تصویرِ خاک
یا تصوّر نے سماں باندھا ہے ایسا ہولناک

آبِ حیواں کے کنارے اِک جہاں سیراب ہے
رہنمائی خضر کی لیکن اِسے نایاب ہے

موت کا کھٹکا کسی کو رنج و غم افلاس کا
کیا نفع ہر آدمی کو قوّتِ احساس کا

بے بسی لاچارگی اِس خاک کے پیکر میں ہے
"خالقِ ہر دو جہاں" تقدیر کے چکر میں ہے

چاندنی رات

از جناب محسن اعظم گڈھی

شب کی چشم کور میں پھر روشنی آنے کو ہے
چاند مشرق سے نکل کر نور برسانے کو ہے

اسکے پرتو سے ہوئے روشن ستاروں کے چراغ
دامنِ عالم سے اس نے دھو دئے ظلمت کے داغ

فیض اسکا عام بستی اور ویرانے میں ہے
اللہ اللہ کتنی وسعت ایک پیمانے میں ہے

کارواں شب کے حق میں شمعِ منزل بن گیا
دردمندوں کیلئے دکھتا ہوا دل بن گیا

چاندنی کی وہ جوانی اور وہ موسم خوشگوار
باغ میں شبنم کے چھینٹوں سے نہاتی ہے بہار

ضو فگن ہے آسماں پر اس طرح سے ماہتاب
حُسن کے دریا میں جیسے غسل کرتا ہو شباب

شب کے سناٹے میں وہ کوئل کا شورِ دلربا
درد میں ڈوبی ہوئی پیہم پپیہے کی صدا

سارا عالم سو رہا ہے اور فضا خاموش ہے
آج ظلمت چاندنی کے خوف سے روپوش ہے

مقالات

عرب انشا پرداز اور ان کی انشا پردازی

از سید ریاست علی ندوی

عربی زبان ہندوستان کے لئے نامانوس زبان نہیں۔ ہماری ملکی زبان سے خواہ وہ اردو رسم خط میں ہو یا ہندی رسم خط میں عربی زبان کے لازوال تعلقات قائم ہوچکے ہیں۔ آج بہت سے ہندی کے لفظ ہیں کہ اگر انکی اصلیت معلوم کی جائے تو وہ عربی ہی نکلےگی۔ مگر ہمیں اس کا سان وگمان بھی نہیں ہوتا۔

ہم غلطا ہم ای بعض تحریکات کی رو میں بہ کر عربی زبان سے رفتہ رفتہ ناآشنا ہوتے جاتے ہیں۔ آج اگر کالج کے کسی طالب علم سے عربی زبان وادب سے متعلق کوئی سطحی بات بھی پوچھ لی جائے تو اس کا جواب اس کیلئے دشوار ہوگا۔ اس کے موازنہ میں دوسری طرف انگریزی ادب کے غیر ضروری معلومات بھی اس کے حافظہ میں محفوظ ملیں گے۔ ہمیں اس صورت حال کے اسباب میں جانے کی ضرورت نہیں۔ مدعا یہ ہے کہ مشرقی زبانوں سے ہماری اجنبیت آہستہ آہستہ دور ہونی چاہئے۔ اسی سلسلہ میں ذیل میں مضمون کا ایک مختصر سلسلہ پیش ہے۔ جو دو تین نمبروں میں تمام ہوجائے گا۔ امید ہے کہ ناظرین اسے دلچسپی سے پڑھنا گوارا کرینگے

یہ مضمون شام کے مشہور علامہ کرد علی کے وسیع مقالہ "الانشاء والمنشؤن" سے مرتب کیا گیا ہے اور امکان بھر ان کے طرز ادا کو قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ مضمون دمشق کے رسالہ "المجمع العلمی العربی" میں شایع ہوا تھا۔

پہلی صدی ہجری

عربی زبان کے انشا پردازوں کے جس قدر خطبات، محاورات، رسائل اور تصنیفات ہم تک پہنچے ہیں اونہیں دیکھکر اگر ہم ان پر کوئی اجمالی رائے قائم کرنی چاہیں تو ہم اس سلسلہ کو پہلی صدی کے انشا پردازوں سے شروع کرسکتے ہیں۔ جن کے سرخیل حضرت امیرالمومنین علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ ہیں۔

حضرت علی حضرت علیؓ عربی علم ادب میں بلغاء کے سرتاج اور عربی علم بیان کے بانی ہیں اور ناقدین فن کے خیال کے مطابق اون کا کلام اللہ ورسول کے کلام کے بعد عربی کے تمام ادیبوں کے کلاموں سے بلیغ تر ہے۔

نہج البلاغہ ان کے کلام کا نمونہ نہج البلاغہ ہے۔ جسے شریف رضی نے جمع کیا ہے۔ اور ابن ابی الحدید نے اوسکی جو شرح لکھی ہے وہ ایک حیات جاوداں کی مالک ہے۔

عہد صحابہ میں حضرت علیؓ کے علاوہ اور بہت سے صحابہ کرام انشا وخطابت کے امام شمار کئے جاتے ہیں۔ لیکن اون کا یہاں استقصا مقصود نہیں۔ اسکی تفصیل اعجاز القرآن باقلانی اور الاتقان والمزہر سیوطی وغیرہ میں موجود ہے۔

ایام جاہلیت کے خطبات ورسائل چونکہ عربوں میں علوم کی تدوین کا سلسلہ دوسری صدی ہجری میں شروع ہوا اس لئے ایام جاہلیت کے بہت سے خطبے اور رسالے محفوظ نہ رہ سکے کیونکہ عرب اپنے حافظہ اور اپنی مسلسل روایتوں پر

زیادہ اعتماد رکھتے تھے۔ رفاعی کا بیان ہے:-

"عربوں کی نظم سے اونکی نثر زیادہ تھی، لیکن اونکی نثر کا دسواں حصہ بھی بالکل اسی طرح محفوظ نہیں جیسے اونکی نظم کا دسواں حصہ بھی ضائع نہیں ہوا۔"[1]

عمر بن عبدالعزیز قرن اول امیرالمومنین عمر بن عبدالعزیز پر ختم ہوتا ہے، اون کے فصیح و بلیغ رسائل و خطبات جنہیں ابن سعد نے "طبقات" میں اور ابن جوزی نے "مناقب عمر" میں نقل کیا ہے، فن بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

پہلی صدی کے دیگر ممتاز انشاپرداز پہلی صدی کے دیگر ممتاز انشاپردازوں میں زیاد بن ابیہ، حجاج بن یوسف الثقفی، قطری بن فجاءۃ اور عمران بن حطان ہیں۔ فجاءۃ اور عمران خطبائے خوارج میں ہیں، جن خوارج نے یوم نہروان میں حضرت علیؓ پر خروج کیا تھا اون کے حالات کتاب الکامل مبرد میں مذکور ہیں، ان سے ان خوارج کی بلاغت نمایاں ہوتی ہے۔

دوسری صدی ہجری

عبدالحمید بن یحییٰ دوسری صدی کے آغاز ہی سے عبدالحمید بن یحییٰ کاتب نمایاں ہوتا ہے۔ وہ فصاحت و بلاغت کی ترقی کے عروج تک پہنچا۔ اوس نے خط و کتابت کے طریقہ اور طرز انشا میں ایک نئے اسلوب کی بنا ڈالی۔

ابن المقفع اس کے بعد عبداللہ بن المقفع پیدا ہوا، اس نے تحریر میں سلاست و روانی اختیار کی، اس کی تحریر میں تکلف و تصنع کا کوئی شائبہ موجود نہیں، اس کی کتاب "الیتیمہ" اور اس کے دیگر رسائل مثلاً کلیلہ و دمنہ وغیرہ فن بلاغت میں بلند پایہ مرتبہ رکھتے ہیں، اگر ابن المقفع زیادہ عمر پاتا (صرف ۳۶ برس زندہ رہا) تو اسوقت ہمارے پاس علم بیان کے ایسے بہت سے نمونے موجود ہوتے جن سے عربی علم ادب کے طلبہ مدت ہائے دراز تک مستفید ہوتے رہتے۔

سہل بن ہارون اسی صدی میں سہل بن ہارون ظاہر ہوا۔ یہ وہی انشاپرداز ہے جس کی رفعت شان کا جاحظ معترف ہے اور اسکی عبارتوں کے اقتباس سے اپنی کتابوں کی زینت بڑھائی ہے۔ جاحظ نے اپنی اکثر کتابیں بھی سہل بن ہارون کے نام سے منسوب کردی ہیں۔ سہل کے چند رسائل ہم تک پہنچے ہیں۔ اون سے علم ادب میں اسکی مہارت کا پتہ چلتا ہے، سہل کی انشا سہل ترین ہے، نہ اوس میں غریب نامانوس الفاظ ہیں، اور نہ مبتذل عبارت آرائیاں۔

دیگر ممتاز انشاپرداز اس صدی کے ممتاز خطیبوں میں داؤد بن علی اور شبیب بن شیبہ ہیں، اور ممتاز انشاپردازوں میں اسمٰعیل بن صبیح (جو ہارون رشید کا کاتب تھا) اور صالح بن جناح صاحب کتاب "الادب المروۃ" میں خصوصاً صالح کا کلام نہایت لطیف، معنی خیز اور علم و حکمت سے مملو ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس عہد میں تمام اہل علم میں صرف دس بلیغ ہیں، یعنی عبداللہ ابن مقفع، عمارہ بن حمزہ، خالد بن یزید، محمد بن محمد، انس بن ابی شیخ، سالم بن عبداللہ، مسعدہ، الہزبر، عبدالجبار بن عدی اور احمد بن یوسف۔

[1] رفاعی کا یہ بیان محل نظر ہے۔ "ر"

دوسری طرف ابن ندیم صاحب کتاب الفہرست لکھتا ہے :-

"متاخرین (جو ہمارے لئے متقدمین ہیں) میں سے ابراہیم بن عباس صولی، حسن بن وہب اور سعید بن عبدالملک بلغا میں ہیں" ان صاحب منزلت ارباب قلم میں سے ابن مقفع، احمد بن یوسف، اور ابراہیم بن عباس صولی کے علاوہ کسی کا کلام ہمارے پاس موجود نہیں، ان سب کی تالیفات آج ناپید ہوچکی ہیں، اگرچہ ایک آدھ ادھر ادھر نظر آجاتی ہیں۔ لیکن صرف ان پر کسی فیصلہ کی بنا قایم نہیں کی جاسکتی،

ان انشا پردازوں کے علاوہ ابواسحٰق کاتب اور ابراہیم بن محمد مدبر (وزیر المعتمد علی اللہ المتوفی ۲۷۹ھ) کو بھی اسی صدی میں شمار کرنا چاہیے، ابراہیم کی ایک کتاب "النظم الرائق والنثر الفائق" ہے، اور ایک رسالہ "العذرا فی موازین البلاغۃ و ادوات الکتابۃ" ہے جو شایع ہوچکا ہے۔

تیسری صدی ہجری

جاحظ

تیسری صدی ہجری جاحظ (۲۵۵ھ) کے ظہور سے ممتاز ہوتی ہے۔ وہ اقلیم سخن کا تاجدار ہے، وہ اپنی خیال آرائیوں اور اثبات مدعا میں بدیہہ گوؤں کا سرتاج ہے، اوس نے مختلف قسم کے موضوعوں پر طبع آزمائی کی، اور جس موضوع پر قلم اوٹھایا، اپنے طرز و انداز و اسلوب و دلکشی میں عدیم المثال رہا، اس کی تحریر سلاست، روانی اور سادگی کا نمونہ ہے، میں نے اس کے جملے بار بار پڑھے، اور نئی حلاوت پائی، اور جس قدر اس کی تحریر پڑھی جائے اوسکی نکتہ آفرینیاں آشکارا ہونگی۔ اور الفاظ کے ذخیرہ پر اوس کے عبور کا پتہ چلے گا۔

تاہم کہیں کہیں اوسکی تحریروں میں تساہل بھی نظر آتا ہے، وہ کبھی کبھی اظہار جذبات میں رکیک و سخیف الفاظ استعمال کرجاتا ہے۔ جو اوس کے ایسے بلند پایہ انشا پرداز کے شایان شان نہیں ہوتے۔

لیکن اوسے ایسی قادر الکلامی حاصل ہے کہ وہ حق کو باطل اور باطل کو حق کر دکھائے، اور کبھی کبھی قدرت کلام کے طور پر وہ کسی امر میں ایک مرتبہ ایجابی پہلو اختیار کرتا ہے، اور ایسے دلائل اور ایسے اسلوب بیان میں اس کو پیش کرتا ہے کہ اوسکی تردید پر یقین نہیں آسکتا، لیکن پھر خود ہی پہلو بدل کر ایسی روش سے ہتھیار اوٹھاتا ہے اور اپنے عجیب دلائل سے اس طریقہ سے اوس مسئلہ کو پیش کردیتا ہے کہ اوس کے ایجاب کے تمام پہلو ذہن سے نکل جاتے ہیں۔

عربی کتب خانوں میں جاحظ کی جو کتابیں زمانہ کے دستبرد سے محفوظ رہ گئی ہیں۔ وہ اس کے تعمق، بداعت معانی کی الفاظ سے مطابقت اور الفاظ کی نظافت و شستگی کو نمایاں کرتی ہیں۔ اس کے کلام میں لطائف و ظرائف کی چاشنی بھی ہوتی ہے۔ اس کی تصنیفات میں کتاب الحیوان، البیان والتبیین، البخلاء، الحاسد والمحسود، اور المحاسن والاضداد وغیرہ زیادہ نمایاں ہیں۔ اس کے تقریباً دس رسالے طبع ہوچکے ہیں۔

ابوحنیفہ دینوری

جاحظ کے بعد ابوحنیفہ دینوری کا نام آسکتا ہے وہ مشہور کتاب الاخبار الطوال کا مصنف ہے دینوری میں ندرت بدرجہ کمال پائی جاتی ہے - اور جاحظ میں حلاوت و شیرینی ہوتی ہے - جاحظ کے معانی لطیف اور توجہ کو منعطف کرنے والے ہوتے ہیں - اور دینوری کے الفاظ زیادہ شیریں انوکھے اور عربوں کے اسلوب سے ملے جلے ہوتے ہیں - ابوحیان توحیدی کہتا ہے :-

"میں جو کچھ کہتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں نے تمام اسلاف و متاخرین میں سے ایسے صرف تین اشخاص پائے کہ اگر تمام جن وانس انکی ذہانت، علم، فضل اور انکی تصنیفات و رسائل کی مدح وستائش مل کر کریں تو بھی ان میں سے ہر ایک جس مدح کا مستحق ہے - وہ ادا نہ ہوگی - وہ تینوں جاحظ دینوری اور ابوزید احمد بن سہل بلخی ہیں"۔

تراجم کی ابتداء

تیسری صدی کا عربی علم ادب کے لئے ایک نمایاں امتیاز یہ ہے کہ اسی صدی کے نصف اول میں دمشق میں خالد ابن یزید اموی کی نگرانی میں تراجم کا سلسلہ قائم ہوا - اور حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بھی اپنے آخر ایام میں سلسلہ تراجم پر اپنی توجہ مبذول کی پھر بغداد میں منصور عباسی کے زمانہ میں اس سے زیادہ دلچسپی پیدا ہوئی اس کے بعد پھر عہد مامون میں نہایت انہماک سے کام جاری ہو گیا۔ اوران (مترجمہ) علوم وصنائع نے ادب عربی میں ایک نئی روح پھونک دی، یہ ترجمے سریانی، فارسی، یونانی اور ہندی زبانوں سے ہوئے، ان سے زیادہ عربی میں بڑی وسعت ہوگئی - اور اس میں ایسے اسلوب وخیالات پیدا ہوگئے جن سے وہ اب تک محروم تھی، عربی زبان میں دوسری قوموں کے لٹریچر کا یہ پہلا نفوذ تھا - اس دور سے پہلے یہ صرف شعر وحکمت کی زبان تھی - اب یہ علم وصنعت کی زبان بھی ہوگئی - خصوصاً مامون کا زمانہ عربی علم ادب، انشا اور دیگر عربی تہذیب وتمدن کے لحاظ سے ایک درخشاں عہد تھا۔

احمد بن یوسف

اس صدی میں احمد بن یوسف کاتب بعضوں کی سب سے اگلی جماعت میں ہے، صولی نے اپنی قلمی کتاب "الاوراق" میں اس کے متعدد رسائل نقل کئے ہیں، ابن طیفور صاحب کتاب "بغداد" نے بھی اپنی کتاب میں اسکے رسائل کے چند حصے نمونہ کے طور پر درج کئے ہیں، اسکی بعض کتابوں کی مسجع عبارتیں بعض ضخیم مترجمہ کتابوں میں ملتی ہیں - اسکی سجع پہلی صدی کے آئمہ بلاغت کی سجع کے مانند ہے - اس کے لئے یہ باعث فخر ہے کہ مامون اسکی ذہانت وانشا کا گرویدہ ہوا اور اسی سے وزارت وعہدہ کتابت کیلئے درخواست کی۔

عمرو بن مسعدہ

اس صدی کے بلند رتبہ انشاپردازوں میں عمرو بن مسعدہ وزیر مامون بھی ہے یہ ایک بلیغ انشاپرداز تھا - اس کی عبارت شستہ، پاکیزہ اور مفہوم ومعانی صاف اور سلجھے ہوئے ہوتے ہیں - رشید نے بلاغت کی جو تعریف کی ہے وہ اس پر صادق آتی ہے - وہ کہتا ہے "بلاغت طوالت سے گریز کرنے، معنی مقصود سے قریب ہونے اور چند الفاظ کے ذریعہ بہت سے معانی کو گھیر لینے کو کہتے ہیں"۔

ابوعلی دامغانی

اسی طرح وزیر ابوعلی دامغانی، ابوالفتح بستی، صاحب کتاب "الطریقۃ الانیقۃ فی التجنیس النفیس البدیع التأسیس" بھی اس صدی کے بہترین منشیوں میں ہیں۔

ابن قتیبہ

اس صدی کے ان چند لوگوں میں جن کی کتابوں کی بہت زیادہ نشر واشاعت ہوئی - ایک ابن قتیبہ (۲۷۶ھ) ہے یہ اپنے علم وفضل، طریقہ تحریر اور اپنے کلام کی تاثیر کے لحاظ سے جاحظ ثانی ہے، اسکی چند کتابوں مثلاً الامامۃ

علامہ شیخ محمد اقبال مرحوم

از جناب سید رضا قاسم صاحب۔ مختار جپلا (پلاموں)

(۳)

آپ کے کلام میں اکثر طویل نظمیں ملتی ہیں جن میں آپ کے طائر خیال کی بلند پروازی اور آپکے مخصوص رنگ کی جھلک نظر آتی ہے۔ آپ کی نظموں میں ہمالہ، شکوہ' اور جواب شکوہ وغیرہ شہرت رکھتی ہیں۔

'ہمالہ' میں جہاں موضوع کی بلندی قابل تحسین ہے۔ وہاں آپ کی بلند خیالی بھی کم داد طلب نہیں ہے' آپ اپنے وطن کے دلدادہ اور اس کے قدرتی مناظر کے شیدائی نظر آتے ہیں اور اسی بنا پر اس کی محبت والفت کا دم بھرتے ہیں' آپ کوہ ہمالہ کے عاشق تھے' کیونکہ آپ اُسے وطن کا پاسبان اور محافظ سمجھ کر وطن کی فصیل قرار دیتے تھے۔

"شکوہ" میں نہایت مودبانہ اور شاعرانہ پیرایہ میں آپ اُن کل آلام و مصائب کا دکھڑا روئے ہیں' جو مسلمانوں کی زبوں حالی' بدنصیبی اور جہالت کی وجہ سے آئے دن انہیں گھیرے رہتے ہیں۔ "جواب شکوہ" میں مسلمانوں کے شکوے کا معقول جواب ہے اور انہیں اُن کے مصائب' آلام کے اسباب بھی نہایت خوبی سے گوش گزار کردئے ہیں" والدہ مرحومہ کی یاد میں" آپ نے جو مؤثر نظم لکھی ہے وہ آپکے سچے جذبات سے مملو ہے' نیز آپ کی نظم "خضر راہ" آپ کے ملی احساسات کا نتیجہ ہے۔ جس میں آپ جدید مغربی ترقیوں کو اپنے اہل وطن کے واسطے شک و بے اعتباری کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

آپ نے چھوٹی چھوٹی نظمیں مولانا حالی اور مولانا اسمٰعیل وغیرہ کے طرز کی بھی لکھی ہیں۔ جنکی عبارتیں صاف سہل اور فارسی ترکیب سے مبرا ہیں' ان میں سے اکثر نظمیں بچوں کی درسی کتابوں میں ملتی ہیں اور ہر نظم کسی نہ کسی اخلاقی نتیجے پر مبنی ہے مثلاً بچہ کی دعا۔ "مکڑا اور مکھی"۔ "ایک پہاڑ اور گلہری" وغیرہ۔ آپ کی نظم "بچہ کی دعا" کتنی ہمت افزا اور پاکیزہ خیالی و راست روی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری ! زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری !
دور دنیا کا میرے دم سے اندھیرا ہو جائے ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے !

آپ نے اور بھی دوسری نظمیں لکھی ہیں جن کا انحصار زیادہ تر حب وطن پر ہے۔ ان نظموں نے آپ کا تخم محبت تمام ہندوستانیوں کے دلوں میں بو دیا۔ چنانچہ آپ کی نظموں میں "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" ہندوستان کے بچے بچے کے مقبول خاطر ہے۔ "نیا شوالہ" بھی آپ کی ایک بے بہا نظم ہے۔ جو ہندو مسلم اتحاد کی ایک سچی تصویر ہے۔ کچھ نظمیں آپنے مناظر قدرت پر بھی لکھی ہیں جو فی الحقیقت

نیچر کو بے نقاب کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ داغ۔ غالب۔ شبلی۔ حالی۔ سوامی رام تیرتھ۔ گرو نانک۔ شیکسپیر۔ رام۔ عرفی اور گوسٹے وغیرہ پر بھی آپ نے اپنی نظموں میں طبع آزمائی کی ہے۔

آپ کی شاعری کی ابتدا دنیائے شاعری کی فضا میں حبِ وطن کے نغموں کی صورت میں گونجی تھی۔ اس ضمن میں آپ کی نظم "تصویرِ درد" شاہکار کا درجہ رکھتی ہے، جس میں آپ نے وطن و اہل وطن کی شکستہ حالی اور بیکسی پر آنسو بہائے ہیں اور اہل وطن کو صبر و ہمت افزائی کے ساتھ ان کے پژمردہ اور خوابیدہ جذبات کو جس خوبی سے ابھارنے کی کوشش کی ہے اس کی دوسری مثال مشکل سے ملتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں! مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں

نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں!
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

ملک میں جب تفرقہ، پھوٹ اور نفاق کی آگ بھڑکتی ہے تو اُسے دیکھ کر آپ کا دل حد درجہ متاثر ہوتا اور آپ باہمی ارتباط، موافقت اور ملاپ کے لئے حد درجہ بےچین ہو کر یوں اظہار خیالات کرتے ہیں ؎

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کا
جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

مجھے اے ہمنشیں! رہنے دے شغلِ سینہ کاوی میں
کہ میں داغِ محبت کو نمایاں کر کے چھوڑوں گا

دکھا دوں گا جہاں کو جو مری آنکھوں نے دیکھا ہے
تجھے بھی صورتِ آئینہ حیراں کر کے چھوڑوں گا

جو ہے پردوں میں پنہاں چشمِ بینا دیکھ لیتی ہے
زمانے کی طبیعت کا تقاضا دیکھ لیتی ہے

علاوہ ازیں "ترانۂ ہندی" جو آپ کی ایک چھوٹی سی نظم ہے، مادرِ ہند کی محبت ہمارے دلوں میں موجزن کرتی ہے اور بلا شبہ اسے وہی درجہ دیا جا سکتا ہے جو فی زمانہ انڈین نیشنل کانگرس نے ترانہ "بندے ماترم" کو دے رکھا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اخوتِ ملی کا رنگ آپ کے کلام میں اس وقت سے جلوہ گر ہوا جب آپ لندن سوسائٹی آف پین اسلامزم" میں بکثرت حصہ لیا کرتے تھے، آپ اسلام کو فرقہ وارانہ اختلافات و جزئی افتراق سے مبرا دیکھنے کے متمنی تھے اور ان میں ایک ہمہ گیر اخوت و عالمگیر اتحاد پیدا کرنا چاہتے تھے۔ آپ کی دلی خواہش تھی کہ اسلام کا بکھرا ہوا شیرازہ یگانگی، یکجہتی، ہمدردی اور محبت کے رشتے میں بندھ جائے۔ چنانچہ اس ضمن میں آپ کا "ترانۂ ملی" آپ کے ان خیالات کا حامل ہے، نیز آپ کی مشہور نظم "جوابِ شکوہ" اس کی اچھی نظیر ہے۔ ؎

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی ایمان بھی ایک

حرمِ پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں!
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

مسلمانوں کو آپ کا یہ عام پیغام ہے کہ انہیں یہ خیال یک لخت ترک کر دینا چاہئے کہ ہم ترک ہیں، مصری ہیں، ہندی ہیں یا افغانی، بلکہ نسلی و ملکی امتیازات سے الگ ہو کر۔ اخوتِ اسلامی کی عظیم الشان کڑی میں منسلک ہو جانا چاہئے۔ چنانچہ

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی — اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا — نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

نیچرل شاعری کی صنعت میں آپ کی نظمیں "اختر صبح" "چاند" "جگنو" "ایک آرزو" اور "ایک پرندہ اور جگنو" وغیرہ قدرتی مناظر کی مکمل محاکات کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ "اختر صبح" میں فرماتے ہیں ؎

ستارہ صبح کا روتا تھا اور یہ کہتا تھا — ملی نگاہ مگر فرصتِ نظر نہ ملی
ہوئی ہے زندہ دمِ آفتاب سے ہر شے — اماں مجھی کو تہِ دامنِ سحر نہ ملی

آپ کی فلسفیانہ شاعری فلسفہ خودی کی سرمایہ دار ہے۔ چنانچہ آپ کی مثنوی "اسرار خودی" تمام تر اسی کا آئینہ ہے آپ فلسفۂ ویدانت وغیرہ کے قائل نہیں تھے۔ آپ خودی کو بجائے فنا کرنے کے اُسے ابھارنے کی تلقین کرتے ہیں۔ آپ کے خیال میں زندگی ایک انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ الٰہیات کے ہمہ تن دلدادہ تھے اور متشائم طبقے کے سخت مخالف۔ زندہ دلی اور وسعت نظری آپ کا مقولہ تھا۔ غرضکہ آپ کے فلسفیانہ نظریہ کا لب لباب یہ ہے کہ انسان کو اپنی غرضِ آفرینش و تخلیق کی غایت کا مسئلہ بغور سوچنا اور جاننا چاہئے، انسان اپنی ہستی کو ایک ادنیٰ شئے تصور کرتا ہے یہ اسکی سراسر حماقت ہے، اُسے یہ خیال خام ترک کر کے اپنے کو اعلیٰ ثابت کرنے میں ہمہ تن کوشاں رہنا چاہئے کیونکہ جب تک انسان اپنی ہستی سے کما حقہ واقفیت حاصل نہ کرے گا شاہراہ ترقی پر وہ ہرگز گامزن نہیں ہوسکتا ہے۔ ساتھ ہی اس کے آپ کا یہ بھی خیال تھا کہ اہل مشرق کے دل و دماغ پر وہم و گمان کی تاریکی مسلط ہے اور جب تک یقین و اعتبار کی روشنی سے ان کے دل و دماغ روشن نہ ہوں گے اسوقت تک ان کے بیڑے کا اس مادی دنیا کے منجدھار سے پار ہونا ناممکن ہے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے — یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

آپ کا کلام ایسے جذبات سے بھی مملو ہے جن میں انسان کو (جب اُس پر مصائب و آلام کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں) خودداری اور خوشدلی کی تلقین کی گئی ہے اور اُسے یاد دلایا گیا ہے کہ اُس کا مرتبہ اُس کی عظمت اور اُس کی شان بہت اعلیٰ و ارفع ہے۔ مثال ملاحظہ فرمائیے ؎

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا — خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو — اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

حضرت اقبال ہندوستان میں ایسے وقت میں پیدا ہوئے جبکہ ہندوستان کے ہر حصے میں ناکامی اور مایوسی کے جذبات چھائے ہوئے تھے۔ اُسوقت آپ نے بہتیرے ہندوستانی شعراء کی روش کے خلاف ملک کو اپنے نئے نغام سے بیدار کیا۔ اور ملک کے مرجھائے ہوئے لالہ زاروں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ آپ کی چشم بینا ستم رسیدہ مشرق کیلئے ایک درخشاں مستقبل دیکھتی ہیں۔ چنانچہ اپنی ایک طویل نظم بعنوان "شمع اور شاعر" مورخہ ماہ فروری ۱۹۰۷ء سنہ میں فرماتے ہیں:-

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہوجائے گی!
اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی!
آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہوجائے گی!
شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہوجائے گی!
دیکھ لوگے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موجِ مضطر ہی اسے زنجیر پا ہوجائے گی!

آپ کا ظریفانہ کلام صرف نکتہ سنج دنیا ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں موجودہ تہذیب کے نقائص اور انکے دور کرنے کا راز مضمر ہے۔ چنانچہ جن لوگوں نے حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم کے کلام کا مطالعہ کیا ہے وہ بخوبی اس کا فیصلہ کرسکتے ہیں کہ اس صنف میں آپ کی ظرافت یکسر اکبر مرحوم کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار میں آپ کی مزاحیہ شاعری کی اصلی اسپرٹ ملاحظہ ہو:-

یہ کوئی دن کی بات ہے اے مردِ ہوشمند
غیرت نہ تجھ میں ہوگی نہ زن اوٹ چاہے گی
آتا ہے اب وہ دور کہ اولاد کے عوض!
کونسل کی ممبری کے لئے ووٹ چاہے گی

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِنظر
وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین؟
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

مجھے اعتراف ہے کہ یہ مضمون بہت طویل ہوگیا ہے تاہم ناچیز یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہندوستان کے اس معجز نما شاعر و حکیم اسلام علامہ شیخ محمد اقبال مرحوم کی ذات ایسی تھی کہ جس کے بیان کرنے کو ع سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے اور ناچیز باوجود اس طوالت تحریر کے آپ کی شیریں نوائی پر کماحقہٗ اظہارِ خیال نہ کرسکا ہے۔ ناچیز نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ محض اس لئے کہ اسکول اور کالج کے طلبہ کے سامنے اجمالی طور پر اس شاعر مشرق کے متعلق ایک جامع بیان پیش کردیا جائے کہ شاید وہ اس سے فائدہ اٹھا سکیں ورنہ اصل موضوع پر ان سطروں میں کیا کہا گیا اس کے متعلق تو بس یہی کہنا مناسب ہے

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کی رقم کا
حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا

نقد و بحث :-

پطرس اور چغتائی

از جناب ج - الف عظیم آبادی

ستمبر کے نیرنگ خیال میں موجودہ دور کے مزاحیہ نگاروں پر جناب محمود نظامی نے ایک تنقیدی مضمون شائع کیا ہے جس میں ردو کے مزاح نگاروں پر نقد و بحث کی گئی ہے اور نتیجہ کے طور پر دکھایا گیا ہے کہ پطرس کی مزاحیہ نگاری میں کوئی بھی عیب نہیں ہے۔ اتی دوسرے مزاح نگار جناب فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، ملا رموزی، شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی میں عیوب کی بھرمار ہے۔ تاہم پطرس کے علاوہ دوسرے بقیہ مزاح نگار بھی کچھ نہ کچھ خوبیاں رکھتے ہیں۔ مگر غریب عظیم بیگ چغتائی میں تو سرے سے کوئی ی خوبی نہیں۔ چنانچہ ڈھائی صفحوں میں چغتائی کے عیوب ہی عیوب بیان کئے گئے ہیں اور پھر ضرورت دکھائی ہے کہ مزاح نگاروں پر سختی سے تنقید کی جائے تاکہ ادب کی حفاظت ہو۔

میں آج اس پردہ کو اٹھانا چاہتا ہوں کہ کیوں اور کس وجہ سے پنجاب کی طرف سے اس قسم کی غلط تنقیدیں شائع ہوتی یں۔ اور انکا کیا مقصد ہے۔ لیکن ہمارے لئے یہ خوشی کی بات ہے کہ پنجاب کے ایک سنجیدہ صحیفہ نے اس روش پر ٹوکنا ضروری سمجھا، نانچہ ادبی دنیا کے لائق اڈیٹر نے اپنی تازہ اشاعت میں۔۔ مذکورہ بالا مضمون پر اظہار خیال کیا۔ اور اسکا اعتراف کیا ہے کہ اس مضمون میں چغتائی کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے۔ اور پطرس کی بیجا پاسداری کرکے ان کی تعریف کے پل باندھے گئے ہیں۔

جناب محمود نظامی نے اس ادبی نقد میں ایسی ٹھوکر کیوں کھائی اس کی وجہ آشکارا ہے۔ ان کا خود بیان ہے کہ چند سال پہلے آپ کی حالت یہ تھی کہ نہ تو یہ جانتے تھے کہ ہندوستان کے مزاح نگار کون ہیں کیا انکی کتابیں ہیں۔ نہ یہ معلوم کہ موجودہ دور کے مزاح نگار کون ہیں۔ اور انکی کون سی کتابیں ہیں اور کیسی ہیں؟ اور یہی عبرتناک حالت "پچھلے سال" تک قائم رہتی ہے۔ لیکن ستم ظریفی ہے کہ جب آپ نے اپنے کو اس موضوع پر قلم اٹھانے کا اہل سمجھا اسوقت بھی آپ کے معلومات کا عالم یہ ہے کہ آپ کے علم میں ہے کہ چغتائی اردو کے بہت پرانے لکھنے والے ہیں۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ انکی کتابیں سنجیدہ زمرہ میں شامل تھیں۔ اب ان کی ایسی کتابیں آ رہی جن کو مزاحیہ کہا جاتا ہے۔ ذرا اس عجیب و غریب تحریر کو پڑھئے اور ان معلومات کی داد دیجئے۔ خدا جانے چغتائی کی وہ تصنیفات کون سی ہیں جو سنجیدہ کتابوں کے زمرہ میں شامل تھیں۔ پھر آگے چل کر شوکت تھانوی کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ بیگم کے قصے لکھنا ان سے مخصوص ہے۔ اور چغتائی نے ان کے مقابلہ میں لکھے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ پچھلے سال سے پہلے واقعی ناقد کی وہی حالت تھی جو انھوں نے لکھی ہے۔ یعنی ان کو کچھ بھی پتہ نہ تھا کہ کون شوکت ہیں اور کون چغتائی۔ اور کون کیا لکھ رہا ہے۔ ملاحظہ ہو واقعہ یہ ہے کہ بیگم کے قصے چغتائی نے سنہ ۳۲ء سے سنہ ۳۳ء تک میں لکھے ہیں۔ "بیگم" کے بجائے انھوں نے

لفظ "خانم" استعمال کیا ہے۔ اس وقت شوکت نے بیگم کی ایک داستان بھی نہیں لکھی تھی جب چغتائی اپنی خانم کی داستان خصوصی ختم بھی کر چکے اس کے بعد شوکت تھانوی نے اپنی بیگم کی داستان شروع کی۔ چغتائی کی ضخیم کتاب خانم ... شاید ناقد کے ہاتھ نہ آئی ہو ورنہ انہیں اندازہ ہو سکتا۔ خانم میں چغتائی کا وہی کردار ہے جو شوکت کا' وہی قصہ' وہی رنگ' وہی ڈھنگ' وہی شوہر اور وہی عورت غرض سب کی سب وہی باتیں۔ اس انداز کو پطرس نے "کیا میں ایک میاں ہوں" لکھ کر شروع کیا تھا اب سنئے اصل کہانی۔ چغتائی کا آغاز ہوا تو شاید کچھ ان بن ہوئی' اور چغتائی نے مقابلہ میں انہی مضامین پر قلم اٹھانا شروع کیا جن پر دوسرے مزاح نگار لکھ چکے تھے۔ اس سلسلہ میں کئی مضامین پطرس کے بھی تھے جیسے ملاحظہ ہو :۔

چغتائی نے مقابلہ میں جو مضمون لکھا	پطرس کا مضمون
(۱) ہنسکھ موہن	(۱) بچے۔
(۲) فلسفۂ عشق	(۲) کتے
(۳) میں ایک بدمعاش میاں ہوں	(۳) میں ایک میاں ہوں

بقیہ مضمون پیش نظر نہیں ہیں۔ نہ صحیح یاد ہیں۔ لیکن میں نے خود دیکھے ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ پطرس کے صرف چند ہی مضمون ہیں۔ اور حضرت چغتائی نے یہ گستاخی کی کہ ہر مضمون کے مقابلہ میں نہ صرف ایک بلکہ کئی کئی مضامین جواب میں لکھ ڈالے۔ مثلاً میں ایک میاں کے مقابلہ میں نہ صرف میں ایک بدمعاش میاں ہوں۔ لکھا۔ بلکہ "چنبیلی کی کلی"۔ "مچھلی کا شکار"۔ "اندھیرا" کیا بلکہ پوری کتاب خانم کہی جا سکتی ہے۔ لیکن خاص مضمون مقابلہ میں جن میں حرف بحرف مقابلہ موجود ہے۔ صرف چار پانچ ہیں۔

پھر ادھر شوکت سے بھی ٹھنی۔ چنانچہ آپ شوکت تھانوی پر زیادہ صفائی سے جھکے۔

چغتائی کا مقابلہ کا مضمون	شوکت تھانوی کا مضمون
(۱) سودیشی پولیس	(۱) سودیشی ریل
(۲) منھو بیٹے	(۲) منھو بیٹے
(۳) یکہ	(۳) یکہ

اس کے بعد حضرت ایم۔ اسلم کی کتاب "مرزا جی" کے شائع ہونے کے بعد چغتائی کے "مرزا جنگی" میدان میں آ گئے بندو قچی کے مقابلہ میں مرزا جنگی" لکھ مارا۔

اب یہ چغتائی کی بدقسمتی ہے کہ پطرس کے مقابلہ میں انکا ہر مضمون ہر طرح پطرس سے بڑھ گیا' اسی طرح شوکت کے ہر مضمون کے مقابلہ کا ہر مضمون بڑھ گیا۔ لیکن سودیشی ریل اس تیزی سے آگے بڑھ گئی کہ "سودیشی پولیس" سے کچھ کرتے دھرتے نہ بن پڑا اور یہاں چغتائی کو شکست کھانی پڑی۔ شاید اسی لئے "سودیشی پولیس" ان کے کسی مجموعہ میں موجود نہیں۔

پطرس کو جو حیثیت اردو ادب میں حاصل تھی۔ اس کا اندازہ لاہور کے باہر والے نہیں کر سکتے۔ لاہور ایک ادبی مرکز ہے۔ لاہور کے ادبی حلقہ میں جو رسوخ انکو اور انکی پارٹی کو حاصل تھا۔ اور ہے۔ اس کا اندازہ لاہور کے باہر کے لوگ نا

ہے۔ لیکن خود حضرت پطرس کی شخصیت آئینہ کی طرح ہمیشہ صاف ہے۔ وہ خود چپ رہتے ہیں لیکن ان پر ہر انگلی اٹھانے والا ان کے احباب کے تمسخر انگیز قہقہوں کا نشانہ ہوتا ہے۔

چغتائی سے یہ کچھ کم گستاخی سرزد نہ ہوئی کہ اپنی ادبی پیدائش کے سال ڈیڑھ سال کے اندر ہی اندر پطرس کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑے ہو گئے۔ لاہور کے ادبی حلقوں میں اس کا احساس پیدا ہوا۔ چہ میگوئیاں ہوئیں۔ اما دے ہوئے مگر چغتائی کی ادبی عمر کو دیکھتے ہوئے یہ اندیشہ ہوا کہ پطرس کا ان کے مقابلہ میں جانا شاید خود چغتائی کے فروغ کا باعث نہ بن جائے اس کے علاوہ چغتائی کا قلم اس زور سے جا رہا تھا کہ رسالوں کو آگے جا کر چغتائی کو خوش ہی رکھنا تھا۔ پھر چغتائی کی حمایت پر دلی پارٹی اپنی پوری قوت کے ساتھ علیحدہ تیار ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی چوں نہ کر سکا۔ چغتائی نے شاید وہی کیا جو ایک نیا پہلوان کرتا ہے کہ مشہور پہلوانوں سے زور آزمائی کرے۔ انھوں نے زور آزمائی کی اور کامیاب بھی ہوئے۔ لیکن لاہور کے ادبی حلقوں میں یہ ایک ناسور بن گیا۔ آگے چل کر خود چغتائی نے ناول نویسی۔ ٹریجڈی سنجیدہ نگاری اور اتم نظم لکھ کر پکڑ کا کچھ موقع بھی دے دیا۔

مجھے چغتائی صاحب اور ایک اور حضرت معاف کریں۔ اگر میری معلومات صحیح ہیں تو انکو احساس ہوا اور احساس کرایا بھی گیا۔ کہ تم نے پطرس اور دوسرے مزاح نگاروں کا کھلم کھلا مقابلہ کر کے پنجاب کے ادبی حلقوں میں اپنی مخالفت کا بیج بو دیا ہے۔ چغتائی کے دل میں احساس ضرور تھا کہ ایسا نہ کرنا چاہیے تھا۔ اور شاید فاتحانہ شان دکھانے کو یہ لکھ مارا کہ میں پطرس کی رعیت ہوں اور ان کے رنگ پر جان دیتا ہوں (چغتائی نمبر) اس سے گستاخی کی تلافی تو ہو گئی۔ لیکن اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ پطرس کو ذرا زیادہ بلند کیا جائے۔ اور اس کے لئے لازم ہوا کہ چغتائی کو زیادہ نیچے گرایا جائے چنانچہ محض پطرس کو بلند سے زیادہ بلند کرنے کے لئے جو پروپیگنڈا کیا گیا اور کیا جا رہا ہے وہ ہمارے پیش نظر ہے۔

اب حقیقت امر یہ ہے کہ ایک باغ ہے اور اس میں صرف گلاب کا ایک درخت ہے جس میں بہترین پھول کھلے ہوئے ہیں ۔ یہ پطرس کی مزاحیہ نگاری ہے۔

دوسری طرف ایک دوسرا باغ ہے اس میں ہزاروں درخت ہیں اور ان میں قسم قسم کے پھول ہیں۔ خوشرنگ اور خوشبودار بھی اور پھیکے اور بے خوشبو بھی یہ چغتائی کے مضامین ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دونوں باغوں سے (اول الذکر کو باغ ہی کہنا ستم ہے) اگر بہترین پھول لائے جائیں تو شاید چغتائی کا باغ ایک کے بدلے دو پھول پیش کر سکے اور اول الذکر سے بہتر بھی۔

لیکن ہو یہ رہا ہے کہ چغتائی کے یہاں کے ردی پھول پتے اٹھا کر پطرس کے گلابی پھولوں سے ملایا جا رہا ہے اور چغتائی کے باغ کی بے رونقی دکھائی جا رہی ہے۔ یہ چغتائی پر ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟ اگر صحیح موازنہ کرنا ہے تو چغتائی کے باغ سے بھی صرف ایک یا دو اسی معیار کے خوشرنگ و خوشبودار پھول لیجئے اور پطرس کے ایک دو پھول سے مقابلہ کر لیجئے۔

افسوس ہے کہ میں یہ سطریں سفر میں قلمبند کر رہا ہوں۔ کتابیں پاس نہیں ہیں ورنہ موازنہ کر کے دونوں کے فرق کو دکھاتا۔

تاہم مطالعہ کی یادداشت سے جو سرسری خاکہ پیش کیا جا سکتا ہے وہ نمونہ کے طور پر پیش ہے :-

پطرس کا فسانہ "بچے"

اس مضمون میں پطرس نے بچوں پر پھبتیاں کسی ہیں۔ طنز نے اس مضمون میں جان ڈال دی ہے۔ بچوں کے رونے مچلنے اور ان کی وارفتہ محبت پر گویا ایک مزاحیہ مقالہ ہے۔ اس کے ساتھ پطرس کا زورِ قلم موجود ہے اور ان کے مخصوص جملے قابل تعریف ہیں مگر مزاح کا رنگ صرف الفاظ سے پیدا کیا گیا ہے فلسفہ یا اسٹڈی مفقود ہے۔ جذبات کا تو ذکر ہی نہیں اور نہ شوخی کا پتہ ہے۔

چغتائی کا "ننھا منا موہن"

پطرس کے مقابلہ میں چغتائی نے قلم اٹھایا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ اس میں ہر وہ بات بدرجہ اتم موجود ہے جو پطرس کے یہاں ہے بلکہ بچوں کے رونے مچلنے اور وارفتہ محبت کی اداؤں کے ذکر میں چغتائی کے یہاں جو ظرافت اور جو لطفِ بیان موجود ہے اس کا پطرس کے یہاں پتہ نہیں۔ اس کے ساتھ چغتائی نے اس مضمون میں الفاظ کے انتخاب اور جملوں کی دلنشین نشست سے غیر معمولی جان ڈال دی ہے۔

پھر چغتائی کی شوخی میں وہ لطیف ادائیں ہیں جو پطرس کے یہاں مفقود ہیں۔ اور سب سے زیادہ دلچسپ بات چغتائی کے یہاں یہ ہے کہ بچہ کی مکمل اسٹڈی موجود ہے۔ اسکی زندگی کے ہر پہلو کی دلکش تصویر اتارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پھر ماں کی مامتا باپ کی محبت، چچا کا پیار اور بچہ کی ماں اور بھائی سے رشتہ داری کا دلکش تعلق اور بچہ کی خلقت یہ سب چیزیں نمایاں ہوتی ہیں۔ بچہ کی ایسی چلتی پھرتی ہنستی کھیلتی تصویر دکھائی گئی ہے۔ جو پطرس کے "بچے" میں موجود نہیں۔

پطرس کا مضمون "کتے"

یہ مضمون پطرس کے شاید بہترین مضامین میں سے ہے کتوں کی مخصوص عادات، بوجہ شب کو بھونکنے پر اسکو غزل خوانی قرار دیکر دوسرے کتوں کی اس میں شرکت کو مشاعرے سے تشبیہ دیکر اسی سلسلہ میں جو لطیف طنز کئے گئے ہیں وہ اپنی نظیر آپ ہیں۔ اور مضمون کا بہترین حصہ یہی ہے۔ بلکہ اور مضمون میں ہے کیا۔ طنز کا پہلو بدستور نمایاں ہے مگر کوئی خاص اسٹڈی یا فلسفیانہ پوائنٹ نہیں۔ کسی خاص گہرے تخیل کا پتہ نہیں۔ جذبات نگاری یا رنگ آمیزی مضمون سے یکسر مفقود، جو مشاعروں کا لطف رہ جاتا ہو۔ اس کے لئے مضمون

چغتائی کا فلسفۂ عشق

چغتائی نے بدستور اپنے مضمون کو افسانہ کا رنگ دیا ہے۔ ایک پالتو کتے کی داستانِ عشق ہے۔ رقابت۔ وہ بھی کتوں کی جس کے مناظر شاہراہ پر عام طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ حسن و عشق کی مکمل داستان۔ اور دلچسپ کہانی ایسے پرلطف پیرایہ میں ہے کہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ خاص چیزیں جو اسکو پطرس کے مضمون سے بہت بلند کر دیتی ہیں۔ وہ اسکی دلکشی۔ جذبات نگاری رنگ آمیزی کے علاوہ ایک مکمل فلسفیانہ اسٹڈی کی ظرافت کا رنگ ہر طرح پطرس سے بہتر ہے۔ بلکہ ظرافت تو پطرس کے یہاں ندارد ہے۔ پطرس کے یہاں ایک اور کمزوری نمایاں ہے یعنی یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف ہنسانا چاہتا ہے۔ مگر چغتائی کے یہاں اس مضمون میں ہنسانے کی کوشش

پطرس کا مضمون "کتے"

بیکار ہے وہ اس پر ایک سرسری نظر ڈال کر اسکو محض کتوں کے متعلق چند مزاحیہ جملوں اور فقروں کا مجموعہ سمجھے گا۔

چغتائی کا "فلسفۂ عشق"

کا کہیں دور سے بھی پتہ نہیں ہے۔ پھر بھی مزاح لطیف اور ظرافت کے بیحد دلکش نمونے موجود ہیں۔ جنہیں پڑھکر آپ خود بخود ہنستے جائیں گے۔

پطرس کا مضمون "میں ایک میاں ہوں"

پلاٹ اس کا یوں ہے کہ ایک زن مرید قسم کے میاں کی ذرا زوردار بیوی جن سے میاں کو بہت محبت ہے۔ میکہ جاتی ہیں۔ غیر موجوگی میں میاں اپنے دوستوں کو گھر لے آتے ہیں۔ خوب ہڑ مچتا ہے۔ تاش ہوتا ہے۔ سکہ جو ہارے وہ کالا منہ کرکے کاغذکی لمبی ٹوپی پہنے۔ چلم بھرے۔ میاں ہارتے ہیں اور چلم بھر کر لاتے ہیں کہ اچانک بیوی بغیر اطلاع سامنے آجاتی ہے۔

یہ وہ مضمون ہے جس سے چغتائی نے ہار مانی ہے۔ اسی کے تتبع میں نہ صرف "بدمعاش میاں ہوں" لکھا۔ بلکہ قریب چالیس افسانہ لکھ ڈالے کہ ان میں سے انتخاب ہو کر پوری کتاب "خانم" مکمل ہوئی۔ وہی پطرس کے کردار ہیں ہی

. . . .

. . . .

. . . . بلکہ مجھ سے یک حضرت نے لاہور ہی میں کہا کہ چغتائی صاحب کہتے تھے کہ میری کتاب کے سب افسانے پطرس کے اس افسانہ کا خراج تحسین ہیں واللہ اعلم دروغ برگردن راوی مگر اس افسانہ میں پطرس کا زور قلم موجود نہیں کیا بلکہ میرے خیال میں۔۔۔ ...... پطرس کا اپنا رنگ اسی افسانہ میں کچھ غائب سا ہے مضمون میں افسانہ کا سا رنگ ہے۔ جذبات کی تہ پلطیف نعلک ہے۔ مزاح بھی ہے۔ واقعات اسکو دوبالا کرتے ہیں یعنی پلاٹ نہ کہ پطرس کا زور قلم دراصل یہ ڈرامائی شگفتہ مضمون ہے اور زن مرید شوہروں پر بہترین طنز بھی ہے۔

چغتائی کا مضمون "میں ایک بدمعاش میاں ہوں"

صرف واقعاتی مزاح ہے۔ اور پطرس کے پلاٹ سے زیادہ پرلطف۔ علیگڑھ کے مقامی رنگ نے اس کو کچھ مقامی سا کر دیا ہے۔ جذبات اور رنگینی میں پطرس سے بہت بلند، دلچسپی اور دلکشی میں بھی خوب ہے اس مضمون کی تفصیل اس لئے دینی مناسب نہیں کہ پطرس کے ایک مضمون کے مقابلہ میں چغتائی نے پوری کتاب لکھ ڈالی۔ جس میں "جنبیلی کی کلی"۔ "اندھیرا"۔ "کھو گیا" "مچھلی کا شکار" اور کئی دوسرے افسانے ہیں۔ جو پطرس کے مضمون سے ہر لحاظ سے بلند ہیں۔ اور ان سب کے مطالعہ کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ ان میں سے کون سا افسانہ صحیح طور پر پطرس کے افسانہ کے مقابلہ میں لایا جا سکتا ہے۔

ضرورت ہے کہ پطرس اور چغتائی، دونوں کے مضامین سامنے رکھ کر موازنہ کی خدمت انجام دی جائے جو ان سرسری سطروں میں ممکن نہیں۔

یہ کوئی تنقید نگاری ہے کہ چغتائی نے چند پست درجہ کے مضامین اگر لکھ دئے تو ان کے اچھے مضامین کے محاسن بھی رخصت

ہو گئے۔ چغتائی کے مضامین اور تصانیف کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ ان کے اوسط درجہ معمولی قسم کے مضامین کو لیا جائے اور دوسری طرف پطرس کے گلاب کے پھول ہوں۔ اگر یہی کرنا ہے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ آپ روح ظرافت، روح لطافت، سوانح کی روحیں۔ اور دس افسانہ اور لے کر سامنے رکھ لیجئے اور پطرس کا سرمایۂ حیات سامنے رکھئے اور پھر فیصلہ دیجئے۔

چغتائی کی ظرافت کی جان اسکی شوخی ہے۔ جس کا ذکر ہی اڑا دیا جاتا ہے۔ اور سنجیدگی کی تعریف کا محل بچا کر چغتائی کو پیش کیا جاتا ہے۔ چغتائی نے ادب کی خدمت کی ہے۔ یہ بے انصافی ہوگی کہ اسکو ایسے پروپیگنڈا سے نہ بچایا جائے

پھر سوال یہ ہوتا ہے کہ پطرس کو کیوں اتنا اونچا درجہ مل گیا۔ اس کا جواب سنئے' پطرس نے ایک عمدہ چیز اسوقت لکھی جب میدان میں کوئی نہ تھا۔ اور جب دیکھا کہ ان سے بہتر میدان میں آگئے تو قلم توڑ کر پھینک دیا۔

پطرس اس زمانہ میں ادبی دنیا میں قدم رکھتے تو ان کے لئے بمشکل کوئی جگہ ہوتی۔ جس زمانہ میں انھوں نے لکھا کوئی حریف نہ تھا۔ ایک بات اور ہے۔ پطرس محض چند مضامین لکھ کر مزاح نگار ہو گئے۔ اور مزاح نگاروں کے مقابلہ لائے گئے۔ کیا آغا حشر محض اپنی ایک نظم شکریۂ یورپ (مع دعا) کے سبب شاعر ہو گئے اور ہر شاعر کے مقابلہ میں لائے جائیں گے۔ یوں تو صرف ایک شعر کہہ دینے والا بھی شاعر اور ایک افسانہ لکھنے والا بھی افسانہ نگار ہی ہے۔

حضرت آدم بھی ساقی میں نئے نظر آتے ہیں۔ اگر بیس سال پہلے یہ مضمون چھپتے تو پطرس کا درجہ لینا مشکل نہ تھا۔ پطرس کی بہت اولیت میں ہے۔ انھوں نے متقدمین کی صف میں رہنے کا انتظام بھی خوب کر لیا ہے۔

سردست ہم اس موضوع کی تفصیلات میں نہیں جاتے۔ اور نہ جناب محمود نظامی کی تحریر کا جواب دینا مقصود ہے۔ ورنہ ان کی نکتہ فہمی کا تو عالم یہ ہے کہ وہ شوکت تھانوی کے متعلق سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے مضامین میں خود اپنے اور اپنی بیگم کے ذاتی حالات لکھ رہے ہیں۔ اور لکھنؤ کی نسوانیت کے خلاف شوکت جو پھبتیاں کستے ہیں۔ ان کے متعلق ناقد صاحب سمجھتے ہیں کہ خود شوکت کی تحریر میں نسوانیت آ گئی ہے۔

ہم ان سطروں کے ذریعہ اردو ادب کے نقد نگاروں کو صرف دعوت دینا چاہتے ہیں کہ وہ اس طرف توجہ کریں اور اردو کے ممتاز ادیبوں کو غیر صحیح تنقیدوں کی زد سے بچائیں۔ ان سرسری سطروں کے شائع کرنے کا اصل مدعا صرف اسی قدر ہے۔

باب المراسلۃ والمناظرہ:-

تصحیح حضرت تمناؔ کی توضیح

ما زیاراں چشم یاری داشتیم — خود غلط بود آں چہ ما پنداشتیم

از حضرت حمید عظیم آبادی

ماہ دسمبر ۳۹ء کے ندیم میں حضرت تمنا مدظلہٗ عمادی مجیبی پھلواروی نے بسلسلۂ "میخانہ الہام" ایک تصحیح شائع فرمائی ہے۔ قبل ازیں کہ میں اس تصحیح کے متعلق کچھ عرض کروں ڈپٹی ولی صاحب نے شعر زیر بحث پر جو تنقید لکھی ہے۔ اُس کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ولی صاحب کی تنقید پر میں اپنے مضمون میں کافی روشنی ڈال چکا ہوں۔ اس فروگذاشت پر بھی میری نظر تھی لیکن اگر ان جزئیات پر بحث کی جاتی تو مضمون بہت طویل ہو جاتا۔ اگر یہ تصحیح نہ شائع ہوتی تو مجھے مزید خامہ فرسائی کی ضرورت نہ تھی۔ بہرکیف اہم بات تو یہ ہے کہ ولی صاحب نے اپنی تنقید میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ کسی دلیل یا سند پر مبنی نہیں۔ ولی صاحب تحریر فرماتے ہیں۔ ندیم۔ جولائی ۳۹ء صفحہ ۱۹:-

شعر: جب اہل ہوش کہتے ہیں افسانہ آپ کا — ہنستا ہے دیکھ دیکھ کے دیوانہ آپ کا

اصلاح شعر: " " " " " — سنتا ہے اور ہنستا ہے دیوانہ آپ کا

میں عرض کرتا ہوں کہ ولی صاحب نے واقعہ کے بالکل برعکس لکھا ہے۔ دوسرا مطلع پہلے لکھا گیا تھا اور "ہنستا ہے دیکھ دیکھ کے دیوانہ آپکا" یہ مصرع بعد میں بنایا گیا تھا۔ چنانچہ ملاحظہ ہو کلام شاد صفحہ ہ۔ جب کلام شاد شائع ہو گیا تو اُستاد مرحوم نے کلام شاد کے بہت سے شعروں کی تصحیح فرمائی لیکن یہ مصرع علیٰ حالہ رہنے دیا گیا (ہنستا ہے دیکھ دیکھ کے دیوانہ آپ کا) یہ اصلاحیں سب سے آخری تھیں۔

(وہ اصل مسودہ میرے پاس محفوظ ہے جو صاحب چاہیں دیکھ سکتے ہیں)

جب اُستاد مرحوم نے اپنے اس مطلع کی اصلاح فرمائی جو زبان زد ہو چکا تھا تو محترمی ڈاکٹر عظیم الدین احمد صاحب ادام مجدہٗ نے خود مجھ سے کہا تھا کہ دیکھو کیسے اچھے خاصے مصرع کو تمہارے اُستاد نے خواہ مخواہ بدل دیا ہے۔ (ڈاکٹر صاحب موصوف سے اس کی

صدیق کی جاتی ہے)۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

عرصہ ہوا کہ ایک دفعہ محترمی علامہ شفق مدظلہٗ العالی میرے ہاں کلام شاد دیکھ رہے تھے کہ اس مطلع پر پہونچے تو آپ نے اس مصرع کو یوں بنا دیا کہ "ستتا ہے اور ہنستا ہے دیوانہ آپ کا"۔ اور کہا کہ بھائی! مجھے یوں ہی یاد ہے۔ چنانچہ اُن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہنوز کلام شاد میں میرے پاس موجود ہے۔

جب "میخانۂ الہام" کی طباعت کے سلسلے میں انتخابیہ کمیٹی بیٹھی جس کا میں ولی صاحب کی تنقید کے جواب میں ضمناً ذکر کر چکا ہوں تو اس مطلع پر کافی بحث رہی۔ حضرت شائق مرحوم اصلاح کو یعنی "ہنستا ہے دیکھ دیکھ کے دیوانہ آپ کا" مرجح سمجھتے تھے۔ لیکن اکثر احباب پہلے ہی مصرع کو بہتر سمجھتے تھے۔ میں قبل بھی لکھ چکا ہوں ولی صاحب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نے یہاں بھی وہی قیاس آرائی فرمائی ہے۔ شائق صاحب نے اس مصرع کی تائید میں جو فرمایا تھا بہ تغیر الفاظ میں ناظرین ندیم کی دلچسپی کے خیال سے عرض کر دینا چاہتا ہوں۔ شائق مرحوم نے فرمایا کہ شاعر کا مدعا یہ ہے کہ جب اہل ہوش یا اہل خرد آپ کا افسانہ کہتے ہیں تو دیوانہ یہ دیکھ دیکھ کر ہنستا ہے کہ عقل والے اور آپ کا افسانہ بیان کریں! کجا ایک پابستۂ دام خرد اور کجا داستانِ محبت و عشق۔ عشق اور عقل سے تو ایک دائمی عداوت اور ہمیشہ کا بیر ہے پھر اہل خرد اور بیانِ داستانِ محبت۔ واقعی حیرت کی بات ہے۔ یہاں ہنسنا تمسخر کرنا یا ہنسی اُڑانا کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی دیوانہ عقل والوں کو افسانۂ محبت بیان کرتے دیکھ کر (بطور مضحکہ) ہنسنے لگتا ہے (دیوانے یوں بھی ہنسا کرتے ہیں) المختصر زمانے کی یہ حالت دیکھ دیکھ کر دیوانۂ محبت دنیا والوں کی سمجھ پر ہنستا ہے کہ اب تو یہ وقت آ گیا کہ اہل خرد اور افسانۂ محبت بیان کریں! لیکن اکثر احباب اُسی پہلے مصرع کے ہمنوا تھے اور اسی لئے وہی مصرع "میخانۂ الہام" میں درج کیا گیا۔ یہ تھی اس مطلع کی مختصر سی روداد! کیا ڈپٹی ولی صاحب استاد مرحوم کے کسی مسودے میں دکھا سکتے ہیں کہ شاد نے وہ اصلاح فرمائی ہے جسے وہ اپنی تنقید کے سلسلے میں پیش فرماتے ہیں؟

کاش ولی صاحب "داناپور" کے کسی قدیم شاعر کا شعر لکھنے کے قبل "تاریخ شعرائے بہار" مطبوعہ سنہ ۱۹۳۱ء دیکھنے کی زحمت فرماتے

- -

- -

- -

من خرابم ز غم یار خراباتی خویش
میزند غمزۂ او ناوک غم بر دل ریش (حافظ)

اب تصحیح کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ مولانا صحیح فرماتے ہیں کہ یہ مطلع حضرت تپاںؔ کا ہے لیکن یہ مطلع بھی تین جگہ تین مختلف صورتوں میں شائع ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

ندیم جولائی ۲۹ء ص ۱۹ سے کہتے ہیں اہل خرد جگہ فسانہ تیرا — منہ کا پھیرے ہوئے ہنستا ہے دوانہ تیرا (بقول جناب ولی)

تاریخ شعرائے بہار ص ۲۹ سے عقل والوں سے جو سنتا ہے فسانہ تیرا — پیٹھ پھیرے ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔ (بقول جناب راز)

ندیم دسمبر ۲۹ء ص ۲۸۷ سے ہوش ۔ ۔ ۔ ۔ — بیٹھا منہ پھیرکے ۔ ۔ ۔ ۔ (بقول جناب تمنا)

میں تینوں بیانوں میں مولانا کے بیان کو مستند سمجھتا ہوں لیکن شاد کے مطلع کے لکھنے کے بعد اس مطلع کے پیش کرنے میں جو کُن ہے اُس پر روشنی ڈالنا میری آج کی "توضیح" کا موضوع ہے ۔

شادؔ مرحوم کے مخالفوں نے حضرت تمناؔ کے مذکور الصدر مطلع کو بار بار پیش کیا ہے اور غالباً اِس خیال سے کہ گویا شادؔ مرحوم نے سرقہ کیا ہے ۔ ایک تو یہ کہ مضمون میں کوئی خاص ندرت نہیں کہ کہنے والا خواہ مخواہ سرقہ کرتا ۔ دوسرے یہ کہ جب "فسانہ اور دیوانہ" یہ دو قافیے مطلع میں نظم کیے جائیں گے تو اُسی طرح کا مضمون اکثر و بیشتر بہ تغیرِ الفاظ ذہن میں آئے گا ۔ تیسرے یہ کہ حضرت تمناؔ کا یہ مطلع ممکن ہے کہ شادؔ مرحوم نے سنا ہو (جیسا کہ مخالفوں کا گمان ہے) لیکن میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا جناب بحرؔ مرحوم تلمیذِ رشید ناسخؔ مرحوم نے بھی سرقہ کیا تھا ؟ جناب بحرؔ کا مطلع ملاحظہ ہو :۔

حوریں سننے کے لئے آئیں گی افسانۂ عشق ۔۔۔ آگیا بزم میں کس روز جو دیوانۂ عشق

وہی دیوانے کی فسانہ گوئی اور وہی افسانۂ عشق !

اب ذرا سرقہ کے متعلق بھی چند ضروری باتیں سن لیجئے ! اگر دوسرا شعر عذوبیت اور حسنِ ترکیب میں پہلے شعر سے بہتر ہو تو علمِ بلاغت میں بجائے خود مقبول و مستحسن ہے ۔ چنانچہ صاحب مجمع الصنائع تحریر فرماتے ہیں ۔ "در جمیع اقسام سرقہ اگر شعرِ دوم بہتر باشد از اول در سلاست و عذوبت و حسنِ ترکیب آں را مقبول و احسن می شمارند" ثبوت میں حدائق البلاغۃ سے حکیم سنائیؔ اور خاقانیؔ کے اشعار پیش کرتا ہوں :۔

حکیم سنائیؔ ؎ کودک از سرخ و زرد نشکیبد ۔۔۔ مرد را سرخ و زرد نہ فریبد

خاقانیؔ ؎ مرد از پئے لعل و زرد نپوید ۔۔۔ طفل است کہ سرخ و زرد جوید

مصنفِ حدائق البلاغۃ لکھتے ہیں کہ "شعرِ خاقانی بہ سبب لفظِ لعل و زر رنگ دگر پیدا کردہ"

اگر لطافت و پاکیزگی میں دوسرا شعر پہلے شعر کے برابر بھی ہو تو مذموم نہیں ۔

بقدِ تو گفتمی کہ سرو یست در میانہ قبا ۔۔۔ بروے گفتمی کہ ماہ است برنہادہ کلاہ

چوں ماہ بود چوں سرو و نہ ماہ بود نہ سرو ۔۔۔ قبا نہ سرو بپوشد کلہ ندارد ماہ

اس کے مقابلہ میں رشید الدین وطواط کا یہ قطعہ پیش کیا جاتا ہے ۔

بماہ و سرو از آنت نمی کنم تشبیہ ۔۔۔ کہ ایں سخن بر عاقلاں خطا باشد

تو ئی چو ماہ اگر ماہ را کلہ بودے ۔۔۔ تو ئی چو سرو اگر سرو را قبا باشد

ہاں ! اگر کسی شاعر کا شعر متقدمین کے کسی شعر سے نفاستِ کلام ، حسنِ ادا اور علوِ تخئیل میں کم رتبہ ہو تو اربابِ بصیرت اور اہلِ فن کے ہاں بے شک معیوب ہے ۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو شاعر طبع آزمائی کرتے ہیں اور اُن کے خیال میں ایسا توارد ہو جاتا ہے کہ شعر معنی اور الفاظ

دونوں اعتبار سے ایک معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اس طرح کا ایک واقعہ خلاصۃ الاخبار میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ ایک دفعہ میر نظام الدین نے میرزا سلطان الدین سمرقندی کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا اور اصلاح کے لئے اپنے اُستاد علی شیر کے پاس لے گئے۔ استاد نے قصیدہ بغور پڑھنے کے بعد فرمایا کہ جو بیت ممدوح کے نام پر مشتمل ہے' اس کے بعد ایک اور بیت چاہیے کہ کلام مربوط ہو جائے۔ میر نظام الدین نے کہا کہ وہ شعر اضافہ کر دیا جائے۔ استاد نے فرمایا کہ میں بھی غور کرتا ہوں' تم بھی فکر کرو۔ دونوں غور کرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں دونوں نے ایک ایک شعر کہا اور لکھ کر ایک دوسرے کو دکھایا۔ اتفاق دیکھئے کہ دونوں میں ایک حرف کا بھی فرق نہ تھا۔ وہ شعر یہ ہے۔ ؎

"بہارِ باغِ جوانی' نہالِ گلشنِ عدل　　　　گلِ ریاضِ کرم' سروِ جویبارِ وفا"

صاحب مجمع الصنائع بھی میر محمد باقر نامی ایک شخص کا بیان نقل کرتے ہیں کہ وہ کہتے تھے کہ میرے چچا نے ایک غزل کہی تھی' دس سال کے بعد میں نے فیضی کے دیوان میں وہ مطلع بعینہ لکھا دیکھا۔ وہ مطلع یہ ہے :- ؎

"عالم ز آبِ دیدۂ ما نم گرفتہ است　　　　طوفانِ اشکِ ماست کہ عالم گرفتہ است"

توارد اور سرقہ میں امتیاز خود شاعر کی زندگی کے واقعات سے ہو سکتا ہے۔ اگر ایک عامی کوئی شعر کہے اور وہ حسنِ ادا' نفاست و عذوبت میں کسی اگلے شاعر کے شعر سے مل جائے تو اُس پر سرقہ کا الزام عاید کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسا ہی شعر جب انوری' حکیم ازرقی اور خسرو' امیر معزی کے مقابلے میں کہتے ہیں تو اربابِ بلاغت اُسے توارد سے تعبیر کرتے ہیں۔ سرقہ اور توارد دونوں اعتباری مصطلحات ہیں جو شاعروں کے واقعاتِ زندگی' اُن کے مایۂ علم اور رتبہ شاعری کے لحاظ سے پیدا کئے جاتے ہیں ؎

عرفی　　تو و بزمِ عیش' عرفی من و کوچہ کہ ہر سو !　　سرِ خوں چکاں فتادہ' دلِ بے نوا نشستہ

خسرو　　در چار حد کوئے تو افتادہ بینی بندہ را　　تن یک طرف جاں یک طرف سر یکطرف پا یکطرف

عرفی　　داغ دا غم کرد پاس طالب کامم ہنوز　　دو زخے در ہر بن مو دارم و خامم ہنوز

حافظ　　ساقیا یک جرعہ از آں آتشِ گوں کہ من　　درمیاں پختہ گانِ عشق او خامم ہنوز

مصنفِ حدائق البلاغۃ سرقۂ غیر ظاہری کی بحث میں لکھتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ "اقسامِ غیر ظاہر سرقہ کہ مذکور شد نزد بلغا مقبول و ممدوح است بلکہ اطلاق سرقہ بر آں روا نیست"۔ صاحبِ تلخیص کی عبارت اپنی تحریر کی تائید میں پیش کرنے کے بعد کیا خوب لکھتے ہیں کہ "و باید دانست کہ حکم بہ سرقہ وقتے می تواں کرد کہ علم بہ اخذِ شاعر حاصل باشد"۔

اب ذرا حضرت تباں' اور حضرت شاد مرحوم کے مطلعوں پر بھی ایک سرسری نظر ڈالئے !

تباں ؎　　ہوش والوں کو جو سنتا ہے فسانہ تیرا　　بیٹھا منہ پھیر کے ہنستا ہے دوانہ تیرا۔

شاد ؎　　جب اہلِ ہوش کہتے ہیں افسانہ آپ کا　　سنتا ہے اور ہنستا ہے دیوانہ آپ کا

حضرت بیاں کے مطلع کو دو صاحبوں نے یعنی جناب راز مرحوم اور بقول جناب وَلی ڈاکٹر عظیم صاحب نے کچھ تغیر کے سا پیش کیا ہے۔ بقول جناب وَلی ڈاکٹر عظیم صاحب یوں پڑھتے ہیں ؎

کہتے ہیں اہل خرد جب کہ فسانہ تیرا
منھ کو پھیرے ہوئے ہنستا ہے دوانہ تیرا

پہلے مصرع میں تو کچھ ایسی ترقی نہیں ہوئی لیکن ڈاکٹر صاحب کو غالباً دوسرے مصرع میں "بیٹھا" کا لفظ کھٹکا اور اس لئے دوسرا مصرع بدل کر پڑھا گیا۔ راز مرحوم نے ہوش کو عقل سے بدلا اور دوسرے مصرع میں وہی لفظ "بیٹھا" اُن کو بھی کھلا اور رو "منھ" کی جگہ "پیٹھ" لکھ گئے۔ تینوں میں کون صورت سب سے بہتر ہے اس کا تصفیہ ناظرین کے مذاق کے حوالے کرتا ہوں۔ میں خود کچھ لکھنا مناسب نہیں سمجھتا۔ لیکن اتنا ضرور عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ دیوانے کی فطرت کے خلاف ہے کہ وہ "بیٹھا" رہے۔ جنون اور سکون، دیوانہ اور بیٹھے رہنا۔ عجیب طرح کی بات ہے۔ ایک اور نکتہ بھی قابل غور ارباب علم و اہل فہم کے سمجھنے کا ہے کہ دیوانے کو اتنی عقل اور اس امتیاز کی سمجھ کہاں کہ وہ کسی کی طرف سے منہ پھیرکے یا پیٹھ پھیرکے بیٹھا ہنسا کرے۔ یہ عقل والوں کا کام ہے کہ وہ کسی کی طرف سے منہ پھیریں یا اُس سے اظہار نفرت کریں۔ شاد نہ بیٹھنے کی قید لگاتے ہیں نہ اُٹھنے کی۔ نہ منھ کو پھیرنے کی اور نہ پیٹھ پھیرنے کی۔ بلکہ فرماتے ہیں ؎

جب اہل ہوش کہتے ہیں افسانہ آپ کا
سنتا ہے اور ہنستا ہے دیوانہ آپ کا

شعر کیا ہے دیوانے کی فطرت کا صحیح آئینہ دار ہے۔ نہ تصنع ہے نہ بناوٹ! اسی کو مرحوم کس دل آویزی کے ساتھ اور کس معرفت کے رنگ میں یوں نظم فرماتے ہیں

کچھ کہے جاتا تھا غرق اپنے ہی افسانے میں تھا
مرتے مرتے ہوش باقی تیرے دیوانے میں تھا

جس مشاعرے کا مولانا اپنی تصحیح میں ذکر فرماتے ہیں یہ ناچیز بھی اُس مشاعرے میں شریک تھا۔ شاد کے زیر بحث مطلع کے بعد ناظرین مولانا کا وہ مطلع بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

بے سمجھے کیا کہے کوئی افسانہ آپ کا
خاموش کچھ سمجھ کے ہے دیوانہ آپ کا

دیوانہ اور اُس کا کچھ سمجھ کے خاموش رہنا۔ دو متضاد باتیں ہیں۔ اگر سمجھنے کا مادّہ یا قوت ادراک و فہم ہو تو اُسے دیوانہ کیوں کہا جائے؟ فہم و ادراک کا بھی موقع ہوتا ہے اور خاموشی و زباں بندی کا بھی محل۔ ملاحظہ ہو ؎

طلب کرتے نہیں ساقی سے گو افراط ہے مے سے
زباں روکے ہوئے ہیں رنگ محفل دیکھنے والے (شاد)

میں معذرت طلبی کے بعد بصد ادب یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر مولانائے موصوف کا مطلع زیر بحث مطلع کا جواب ہو سکتا ہے تو ایسے کتنے مطلعے کہہ کر پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ہیچداں حمید حاضر ہے!!

مے مخور باد گراں تا نخورم خونِ جگر
سر مکش تا نہ کشد سر بفلک فریادم (حافظ)

اقتباسات

پیامات

آل انڈیا اردو کانفرنس کے اجلاس میں ملک کے مختلف اطراف سے خیر مقدم کے جو پیامات پہنچے وہ مرکزی انجمن کے ترجمان "ہماری زبان" میں شایع ہوئے ہیں۔ ذیل میں وہ نقل کیے جاتے ہیں تاکہ ناظرین ندیم بھی اُردو کے متعلق ملک کے مختلف اکابر کے مختلف زاویہ نگاہ معلوم کر سکیں۔ "ندیم"

پنڈت جواہر لال نہرو

ڈیر مولوی صاحب! میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ۲۹ و ۳۰ دسمبر سنہ ۱۹۳۹ء کو منعقد ہونے والی کل ہند اردو کانفرنس کی شرکت کیلئے آپ نے بذریعہ تار مجھے دعوت دی۔ لیکن ان ہی دنوں مجھے پنجاب میں سخت مصروفیت رہیگی اور اندیشہ ہے کہ اسی مصروفیت کی وجہ سے آپ کی اس مہر آمیز دعوت سے مستفید نہ ہو سکوں گا۔ لیکن میں آپ کی کانفرنس کی کامیابی کے لئے دعا کرتا ہوں اور یہ امید ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کانفرنس اُردو کو بڑا فائدہ پہنچائیگی۔ اس بارے میں غالباً آپ میرے خیالات سے واقف ہیں۔ مجھے اس پر بڑا افسوس رہا کہ اُردو کی ترقی کو یا ہندی کی ترقی کو ایک دوسرے کے مخالف خیال کیا جائے۔ گویا ایک کی ترقی دوسرے کے لئے سنگ راہ ہے۔ بخلاف اس کے میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ در اصل ان دونوں کو ایک دوسرے کی معاونت کرنا اور آپس میں قریب ہونا چاہئے۔ اور یہ اس لئے اور بھی ضروری ہے کہ ہماری عظیم الشان قومی زبان کو نشو و نما مل سکے جس کی جڑیں بکثرت پھیلی ہوئیں اور ان تمام جڑوں سے اس کو غذا اور قوت حاصل کرنا چاہئے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اُردو اور ہندی کو ایک دوسرے سے نزدیک تر آجانا چاہئے۔ ان کے اپنے اپنے رسم خط الگ رہیں لیکن وہ مل کر ایک زبردست زبان کی شکل اختیار کرلیں، ساتھ ہی ان کے موجودہ اسالیب کو جو اپنی اپنی خصوصیات اور ماضی سے پیدا ہوئے ہیں موقع دیا جائے کہ ایک دوسرے کی مزاحمت کئے بغیر نمو پاتے رہیں۔ یہ بات جامع اضداد معلوم ہوگی لیکن میرا خیال ہے کہ در اصل ایسا ہے نہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک زبان دوسری کو مالا مال کرنے میں مدد دیگی۔ (ترجمہ از انگریزی)

راجۂ راجایان ہز ایکسیلنسی مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر شاد یمین السلطنۃ

"شاد منزل" حیدرآباد دکن ۱۶ دسمبر سنہ ۱۹۳۹ء

مخلص و مہربان فقیر شاد مولوی عبدالحق صاحب

"آپ کا دعوت نامہ اور کل ہند اُردو کانفرنس کا پروگرام پہنچا جس کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ فقیر شاد کی بڑی تمنا تھی کہ اس کانفرنس میں شریک ہو

لیکن افسوس کہ فقیر بعض وجوہ سے دسمبر کے آخری ہفتے میں دہلی جانے سے قاصر ہے۔ آپ کی انجمن اُردو کی جو بیش بہا خدمت کر رہی ہے میں اُسے قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ اُردو کی ترقی اور اشاعت کی کوشش ملک کی حقیقی خدمت ہے۔ کیونکہ یہ زبان ہندو مسلم اتحاد کی سب سے مضبوط کڑی ہے۔ اور اس کڑی کو قوی کرنا۔ ہندو مسلم اتحاد قوی کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں انجمن ترقی اُردو کی کارگذاریوں کو بڑے شوق سے دیکھتا رہتا ہوں۔

مجھے اسے خوشی ہوئی کہ انجمن نے اپنی آل انڈیا اردو کانفرنس دہلی میں منعقد کی۔ دہلی اُردو کا جنم بھوم ہے اور اس قسم کی پہلی کانفرنس وہیں ہونی چاہیے تھی۔ فقیر اس کانفرنس کی کامیابی اور آپ کی انجمن کی ترقی کے لئے دل سے دعا کرتا ہے۔ فقط

(شرح دستخط) کشن پرشاد۔ یمین السلطنتہ "

ہز ایکسیلنسی دی رائٹ آنریبل نواب سر اکبر حیدر نواز جنگ بہادر وزیر اعظم سرکار نظام حیدرآباد۔ دکن

"آپ کا دعوت نامہ اور کل ہند اُردو کانفرنس کا پروگرام پہنچا جس کو میں نے دلچسپی کے ساتھ پڑھا۔

اُردو زبان کی ترقی کو میں اسلئے بھی ضروری خیال کرتا ہوں کہ یہ ہندو مسلم اتحاد کی سب سے بڑی یادگار ہے اور اس لئے اس کی ترقی کی کوشش قومی اور ملکی خدمت ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے اور اُردو زبان کو مقبول عام بنانے کے لئے میری ناقص رائے میں سب سے بڑھ کر اس کی ضرورت ہے کہ اس میں جہاں دوسری زبانوں کی کارآمد الفاظ شریک کئے جائیں اس امر کی احتیاط برتی جائے کہ غیر مانوس اور بھدے الفاظ خواہ اُن کا تعلق سنسکرت سے ہو یا عربی سے یا کسی اور زبان سے نہ ٹھونسے جائیں تاکہ اُردو زبان کی مشترکہ حیثیت میں فرق نہ آسکے۔ اور اس زبان کے ذریعہ ہندوستان کی مختلف قوموں کے باہمی میل جول میں ترقی ہو۔

میں کانفرنس کی کامیابی کے لئے دعا کرتا ہوں۔ اور امید کرتا ہوں کہ کانفرنس کی قراردادیں اور فیصلے اُردو زبان و ادب کے حق میں مفید ثابت ہوں گے۔

(سفرح دستخط) اکبر حیدری

جناب اے۔ کے فضل الحق صاحب وزیر اعظم بنگال

مولانا عبد الحق

بنگال کی جانب سے اُردو کانفرنس کو قلبی مبارکباد پیش کر دیجئے۔ بنگال میں بھی ۳۱ر دسمبر کو ایک کانفرنس کا اجلاس ہے اس لئے شرکت سے معذور ہوں جس کا افسوس ہے۔ اُردو ہندوستان کی عام زبان Lingua Indica ہندوستانی قومیت کے صحیح ارتقا اور قومی نصب العین کے حصول کے لئے اشد ضروری ہے۔

(تار کا ترجمہ)

ایس۔ اے۔ بریلوی صاحب ایڈیٹر "بمبئی کرانیکل" بمبئی

مائی ڈیر ڈاکٹر عبد الحق

مجھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے کرسمس کے دوران میں بمقام دہلی ایک کل ہند اُردو کانفرنس کا انتظام کیا ہے۔ اس کانفرنس میں شرکت سے زیادہ مجھے کوئی چیز عزیز نہیں۔ لیکن فی الوقت میرے لئے بمبئی سے باہر جانا غیر ممکن ہے۔ اور اسی لئے مجھے بڑا افسوس ہے کہ میں کانفرنس میں شریک نہ ہو سکوں گا۔ تاہم مجھے اجازت دیجئے کہ کانفرنس کی ہر ممکنہ کامیابی کے لئے دعا کروں۔

آپکا مخلص

ایس۔ اے بریلوی (ترجمہ)

مسٹر سہراب مودی

مولوی عبدالحق صاحب

نواب نواز علی صاحب کے ذریعہ اُردو کانفرنس میں شرکت کی دعوت کا تہ دل سے شکریہ قبول فرمائیے۔ شرکت سے معذوری کے لئے معذرت چاہتا ہوں۔ حالانکہ میری دلی تمنا تھی کہ کانفرنس میں شریک ہوتا۔ کانفرنس اور آپ کی پوری کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔ براہ کرم یقین رکھئے کہ میری خدمات ہمیشہ کانفرنس کی خدمات کے لئے حاضر ہیں۔

آپ کا مخلص۔ سہراب مودی (تار کا ترجمہ)

مولانا ابوالکلام آزاد

کانفرنس کے لئے پوری کامیابی کی دعا کرتا ہوں، اُردو چھپائی کے لئے ٹائپ کی ضرورت فی الوقت سب سے اہم ہے، کانفرنس کو اس کی سفارش کرنا چاہیے کہ اُردو کے اخبارات ورسایل نسخ ٹائپ اختیار کریں۔

(ابوالکلام آزاد) (تار کا ترجمہ)

بابو راجندر پرشاد

افسوس ہے کہ علالت کے باعث اُردو کانفرنس میں شرکت سے معذور ہوں۔ اس کی ہر طرح کی کامیابی کا خواہشمند ہوں۔

راجندر پرشاد
(تار کا ترجمہ)

گاندھی جی

بھائی صاحب

آپکا تار ملا تھا۔ مجھے دکھ ہے کی آپکے جلسے میں میں حاضر نہیں ہو سکتا ہوں۔ میری امید ہے کہ جلسہ ہر طرح کامیاب ہوگا آپ جانتے ہیں کی میں اردو زبان کی طرف پیاسا ہوں، میرا خیال ہے کی سب ہندو جو ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اردو سیکھیں اور مسلم ہندی سیکھیں، سیکھاویں

وردھا ۳۹ ... گاندھی

راجہ پرتاب گیر جی

نشاط محل [illegible] - حیدرآباد دکن
۲۳ دسمبر ۱۹۳۹ء

خدمت شریف جناب مولوی عبدالحق صاحب بی اے سکریٹری انجمن ترقی اُردو ہند

تسلیم!

آل انڈیا اُردو کانفرنس کا دعوت نامہ پہنچا جس کا تہ دل سے شکر گزار ہوں [illegible] آخری ہفتہ میں میرا [illegible] لہٰذا اس قسم کی [illegible] کہ میں کانفرنس میں شریک نہیں ہو سکتا۔ لیکن مجھے انجمن ترقی اُردو کے مقاصد کا کامل [illegible] اردو زبان سے [illegible] اُردو کتابیں [illegible] مطالعہ کرتا ہوں۔ [illegible] تمام مطبوعات میرے [illegible] موجود ہیں میں اردو زبان کو ہندوستان کی عام اور مشترک زبان [illegible] ہوں اور اسکی ترقی کا [illegible] ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی [illegible] کانفرنس کو پوری کامیابی [illegible] نتائج مرتب ہوں۔ کیا اچھا ہو کہ آیندہ کانفرنس [illegible] میں منعقد کیں۔

نیازمند
(مترجم دستخط) پرتاب گیر

جناب کاکا کیلکر صاحب

مہربان عبدالحق صاحب

آپ کا تار ملا ۔ اس کے لئے احسان مند ہوں ۔ میں دہلی جا نہیں سکوں گا ۔ اس کی مجھے دلگیری ہے ۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں دل و جان سے اُردو زبان اور ادب کی ترقی چاہتا ہوں ۔ اگر اُردو کا علم مجھے حاصل ہوتا تو اس کی ترقی میں ضرور اپنا حصہ ادا کرتا ۔ آپ کی کانفرنس کی سپھلتا چاہتا ہوں ۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ کی مبارک کوشش سے اُردو زبان آسان بنتی جائیگی اور اُس میں دیشی لفظوں کی تعداد بڑھتی جائے گی ۔

چند مسلمان دوست کہتے تھے کہ اگر اُردو میں ایک ہی آواز کے لئے دو دو چار چار حرف ہیں وہ کم کر دیے جائیں تو اُردو لکھنا پڑھنا آسان ہوگا [illegible] کرنے کی سہولت بڑھیگی ۔ مجھے پتہ نہیں کہ یہ کہاں تک ممکن ہے ۔ ہم تو 'ناگری لپی' کو آسان بنانے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ ویسا ہی کچھ اُردو کے لئے ہو جائے تو Literacy Campaign میں بڑی مدد ہوگی ۔

پھر سے آپ کی کانفرنس کی سپھلتا چاہتا ہوں ۔

(آپ کا بھائی)

(شرح دستخط) کاکا کیلکر

آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو صدر انجمن ترقی اُردو (ہند)

۱۹ ۔ البرٹ روڈ ۔ الہ آباد ۲۶ دسمبر ۱۹۳۹ء

مخدومی مکرمی ڈاکٹر عبدالحق صاحب

تسلیم دنیاز ۔ اگرچہ میری بڑی خواہش تھی کہ میں اس موقع پر جلسہ میں شریک ہوں ۔ لیکن پچھلے تین چار روز سے میری طبیعت پھر ناساز ہوگئی ہے ۔ اور مجھے خوف ہے کہ ریل کے سفر سے زیادہ خراب نہ ہو جائے ۔ لہذا بحالت مجبوری میں حاضر نہیں ہو سکتا ۔ کل شب کو ڈاکٹر صدیقی صاحب بھی تشریف لائے تھے میں نے ان سے زبانی بھی عرض کر دیا ہے کہ وہ میری طرف سے معذرت کر دیں ۔

اگرچہ میں جلسہ میں موجود نہ ہونگا لیکن میں آپکو یقین دلاتا ہوں کہ میں آپ کے مقاصد اور اغراض سے ہمہ وجوہ وابستہ ہوں ۔ اور پوری ہمدردی رکھتا ہوں ۔ آپ کا ہم نوا اور ہم آہنگ ہوں ۔ اور امید کرتا ہوں کہ آپ اپنے مقاصد میں پورے طور پر کامیاب ہونگے ۔ میں اس مسئلہ زبان کو کسی فرقہ وارانہ نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہتا ہوں ۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ جو تنازعہ اس وقت زبان کے مسئلہ کے متعلق ہندوستان میں پیدا ہو گیا ہے اس کی اہمیت اور تنازعات سے بہت زیادہ ہے ۔ کیونکہ اگر یہ زبان جس کے پیدا کرنے اور پرورش کرنے میں ہندو اور مسلمان دونوں نے حصہ لیا ہے تباہ ہوگئی تو وہ تہذیب اور طرز زندگی بھی جسکا ظاہری لباس ہے تباہ ہو جائے گی اور کم از کم شمالی ہندوستان میں تو ہمکو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا ۔ ایک مورخ نے راجہ ٹوڈر مل کے بارہ میں یہ لکھا ہے کہ انہیں کے حکم سے حسابات سلطنت فارسی میں لکھے جانے لگے اور ہندوؤں نے عام طور پر فارسی کا پڑھنا شروع کیا جس کا آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی ہندوستان میں ایک نئی زبان یعنی اُردو پیدا ہوئی جس کو اگر ہندو قبول نہیں کرتے تو ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی تھی ۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ناممکن تھا کہ تمام ہندو فارسی پڑھ جاتے ۔ اور یہ بھی اسی قدر غیر ممکن تھا کہ اس زمانہ میں تمام مسلمان ہندی پڑھ جاتے ۔ چونکہ دونوں کو اسی ملک میں رہنا تھا ۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ دنیا کے کاروبار لازمی تھے لہذا ضرورت وقت نے دونوں کو اس پر مجبور کیا کہ ایک ایسی زبان مشترک پیدا کیجائے کہ ایک دوسرے کی خیالات

کو سمجھ سکیں اور ایک دوسرے کی وقعت اور احترام کر سکیں - یہی وجہ ہے کہ اردو میں ہندی، سنسکرت - فارسی - عربی اور دیگر زبانوں کے الفاظ کی اس قدر آمیزش ہوگئی - رفتہ رفتہ اسی زبان کے اُستادوں نے اس زبان کو اس خوبی کے ساتھ مانجھا کہ اس کو بذات خود ایک مشترکہ زبان ہونے کا وقار حاصل ہوگیا - اور اس کو مشترکہ زبان کہنے میں نہ ہندو اور نہ مسلمان اپنی بے عزتی سمجھتے تھے - اسی وجہ سے ہمارے ملک میں ایک مشترکہ تہذیب پیدا ہوگئی جسکی وجہ سے کم از کم شہروں میں تو تبادلہ خیالات میں کسی قسم کی دقت محسوس نہیں ہوتی تھی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دہلی - آگرہ - روہیلکھنڈ اور پنجاب کے اطراف میں تو اس زبان کو دیہاتیوں نے بھی داخل ہوگیا اور دیہاتی زبان میں بھی ہزارہا الفاظ داخل ہو گئے جن کو ہم یہی سمجھتے تھے کہ ہمارے ملک کے الفاظ ہیں - مگر اب دھار ادوسری [illegible] رہا ہے - اور اب یہ کوشش کیجارہی ہے کہ چن چن کر وہ الفاظ جو مقبول عام ہوگئے ہیں ہماری زبان سے خارج کئے جائیں اور ایک نئی زبان پیدا کی جائے جو کہ تمام ملک پر حاوی ہو - میں آپ سے صحیح عرض کرتا ہوں کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کوشش کیوں اس وقت کی جارہی ہے - ایسی [illegible] ثابت ہوئی ہے کہ جس کی وجہ سے ہم اس زبان کو جو کہ دو سو ڈھائی سو برس سے شمالی ہندوستان میں رائج ہوگئی ہے اس طریقہ سے ختم کریں اور اس زبان کے ساتھ اس تہذیب کو بھی ختم کریں جس میں کہ یگانگت کے خیالات پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے - میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ اردو کے حامی کسی اور زبان پر حملہ کریں مگر میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اور لوگ بھی اردو پر حملہ نہ کریں - اردو اس وقت میرے خیال میں معرض خطر میں ہے - اور اس وقت [illegible] زیادہ اس وجہ سے ہے کہ آپس کی جنگ و جدل کی وجہ سے ہندو بھی اس کو بگاڑ رہے ہیں اور مسلمان بھی - اگر ہندوؤں کی طرف سے یہ کوشش ہوتی ہے کہ معمولی الفاظ فارسی یا عربی کے جو ہماری زبان میں جذب ہوگئے ہیں نکال دیے جائیں تو مسلمانوں کی طرف سے یہ کوشش ہوتی چلی [illegible] یہ ہندی کے معمولی الفاظ کے مشکل سے مشکل الفاظ عربی یا فارسی کے جو عام فہم نہیں ہیں استعمال کیے جائیں - اردو کے ساتھ اس سے زیادہ برا سلوک نہیں ہو سکتا - میں سمجھتا ہوں کہ اب وقت آگیا ہے کہ انجمن ترقی اردو اس معاملہ میں پیش قدمی کرے اور ایک معیار زبان کا قائم کرکے اس بات پر اصرار کرے کہ جو کتابیں یا رسالے یا اخبارات اردو میں لکھے جائیں وہ اسی زبان میں ہوں جو عام فہم ہو تاکہ اس زبان کی روزافزوں ترقی ہو - اور اس کو وقعت حاصل ہو - یہ ضرور ہے کہ اصطلاحی الفاظ کا ذخیرہ ہمارے یہاں کافی نہیں ہے اور ہم کو دیگر زبانوں سے جس میں کہ میں انگریزی کو بھی شامل کرتا ہوں ایسے الفاظ لینے پڑیں گے - ادب کا دائرہ اب نہایت وسیع ہوتا چلا جاتا ہے - میرے خیال میں ہماری انجمن کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ ایسی کتابیں مستند اردو زبان میں شایع کرے کہ جس کی بدولت ہمارے نوجوانوں کی تعلیم شروع سے آخر تک کافی طور پر ہو جائے - مثلاً ہندوستان کی تاریخ میں کوئی وجہ نہیں دیکھتا کہ ہمارے ادیب ہر حصّہ تاریخ ہندوستان کے اور ہندو زمانہ سے لیکر انگریزی زمانہ تک عالمانہ کتاب نہ لکھیں - ادب میں تنگ نظری و تعصب کی گنجائش نہیں ہے - ادب کو کسی ذاتی اعتقاد یا تعصب سے تعلق نہیں ہے - وہ ادیب ادیب نہیں جس میں منصف مزاجی نہ ہو - لہذا میں نہایت ادب کے ساتھ یہ عرض کروں گا کہ انجمن ترقی اردو کا فرض ہے کہ وہ اس معاملہ میں ہماری رہنمائی کرے - اور جس انجمن کا روح و رواں ایسا شخص ہو جیسا کہ ڈاکٹر عبدالحق - اُس سے ایسی امید کرنا ہمارے لیے بیجا نہ ہوگا - آخر میں میں دعا کرتا ہوں کہ آپکا جلسہ کامیاب ہو اور آپ ایسی تجاویز منظور فرمائیں کہ جو عملی طور پر مفید ثابت ہوں -

نیازمند
تیج بہادر سپرو

غزلیات

تبرکاتِ آزاد

حضرت علامہ فضل حق آزاد

عشق برحق ہو اگر سلسلۂ غیب سے ہے (یومنون بالغیب)
پردۂ غیب کا معشوق بری عیب سے ہے

نورِ ایماں کی تجلی کا وہاں کیا کہنا،
دل بھی آئینہ جہاں و سوئے ریب سے ہے (پاک صاف)

بندۂ حق ہوں ہمیں تو نہیں ہیں لیکن
راہ اک طورِ تجلی کو مرے جیب سے ہے (سینہ و دل)

بڑھ کے بخشش سے نہیں رد بلا کی تدبیر
دور انسان سے ہر آسیب اسی ہیب سے ہے (دہشت)

خیر کی نقل بھی کر، دیکھ لے انکا ایکا (اتفاق)
طیب و طیب جو ہیں تجنیس بہم طیب سے ہے (بوئے خوش، پاک، پاک شدن)

وقت کا راگ بھی کیا ہے الفِ شاب و شباب (جوان - جوانی)
منحنی شکل میں کس طرح خجل شیب سے ہے (پیری)

اِس میں آزاد کی تخصیص نہیں ہے کوئی
کون ایسا ہے مبرا جو ہر اِک عیب سے ہے

جذباتِ مبارک

از حضرت مبارک عظیم آبادی

ترے درد کا وہ مزا جانتے ہیں
کہ اس درد کو جو دوا جانتے ہیں

تری بے نیازی کے قربان کافر
خدا کی قسم سب خدا جانتے ہیں

بہت دیکھے ہیں موہنی شکل والے
یہ سفاک دل لُوٹنا جانتے ہیں

تمہیں کیا خبر دوستی کیا بلا ہے
ارے ہم وفا آشنا جانتے ہیں

یہ چرچے ہیں کس کی جفا کے بتاؤ
کسے ناشناسِ وفا جانتے ہیں

وہ کہہ دیتے ہیں عرضِ مطلب سے پہلے
کہ ہم آپ کا مدعا جانتے ہیں

خدا کیلئے ہم ہیں بندے خدا کے
نہ پوچھیں ہم اس بت کو کیا جانتے ہیں

بلائیں لیا کرتے ہیں زلف و رخ کی
بلا کو کہاں ہم بلا جانتے ہیں

جھلکتا ہے ہر رنگ میں رنگ تیرا
یہ نیرنگ رنگ آشنا جانتے ہیں

یہ کالی بلا رات بھی کیا بلا ہے
تری زلف کے مبتلا جانتے ہیں

ہماری جبیں سائیاں پوچھ ان سے
یہ سجدے ترے نقشِ پا جانتے ہیں

وہ کیا جانیں بے درد ہیں جو مبارک
مرا درد - درد آشنا جانتے ہیں

تجلیاتِ قیس

از جناب حاجی آر قیس صاحب شیخپوری

الٰہی ہجر کی شب کا فسانہ ختم کرنا
مجھے رخصت جہاں سے صورتِ شمعِ سحر کرنا

بہ معراجِ محبت سر کو نذرِ سنگِ در کرنا
علاجِ زخمِ دل ہے ، دعوتِ تیرِ نظر کرنا

تری محفل میں لائی ہے کشش شوقِ شہادت کی
مری جانب بھی اے چشمِ تغافل اک نظر کرنا

کلیجہ دیکھ اپنے کشتۂ کامانِ محبت کا
نہ کرنا صبر اور دو بھی تری بیداد پر کرنا

ہمارے شیشۂ دل میں ہیں حوریں باغِ رضواں کی
کوئی مت زاہدوں کو اس حقیقت کی خبر کرنا

قیامت ہے قفس میں فصلِ گل کی آمد آمد پر
کسی بے بال و پر کا آرزوئے بال و پر کرنا

سکونِ یاس ہی مجھکو میسر کاش ہو جائے
جفا کرنا اگر مجھ پر تو ظالم عمر بھر کرنا

تڑپ تو مٹ گئی دل سے مرے شوقِ رہائی کی
کرم صیاد کا ہے مجکو یوں بے بال و پر کرنا

رقیبوں کو کیا بدمست تیری چشمِ میگوں نے
کسی دن اس طرف بھی اک عنایت کی نظر کرنا

وہ بولے ہنس کے میرے شکوۂ ترکِ محبت پر
یہاں فرصت کسے ، جو کام کرنا مختصر کرنا

تمنا ہے کہ دیکھیں قیس پھر اکبار وہ منظر
نہا کر دوش پر اسکا وہ گیسو منتشر کرنا

لمعات سوز ناروی

زمانہ ہے خفا بھی بدگماں بھی
مصیبت ہو گیا عشقِ بتاں بھی

نفس کا سلسلہ آخر کہاں تک
رُکے گا ایک دن یہ کارواں بھی

مصیبت میں ہے تسکینِ خاطر
کبھی آتی ہے یادِ رفتگاں بھی

انھیں ہونے لگا پھولوں سے بھی رشک
ہوئی متروک سیرِ گلستاں بھی

نہ دوں یک لمحۂ دورِ محبت
اگر دیں خضر عمرِ جاوداں بھی

وہ کچھ تو مانگتے ہیں پیارے دل،
اُنھیں منظور ہے کچھ امتحاں بھی

یہ نعمت ہے کہاں سب کو میسّر
خدا کی دین ہے زورِ بیاں بھی

حسینوں سے جو شوقِ گفتگو ہے،
تو سیکھو سوز گجراتی زباں بھی

غزل

از جناب ممتاز الحق صاحب ساغر ہرنوی (عظیم آبادی)

بتوں کی یاد سے تھک کر خدا کو یاد کرتے ہیں،
کبھی کعبہ کبھی ہم بتکدہ آباد کرتے ہیں،

مرا دِل توڑ کر شوخی سے یہ ارشاد کرتے ہیں
ہم اپنے گھر کو اپنے ہاتھ سے برباد کرتے ہیں،

محبت نام ہے کسکا سمجھ میں کچھ نہیں آتا
مگر اتنا سمجھتے ہیں کسی کو یاد کرتے ہیں،

ہماری بے خودی خود ہی زبانِ حال ہے گویا
کسی کی عشق میں دن رات ہم فریاد کرتے ہیں،

غلامی کا گلے میں طوق ہے، توڑ ڈالے ساغر
وہی تم بھی کرو دنیا میں جو آزاد کرتے ہیں

تیری یاد

از جناب نجم کاکوی

جب نجمِ فلک پر روشن تارے اپنا رنگ جماتے ہیں
ہم تیری یاد میں آنکھوں کی سیلابِ اشک بہاتے ہیں

آغوش میں دریا کی موجیں جس طرح سے لہریں لیتی ہیں
سینے میں مرے جذباتِ محبت یوں طوفان اٹھاتے ہیں

اے کیفِ جنونِ عشق تجھے اس عالمِ نو میں پہونچا دے
ہر تارِ نظر یعنی جس جا اک آن میں بس جل جاتے ہیں

جب تو ہی نہیں کس سے کہوں جو حال ہے اپنا ان روزوں
اٹھتا ہے درد تو ہاتھوں سے ہم اپنے دل کو دباتے ہیں

ہیں دور نگاہوں سے پھر بھی، اک ربطِ نہاں ہے ہر ساعت
دنیائے تصور میں اکثر بے پردہ نظر وہ آتے ہیں

آغوش میں گُل کی جب بلبل مشغولِ ترنم ہوتی ہے
تصویر کسی کی رہ رہ کر سینے سے نجم لگاتے ہیں

فلسفۂ ہستی

از جناب بسمل آزادی،

(۱)

کچھ بات سمجھ ہی میں نہیں آتی ہے
دنیا کہاں آتی ہے کہاں جاتی ہے

مٹنا ہے تو غم مٹنے کا کیا بسملؔ!
ہستی مجھے ہر پہر کے یہ سمجھاتی ہے؟

(۲)

جو لطف بلندی میں ہے پستی میں نہیں
کب جوشِ سرور رنگ مستی میں نہیں

ہوں نیستیٔ دہر کا قائل بسملؔ!
ہستی ہستی ہے کچھ بھی ہستی میں نہیں

مزاحیات بیخودؔ

از مولوی سید ناظر امام صاحب بیخودؔ ندوی

اے دلِ بیقرارِ حُسن، ہو نہ کسی پہ لوٹ پوٹ
مفت نہ اپنی جان کھو، تیرِ نظر کی کھا نہ چوٹ

آدمی ہے وہی کرے، اپنا جو آپ احترام
وہ بھی ہے کوئی آدمی، پیسوں پہ بیچدے جو ووٹ

ایسی بھی کیا تونگری! کارِ نکو کے واسطے
جیب میں بھی نہ جائے ہاتھ، ہو میں پہ ہو خرچ نوٹ

خیر نہیں ہے مرغِ دل! تیری کہ آرہے ہیں وہ
کاندھے پہ رائفل لئے پہنے شکاریوں کا کوٹ

چھیڑ نہ مے کشوں کو شیخ ورنہ نہیں ہی خیریت
آئے ہیں میکدے میں آج، باندھ کے یہ جوان لنگوٹ

اپنی یہی ہے آرزو اور یہی ہے اِلتجا
میری طرف سے اے خدا! ہو نہ کسی کے دل میں کھوٹ

صدق و صفا کا دہر میں عشرِ عشیر بھی نہیں
عین دیانت اب یہ ہے، لوٹ اِنہیں تو اُن کو لوٹ

ہم جو ہوئے گریجویٹ، پھر تو دماغ پھر گیا،
رہنے لگے رزرو اور کرنے لگے بڑوں پہ چوٹ

بیخودؔ خوش مزاج آج، بزم میں کیوں خموش ہیں
ہو تو نہیں گیا کہیں، کیسۂ تن سے دِل کا نوٹ

تقریظ و انتقاد

اردو رسالوں کے چند سالنامے

ہمایوں کا سالگرہ نمبر سنہ ۴۰ء (مصور) ایڈیٹر جناب بشیر احمد بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا

جائنٹ ایڈیٹر جناب حامد علی خاں صاحب - حجم ۱۰۰ صفحے - تقطیع ندیم - قیمت ۱۲/

پتہ :- مینیجر رسالہ ہمایوں ۲۳ لارنس روڈ ، لاہور

ہمایوں ، اردو کا قابل قدر سنجیدہ ادبی رسالہ ہے جو اپنی ایک روش پر جاری ہے - اس کا سالگرہ نمبر ہر سال ماہ جنوری میں شائع ہوتا ہے - ادھر چند سال سے اردو کی بقا ، ترقی اور حفاظت کی منظم تحریک کا خاص طور پر داعی ہے - سنہ ۴۰ء کے سالگرہ نمبر میں اپنے افتتاحیہ میں سنہ ۳۹ء میں ہندوستان میں اردو ، کے عنوان پر صوبہ وار نظر ڈالی ہے - صوبہ بہار کے متعلق لکھتا ہے -

" بہار میں اردو عدالتوں میں کہنے کو " داخل " کر دی گئی ہے - لیکن اسے کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ دیا گیا ہے - حکومت تحریری موقعوں پر اردو دان پبلک سے اردو میں خطاب نہیں کرتی - چنانچہ جن سرکاری فارموں پر کئی زبانیں ہوتی ہیں ، ان میں رسالہ " ندیم " کی استدعا ہے کہ " اڑیا جیسی غیر ضروری زبان کے نیچے ہی غریب اردو زبان کو بھی رہنے کی جگہ عنایت کی جائے " "

خاتمہ کلام میں کہتا ہے " سنہ ۳۹ء کی خبر یہ ہے کہ اردو والوں نے کچھ کام کرنا شروع کر دیا ہے " " جہاں نما " اس کا مستقل عنوان ہے - جس میں سنہ ۳۹ء کے اہم واقعات تاریخوار جمع کئے گئے ہیں - اس کے بعد مضامین نظم و نثر شروع ہوتے ہیں - جن میں اولیت والاشان شاہزادہ نواب اعظم جاہ بہادر کے کلام شاہانہ کو حاصل ہے - قابل ذکر مضامین میں مدیر رسالہ کا مضمون " کشمیر ، اس کی تاریخ اور اسکے مسائل " کے عنوان سے ہے - ہمایوں کے روشناس افسانہ نگار حضرت فلک پیما کا ایک ڈراما " ماں بیٹی " کے عنوان سے ، ایک افسانہ " بابا " کی سرخی سے ہے - یاد آتا ہے ایسا ہی افسانہ چند سال پہلے بھی کہیں پڑھنے میں آیا تھا ــــ منظومات میں حضرت امجد ، خلیفہ عبد الحکیم ، عبد السمیع پال ، حامد علی خاں وغیرہ کے کلام ہیں - امید ہے کہ یہ سالگرہ نمبر سنجیدہ حلقوں میں ذوق کی نظر سے پڑھا جائے گا -

سالنامہ ساقی سنہ ۴۰ء (مصور) ، ایڈیٹر جناب شاہد احمد بی - اے (آنرز) دہلوی ،

تقطیع ندیم - حجم ۳۰۴ صفحے ، قیمت ۴/

ماہنامہ ساقی بھی غیر معمولی سلامت روی سے اپنی زندگی کی منزلیں طے کر رہا ہے - اس کی دسویں سالگرہ کے موقع پر ماہ جنوری میں اس کا سالنامہ شائع ہوا ہے - سالنامہ کا آغاز نامور مترجم مولانا عنایت اللہ دہلوی کی ایک مترجم تمثیل سے ہے - سیکسپیر کے مشہور ڈراما

رومیو جولیٹ کا اردو ترجمہ ہے۔ ترجمہ کی شگفتگی، برجستگی، روانی، سلاست وہی ہے جو اس نامور مترجم کے قلم کی خصوصیات بن چکی ہے۔ پروفیسر عندلیب شادانی نے "خواجہ حافظ اور شراب شاہد" کے عنوان سے بڑی بیباکی کے ساتھ حافظ شیراز کو بے نقاب کرنا چاہا ہے اور ان کے خوش عقیدہ شارحین پر گرم نگاہ ڈالی ہے۔ بڑے جوش اور ولولے سے دلائل میں اشعار پر اشعار نقل کرتے گئے ہیں۔ مگر سچ یہ ہے کہ آخر میں خواجہ حافظ کی کرامت کا ظہور ہو ہی گیا۔ مقالہ نگار کا قلم "حافظ کے روحانی تصرفات" سے اچانک "مسحور" نظر آتا ہے۔ اور وہ جو کچھ کہہ آیا ہے، اس سب کی ذمہ داری مولانا شبلی مرحوم کی شعر العجم کے ایک فقرہ پر ڈال کر خود علیحدہ ہو جاتا ہے۔ پروفیسر شادانی کے یہ مضامین نوجوانوں میں وسعت نظر اور غور و فکر کی صلاحیت پیدا کرنے میں بڑے کام آئیں گے۔ دوسرے سنجیدہ مضامین میں پروفیسر مسلم، شمس العلماء مولانا عبدالرحمن، ابوالقاسم سرور، اور پروفیسر اختر اورینوی وغیرہ کے ہیں۔

سالنامہ ساقی کے افسانوں پر کچھ لکھنے سے بہتر ہے کہ اس کے جلیل القدر اور روشناس افسانہ نگاروں کے چند اسماء پیش کر دئے جائیں وہ قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر عابد حسین، خواجہ حسن نظامی، عظیم بیگ چغتائی، ایم۔ اسلم، ڈاکٹر اعظم کریوی، حجاب امتیاز علی، انصار ناصری، احمد ندیم قاسمی وغیرہ ہیں۔ شعراء میں سے فانی بدایونی، امین حزیں، حکیم آزاد انصاری، بہزاد لکھنوی وغیرہ کے منظومات ہیں۔ ہم کارکنان ساقی کو اس قابل قدر مجموعے کے شائع کرنے پر مبارکباد دیتے ہیں۔

جدید اردو کلکتہ ادارہ جناب پرویز شاہدی، احسن احمد اشک، سعد منیر الدین و ایم زیڈ احسن فانی، ۱۹۲ صفحے ● قیمت ۱۲؍ پتہ۔ جناب اے جلیل، منیجر جدید اردو ۳۶ مارسڈن اسٹریٹ، کلکتہ

صوبہ بنگال میں اس وقت اردو زبان کی سنجیدہ ادبی خدمات ماہنامہ جدید اردو کے صفحوں کے ذریعہ انجام پا رہی ہیں۔ سال کے آغاز میں اس کا سالنامہ ندیم کے بہار نمبر کے طرز پر بنگال نمبر کے نام سے شائع ہوا ہے۔ جو نظم و نثر کے وقیع علمی، ادبی مضامین سے ترتیب پایا ہے۔ مضمون نگاروں میں ممتاز اہل علم اور شعراء میں خان بہادر مولانا رضا علی وحشت نے "اردو کا تعلق بنگالہ سے" دکھایا ہے۔ جس میں بہت سی بھولی بسری باتوں کی یاد تازہ کی گئی ہے۔ یہ مضمون ان بنگالی نوجوانوں کے لئے تازیانہ عبرت ہے جو غلط "وطنی تحریک" کی رو میں بہ کر اردو سے بے اعتنائی برتنا چاہتے ہیں۔ پروفیسر محفوظ الحق ایم۔ اے نے اپنے زیر تصحیح فارسی تذکرہ ہفت اقلیم کو اہل علم سے روشناس کیا۔ پروفیسر طاہر رضوی نے "فردوسی اور دقیقی" کے عنوان سے دقیقی کے مذہب پر روشنی ڈالی ہے۔ اور اغلاط کی تصحیح کی ہے۔ پروفیسر مولانا مظفر ندوی نے "اوقاف اسلامی کا صحیح مصرف" لئے جانے کی تحریک پیش کی ہے۔ حضرت محمود طرزی نے اپنے دور آغاز شباب کے سفر افغانستان کے مناظر افسانوی رنگ میں دکھائے ہیں۔ افسانوں میں پریم پجاری اور جمیلہ خاتون، اور ایسے ہی چند دوسرے روشناس افسانہ نگاروں کی گلکاریاں ہیں۔ منظومات میں حضرت جمیل مظہری ایم۔ اے کی ایک انوکھے انداز کی نئی نظم "تعزیت" شائع ہوئی ہے۔ موصوف کا یہ تازہ کلام غالباً سالہا سال کے بعد دیکھنے میں آیا ہے۔ حضرت اسحاق امرتسری نے ٹیگور کی ایک نظم کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ اور امیر رضا کاظم کا کلام "الزام" بھی ندرت سے خالی نہیں۔ ایک سہ رنگی اور چند مضمون نگاروں کی تصویروں سے رسالہ کی زینت بڑھائی گئی ہے۔

عالمگیر خاص نمبر سنہ ۴۲ء

ایڈیٹر جناب حافظ محمد عالم صاحب - حجم ۲۱۸ صفحے، بڑی تقطیع قیمت ۱عہ
پتہ :- دفتر عالمگیر بازار سید مٹھا - لاہور

مقبول عام ادبی ماہنامہ عالمگیر کا خاص نمبر سنہ ۴۲ء، غیر معمولی اہتمام سے شایع ہوا ہے۔ "شاہان گجرات کا توپخانہ" (مولانا سید ابوظفر ندوی) "چندا" (پروفیسر علیم الدین سالک) "آگرہ کا ایک قدیم مشاعرہ" (پروفیسر سید حامد حسن قادری) "سیاسیات عالم" (شبلی بی۔کام) "ہندوستان اور یورپی تاجر" (جناب دبیر) "روزمرہ اور محاورہ" (رشید احمد صاحب) مفید اور قابل قدر مضامین ہیں "مذاہب اربعہ" کے عنوان سے ایک مضمون اور یکجل حیثیت سے شایع ہوا ہے جو دراصل مصری اہل قلم احمد تیمور پاشا کے عربی رسالہ کی نامکمل تلخیص ہے اس مضمون کا ترجمہ چند سال گذرے "معارف اعظم گڑھ" میں چھپ چکا ہے — افسانوں میں "مختصر لفافہ" (جناب احمد ندیم قاسمی) "اس کی حسین تقدیر" (جناب مرزا ادیب بی۔اے) "گیتا" (جناب آسی رام نگری) "خار و گل" (حضرت ایم۔اسلم) "شکایتیں" (جناب شفیق الرحمٰن) وغیرہ اچھے اور دلچسپ افسانے ہیں — منظومات میں حضرت جلیل، سیماب اکبرآبادی، جگر مرادآبادی، حضرت نوح ناروی، امجد حیدرآبادی، دل شاہجہان آبادی، آثر صہبائی وغیرہ کے کلام ہیں۔ امید ہے کہ یہ سالنامہ قدردانوں میں مقبول ہوگا۔

سالنامہ ادب لطیف سنہ ۴۲ء

ادارۂ تحریر چودھری برکت علی بی۔اے، مرزا ادیب بی۔اے، مقام اشاعت مکتبۂ اردو لاہور، حجم ۲۰۴ صفحے تقطیع ندیم - قیمت عہ/

لاہور کے مشہور ادبی رسالہ ادب لطیف کا سالنامہ ماہ جنوری سنہ ۴۲ء میں شایع ہوا ہے جو ادبی، تنقیدی، اصلاحی، معاشرتی اور سیاسی مضامین اور افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ حصۂ نظم میں اکابر شعراء کے منظومات ہیں۔ ممتاز و روشناس مضمون نگاروں میں جناب شبلی بی۔کام، ماہر القادری، سہیل عظیم آبادی، اختر اورینوی، حجاب امتیاز علی، سیماب اکبرآبادی، اختر شیرانی، امین حزیں، بادشاہ حسین حیدرآبادی علیگ، روش صدیقی، علی عباس حسینی وغیرہ کی قلمی معاونت حاصل ہوئی ہے "اکبر کا انصاف" "گرمیوں کی چھٹیاں" "حجلۂ عروسی" "سنڈاسے" "مسلم" "منعم عالم" "برناڈشا کی نازک مزاجی" اچھے اور دلچسپ مضامین ہیں بعض مضامین میں خصوصاً افسانوی حصے زیادہ قابل قدر ہیں۔ ایک سہ رنگی تصویر اور مضمون نگاروں کے مرقع شایع کئے گئے ہیں امید ہے کہ قدردانوں میں اس کی مقبولیت ہوگی۔

ماہنامہ الفرقان کا خاکسار تحریک نمبر

، ایڈیٹر مولانا محمد منظور نعمانی، حجم ۱۲۰ صفحے $\frac{20 \times 26}{8}$ سائز
پتہ :- دفتر الفرقان - بریلی،

ماہنامہ الفرقان کے تین مہینوں کا مشترک رسالہ "خاکسار تحریک مذہب و سیاست کی روشنی میں" کے عنوان سے شایع ہوا ہے خاکسار تحریک پنجاب سے نکل کر ہندوستان کے مختلف گوشوں میں پھیل رہی ہے۔ اور اس تحریک کے بانی کی قوت تبلیغ سے فروغ پا رہی ہے۔ اگر خاکسار تحریک کو مذہب سے علیحدہ رکھ کر محض سیاسی خیالات کے ماتحت چلایا گیا ہوتا تو ہر شخص کو آزادی تھی وہ اس کو قبول کرتا، مگر اس کے برخلاف کہا جاتا ہے کہ "یہ خالص مذہبی اصلاحی اور معاشرتی تحریک ہے...... کوئی سیاسی تحریک نہیں" اس لئے قدرۃً اس تحریک کے ساتھ اس کے بانی کی رسوائے زمانہ بدنام کتاب "تذکرہ" کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ خصوصاً جب کہ یہ برملا کہا جاتا ہے کہ خاکسار تحریک کا مقصد تذکرہ کے پیغام کی عملی تصدیق ہے تو اس تحریک سے مسلمانوں کو متنبہ کرنا ایک دینی فرض قرار پاتا ہے کہ بانی تحریک کے اسلام کا خاکہ بادیۂ عرب کے بجائے ستشرقین یورپ کے

درس کے حلقہ میں تیار ہوا ہے۔ ماہنامہ الفرقان نے اسی نقطۂ نظر سے اس نمبر میں اس تحریک کے بانی کے عقائد اور لائحہ عمل پر تفصیلی نظر ڈالی ہے اور آخر میں ان مغالطوں کو دور کیا ہے۔ جو تحریک کے بانی کی دینی گمراہیوں کے باوجود اجتماع و تنظیم کی خاطر اس میں شریک ہونے کی دعوت دیجاتی ہے۔
یہ پورا نمبر انہیں مباحث پر سیر حاصل تبصرہ سے لبریز ہے۔ اس تحریک کے موافق و مخالف دونوں طبقوں کے لئے یہ دلچسپ نمبر ثابت ہوگا۔

رسالہ البیان کا اقبال نمبر

حجم ۸۰ صفحے، $\frac{20\times26}{8}$ سائز، قیمت ۴ر

پتہ:۔ دفتر "امت مسلم"، بیرون دروازہ چکمان - امرتسر

البیان اہل قرآن کی جماعت امت مسلمہ کا ترجمان ہے۔ اس کے دسمبر ۱۹۳۹ء کا پرچہ اقبال نمبر کے نام سے شایع ہوا ہے۔ حضرت عرشی امرتسری کا ایک مضمون "علامہ اقبال کی صحبت میں" اس نمبر کی اصل جان ہے جس میں مختلف صحبتوں کے مذاکروں کے حالات لکھے گئے ہیں۔ "مکتوبات اقبال" میں چند خطوط چھاپے گئے ہیں۔ جن میں سے بعض حضرت عرشی اور بعض پروفیسر تبسم کے نام کے ہیں۔ پھر "اقبال اور صنف لطیف" "اقبال کا عشق قرآن" اور "اقبال اور قرآن" کے عنوانوں سے مضامین ہیں۔ "یاد ماضی" کے تحت میں وہ نظمیں جمع کی گئی ہیں جو حضرت عرشی نے علامہ اقبال مرحوم کی طویل خاموشی پر پہلے لکھی تھی اور اقبال نے ایک نظم میں جواب دیا تھا۔ پھر دو نظمیں اس پر اور کہی گئی تھیں۔ یہ گرچہ مختصر نمبر ہے مگر حضرت عرشی کے مضمون اور خطوط سے اس کی اہمیت اور افادہ میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اہل ذوق اس سے فائدہ اٹھائیں۔

پیشوا کا صلاح الدین نمبر

اڈیٹر جناب سید عزیز حسن بقائی، ۴۵ صفحے
ندیم سائز، قیمت ۳ر، پتہ:۔ دفتر پیشوا دہلی،

ماہنامہ پیشوا کے فروری ۱۹۴۰ء کا پرچہ "صلاح الدین نمبر" کے نام سے شایع ہوا ہے۔ جو مولوی رشید اختر صاحب ندوی کے طویل مضمون یا گویا ایک کتاب پر مشتمل ہے۔ جس میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے سوانح حیات اختصار اور جامعیت سے جمع کئے گئے ہیں۔

نئی کتابیں

سائنس کی انوکھی کہانی

مصنفہ جناب ڈاکٹر قدرت خدا صاحب، ڈی ایس سی (لندن) ایف آئی سی - ایم - اس - سی (کلکتہ) مترجمہ مولوی رشید احمد صاحب ندوی، پبلشر ماڈرن بک ایجنسی نمبر ۱۰ کالج اسکوائر - کلکتہ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ، قیمت مجلد دو روپیہ بارہ آنے ،

ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں مڈریکولیشن کے امتحانات کے مادری زبان میں دئے جانے کی اجازت منظور ہو چکی ہے - اس لئے اہل علم کو یہ مناسب خیال پیدا ہوا ہے کہ مختلف علوم و فنون کی درسی کتابیں اردو زبان میں منتقل کی جائیں - اس سلسلہ کی ایک کڑی "سائنس کی انوکھی کہانی" کے نام سے شائع ہوئی ہے - یہ کتاب جناب ڈاکٹر محمد قدرت خدا صاحب صدر شعبۂ کیمیا پریسیڈنسی کالج کلکتہ کی تصنیف ہے، اور مصنف ہی کی توجہ سے اردو زبان میں انگریزی سے ترجمہ کی گئی ہے - ترجمہ مولوی رشید احمد صاحب ندوی نے کیا ہے - مضامین کی صحت کی نگرانی خود مصنف نے کی ہے، اور زبان کی صحت اور روانی پر جناب پروفیسر طاہر رضوی نے نظر ثانی فرمائی ہے - ترجمہ ایسا شگفتہ اور رواں ہے کہ گویا کتاب اردو زبان ہی میں تصنیف ہوئی ہے - اصطلاحات کیلئے جامعہ عثمانیہ کے قبول کئے ہوئے اصطلاحات پر اعتماد کیا گیا ہے -

کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے - "داستان علم ہندسہ" "طبقات الارض" "عالم نباتات" "حیات حیوانات" "داستان عضویات" "شئے مادہ کی مختلف کہانیاں" "علم کیمیا کی ابتداء" سب سے توجہ کے لائق اس کتاب کا طرز بیان ہے - ان خشک علمی معلومات کو ایسے اسلوب میں بیان کیا ہے کہ واقعی کہانی کا لطف آتا ہے - اور لطف مطالعہ کے ساتھ معلومات کا خاصہ ذخیرہ پڑھنے والے کے ذہن میں جمع ہو جاتا ہے - کتاب میں جا بجا حسب ضرورت اجرام ارضی و سماوی کے اشکال، حیوانات و نباتات اور سائنٹیفک آلات کی تصویریں منسلک کی گئی ہیں، اس کتاب کے سائنس کے طلبہ کے لئے مفید ہونے کی شہادت دینا سورج کو چراغ دکھانا ہے - امید کہ طلبہ اس اردو ایڈیشن سے پورا فائدہ اٹھائیں گے اور مصنف، مترجم اور مصحح کی جانفشانیوں کی قدر دانی کریں گے -

شبِ غم

از جناب ایم - اسلم، صاحب ناشر دارالادب پنجاب، بانده خانہ روڈ - لاہور ۲۱۸ صفحے - تقطیع چھوٹی - قیمت مجلد

جناب میاں محمد اسلم صاحب کے افسانے تعارف کے محتاج نہیں، انہوں نے افسانوں کے ہزاروں ہزار صفحے لکھے اور ایسے مقبول ہوئے کہ بار بار چھپے، "شب غم" میں ایک فاحشہ کی زندگی کے واقعات چند خطوط کے مجموعہ میں قلمبند کئے گئے ہیں، وہ اپنی ناپاک زندگی سے متنفر ہوئی ہے اور ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے، جن لوگوں نے مصنف کا افسانہ "نرگس" پڑھا ہے، وہ "شب غم" کے بھی سوز گداز، حلاوت دلکشی، دلفریبی، جذبات کی پاکیزگی، ایثار، قربانی اور سچی محبت کی وارفتگی کا اندازہ کر سکتے ہیں، "نرگس" اور "شب غم" میں نمایاں فرق یہ ہے کہ "نرگس" محبوب کے فراق میں گھل گھل کر جان دے دیتی ہے، اور "شب غم" کی ہیروئن "اختر" محبوب کی آغوش میں ابدی نیند سو جاتی ہے —— ہم جناب میاں محمد اسلم کو اس کامیاب تصنیف پر مبارک باد دیتے ہیں -

دنیا کی کہانی

از جناب محمد مجیب صاحب بی۔ اے (آکسن)
ناشر مکتبہ جامعہ، قرول باغ، دہلی
حجم ۲۲۷ صفحے، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت ۱/ ۱۲

"یہ دنیا کی کہانی" پروفیسر مجیب کی زبانی ہے، جسے انہوں نے ریڈیو اسٹیشن سے سنائی ہے، پروفیسر موصوف کہتے ہیں:۔

> یہ ذرا سی کتاب چند تقریروں کا مجموعہ ہے جو آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن کی فرمائش پر تیار کی گئی تھیں اور اسی کی اجازت سے اس شکل میں چھاپی جا رہی ہیں، اسے تاریخ کہتے ہوئے شرم آتی ہے، اور کہانی میں جو دلچسپی چاہئے وہ اس میں نام کو نہیں ۔"

مگر سچ یہ ہے کہ اب سے پچھلی دنیا کو جیسے مبصرانہ انداز میں اس مختصر کتاب میں پیش کیا گیا ہے وہ بڑی بڑی تاریخوں میں موجود نہیں، اور انداز بیان ایسا ہے کہ آدمی اس کو کہانی ہی نام دینے کو جی چاہتا ہے ۔ دنیا میں جتنے بڑے بڑے انقلابی دور گذرے ہیں، یعنی جس دور کے آغاز سے کسی پچھلے دور کا خاتمہ ہوا ہے۔ ان سب کو مستقل باب قرار دیکر ان پر دلنشیں اور جامع بیان مرتب کیا ہے۔ ابواب یہ ہیں:۔ "دنیا کی کہانی" یعنی پیدائش و نشو و نما ۔"دنیا کی پہلی تہذیبیں مشرق و مغرب کی" ۔ یونانی تہذیب ۔ یونان اور روم ۔ قدیم چینی تہذیب ۔ قدیم ہندوستان ۔ عیسائی مذہب ۔ اسلام ۔ مسلمانوں کی سیاست ۔ مسلمانوں کی تہذیب ۔ ترک اور تاتاری ۔ ہندوستان میں یورپی تہذیب کی ابتدا، جدید یورپ کی سیاست ۔ جدید مغربی تہذیب ۔ آج کی دنیا

سمجھا جا سکتا ہے کہ ان جامع عنوانوں کے بعد دنیا کی اور کون سی چیز ان سے رہ جاتی ہے ۔ اسی مختصر مجموعہ میں سارے اشارات اور دنیا کے مختلف دوروں کے متعلق صحیح عالمانہ نظریہ بیان کر دئے گئے گو ہر کسی کی تمام رایوں اور نقطۂ نظر سے اتفاق ممکن نہیں، لیکن سب اپنی اپنی جگہ قابل قدر ہیں کہ وہ غور و فکر کے بعد قائم ہوئے ہیں، خواہ وہ کہیں کہیں محل نظر ہی کیوں نہ ہوں ۔

اس کتاب کا مطالعہ دنیا کی بڑی بڑی تاریخوں کے پڑھنے اور سمجھنے میں بڑی مدد دے سکتا ہے ۔"الہرا" اور بعض اور ایسی ہی کتابت کی ایک دو مسامحتیں نظر آئیں جو کسی اچھی کتاب میں ناگوار گذرتی ہیں۔

مجنوں کے افسانے

از جناب مجنوں گورکھپوری،
ناشر حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر، دہلی،
۱۸۰ صفحے، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ، قیمت ۱۲/

جناب مجنوں گورکھپوری المیہ افسانہ نویسی میں ملک میں روشناس ہو چکے ہیں ۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "ہیتا اور دوسرے افسانے" کے نام چھپا تھا۔ اب اس کے ختم ہونے کے بعد وہی مجموعہ "مجنوں کے افسانے" کے نام سے حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی نے شایع کیا ہے۔ "شان نزول" کی سرخی سے افسانہ نگار نے خود اپنی کتاب کا دیباچہ لکھا ہے، اور اس میں اپنے افسانوں پر نقد بھی کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

> "ان افسانوں کو میں کئی اعتبار سے اپنا حاصل عمر سمجھتا ہوں اور ان میں سے بعض تو ابھی میرے بہترین ادبی کارنامے کہے جانے کے مستحق ہیں ۔"

ہم موصوف کے اس بیان کی تصدیق کرتے ہیں، امید ہے کہ یہ مجموعہ بھی پہلے کی طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا ۔

اردو ہندی

از جناب ایم۔ اسلم، ۴۸ صفحے، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶
ناشر ملک دین محمد اینڈ سنز
بل روڈ۔ لاہور، قیمت ۴/

آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے ملک کے چند مشاہیر کی تقریریں "ہندوستانی کیا ہے" کے موضوع پر فروری ۳۹ء میں ہوئی تھیں ۔ ان تقریروں کا مجموعہ جامعہ سے شایع ہو چکا ہے جناب میاں محمد اسلم صاحب نے ان تقریروں پر علیحدہ علیحدہ تبصرہ ایک مضمون کی صورت میں کیا تھا جو ماہنامہ ساقی میں شایع ہوا تھا۔ کچھ دن ہوئے یہ مضمون کچھ مزید

نئی کتابیں

نامورانِ اسلام — اِس میں کوئی ساٹھ بزرگوں، سپہ سالاروں اور بادشاہوں کے حالات درج ہیں۔ یہ انسانیت کے وہ خادم ہیں جنھوں نے اپنے علم و عمل سے دنیا کی تاریخ بدل دیں۔ قیمت ۱۲؍

کایا پلٹ — ایک چھوٹا سا ڈراما ہے۔ مگر بہت ہی مزے دار۔ ایک سست اور کاہل صاحبزادے کیا کیا حرکتیں کرتے ہیں اور پھر اُن کے ساتھی اور استاد انہیں کس طرح سیدھے راستے پر لاتے ہیں۔ قیمت ۳؍

دو بھائی — ایک بے وقوف باپ نے اپنے چالاک بھائی کے کہنے پر اپنے دو بچوں کو جنگل میں چھوڑ دیا، اُن دونوں نے اپنے لئے خود راستہ پیدا کیا۔ اپنی جد و جہد اور سمجھ بوجھ کی بدولت شاندار کامیابی حاصل کی۔ دونوں بھائیوں کی جدائی۔ ملاقات۔ ایک دوسرے کی جان بچانا۔ ایسے دلچسپ واقعات ہیں کہ پوری کتاب پڑھے بغیر چین نہیں آتا۔ قیمت ۴؍

قومی نظمیں — اِس مختصر سی کتاب میں ایسی نظمیں ہیں جو دلوں میں قومی جذبہ پیدا کریں گی اور انہیں اپنی قوم و ملک کا سچا نوجوان بنائیں گی۔ یہ قومی گیتوں کا مجموعہ استادوں کے لئے بہت کام کی چیز ہے۔ قیمت ۴؍

صدر دفتر:- مکتبہ جامعہ، نئی دہلی۔

شاخیں:- جامع مسجد، دہلی - لوہاری دروازہ، لاہور
امین آباد، لکھنؤ - پرنس بلڈنگ، جے جے اسپتال، بمبئی

ضروری اطلاع ←—— اس کے پڑھنے سے لاکھوں کا بھلا ہوگا

صاحبان! میں نہ حکیم ہوں نہ ڈاکٹر بلکہ ایک معمولی آدمی ہوں۔ بدقسمتی سے مجھے اپنے ہاتھوں اپنی جوانی کا ستیاناس کرنے والی عادت پڑ گئی تھی جن کے نتیجہ بد سے بے خبر تھا۔ عرصہ ڈیڑھ سال کے بعد مجھے نامردی کا مرض لاحق ہو گیا۔ سرعت۔ جریان۔ احتلام وغیرہ کی شکایتوں کے سبب میرا چہرہ و بدن بد رونق ہوتا جاتا تھا۔ رگ رگ میں ہر وقت درد رہتا۔ سر چکراتا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آتا۔ گھبراہٹ سستی اور اداسی چھائی رہتی تھی۔ دوست میری پژمردگی کا سبب پوچھتے تھے مگر میں کبھی کو اپنی حالت سے آگاہ کرنا مناسب نہ سمجھتا تھا۔ مگر درپردہ مشہور شہروں کے بڑے بڑے ڈاکٹروں اور حکیموں سے ادویات منگوا کر استعمال کرتا رہا۔ لیکن مجھے بالکل ذرا بھی فائدہ نہ ہوا۔ بلکہ علاوہ طرح طرح کی اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس مایوسی کی حالت میں زندہ در گور ہونے کو ترجیح دیتا تھا۔ خوش قسمتی سے مجھے ایک ملازمت میں پشاور جانا ہوا۔ پشاور جس جگہ میں ٹھہرا۔ ایک فقیر خوبصورت جو ہال [illegible] تھے مجھ سے پوچھنے لگے کہ تمہاری صورت مریضوں کی سی کیوں ہے۔ میرے پر درد دل نے اس خوبصورت کو سارا ماجرا کہہ ڈالنے کی ہدایت کی۔ چنانچہ میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ اب میں زندگی سے تنگ آ کر خودکشی کرنے پر آمادہ ہوں۔ اس فقیر صاحب کمال نے رحم فرما کر ایک نسخہ بنانے کیلئے مقوی گولیوں کا۔ دوسرا نسخہ رگوں اور پٹھوں کی سستی دور کرنے کیلئے مالش کا بتلایا۔ چنانچہ میں نے حسب ارشاد ان صاحب کمال کے لاتعداد اور جنگلی جڑی بوٹیاں اور کئی ادویات بازار سے خرید کر ہر دو جوہر کیمیا کو تیار کر کے استعمال کرنا شروع کیا **ناظرین میں خدا کو** حاضر ناظر جان کر سچ کہتا ہوں کہ ساتویں روز ہی میری تمام شکایتیں رفع ہونی شروع ہو گئیں۔ اور میں اپنے آپ کو قابل فخر کہنے کا مستحق ہو گیا۔ [illegible] ارشاد اپنے محسن خوبصورت کے ۲۱ روز تک پرہیز اور علاج جاری رکھا [illegible] میرا معدہ ہضم کر لیتا تھا۔ میرا چہرہ بارونق بدن مضبوط۔ بینائی طاقتور ہو گئی۔ اب میں ایسا قابل فخر مرد بن گیا ہوں جس کے بیان [illegible] تہذیب اجازت نہیں دیتی۔ واپس آ کر یہی مانند دوائی کا نامردی کے مایوس مریضوں پر تجربہ کیا تو ہر قسم کی نامردی سستی۔ جریان۔ احتلام سرعت وغیرہ کیلئے اکسیر پایا۔ پھر کئی ہمدرد اشخاص کے اصرار پر اشتہار بغرض رفاہ عام دیا جاتا ہے کہ جو صاحب اس نامناک عادت کے شکار بن کر حظوظ النفسانیت سے محروم ہو بیٹھے ہوں اور سینکڑوں روپیہ علاج معالجہ [illegible] کر کے بھی [illegible] ہو چکے ہوں وہ ان [illegible] الاثر دوائی کو استعمال کر کے صحتیاب ہو جائیں۔ اور خدا کے فضل کے گیت گائیں۔ قیمت مقوی گولیاں جس میں [illegible] روز کی [illegible] خوراک موجود ہے [illegible] روغن مالش طلاء جس میں ۲۱ روز تک رگوں اور پٹھوں کیلئے کافی ہے [illegible] جریان کیلئے گولیاں [illegible] ہیں۔ روغن مالش طلاء سے کسی قسم کی چھنسی یا آبلہ ہرگز نمودار نہ ہوگا۔ اس دوائی میں کشتہ وغیرہ کی آمیزش نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ [illegible] بوڑھا جوان آسانی بلا لحاظ موسم کے ان گولیوں کا استعمال کر سکتا ہے اور لطف یہ کہ اس دوائی کے استعمال کے بعد دوبارہ کسی دوائی کی ضرورت نہ رہیگی۔ آخر یہ بھی ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اشتہار چھاپنے سے میری کوئی ذاتی غرض نہیں اور نہ میرا مطلب جعلی اشتہار شائع کر کے پبلک سے روپیہ کمانے کا ہے۔ بلکہ فائدہ خاص و عام کا مدنظر رکھ کر اور احباب کے اصرار پر اشتہار شائع کیا جاتا ہے۔ تندرست اصحاب بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں کیونکہ اس کے استعمال سے سست سے سست اور جست سے طاقتور بن جاتا ہے۔ اگر بڑھاپے میں بھی لطف جوانی اٹھانا چاہتے ہیں تو ان گولیوں اور روغن مالش طلاء کا استعمال کریں۔ ان کے استعمال سے بدن میں خون پیدا ہو جاتا ہے الغرض جب تمام جرحہ ڈھیلا ہو گیا ہو تو ان کا استعمال کریں۔ مکمل پرچہ ترکیب ہمراہ دوا ہوگا۔ محصولڈاک [illegible] علاوہ۔ تمام خط و کتابت پوشیدہ رکھی جاتی ہے۔

نوٹ: کوئی صاحب مجھے اور دوائی کے لئے تکرار نہ کریں۔ یہ گورنمنٹ آف انڈیا سے رجسٹرڈ ہے۔ آرڈر دیتے وقت اپنا پتہ مکمل خوشخط تحریر کریں۔

شرطیہ علاج اور شرطیہ وعدہ۔ ہندو کو دھرم اور مسلمان کو ایمان کی قسم ہے کہ اگر میری دوائی کے استعمال سے فائدہ نہ ہو تو حلفی تحریر بھیج کر قیمت واپس منگوالیں۔ یہ کوئی صاحب دوائی سے [illegible] بھی فائدہ نہ اٹھائیں تو ان کی قسمت

ضروری اطلاع۔ یاد رہے کہ میری دوائی نامردی سستی۔ جریان۔ احتلام۔ سرعت۔ کمزوری نامردی یہ امراض خواہ کسی سبب سے ہوں۔ جلق یا کثرت مباشرت یا عادت بد سے سب کے لئے یکساں مفید ہے [illegible] کمزوری کیلئے اس کا استعمال [illegible] دوائی اکسیر ہے

ہزاروں تعریفی خطوط و سرٹیفکیٹ موجود ہیں جن کے لکھنے والے عام صاحبان کے علاوہ کئی ڈاکٹر اور وید ہیں۔ ڈاکٹر اور ویدوں کی رائے ہے کہ دار الشفاء مقوی گولیاں و روغن مالش طلاء تیر بہدف ہے۔

خط و کتابت و دوائی ملنے کا پتہ

مینیجر دار الشفاء گولیاں رجسٹرڈ بٹالہ ضلع گورداسپور (پنجاب)

رسالہ ندیم گیا

کا

بہار نمبر سنہ ۴۲ء

مرتبۂ سید ریاست علی ندوی

چھپنا شروع ہو گیا ہے، آخر مارچ یا اوائل اپریل میں شائع ہو جائے گا تین سو صفحوں سے [illegible]
ضخامت ہوگی - مشہور آرٹسٹوں کے متعدد رنگین شاہکار، مشاہیر اور نوجوان مضمون نگاروں، افسانہ نویسوں
اور شاعروں کی بہ کثرت تصویریں، متعدد آثار قدیمہ کے فوٹو، اس کی ظاہری زیب و زینت ہیں -

معنوی حیثیت سے ایسا دلچسپ قابل قدر رسالنامہ کہیں مشکل سے دیکھنے میں آیا ہوگا حضرت علامہ
سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، ڈپٹی سید وصی احمد بلگرامی، سر خواجہ محمد نور چیف جسٹس پٹنہ ہائی کورٹ
پروفیسر طاہر رضوی، پروفیسر مظفر الدین ندوی، پروفیسر سید حسن عسکری، مولانا سید مناظر احسن گیلانی، پروفیسر ڈاکٹر شیخ
محمد عنایت اللہ پی ایچ ڈی لندن، پروفیسر محمد مسلم ایم - اے، فخر بہار حضرت مبارک عظیم آبادی، حضرت جمیل مظہری،
مشہور مزاح نگار حضرت ماہر القادری، اور اسی طرح بہ کثرت نامور ادبا و شعرا کے مضامین نظم و نثر سے

بہار نمبر سنہ ۴۲ء

مالا مال ہے -

قیمت بہار نمبر (ایک روپیہ بارہ آنے) علاوہ محصول ڈاک - مستقل خریداروں کو ان کے سالانہ زرِ چندہ صرف
چار روپیہ میں نذر ہوگا - یا تو "ندیم" کی مستقل خریداری قبول کریں، یا بہار نمبر کے لئے خاص آرڈر جلد بھیجیں،

منیجر رسالہ ندیم - گیا

رجسٹرڈ نمبر پی ۲۹۴

ماہ اگست سنہ ۴۰ء

ندیم

صوبہ بہار میں علم، ادب، تعلیم اور زبان کا ترجمان

مرتبہ

سید ریاست علی ندوی

مطبوعہ ندیم پریس، کچہری روڈ، گیا

بہار نمبر ——— اہل نظر کی نظر میں

جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی سابق وزیر تعلیم صوبہ بہار

"ندیم بہار نمبر ملا۔ میں سب تو نہیں پڑھ سکا لیکن اُسے ادھر اودھر سے دیکھا۔ آپکی محنت کی داد دیتا ہوں۔ نہایت عمدہ نمبر نکلا ہے۔ اس صوبہ میں تو تاریخ کے ہر زمانہ میں بڑے بڑے مشاہیر گذرے ہیں۔ ان کے حالات جستہ جستہ لکھنے چاہئیں۔ پھر لکھونگا اسوقت جلدی میں ہوں"

حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی

"پرچہ کی خوبیوں کا کیا کہنا۔ اتنی ضخامت اور ایسی جامعیت کا تو مجھے خیال بھی نہ تھا۔ طویل انتظار کا پورا کفارہ ہوگیا۔ وصی احمد بلگرامی صاحب حسن انشار و صحت زبان کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہیں۔ (صحیح زبان لکھنے والے اسوقت بس دو ہی چار نکلیں گے، ورنہ اور حضرات نے تو دلچسپ فقروں کو غلط زبان کا پردہ پوشش بنا لیا ہے) مولانا گیلانی کے مضمون کا کیا پوچھنا۔ پھر ہمارے سید صاحب اور ڈاکٹر عنایت اللہ اور فلاں اور فلاں، نام کن کن کے اور کہاں تک گناؤں؟ ہاں نقاب پوشن دیو جانس، کی داد نہ دینا بھی ظلم ہے۔
آپ نے محنت و تلاش کی تو ایک کرامت دکھا دی۔ البتہ کتابت و طباعت وغیرہ لوازم ظاہری کی پستی کے لحاظ سے چندہ کا پورا جواب ہے۔ تصویروں کی داد کی میں اہلیت نہیں رکھتا۔"

جناب پروفیسر محمد مسلم ایم۔اے

"گرامی نامہ شرف صدور لایا۔ ندیم کا بہار نمبر نظر افروز ہوا۔ بے شبہ کیفیت و کمیت ہر لحاظ سے یہ سالنامہ اگر اردو کے سالناموں میں بے مثال نہیں تو کم مثال ضرور ہے۔ پورا سالنامہ پڑھنے کے لئے تو شاید مجھے ایک سال چاہئے مگر جا بجا سے جو کچھ اب تک پڑھ سکا ہوں سے بصیرت افروز اور دلنواز پایا ہے۔ جملہ اصناف سخن میں گراں بہا جواہر ریزے موجود ہیں۔ ان کے ساتھ اگر خزف ملتے بھی ہیں تو وہ بیک گراؤنڈ کا کام دیتے اور ان کی تابانی کو اور بڑھاتے ہیں۔
جو وصف مجھے سب سے زیادہ قابل داد نظر آتا ہے وہ مضامین میں "بہار" کی تخصیص و تحدید ہے۔ اگرچہ میں ادب میں ایسی تحدید کا ہمیشہ مخالف رہا مگر اس کو کسی کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ندیم کے بہار نمبر کے متعلق پچھلا عریضہ صرف تعمیل ارشاد تھی۔ ورنہ اُس وقت تک میں نے صرف چند افسانے ہی پڑھے تھے۔ فرصت کم تھی، اب جوں جوں میں اسے پڑھتا گیا اس کی دل آویزی نے زیادہ فرصت نکالنے پر مجبور کیا۔ اور دوسرے ضروری

اشغال کے باوجود تمام کرکے رہا۔ چنانچہ یہ عریضہ آپ کے ارشاد سے نہیں بلکہ اُس خلشِ مسرت و امتنان کے زیر اثر ہے جو بے تسکین نہیں رہ سکتی۔

مولانا یہ اعلان عین مقتضائے انصاف ہوگا کہ یہ سالانہ نمبر معنوی اعتبار سے ہندوستان کے تمام اردو پرچوں کے سالانہ نمبروں میں اکثر سے برتر، اور کمتر کسی سے نہیں، کیفیت اور کمیت ہر لحاظ سے۔ شیر شاہ کا کردار نئی روشنی میں، فردوسی و دقیقی، اقبال کی شاعری پر تنقید، شاد کا تغزل (ولی الرحمٰن صاحب) جس محنت دقت نظر اور طباعی سے لکھے گئے ہیں اسکی کافی داد نہیں دی جاسکتی "غالب کی خودداری" نے مسحور کیا۔ مجھے خبر نہ تھی کہ بہار میں ایسی ہستیاں بھی ہیں جو زبان اور تحقیقات علمیہ میں ہندوستان کے کسی حصے میں بھی کیا صف اول میں جگہ پانے کا حق رکھتی ہیں اور ملک کے لئے باعث فخر ہیں۔

افسانوں کے متعلق میں عرض کرچکا ہوں۔ ان میں کوئی بھی عامیانہ و سوقیانہ نہیں، ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است، ٹل ٹل کی موت، شادی کے تحفے، بہاری صاحب کے علاوہ خاصہ کی چیزیں ہیں، ہر نو بنگ سبھا تو ایک مختص رنگ میں لاجواب ہی ہے، جس کیلئے مانپوری صاحب ایک جدید فنکار کا رتبہ حاصل کرچکے ہیں۔ غیر مطبوعہ مکاتیب کے عکس بھی اس نمبر کا طرۂ امتیاز ہیں، اور سپاہی کی بیٹی کے طرز اور زبان کا کیا کہنا یہ وصی احمد صاحب کی خصوصیت امتیازی ہے۔

جناب سید شاہ ولی الرحمٰن صاحب ولی ڈپٹی مجسٹریٹ باڑھ

ندیم کا بہار نمبر مونہار ہی ہوتا ہوا یہاں پہونچا اور مجھے مل گیا۔ ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں اور تحفۂ مسرت بھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ندیم نے صوبۂ بہار میں اردو کی جیسی خدمت کی پبلک سے پوشیدہ نہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ اس نے صوبہ میں متعدد ادیب و شاعر پیدا کردیے اس سے بہتر اور اس سے زیادہ دیرپا رسالہ اس صوبہ سے کبھی نہیں نکلا تھا۔ بہار نمبر کی اشاعت اسکی ایک ایسی خصوصیت ہے جس میں ہندوستان کا کوئی رسالہ اس کا حریف نہیں ہوسکتا۔ موجودہ بہار نمبر اس سلسلہ کی تیسری کڑی ہے اور میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ آئندہ نمبروں سے یہ گوئے سبقت لے گیا۔ آسمانِ ادب کا یہ نیر درخشاں ظلمت کدۂ صوبۂ بہار کو روشن و منور کرگیا۔ خدا کرے اس کی ضیا پاشیاں ہمیشہ قائم رہیں۔ اس عظیم الشان کامیابی پر ادارۂ ندیم کی خدمت میں ہدیۂ تہنیت پیش کرتا ہوں۔

پروفیسر مولانا سید ظفر الدین ندوی ایم۔اے اسلامیہ کالج کلکتہ

عرصہ کے انتظار کے بعد دفتر ہند سے "ندیم بہار نمبر" موصول ہوا، دیر آید درست آید۔ رسالہ دیکھ کر میں اور میرے احباب بہت خوش ہوئے، آپ کی محنت اور کد و کاوش پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

رسالہ کی ضخامت، مضامین کی فراوانی، علمی و تاریخی و ادبی مقالات کی بلند پائیگی، نظم و نثر کی مناسب تقسیم، غرض مجموعی حیثیت سے آپ کی کوشش امید سے زیادہ کامیاب رہی، خدا برکت دے آمین!

پروفیسر شبلی ابراہیمی ایم اے

"بہار نمبر مجھے بیحد پسند آیا۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے اور صد و سی سال تک ندیم کی خدمت کے لئے زندہ توانا و تندرست رکھے آمین! ثم آمین!!"

جناب مولانا سید شاہ صبیح الحق صاحب عمادی خانقاہ عمادیہ منگل تالاب پٹنہ سٹی

"حقیقت یہ ہے کہ ندیم کا بہار نمبر تعریف سے مستغنی ہے بلحاظ مضامین نہایت اعلیٰ ہے اور ترتیب بھی دلپسند ہے غالبًا مضامین کی ترتیب آپ نے خاص توجہ سے دی ہے۔ علمی اور تاریخی حیثیت سے چند مضامین نہایت بلند ہیں انجم صاحب کا ڈرامہ "سبھا" بھی خوب ہے۔ جس طرح نثر کی ترتیب بہتر ہے اسیطرح نظم کی ترتیب بھی بہت عمدہ ہے تصاویر کا ذخیرہ بہت زیادہ ہے مگر ہمیں جس تصویر سے دلچسپی ہے وہ اراکین ادارہ کی ہے" ساقی بنور بادہ برافروز جام ما ۔ مطرب بگو کہ کار جہاں شد بکام ما" کی تصویر بھی بہت اچھی ہے۔ "اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز ہے حسن" کی تعریف مجھ سے دکرائیے بال پک چکے ہیں اور بوڑھوں کی صف میں گھسنے کی زبردست فکر میں ہوں اس لئے اوس کے بارے میں کیا لکھوں ؎

چوں بپیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو ۔ رندی و ہوسناکی در عہد شباب اولی"

جناب کامریڈ علی اشرف صاحب محبوس سنٹرل جیل ہزاری باغ

ندیم کا بہار نمبر ملا۔ شکریہ! اپنی اس نظربندی میں جہاں اردو رسائل و کتب کی صورت دیکھنے سے بھی محروم ہوں ندیم کا ملنا نعمت سے کم نہیں۔ اس صوبہ میں جہاں کا پانی اردو صحافت کو راس نہیں آتا "ندیم" کا دم بہت غنیمت ہے۔ اور بہار نمبر نے تو بہار کی لاج رکھ لی۔ ڈوبتی ناؤ کو منجدھار سے نکال لے جانا آپ کا کام تھا اور جب ٹکڑے ٹکڑے جوڑ کر وہ "بڑے جہاز کی روانی اور شکوہ" حاصل کرلے تو ناخدا کی محنت کی داد دئے بغیر نہیں رہا جاتا۔ میری طرف سے اپنی اس کامیاب کوشش کیلئے مبارکباد قبول فرمائیے۔

جناب محمد احسن صاحب بھلواہی پوری

نہایت بے چینی اور بہت انتظار کے بعد بہار نمبر محکمۂ آبکاری کے انسپکٹر صاحب کی معرفت ۲۳ جولائی کو مجھے مل گیا۔ شکریہ ادا کرکے جی بہت خوش ہوا۔ ایسا دلکش اور بلندپایہ نمبر نکالنا آپ ہی جیسے فاضل کا کام تھا۔ دیر تو لگی لیکن ایک ایسی چیز تیار ہوئی جو اپنی نظیر آپ ہے اور جسکی تعریف جتنی کی جائے کم ہے۔ خدا نے آپکو آپکی جانفشانی اور محنت کا صلہ بہت اچھا دیا۔ اس کامیاب نمبر کی اشاعت پر آپ میری جانب سے دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

جناب حمید تاج محلی آگرہ

"میں تو واللہ ندیم کے بہار نمبر سنہ ۴۰ء سے ناامید ہو چکا تھا۔ مگر امید کے خلاف بہار نمبر میرے ادیرو ہے رحمۃ ؟

مسرت ہوئی اس کا شکریہ ... ... اس لحاظ سے ندیم بہار نمبر کا مکمل ثبوت ہے اور قابل داد ہے، یہ کدو کاوش صرف آپ کی ذات تک محدود ہے، اور حقیقتہً آپ قابل مبارکباد ہیں۔ تصاویر بھی فنی نقطۂ نگاہ سے بہترین شاہکار اور نہایت دلکش اور قابل صد تحسین ہیں۔ مضامین نثر اور نظم بھی علمی اور ادبی لطافتوں سے پر ہیں۔

اس کے مطالعہ کے بعد مجھے نہ صرف خوشی ہوئی بلکہ میرے ضمیر نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میاں نظیر کا لٹریچر آپکے ندیم کو قسط وار پیش کرتا ہوں۔ انشاء اللہ مثنوی کی دوسری قسط عنقریب روانہ کرنے والا ہوں۔

مولانا سیّد عبدالرؤف صاحب ندوی

"ندیم بہار نمبر منصور صاحب کاکوی کی وساطت سے دستیاب ہوا۔ نظرات نظر سے گذرے۔ مقالہ نگار اور مضمون نگار پہ رائے زنی اور تنقیدیں موزوں اور مناسب حال ہیں مگر مجھ جیسے مضمون نگار ... کی بابت رائے زنی میں حسن ظن اور مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ ' بایں ہمہ از دوست رسد نیکوست ' ذرہ نوازیوں کا شکریہ اور جزائے خیر کی دعا۔

پیش نظر بہار نمبر تصاویر اور مضامین اور نیز دیگر معنوی حسن و خوبی کے اعتبار سے بالا و بہتر ہے۔ تصاویر دیدہ زیب عمارات اور فرمان کا عکس جاذب نظر اور مضامین دلنشیں اور اچھوتے۔ ترتیب مضامین بہتر و خوب ہیں۔ غرضکہ ہر گونہ اور بہر حال حسن و خوبی میں آپ اپنی مثال ہے۔ ع۔ اے تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم۔ خدا حاسدوں کی نظر بد سے اسکو بچائے۔ ع۔ ز چشم بد رخ خوب ترا خدا حافظ۔ بہار نمبر سنہ ۴۱ء ان شاء اللہ مقبول خاص و عام اور جوہر شناس صاحبوں کا چشم و چراغ بنے گا۔

جس جذبۂ خیر کے ماتحت ندیم بہار کی عنان ادارت آپ نے اپنے ہاتھوں لی ہے وہ باخبر اصحاب سے پوشیدہ نہیں۔ زبان اُردو کی خدمت سرزمین بہار سے گرانقدر اور وقیع ہے مگر دشوار سے دشوار تر۔ خداوند کریم آپ کی حوصلہ شکن اور صبر آزما مساعی حسنہ کو مشکور بنائے۔ ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔"

جناب سہیل عظیم آبادی

"بہار نمبر" مل گیا۔ شکریہ! بلا تصنع یہ نمبر میری تعریف سے بالاتر ہے۔ کس کس مضمون کی تعریف کروں۔ آپنے تو خزانہ لٹایا ہے۔ یا گنگا بہائی ہے۔ یقینی طور پر یہ سنہ ۱۹۴۰ء کا شاہکار ہے۔"

جناب رحمت علی صاحب صابر نور محلوی

بہار نمبر پہنچا۔ یاد فرمائی کا شکریہ! راہ تو بہت دکھائی۔ مگر نیر صوبہ بہار کے اس بہار آفریں نمبر کو دیکھ کر انتظار کی شدت کی تلافی ہی نہیں ہو گئی۔ بلکہ سال رواں کے اس بیش بہا اور شاہکار نمبر کو دیکھ کر دل و دماغ پر ایک کیفیت سی طاری ہو گئی۔ ندیم کا بہار نمبر

ی ظاہری و باطنی، صوری و معنوی خوبیوں کے لحاظ سے اپنا آپ جواب ہے۔ یوں تو ملک میں ہر سال بلند پایہ رسائل کے خاص اور سالانہ بر شائع ہوتے ہیں۔ مگر یہ خصوصیت شاید ندیم ہی کو حاصل ہے کہ وہ بہاری ادبا و شعرا کے شہ پاروں کو یکجا کرکے بہار نمبر کے نام سے ایک مخصوص بر نکالتا ہے۔ زیر نظر شمارے میں صوبہ بہار سے متعلق جتنے مقالات اور مضامین شائع کئے گئے ہیں۔ وہ تاریخ بہار میں ایک بیش بہا اضافہ ب۔ افسانے اور حصہ نظم بھی بہت دلکش اور بلند پایہ ہے۔ جس سے اس شمارۂ خاص میں ایک تنوع اور دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔

بہار نمبر کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں آپ کی کوششیں قابل صد ستائش اور آپکی سعی مخلصانہ ہزار آفریں کی مستحق ہے۔ س دور گرانی میں اس قدر شاندار اور رنگین و جمیل صحیفۂ ادب نکالنا حقیقۃً آپ ہی کا حصہ ہے۔ جس کے لئے میں آپکو ہدیۂ تہنیت پیش کئے بر نہیں رہ سکتا۔ خدائے عزوجل آپ کی ان مساعی جمیلہ کو بارآور کرے۔ اور علم و ادب کی خدمت کے لئے عمر خضر عطا کرے۔ آمین!

مولوی سیّد محی الدین صاحب ندوی

ندیم کا بے نظیر سالنامہ نمبر ملا۔ شکریہ قبول فرمایئے حقیقت یہ ہے کہ آپنے بڑی محنت اور جانفشانی سے انمول مضامین کو حاصل کیا ، اللہ تعالیٰ آپ کی محنت کو مشکور فرمائے اور توقع ہے کہ قوم اسے قبولیت عامہ بخشے گی۔ ندیم کا یہ سالنامہ تمام سالناموں پر سبقت ے گیا ہے۔ پڑھے لکھے حلقوں نے آپ سے یہی توقع وابستہ کر رکھی تھی۔

جناب نصرت آروی

"بعد انتظار شدید کے سالنامہ ندیم (بہار نمبر) وارد ہوا۔ بے ساختہ دل سے نکلا" این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند" کاوش اور نت کی داد میرے بس سے باہر ہے۔ اس بہار کی سنگلاخ سرزمین میں ایسا چمن لگانا اور پھر ایسا گلدستہ پیش کرنا" کارے دارد" میں پ کو اور جملہ اُن ہمدردان ادب کو اس سعی جمیل پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔"

جناب ن۔ ص۔ بیگم بھاگلپور

"بہار نمبر ملا۔ شکریہ! واقعی پرچہ بڑا شاندار نکلا ہے۔ خدا ہمارے بہار کی ہر ایک چیز کو اسی طرح عروج دے۔"

مولوی مسعود الرحمٰن صاحب ندوی

"غایت انتظار کی حالت میں ندیم بہار نمبر ملا۔ اسکی ظاہری دیدہ زیبی اور دلکش ٹائیٹل پیج کے بعد اس کے قیمتی اور بیش بہا ضامین کو دیکھا۔ بس یہ آپ ہی کی سعی کی مرہون منت ہے۔ ورنہ ان خوبیوں کے ساتھ بہار نمبر کا نکلنا مشکل ہی نہیں بلکہ محال تھا۔"

—××—

ضروری اطلاع ... کا بھلا ہوگا

صاحبان! میں دواشتہاری حکیم ہوں نہ ڈاکٹر بلکہ ایک معمولی آدمی ہوں - بدقسمتی سے مجھے اپنے ہاتھوں اپنی جوانی کا ستیاناس کرنے والی عادت پڑ گئی تھی جس کے نتیجہ سے میں بالکل بے خبر تھا - اچانک عرصہ ڈیڑھ سال کے بعد مجھے نامردی کا تمام مرض لاحق ہوگیا - سرعت، جریان، احتلام وغیرہ کی بے انتہا شکایتوں کے سبب میرا چہرہ روز بروز لاغر اور زرد ہوتا جاتا تھا - دل ہر وقت دھڑکتا رہتا - آنکھوں کے سامنے اندھیرا آتا - گھبراہٹ، سستی اور اداسی چھائی رہتی تھی - دوست احباب میری پژمردگی کا سبب پوچھتے تھے مگر میں کسی کو اپنی حالت سے آگاہ کرنا مناسب نہ سمجھتا تھا مگر در پردہ مشہور شہروں کے بڑے بڑے ڈاکٹروں اور حکیموں سے جن کے لمبے چوڑے اشتہاروں کی کوئی حد نہ تھی ادویات منگا کر استعمال کرتا رہا لیکن مجھے بالکل ذرہ بھی فائدہ نہ ہوا بلکہ علاوہ خرچ کے کئی اور تکلیفوں کا سامنا کرکے بھی مایوس ہی رہنا پڑا - اس مایوسی کی حالت میں زندہ درگور ہونے کو ترجیح دیتا تھا - اتفاقاً خوش قسمتی سے مجھے ملازمت کے ایک سلسلہ میں پشاور جانا پڑا - پشاور جس جگہ میں جا کر رہا - وہاں ایک فقیر خضر صورت جو کہ پہلے سے وہاں مقیم تھے - مجھ سے پوچھنے لگے کہ تم اداس اور تمہاری صورت مریضوں کی سی کیوں ہے؟ میرے پر درد دل سے آواز نکلی - خضر صورت اور کامل سنیاسی سے اپنا سارا دکھ درد کہہ ڈالنے کی ہدایت کی - چنانچہ میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ اب میں زندگی سے تنگ آ کر خودکشی کرنے پر آمادہ ہوں - اس فقیر صاحب کمال نے ازراہ شفقت میرے حال زار پر رحم فرما کر ایک نسخہ کھانے کیلئے مقوی گولیوں کا اور دوسرا نسخہ رگوں اور پٹھوں کی سستی دور کرنے کیلئے مالش کا بتایا چنانچہ میں نے حسب ارشاد اس صاحب کمال کے لاتعداد جنگلی جڑی بوٹیاں اور کئی ادویات بازار سے خرید کر ہر دو جوہر کیا کر دو دوا اس صاحب کمال کے تیار کرکے استعمال کرنا شروع کیا! **ناظرین! میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر سچ کہتا ہوں** کہ ساتویں روز ہی میری تمام شکایتیں رفع ہونی شروع ہوگئیں اور میں اپنے آپ کو قابل فخر مرد کہنے کا مستحق ہوگیا - اگرچہ مجھے چند ہی روز کے استعمال سے ضبط کرنا دشوار ہوگیا - مگر بموجب ارشاد اپنے محسن خضر صورت کامل سنیاسی کے **اکیس روز** تک پرہیز اور علاج جاری رکھنا پڑا - میں ہر روز تین سیر ساڑھے تین سیر دودھ باآسانی ہضم کر لیتا تھا - میرا چہرہ بارونق - بدن مضبوط - بینائی طاقتور ہوگئی - اب میں ایسا قابل فخر مرد بن گیا ہوں کہ جس کے بیان کرنے کی تہذیب اجازت نہیں دیتی - واپس آ کر یہ فائدہ دوائی کا نامردی کے مایوس مریضوں پر تجربہ کیا تو ہر قسم کی نامردی، سستی - جریان - احتلام - سرعت وغیرہ کے لئے اکسیر سے بڑھ کر پایا - پھر کئی ایک دوراندیش احباب کے اصرار اور عوام کے فائدہ کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ اشتہار بغرض رفاہ عام دیا جاتا ہے کہ جو صاحب اس شرمناک اور قبیح عادت کے شکار بن کر حظوظ انسانیت سے محروم ہو بیٹھے ہوں اور سینکڑوں روپیہ علاج معالجہ پر صرف کرکے مایوس ہو چکے ہوں وہ اس قلیل القیمت اور سریع الاثر دوائی کو استعمال کرکے صحت یاب ہو جائیں اور خدا کے فضل کے گیت گائیں - قیمت صرف لاگت ادویات اور خرچ اشتہار پر بمشکل اکتفا کرتی ہے - فائدہ بہت کم ملحوظ ہے -

قیمت مقوی گولیاں فی شیشی جس میں ۲۱ روز کی ۴۲ عدد گولیاں موجود ہے صرف دو روپیہ علاوہ محصول

قیمت روغن مالش طلا جو ۲۱ روز تک رگوں اور پٹھوں کیلئے کافی ہے فی شیشی دو روپے آٹھ آنے علاوہ محصول

یہ گولیاں از حد مفید ہیں - مادر زاد نامردی کے سوائے خواہ کسی قسم کی نامردی کا مرض کیوں نہ ہو اکسیر ہے - روغن مالش طلا سے کسی قسم کی پھنسی یا آبلہ ہرگز نمودار نہ ہوگا ٭

اس دوائی میں کشتہ وغیرہ کی آمیزش نہیں ہے - یہی وجہ ہے کہ ہر بچہ - جوان اور بوڑھا باآسانی بغیر لحاظ موسم کے ان گولیوں کا استعمال کر سکتا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس دوائی کے استعمال کے بعد دوبارہ کسی دوائی کی ضرورت نہ رہے گی - آخر میں یہ بھی ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اشتہار کے نکالنے سے میری کوئی ذاتی غرض نہیں ہے اور نہ ہی میرا مدعا جعلی اشتہار شائع کرکے پبلک سے روپیہ کمانے کا ہے بلکہ ہر خاص و عام کا فائدہ مدنظر رکھ کر احباب کے اصرار پر اشتہار شائع کیا جا رہا ہے - تندرست اور شوقین احباب بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں - کیونکہ اس کے استعمال سے سست سے چست اور ضعیف سے طاقتور بن جاتا ہے اگر بڑھاپے میں بھی لطف جوانی اٹھانا چاہتے ہیں - تو ان گولیوں اور روغن مالش طلاء کا استعمال کریں کیونکہ اس کے استعمال سے بدن میں خون صالح پیدا ہو جاتا ہے - الغرض جب تمام چرخا ڈھیلا ہوگیا ہو تو ان کا استعمال کریں اور فائدہ اٹھائیں - مخفی دکھوں کا تمام دنیا کی دواؤں سے عجیب و غریب علاج ہے ٭

نیز عورتوں کی جوانی قائم رکھنے کے لئے - جو عورتیں مردوں کی طرح جریان الرحم یا اخراج رطوبت یعنی لیکوریا جیسے خطرناک امراض میں مبتلا ہوں - ان کے لئے مقوی گولیاں از حد مفید ہیں - ضرورتمند احباب تجربہ کریں مکمل پرچہ ترکیب ہمراہ دوا ہوگا - محصول ڈاک علاوہ - تمام خط و کتابت پوشیدہ رکھی جاتی ہے ٭

خاص نوٹ } دو احباب جو ہم سے دوائی منگا کر استعمال کریں - اخبار کا حوالہ ضرور دیں - کیونکہ کئی احباب نے پیشہ اختیار کر رکھا ہے کہ ہم سے دوائی منگا کر زیادہ قیمت پر فروخت کر دیتے ہیں - لہٰذا فقیر خضر صورت سنیاسی کے قول کے مطابق اس کی کمائی کھانا گناہ ہے - یہ گورنمنٹ آف انڈیا سے رجسٹرڈ ہیں - آرڈر دیتے وقت اپنا پتہ صاف اور خوشخط لکھیں

غیر ممالک سے قیمت پیشگی ٭

ضروری اطلاع

یہ یاد رہے کہ میری دوائی صرف نامردی، سستی، جریان، احتلام، سرعت ...

شرطیہ علاج اور شرطیہ وعدہ

...

ڈاکٹر ...

از امرتسر

یہ دوائی احتلام و سرعت انزال کیلئے اکسیر ہے ٭

ڈاکٹر حسین خان

از سنگاپور

یہ دوائی جلق زدہ مریض کے لئے شرطیہ فائدہ دہ ہے

حکیم جہانگیر بیگ

از

چوبیس پرگنہ

یہ دوائی قابل تعریف ہے ٭

ڈاکٹر شاہ خیرات امام

ایم - ڈی - پی ایچ

از حسین آباد مونگیرا

یہ دوائی گم شدہ قوت مردی کو از سر نو بحال کر دیتی ہے ٭

مسٹر آر چندرا

از امریکہ

اس دوائی کے استعمال سے میرا وزن بڑھ گیا ہے

جناب حکیم ... صاحب ...

از آگرہ

مدد اشتہ گولیاں ... استعمال ...

... چندر

... ن

... گولیاں از

... کیلئے

... یہ ہے

... لال

... لاہور

... اولاد

... کرنے کے قابل

... دیتی ہے ٭

... بہری رام از

... ہسپتال

... گوالیار

... نامردی کے مریض

... استعمال کرائی گئی

... مفید پائی گئی ٭

ڈاکٹر ای کے پی ... کس

از امریکہ

یہ دوائی

نامرد کو مرد بناتی ہے ٭

والدہ یوسف کمال

از کلکتہ

یہ دوائی جریان الرحم ... کیلئے مفید ہے ٭

آغا ... صاحب

پشاور

سری نگر

یہ دوائی جسمانی ...

صوبہ بہار کے سکولوں اور کالجوں میں ۱۹۳۱ء سے منظور شدہ

رسالہ ندیم گیا

مرتبہ:- سید ریاست علی ندوی

قیمت سالانہ للعہ — ششماہی عہ

قیمت فی پرچہ ۵ر

جلد ۱۴ | ماہ رجب المرجب ۱۳۵۹ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۴۰ء | نمبر ۲

عنوان	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	سید ریاست علی ندوی	۶۶ - ۶۸
مقالات:- سرگذشت قلعہ رہتاس	مولانا سید عبدالرؤف صاحب ندوی	۶۹ - ۷۳
سرمایہ داری	جناب سید مظفر حسین صاحب ایم-اے، ایڈوکیٹ	۷۴ - ۷۹
سنت کبیر داس	جناب مظہر رمضان پوری ایم-اے	۸۰ - ۸۵
افسانہ ومحاضرات:- سوز ناتمام	جناب رحمت علی صاحب صابر کوز محلوی	۸۶ - ۹۰
من کی چاہ (شکسپیر کی شہرۂ آفاق تمثیل)	جناب سعید الحق صاحب دسنوی بی-اے آنرز	۹۱ - ۹۸
عجیب انسان	جناب محمد احسن صاحب پھلوی پوری	۹۹ - ۱۰۶
روانگی	جناب سید مشتاق احمد صاحب کابری	۱۰۷ - ۱۰۹
آئینہ	جناب مجتبیٰ احمد صاحب	۱۱۰ - ۱۱۴
آثار علمیہ ادبیہ:- علامہ شبلی نعمانی کے دو غیر مطبوعہ خطوط		۱۱۵ - ۱۱۶
تلخیص وتبصرہ:- شہزادی گوراما	جناب رابط ہاشمی	۱۱۷ - ۱۱۸
ادبیات:- تنزیہات	مولانا آزاد سبحانی	۱۱۹
تاثرات جدیدہ	حضرت عبدالباری آسی لکھنوی	۱۲۰
گلزار خلیل	حضرت خلیل بیگوسرائی	۱۲۱
نگارخانۂ تصورات	جناب سید عزیز الحسن صاحب عزیز عظیم آبادی	۱۲۱
فردوس خیال	جناب بدرالدجیٰ صاحب کامل عزیزی	۱۲۲
میرے لئے	جناب سید ضمیر الحق صاحب ضمیر عمادی	″
آہ	جناب منظر عمادی عظیم آبادی	″
نوائے نجم	جناب نجم کاکوی	۱۲۳
رقیبوں سے حضرت جو مل جائے فرصت	جناب اختر علی دربی بلیاروی ایم-اے	″
انکار	جناب سید ابراہیم حسین صاحب برق	″
ترانۂ جوگی	جناب جوگندر پرشاد سرواستو جوگی	۱۲۴
افکار کمالی	جناب ابوالفرح سید محمد انوار الحق صاحب حسینی کمالی	″
کلام منیر	جناب منیر استھانوی	″
بادۂ کہن:- منیر بلیاوی	مولوی ابونعیم سید محمد عبدالحکیم صاحب آرمان شمسی	
نئی کتابیں	ادارہ	

سید ریاست علی ندوی اڈیٹر پرنٹر پبلشر نے ندیم پریس کچہری روڈ گیا میں چھپوا کر دفتر ندیم گیا سے شائع کیا

نظرات

خدا کا شکر ہے کہ "ندیم" کا بہار نمبر ہر حلقہ میں قبولیت کی نظر سے دیکھا گیا۔ بزم کے "اہل نظر" و "تماشائی" دونوں نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس کا خیر مقدم کیا۔ پھر بزم سے نکل کر "رزم" کے تیر اندازوں کی نظر سے بھی نہ بچ سکا۔

لیکن اگر "پیہم جدوجہد" کی دنیا میں بسنے والے ان مخلص نکتہ چینیوں کی نظر "تقسیم کار" کے اصول پر ہوتی تو وہ بالواسطہ ندیم اور اس کے بہار نمبر کو بھی "معروف جہاد" ہی تصور فرماتے۔ اور بہار نمبر کے صفحات میں بھی جابجا "زندگی کے حقایق" اور "دل و جگر کے خون" کے قطرات ٹپکتے نظر آتے، قومیں صرف طبل جنگ سے بیدار نہیں ہوتیں، نوائے چنگ بھی کبھی انہیں ہشیار کرتی ہے۔ شاید "جہاد" کے معنی تو یہ کبھی بھی نہیں رہے کہ جنگ کے سارے سپاہی کیمپ پر کیمپ کسی ایک ہی مورچہ پر لاکر کھڑے کر دئے جائیں۔ اگر ایسا ہوتا تو آج اسلام کے علوم فنون اور اس کے تمدن کی ایسی شاندار تاریخ نہ ہوتی۔

ندیم اس صوبہ میں اردو زبان کا ترجمان ہے۔ اسکی حفاظت بقا اور ترقی کی ہر ممکن کوشش عمل میں لاتا ہے۔ پھر وہ اس صوبہ میں اُردو زبان اور ادب کے لباس میں اسلامیت کی بھی جو تھوڑی بہت خدمت انجام دے رہا ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ وہ اسلامی علوم و فنون سے بیگانہ مسلمان نوجوانوں کو اسلامیات کے قریب لانا اور اس صوبہ میں مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی کھوج لگانا چاہتا ہے، مغربیت کی کے زہر سے جو ذہنی انتشار پھیلا ہوا ہے اس کے معالجہ کی فکر کرتا ہے۔ لیکن اگر طبیب مریض کی افتاد طبع اور مزاج کا لحاظ کئے بغیر علاج کرے تو شاید اسکی کامیابی دشوار ہو جائے۔ ہمارے غیر صوبہ کے احباب بھی اس صوبہ کے ماحول سے آگاہ نہیں، جنہیں یہاں قائم کرنے کا تھوڑا بہت تجربہ ہوا ہے۔ وہ اسی لحاظ سے اپنی بساط کے مطابق اپنی خدمتیں انجام دے رہے ہیں۔ اور کم سے کم خود ان کا ضمیر اس سے مطمئن ہے۔ اور یہ ان کے لئے بس ہے۔

بہار نمبر میں بعض مخلصین کو ممتاز اہل قلم کے پہلو بہ پہلو نو مشق و نوجوان ادیبوں کی تصویروں کا شائع ہونا بھی کھٹکا ہے۔ حالانکہ ندیم میں اگست ۱۹۳۹ء سے نومبر ۱۹۳۹ء تک کے پرچوں میں التزام سے شائع کیا گیا کہ

"نیز ایسے مضمون نگاروں اور شاعروں کی تصویریں بھی ہونگی جو آئندہ چل کر نامور ادیب ہونیوالے ہیں"

بہار نمبر میں نقطۂ نظر سے ان نوجوانوں کی تصویریں چھاپی گئیں۔ مدعا محض ان نوجوان ادیبوں کی ہمتوں کا بڑھانا تھا نہ کہ اہل کمال اور نوجوان

ادیبوں کے درمیان فرق مراتب کا اوٹھا دینا۔ آج کتنے "مشاق اہل قلم" ہیں جن کے ادب و انشاء کی نشو و نما ندیم کے صفحات سے شروع ہوئی، اور تعارف کیلئے انکی تصویریں چھاپ کرا نہیں ناظرین ندیم سے روشناس کیا گیا۔ کیا آئندہ چل کر آج کے نومشق کل مشاق نہ ہوں گے۔

ادھر چند مہینوں سے صاحب "نگار" جناب نیاز فتحپوری کے ہفوات کا چرچا، اخباروں اور رسالوں میں نئے سرے سے آگیا ہے۔ پچھلی مرتبہ وہ انبیائے کرام کی توہین کے جرم کے مرتکب ہوئے تھے۔ اور توبہ نامہ داخل کرکے گلوخلاصی کرائی تھی۔ اس مرتبہ انھوں نے قرآن مجید کی توہین کی جرأت کی ہے۔ قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے سے انکار کیا ہے۔ اور اس میں مندرج تاریخی واقعات کو نعوذ باللہ آنحضرت صلعم کی طرف سے یہود و نصاریٰ سے سنی سنائی باتوں میں "زیب داستان" کیلئے بڑھا دئے جانے کا اعلان کیا ہے۔ اس حیرت انگیز جرأت پر جب رائے عامہ کی مخالفت کا اندازہ ہوا تو دوسرے مہینے میں انھوں نے ان مباحث کی آڑ پکڑلی جو مسئلہ خلق قرآن کے سلسلہ میں عہد اسلام میں پیدا ہوئے تھے۔ اور تاویلات کا ایک طومار باندھ دیا۔ جس کو "نگار" کے پچھلے مہینے کی تحریر سے دور کی بھی مناسبت نہیں ——— پھر توبہ نامہ کے متعلق چھاپا کہ وہ کالعدم ہوچکا تھا۔ اس لئے کہ ان کے بقول انکے مخالفین نے پہلے اسکی خلاف ورزی کی۔ گویا وہ توبہ نامہ بھی کوئی دنیاوی معاہدہ تھا، جو فریقین میں ہوا تھا۔ وہ اگر عہد تھا تو اُن کے اور انکے پیدا کرنے والے رب العالمین کے درمیان ——— لیکن انھوں نے بزعم خود خدا کے بندوں کو درمیان میں ڈال کر خود اپنی بزدلی کا اقرار کیا کہ وہ توبہ خدا سے ڈر کر نہیں بندوں کے خوف سے کی گئی تھی۔

نیاز صاحب کے سر یہ ساری مصیبت صرف ایک سبب سے ہے۔ ان میں یہ اخلاقی جرأت نہیں کہ وہ اسلام سے علانیہ مرتد ہونے کا اعلان کرسکیں حالانکہ وہ دوسروں سے زیادہ خود خوب جانتے ہیں کہ وہ تمام سلسلہ مذاہب کو عہد جہالت کی یادگار جانتے ہیں۔ وہ اسوقت قرآن مجید کے متعلق اپنی لکھی ہوئی تحریر کو کلامی مسائل و مباحث کے پردہ میں چھپانا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کے پاس اس واقعہ کا کیا جواب ہے جب وہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے ایک جلسہ میں شرکت کیلئے گئے ہوئے تھے۔ اور کتب خانہ کی ایک الماری میں قرآن مجید کے ایک نسخہ کو رکھا ہوا دیکھ کر انھوں نے نہایت تبختر اور جاہلانہ غرور سے قرآن مجید کی طرف اپنی چھڑی سے اشارہ کرکے اپنے ایک دوست سے کہا کہ "اگر اس فرسودہ کتاب کے بجائے موسیقی کی کوئی کتاب لکھی ہوتی تو وہ زیادہ بہتر ہوتی۔!؟

اس سلسلہ میں ہمیں زیادہ حیرت محترم معاصر روزانہ ہند کلکتہ کے ایک نوٹ کو پڑھ کر ہوئی۔ جو "بیوقوفی" کے عنوان سے شائع ہوا ہے اس میں ان مخلص اہل علم کو نادان کہا گیا ہے جو نیاز کو اس کے ہفوات پر سرزنش کر رہے ہیں ——— بلاشبہ ہر شخص کو اپنی آزاد رائے کے ظاہر کرنے کا اختیار ہے۔ لیکن کسی کو یہ اختیار تو نہیں کہ اپنی گفتگو اور تحریر سے قوم کی قوم کو فریب میں مبتلا کرنے کی کوشش کرے۔ نیاز کے ہفوات پر کبھی کوئی سنجیدہ توجہ نہ کی جاتی اگر وہ اپنے الحاد و زندقہ کا اعلانیہ اقرار کر لینے کے بعد ظاہر کرتے۔ اور مسلمان نوجوانوں اور تعلیم یافتوں کے سامنے مسلمان بن کر نہ آتے۔ ہم نے اس شخص کو کبھی ملامت نہیں کی جس نے لاہور کی عدالت میں برملا اعلان کیا کہ "ہمیں حلف کا کوئی ایسا طریقہ بتایا جائے جس میں خدا کا نام نہ آنے پائے۔" ——— ہم مولانا سے ملیح آبادی سے سوال کرتے ہیں کہ اگر کوئی مشہور سرمایہ دار اپنی

سرمایہ داری کے فروغ کیلئے اپنے کو سوشلسٹ یا کمیونسٹ مشہور کرے اور دولت کے جمع کرنے کیلئے دلائل میں مارکس و انجلس کے اقوال پیش کرے اور نیز لینن اور اسٹالین پر سب و شتم کرے کہ انھوں نے سوشلزم کو نہیں سمجھا' اور غلط راہ اختیار کی تو وہ اسکو خوشی سے برداشت کرینگے یا وہ ایڈیٹر قلم کی تیز نا خونوں سے اسکے مکر و فریب کے لباس کو اس سختی سے نوچیں گے کہ اس کے جسم کی چمڑی بھی ادھڑ جائے۔ کیا ایسی صورت میں دنیا کے سامنے اس کے مکر و فریب کے لباس کو پارہ پارہ کرنا دانشمندانہ فعل ہوگا۔ یا وہ اسکو بیوقوفی اور نادانی پر محمول کریں گے۔ ؎

جنوں کا نام خرد رکھ دیا خرد کا جنوں ۔۔۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

ہمیں مولانائے ملیح آبادی پر مزید حیرت اس لئے ہے کہ وہ صاحب نگار کے سارے دجل و فریب سے بخوبی آگاہ ہیں۔ وہ پہلے بھی اسکی اخلاقی کمزوری پر ماتم بھی کر چکے ہیں۔ کہ وہ جن خیالات کو ظاہر کر چکا ہے ڈر کر ان سے توبہ کر لی۔ وہ اسکی ادبی زندگی کے سرقہ کے ایک ایک نقطہ سے آگاہ ہیں۔ انہیں خوب معلوم ہے کہ اس نے کیسے کیسے مسروقہ مالوں کی تجارت سے بازار میں فروغ حاصل کیا ہے۔ بایں ہمہ وہ بالواسطہ اسکی حمایت میں قلم اٹھاتے ہیں۔ کیسے تعجب کی بات ہے کہ اردو صحافت کی برادری میں ایسے ایسے پرانے پاپیوں کے حمایتی بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور وہ بھی جب مولانائے ملیح آبادی جیسا سنجیدہ صاحب نظر اہل علم ہو۔

قصبہ اسلام پور پٹنہ کے ضلع میں مسلمانوں کی ایک قدیم آبادی ہے۔ کچھ دن گذرے وہاں سے سر راہ گذرنے کا اتفاق ہوا۔ آبادی یہاں کی اگرچہ کچھ زیادہ وسیع نہیں مگر قصبہ میں علمی و تعلیمی سرگرمیاں موجود ہیں۔ خانقاہ ام۔ ای۔ اسکول کو ترقی دیکر خانقاہ ہائی انگلش اسکول بنایا جا چکا ہے۔ جناب شاہ اکرام الدین صاحب عرفاں اور جناب شاہ حمید الدین صاحب رؤسائے اسلام پور کے ذاتی کتب خانے خاصے انمول جواہر سے مالا مال ہیں۔ جناب شاہ ابو البرکات صاحب سجادہ نشین خانقاہ کے کتب خانہ میں اسلامی علوم و فنون کی کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے ان سب کے ماسوا قصبہ کے پرجوش نوجوانوں نے دار التفریح کے نام سے ایک انجمن قائم کی ہے۔ جس کے دار المطالعہ میں سنجیدہ اخبار و رسائل کا وافر ذخیرہ موجود رہتا ہے۔ کتابوں کا ذخیرہ بھی رفتہ رفتہ بڑھ رہا ہے۔ اور اس قصبہ کے نوجوانوں میں علم و ادب کا ستھرا مذاق پیدا ہو رہا ہے۔ مولوی سید محمد عثمان صاحب منشاں ابدالی اس کے روح و رواں ہیں۔ موصوف کا اخلاص و پیہم عمل لائق ستائش ہے یہ سرگرمیاں دوسرے مردم خیز قصبوں کیلئے تقلید کے لائق ہیں۔ اس انجمن کے ذریعہ سے ان اطراف میں اردو کی لائق ذکر خدمات انجام پا رہی ہیں۔ ہم معاصرین کرام' اور اردو کتابوں کے ناشروں سے درخواست کرتے ہیں کہ اگر ان کی فہرست میں خدمتگذار انجمنوں کیلئے عطایا کی گنجائش ہو تو وہ دار التفریح اسلام پور کو فراموش نہ فرمائیں۔ کہ یہ امداد برمحل صرف ہوگی' مطبوعات کی ترسیل کے لئے پتہ:۔ ناظم دار التفریح' اسلام پور' ڈاکخانہ عطا سرائے' ضلع پٹنہ ہوگا۔

مقالات :-

سرگذشت قلعۂ رہتاس

از جناب مولانا عبدالروف صاحب رحمانی ندوی

(۲)

تاریخ فرشتہ "شیرخاں شہر گوڑ کو چھوڑ کر چھار کھنڈ روانہ ہوا اور نزدیک ہونے کے سبب تسخیر قلعۂ رہتاس کی فکر میں ہوا۔ تاکہ عورتوں اور بچوں کو وہاں رکھ کر اطمینان قلب کے ساتھ ملک گیری اور ہمایوں سے جنگ آزمائی کی طرف متوجہ ہو۔ چونکہ قلعۂ رہتاس کا حصول جنگ آزمائی سے ناممکن تھا اس لئے حیلہ وتدبیر سے کام لینا پڑا۔ چنانچہ چند اشخاص کے ذریعہ راجہ قلعہ کے پاس جس کا نام ہرکشن تھا یہ پیغام پہونچایا کہ ہمارا نہایت ابتر حالت میں ہے اور ہمارے پاس لشکر زیادہ جمع ہوگیا ہے بنابریں فتح بنگالہ کا خیال ہے۔ مغلوں کے نزدیک آجانے کے سبب پریشانی ہے۔ اس وقت تمہاری دوستی پر اعتماد کرکے اپنے اہل و عیال اور سپاہیوں کو تمہارے قلعہ میں بھیجدینا چاہتا ہوں۔ پھر پورے اطمینان کے ساتھ بنگال میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔ راجہ نے شیرخاں کی عرضداشت قبول کرنے سے انکار کردیا۔ شیرخاں نے مگر چند قابل اور لائق آدمیوں کو تحفے دے کر راجہ اور اُن کے عملوں کی خدمت میں روانہ کیا۔ اور یہ پیغام پہونچایا کہ بس عورتوں اور خزانوں کے سوا اور کوئی دوسری چیز نہیں بھیجنا چاہتا۔ اگر بنگال فتح ہوگیا اور صحیح وسلامت واپس آئے تو تمہاری مہربانیوں کا پورا حق ادا کرینگے۔ اور ہمارا معاملہ برعکس ہوا تو ہمارے مال ومنال تمہارے پاس رہیں گے۔ مغلوں کے ہاتھ نہیں لگنا چاہیئے کیونکہ وہ ہمارے دیرینہ دشمن ہیں۔ راجہ نے اس طمع میں کہ خزانہ ہاتھ آتا ہے، عرضداشت کو قبول کرلیا۔ تو پھر شیرخاں نے ہزار ڈولی کا انتظام کرکے ہندوستان میں عورتوں کو جس صورت سے ایک جگہ سے دوسری جگہ ڈولی میں بٹھا کر اور اُس پر پردہ ڈال کر لیجاتے ہیں اسی طرح ہر ڈولی میں عورتوں کی جگہ دو دو بہادروں کو بٹھا دیا۔ علاوہ ازیں پانسو اشخاص مزدوروں کے طور پر قلعہ کے پاس اس طرح روانہ کئے کہ اُن کے سروں پر اشرفی کے توڑے اور لاٹھی کی جگہ ہاتھ میں چھڑی و ڈنڈے تھے اور چند ڈولیاں جو آگے آگے تھیں ان میں بوڑھی عورتوں کو بٹھادیئے اور خواجہ سراؤں کو اُن کے ہمراہ کردیا۔ راجہ اور اُس کے متعلقان ووابستگان بالکل غفلت میں رہے کہ ڈولیوں کی بابت تجسس نہ کیا اور مال و اسباب کو اپنی ملک خیال کرکے قلعہ کے اوپر پہونچانے میں بہت جلدی کی۔ جب ڈولیاں اُس حویلی میں جا پہونچیں جس کو راجہ نے اُن کے لئے مقرر کر رکھا تھا تو وہ آزمودہ کار بہادر جن کو راجہ نے عورت سمجھا تھا، ننگی تلواریں لیکر مردانہ وار دروازوں کی طرف دوڑ پڑے اور مزدور بھی اُن پیسوں کی تھیلیوں کو جو اشرفی کے توڑے کی طرح سروں پر رکھے تھے، پٹک کر اور لکڑیوں کو سیدھا کرکے دروازوں کی طرف رُخ کیا۔ راجہ ہرکشن اور اُس کے ہمراہی جو بالکل غافل تھے آمادہ جنگ ہوگئے اسی اثنا میں شیرخاں جو اپنے لشکر کو مستعد ومکمل کرکے کان لگائے بیٹھا تھا۔ ابر رواں کی مانند دروازوں کی طرف دوڑ پڑا اور دروازوں کو کھلا پاکر اپنے اکثر ساتھیوں کو لیکر اندر گھس پڑا۔ ہرکشن اپنے خاص جماعت کے ہمراہ تھوڑی دیر جنگ میں ٹھہرا۔ جب اُس نے دیکھ لیا کہ مقابلہ مشکل ہے تو پشت قلعہ کے دروازہ کو کھول کر نہایت حیرانی وپریشانی کیساتھ نکل بھاگا

سلہ تاریخ فرشتہ صفحہ ۲۲۵

قلعہ مذکور کی تسخیر کے سلسلہ بیان میں خافی خاں نے تنگ بیانی سے زیادہ کام لیا ہے۔ اور صاحب سیر المتاخرین نے واقعاتِ مذکورہ کے بیان میں طبقات اکبری اور تاریخ فرشتہ کا تتبع کیا ہے۔ بنابریں ان ہر دو کتابوں کی عبارتیں قلم انداز کی جاتی ہیں ——— مگر باایں ہمہ شیرشاہی مورخ ہم مورخ انگلشیہ (صاحب سیر المتاخرین) تک کل اس امر میں متفق اللسان ہیں کہ شیرخاں حیلہ و تدبیر سے قلعہ رہتاس پہونچا اور نیز محافظوں اور ڈولیوں کے واقعہ کو باستثنا مورخ شیرشاہی کل مورخین نے مختلف تعداد کے ساتھ مختلف پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ تاہم باشد چیزکے مردم نگویند چیز

حقیقت حال یہ ہے کہ قلعہ مذکور کی ہیئت و نوعیت کے پیش نظر شیرشاہ کیا کوئی تاجدار مخالفانہ اور جنگ جویانہ حوصلہ مندیوں کے ساتھ وہاں پہونچ نہیں سکتا تھا، اس لئے شیرخاں کو بدرجہ مجبوری اس حیلہ و تدبیر سے کام لینا پڑا۔ چنانچہ فرشتہ نے اسی حقیقت کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے :-

"گرفتن قلعہ بجبر و قہر امکان عقلی نداشت متوسل و متمسک بدامن حیلہ و تدبیر گشتہ"[1]

شہنشاہ اکبر اور قلعۂ رہتاس

اور یہی وہ خاتم سلیمانی ہے جس کے دستیابی پر ہر باغی و طاغی نے سر اٹھایا اور خودسری حاصل کی ——— چنانچہ شیرشاہ[2] کے بعد قلعہ مذکور امرائے افغانی کے تصرف میں رہا، تاآنکہ شہنشاہ اکبر کے عہد حکومت میں سلیمان کرانی حاکم بنگالہ و بہار جمعیت افاغنہ کی سورش اور فتح خاں کی یورش کے باعث سنہ ۹۸۱ھ میں قلعہ کے محاصرہ کی طرف متوجہ ہوا۔ اور چھ ماہ تک محاصرہ کئے پڑا رہا، مگر فتح کر نہ سکا۔ بالآخر غازی اکبر خود شاہزادگان و حرم کے ہمراہ داؤد بن سلیمان کرانی کی تنبیہ کے خیال سے سنہ ۹۸۲ھ میں عازم بہار ہوا ——— شاہ اکبر جب بنارس و جونپور میں خیمہ زن تھا تو فتح خاں قلعہ دار رہتاس نے خود شاہ کے حضور میں حاضر ہو کر اظہار اطاعت کی اور قلعہ کی کلید حوالہ کردی ——— مگر شاہ ممدوح نے افاغنہ کی سورش اور داؤد بن سلیمان کی سرکشی کے باعث امیر العساکر مظفر خاں کو داؤد خاں اور ہیبت خاں کی گرفتاری اور قلعہ رہتاس کی تسخیر کے لئے نامزد کیا ——— چنانچہ مظفر خاں صوبہ دار تسخیر قلعہ کی طرف متوجہ ہو کر سنہ ۹۸۳ھ میں قلعہ مذکور کو کالا پہاڑ اور ہیبت خاں سے جو داؤد خاں کے امراء عساکر سے تھے، زر بھر کر حاصل کیا، اس جنگ کی داستان پر لطف ہے مگر بخوف طوالت قلم انداز کی جاتی ہے۔ انجام کار داؤد خاں کو قتل کر کے سرزمین بہار کو افاغنہ کے فتنہ و فساد سے پاک کر دیا ——— اور محب علی خاں کو رہتاس کا قلعہ دار بنایا گیا ——— اس فتح عظیم کی تاریخ ملک سلیمان زداؤد رفت (سنہ ۹۸۳ھ) کہی گئی۔

انہیں ہنگامہ آرائیوں اور سورشوں کے سبب بہار و بنگال میں چند سال کے اندر پیہم متعدد صوبہ دار آئے اور گئے تاآنکہ راجہ مان سنگھ سنہ ۹۹۶ھ میں نظامت و حکومت کی سند لیکر آیا اور نظم بنگالہ اور فتح اڑیسہ کے مہم سے فراغت کر کے قیام کے لئے اور خزانہ شاہی کے استحفاظ کے لئے اسی قلعۂ رہتاس کو پسند۔ اور آخر عہد حکومت تک وابستگان اور عملگان کے ہمراہ یہیں مقیم رہا ——— اور دوران قیام میں عمارات قلعہ میں قابل قدر اور جاذب نظر اضافے کئے۔ چنانچہ موجودہ محلات شاہی اور حرم سرائیں اسی عہد کی یادگار ہیں۔

شاہجہاں اور قلعۂ رہتاس

شاہزادہ خرم (شاہجہاں) پدر نامہربان جہانگیر کی نامہربانیوں اور سوتیلی ماں نور جہاں کی بے مہریوں کے باعث اطاعت سلطانی سے منحرف ہو گیا۔ چنانچہ نہم جمادی الثانی سنہ ۱۰۳۲ھ کو موچپور اور قبول پور کے مابین طرفین کی فوجیں صف آرا ہو گئیں۔ نتیجہ کار شاہزادہ کو پسپائی ہوئی، شاہزادہ نربدا سے عبور کر کے قلعہ آشیر پہونچا، اس کو حاصل کر کے برہان پور آیا۔ اور وہاں سے براہ گولکنڈہ و بندر مچھلی پٹن اڑیسہ و بنگال کی طرف روانہ ہوا۔ ڈھاکہ پہونچکر داراب خاں پسر خانخاناں کو جو اس وقت قید سے رہا کر کے بنگالہ کا صوبہ دار بنا کر کے پٹنہ پہونچا اور عبدالرشید خاں کو دریا خاں کے ہمراہ الہ آباد روانہ کیا۔ اسی اثنا میں شاہزادہ پرویز اور مہابت جنگ لشکر گراں کے ہمراہ آپہونچے۔ فوجیں مقابل ہوئیں۔ متعدد بار جنگیں ہوئیں، بالآخر شاہجہاں کو شکست فاش ہوئی۔ افواج بادشاہی کے نزدیک آجانے کے باعث شاہجہاں اکبر نگر (راج محل) ہوتا ہوا سیدھا قلعہ رہتاس پہونچا۔ سید مبارک قلعہ دار نے بخوشی قلعہ شاہزادہ کو حوالہ کر کے ملازموں میں داخل ہو گیا۔ قلعۂ رہتاس پہونچکر شاہزادہ قوی دل ہو گیا ——— اور اس پرآشوب دور میں باامن و قیام اسی محفوظ قلعہ کو پسند کیا۔ چنانچہ شاہزادہ نومولود[3] کو اس کی ماں کے ہمراہ اور دیگر شاہزادگان عالی تبار کو قلعہ میں رکھ کر دہ مطمئن ہو گیا۔

---

[1] ذکر سلطان اکبر بادشاہ غازی اس جملہ کا ترجمہ اوپر گذر چکا ہے۔ [2] ماخوذ تاریخ فرشتہ و سیر المتاخرین

[3] بساعتِ ہمایون انیسویں جلوس شاہی کو راج محل اور قلعہ رہتاس کے تگ و دو میں سلطان مراد بخش عالم وجود میں آیا اور اسی قلعہ میں پرورش پائی۔

انجام کار تنگ آکر شاہجہاں نے جہانگیر سے عفو تقصیر چاہی ۔ جہانگیر نے لکھا کہ اگر رہتاس اور آسیر کے قلعے حوالہ کردو اور شاہزادگان دارا شکوہ اور اورنگ زیب اور سلطان شجاع کو حضور میں بھیجدو تو تمہاری تقصیر معاف ہوگی ۔

چنانچہ شاہجہاں نے دونوں شاہزادوں کو دو لاکھ پیشکش دیکر بارگاہ سلطانی میں روانہ کئے ، اور دونوں قلعے شاہی آدمیوں کے حوالہ کردئیے ۔[۵۱]

شاہزادہ فرخ سیر اور قلعہ رہتاس ۔

عہد بہادر شاہی[۵۲] ۴ شہ جلوس میں شاہزادہ فرخ سیر جب صوبہ کے نظم ونسق کی خاطر بہار میں قیام پذیر تھا تو محمد رضا خاں مخاطب برعایت خاں جو بادشاہ کے منصب داروں سے تھا عتاب شاہی کے سبب دکن سے صوبہ بہار آیا اور رہتاس کے قلعہ داری کا جعلی فرمان دکھلا کر قلعہ پر قابض ہوگیا ۔ قبضہ وتسلط کے بعد سرکار رہتاس سے متعلقہ علاقہ سے مالگزاری وصول کرکے اور ذخیرہ جمع کرکے بادشاہ کو عرضی لکھی کہ شاہی متصدیوں کا کوئی معقول بند وبست نہ رہنے کے سبب میں نے قلعہ رہتاس پر قبضہ کر رکھا ہے اور اس کے پہلے مخبر سلطانی نے رعایت خاں کی خبر دے رکھی تھی ، بنابریں بہادر شاہ اور عظیم الشان ہر دو نے شاہزادہ فرخ سیر کو رعایت خاں کی تنبیہ وتادیب کے لئے اور قلعہ کو اس کے قبضے سے نکال لینے کا حکم دیا ۔ مگر شاہزادہ کے پاس قلعہ کے محاصرہ کے لئے کافی ساز وسامان موجود نہ تھے ۔ اور قلعہ کا محاصرہ بھی دشوار طلب تھا ۔ اسلئے اس نے صائب الرائے امراء سے مشورہ طلب کیا ۔

لاچین بیگ قلماق نے جس کو شاہزادہ نے ملازمت سے برطرف کر رکھا تھا ، یہ مشورہ دیا کہ اگر یہ خبر مشہور عام کردیجائے کہ بادشاہ کی طرف سے رعایت خاں کے عفو جرایم اور رہتاس کے قلعہ داری کا فرمان مع خلعت ونشان آیا ہے ۔ اور میں ان چیزوں کو رہتاس لیجانے اور رعایت خاں کو سپرد کرنے کے بہانے سے شاید اس کا کام تمام کرسکوں ـــــ اس تدبیر سے اگر اس کو قتل کرکے زندہ واپس آیا تو انعام کا مستحق ہونگا ورنہ میرے مقتول ہونے کی صورت میں اہل وعیال کی پرورش کا پورا خیال کیا جائے ۔ شاہزادہ فرخ سیر اور ارکان دولت اس صلاح کے مطابق لاچین بیگ کو خلعت ونشان دے کر بعض جانبازوں کے ہمراہ رہتاس روانہ کیا ۔

لاچین بیگ کے سلام وپیام کے بعد رعایت خاں راضی ہوگیا کہ لاچین بیگ صرف دو ہمراہیوں کے ساتھ قلعہ کے دروازہ پر آکر خلعت ونشان سپرد کردے ۔ جب رعایت خاں استقبال کی خاطر قریب پہونچا تو لاچین بیگ نے ازبکی چھری نکال کر رعایت خاں کے پیٹ میں ایسا مارا کہ ایک ہی وار میں اس کا کام تمام ہوگیا ۔

رعایت خاں کے بعض ہواخواہوں نے لاچین بیگ کو چند زخم کاری لگائے لیکن ساتھیوں نے اس کو بچا لیا ـــــ اور رعایت خاں کا سر کاٹ کر شاہزادہ فرخ سیر کے حضور میں روانہ کیا گیا ۔

شاہزادہ نے بارگاہ سلطانی سے لاچین بیگ کو بہادر دل کا خطاب اور دیوان کا منصب دلوایا ۔ اور نیز اس کارنمایاں سے خود فرخ سیر کا اعزاز بہادر شاہ اور عظیم الشان کی نگاہ میں بہت زیادہ ہوگیا ۔

میر قاسم خاں عالیجاہ اور قلعہ رہتاس ۔

شاہ عالم کے عہد حکومت میں محصول تجارت کی بابت عالیجاہ حاکم اعلےٰ بہار وبنگال اور کمپنی اور صاحبان کونسل کے مابین سوء مزاجی اور نزاع ہوگئی ۔ کارکنان کمپنی اور شاہی عمال کی زیادتیوں اور جانبین کی غلط فہمیوں کے باعث جنگ چھڑ گئی ۔ چنانچہ بماہ محرم ۱۱۷۷ھ میدان سوتی میں جانبین سے افواج نکل کر صف آرا ہوئیں اور زبردست مقابلہ ہوا ـــــ نتیجہ کار افواج عالیجاہ کو شکست ہوئی ۔ عالیجاہ نواح سوتی میں تھا کہ شکست کی خبر ملی وہاں اودھوا نالہ سے مونگیر پر پہونچکر ایک طرف مورچال کے استحکام اور افواج انگلشیہ کے مدافعت کے بندوبست میں مصروف ہوا ۔ تو دوسری طرف اموال اندوختہ زر وجواہر اور نیز بیگمات اور دیگر وابستگان کو قلعہ رہتاس روانہ کرنے کی فکر میں ہوا ۔ چنانچہ بیگم خاص اور دیگر مستورات اور جواہر وخزانہ کو میر سلیمان خانساماں اور دیوان نوبت رائے اور چند دیگر معتمد ملازمین کی نگرانی میں کشتیوں اور ہاتھیوں ، چھکڑوں ، اونٹوں پر بار

---

۵۱ ماخوذ از شاہجہاں نامہ وسیر المتاخرین ذکر باغی شدن شاہزادہ شاہجہاں ۔

۵۲ منتخب اللباب حصہ دوم صفحہ ۶۰۹ و ۶۱۰ ۔

۵۳ سیر المتاخرین صفحہ ۷۳۲ تا ۷۳۴ ۔

کرکے قلعہ رہتاس کو روانہ کیا۔ اور بے تعلق مستورات جو حرم سرا میں اکٹھا ہو گئی تھیں اُنہیں جواب دیدیا کہ جہاں جینگ سما نکل جائیں۔[۵۱] اور عالیجاہ کو جب اودھ واندی اور پٹنہ میں شکست پر شکست ہوئی تو وزیر الممالک شجاع الدولہ بہادر سے اعانت کا طالب ہوا۔ چنانچہ اسی غرض سے پٹنہ سے بنارس اور بنارس سے الہ آباد پہونچا۔ وزیر الممالک کو تحفہ و تحائف سے خوش کرکے صوبہ جات بنگال و بہار کے استرداد پر تیار کیا چنانچہ عالیجاہ وسط ماہ رمضان المبارک ۱۱۷۷ھ میں شاہ عالم اور وزیر الممالک کے ہمراہ بنارس واپس آیا۔ اور مقام پٹنہ میں افواج شاہی اور انگلشیہ سے مقابلہ ہوا ـــــــ اور پھر دوسرا زبردست مقابلہ مقام بکسر میں ہوا۔ چونکہ عالیجاہ نے وزیر الممالک سے وعدہ کیا تھا کہ استرداد صوبجات شرقیہ اور انتزاع بنگال و بہار کے ارادہ سے گنگا عبور کرکے حدود عظیم آباد میں قیام رکھیے۔ گیارہ لاکھ روپیہ ماہیہ حضور والا میں ادا کیا کریں گے۔ مگر عالیجاہ حالات کی تبدیلی کے سبب اس وعدہ کو پورا نہ کر سکا۔ جس کے سبب عذر و معذرت کے باوجود وزیر الممالک اور عالیجاہ میں سُوء مزاجی پیدا ہو گئی۔ اس غیر متوقع سُوء مزاجی اور انقلاب پیہم نے عالیجاہ کو خود اس طرح پر فراموش کر دیا کہ اموال اندوختہ اور بیگمات[۵۲] کی خبر لے نہ سکا۔ اور یہ سب امانتیں دیوان نوبت رائے کے بعد دیوان ساہو مل کے سپردگی میں رہیں[۵۳]۔

قلعۂ رہتاس اور انگریزوں کا تسلط

ایک طرف[۵۴] میر سلیمان خانساماں عالیجاہ نے وزیر الممالک اور اُس کے ارکان دولت سے ساز و باز کرکے کسی مقرب خاص کے وساطت سے یہ خبر پہونچائی کہ یعقوب کمیدان حارس قلعہ اور دیوان ساہو مل قلعہ دار رہتاس ہمارے متوسلوں اور ماتحتوں سے ہیں۔ اور نیز کیسہ ہائے زر و جواہر معلوم اور ہمارے رکھے ہوئے ہیں۔ اور بیگمات سب ہماری نگرانی میں ہیں۔ اگر مرضی مبارک اور حکم عالی ہو تو قلعہ کی تسخیر و تسلیم میں ممکن تدابیر عمل میں لاکر ممالک محروسہ میں اس کو شامل کر دوں۔ وزیر الممالک تو ان امور کا جویا تھا ہی۔ خبر پانے کے میر سلیمان خانساماں کو طلب کیا اور عنایات شاہانہ سے خوش کرکے میر رحیم خاں حاکم سہسرام کے پاس روانہ کیا کہ طلب کردہ رقوم میر سلیمان کو وہ ادا کر دے۔ چنانچہ میر سلیمان سہسرام ہوتا ہوا رہتاس پہونچا۔ اور حسب وعدہ تسلیم قلعہ کے ریشہ دوانیوں میں سرگرم عمل تھا کہ دوسری طرف میجر منرو سردار افواج انگلشیہ تے جو بمشورہ کونسل کلکتہ فوج کی نگرانی اور وزیر الممالک کے مقابلہ کے لئے مامور ہو کر عظیم آباد آیا ہوا تھا۔ ڈاکٹر فلرٹن کی وساطت سے سید غلام حسین طباطبائی مصنف سیر المتاخرین کے پاس ایک نوشتہ روانہ کیا کہ اگر تمہاری کوششوں سے قلعہ رہتاس ہمارے قبضہ میں آجائے تو ازدیاد محبت کا موجب ہو۔ جب تحریر[۵۵] مصنف مذکور نے اس راز کو دیوان ساہو مل سے ظاہر کیا۔ اور مخلصانہ اور دوستانہ طور پر سمجھا دیا کہ دیکھو وہ دن قریب ہے کہ جماعت انگلشیہ غالب اور سربلند۔ اور وزیر الممالک اور اُس کی

---

[۵۱] مارٹن صاحب کتاب مذکور میں تحریر فرماتے ہیں کہ "قاسم علی حاکم بنگالہ و بہار نے قلعہ رہتاس کو علی گہر قلعہ دار رہتاس سے اُس کے غائبانہ میں اس طور پر حاصل کیا کہ دیوان قلعہ دار اُس وقت ساہو مل تھا اور شجاع الدولہ کا طرفدار تھا، بنابریں حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا۔ تو قاسم علی نے نثار علی کو قلعہ دار رہتاس مقرر کیا اور اُس نے دیوان مذکور کو اُس کے نافرمانی کے سبب مقید کر دیا۔ جب قاسم علی کی فوج نے اودھوا نالہ پر ہزیمت اٹھائی تو قاسم علی نے بیگم کو مع ۱۷۰۰ عورتوں اور بشمار خزانے کے لالہ نوبت رائے کی نگرانی میں قلعہ رہتاس کو بھیجدیا۔ چونکہ نوبت رائے اس کے بعد ہی مر گیا اور قلعہ دار حاکم مذکور ہمراہ تھا۔ اس لئے یہ امانت دیوان ساہو مل کے سپردگی میں دیگئی ـــــــ پھر جب قاسم علی کو بکسر میں پوری شکست ہوئی تو اس کے بعد دیوان مذکور نے بیگم کو نواب قاسم علی کے پاس بھیجدیا۔ لیکن خزانہ بھیجا نہ جا سکا۔

یہی حقیقتیں مولوی ابو محمد مصلح صاحب سہسرامی نے بھی تاریخ سہسرام میں تحریر فرمائی ہیں ظاہر ہے کہ تاریخ سہسرام کا ماخذ اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا ہے

[۵۲] مارٹن صاحب کی تحقیقات مندرجہ سے معلوم ہو چکا ہے کہ بیگمات عالیجاہ کے پاس بھیجدی گئیں مگر خزانہ لیجا نہ سکا۔

[۵۳] سیر المتاخرین صفحہ ۷۴۵ و ۷۴۶

[۵۴] سیر المتاخرین صفحہ ۷۵۷ و ۷۵۸

[۵۵] مصنف مذکور اور حکومت انگلشیہ سے دوستانہ، خادمانہ، مورخانہ گوناگوں تعلقات تھے۔ عالیجاہ اور انگریزوں کے جنگ کے دور میں اگرچہ کسی عہدہ پر ممتاز نہ تھا، مگر حکومت انگلشیہ کا رہین منت تھا اور مزید نوازشوں کا امیدوار۔ اسلئے حکام اعلیٰ اور سرداران فوج سے گہرے روابط اور تعلقات قائم تھے۔ اسلئے اس اہم کام کے لئے مصنف مذکور منتخب ہوا۔

ماری جماعتیں مغلوب ہونگی۔ اگر تم اپنی خیریت چاہتے ہو اور آیندہ کی فلاح و بہبود چاہتے ہو تو قلعہ رہتاس کو اپنے آقا کے دشمن وزیر الممالک کو حوالہ نہ کرکے، انگریزوں کے حوالہ کردو۔ اس کے بعد مصنف مذکور لکھتا ہے کہ دیوان ساہو مل بندہ کا ممنون کرم اور رہین منت اور ہماری جاگیر مقبوضہ سے ہمسائگی رکھتا تھا اس لئے بندہ کے حقوق اس پر تھے۔ علاوہ بریں دیوان مذکور خود مرد دانا اور سنجیدہ تھا اس لئے اس نے بندہ اور میر خانساماں کی باتوں کا موازنہ کرکے میر مذکور کو بہت لیت و لعل میں رکھا۔ اور بندہ کے پاس ایک مراسلہ روانہ کیا کہ تسلیم قلعہ کے لئے میں آمادہ ہوں مگر آیندہ کے لئے مجھے مطمئن کردیا جائے کہ میرے اس نوشتہ مطالب کو دستخط سے مؤکد و موثق کراکر بھیجدیں، چنانچہ مصنف موصوف نے ڈاکٹر فلرٹن اور میجر منرو کو لکھا کہ جرنل گارڈ صاحب جو نواح ٹکاری میں کپتان ہے طلب کرکے اور دیوان کے نوشتہ مرسلہ پر دستخط کرالیں اور رہتاس دیوان ساہو مل کے یہاں بھیجدیں۔ چنانچہ مصنف موصوف کی سعی پیہم سے قلعہ رہتاس پر[1] انگریزوں کا قبضہ اس صورت سے ہوا کہ جرنل گارڈ صاحب ایک پلٹن لیکر قلعہ تک آپہونچے، دیوان نے خوش آمدید کہا اور خوشی خوشی کلید قلعہ جرنل صاحب کے حوالہ کردی۔ قلعہ پر قبضہ ہوتے سب سے پہلے نقد و جنس اور بیگمات عالیجاہ کا جائزہ لیا گیا۔

قلعہ رہتاس عہد انگلشیہ میں

بیگمات[2] کے جائزہ میں ایک انگریز خاتون بھی تھی، اُسے تو جرنل صاحب نے پاس رکھا اور بیگمات کو حکم ہوا کہ مرشد آباد یا جہاں کہیں جائیں روانہ ہوجائیں۔ چنانچہ خانماں برباد بے سروسامان نکل کھڑی ہوئیں صعوبت راہ اور مصائب سفر سے بہتوں کا خاتمہ ہوگیا اور غالباً چند افتاں خیزاں مرشد آباد پہونچیں، اور وہ کیسہ ہائے زر و جواہر اور دیگر نقد و جنس جرنل صاحب[3] کے ہاتھ لگے۔ اور قلعہ دار اور دیوان کے منصب اٹھادئے گئے، گماشتگان متعلقہ سرکار رہتاس کو جواب دیدئے گئے۔ توپخانے اور رسالے منتقل کردئے گئے۔ متعینہ فوجیں ہٹالی گئیں، بارکیں خراب کردی گئیں۔ ہاں ایک مختصر محافظ دستہ فوج ایک سال کے لئے مقرر کردیا گیا۔ علاوہ ازیں پُر رونق بازار اٹھادئے گئے۔ دکاندار روانہ ہوئے۔ صناع اور کاریگر جو قیام پذیر تھے انہوں نے اپنی اپنی راہ لی۔ المختصر جرنل صاحب کے دو ماہہ قیام میں رہتاس جیسا پُر رونق مقام ویران کردیا گیا۔ اس کی مرکزیت ختم کردیگئی اور خبر نہیں کون کون سی یادگار زمانہ یادگاریں اور قابل آثار نیست و نابود کردئے گئے ــــــــ"

اس واقعہ کے تقریباً ڈیڑھ سو سال کے بعد بیسوی صدی عیسوی کے آغاز میں لارڈ کرزن کے عہد حکومت میں حکومت کی تعمیری توجہ مبذول ہوئی کہ قلعہ اور اُس کے بقیتہ السیف آثار محکمہ آثار قدیمہ ہند کے زیر نگرانی آگئے۔ جس کے سبب آثار باقیہ سیاحان عالم سے اپنی درد بھری کہانی سنانے کے لئے باقی رہ گئے ہیں۔

---

[1] مارٹن صاحب لکھتے ہیں: قاسم علی شجاع الدولہ کے بےرحمانہ سلوک اور اس کی رکشش بجائے کبیدہ خاطر تھا اس نے جنگ بکسر کے بعد ہی دیوان ساہو مل کو لکھا کہ قلعہ انگریزوں کے سپرد کردیا جائے مگر حقیقت وہی ہے جو صاحب سیر المتاخرین نے ذمہ دارانہ طور پر تحریر کیا ہے۔ [2] مارٹن صاحب نے لکھا ہے کہ جنگ بکسر کی شکست کے موقع پر دیوان مذکور نے بیگم کو نواب قاسم علی کے پاس بھیجدیا لیکن خزانہ بھیجا جانہ سکا ــــــ اس سے ظاہر ہے کہ وہ سب نقد و جنس جرنل صاحب کو ہاتھ لگے۔

[3] یہ پوری حقیقتیں مارٹن صاحب کی تحریر سے ظاہر ہورہی ہیں۔

سرمایہ داری

از جناب سیّد مظفر حسین صاحب ایڈوکیٹ

جب انسان وجود میں آیا، یا یوں کہیئے کہ جب کوئی شے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اس منزل تک پہونچی تو وہ ضروریاتِ زندگی سے بیگانہ ازلو نہ تھی - ازل سے انسان کی ضروریات اس کے ساتھ ساتھ ہیں، اور تاریخی حیثیت سے دونوں بالکل ہم عمر ہیں۔ لیکن اگر ان اگلی ضرورتوں کا موجودہ ضروریات سے مقابلہ کیا جائے تو کوئی مناسبت نہ ہوگی - اُس وقت کی ضروریات محض خوراک اور موسم کی شدتوں سے محفوظ رہنے تک محدود تھیں - ان ضرورتوں کے پُورا کرنے کی معمولی سی ترکیب بھی معلوم تھی - جیسے جیسے انسان ترقی کرتا گیا ویسے ویسے اس کی ضرورتیں بھی بڑھتی گیئں - ویسے ویسے ان کے پورا کرنے کی دقتیں بھی بڑھتی گئیں - اور کم و بیش ان کا حل بھی ہوتا گیا - اگر اس وقت کی سادہ اور سہل زندگی کا اس زمانے کے متمدن اور مہذب زندگی سے مقابلہ کیا جائے تو آسمان و زمین سے زیادہ کا فرق نظر آئیگا - وہ آس پاس کے درختوں کے پھل توڑ کر کھالینا وہ درختوں کے نیچے یا پہاڑوں کے غاروں میں سردی گرمی اور بارش سے بچنے کو دوڑ دوڑ کر چھپنا!

کہاں وہ دور اور کہاں دورِ حاضر کی وسعت اور پیچیدگیاں! کھانے پینے کے اقسام کی کوئی انتہا نہیں - رہایش کے انداز اور سامان کے تکلف کی کوئی حد نہیں - پوشاک، آرائش اور زیبایش کے تکلفات کا شمار نہیں - وہ صرف آس پاس کے درختوں کے پتے اور پھل کھا سکتا تھا - آج کل کے انسان کے لئے کروڑوں در کروڑ آدمی سیکڑوں قسم کے غلہ اناج اور پھل اُگانے میں مصروف ہیں۔ میرے کھانے پر بیسیوں قسم کی چیزیں ہوتی ہیں - روٹی مشین سے پکی ہوئی، آدمی کا ہاتھ مطلق نہیں لگا - ریل پر تین چار سو میلوں سے آئی - لطف یہ ہے کہ ہنوز تازی ہے - کل شب کو پکی اور اس وقت ناشتہ کے وقت دسترخوان پر موجود - اس کے ساتھ کا مکھن پانچ چھ ہزار میلوں کی مسافت طے کر کے ہولینڈ اور ڈنمارک سے آیا ہے - بعضوں کو یہ مکھن پسند نہیں، اور ان کے لئے مکھن سوئزرلینڈ یا نیوزی لینڈ سے آتا ہے - بعض شہد امریکہ سے منگواتے ہیں۔ بعض کے لئے پنیر آئرلینڈ سے آتی ہے - پھل کو دیکھیئے تو اتنے قسم کے ہیں کہ یکوقت سب کو کھانا ناممکن ہے - بعض ہزاروں میل طے کر کے اسٹریلیا، جاپان اور کالیفورنیہ سے آتے ہیں - چھُری کانٹے اور چمچے جن سے میں کھا رہا ہوں، وہ انگلستان کے بنے ہیں، رکابیاں، گلاس اور بعض بعض برتن جاپان، جرمنی اور چین سے آتے ہیں دسترخوان کا کپڑا غالباً جاپانی یا ولایتی ہے - ذرا دیر بعد کھانے کے ٹیبل پر سے اُٹھ جاؤں گا - بلکہ کھانے کے کمرے ہی سے ڈرائنگ روم میں چلا جاؤنگا - اس میں آرام سے بیٹھنے کے لئے کئی طرح کی کرسیاں اور صوفے ہیں، قالین ہیں - دیواروں پر آرائش کے لئے کہیں خوشنما تصویریں ہیں کہیں آئینے ہیں - کہیں پھولوں اور کام کئے ہوئے کپڑے ہیں - کہیں چینی یا شیشے یا دھات کے بنے ہوئے گلدان آویزاں ہیں - ان میں سے بعض میں پھول، جن کے بیج اٹلی یا فرانس یا انگلستان سے منگائے گئے تھے - کہیں نقلی پھول ہیں، جو خوبصورتی میں اصلی کو بھی شرماتی ہیں

دروازوں پر پردے پڑے ہیں۔ ان کے لئے لیس خاص ہلجیم اور اس کے نواح سے آتا ہے۔ بغل میں تفریح کے لئے گرامو فون رکھا ہے۔ نادر نادر گانیوالوں کے گانے جب چاہوں سُن سکتا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد ریڈیو سُنیں گا۔ اس پر امریکہ اور یورپ سے گانے کی آواز آئیگی۔ بلکہ آج فرانس کے وزیر اعظم کی تقریر کا انتظار ہے۔ بغل ہی میں پس پردہ ٹیلیویژن کا سامان رکھا ہے۔ لندن پیرس اور نیو آرک کے تھیٹروں کے تماشے گھر بیٹھے بیٹھے دیکھ سکتا ہوں۔ اس سے جب جی بھر جائے تو یہاں سے اُٹھ کر بغلی میں ذرا لائبریری کے کمرے میں چلا جاتا ہوں۔ یہاں ساری کتابیں ہیں۔ سارے جہاں کے اشاعت خانوں کی فہرستیں دیکھ کر بلکہ اُن کے ایجنٹوں سے ملکر منگوائی ہے۔ بعض امریکہ سے آئی ہیں۔ بعض انگلستان سے۔ بعض فرانس سے۔ بعض ایران سے۔ ان تصنیفوں کے علاوہ اور اور ملکوں سے وہاں کے شاہکاروں کے ترجمے بھی منگوائے ہیں۔ روسی انقلاب پسندوں کی کتاب کے ترجمے ہیں۔ جرمن فلسفیوں کی کتابوں کے ترجمے ہیں۔ لاطینی اور یونانی ماہروں کے بھی بعض بعض ڈرامے ہیں۔ غرض یہاں بھی تھوڑی دیر طبیعت بہل جاتی ہے۔ اس ذریعہ سے طبیعت بہلانے کا کام سارے جہاں میں ہزاروں اشاعت خانوں نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔ یہیں ریڈیو فون لگا ہے۔ اور گھر بیٹھے بیٹھے امریکہ اور لندن کے احباب یا کاروباریوں سے ٹیلیفون یا ریڈیو فون سے باتیں کر سکتا ہوں۔ امریکہ کے بازار کی شرح دریافت کر سکتا ہوں۔

شام کے ناشتہ پر چند احباب آنے والے ہیں۔ اُن میں سے ایک صاحب بیرسٹر ہیں۔ اور انہوں نے آئرلینڈ میں تعلیم پائی ہے۔ ایک صاحب دانتوں کے ڈاکٹر ہیں اور فرانس کے تعلیم یافتہ ہیں۔ ایک صاحب انجینیر ہیں۔ اور امریکہ اور جرمنی دونوں کی سندیں رکھتے ہیں۔ ایک صاحب سیاح ہیں اور سارے جہان کی چند بار چکر لگا چکے ہیں۔ اُن میں اور اُن کے بھائی میں ایک بات میں بڑا اختلاف رہتا ہے۔ دونوں افکار زندگی سے بالکل آزاد ہیں۔ دونوں کو سیاحت کا شوق ہے مگر ایک عجلت پسند ہیں اور صرف ہوائی جہاز پر سفر کرتے ہیں۔ کلکتہ سے تین ساڑھے تین دنوں میں لندن پہونچنا ان پر جبر گذرتا ہے دوسرے ذرا سُست رو ہیں اور صرف جہاز یا ریلوں پر چلتے ہیں۔ کل دونوں نے اپنے اپنے خیالات ریڈیو پر ظاہر کئے تھے، اور آج یہاں اس بحث کو جاری رکھیں گے۔ چائے کے بعد سینما کا ارادہ ہے۔ انقلاب فرانس کے متعلق فلم ہے۔ ماہر روسی ڈائرکٹر کنالسکی نے تیار کیا ہے اور امریکہ کی مشہور ترین اداکار اس میں ملکہ فرانس بنے گی۔ خاص امریکہ والوں نے یہاں ایک تفریح گاہ بنائی ہے اس میں تماشہ ہوگا۔ غرض ضروریات چند در چند بڑھ گئی ہیں اور ضروریات کو چھوڑ کر اب انسان اتنا آگے بڑھ گیا ہے کہ اُس دور کے تو کجا اگر محض سو برس پہلے کے آدمی کو زندہ کر کے اس دور میں لایا جائے تو وہ چکا چوند ہو جائے۔ اسی طرح دو سو تین سو برس پہلے کے آدمی کو زندہ کر دیا جاتا تو چکا چوند ہو جاتا۔

درختوں کے پتے کھانے والے ننگے رہنے والے پہاڑوں کے غار میں پناہ لینے والے انسان کو اس عروجِ کمال تک پہونچانا سرمایہ داری کا اعجاز ہے۔ ہمارے آرام و آسائش کے سامان میں اتنی سہولتات اور تنوع اسی کی عنایت ہے۔ ضروریات پورا کرنے سے مطمئن ہو کر ایک اور فروعات کی گنگا بہا دینا اسی کا فیضان ہے۔ ایک متوسط درجے کے انسان کی ضروریات کا معیار چند در چند بڑھ گیا ہے۔ اور ان ضروریات کے علاوہ انگنت نیم ضروری اور غیر ضروری اجزا اُس کی زندگی میں شامل ہو گئے ہیں۔ ان سب کا فراہم کرنا سرمایہ داری نے اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ اس غرض کے ادا کرنے کو ایک عظیم الشان ڈھانچا کھڑا ہے۔ جس کی میکانکی اور تنظیمی کامیابی دشمنوں سے بھی داد لئے بغیر نہیں رہتی۔ مگر جہاں ایک گروہ پہاڑوں کے غار

اور درختوں کے سائے چھوڑ کر سرمایہ داری کے بنائے ہوئے دس منزلے اور بیس منزلے فلیٹوں میں رہنے لگا۔ جہاں سرمایہ داری نے اس کے آرام و آسائش اور تفنن کی خاطر ان فلیٹوں کو رشک فردوس بنا دیا۔ وہیں ایک گروہ ایسا بھی موجود ہے جو اب تک درختوں کے پتوں اور چھالوں کی بنائی ہوئی ٹٹیوں کے سائے میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اس ٹٹی کے نیچے پہاڑوں کے غار سے زیادہ وسعت نہیں ہوتی۔ پہاڑوں کے غار سے کم تاریکی نہیں ہوتی۔ سرمایہ داری کے بنائے ہوئے ساز و سامان یہاں اسی قدر مفقود ہیں جتنے پہاڑوں کے غار میں فطرت کی بنائی ہوئی زمین پر اللہ تعالیٰ کا ایک سرمایہ داری کے بنائے ہوئے کپڑوں سے بے نیاز اس کے غیر فطری تکلفات سے ناآشنا، اس کے عنایات کی دست رس سے دُور، اس کے فیض کے چشمے سے بے بہرہ محض اللہ پر بھروسہ کئے پڑا ہے۔ بغل ہی میں ایک پر ایک اس سے بھی زیادہ بدحال اور کئی انسانی صُورتیں ڈھیر ہیں۔ ان کے لئے معاشی دَور ابھی نہیں بدلا۔ وہ اب تک فطرت کے پہلے دَور میں ہیں۔ یا اس سے محض اس قدر گذر گئے ہیں کہ گلے سے لگا ہے دل کی بھڑاس نکالنے کی غرض سے غیر فطری تکلفات اور لذائذ تک دست شوق پھیلاتے ہیں، بلکہ زیادہ تک کاسہ گدائی۔

اِس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری نے ایک حیثیت سے بہت بڑا کام کیا۔ بڑا اس حیثیت سے کہ دَورِ حاضر کا عظیم الشان معاشی نظم بالکل اسی کا زائیدہ اور پروردہ ہے۔ اس کا کھڑا کیا ہوا تنظیمی اور مالیاتی ڈھانچہ فنی حیثیت سے بہت کچھ مکمل ہے۔ کم از کم کسی اور گروہ نے اس کا بدل نہیں سوچا ہے، اس کا اس سے بہتر ہونا بالکل مشکوک ہے۔ دوسرے وہ اسی سے عاریت لیا ہوا ہے اور نقوش ثانی کا حکم رکھتا ہے اس کے کھڑے ہوئے ڈھانچے کو نقش اوّل کا فخر حاصل ہے۔ گویا اس نے ایک نمونہ اور مثال کھڑی کر دی جس پر حسب ضرورت اور حسب تقاضائے وقت ردوبدل کر لیا جا سکے

مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہنا لازم ہے کہ اس کا دل اور دماغ کسی اعلیٰ اور قابل قدر جذبہ سے مملو نہ تھا۔ اس کی کل کوششوں اور سرگرمیوں کی بنیاد ذاتی مفاد کی امید تھی۔ مروّجہ اخلاق کے اعتبار سے گو یہ جائز ہو مگر دَورِ حاضرہ اور اس سے بھی زیادہ غالباً دَورِ آئندہ کے اخلاق کا معیار اس کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ اخلاقی معیار کو بہت پست کر دیا جائے تو اور بات ہے ورنہ محض ذاتی مفاد کی امید پر کام کرنا مستحسن نہیں قرار دیا جا سکتا اس کو جائز کر دینا اسی کی تعلیم تھی اور یہ تعلیم اس شد و مد سے کی گئی کہ نادانوں کو یقین ہو گیا کہ ذاتی مفاد کا خیال ہی محرکِ عمل ہو سکتا ہے ورنہ کوئی بغیر اس طمع کے انگلی اُٹھانے کا روادار نہیں۔

دوسرے اس کی یکسوئی نے ساری فطرت کو محض ایک نظریہ سے دیکھا۔ مگر اس نظر سے کہ کیسے اس کو اپنے اغراض و مقاصد کے حصول کا آلۂ کار بنایا جا سکتا ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے انسان اس کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہوا نظر آیا۔ ایک جماعت اس کو ایسی نظر آئی جو اس کی خدمت لے اور اس کا صلہ دے۔ یہ جماعت اہلِ استطاعت کی تھی۔ اس کی خدمت گذاری کر کے اپنے آپ کو بنانا اس نے اپنا نصب العین بنا لیا۔ ایک اور جماعت بھی انسانی صورتوں کی اس کو نظر آئی۔ اس کو اس نے اسی طرح دیکھا، جیسے لوہار اور بڑھئی اپنے اوزار کو دیکھتا ہے۔ ایک بالکل بے جسم و جان شئے جس کا مصرف ہی ہو محض کسی کام کرنے کے لئے استعمال کیا جانا۔ محض ایک آلہ محض ایک اوزار۔ ان انسانی صورتوں کی انسانیت کو یہ بھول گئی اور ان کو اس نے اپنے مشینوں کا ایک پرزہ ایک ٹکڑا سمجھ لیا۔ اس نظریہ کے ان کو استعمال بھی اسی طرح کیا۔

اس طرزِ عمل اور نظریہ کا جلا اری نتیجہ تھا وہ اب رونما ہونے لگا ہے۔ سرمایہ داری اور مزدوروں میں تصادم شروع ہو گیا ہے سارے

جہان میں کم و بیش یہ جنگ جاری ہے۔ بہت زمانے سے مزدوروں کے سینے میں آگ سلگ رہی تھی۔ مگر سرمایہ داری برسر اقتدار تھی ساز و سامان سے مرصع تھی۔ زیادہ [illegible] رکھتی تھی۔ یہ آگ سلگنے نہ پائی۔ جنگ عظیم کے پہلے ہی یورپ کے مختلف ممالک میں اس کی خوفناک بد ہیئت صورت سرمایہ داروں کو ڈرانے لگی تھی۔ جنگ عظیم کے بعد اُس نے اور قوت پکڑا۔ ایک بڑے عظیم الشان ملک سے سرمایہ داری کی بیخ و بنیاد اکھاڑ پھینکی۔ زار روس کے ملک سے سرمایہ داری رسوا و خوار ہوکر نکل گئی۔ انگلینڈ، فرانس اور امریکہ میں مختلف وجہوں سے اس کی کامیابی نے دوسری صورت اختیار کی۔ اٹلی اور جرمنی میں یہ قریب قریب روس کا نقشہ دہرانے والی تھی۔ مگر وہاں اس کو سخت مخالفت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ سرمایہ داری نے اپنا روپ و روپہ کچھ بدل دیا۔ درشتی و نرمی بہم دربہ است کے سبق کو یاد کیا۔ جرّاحی کے ساتھ ساتھ مرہم نہی شروع کی۔ اپنے حریفوں کی کتابوں سے ورق چرائے۔ اپنے اغراض و مقاصد اور مفاد کو قایم رکھتے ہوئے ظاہری رعایتیں کرنی شروع کیں۔ اپنی حد سے بڑھی ہوئی درشتی اور بدسلوکی میں تقاضائے وقت کے اعتبار سے مصلحتاً نرمی شروع کردی۔ اپنے بقا کی صورت عوام کے ساتھ رعایت کرنے میں دیکھی۔ ساتھ ساتھ اپنے مخالفوں کے پیچھے کچھ اس طرح پڑی کہ الاماں والحفیظ۔ زار روس کی سفّاکی قصۂ ماضی ہوگئی۔ بالشوکوں کی خونریزی رحم دلی معلوم ہونے لگی۔ غرض کہ درشتی و نرمی پر عمل کرنے کی وجہ سے ان دو ملکوں میں اس کے تنِ نیم جان بلکہ قریب قریب بے جان میں پھر خون کی لہریں بہنے لگیں۔ سرمایہ داری پھر اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی۔ مگر یہ سرمایہ داری اب وہ سرمایہ داری نہیں رہی۔ اس کی بدباطنی ماتحتی پھر قایم ہے کہ اس کو اب تک بدباطن ہی کہا جائیگا۔ اس کی خصوصیات اتنی پھر قایم ہیں کہ یہ اب تک سرمایہ داری کے سوا اور کچھ نہیں کہی جاسکتی۔ مگر اس کی ظاہری تشکیل کچھ کچھ مزدوروں کے مجوزہ شکل سے مشابہ ہوگئی ہے۔ سرمایہ داری بالکل بدستور قایم ہے۔ مگر سرمایہ دار غریب عجیب جنجال میں پڑگیا۔ روزہ بخشوانے گئے، گلے پڑی نماز کی مصداق ہوئی۔ مزدوروں سے بچنے کو اس نے ایک جماعت کھڑی کی۔ اس کی دامے درمے مدد کی۔ مگر جب یہ جماعت برسر اقتدار آئی تو مینڈکوں کے بادشاہ سارس کی طرح اپنی رعایا ہی کو کھانے لگی نہیں صرف مجروح و زخمی کرنے لگی۔ نیست و نابود ہوجانے سے اس کو اس سے بہتر جانا۔ سرمایہ داری کا حقیقتاً یہ ایک نیا رُخ ہے۔ اس کے بعد وہ بعض بعض اعتبار سے اشتراک کے قریب تر ہوگئی۔ بلکہ اشتراک میں تبدیل ہوجانے کے لئے تیار ہوگئی۔ یہ اس کے ارتقا کی آخری کڑی ہے، اس کی آیندہ منزل فنا ہے۔

اس آگ کے اس قدر بھڑک اُٹھنے کی چند اور وجہیں بھی تھیں، اوّل تو یہ کہ معاشی نظم کی یہ خوبی ہونا چاہیے، بلکہ یہ غرض ہونا چاہیے کہ ہر صحیح و سالم آدمی کو روزی کمانے کا ذریعہ بہم پہونچ جائے۔ سرمایہ داری اس حیثیت سے بالکل ناکام رہی۔ بیکاروں کی تعداد کروڑ کروڑ تک پہونچی۔ موجودہ دور میں بیکاری کے معنی فاقہ، عسرت اور بے خانماں ہونے کے ہیں ہے۔ کروڑ در کروڑ آدمیوں کا اس حال میں رہنا ہرگز امن و امان کا ضامن نہیں ہوسکتا۔ جس طریقے نظم میں ایسا ممکن ہو اس کے دشمنوں کی تعداد میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہیگا۔

دوسرے معاشی نظم کی پیداواری اس مقدار اور تعداد میں ہونی چاہیے کہ کل بنی نوع انسان کی ضرورتوں کو کافی ہو۔ ہر شخص کی ضروریات کا تمام و کمال پورا ہونا ضروری ہے۔ سرمایہ داری نظم میں اس کا کوئی سامان نہیں۔ کروڑوں در کروڑ بندگانِ خدا کی ضرورتوں کی طرف کوئی توجہ کرنے والا نہیں۔ کروڑوں آدمی کھانے پہننے کی چیزوں کو ترس رہے ہیں۔ مگر گیہوں جنس، اور قہوہ کی پیداوار کو کم کرنے کی بین الاقوامی کوششیں

ہو رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت بھی سوسائٹی کے مشتعل جزو میں اضافہ کرے گی۔

تیسرے یہ سوال بھی اجتماعی نقطۂ نگاہ سے بہت اہم ہے کہ انواع و اقسام کی پیداوار میں اوّل اور آخر کے اعتبار سے کیا نسبت ہو کون چیز پہلے اور کون چیز پیچھے بنائی جائے۔ ضروری چیزوں کے فراہم ہونے کا سامان اشیاء لطف و تعیش سے پہلے ہونا چاہیے۔ پہلے ضرورت پھر لطف اور آسائش اور عیش۔ سرمایہ دارانہ نظم میں یہ نسبت قایم کرنے اور قایم رکھنے والا کوئی عنصر نہیں۔ ہزاروں آدمی کھانے پینے کی چیزوں کو ترس رہے ہیں۔ کروڑوں آدمیوں کو دو وقت کا کھانا نہیں ملتا۔ اس طرف توجہ کرنے والا کوئی نہیں مگر گھوڑ دوڑ کے گھوڑوں کے لیے طرح طرح کے گھاس اُگانے میں ہزاروں آدمی منہمک ہیں۔ یتیم بچوں، بیکس محتاجوں اور غریب مریضوں کی مخصوص خوراک کا خیال کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ مگر شوقینوں کے کتوں کے بسکٹ بنانے کے لیے پوری پوری فیکٹریاں وقف ہیں۔

چوتھے جتنی چیزیں موجود ہوں ان کی تقسیم کا معقول اصول ہونا چاہیے۔ ہر شخص کا حصہ ہونا ضروری ہے۔ ہر شخص کو کچھ نہ کچھ ملنا ضروری ہے۔ موجودہ اصول تقسیم اس کا لحاظ نہیں کرتا۔ بعضوں کے گھر میں فراوانی اور بہتات کی ندیاں بہ رہی ہیں اور بعض نان جویں کو محتاج ہیں۔ ایک فورڈ اور روکفیلر بنایا ہوا ہے۔ اور ایک کاسہ گدائی کے لیے ادھر اُدھر دھکے کھاتا پھرتا ہے

پانچویں جتنی چیزیں موجود ہوں، ان کے تقسیم کا معقول نظم ہونا چاہیے۔ تقسیم کرنے کا طریقہ اور ترکیب ایسی ہونی چاہیے کہ ہر شخص کو جو اس کا حصہ ہو مل جائے۔ امریکہ میں لاکھوں بیکار بھوکوں مر رہے ہیں۔ لاکھوں من گیہوں موجود ہے۔ مگر تقسیم کی نظم کچھ ایسی ہے کہ یہ دانے ان مُنہ تک نہیں پہونچتے۔ سرمایہ داروں نے اس کو جلا دینا پسند کیا مگر ان کو یہ منظور نہ ہوا کہ گیہوں کی قیمت گھٹے۔ اور ان بھوکوں کو اس پر دسترس ہو سکے۔ غرض لاکھوں ٹن گیہوں جلا دیا گیا اور لاکھوں آدمی بھوکے رہے۔ اسی طرح تمام ملکوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کو جاڑوں میں بدن گرمانے کو ایک پیالی چائے یا قہوہ نہیں ملتا۔ برازیل میں ہزاروں من قہوہ موجود ہے۔ مگر یہ ان غریبوں کے بدن گرمانے کے لیے نہیں میسّر آسکتا۔ اور موٹروں کے ٹائروں کو صدمے سے محفوظ رکھنے کے لیے سڑکوں کو چکنا کرنے میں صرف کیا جاتا ہے۔

چھٹے اصول تقسیم کی خرابی کی وجہ سے ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے، جس کو کسی کام کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا پیشہ تعیش ہے۔ اس نے اپنا بوجھ اوروں کے کندھوں پر ڈال دیا ہے۔ اور ہمہ تن عیش و نشاط میں مشغول ہے۔ اس کی لاپروائی، آزادی اور کاہلی کی زندگی لاکھوں در لاکھوں محنت کے بوجھ سے مرے جانے والے انسانوں کو بجز مشتعل کرنے کے اور کیا کر سکتی ہے۔

جو جذبات سرمایہ دار کے محرک عمل ہو اور جب کوشش اور عمل کی غرض منفعت ہو تو ظاہر ہے کہ راہ عمل اور طریق کار بھی اس کی رعایت رکھتے ہوئے اختیار کیا جائیگا۔ اور اس میں بھی جہاں تک ممکن ہو حصول مدعا کو نظروں کے سامنے رکھا جائیگا۔ یعنی خود اس کو بھی ایک گونہ حصول مدعا کا آلہ بنایا جانے کی کوشش کیجائیگی "جہاں تک ممکن ہو" اور ایک گونہ قصداً اسلئے کہا گیا کہ اگر طریق کار میں کسی اور کی مدد بھی ضروری ہو تو اس کے محرک عمل جذبے اور کوشش کی مدعا کا لحاظ رکھنا ضروری ہوگا۔ دونوں میں کچھ نہ کچھ انحراف لازم ہے دونوں کا بالکل ایک ہونا قریب قریب غیر امکان ہے۔ گو حد امکان کے باہر نہیں۔ غرض اس معاون کے جذبے اور مدعا کی رعایت کرتے ہوئے طریق کار ایسا اختیار کیا جائے گا جو خود اپنے جذبے اور مدعا کو زیادہ سے زیادہ اور دوسرے کے مدعا کو کم سے کم حاصل ہونے دے۔ یعنی طریق کار چننے میں

یادہ سے زیادہ اپنا اور کم سے کم کسی اور کا خیال ہوگا۔ ایسی حالت میں خود طریق کار ایسی صورت اختیار کریگا کہ اس میں بذات خاص مدّعا کا حصول پوشیدہ ہو۔ سرمایہ داری نظم میں دو گروہیں ہیں۔ ایک جو اوروں کی مدد چاہتا ہے۔ دوسرا جو اوروں کو مدد دیتا ہے۔ سرمایہ دار اوروں سے مدد لیتا ہے۔ مزدور سرمایہ داروں کو مدد دیتا ہے۔ اور اس معاملہ میں بہت سی وجہوں سے سرمایہ دار کے مقابلہ میں اپنے حصول مدعا میں ناکام رہتا ہے۔ سرمایہ دار بہت سی جہتوں سے حریف غالب رہتا ہے۔ غرض اس طرح موجودہ معاشی نظم میں ایک گروہ حریف غالب کا اور دوسرا حریف مغلوب کا قایم ہوگیا ہے۔ اور ان میں میل اور موافقت ناممکن ہے۔ اس کی کوشش سعی لاحاصل ہے۔ چنانچہ یہ آگ ساری دنیا میں کم وبیش بھڑک چکی ہے۔ کہیں غائت جبر وتشدد سے کہیں کچھ حکمت عملی سے اور کہیں مقامی چند اسباب کے بنا پر یہ ابھی بہت برافروختہ نہیں ہوئی۔ مگر یہ محض چند روزہ کیفیت ہے۔ بکری کی ماں کب تک خیر منائے گی۔

جنوبی امریکہ میں چونکہ زمین اور معدنیات کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ اور صنعت وحرفت کی ترقی چنداں نہیں ہوئی۔ وہاں یہ تصادم ابھی ہیبت ناک صورت میں نہیں ہوا۔ شمالی امریکہ میں بھی یہ تصادم ابھی قدرے دبا ہوا ہے۔ وہاں اس کا دبا رہنا وہاں کے سرمایہ داروں اور معاشی نظم کے مزدوروں کو دیگر ہیلاتے رہنے پر ہے۔ وہاں یا انگلینڈ یا بعض اور ممالک میں اس سلگتی ہوئی آگ پریانی کی چھینٹیں اور مختلف صورتوں میں دیجا رہی ہیں۔ اکثر ملکوں کی حکومتوں نے مزدوروں اور بیکاروں کے نان ونوش کا کچھ سامان کر دینا مناسب سمجھا۔ بعض بعض دور اندیش سرمایہ داروں نے ان کے رہنے سہنے یا اور ضروریات زندگی کا کچھ ہلکا سا کا منہ دکھاوے کا سامان فراہم کر دیا ہے۔ خود سرمایہ داری کی حیرت انگیز میکانیکی ترقیوں نے ضروریات زندگی کو تھوڑے پونجی والے آدمی کے بھی دروازہ تک پہونچا دیا ہے۔ ان سب باتوں نے مل ملا کر درشتی اور ناانصافی کے پہلو پر پردہ ڈالدیا ہے، مگر ان رعایات اور مراعات سے نفس مسئلہ پر اثر نہیں پڑتا۔ وہ اپنی جگہ پر اٹل ہے۔ معاشی نظم کو اپنا مدعا اپنے اغراض ومقاصد اور اپنا محرک عمل جذبہ بدلنا ہی پڑیگا۔ دوسرے معاشی نظم کے ساتھ ساتھ جو اخلاق اور فلسفہ مروج ہوگیا، وہ بھی اب نامحمود نظر آتا ہے۔ اسکے اثر سے متاثر ہو کر اور ان کے رہنمائی میں سیاسیات نے بھی ایک خاص رویہ اختیار کیا ہے۔ اور گو یہ رویہ اب کچھ کچھ بدل رہا ہے۔ مگر اس کی رفتار بالکل تشفی بخش نہیں۔

غرض میکانیکی اور بعض تنظیمی حیثیتوں سے گذر کر اور شعبوں میں یا اور حیثیتوں سے سرمایہ داری کی خدمات روشن نظر نہیں آتیں اس کی میکانیکی کامیابیوں کے سب معترف ہیں۔ ان سے انکار کفر ہے۔ مگر سرمایہ داری کا صرف ایک میکانیکی ہی پہلو ہی نہیں۔ بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست کے قاعدہ پر اس کے اتنے پہلو ہیں کہ اس کا شمار نہیں۔ اس کو صرف ایک کسوٹی پر پرکھا نہیں جا سکتا، اسکو سوشل اور اخلاقی حیثیت سے جانچنا ہوگا۔ اسکے معاشی پہلوؤں پر بھی ڈالنی ہوگی، اس نے ایک تہذیب اور تمدن کی بنیاد ڈالی، اسکو دیکھنا ہوگا۔ عموماً سرمایہ داری صرف ایک معاشی تنظیم اور طریق کار کا نام نہیں بلکہ اس سے زیادہ وسیع اور بسیط چیز ہے۔ معاشی تنظیم ایک سانچہ ہے، دنیا کی اور کل چیزیں اسی سانچے میں ڈھلنے لگتی ہیں یہ ایک بنیاد ہے جس پر اور کل عمارتیں کھڑی ہیں۔ چنانچہ من حیث بنیادی معاشی نظم کے سرمایہ داری نظم نے بھی دنیا کے اور کل علوم وفنون اخلاق وفلسفہ کو بالکل اپنے زیر اثر کر لیا سب پر چھا گیا اور سب کو رنگ میں رنگ لیا۔ اسکے زیر سایہ ایک سوشل تنظیم کی تشکیل مکمل ہوئی۔ اس نے اخلاق وفلسفہ پر نہ صرف اثر ڈالا بلکہ اپنے اغراض ومقاصد اور اصول کے اعتبار کا ایک خاص نقطۂ نگاہ اور معیار قایم کر لیا۔ سیاسیات پر حاوی ہو کر سیاسی اقتدار کو اپنے اغراض ومقاصد کے حصول کا آلہ بنایا۔ حقیقت میں سرمایہ داری صرف ایک محدود تنظیم اور طریق کار کا نہیں بلکہ اس معاشی نظم اور رویہ نے جو ایک دنیا قایم کر دی اس کا ہونا چاہیئے۔ معاشی تنظیم اس دنیا کا صرف ایک اہم ترین اور بنیادی جزو ہے۔ مگر اصلاح میں سرمایہ داری نظم سے مراد صرف معاشی نظم ہوتا ہے۔ اس مخصوص محدود نقطۂ نگاہ سے سرمایہ داری نظم کا مطالعہ ان مختلف عنوانوں کے تحت میں کیا جا سکتا ہے۔ جس پر موقع ملا تو کبھی کبھی اظہار خیال کیا جائے گا۔

سنت کبیر داس

ہندی ادب کا مایۂ ناز شاعر

(از جناب مظہر رمضا پوری ایم - اے - یونیورسٹی - گولڈ میڈلسٹ)

ہندی زبان کے مہاکوی سنت کبیر داس ۱۳۹۸ء میں بمقام کاشی پیدا ہوئے۔ ان کے حسب و نسب کے متعلق ابتک کوئی اٹل فیصلہ نہ ہو سکا۔ ہندی اسکالروں کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ یہ ایک مسلمان جولاہے کے گھر پیدا ہوئے۔ دوسری جماعت کا دعویٰ ہے کہ ایک بیوہ برہمن کاشی میں رہتی تھی۔ ایک دن سوامی رامانند جی نے خوش ہو کر اس کو غلطی سے اشرباد دیدی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے ایک لڑکا ہوا۔ وہ بہت گھبرائی، لاکھ سوچتی لیکن اُس کی سمجھ میں کوئی بات نہ آتی تھی، کہ وہ بچّہ کو کیا کرے ——— ؟

دنیا والوں کے خوف، سوسائٹی کے قید و بند، اور ملکی رسم و رواج کی بنا پر مجبور ہو کر لہر تار کے قریب ہی ایک تالاب کے درخت کے نیچے مادرانہ محبت و شفقت کو تیاگ کر اُس زائیدہ بچّہ کو روتا بسورتا چھوڑ آئی۔ حسنِ اتفاق سے ایک مسلمان جولاہا علی یا نیرو نامی اپنی بیوی نیما کے ساتھ اس طرف سے آ رہا تھا، پاس سے گذرا۔ یکایک دونوں کی نگاہیں بچّہ پر پڑیں۔ نیرو ٹھٹک گیا۔ بچّہ کے قریب گیا، چند لمحہ تک حیرت زدہ کھڑا رہا۔ اس سنسان مقام پر بچّہ کو تنہا دیکھ کر سخت پریشان ہوا۔ اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں۔ لیکن کوئی نظر نہ آیا۔ بچّہ بے طرح رو رہا تھا۔ اُس کو اُٹھا کر پیار کیا۔ پیار چمکار کر چُپ کیا۔ پھر بیوی سے کہا ———

"نیما! چلو اِس بچّہ کو گھر لے چلیں۔ بیوی نے اس خیال کی سخت مخالفت کی۔ نیرو نے ایک نہ سُنی بچّہ کو لیکر گھر کی راہ لی۔" نیرو کے اور کوئی دوسری اولاد نہ تھی۔ اسے اپنی اولاد کی جگہ سمجھا۔ اور بڑے ناز و نعم سے پرورش کرنے لگا۔

ہندی اسکالروں کی یہ جماعت اپنے دعویٰ کی دلیل میں کبیر داس کے یہ اشعار پیش کرتی ہے:-

(۱) کاشی کا میں باسی بہمن نام میرا بنیا
ایک بار ہری نام بسارا، پکڑی جولاہا کنیا
میرے کون تنیگا تانا ——— ؟

(۲) تو باہمن، میں کاشی کا جولاہا - بُوجھو مور گیانا

کبیر داس کی "اُلٹی بانی" مشہور ہے۔ اِس شعر میں "بوجھو مور گیانا" سے صاف ظاہر ہے کہ کبیر داس برہمن تھا۔

علم و تعلیم

بنارس چونکہ شروع ہی سے ایک اہم مذہبی جگہ ہے۔ لہٰذا وہاں فلسفۂ مذاہب پر آئے دن مباحثے ہوا کرتے تھے۔ عام پبلک خاص طور

ن مباحثے سے دلچسپی لیا کرتی تھی۔ کبیر بھی اکثر مجلسوں میں شرکت کیا کرتا تھا۔ اس طرح کبیر کو مختلف خیالات کے لوگوں سے ملنے کا موقع یہی وہ زمانہ تھا، جب کہ سوامی رامانند جی کے علم و فضل کی شہرت کا ڈنکا ہر چہار طرف بج رہا تھا۔ ویشنو دھرم کے متعلق اُن کی م کے ہر چہار طرف چرچے ہو رہے تھے۔

سوامی رامانند جی نہ صرف سنسکرت بلکہ ہندی زبان میں بھی اچھی شاعری کر لیتے تھے۔ کبیر کے دل میں بچپن ہی سے مذہبی س پیدا ہو گیا۔ چونکہ تعلیم و تربیت اچھی طرح نہ ہو سکی تھی، اور اُس کمی کا خود اُنہیں اچھی طرح احساس تھا۔ لہذا اُنہیں اس بات کی تلاش ن کہ کسی کو اپنا اُستاد یا گرو بنائیں۔ کبیر نے انتہائی کوشش کی کہ وہ کسی طرح سوامی رامانند جی تک پہونچیں لیکن ناکام رہے۔ کچھ عرصہ علوم ہوا کہ سوامی رامانند جی ہر رات کو پچھلے پہر "پنچ گنگا" اشنان کے لئے جایا کرتے ہیں۔ ایک روز نصف رات گئے کبیر گھر سے نکلے پنچ گنگا "گھاٹ کی سیڑھی پر چپ چاپ لیٹ رہے۔ سوامی رامانند جی اپنے معینہ وقت پر آئے۔ نہانے کی غرض سو گنگا میں اُترنے لگے تاریک تھی، سامنے کچھ نہ دیکھ سکے۔ کبیر پر پاؤں پڑ گیا۔ وہ چونکے اور فوراً بول اُٹھے ——— بیٹا! رام رام کہہ

کبیر اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی آرزو پیش کی۔ سوامی رامانند جی خوش ہوئے اور کبیر کو اپنی شاگردی میں لے لیا۔ کبیر نے سوامی نند جی سے وشنو دھرم کی تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔ اُنہوں نے حصولِ علم میں بہت زیادہ انہماک و گرم جوشی سے کام لیا، یہاں تک کہ ن نائی بھوآنند اور کبیر یہی تین سوامی رامانند جی کے خاص شاگرد کہلائے۔ جہاں کبیر نے سوامی رامانند جی سے وشنو دھرم کی تعلیم ں کی، وہاں مانک پور کے مشہور صوفی شیخ تقی کی صحبت میں رہ کر اچھی باتیں سیکھیں۔

اس کے علاوہ کبیر نے کافی عرصہ جوگیوں اور فقیروں کی صحبت میں بھی گذارا۔

مذہبی اعتقاد

کبیر مسلمان ہوں یا نہ ہوں، لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں کہ اُن کی پرورش ایک مسلمان جولاہے کے گھر ہوئی۔ اگر ایک طرف و رشیوں کی تعلیمات سے بہرہ ور ہوئے۔ تو دوسری طرف مسلمان صوفیائے کرام کی صحبتوں سے مستفید ہوئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن پر دونوں مذاہب گہرا اثر کیا۔ جب کبھی کوئی بات ہندو یا مسلمان میں سے اپنے خیال کے مطابق قابلِ اعتراض دیکھ پاتے فوراً نکتہ چینی کرتے۔ اس میں شک ں کہ وہ مذہبی احکام میں کسی تبدیلی کے خواہاں نہ تھے۔ اُن کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد سوسائٹی کو بلند کرنا، اور اونچ نیچ لے اور ادنیٰ، ذات اور پات کے امتیاز کو مٹانا تھا۔ وہ تفریق مذہب کے قایل نہ تھے۔ اُن کی نگاہ میں ہندو اور مسلمان ونوں ایک تھے۔ اُن کی عقیدت مندانہ نگاہ رام اور رحیم دونوں پر پڑتی تھی۔ اُن کا قول تھا کہ جس شخص میں صفائی قلب، خدا پر ایمان بندگانِ خدا کی خدمت کا جذبہ ہوگا وہی مقبول بارگاہ خداوندی ہے۔ وہ کہتے خدا ایک ہے۔ تمام انسان ایک ہی آدم کی اولاد ہیں۔ بھید بھی لاف لغو اور فضول ہے۔ ان کے کلام سے اس بات کا اچھی طرح پتہ چلتا ہے کہ اُن کے عہد کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں مذہبی اعتقاد اختلاف کی بنا پر بڑی کشمکش جاری تھی چنانچہ انہوں نے اس باہمی کشمکش کے دُور کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ نظمیں لکھتے اور ان ہندوں اور مسلمانوں کی اچھی طرح خبر لیتے۔ مثال کے طور پر ان کے کلام کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں۔ ہندو لوگ نکتہ چینی کرتے

ہوئے لکھتے ہیں :

ایک جنم کے کارنے ، کت پوجو دیو سہیو رے -
کا ہن پوجو راج جی ، جاکے بھکت مہو رے -

پتھر پوجیں ہری ملیں ، تو میں پوجوں پہار　　چکی کیوں نہیں پوجی ، جاکو پسیا کھائے سنسار

مسلمانوں پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

کنکر پتھر جوڑکے مسجد دئے چنائے　　تا چڑھی ملا بانگ دے ، بہرا ہوا خدا ئے

پھر ایک جگہ دونوں قوموں سے یوں مخاطب ہوتے ہیں :-

دوئی جگدیش کہاں تے آئے ، کہوں کونے بھرمایا　　اللہ رام کریما کیشو ، ہری حضرت نام دھرایا -
گہنا ایک کنکتے گہنا تا میں بھاؤ نہ دوجا　　کہن سنن کو ئی دوئی کرتھاپے ، ایک نماز ایک پوجا -

دوسری مثال ملاحظہ ہو :

کہیں کبیر ایک نام ہی جپو رے ہندو ترک نہ کوئی　　ہندو ترک کا کرتا ، ایکے تاگتی لکھن جائے

تیسری مثال ملاحظہ ہو :

ارے ان دو اُن راہ نہ پائی -

ہندو اپنی کرے بڑائی ، گاگر چھوآن نہ دے آئی　　دیشیا کے پائیں تر سووے ، یہ دیکھو ہندوائی ،
مسلمان کے پیر اولیا مُرغی مُرغا کھائی　　کھالہ کی رے بیٹی بیاہیں گھر میں کرے سگائی ،
باہر سے ایک مردہ لائے دھودھلاے چڑھ دائی　　سب سکھیا ملی جیوں بیٹھیں گھر بھر کرے بڑائی ،
ہندو کی ہندوائی دیکھی ، ترکن کی ترکائی ،　　کہیں کبیر سنو بھائی سادھو کون راہ ہو جائی ،

کبیر کی زندگی کا سب سے بڑا اہم نکتہ یہ ہے کہ وہ چونکہ پست اقوام کی بڑے زوروں پر حمایت کرتے تھے ، لہٰذا ان کے پیرو کافی تعداد میں ہو گئے - اُن کی شہرت ہر چہار طرف پھیل گئی - اُن کی تقریر سُننے کے لئے ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے لوگ جوق در جوق آتے اور تھوڑے ہی عرصہ میں شمال سے لیکر جنوب تک یعنی ــــــ پنجاب ، بہار ، مدراس ، سی پی میں ان کے مریدان کی کثیر تعداد ہو گئی - ان کی تقریر ہر مزاج اور ہر قماش کے لئے یکساں اثر رکھتی تھی - تعجب ہوتا ہے ، یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے لئے سفر کرنا ایک بہت ہی مشکل کام تھا - لوگ کس طرح دشوار گذار سفر کے مراحل طے کرتے تھے - اس سے صاف ظاہر ہے کبیر اس زمانہ کے لوگوں کے لئے مصلح قوم اور پیغمبر سے کسی طرح کم نہ تھے - وہ جب تک زندہ رہے اُن کا واحد مقصد سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ اُونچ نیچ کے تفرقہ کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے - ان کی نگاہ میں قابل ستائش وہی انسان تھا جس کے افعال اچھے ہوں - خواہ وہ بھنگی یا چمار ہی کیوں نہ ہو - افسوس ہے کہ کبیر داس کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی - ان کے

بعد ہی سورداس اور تلسی داس کا دور آتا ہے۔ ان دونوں نے کبیر داس کی تعلیم و تبلیغ کو بڑا دھکا لگایا۔ سورداس اور تلسی داس کا خیال تھا کہ سوسائٹی کے نظام کو برقرار رکھنے کے لئے اونچ نیچ کا وجود ازحد ضروری ہے۔ تلسی داس نے نہ صرف اچھوت (شودر) ہی کو بلکہ عورتوں کو بھی حقیر نگاہ سے دیکھا اور انہیں ہمیشہ ذلیل سمجھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:-

ڈھول، گنوار، پشو، ناری، شو   یہ سب تاڑنے کے ادھیکاری

کبیر داس کا جو بھی مذہب ہو، لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ وہ اپنے اعتقاد کا پختہ تھا۔ عوام کی طرح اس میں توہم پرستی نہ تھی۔ چنانچہ اس عقیدہ کے مطابق کہ جو ہندو کاشی میں مرتا ہے اس کے سارے گناہ دھل جاتے ہیں اور وہ سیدھا بیکنٹھ (بہشت) میں جاتا ہے اس کے برعکس اگر کوئی بدنصیب مگھر میں مرا تو اس کے سارے تقویٰ پر پانی پھر جاتا ہے۔ گویا کبیر داس حد درجہ بدنصیب تھے کہ اُن کی موت مگھر میں واقع ہوئی۔ لیکن کبیر داس ضعیف الاعتقاد نہ تھے۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب کبیر داس کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں کہاں مروں گا۔ مگھر کے متعلق لکھتے ہیں:——

"جو کبیر آکاسی مرے، رامہیں کون نہور"

یہ حقیقت ہے کہ وہ مگھر کو وقعت کی نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ چنانچہ جیسا کہ مشہور ہے مرنے سے کچھ پہلے کاشی چھوڑ مگھر میں آ بسے

کبیر داس نہ صرف ایک باکمال بزرگ تھے۔ بلکہ شاعری میں بھی انہیں بڑا کمال حاصل تھا۔ وہ شاعری میں پوربی ٹھیٹھ دیہاتی، بناری اور اودھی زبان استعمال کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ کبیر داس کی تعلیم کوئی اچھی نہ ہوئی تھی۔ پھر بھی شاعری میں بڑا زور دکھایا۔ ہاں ان کے کلام میں فنِ شاعری کی اکثر خامیاں رہ گئی ہیں۔ لیکن اس بات کی برابر کوشش رہی کہ زبان صاف ہو۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں

"ہمن ہے عشق مستانہ، ہمن دنیا سے کیا مطلب؟"

معشوقِ حقیقی یعنی خدا ——— (پرماتما) کو اپنے اشعار میں جابجا گرو، ستگرو، سائیں، صاحب اور پیر جیسے الفاظ سے مخاطب کیا ہے۔ عشق حقیقی کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں:——

لالی میرے لال کی، جت دیکھوں تت لال   لالی دیکھن میں گئی، میں بھی ہو گئی لال

دوسری جگہ لکھتے ہیں:——

پریتم کو پتیاں لکھوں، جو کہوں ہوئے بدیس   تن میں، من میں، نین میں، تاکو کہاں سندیس

معشوق کے فراق میں اپنی بیقراری کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں:-

تلپھے بن بالم مور جیا ———
دن ناہیں چین، رات نہیں نندیا، تلپھ تلپھ کے بھور کیا
تن من مور رہنت آس ڈولے، سونہ سیج پر جنم چھپیا
نین تھکت بھے، پنتھ نہ سوجھے، سائیں بیدردی سدھ نہ لیا
کہت کبیر سنو بھائی سادھو ہرو پیر دکھ جور کیا

دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

یہی تن کا دِو لا کروں باتی میلوں جیو، لوہو سیچوں تیل جیوں، کب مکھ دیکھوں پیو

تیسری جگہ لکھتے ہیں :۔

بالم آؤ ہمارے گیہرے، تم بن دکھیا دیہہ رے
سب کوئی کہے تمہاری ناری موکو یہ سندیہہ رے
ایک مک ہو سیج نہ سوے تب لگ کیسا نیہہ رے
انن نہ بھاوے، نیند نہ آوے، گرہ بن دھرے نہ دھیر رے
جیوں کامی کو کامنی پیاری جیوں پیاسے کو نیر رے
ہے کوئی ایسا پر آپکاری پیہہ سے کہے سنائی رے
اب تو بے حال کبیر بھئے ہیں بن دیکھے جیو جائے رے

کبیر داس نے اپنے اشعار میں کہیں کہیں تعلّی کی بھی لی ہے۔ مثلاً

سو چادر سُر نر منی اوڑھی، اوڑھی کے میلی کین چدریا
داس کبیر جتن سے اوڑھی جیوں کی تیوں دھر دیں چدریا

پھر ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

تو باہمن میں کاسی کا جُلاہا۔
بوجھو مور گیانا۔

کہیں کبیر داس نے حد درجہ انکساری سے کام لیا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں :۔

(۱)
بُرا جو دیکھن میں چلا، بُرا نہ ملیا کوئے
جو دل کھوجوں اپنا، مجھسا بُرا نہ ہوئے

(۲)
کیا مکھ لے بنتی کروں لاج آوت ہے موہیں
تم دیکھت اوگن کروں کیسے بھاوُوں توہیں

(۳)
اوگن میرے باپ جی! بخش غریب نواز
جو میں پوت کپوت رہوں، تو بتا کو لاج،

کبیر داس نے ایسے بھی اشعار کہے ہیں جن سے دھوکہ ہوتا ہے کہ وہ انگریزی بھی جانتے تھے۔ مثال کے طور پر شعر ملاحظہ ہو :۔
مرنا ہے تو مر جائے چھُٹی پڑے جنجال ایسا مرنا کو مرے دن میں سو سو بار

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ گویا کبیر نے شیکسپیر کے مشہور شعر کا لفظی ترجمہ کیا ہے -

COWARDS DIE MANY TIMES BEFORE THEIR DEATH .
VALIANT NEVER TASTE DEATH BUT ONCE .

کبیر داس نہ صرف ہندوؤں میں مشہور رہیں ، بلکہ مسلمانوں میں بھی بڑی وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں - اُن کے اکثر اشعار نہ صرف ہندی جاننے والوں ، بلکہ اُردو داں طبقہ میں بھی بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں اور بسا اوقات موقع کیساتھ احباب کی باہمی گفتگو میں بطور تمثیل پیش کئے جاتے ہیں -

اشعار کے علاوہ اُن کے اکثر مقولے اُردو ادب میں بہت زیادہ مروّج ہیں ، مثلاً :-

" کیسا کعبہ ، کیسا کیلاش ، نیچی بیری سب کو جھورے "

" سادھو ایسا ہو جیئے ، جیسا کچھ نہ ہوئے "

رنگی کو نارنگی کہیں ، کہیں دُودھ کو کھویا چلتی کو گاڑی کہیں ، یہی کبیر ارویا

کبیر داس نے .... طویل عمر پائی - انہوں نے اپنی زندگی میں عجیب عجیب انقلابات دیکھے مثلاً جب وہ (۱۳) سال کے تھے تو پانی پت کی لڑائی میں دہلی کے سلطان ابراہیم لودی نے شکست کھائی - اور وہیں اُس کی موت ہوئی - اُس کے بعد بابر ہندوستان کا بادشاہ بنا - اُن کے زمانہ میں ابراہیم لودی ، بابر ، ہمایوں ، شیر شاہ ، اسمٰعیل شاہ محمد عادل شاہ - پھر ہمایوں اور اُس کے بعد اکبر اور اکبر کے بعد جہانگیر یکے بعد دیگرے سریر آرائے سلطنت ہوئے -

---

افسانۂ محاضرہ

سوزِ ناتمام

(ایک سچا واقعہ افسانے کے رنگ میں)

از جناب رحمت علی صاحب ماہ نور محلوی

جیسے ہی میں اُن کے مکان میں قدم رکھتا۔ تو سامنے سے کملا کی ترنم ریز آواز یہ کہتی ہوئی سُنائی دیتی۔

"لیجیئے! ہرکارہ میری ہفتے کی ڈاک لیکر آگیا!" میں یہ سُنتے ہی ہنسنے لگتا۔ وہ پھر شوخی سے مجھے متبسم نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہتی :۔

"کیوں! لائے کوئی رسالہ!!"

اُس کا متبسم چہرہ اور مستی سے بھری معصوم آنکھیں مجھے بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ میں نہ سیر ہونے والی نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے ہنسکر بغل سے کوئی نہ کوئی رسالہ نکال کر اُس کے ہاتھوں میں دے دیتا۔ وہ خوشی کے مارے ناچنے لگتی اور دہیں کھڑے کھڑے ورق گردانی کرتے ہوئے کہتی :۔

"بڑے اچھے ہیں آپ تو ہرکارہ جی!"

"میں بھی ہنسکر جواب دیتا۔" آپ بھی بہت اچھی ہیں دیوی جی!!"

وہ زور سے قہقہہ لگاتی اور پھر بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں جاکر آرام کرسی پر لیٹ جاتی۔ اور گنگناتے ہوئے رسالہ دیکھنے لگتی۔ اور میں بھی پاس ہی پڑی ہوئی، دوسری کرسی پر بیٹھکر اُس کی کتاب حُسنِ کا مطالعہ شروع کردیتا۔

وہ یکایک تمام رسالے کی ورق گردانی کے بعد تاسف بھرے لہجے میں کہتی۔ "اس میں تو کوئی بھی مضمون آپ کا نہیں!"

میں صورتِ انکار سر ہلادیتا۔

"تو آپ "پریم ویکلی" کب لائیں گے؟ جس کی ہر اشاعت میں آپ کا کوئی نہ کوئی افسانہ یا نظم شایع ہوتی ہے۔!!"

"وہ تو ابھی آیا نہیں ...... جیسے ہی آئیگا۔ آپ کی خدمت میں پیش کردیا جائے گا۔"

وہ بیدلی سے کوئی اچھی سی نظم نکال کر گنگنانے لگتی۔

کملا اور میں بچپن سے ہی ایک ساتھ کھیلے تھے۔ میرے اور اُس کے ماں باپ میں بہت میل جول تھا۔ جس کی وجہ سے ہم بے روک ٹوک ایک دوسرے کے یہاں آتے جاتے تھے۔ میں ہائی اسکول کی دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اور کملا گرلز اسکول کی آٹھویں میں مجھے شروع ہی سے چھوٹی چھوٹی نظمیں اور اصلاحی افسانے لکھنے کا شوق تھا۔ جس کی وجہ سے میرے پاس متعدد ماہوار اور ہفتہ وار ادبی رسالے آتے تھے۔ چونکہ کملا کو بھی ادبی شوق تھا۔ اور خاصکر وہ میرے مضامین کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ اسلئے جیسے ہی کوئی رسالہ ملتا۔ میں اپنی پہلی فرصت میں لئے ہوئے اُس کے یہاں پہنچ جاتا۔ "پریم ویکلی" ایک بلند پایہ ادبی رسالہ تھا۔ جس میں ہر ہفتے میرا کوئی نہ کوئی مضمون شایع ہوا کرتا تھا۔ مگر کچھ دنوں سے وہ بھی اچھے رسالوں کی طرح متواتر دیر کرکے پہنچتا تھا۔ جس کی وجہ سے ہمیشہ کملا سے بہانہ کرنے پر مجبور ہوجاتا تھا۔ اور وہ جب نہ تب اُسی کے بارے میں دریافت کرتی رہتی۔

یوں تو میں کملا کو شروع ہی سے چاہتا تھا۔ اور ہفتہ میں ایک

دو بار اُس کے یہاں جانا میرا معمول تھا۔ مگر ہماری اس معصوم محبت نے ایک دن نئی کروٹ لی۔ ستمبر کے ابتدائی دن تھے۔ موسم خوشگوار تھا میں اور کملا حسبِ معمول اُس کے مکان کی دوسری منزل میں بیٹھے ہوئے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔ آسمان پر فاختئی رنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ یکایک میں اس دلفریب منظر سے لطف اندوز ہونے کی نیت سے کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اور تھوڑی دیر میں کملا بھی کرسی سے اُٹھ کر میری بغل میں آکھڑی ہوئی۔ کھڑکی میں سے حدِ نگاہ تک پھیلی ہوئی ہریاول اور درختوں کے گھنے گھنے جھنڈ بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ کچے پکے مکانات سے دھواں اُٹھ کر شام کے کھانے کی تیاری کا ثبوت دے رہا تھا۔ آسمان پر کسی مدہوش شرابی کی طرح بادل پورب سے پچھم دوشِ ہوا پر لڑکھڑاتے ہوئے جا رہے تھے۔ اور کبھی کبھی پردۂ سحاب سے بجلی چمک کر آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دیتی تھی۔ یکایک کہیں نزدیک ہی بڑے زور سے بادل گرجا۔ اور کملا چیخ مار کر مجھ سے لپٹ گئی۔ اُسکے جسم کے لمس سے میرے تمام بدن میں ایک برقی لہر سی دوڑ گئی۔ اُس کا ننھا سا دِل بڑے زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اور وہ کانپ رہی تھی اور چہرے کا رنگ فق تھا۔ میں نے محبت بھری نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس نے ایک شرمگین تبسم کے ساتھ کمال آسودگی سے اپنا خوبصورت سر میرے سینے سے لگا دیا۔ اور مسحور نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ مجھ پر ایک کیفیت سی طاری ہو گئی۔......

...... معلوم نہیں میں کب تک اُسے اپنی تنگ آغوش میں بھینچے کھڑا رہا۔ یکایک میری محویت ٹوٹی۔ اور میں نے بمشکل اپنے جذبات پر قبضہ حاصل کرتے ہوئے کہا "کملا ......"

"کیلاش بابو!!" اُس نے کانپتے ہوئے لبوں سے کہا۔ اور میری گردن میں باہیں حمائل کر دیں۔ اور دلفریب انداز سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔...... نگاہوں سے نگاہیں ملیں میں نے اُس کی مست نشیلی آنکھوں میں معصوم محبت کی ننھی ننھی پریوں کو تیرتے ہوئے دیکھا۔ کسی نامعلوم احساس کے ماتحت اُس کے رخساروں پر سُرخی پھیلتی جا رہی تھی اور لب پھڑک رہے تھے .... میری آنکھوں نے وہ سب کچھ کہہ دیا جو شاید میں زبان سے ادا نہ کر سکتا...... اور دوسرے لمحے میں میں نے اپنی بے پایاں محبت کی مہر بھی اُس کے یاقوتی لبوں پر ثبت کر دی .... اس کے بعد کھڑے کھڑے ہم نے ایک دوسرے سے وفا کے نہ ٹوٹنے والے وعدے کر لیے اور شادی کی بات بھی پختہ کر لی۔...... اس دن کی میری خوشیوں کا کوئی کس طرح اندازہ کر سکتا ہے۔

اسی طرح دن پر دن گذرتے گئے اور کسی نہ کسی طرح ہماری محبت کی اطلاع میرے ماں باپ کو بھی ہو گئی اور وہ بھی میرے انتخاب پر بہت خوش ہوئے۔ مگر تکمیل تعلیم سے پہلے کملا کی شادی انہیں کسی طرح منظور نہ تھی۔ اس لئے صلاح مشورے کے بعد مجھے اعلیٰ تعلیم کی غرض سے "پٹنہ انجینیرنگ کالج" میں داخل کرا دیا۔ میں جانے کو تو پٹنہ چلا گیا۔ مگر میرا دل اور میرے خیالات ہمہ کملا اور اُس کے گاؤں ہی میں لگے رہتے۔ جہاں پر میری جدائی میں کملا رات دن گذارنے پر مجبور تھی۔ اس مہجوری کی سختیوں کو ہم نے خط و کتابت کے ذریعہ کم کرنا چاہا۔ اسلئے جب تک مہینے میں اُسکے تین چار خط نہ آتے مجھے چین نہ پڑتا۔ میرے پتا ہمیشہ نوکری کے سلسلے میں باہر دورے پر رہتے تھے۔ اسلئے میری ماتا بھی کملا سے خط لکھواتی۔ اور وہ اُس خط میں بھی اپنی خیرت سے مجھے آگاہ کرتی رہتی۔ میں "انجینیرنگ کالج" میں داخل ہونے کے بعد "پریم وِیکلی" میں

ننھے افسانے اور نظمیں لکھتا رہتا۔ اور رسالہ ملتے ہی کملا کو پاس بھیجدیتا۔ اور وہ مضمون کے مطالعے کے بعد میری قادر الکلامی، سلاست بیانی اور روانی کی داد خط کے ذریعہ دیتی۔ اور میں خوشی کے مارے پھولا نہ سماتا۔

دو سال گذر گئے۔ میرے کورس کا ابھی ایک سال باقی تھا اس دو سال کے عرصہ میں میں بارہا چھٹیوں میں گھر گیا۔ کملا سے ملاقات ہوئی۔ وہ بڑی بے صبری سے میری تکمیل تعلیم کے انتظار میں تھی اور میری کامیابی کے لئے دست بدعا تھی۔ اس کی محبت اور میری ذات سے وارفتگی روز بروز ترقی پذیر تھی۔

ایک دن .... ہاں بہت دنوں کی طویل خاموشی کے بعد مجھے کملا کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک چٹھی ملی، تحریر سے ظاہر تھا کہ بڑی جلدی میں لکھی گئی ہے۔ لکھا تھا

"پیارے کیلاش بابو!

یہاں حالات کچھ اس طرح کے ہو گئے ہیں کہ میرا یہاں زیادہ دن تک ٹھیرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ اس لئے میں جمعہ کے روز مورخہ ۱۲ جولائی کو پٹنہ پہنچ رہی ہوں۔ قیام کا انتظام کر رکھئے گا۔ آپکی کملا"

میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس خط کو بار بار پڑھا مگر کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا۔ پھر کھولا۔ پڑھا۔ کملا کی تحریر کو مطلب پہنانے میں میں پھر بھی ناکام رہا۔ البتہ اس کی آمد کی خبر سنکر میرے دل میں بہت خوشی ہوا۔ اور ساتھ ہی ساتھ خوف و پریشانی سے بھی سینے میں دل ڈوبنے لگتا...... میں نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے باقر گنج میں ایک مکان کا بندوبست کر لیا۔ اور جمعہ کی صبح کو چھ ہی بجے اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ مگر وہاں پہونچتے ہی میرے اوسان خطا ہو گئے۔ جب یہ سنا کہ ۱۵ ڈاؤن ہوڑہ ایکسپریس بہٹہ اسٹیشن کے قریب لائن سے نیچے گر کر چکنا چور ہو گئی۔ اس وقت کوئی گاڑی "بہٹہ" جانیوالی نہ تھی۔ میں نے اپنی پہلی فرصت میں ایک موٹر کرایہ پر کی اور جائے وقوعہ کے لئے روانہ ہو گیا۔ بارش کی وجہ سے راستہ خراب ہو چکا تھا، اس لئے بڑی مشکل کے بعد گیارہ بجے کے قریب "بہٹہ" پہنچا۔ لاوارث لاشوں اور مجروحین کو لیجانے کے لئے بہت سی ریلیف ٹرینیں اور ایمبولنس کاریں وہاں موجود تھیں، اور بہت سی لاشیں میرے پہنچنے سے قبل ہی "آرہ ڈسپنسری" اور "پٹنہ جنرل ہسپتال" میں پہنچائی جا چکی تھیں مختلف اداروں کے والنٹیر بھی موقعہ واردات پر موجود تھے۔ اور مجروحین کو ہر ممکن امداد پہنچانے کے لئے مستعد تھے۔ یہ المناک منظر اور انسانی لاشوں کی یہ کسمپرسی دیکھ کر میرا دل بیٹھ گیا۔ اور میں نے سمجھ لیا کہ شاید انہی بے ڈھنگی موت مرنیوالوں میں میری کملا بھی ہوگی۔ تاہم میں نے کملا کی تلاش میں دو تین چکر مجروحین کے ادرگرد لگائے۔ وہاں سے مایوس ہو کر آرہ ڈسپنسری میں پہونچا وہاں بھی کملا نظر نہ آئی۔ میں پٹنہ جانے کے بدلے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا جو کہ وہاں سے نزدیک ہی تھا۔ تین چار گھنٹہ کی مسافت کے بعد جب میں کملا کے مکان پر پہنچا تو وہاں ایک سپاہی موجود تھا۔ میں اسے وہاں موجود دیکھکر حیران رہ گیا۔ رفع استعجاب کی غرض سے میں نے اس سے چند سوال کئے۔ اس نے بھی چند باتیں مجھ سے پوچھیں۔ اور اس کے بعد وہ خالص سپاہیانہ لہجے میں بولا۔ "آپ کو میں حراست میں لیتا ہوں۔" میں نے گھبرا کر حراست کی وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگا۔ "کملا کے باپ نے تھانے میں رپٹ لکھوائی ہے۔ کہ آپ نے اس کی لڑکی کا اغوا کر لیا ہے۔" میں نے صدائے احتجاج بلند کی، اپنی بیگناہی کے بارے میں لاکھ کہا اور بتایا کہ میں تو خود اسی کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔ اتنے میں دو سپاہی اور پہنچ گئے اور مجھے مجرم سمجھ کر تھانے لے گئے۔ میرا بیان قلم بند کیا گیا اور مجھے حوالات میں بند کر دیا گیا۔

میرے پٹنہ جانے کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد کملا کے پتا نے

اُس کی منگنی بنارس کے کسی کھاتے پیتے گھرانے میں کر دی تھی مگر کملا کو یہ رشتہ منظور نہ تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ جس سے میں نے ایک دفعہ وفا کا وعدہ کیا ہے۔ اُسی سے میرا بیاہ ہو۔ جس دن مجھے اُس کے گھر کے پاس گرفتار کیا گیا۔ اُس سے ایک دن پہلے بنارس سے کملا کی برات آئی ہوئی تھی۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ کیوں میرے پاس پٹنہ آنے کے لئے آناً فاناً تیار ہو گئی تھی۔

مجھے حوالات میں بند ہوئے پانچ روز ہوئے تھے کہ ایک اخبار میں یہ خبر چھپی "پٹنہ انجینرنگ کالج کے پاس ایک نوجوان اور حسین لڑکی مردہ پائی گئی۔ جس کے جسم پر بہت سے زخموں کے نشانات تھے۔ اور جا بجا پٹیاں بندھی ہوئی تھیں، شاید وہ بھی "حادثۂ بہٹہ" کے وقت گاڑی میں سوار تھی۔ اور وہیں سے اُسے بھی مجروحین کے ساتھ پٹنہ ہسپتال میں لایا گیا تھا۔ جہاں سے بعد میں وہ ڈاکٹروں کی آنکھ بچا کر نکل بھاگی۔ اور آخر کار مر کر کالج ہوسٹل کے سامنے گر پڑی۔"

اسٹاپ پریس کی خبروں میں درج تھا "اُس کے بلوز کی جیب سے ایک خط برآمد ہوا ہے جو کیلاش بابو انجینرنگ کالج کے کسی سٹوڈنٹ کے نام تھا، جس کا مضمون ہم کل شائع کریں گے۔"

دوسرے دن اُس خط کی نقل شائع ہوئی جو یہ تھی:-

"پیارے کیلاش بابو!

میں برسوں سے آپ کی تلاش میں تھی اور اسی غرض سے میں نے آنے سے قبل ایک خط بھی آپکو لکھ دیا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ آپ حسب توقع آخری دم تک نہ پہنچے ...... گھر سے یہ سوچکر روانہ ہوئی تھی کہ یہاں سے نکلتے ہی میں بیاہ کی مصیبت سے چھوٹ جاؤنگی۔ مگر تقدیر نے مجھے ایک آفت سے نکال کر دوسری میں پھنسا دیا۔ کیونکہ میں جس گاڑی میں سوار تھی وہ راستے میں ہی پٹری سے اُتر گئی۔ میرے سر میں بڑے زور کی چوٹ آئی۔ پھر معلوم نہیں کہ کیا ہوا۔ اور کس طرح مجھے پٹنہ لایا گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں بہت سے مجروحین کے ساتھ ہسپتال میں تھی۔ میرے زخموں کی بھی مرہم پٹی کی گئی۔ میں نے نرس سے پوچھا کہ "یہاں سے انجینرنگ کالج کتنی دور ہے؟" وہ کہنے لگی "نزدیک ہی ہے"۔ میں نے اُس سے اور باتیں کرنا چاہیں۔ مگر اُس نے ملنے جلنے اور بات چیت کرنے سے بالکل منع کر دیا۔ کیونکہ میرے سر میں سخت چوٹ آئی تھی، اور بہت سا خون بہ جانیکی وجہ سے میں نحیف و کمزور ہو گئی تھی۔ اور دو تین دن مجھے ...... بالکل ہوش نہ رہا۔ ایک دن نرس سے میں نے بڑی لجاجت سے کاغذ قلم دوات مانگا۔ بہت سی پس و پیش کے بعد اُس نے ایک فاؤنٹین پن اور کاغذ لا دیا۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے آپ کو ایک خط لکھا جس میں میں نے اپنی موجودگی کا ذکر کر کے آپکو بلا بھیجا تھا۔ خط ختم ہی کیا تھا کہ پھر نرس کوئی دوا لیکر پہنچ گئی۔ میں نے اُس سے پھر درخواست کی کہ اسے انجینرنگ کالج میں پہنچا دیا جائے۔ وہ میرے پاس ہی کھڑی لکھے ہوئے پتے کو پڑھنے لگی۔ یکایک میرے دل میں یہ خیال آیا کہ جب کالج نزدیک ہی ہے تو کیوں نہ میں خود ہی وہاں چلی جاؤں۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے نرس سے خط واپس لیکر پھاڑ دیا۔ اور نیا کاغذ مانگا۔ جب وہ لا کر دے گئی تو میں نے یہ خط لکھنا شروع کیا۔ مگر ختم کرنے سے قبل ہی نقاہت و کمزوری نے مجھے آدبایا۔ اور میں بیہوش ہو کر بستر پر گر گئی۔

جب میری آنکھ کھلی تو شام ہو چکی تھی۔ ہر طرف زخمیوں کی چیخ و پکار سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ڈاکٹر اور نرسیں بڑی مستعدی سے اُن کی دیکھ بھال میں مصروف تھے۔ اور ہر ممکن طریقہ سے اُنہیں خاموش رہنے کی ہدایت کر رہے تھے۔ میں نے یہ موقع غنیمت جان کر نکل جانے کا ارادہ کر لیا ——— فاؤنٹین پن اور نامکمل خط میں پہلے ہی جیب میں رکھ چکی تھی۔ اور آہستہ آہستہ اُن کی نظروں سے بچتی بچاتی

باہر نکل کر میں سڑک پر آگئی چار روز سے چارپائی پر پڑے رہنے کی وجہ سے تکان سی محسوس ہو رہی تھی اور کمزوری کی وجہ سے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے اور سر چکرا رہا تھا۔ مگر میں نے ہمت باندھی۔ اور پوچھتے پوچھتے ہوسٹل کے سامنے پہنچ گئی۔ پھاٹک بند تھا۔ میں نے دو تین آوازیں دیں۔ بڑی دیر کے بعد چوکیدار باہر نکلا اور میرے پوچھنے پر وہ کہنے لگا۔

"کیلاش بابو تو آج تین روز سے لاپتہ ہیں۔"

"کب آئیں گے؟" میں نے پھر سوال کیا۔

"یہ بھی معلوم نہیں۔" یہ غیر متوقع جواب سُنکر میرا دل سینے میں ڈوبنے لگا۔ آنکھوں سے بے اختیارانہ آنسو ٹپک پڑے۔ میں گرتے پڑتے سڑک پر آگئی۔ چوکیدار اُسی طرح حیرت بھری نگاہوں سے کھڑا میری طرف دیکھتا رہا۔ اب مجھ میں چلنے کی بالکل سکت نہ تھی۔ ہمت ٹوٹ گئی تھی۔ اسلئے میں ایک بتی کے کھمبے کا سہارا لیکر بیٹھ گئی اور تصور میں تم سے باتیں کرنے لگی۔

"کیلاش بابو! کیا آپکو اب مجھ سے پیار نہیں رہا؟ کیا آپ اپنے وعدوں کو بھول گئے۔ اور میرا خط ملتے ہی یہاں سے کس طرف بھاگ گئے۔ شاید اپنی بدنامی اور رسوائی کا خوف ہو۔ خیر مجھے آپ سے گلہ نہیں۔ میں تو محض اپنے دیے ہوئے قول اور کیے ہوئے وعدے کو نبھانے کی غرض سے آئی تھی۔ یاد ہے میرا وہ قول اور میرا وعدہ"...... کیلاش میں تمہاری ہوں اور تمہاری ہی رہونگی...... اگر اس میں کسی نے رخنہ اندازی کی تو جان دیدونگی۔ مگر دوسرے کی ہونا گوارا نہ کروں گی۔ مگر قسمت نے مجھے اس کا موقعہ نہ دیا۔ اور آپ میرے پہنچنے سے قبل ہی کہیں جا چکے تھے...... مجھ پر پھر بیہوشی کا دورہ طاری ہو رہا ہے۔ آسمان و زمین گھومتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں......

آخری دم تک آنکھوں کو آپکے آنے کا انتظار ہے اور درشن کی غرض سے کھلی ہوئی ہیں...... اے کاش آپ ایسے موقعہ پر پہنچ جائیں اور میں خوشی سے آپکے زانو پر سر رکھے ہوئے جان دیدوں...... مگر یہ آس پوری ہوتی نظر نہیں آتی اور شاید ہی میں دوبارہ اس بیہوشی سے بیدار ہو سکوں...... مجھے بھولنے کی کوشش کیجئے گا۔ اور زیادہ افسوس نہ کیجئے گا۔ بلکہ سمجھ لیجئے گا کہ ایک ادنیٰ سی داسی تھی جس نے آپکی جدائی میں تڑپ تڑپ کر جان دیدی...... میرا ارمان بھرا...... آخری سلام لیجئے۔ اب انگلیوں میں قلم تھامنے کی بھی طاقت نہیں رہی...... اچھا رخصت...... آپکی منتظر کملا"

یہ پڑھتے ہی مجھ پر جنون کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور میں بے اختیار رو رو کر بین کرنے لگا۔ "ہائے بھگوان تُونے مجھ بدنصیب کے ساتھ یہ کیا ظلم کیا اور تیری رحمت نے ایک غریب محبت کی ماری ہوئی لڑکی کو مجھ سے جدا کر کے اس طرح تڑپا تڑپا کے مارنا کس طرح گوارا کیا...... میں روتا تھا اور چلاتا تھا اور رنج و غم کے مارے کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ پولیس کا کنسٹیبل مجھے دھمکا کر اور پھر محبت سے خاموش رہنے کی تلقین کر رہے تھے۔ مگر میرے دل میں جو آگ لگی ہوئی تھی وہ مجھے خاموش نہ ہونے دیتی تھی......

اس خبر کے ملتے ہی کملا کے پتا پٹنہ روانہ ہو گئے۔ اور دوسرے دن لاش لیکر واپس آ گئے۔ مگر مجھ بدنصیب کو اُس کا آخری دفعہ منہ دیکھنے کی بھی اجازت نہ ملی۔

دس بارہ روز کے بعد مجھے بیگناہ سمجھ کر حوالات سے رہا کر دیا گیا اور میں کسی کو منہ دکھائے بغیر ہی گاڑی پر سوار ہو کے پٹنہ روانہ ہو گیا وہاں پہونچکر معلوم ہوا کہ پندرہ دن کی متواتر غیر حاضری کے بعد میرا نام کالج سے خارج کر دیا گیا ہے۔ اور پھر نئے سرے سے فیس داخل کر کے درج کرا جائیگا۔ میں نے یہ سُنکر سر پیٹ لیا اور روتے ہوئے کہنے لگا۔ "کاش جمعہ کے روز یہاں ہی ہوتا۔ نہ تو میرا نام ہی خارج ہوتا اور نہ میری چھوڑی ترستی ہوئی کملا تڑپ تڑپ کر جان دیتی......" مگر ان میں ایک بھی بات میرے بس کی نہ تھی۔ اور عمر بھر کے لئے کملا کی سوگ کا روگ میری جان کو لگ گیا۔

شکسپئیر کی شہرۂ آفاق تمثیل "AS YOU LIKE IT" کا ترجمہ

"مَن کی چاہ"

از جناب سعید الحق صاحب سنوی بی۔ اے (آنرز)

افراد مجالس

(Duke) جو جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔

(Frederick) اس کا بھائی اور اسکی مملکت کا غاصب

(Amiens) } وہ امرا جو جلاوطنی میں رہتے والے
(Jaques) } ڈیوک کے ہمجلیس ہیں۔

(Le Beau) فریڈرک کا ایک درباری

(Charles) پہلوان

(Oliver) }
(Jaques) } سر رولینڈ ڈی بوائز Sir-Roland De Boys کے لڑکے
(orlando) }

(Adam) } اولیور کے خدمتگار
(Dennis) }

ٹچسٹون (Touch stone) ایک مسخرہ۔

سر اولیور مارٹکسٹ[1] Sir oliver Martext ایک پادری

کورن (Corin) } چرواہے
سلویس (Silvius) }

ولیم William ایک دہقانی جو اوڈری Audrey پر عاشق ہے

ایک شخص جو بیاہ کے دیوتا کی شکل میں آتا ہے[2]

روزلینڈ Rosalind جلاوطنی میں رہنے والے ڈیوک کی لڑکی۔

سیلیا (Celia) فریڈرک کی لڑکی۔

فی بی (Phebe) ایک چرواہن۔

اوڈری (Audrey) ایک دہقانی

امرا، نوکر، جنگلوں میں رہنے والے اور ہمجلیس

محاذ:۔ اولیور کا باغ جو اسکے مکان کے پاس واقع ہے۔ اس کے بعد غاصب کے دربار میں اور آرڈن (Auden) کے جنگل میں۔

جزو اوّل

یعنی قلمرو کا حکمران امیر الامرا [1] Martext کے لغوی معنی (مقدس) کتاب میں تحریف کرنے والے کے ہیں۔ یعنی وہ شخص جو صحیفہ میں ردوبدل کرتا ہے [2] ہائمن Hymen

پہلا منظر

اولیور کے مکان کے پاس کا باغ

(اورلینڈو اور ایڈم داخل ہوتے ہیں)

اورلینڈو - ایڈم مجھکو یاد ہے کہ وصیت نامہ کے رو سے میرے ورثہ کا حصہ ایک ہزار کرؤن[1] ہوتا ہے۔ اور تمہارے کہنے کے مطابق میرے بھائی کے ذمہ میری تعلیم و تربیت سپرد کی گئی تھی اور یہیں سے میرے رنج و الم کی داستان شروع ہوتی ہے۔ میرے بھائی ژاک کو وہ اسکول میں تعلیم دلاتا ہے اور وہاں وہ نہایت شاندار کامیابی کے ساتھ پڑھ رہا ہے۔ اور مجھ کو وہ گھر پر ایک دہقانی کی طرح رکھتا ہے، یا یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ مجھ کو گھر پر تعلیم و تربیت کے فیض سے محروم رکھتا ہے، اگرچہ میں ایک شریف خاندان کا رکن ہوں۔ مگر میری تربیت اور ایک بیل کی تربیت میں کوئی فرق نہیں۔ اس کے گھوڑوں کی تربیت مجھ سے بہتر ہوتی ہے اس لیے کہ انکو صرف غذا ہی نہیں دی جاتی بلکہ انکی تربیت کیلئے سوار گراں قیمتوں پر نوکر رکھے جاتے ہیں لیکن میں اگرچہ اس کا بھائی ہوں مجھ کو اسکی ذات سے سوائے اس کے کہ میں قد و قامت میں بڑھ رہا ہوں اور کوئی فائدہ نہیں اور اس کیلئے میں اس کا اتنا ہی ممنون ہوں جتنا دانہ گھاس پر پلنے والے اس کے جانور، اسیطرح یہ کہ جو کچھ قدرت نے مجھ میں ودیعت کر رکھا ہے اسکو بھی وہ چھین لینا چاہتا ہے، وہ مجھ کو اپنے جانوروں کے ساتھ کھلاتا ہے، ایک بھائی کے پوزیشن سے محروم رکھتا ہے اور اس سے جہاں تک ہو سکتا ہے میری تربیت کے تغافل سے میری نسبی شرافت کو ملیا میٹ کرنا چاہتا ہے۔ ایڈم ایسی چیز میرے سوہان روح کا باعث ہے، اور میرے باپ کی روح جو میں سمجھتا ہوں کہ میرے اندر ہے اس غلامی سے بغاوت کرتی ہے، اب میں اسکو برداشت نہیں کر سکتا، اگرچہ میں کوئی ایسی تدبیر نہیں جانتا جو مجھکو اس پنجۂ غلامی سے رہا کرے۔

ایڈم :- وہ دیکھئے، میرے مالک یعنی آپکے بھائی سامنے آرہے ہیں

اورلینڈو :- ایڈم تم ہٹ جاؤ اور دیکھو وہ کس طرح میرے ساتھ پیش آتے ہیں۔

(اولیور داخل ہوتا ہے)

اولیور :- کہئے حضرت، آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔

اورلینڈو :- کچھ نہیں مجھے کچھ کرنے کے لئے سکھایا ہی نہیں گیا۔

اولیور :- تو جناب پھر کونسی چیز بگاڑ رہے ہیں۔

اورلینڈو :- جناب عالی، واقعہ تو یہ ہے کہ میں یہ کوشش کر رہا ہوں کہ آپکو اس چیز کے بگاڑنے میں مدد دوں جس کو اللہ نے بنایا یعنی آپ کا غریب نالایق بھائی۔

اولیور :- کچھ کام کیجئے، اور ابھی میری نظر سے دور ہو جائیے۔

اورلینڈو :- کیا میں آپکے سوروں کی نگہداشت کروں اور انکے ساتھ غلاظت چاٹوں، آخر میں نے کونسی اپنی دولت برباد تو نہیں کی کہ اس غربت و افلاس کی زندگی بسر کروں۔

اولیور :- کچھ خبر ہے کہ آپ کہاں کھڑے ہوئے ہیں؟

اورلینڈو :- جی ہاں اچھی طرح یہاں آپکے باغ میں۔

اولیور :- کچھ خبر ہے کہ کس کے سامنے؟

اورلینڈو :- ہاں، میں جس کے سامنے کھڑا ہوا ہوں جتنا وہ مجھ کو جانتا ہے اس سے زیادہ میں اسکو جانتا ہوں میں جانتا ہوں کہ آپ میرے سب سے بڑے بھائی ہیں اور خون اور شرافت

---

[1] کرون (Crown) ایک کرون پانچ شلنگ کے برابر ہوتا ہے اور ایک شلنگ موجودہ حساب سے تقریباً بارہ آنے کے برابر ہوتا ہے۔

نسب کا یہ تقاضا ہے کہ آپ بھی مجھ کو بھائی سمجھئے' قوموں کی تہذیب و رواج کے مطابق آپ میرے بزرگ ہیں۔ اس لئے کہ آپ پہلے اس دنیا میں آئے۔ لیکن وہی رواج مجھ کو میری شرافت سے محروم نہیں کرسکتا اگرچہ میرے اور آپکے درمیان میں بھائی بھی کیوں نہیں ہوتے' میری رگوں میں بھی میرے والد کا اتنا ہی خون ہے جتنا آپکی رگوں میں' اگرچہ میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ چونکہ آپ مجھ سے پہلے اس دنیا میں آئے اس لئے آپ والد کی عزت سے قریب تر ہیں۔

اولیور:۔ کیوں بے لونڈے ؟ یہ کیا؟

اورلنیڈو:۔ آہستہ' آہستہ بھائی جان اس معاملہ میں آپ ابھی کچے ہیں۔

اولیور:۔ بچے بد معاش تو مجھ پر ہاتھ چھوڑیگا۔

اورلنیڈو:۔ میں لچا یا بدمعاش نہیں ہوں میں سر رولینڈ ڈی بوائز کا سب سے چھوٹا لڑکا ہوں' وہ میرے والد تھے اور وہ شخص سہ گونہ بد معاش ہے جو یہ کہتا ہے کہ میرے والد کے لڑکے لچے اور بدمعاش ہیں' اگر آپ میرے بھائی نہ ہوتے تو میں ہرگز یہ ہاتھ آپکے گلے سے نہ ہٹاتا جب تک کہ دوسرے ہاتھ سے زبان نہ نکال لیتا آپ نے خود اپنی توہین کی ہے۔

ایڈم:۔ (آگے آکر) میرے پیارے آقاؤ' صبر سے کام لیجئے' اپنے والد کی یاد کی خاطر صلح و آشتی اختیار کیجئے۔

اولیور:۔ مجھ کو جانے بھی دو۔

اورلنیڈو:۔ جب تک میری مرضی نہ ہو گی جانے نہیں دونگا۔ آپکو سننا پڑیگا۔ میرے والد نے وصیت نامہ میں آپکو یہ تاکید کی ہے کہ مجھ کو اچھی تعلیم دیجائے۔ آپنے مجھ کو ایک کسان کی طرح رکھا ہے اور شرفا کے تمام اوصاف حمیدہ سے محروم رکھا ہے' میرے والد کی روح جو میرے اندر ہے وہ اسکو قبول نہیں کر سکتی' اس لیئے یا تو مجھے ایسی تعلیم دیجئے جو ایک شریف آدمی کے لایق ہو یا میرے ورثہ کا حصہ دیدیجئے جو میرے والد نے میرے لیئے وصیت کیا ہے' میں اس سے اپنی قسمت آزمائی کرونگا۔

اولیور:۔ اور جب وہ خرچ ہوجائیگا تو کیا کروگے ؟ بھیک مانگوگے؟ اچھا اندر آؤ' مجھ کو پریشان نہ کرو' تمکو تمہارے ورثہ کا کچھ حصہ ملے گا' میں التجا کرتا ہوں کہ میری جان چھوڑو۔

اورلنیڈو:۔ میں جتنا مناسب ہے اس سے زیادہ آپکو تنگ کرنا نہیں چاہتا۔

اولیور:۔ او بڈھے کتے تو اس کے ساتھ جا۔

ایڈم:۔ کیا یہ میری خدمتوں کا صلہ ہے؟ آپ کی خدمت میں بوڑھا ہو گیا' خدا میرے آقا کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے' وہ ہرگز مجھ کو اس نام سے نہ پکارتے (اورلنیڈو اور ایڈم چلے جاتے ہیں)

اولیور:۔ کیا یہ بات ہے ؟ تم مجھ پر آنکھیں نکالتے ہو ؟ میں تمکو تمہاری بدمعاشی کا مزہ چکھاتا ہوں اور ہزار کرون سے بھی محروم رکھتا ہوں' ڈینس ! (ڈینس داخل ہوتا ہے)

ڈینس:۔ حضور نے پکارا ؟

اولیور:۔ کیا ڈیوک کے دربار کا پہلوان چارلس ابھی نہیں آیا ہے ؟

ڈینس:۔ وہ دروازہ پر کھڑا ہے اور باریابی کی اجازت چاہتا ہے۔

اولیور:۔ اسکو اندر بلاؤ (ڈینس چلا جاتا ہے) یہ ایک اچھی تدبیر ہوگی اور کل ہی کشتی ہونیوالی ہے۔

(چارلس داخل ہوتا ہے)

چارلس: - بندہ پرور بندگی عرض ہے۔

اولیور: - موشیو چارلس تم پر سلامتی ہو! نئے دربار کی کوئی نئی خبر؟

چارلس: - حضور دربار کی نئی خبر نہیں ہے، وہی پرانی خبر ہے۔ نئے ڈیوک نے اپنے بڑے بھائی کو جلاوطن کردیا ہے تین یا چار جان نثار امراء جو اس کی دوستی اور محبت کا دم بھرتے ہیں۔ وہ اپنی مرضی سے اسکے ساتھ جلاوطن ہوگئے ہیں اور انکی زمینیں اور جاگیریں نئے ڈیوک کے قبضہ میں ہیں۔ اسی لئے اس نے انکو جلاوطنی کی اجازت دیدی تھی،

اولیور: - کیا یہ بتا سکتے ہو کہ (معزول شدہ) ڈیوک کی لڑکی روزیلینڈ بھی اپنے باپ کے ساتھ جلاوطن کردی گئی ہے؟

چارلس: - جی نہیں۔ (نئے) ڈیوک کی لڑکی سیلیا کو اس سے اتنی محبت ہے (اس لئے کہ دونوں کی پرورش بچپن سے ایک ہی ساتھ ہوئی) کہ وہ بھی ساتھ جلاوطن ہوجاتی یا نہیں تو اس کے فراق میں جان دیدیتی۔ وہ (روزیلینڈ) دربار ہی میں ہے اور اس کا چچا اسکو اپنی لڑکی کی طرح پیار کرتا ہے اور ان دو عورتوں میں جتنی محبت ہے شاید ہی کسی دو عورتوں میں ہو۔

اولیور: - پرانے ڈیوک کا قیام کہاں رہے گا؟

چارلس: - خبر مشہور ہے کہ وہ آرڈن کے جنگل میں پہونچ چکا اور بہت سے زندہ دل حضرات بھی پہونچے ہوئے ہیں اور وہاں وہ لوگ پرانے زمانہ کے رابن ہڈ[2] (Robin Hood) کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں، مشہور یہ ہے کہ نوجوان شرفا وہاں روز پہونچتے رہتے ہیں اور بے فکری کی زندگی اسی طرح بسر کرتے ہیں جس طرح لوگ عہد زریں میں بسر کیا کرتے تھے۔

اولیور: - کیا تم کل نئے ڈیوک کے سامنے کشتی کا جوہر دکھاؤ گے؟

چارلس: - جی ہاں اور میں آپکو ایک بات سے آگاہ کرنے کیلئے آیا ہوں، مجھکو یہ پوشیدہ طور پر معلوم ہوا ہے کہ آپ کا چھوٹا بھائی اورلینڈو بھیس بدل کر مجھ سے کشتی لڑنے کے لئے آنیوالا ہے۔ کل میں اپنی عزت اور دھاک کے لئے لڑونگا اور وہ خوش قسمت شخص ہوگا جو صحیح و سالم میرے پنجہ سے نکل جائے۔ آپ کا بھائی ابھی نوجوان اور ناتجربہ کار ہے آپ سے مجھکو جو محبت ہے اسکی بنا پر میں یہ نہیں چاہتا ہوں کہ اگر وہ قوت آزمائی کے لئے آئے تو اسکو اپنی دھاک جمانے کے لئے بری طرح شکست دوں اس محبت کی بنا پر میں آپ کو اس امر سے آگاہ کرنے کیلئے آیا ہوں تاکہ آپ اسکو اس ارادہ سے باز رکھیں، نہیں تو وہ بری طرح شکست کھانے کے لئے تیار رہے۔ اس لئے کہ وہ اپنی خواہش سے اور میری مرضی کے خلاف آمادہ پیکار ہو رہا ہے۔

اولیور: - چارلس، میں تمہاری اس محبت کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور میں تم کو اس کا بہترین صلہ دونگا، مجھے اپنے بھائی کے اس ارادہ کی خبر ہوچکی ہے، اور میں نے پوشیدہ ذرائع سے یہ کوشش کی ہے کہ وہ اپنے ارادہ سے باز آئے، مگر وہ بڑا ہی ضدی ہے چارلس میں تم کو کہہ دیتا ہوں کہ وہ فرانس کا سب سے ضدی نوجوان ہے، وہ بڑا ہی حوصلہ مند اور حاسد ہے، دوسروں کے اوصاف کی نقل کرتا ہے، میں اس کا بھائی ہوں مگر پوشیدہ طور پر وہ میرا دشمن ہے، اس لئے بہتر ہے کہ تم عقل و ہوش سے کام لو میری خواہش ہے کہ تم اسکی گردن اور انگلی توڑ ڈالو، ہشیاری سے کام لو

---

[1] موسیو (Monsieur) یہ ایک فرانسیسی لفظ ہے جو انگریزی لفظ مسٹر کا مترادف ہے۔
[2] رابن ہڈ (Robin Hood) انگلستان کا مشہور و معروف رہزن جو جنگلوں میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ بےفکری کی زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ امیروں کو لوٹتا تھا اور غریبوں کی مدد کرتا تھا۔ وہ قزاقوں کے گروہ کا سردار تھا۔ یہاں پر یہ تشبیہ محض اس لئے ہے کہ ڈیوک بےفکری کی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ قزاق پیشہ تھا۔

تو اگر اسکو کاری چوٹ نہیں لگی تو وہ تم کو زہر دینے کی کوشش کریگا، کسی دھوکے سے تم کو ضرر پہونچائے گا۔ اور جب تک کسی نہ کسی طرح تمہاری جان نہ لے اسوقت تک اسکو چین میسر نہ ہوگا۔ میں تم کو یقین دلاتا ہوں اور یہ کہتے ہوئے مجھے رونا آتا ہے کہ اس زمانہ میں ایسا بدمعاش نوجوان کوئی بھی نہیں میں برادرانہ شفقت سے بول رہا ہوں، اگر میں اسکی تمام حقیقت آشکار کردوں تو خود مجھ کو نادم ہونا پڑیگا اور تم حیرت سے زرد ہو جاؤگے۔

چارلس:۔ میں دل سے خوش ہوں کہ میں آپ کے پاس آیا۔ اگر وہ کل آیا تو پھر اسکی خوب ہی خبر لی جائے گی، اگر وہ صحیح وسالم نکل گیا تو پھر کبھی انعام کے لئے کشتی نہیں لڑونگا، خدا آپکو سلامت رکھے۔ (چلا جاتا ہے)

اولیور:۔ اب میں اس کشتی باز سے اس کی جان کا خاتمہ کراؤنگا نہ معلوم کیوں میری روح کو اس سے بیحد نفرت ہے لیکن وہ شریف ہے، اگرچہ کوئی تعلیم نہیں دی گئی لیکن شایستہ ہے۔ وہ خوش خیال ہے اور ہر دلعزیز ہے، دنیا اور خاصکر میری رعایا کی نگاہوں میں وہ اس قدر عزیز ہے کہ میری کوئی قدر نہیں ہوتی۔ لیکن اب ان تمام چیزوں کا خاتمہ ہوا چاہتا ہے۔ کشتی باز سب کام ٹھیک کردیگا، اب میں جاکر اس لڑکے کو مشتعل کرونگا۔

دوسرا منظر

ڈیوک کے محل کے سامنے والا میدان

(روزلینڈ اور سیلیا داخل ہوتی ہیں)

سیلیا:۔ میری پیاری بہن روزلینڈ، اپنے دل کو خوش رکھو۔

روزلینڈ:۔ پیاری سیلیا، میں اپنی ممکنات سے زیادہ خوش نظر آنے کی کوشش کرتی ہوں اور اس پر بھی تم مجھ کو کہتی ہو کہ دل کو خوش رکھو، آخر میں اپنے والد کو جو جلاوطنی میں ہیں کیونکر بھول سکتی ہوں؟

سیلیا:۔ تب تم کو مجھ سے اتنی محبت نہیں ہے جتنی مجھ کو تم سے ہے، اگر میرے چچا یعنی تمہارے والد نے تمہارے چچا یعنی میرے والد کو جلاوطن کیا ہوتا اور تم میرے ساتھ ہوتی تو میں تمہارے والد کو اپنے والد کی طرح سمجھتی، اگر تم کو مجھ سے محبت ہے تو تم کو بھی ایسا ہی سمجھنا چاہیئے۔

روزلینڈ:۔ اچھا تو میں اپنے رنج و الم کو بھول جاؤنگی، اور تمہاری خوشیوں میں تمہاری شریک رہونگی۔

سیلیا:۔ تم جانتی ہو کہ میرے والد کی اور کوئی اولاد اب ہوگی، اور جب میرے والد اس دنیا کو خیرباد کہیں گے تو تم انکی تمام دولت کی وارث ہوجاؤگی۔ اس لئے کہ جو کچھ میرے والد نے تمہارے والد سے بالجبر چھین لیا ہے میں تم کو بالرضا واپس کردونگی، اگر میں اس عہدنامہ پر عمل نہ کروں تو پھر میں بھوت پریت ہوجاؤں اسلئے میری پیاری روز، میری اچھی روز، غم نہ کرو۔

روزلینڈ:۔ اچھا اب میں ایسا ہی کرونگی اور تمہارے دل بہلانے کا سامان کرونگی، محبت میں گرفتار ہونے کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟

سیلیا:۔ ہاں اس سے دل ضرور بہلاؤ، مگر واقعۃً کسی پر وارفتہ نہ ہو۔ دل بہلانے سے زیادہ اس کا مقصد نہ ہو تاکہ تمہارا تبسم عصمت آمیز ہو اور تمہاری پاکدامنی پر کوئی دھبہ نہیں آئے۔

روزلینڈ:۔ تو پھر ہم لوگوں کا سامان تفریح کیا ہوگا۔

سیلیا:۔ آؤ ہم لوگ بیٹھیں اور قسمت کی دیوی[1] کو برا بھلا کہیں تاکہ اسکی

[1] قدیم رومی عقیدہ کے مطابق قسمت کی دیوی فورٹونا، Fortuna تھی اور وہ کور چشم سمجھی جاتی تھی۔

عنایتیں سب پر یکساں ہوں۔

روزملنڈ:۔ آؤ ایسا کریں اس لئے کہ یہ دیوی بلا تمیز بخششیں نچھاور کرتی ہے، اور اس بخشش کرنوالی اندھی عورت کا فیصلہ عورتوں کے معاملہ میں نہایت ہی غلط ہوتا ہے۔

سیلیا:۔ یہ صحیح ہے جن کو وہ حسین بناتی ہے انکو عصمت کی دولت سے اکثر محروم رکھتی ہے، اور جنکو عصمت بخشتی ہے انکو حسن سے محروم رکھتی ہے

(لابو داخل ہوتا ہے)

لابو:۔ حسین شاہزادی، آپنے ایک دلچسپ کا تماشہ نہیں دیکھا؟

سیلیا:۔ کس قسم کا تماشہ۔

لابو:۔ کشتی کا تماشہ

روزملنڈ:۔ ذرا بیان توکرو۔

لابو:۔ ایک بوڑھا شخص اپنے تین لڑکوں کے ساتھ آیا۔

روزملنڈ:۔ یہ تو ایک پرانے قصہ کی طرح معلوم ہوتا ہے۔

لابو:۔ سب سے بڑے لڑکے نے ڈیوک کے کشتی باز چارلس سے نبرد آزمائی کی، چشم زدن میں چارلس نے دے مارا، اور اسکی تین پسلیاں توڑ ڈالیں اور اب اس کے بچنے کی امید کم ہے، دوسرے اور تیسرے لڑکوں کا بھی یہی حشر ہوا، وہ سب پڑے ہوئے ہیں اور ان کا باپ اس طرح گریہ وزاری کر رہا ہے کہ تماشائیوں کی آنکھیں تر ہیں۔

روزملنڈ:۔ افسوس!

ٹچ اسٹون:۔ تو پھر تماشہ کیا ہوا؟

لابو:۔ یہی جس کا میں تذکرہ کر رہا ہوں۔

ٹچ اسٹون:۔ خوب ہی عقل کی بات کہی، آج پہلی دفعہ میں سن رہا ہوں کہ پسلیوں کا ٹوٹنا تماشہ ہے۔

سیلیا:۔ میں نے بھی آج ہی ایسی بات سنی۔

روزملنڈ:۔ کوئی شخص ہے جو ٹوٹتی ہوئی ہڈیوں کی آواز سننا چاہتا ہے، اور بھی کوئی ہے جو پسلیاں توڑ ڈالنے کے لئے آمادہ ہے، بہن کشتی دیکھنے چلوگی۔

سیلیا:۔ سامنے وہ سب آ رہے ہیں، ہم لوگ ٹھہر جائیں، اور دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

[آوازِ دہل، ڈیوک فریڈرک، امرا، اور لنیڈو، چارلس اور خدمتگار داخل ہوتے ہیں۔]

ڈیوک فریڈرک:۔ آؤ، وہ نوجوان جب باز ہی نہیں آتا تو خود وہ خطرہ میں ہے۔

روزملنڈ:۔ کیا وہ نوجوان سامنے کھڑا ہوا ہے؟

لابو:۔ جی ہاں۔

سیلیا:۔ افسوس وہ ابھی بالکل ہی نوجوان ہے لیکن اس کی نگاہوں میں کامیابی کی جھلک ہے۔

ڈیوک فریڈرک:۔ کہو بیٹی اور بھتیجی، تم دونوں بھی کشتی دیکھنے آئی ہو

روزملنڈ:۔ جی ہاں، ہم لوگوں کو اسکی اجازت دیجئے۔

ڈیوک فریڈرک:۔ لیکن کوئی خاص لطف نہ ہوگا، اس لئے کہ دونوں میں آسمان زمین کا فرق ہے، چونکہ یہ بہت نوجوان ہے، اس لئے میں نے اسکو بہت روکا مگر وہ سنتا ہی نہیں، تم دونوں کوشش کرو، شاید وہ اپنے ارادہ سے باز آئے۔

سیلیا:۔ لابو، ذرا اسکو ادھر بلاؤ۔

ڈیوک فریڈرک:۔ میں یہاں سے ہٹ جاتا ہوں۔

(ڈیوک چلا جاتا ہے)

لابو:۔ مقابلہ کی کشتی لڑنے والے نوجوان، شاہزادی تم کو بلا رہی ہیں۔

اورلینڈو :۔ بہت خوب حاضر ہوا۔

روزلینڈ :۔ کیا تم نے چارلس سے مقابلہ کی ٹھانی ہے؟

اورلینڈو :۔ نہیں اس نے خود سبھوں کو کشتی کی دعوت دی ہے اور میں بھی قوت آزمائی کے لئے آیا ہوں۔

سیلیا :۔ تم اپنے سن سے زیادہ حوصلہ کر رہے ہو، تم نے ابھی دیکھا ہے کہ اس شخص نے کس بیدردی سے اپنی قوت کا مظہر کیا ہے، تم اس ارادہ سے باز آؤ۔

روزلینڈ :۔ اور تمہاری شہرت میں کوئی بٹہ نہیں لگے گا، ہم لوگ ڈیوک سے درخواست کریں گے کہ کشتی روک دی جائے۔

اورلینڈو :۔ میں آپ لوگوں سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھکو اس بات پر مجبور نہ کریں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کے احکام کی نافرمانی کر رہا ہوں۔ اگر آپ کی دعائیں میرے شامل حال رہیں تو یہ میری خوش نصیبی ہوگی، اگر میں نے شکست کھائی تو مجھے اس کا افسوس بھی نہ ہوگا اگر مارا گیا تو میں مرنے کے لئے ہمیشہ تیار ہی ہوں۔ میرا کوئی دوست بھی نہیں ہے جو ماتم کریگا، بلکہ کسی لائق آدمی کے لئے دنیا میں ایک جگہ خالی ہو جائے گی۔

روزلینڈ :۔ کاش میری قوت بھی اس کے پاس چلی جاتی۔

سیلیا :۔ اور میری بھی۔

روزلینڈ :۔ خدا کرے ہم لوگوں کا خیال غلط ثابت ہو۔

سیلیا :۔ خدا کرے تمہاری خواہش پوری ہو۔

چارلس :۔ کہاں ہے وہ نوجوان جو زمین پر گرنا چاہتا ہے؟

اورلینڈو :۔ میں تیار ہوں مگر تمہاری طرح مغرور نہیں ہوں۔

ڈیوک فریڈرک :۔ صرف ایک بار کشتی ہوگی۔

چارلس :۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ دوسری کی ضرورت بھی نہ ہوگی۔

اورلینڈو :۔ قبل کشتی کے یہ طعنہ زنی زیبا نہیں، اچھا آؤ بھی۔

روزلینڈ :۔ خدا کرے اس نوجوان کو ہرکولیز Hercules[1] کی طاقت ہو جائے۔

سیلیا :۔ جی چاہتا ہے کہ چارلس کا پیر کھینچ لوں۔

(چارلس اور اورلینڈو کشتی لڑتے ہیں)

روزلینڈ :۔ یہ نوجوان خوب ہی قوت آزمائی کر رہا ہے۔

سیلیا :۔ اگر میری آنکھ میں بجلی ہوتی تو میں کہہ دیتی کہ کون فتحیاب ہوگا

(چارلس زمین پر گر پڑتا ہے، شور و غل)

ڈیوک فریڈرک :۔ بس۔ بس۔

اورلینڈو :۔ ابھی تو میں تھکا بھی نہیں۔

ڈیوک فریڈرک :۔ چارلس۔ تمہارا کیا حال ہے؟

لابو :۔ حضور وہ کچھ نہیں بول سکتا۔

ڈیوک فریڈرک :۔ اسکو لے جاؤ۔ نوجوان، تمہارا نام کیا ہے؟

(لوگ چارلس کو لے جاتے ہیں)

اورلینڈو :۔ حضور عالی! میرا نام اورلینڈو ہے اور میں سر رولینڈ ڈی بوائز کا سب سے چھوٹا لڑکا ہوں۔

ڈیوک فریڈرک :۔ کاش تو کسی دوسرے شخص کا لڑکا ہوتا۔ دنیا تیرے باپ کو عزت کی نگاہوں سے دیکھتی تھی، لیکن میں اسکو اپنا دشمن سمجھتا تھا۔ تیرا یہ کارنامہ مجھ کو بہت پسند آتا اور اگر تو کسی دوسرے خاندان کا ہوتا۔ مگر خیر۔ تو ایک شجاع اور بہادر نوجوان ہے۔ کاش تو کسی دوسرے شخص کو اپنا باپ کہتا۔

(ڈیوک فریڈرک، حاشیہ بردار اور لابو چلے جاتے ہیں)

سیلیا :۔ میں اگر ابا کی جگہ ہوتی تو ہرگز یہ نہ کرتی۔

[1] یہ رومی اور یونانی تخیل کے مطابق ہرکولیز (Hercules) قوت و طاقت، شجاعت و بسالت کے لئے مشہور تھا۔

اورلنیڈو:۔ مجھ کو اس پر فخر ہے کہ میں سر رولینڈ ڈی بوائز کا لڑکا ہوں۔ اور اس کا سب سے چھوٹا لڑکا ہوں۔ اس کے مقابلہ میں فریڈرک کا منہ بولا بیٹا بننا گوارا نہیں کرونگا۔

روزلینڈ:۔ میرے والد اور سر رولینڈ ایک جان دو قالب تھے اور تمام دنیا سر رولینڈ کو عزیز سمجھتی تھی۔ اگر مجھے پہلے سے یہ خبر ہوتی تو جس وقت میں اورلنیڈو سے کشتی سے باز آنے کی درخواست کر رہی تھی اس وقت اس کی تمہید آنسوؤں سے کرتی۔

سلیا:۔ اچھی بہن، ہم لوگ چلیں، اسکو مبارکباد دیں اور اسکی ہمت افزائی کریں، میرے والد کا یہ برا سلوک میرے دل میں نشتر کا کام کر رہا ہے، جناب آپ اس فتح کے مستحق تھے۔ اگر آپ اپنی محبت کی آزمائش میں بھی ایسے ہی ثابت قدم ٹھہرے تو آپ کی محبوبہ خوش و خرم رہے گی۔

روزلینڈ:۔ شریف مرد۔ (اپنی گردن سے ایک مالا نکال کر اسکو دیا) میری خاطر اسکو پہنیے، میں قسمت کی ماری ہوں ورنہ اس سے بہتر تحفہ پیش کرتی، بہن! اب ہم لوگ چلیں۔

سلیا:۔ اچھا، الوداع اے حسین مرد۔

اورلنیڈو:۔ کیا میں شکریہ بھی ادا نہیں کر سکتا؟ میں اب مفتوح ہو گیا۔ میری روح اب میرے قابو میں نہیں۔ اور میرا جسم ایک بیجان جسد ہے۔

روزلینڈ:۔ وہ ہم لوگوں کو بلا رہا ہے، میری قسمت کے ساتھ میرا غرور بھی جاتا رہا۔ میں اس سے پوچھونگی کہ اس کی کیا خواہش ہے جناب! کیا آپ نے بلایا؟ آپ خوب ہی کشتی لڑے اور نہ صرف اپنے دشمنوں کو بلکہ اوروں کو بھی مفتوح کیا۔

سلیا:۔ بہن چلوگی؟

روزلینڈ:۔ خدا سلامت، الوداع۔

(روزلینڈ اور سیلیا چلی جاتی ہیں)

اورلنیڈو:۔ نہ معلوم یہ کون سا جذبہ ہے جو میری زبان پر ایک بوجھ رکھے ہوئے ہے۔

خوش گفتگو ہے، بیزبانی ہے زبان میری

میں اس سے بول نہیں سکا۔ لیکن وہ بولنا چاہتی تھی، اورلنیڈو، تو مفتوح ہو گیا، تجھ پر کسی اور ہی کا اب قابو ہے۔

(لابو داخل ہوتا ہے)

لابو:۔ میں تم کو محبت کی بنا پر یہ رائے دیتا ہوں کہ اس جگہ کو چھوڑ دو۔ اگرچہ تم تعریف، ہمت افزائی اور محبت کے مستحق ہو مگر ڈیوک بڑا ہی تلون مزاج شخص ہے۔

اورلنیڈو:۔ شکریہ، مگر ذرا مجھکو یہ بتا دو کہ ان دو عورتوں میں جو کشتی دیکھنے آئی تھیں ڈیوک کی لڑکی کون ہے؟

لابو:۔ اگر اخلاق و اطوار سے اندازہ کیا جائے تو ان دونوں میں کوئی بھی اسکی لڑکی نہیں، لیکن جو چھوٹی تھی وہ ڈیوک کی لڑکی تھی دوسری معزول شدہ ڈیوک کی لڑکی تھی، اسکو اس کے چچا نے یہاں اس لئے رکھ لیا ہے تاکہ وہ اسکی بیٹی کے ساتھ رہے، ان دو عورتوں کی محبت اپنی بہنوں کی محبت سے زیادہ ہے، لیکن تھوڑے دنوں سے ڈیوک اپنی بھتیجی سے صرف اس لئے خفا ہے کہ لوگ اس کے صفات حمیدہ کی قدر کرتے ہیں اور اسکو لوگ اسکے باپ کی وجہ سے نظر ترحم سے دیکھتے ہیں، بہت جلد اس کے کینہ کی آگ بھڑک اٹھے گی الوداع، اس سے بہتر دنیا میں ہم لوگ پھر ملیں گے۔

اورلنیڈو:۔ میں تمہارا بہت ممنون ہوں، اللہ تم پر اپنی رحمت نازل کرے

(لابو چلا جاتا ہے)

اب دھواں سے آگ میں جانا ہے، ایک ظالم ڈیوک کے پاس۔ ایک ظالم بھائی کے ہاں مگر پیاری روزلینڈ!

باقی

ٹارزن
یعنی
عجیب انسان

از جناب محمد احسن صاحب بھلوہی پوری بھگول پٹنہ

باب ۵۳
جنگل میں

ایک لمحہ ٹارزن خاموش لٹکے ہوئے رسی کا کھسکنا دیکھتے رہے۔ آہستہ آہستہ نیچے آتے آتے یکایک جھٹکے کے ساتھ اُس کا آنا بند ہوگیا اور اوپر سے گھرگھراہٹ کی آواز آئی۔ ٹارزن نے سمجھ لیا کہ وہ بالکل کنارے پر دیوار سے اڑ گئی ہے۔ انہوں نے اوپر چڑھنا شروع کیا۔ چند لمحے کے بعد ان کا سر سوراخ کے اُوپر آگیا جس دالان میں کنواں تھا، اس میں بالکل خاموشی تھی۔ ادھر کے سب آدمی شاید قربانی کا تماشہ دیکھنے کے لئے قربانگاہ کے دالان میں چلے گئے تھے۔ لا کی آواز وہاں سے صاف آرہی تھی۔ ناچنا بند ہوگیا تھا اور وہ کچھ مذہبی منتر پڑھ رہی تھی۔ اب چھرے کے گرنے کا وقت قریب ہی ہوگا۔ یہ سوچتے ہوئے ٹارزن اس طرف دوڑے جدھر سے لا کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔

قسمت کی خوبی نے ٹارزن کو سیدھا اُس کمرے کے دروازے پر پہنچا دیا جس کے اندر قربانی کی رسم انجام پا رہی تھی۔ ان کے سامنے پجاری اور پجارنوں کی لمبی قطار تھی اور سب اپنے اپنے ہاتھ میں ایک ایک پیالہ لئے ہوئی تھیں۔ لا کا ہاتھ آہستہ آہستہ قربانگاہ کے پتھر کی طرف جھک رہا تھا۔ اس پر جین پورٹر کے نازک جسم کو پڑا ہوا دیکھ کر ٹارزن کے مُنہ سے ایک ہلکی آہ کی آواز نکل پڑی۔ ان کی پیشانی کے زخم کا داغ سُرخ ہوگیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا، اور ان کے مُنہ سے ایسی خوفناک آواز نکلی جیسی ایپ بندر غصہ میں آپے سے باہر ہوکر مُنہ سے نکالتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ایک جست لگا کر اس طرف دوڑے جدھر قربانی کی ظالمانہ کارروائی ہو رہی تھی۔

پاس کے پجاری کا کندہ اُس کے ہاتھ سے چھین کر ٹارزن اس طرح دائیں بائیں مارنے لگے جیسے وہ اس وقت پاگل ہوگئے ہوں۔ جھلکے کی پہلی ہی آواز سُن کر لا کا ہاتھ رُک گیا تھا۔ اب اُس کی نظر جب ٹارزن پر پڑی تو اُس کا چہرہ سفید ہوگیا۔ اُس کی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ جس کوٹھری میں اُس نے اُنہیں باہر سے بند کر دیا تھا اُس میں سے وہ غائب کس طرح سے ہوگئے تھے۔ اس کا ارادہ نہیں تھا کہ وہ اُدھر سے پھر واپس جائیں اُس نے اُنہیں بڑی پجارن کی نظر سے نہیں ——— ایک عورت کی نظر سے دیکھا تھا، اور وہ چاہتی تھی کہ اُنہیں اپنا شوہر بنا کر وہیں روک رکھے اور وہاں سے باہر نہ جانے دے۔ اپنے آدمیوں کو سمجھانے کے لئے اُس کے تیز دماغ نے ترکیب بھی سوچ لی تھی۔ وہ لوگوں سے کہتی کہ یہ آدمی خداوند آفتاب کا بھیجا ہوا ہمارے پاس آیا ہے اور اس سے لوگوں کو فائدہ پہونچے گا۔ اُس کی قوم کے لوگ اُس کی بات مان جاتے اسکا اُسے یقین تھا۔ لیکن ٹارزن کے بھاگ جانے کی وجہ سے اُس کی ترکیب پر پانی پھر گیا تھا۔ اس وقت وہی آدمی نہ معلوم کہاں سے پھر وہاں آموجود ہوا تھا اور اُس کے آدمیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح مار رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے لئے ہاتھ میں چھرا لئے لا اپنے سامنے کی قربانگاہ پر پڑے ہوئے شکار کو بھی بھول گئی اور اس کے پہلے کہ وہ اپنے پریشان دماغ کو درست کر سکے، ٹارزن اس کے سامنے پہنچ گئے اور قربانگاہ پر پڑی ہوئی عورت ان کی گود میں دکھائی دینے لگی۔

انہوں نے چلا کر کہا "ہٹ جاؤ لا"۔ بغل میں ہو جاؤ۔ تم نے ایک بار میری جان بچائی تھی، اس لئے میں تمہیں تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا لیکن اگر تم نے میرے کام میں دخل دیا یا میرے پیچھا کرنے کی کوشش کی تو تمہیں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑیگا"۔

یہ کہتے ہوئے ٹارزن اس دروازے کی طرف بڑھے جو نیچے سرنگ میں جانے کا راستہ تھا۔ لا نے بھرائی ہوئی آواز میں جین پورٹر کی طرف انگلی اٹھا کر پوچھا "یہ کون ہے؟"

ٹارزن نے جواب دیا "یہ میری ہے!"

لا کے منہ سے پھر آواز نہ نکلی۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر دونوں کی طرف دیکھنے لگی۔ یکایک اس کے چہرے پر سخت رنج اور تکلیف کے آثار ظاہر ہوئے اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اسکے منہ سے چیخ کی آواز نکلی اور وہ بیہوش ہو کر فرش پر گر پڑی۔

ٹارزن جین پورٹر کو کاندھے پر لئے ہوئے تیزی سے بھاگ رہے تھے، جب تک کہ ان کے دشمن ان کے ناگہانی حملہ سے سنبھل کر اپنے ہوش و حواس درست کریں اور ان پر خود حملہ کرنے کی تیاری کریں۔ اس وقت تک ٹارزن جین کو لئے نیچے کے تہخانہ میں گھس گئے۔ اور تیزی سے سرنگ میں دوڑتے ہوئے اس چٹان کی طرف روانہ ہوئے جو اپر کے مندر سے نکلنے کا مخفی راستہ تھا۔ ان کے دشمن انہیں تلاش کرتے ہوئے جب تہخانے میں آئے تو انہوں نے انہیں وہاں نہ پایا۔ وہ سوچنے لگے کہ ان کا خوفناک دشمن وہاں سے نکل کر گیا کہاں۔ وہاں سے جانے کا تو صرف کنواں کے اوپر ہی والا راستہ ہے۔ اس راستے سے ہو کر اگر وہ آئے گا تو ضرور ہم اسے گرفتار کر لیں گے۔

جس راستے سے ٹارزن فرار ہوئے تھے۔ اس کا پتہ ان کے دشمنوں کو نہ تھا۔ اس وجہ سے ان کا پیچھا کسی نے نہ کیا۔ لوگ اوپر کوئیں کے دہانے کے پاس کھڑے ہوئے، ان کے نکلنے کا انتظار کرتے رہے۔ جب بہت دیر کے بعد بھی ٹارزن اس راستے سے باہر نہ آئے تو آفتاب پرستوں کو شبہ پیدا ہوا۔ انہوں نے خیال کیا کہ وہ پہلے بھی ایک بار اسی طرح ہمارے مندر سے غائب ہو چکا ہے۔ وہ کہاں سے ناگہاں آتا اور کہاں چلا جاتا ہے۔ اس کی تلاش میں پچاس آدمی بھیجنا چاہئے جو باہر جا کر اسے پکڑ کر لے آئیں۔

ٹارزن جب اپر سے بھاگ کر اس تہخانہ میں پہنچے جس میں انہوں نے دیوار توڑی تھی تو انہوں نے کنوئیں کی طرف سے پتھر لگا کر پھر دیوار کو برابر کر دیا تاکہ ادھر سے دیکھنے والے کسی آدمی کو پتہ نہ لگے کہ وہاں کوئی آدمی دیوار توڑ کر اس طرف گیا ہے وہ چاہتے تھے کہ مندر میں داخل ہونے کے مخفی راستے کا کسی کو پتہ نہ لگے، کوئی اس خزانے کی کوٹھڑی کا بھید نہ جاننے پائے جس میں طلائی اینٹیں رکھی ہوئی تھیں، اور نہ کوئی ان کا تعاقب ہی کرے۔ ان کا ارادہ تھا کہ چند دنوں کے بعد وہ پھر وہاں جائیں گے اور تھوڑی اور اینٹیں اٹھا لیجائیں گے۔ وہ کنواں پار کر کے سرنگ میں گھسے اور اس کوٹھڑی میں گئے جس میں خزانہ رکھا ہوا تھا۔ وہاں سے گزرتے ہوئے اس سرنگ میں داخل ہوئے جو باہر کی چٹان تک پہنچاتی تھی۔ اس وقت تک جین پورٹر بے ہوش ہی تھی۔

چٹان پر پہنچ کر ٹارزن نے اپر کے شہر کی طرف نظر کی۔ انہوں نے دیکھا کہ وہاں کے پچاس باشندے تیز چلتے ہوئے میدان میں چلے آرہے ہیں۔ انہیں دیکھ کر ٹارزن کچھ پس و پیش کرنے لگے۔ وہ سوچنے

لگے کہ وہاں سے اُتر کر اور دوڑ کر دشمنوں کے آنے سے پہلے پہاڑیوں تک پہنچ جانے کی کوشش کریں یا وہیں شب ہونے تک چھپے رہیں اور اُنہیں آگے نکل جانے دیں۔ اُنہوں نے جین پورٹر کے سفید چہرے پر جب نظر ڈالی تو ان کا ارادہ نہ ہوا کہ وہاں ٹھہر کر خود کو خطرہ میں ڈالا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ سرنگ سے بھی پیچھا کرتے ہوئے دشمن آ رہے ہوں۔ آگے اور پیچھے دونوں ہی طرف سے اگر وہ گھر جائیں گے تو پھر جین پورٹر کو سنبھالتے ہوئے ان کا لڑنا اور بھاگنا دشوار ہو جائے گا۔ یہی بہتر ہوگا کہ چٹان سے نیچے اُتر کر پہاڑیوں تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔

جین پورٹر کو لئے ہوئے ڈھلوان چٹان سے نیچے اُترنا بہت مشکل کام تھا۔ لیکن اُنہوں نے اُسے گھاس کی رسّی سے اپنی پشت پر باندھ لیا اور بڑی مشکل سے نیچے اُترے۔ چٹان کا وہ پہلو جدھر سے وہ اُتر رہے تھے شہر کی دوسری طرف واقع تھا، اس وجہ سے اُترنے کے وقت کسی کی نظر ان پر نہ پڑی اور نہ تعاقب کرنے والوں میں سے کسی نے یہ سمجھا کہ ان کا شکار ان کے اتنا نزدیک ہے۔

چٹان کو اپنے اور اپنے پیچھا کرنے والوں کے درمیان آڑ رکھ کر ٹارزن ایک میل تک برابر بڑھتے چلے گئے اور کسی کی اُن پر نظر نہ پڑی۔ اس کے بعد جب اُپر والے ٹیلے کے گرد گھوم کر راستے پر آئے اور وہاں سے آگے بڑھے تو اُن لوگوں نے شکار کو سامنے بھاگتے ہوئے دیکھا۔ خوش ہو کر زور زور سے چیخیں مارتے ہوئے وہ اُس طرف دوڑے۔ ان لوگوں نے سوچا کہ نزدیک ہونے کی وجہ سے ضرور اُنہیں پکڑ لیں گے۔ لیکن ان کا خیال خام ثابت ہوا۔ ٹارزن کے دوڑنے کی عادت سے وہ ناواقف تھے اور یہ بھی اچھی طرح نہ سمجھتے تھے کہ ان کے ٹیڑھے اور چھوٹے چھوٹے پاؤں اور ٹارزن کی لمبی ٹانگوں میں بہت فرق ہے اور وہ ان کی بہ نسبت زیادہ تیز دوڑ سکتے ہیں۔

ٹارزن نے اپنی رفتار ذرا تیز کر کے دیکھ لیا کہ وہ اپنے اور دشمنوں کے درمیان فاصلہ کو برابر یکساں رکھ سکتے ہیں۔ اب اُنہوں نے جین پورٹر کے چہرے پر نگاہ ڈالی، وہ بالکل پژمردہ اور سفید ہو رہا تھا۔ اگر اس کے دل کی حرکت اُنہیں نہ معلوم دے رہی ہوتی تو اُنہیں شک ہو جاتا کہ وہ زندہ ہے یا اُس کی روح اُس کے جسم سے پرواز کر گئی۔ تیزی سے چلتے ہوئے ٹارزن پہاڑوں کے نزدیک پہنچ گئے۔ اور اوپر چڑھنے لگے۔ اوپر چڑھنے میں اُنہوں نے بڑی جلدی کی اس خیال سے کہ اُپر والوں کے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچنے سے پہلے اُنہیں اُس کی دوسری طرف نیچے اُتر جانا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اوپر سے پتھر کی چٹانیں لڑھکانا شروع کر دیں اور درمیان ہی میں کسی جگہ کچل جانا پڑے۔ وہ جب پہاڑ کے نیچے پہونچ گئے تب اُپر والے دوڑتے اور ہانپتے ہوئے اس کی چوٹی پر پہنچے۔

اوپر پہنچ کر جب ٹارزن کو ان لوگوں نے بہت دور نیچے اُتر کر جاتے ہوئے دیکھا تو وہ غصہ سے دیوانے ہو کر اچھلنے کودنے اور چلّانے لگے۔ لیکن اب کی بار کوئی ان کا پیچھا کرنے کے لئے نیچے نہ اُترا۔ شاید اُنہوں نے یہ سوچا کہ پہلی بار تعاقب کرنے اور تلاش کرنے کے باوجود ان کا پتہ نہ لگا تھا، اس وجہ سے اس بار بھی جانا بیکار ہے۔ یا یہ خیال ہو کہ دشمن کی چال بہت تیز ہے، اس وجہ سے تعاقب کرنا فضول ہے۔ ٹارزن جب پہاڑ سے اُتر کر نزدیک ہی کے جنگل میں داخل ہوئے تو اُنہوں نے دیکھا کہ پیچھا کرنے والے چوٹی سے اُتر کر واپس اُپر کی طرف جا رہے ہیں۔

جنگل میں تھوڑی دُور جا کر ٹارزن ایک ایسی صاف جگہ دیکھ کر ٹھہر گئے جہاں سے پہاڑ کی چوٹی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اُنہوں نے جین پورٹر کو زمین پر لٹا دیا اور نزدیک کے جھرنے سے پانی لا کر اس کے

چہرے پر خوب چھڑکا اور غور سے دیکھنے لگے کہ وہ ہوش میں آتی ہے یا نہیں۔ تھوڑی دیر ٹھیر کر اُنہوں نے پھر سر پر پانی ڈالا، لیکن جب اِس کے بعد بھی اُس کے ہوش میں آنے کی امید نظر نہ آئی تو اُنہوں نے اُسے پھر اُٹھا لیا اور مغرب کی طرف روانہ ہوئے۔

دوپہر کے وقت ہوا لگنے کی وجہ سے جین پورٹر کی بیہوشی دُور ہوئی۔ اس نے فوراً آنکھیں کھولیں۔ وہ ان واقعات کو یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی جنہیں اُس نے آخری بار دیکھا تھا۔ خوفناک قربانگاہ، نزدیک ہی کھڑی بے رحم پجارن اور اُس کے ہاتھ کا خوفناک چھرا جو اس کی چھاتی کو زخمی کرکے اندر اُتر رہا تھا! وہ آنکھیں بند کئے ہی کانپ اُٹھی۔ اُس نے سوچا کہ ضرور وہ مر گئی ہے یا شاید چھرا اُس کے سینے میں اُتر گیا ہے اور مرنے سے پہلے بیہوشی میں وہ خواب دیکھ رہی ہے۔

اُس نے جی کڑا کرکے آہستہ سے آنکھیں کھولیں، جو کچھ اُس نے دیکھا اس سے اس کا خیال اور پختہ ہو گیا کہ ضرور وہ مر گئی ہے۔ اس نے دیکھا کہ اس کا مرا ہوا عاشق اُسے اپنے دونوں ہاتھوں پر اُٹھائے ہوئے گود میں لیئے دلکش جنگل سے ہوتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے! آہستہ سے اُس نے کہا " اگر مرنے کے بعد ایسا ہی آرام ملتا ہے تو خدا کرے میں ہمیشہ مُردہ ہی رہوں!"

ٹارزن نے خوش ہو کر کہا " جین! کیا تم بول رہی ہو! بہت دیر کے بعد تمہیں ہوش آیا"

جین پورٹر کا چہرہ کئی مہینے کے بعد اس وقت مسرت، آرام اور اطمینان کے تبسم سے شگفتہ ہو اُٹھا۔ اُس نے کہا " میں ہی ہوں ٹارزن!"

ٹارزن نے جین پورٹر کو ایک جھرنے کے نزدیک درخت کے سہارے زمین پر بیٹھا دیا اور کہا " خدا کا شکر ہے کہ اُس نے مجھے وقت پر تمہارے پاس پہنچا دیا"

جین پورٹر نے متعجب ہو کر کہا " وقت پر! کیسے وقت پر! اس کا کیا مطلب؟"

ٹارزن نے کہا " ایسے وقت پر پہنچا دیا کہ میں نے قربانگاہ پر سے تمہاری جان بچالی۔ کیوں، کیا تمہیں یاد نہیں ہے؟"

اُسی لہجہ میں جین پورٹر نے کہا " جان بچالی کیوں کہتے ہو، میرے ٹارزن! کیا ہم دونوں مرے ہوئے نہیں ہیں؟"

ٹارزن نے ہنس کر کہا " نہیں بالکل نہیں، ہم دونوں درحقیقت زندہ ہیں۔ تم نے مجھے مُردہ کیوں سمجھ لیا؟"

جین پورٹر نے کہا " اس وجہ سے کہ ہیزل اور مسٹر تھیوران دونوں نے مجھے یقین دلایا کہ تم جہاز سے پانی میں گر پڑے اور چونکہ وہاں نزدیک کوئی جہاز نہ تھا اور زمین کوسوں دُور تھی اس وجہ سے یقیناً ڈوب کر مر گئے ہوگے!"

ٹارزن نے کہا " کس طرح میں تمہیں یقین دلاؤں کہ میں جی رہا ہوں مرا نہیں ہوں۔ یہ سچ ہے کہ مہربان مسٹر تھیوران نے مجھے جہاز سے سمندر میں ڈھکیل دیا تھا، لیکن میں اس سے مرا نہیں، سب حال تمہیں پیچھے سناؤں گا۔ میں زندہ بچ گیا اور اس وقت پھر اُسی جنگلی آدمی میں ہوں جس میں تم نے مجھے پہلے دیکھا تھا"

جین پورٹر اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور ٹارزن کی طرف بڑھ کر ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی " اپنی ایسی خوش قسمتی پر مجھے یقین ہی نہیں آ رہا ہے، میرے ٹارزن! لیڈی الکیس کے غرق ہونے کے بعد سے میں نے بڑی بڑی تکالیف اُٹھائی ہیں۔ ان کے بعد یہ آرام کہیں خواب و خیال نہ ہو، مجھے بار بار یہی شک ہو رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ خوش کُن خواب ٹوٹ جائے اور میں پھر اُسی خوفناک شہر میں اُسی پجارن کے چھُرے کے نیچے جا پڑوں۔ مجھے چوم لو، مجھے گود میں

اُٹھالو میرے ٹارزن؛ جلدی کرو، ورنہ میں ہوش میں آجاؤں گی!"

ٹارزن کو دوسری بار کہنے کی ضرورت نہ تھی اُنہوں نے جین پورٹر کو آغوش میں لے لیا اور ایک دو دفعہ نہیں، سینکڑوں بار اُس کے مُنہ کے بوسے لئے، یہاں تک کہ وہ ہانپنے لگی جب ٹارزن نے اپنا سر ہٹالیا تو جین پورٹر نے ان کے گلے میں باہیں ڈال کر پھر ان کے ہونٹھ اپنے لبوں پر کھینچ لئے۔

ٹارزن نے کہا "کیوں اب تمہیں یقین ہوا کہ میں زندہ ہوں اور تم خواب نہیں دیکھ رہی ہو؟"

جین پورٹر نے کہا "ہاں اب میں سمجھ رہی ہوں کہ تم زندہ ہو اور میں بھی ہوش میں ہوں لیکن اگر ہم دونوں مرے ہوئے بھی ہوں تو کوئی ہرج نہیں۔ میں ایسی حالت میں مرا رہنا بھی پسند کرتی ہوں میرے ٹارزن!"

دونوں تھوڑی دیر خاموش اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ ان کی اس حالت سے معلوم ہو رہا تھا کہ اُنہیں اپنی اچھی قسمت پر اب تک یقین نہ تھا، اور وہ اپنے دلکش خواب کو سچ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ گذشتہ زمانہ، اُس کی تکالیف اور ناامیدیوں کو وہ بھول گئے تھے۔ آیندہ کیا ہوگا، اس کی اُنہیں کوئی فکر نہ تھی۔ اُنہیں کام تھا تو صرف موجود وقت سے جس سے لطف اندوز ہونے کا اُنہیں اچھا موقع ملا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد جین پورٹر نے کہا "پیارے ٹارزن! اب ہم لوگ کہاں جائیں گے اور کیا کریں گے؟"

ٹارزن نے کہا "تم کہاں جانا چاہتی ہو، اور اب تمہارا کیا کرنے کا ارادہ ہے؟"

جین پورٹر نے کہا "میں وہیں جاؤنگی جہاں تم جاؤگے میں وہی کروں گی جو تم کروگے میرے ٹارزن!"

تھوڑی دیر ٹارزن خاموش رہے۔ جیسے وہ دل ہی دل میں کسی بات پر غور کر رہے ہوں۔ پھر اُنہوں نے پوچھا "اور کلیٹن، ان کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ ہم تمہارے شوہر کو بالکل ہی بھول گئے، جین!"

جین پورٹر نے چلا کر کہا "میری شادی اُن سے نہیں ہوئی ہے، اور نہ اب ان سے میرا شادی کا وعدہ ہی رہ گیا ہے۔ جس روز ایپ کے خوفناک آدمیوں نے مجھے پکڑا تھا، اُس سے ایک روز پہلے میں نے اُن سے کہہ دیا تھا کہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے، اور اس وجہ سے تمہارے ساتھ شادی کرنا فضول سمجھتی ہوں۔ وہ سمجھ گئے اور پھر اس کے متعلق مجھ سے کچھ نہ بولے جس روز شیر سے ہماری جان بچی ——" اتنا کہتے کہتے جین پورٹر رک گئی، اور شبہ کی نظر سے ٹارزن کی طرف دیکھتی ہوئی بولی، ٹارزن! میں سمجھ گئی، تم ہی نے شیر سے ہماری جان بچائی ہوگی۔ دوسرا کوئی ایسا نہیں کرتا!"

ٹارزن نے آنکھیں نیچی کرلیں۔ جین پورٹر نے شکایت کے طور پر کہا "تم سے ایسا کس طرح کیا گیا، ٹارزن! کیوں تم نے مجھے دیکھ کر بھی چھوڑ دیا؟"

ٹارزن نے تکلیف آمیز لہجہ میں کہا "گڑے مُردے نہ اُکھاڑو جین! اسے یاد کرکے مجھے شرم آتی ہے۔ پہلے غصہ اور پھر تاسف سے میں نے کتنی تکلیفیں اُٹھائیں۔ یہ میں تمہیں بتا نہیں سکتا جین! میں الزام دیتا تھا تو اپنی قسمت کو، اور کسی کو نہیں۔ تمہارے پاس سے آکر میں ایپ بندروں کے گروہ میں جا ملا اور ارادہ کرلیا کہ ساری زندگی کسی انسان کی صورت نہ دیکھونگا"

اتنا کہہ کر ٹارزن نے پیرس سے آنے، وزیریوں سے ملنے اور پھر ایپ بندروں کے پاس جانے کا سب حال مفصل سنا دیا۔

جین پورٹر نے اور چند باتیں دریافت کیں۔ اس کے بعد ڈرتے ڈرتے اُس نے وہ بات پوچھی جسے ٹھیورن نے اُس سے کہا تھا۔ پیرس کی ایک عورت کے متعلق! ٹارزن نے اپنی پیرس کی زندگی کا پورا پورا حال جین پورٹر کو کہہ سُنایا۔ کوئی بات چھپائی نہیں۔ کیونکہ وہ ہمیشہ سچ بولتے تھے، اور انہیں اپنے وہاں کے کسی فعل کے لئے پس و پیش کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اپنا سارا حال کہہ کر وہ خاموش ہو رہے۔ اور جین پورٹر کا مُنہ دیکھنے لگے کہ ان کی باتیں سُن کر اس کی کیا رائے ہوتی ہے۔

جین پورٹر نے کہا "میں اس کے کہنے کے وقت ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے، کیسا شریر آدمی ہے!"

ٹارزن نے پوچھا "ان باتوں کی وجہ سے تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو؟"

جین پورٹر کے لبوں پر ہلکی مسکراہٹ نظر آئی۔ اُس نے مذاق سے کہا "کیا اولگا ڈی۔ کوڈ بہت خوبصورت ہے؟"

ٹارزن نے زور سے ہنس کر کہا "تم سے نصف بھی نہیں، میری جین!" اتنا کہہ کر اُنہوں نے اُس کے دلکش سُرخ لبوں کا کئی بار بوسہ لیا۔

جین پورٹر نے ان کے کندھے پر سر رکھ کر ٹھنڈی سانس لی، وہ سمجھ گئے کہ ان کا قصور معاف ہو گیا ہے۔

اس روز شب کے وقت ٹارزن نے اسی جگہ ایک بڑے درخت پر شاخوں کے درمیان جین پورٹر کے سونے کے لئے جگہ بنا دی اور خود اسی درخت کے نیچے کھو کھلے میں سو گئے۔

ان لوگوں کو ساحل تک پہونچنے میں کئی دن لگ گئے۔ جہاں جنگل صاف ہوتا تھا، وہاں دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر زمین پر چلتے تھے۔ جس جگہ جنگل گنجان اور درخت ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوتے تھے وہاں ٹارزن جین پورٹر کو اُٹھا لیتے تھے اور درختوں کے اُوپر ہی اوپر چلتے تھے۔ یہ دونوں عاشق و معشوق ایسے سفر سے اتنا لطف اُٹھا رہے تھے کہ ان کی خواہش تھی کہ ہمیشہ اسی طرح سفر کرتے رہیں۔

سمندر کے ساحل پر پہنچنے کے ایک روز پہلے ٹارزن کی ناک میں بُو آئی — حبشیوں کی، اُنہوں نے جین پورٹر کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کہا "یہاں جنگل میں دوست بہت کم ہیں"

نصف گھنٹہ کے بعد درختوں پر چھپ کر چلتے ہوئے انکی نظر حبشیوں کی ایک چھوٹی سی جماعت پر پڑی جو مغرب کی طرف جا رہی تھی۔ اس کے افراد کو دیکھتے ہی ٹارزن کے مُنہ سے مسرت کی ایک ہلکی چیخ نکلی۔ اُنہوں نے پہچان لیا کہ وہ ان کے وزیری دوست ہیں جو ان کے ساتھ اُپر گئے تھے۔ ان لوگوں میں بسولی بھی تھا۔ ٹارزن کو پہچان کر وہ خوشی سے از خود رفتہ ہو کر ناچنے کودنے، اور اُچھلنے لگے۔ ان لوگوں نے بتایا کہ وہ چند دنوں سے جنگل میں اُنہیں تلاش کر رہے ہیں۔

ٹارزن کے ساتھ ایک خوبصورت گوری عورت کو دیکھ کر انہیں بہت حیرت ہوئی اور جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ ٹارزن کی بیوی ہونے والی ہے تو وہ اس کی عزت کرنے اور اُسے آرام پہنچانے میں حتی الامکان کوئی بات اُٹھا نہ رکھنے لگے۔ خوش خوش وزیریوں کو ساتھ لئے ٹارزن اس جھونپڑے کے پاس پہنچے جسے کلیٹن اور ٹھورن نے درختوں پر بنایا تھا۔

وہاں کسی آدمی کے رہنے کا کوئی نشان نظر نہ آیا اور نہ آواز دینے پر کسی نے جواب ہی دیا۔ ٹارزن سیڑھی سے اُوپر چڑھ گئے اور تھوڑی دیر اندر رہے۔ جب باہر نکلے تو ان کے ہاتھ میں ٹین کا ایک خالی ڈبہ تھا۔ اُسے اُنہوں نے بسولی کے پاس پھینک کر اُس

میں پانی لانے کے لئے کہا اور اس کے بعد اشارہ سے جین پورٹر کو اوپر بلایا۔ دونوں ایک ساتھ جھک کر مشہور خاندانی رئیس کے استخوان و پوست کے جسم کو دیکھنے لگے جو کسی وقت تندرست اور خوبصورت تھا۔ کلیٹن کا چہرہ سوکھ کر زرد ہوگیا تھا۔ آنکھیں بے نور ہو کر حلقوں میں آگئی تھیں، گال گڈھے میں گھس گئے تھے، اور ظاہرا وہ بالکل مردہ معلوم ہوتے تھے۔ جین پورٹر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

ٹارزن نے کہا "ابھی جان ہے۔ انہیں بچانے کی پوری کوشش کیجائیگی لیکن مجھے امید کم ہے۔ ہمارے پہنچنے میں بہت دیر ہوئی!"

بسولی پانی لایا تو ٹارزن نے سوکھے اور پھٹے ہوئے ہونٹوں کو آہستہ سے ہٹا کر اور دانت کھول کر پانی کے قطرے منہ میں ٹپکائے اور جسم کو تر کر دیا۔ سر پر پانی دیتے ہی کلیٹن نے آنکھیں کھول دیں۔ جین پورٹر کو اپنے نزدیک جھکی ہوئی دیکھ کر ان کے لبوں پر ہلکی مسکراہٹ آگئی۔ ٹارزن پر جب نظر پڑی تو آنکھوں سے تعجب ظاہر ہوا۔

ٹارزن نے کہا "گھبراؤ مت دوست۔ ہم وقت پر پہنچ گئے تمہارے صحت یاب ہونے میں اب دیر نہ لگے گی"

سر ہلا کر بہت نحیف آواز میں کلیٹن نے کہا "نہیں، اب میں اچھا نہ ہونگا۔ اچھا ہونیکا وقت نکل گیا۔ خیر میرا مرنا ہی ٹھیک ہے!"

جین پورٹر نے پوچھا "مسٹر تھیورن کہاں ہیں؟"

کلیٹن نے جواب دیا "میرا بخار جب مجھے زیادہ تکلیف دینے لگا تو وہ بدمعاش مجھے تنہا چھوڑ کر جانے کے لئے تیار ہوا۔ میں نے اس سے پانی مانگا تو مجھے دینے کے بجائے وہ سارا پانی پی گیا اور جو بچا اسے اس نے زمین پر پھینک دیا۔ وہ بے رحم ہے بے رحم!"

یہ کہتے کہتے کلیٹن کو کچھ جوش آگیا اور وہ ایک گھٹنے پر اٹھ کر چلا کر بولے "نہیں، میں مرونگا نہیں، بغیر اس بے رحم سے بدلہ لئے میں اس دنیا کو چھوڑ نہیں سکتا۔" اتنا کہہ کر کلیٹن تکان کی وجہ سے بستر پر گر گئے۔ ان سے اس سے زیادہ کچھ کہا نہ گیا۔

ٹارزن نے کلیٹن کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر تشفی دیتے ہوئے کہا "تھیورن کے متعلق فکر نہ کرو۔ میں اس سے سمجھ لوں گا وہ مجھ سے بھاگ کر جا نہیں سکتا!"

بہت دیر تک کلیٹن سست اور بیہوش پڑے رہے۔ ٹارزن بار بار ان کی چھاتی سے کان لگا کر دل کی حرکت سننے کی کوشش کرتے رہے۔ شام کے قریب ان کی نیم بیہوشی پھر دور ہوئی انہوں نے اشارہ سے جین پورٹر کو نزدیک بلایا۔ جین نے نزدیک جا کر منہ کے پاس کان لگایا تو آہستہ لہجہ میں انہوں نے کہا "جین! میں نے تمہارے ساتھ بہت برائی کی ہے اور ساتھ ہی تمہارے ——— ٹارزن کے ساتھ بھی! میں تمہیں بہت پیار کرتا تھا، کرتا ہوں، کہہ نہیں سکتا۔ لیکن اس کے لئے میں نے تمہیں نقصان پہنچایا یہ مجھے نہ کرنا چاہیے تھا۔ اس کے لئے تم سے معافی بھی مانگنا نہیں چاہتا۔ میں آج صرف وہی کرنا چاہتا ہوں جسے ایک برس پہلے نامناسب تھا!"

کلیٹن نے سر کے نیچے رکھے ہوئے کوٹ کی جیب میں کانپتے ہوئے ہاتھ سے ٹٹول کر زرد کاغذ کا ایک ٹکڑہ نکالا اور اسے جین پورٹر کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس کے بعد ان کا ہاتھ ان کی چھاتی پر گر پڑا، سر لٹک گیا، آنکھیں الٹ گئیں اور ایک دفعہ کانپ کر سارا بدن ڈھیلا ہوگیا۔ ٹارزن نے ان کے منہ پر ایک کپڑا ڈال دیا۔

چند لمحے دونوں دوزانو کلیٹن کے بیجان جسم کے پاس بیٹھے رہے۔ جین پورٹر دل ہی دل میں خدا سے کچھ التجا کر رہی تھی، اور ٹارزن آنکھوں میں آنسو بھرے زمین کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انہیں بھی کلیٹن کی بیوقت موت سے بہت صدمہ پہنچا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد خود کو سنبھال کر جین پورٹر نے زرد رنگ کے کاغذ کے تہہ کیے ہوئے پرچے کو کھولا جسے کلیٹن نے دیا تھا اور اس میں لکھی ہوئی عبارت پر نظر ڈالی۔ معاً اس کی آنکھوں سے تعجب ظاہر ہونے لگا۔ اُس نے دو تین بار پڑھا تب اُس کی سمجھ میں اُس کا مطلب آیا۔ یہ لکھا تھا:۔

"انگلیوں کے نشان سے معلوم ہو گیا کہ تم گریسٹوک ہو، مبارک باد!" ڈی۔ آرنٹ

ٹارزن کو کاغذ دے کر جین پورٹر نے کہا "یہ اس بات کو بہت دنوں سے جانتے تھے، لیکن اُنہوں نے تم سے کہا نہیں!"

ٹارزن نے جواب دیا "یہ کاغذ سب سے پہلے مجھ ہی کو ملا تھا اُس وقت جب کہ ریلوے اسٹیشن پر میں ویٹنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا اور تم جا رہی تھیں۔ شاید اُسی وقت یہ میرے ہاتھ سے گر گیا اور کلیٹن نے اُٹھا لیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ کلیٹن کے ہاتھ میں پڑ گیا ہو گا!"

جین پورٹر نے کہا "اس کے باوجود بھی دریافت کرنے پر تم نے یہی کہا کہ میری ماں ایپ بندر تھی، اور باپ کون تھے میں نہیں جانتا!"

ٹارزن نے نرم لہجہ میں جواب دیا "تم سمجھتی نہیں ہو، جین! خطاب اور جائداد بغیر تمہارے میرے کسی مصرف کے نہ تھے، اگر میں اُنہیں کلیٹن سے چھین لیتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ ان کے ساتھ ہی تمہیں بھی اُن سے لے لیتا۔ یہ مجھ سے ہو نہیں سکتا تھا!"

جین پورٹر نے ٹارزن کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا "ایسی محبت کا بھی میں نے خیال نہ کیا!"

روانگی

از جناب سید مشتاق احمد صاحب کابری

سُنو جی! یہ روز کا چلتر پن مجھے ذرا نہیں بھاتا۔ اگر تمہیں رہنا ہے تو شانتی سے رہو، ورنہ چلی جاؤ۔

جی ہاں! آپ درست فرماتے ہیں۔ میں اب اسی لائق رہ گئی ہوں اس لئے کہ .... رتن کی آواز گلوگیر ہوگئی۔

اس لئے کہ .... دھرم ویر نے اس کو دُہرایا۔

اس لئے کہ اب مجھ میں آپ کے لئے کون سی دلچسپی باقی رہ گئی ہے رتن نے جواب دیا۔

اور پہلے کون سی دلچسپی تھی؟ دھرم ویر نے کرخت آواز میں کہا۔

وہ تو آپ کا دل جانتا ہوگا یا بھگوا......ن۔ رتن نے اِس آخری فقرہ کو ذرا درد میں ادا کیا۔

چلی ہے..... بھگوان۔ جب انسان ہر طرح مایوس ہو جاتا ہے تو اسی طرح زہر اُگلا کرتا ہے۔ اور ایسی ہی بہکی بہکی باتیں کرتا ہے، یہ بھُول گئی کہ میں نے ہی اس قابل بنا دیا کہ آج آنکھیں چار ہو سکتی ہیں ورنہ .... دھرم ویر رُک گیا۔

ہاں ہاں! مجھے اس سے کب انکار ہے، مگر یہ تو بتلائیے کہ مجھے آج نکالا کیوں جا رہا ہے؟

کیا رتن میں کوئی تبدیلی ہوگئی ہے؟ رتن نے بھرآئی ہوئی آواز میں کہا۔

بس بس رہنے دو! میں اس بحث مباحثہ میں پڑنا نہیں چاہتا صرف اتنا پوچھ لینا ہے کہ جاتی کب ہو؟ دھرم ویر نے زوردار لہجہ میں کہا۔

اب تو کوئی تاریخ مقرر ہی کرنی ہوگی۔ شیشہ میں بال آچکا ہے جس دن یہ بالکل چکنا چُور ہو جائے گا، اُسی روز چلی جاؤنگی۔ رتن نے پُرنم آنکھوں سے جواب دیا۔

(۲)

رتن اور دھرم ویر دونوں ایک ہی قصبہ میں رہتے تھے۔ ابتدائی ماحول جداگانہ ہونے کے باوجود بھی دونوں میں کافی پریم تھا۔ رتن معمولی پڑھی لکھی قبول صورت لڑکی تھی، اور دھرم ویر بھی تعلیم یافتہ بیدار مغز نوجوان تھا۔ کسی نہ کسی طرح دونوں کے تعلقات بہت گہرے ہو چکے تھے۔ دونوں کے والدین کی مرضی کے خلاف یہ محبت کی بندھن باندھی گئی تھی۔ روک تھام کے عرصہ میں دھرم ویر کو اتنا وقت مل گیا تھا کہ وہ پھُول کی خوشبو سونگھ کر سیر ہو چکا تھا۔ رتن بہ حالت مجبوری اُس کے یہاں ماما کی حیثیت سے کام کرتی تھی۔ گرچہ دھرم ویر کو اُس کا اس طرح رہنا برداشت نہیں ہوتا تھا۔ مگر سماج سے اس درجہ تنگ آچکا تھا کہ وہ اب رتن کو نکال دینے پر بھی آمادہ تھا۔ گو دل سے وہ ہرگز ایسا نہیں چاہتا تھا کہ رتن کو ایک لمحہ کے لئے بھی جُدا کرے۔ مگر ماں باپ کی دلی خواہش تھی کہ رتن کا کانٹا کسی طرح نکال پھینکا جائے۔ آخر کوئی ترکیب لگتی نہ دیکھ کر اُنہوں نے ایک ایسا الزام رتن پر لگایا جس نے دھرم ویر کی محبت کے زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا۔ تاہم دھرم ویر رتن کو دیکھ لینے کا آرزومند ضرور رہتا تھا اور یہ آئے دن کی نوک جھونک ماں باپ کی مرضی کے مطابق تھی۔

(۳)

اسٹمر آج بھی حسب معمول آنیوالی تھی۔ اس کے لئے وقت کا

کوئی تعین نہ تھا۔ کبھی دن میں اور کبھی رات میں آجاتی تھی۔ مسافروں کی آگاہی کے لئے وہ دُور ہی سے سیٹی دیا کرتی تھی۔ آج کی سیٹی نے رتن کا نہ جانے کیوں دل ہلا دیا، وہ ایسا محسوس کر رہی تھی۔ جیسے کوئی اُس کی رُوح قبض کرنے آرہا ہے۔ درو دیوار پر حسرت سی دیکھنے لگی۔ خصوصاً اُن چیتھڑوں کی گٹھڑی کو دیکھ کر جس کو اُس نے دن ہی سے سمیٹ رکھا تھا۔ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی، مگر آہ! نصف شب میں جب کہ سارے عالم کے ساتھ ساتھ گھر والے بھی محوِ خواب تھے، اِن آنسوؤں کو دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ سامنے دھرم ویر بھی خراٹے لے رہا تھا۔ اُسے کیا خبر تھی کہ آج اُس کی محبوبہ ایک خطرناک اقدام کے لئے تیار ہو چکی ہے۔ ماں باپ دن ہی میں رتن کی تیاری کو تاڑ چکے تھے مگر وہ دل ہی دل میں خوش ہو کر خاموش رہ گئے تھے۔ سیٹی کی آواز اب قریب تر ہوتی جاتی تھی۔ رتن اپنی جگہ سے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اُٹھی اور دھرم ویر کے پاس گئی، ہزاروں حسرت و ارمان لئے خاموش کھڑی رہی، اُس کا دل چاہا کہ آخر مرتبہ دھرم ویر کے گلے سے حائل ہو جائے، مگر مصلحتِ وقت نے اس کی بھی اجازت نہ دی۔ مایوسی کے عالم میں پھر اپنی جگہ پر آبیٹھی۔ حسرت و ارمان، غم و غصہ کے تھپیڑوں میں بہتی چلی جا رہی تھی۔ سیٹی اب بہت زور سے سُنائی دینے لگی۔ رتن نے اپنا دل مضبوط کیا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے دھرم ویر کے پاس پھر آئی۔ آخری نگاہوں سے جی بھر کے دیکھا، دل ہی دل میں بلائیں لیں۔ تقصیرات کی معافی چاہی، اور ایک پُرزہ جو اُس نے دن ہی سے لکھ رکھا تھا تکیہ کے نیچے رکھ کر چل کھڑی ہوئی۔ اسٹیمر اب اپنے اسٹیشن پر آچکی تھی۔ رتن چاہتی تھی کہ تیز تیز قدموں سے جلد پہونچ جائے مگر پاؤں اٹھائے نہ اُٹھتے تھے۔ تیز چلنے کی کوشش میں دو مرتبہ گر گر گئی۔ سنبھلی اور پھر چلی۔ اس تماشہ کو دیکھنے والا صرف خدا تھا یا رتن کا مجروح دل۔ برسات کی رات گھٹا ٹوپ اندھیری تھی، اور وہ ایک مضبوط ارادہ کے ماتحت اندھا دھند چلی جا رہی تھی۔ آخر گرتے پڑتے اُس نے آدھ میل کی مسافت طے کر لی اور اسٹیمر تک پہونچ گئی۔ کپتان نے اسٹیمر کھول دی اور رتن کو دھرم ویر سے ہمیشہ کیلئے جدا کر دیا۔

(۴)

دھرم ویر آج کچھ دیر سے اُٹھا اس لئے کہ معمول کے مطابق رتن ہی اُس کو اُٹھایا کرتی تھی آفتاب سارے جہان کو منور کر چکا تھا۔ ہر شخص اپنے کام میں منہمک تھا۔ دنیاوی دلچسپیوں میں کوئی کمی نہ تھی، دھرم ویر کو کچھ کسک ضرور معلوم ہوئی کہ آج رتن نے اُس کو یوں ہی کیوں چھوڑ دیا۔ ناشتہ کا وقت بھی چلا گیا۔ رتن پر نظر نہ پڑی۔ پھر بھی دھرم ویر خاموش رہا۔ کھانے کا وقت آیا، رتن اُس وقت بھی نہ تھی، کچھ زیادہ مشکوک ہوا۔ باوجود بھی ماں باپ سے کچھ استفسار کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ کھانے کے کافی دیر بعد اُس نے ماں سے پُوچھا۔

اماں! آج رتن کو نہیں دیکھ رہا ہوں۔

بیٹا! اُس کی فکر ہی کیا ہے، کہیں گئی ہوگی! ماں نے جواب دیا

دھرم ویر اس کے بعد کچھ نہ پُوچھ سکا۔ سہ پہر ہونے کو آیا، وہ گھر سے نکلا، اور رتن کی پوشیدہ طریقہ پر تمام جستجو لگائی، مگر کہیں سُراغ نہ ملا۔ رات ہو گئی تھی، کمہلائے ہوئے پھُول کی مانند گھر لوٹا۔ دماغ ٹھکانے تھا نہ دل۔ بادِل ناخواستہ کچھ کھا پی کر خوابگاہ کو چلا گیا۔ نیم بسمل چارپائی پر تڑپتا رہا۔ طرح طرح کے خیالات سے دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ اسی عالم بے چینی میں رتن کا وہ پُرزہ مِل گیا۔ جس پر لکھا تھا:۔

اب تم ہی مٹاتے ہو دنیا سے وفاؤں کو تم ہی نے سِکھائے تھے آئینِ وفا

تمہاری رتن

دھرم ویر کے ہاتھ سے پرزہ گر گیا۔ اُس کے دل پر ایک ایسی چوٹ لگی کہ کچھ دیر کے لئے وہ بالکل مخبوط ہو گیا۔

تیسرے روز جب وہ برآمدہ میں خاموش بیٹھا تھا کہ سی اسٹیمر کے کپتان کے ملازم نے ایک خط لاکر دیا۔ دھرم ویر نے دھڑکتے ہوئے دل سے اُس کو کھولا اور پڑھنے لگا!

"پیارے دھرم ویر! سلامت رہو!

ممکن ہے تم میرے متعلق غلط فہمی میں رہ جاؤ، اس لئے میں نے مناسب جانا کہ جہاز کی واپسی پر اس خط کے ذریعہ تمہیں میں اپنے متعلق آگاہ کردوں۔ باور کرو کہ مجھ پر جو کچھ الزام لگائے گئے ہیں سراسر بے بنیاد ہیں۔ میں جیسی پاک صاف تھی ویسے ہی آج بھی ہوں، اور ویسے ہی مرو نگی! ہاں، ایک گناہ میں نے ضرور کیا ہے اور وہ تمہاری محبت! مجھے تم اس گناہ کے لئے معاف کردینا۔

"تمہاری داسی رتن"

ملازم نے خط دے کر چلتے چلتے یہ بھی کہدیا کہ حضور کپتان صاحب کو یہ خط دے کر وہ عورت پانی میں کود کر مرگئی۔ جہاز کے سب مسافر بڑی حسرت سے یہ تماشا دیکھتے رہے۔

(۵)

آج دھرم ویر کو گھر چھوٹے ہوئے چھ برس ہوچکے ہیں ماں باپ بیٹے کی تلاش میں اندھے ہوگئے۔ مگر ابتک پتہ نہ ملا کہ دھرم ویر کہاں گیا۔ گمان ہے

آئینہ

از جناب مجتبیٰ احمد صاحب

پیاری اُوشا

یہ خط تمہیں شاید اسوقت ملے جب میری شمع حیات ہمیشہ کے لئے گل ہو جائے اور دنیا ہمیشہ کے لئے میری نامراد ہستی کو صفحہ عالم سے مٹا دے۔ کارواں حیات منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی بھٹک گیا اور اب سامنے موت ۔۔۔ بھیانک موت ۔ کھڑی ہے ۔

کون جانتا ہے کہ میرے حال پر کوئی دو آنسو بھی گرا سکیگا۔ زندگی کا ناٹک کھیلا جا چکا اور اب ایک سین باقی ہے ۔۔۔ پردہ گرا اور ختم ۔

تم اس کہانی کے سننے کی اسقدر شایق کیوں ہو ۔ تم شائد اسے دلچسپ سمجھ رہی ہو لیکن ٹوٹے ہوئے تاروں سے میٹھے سر نہیں نکلتے ۔

یہ کہانی نہیں حقیقت ہے ۔ آئینہ ہے ہمارے جذبات کا ۔ ترجمان ہے حرماں زندگی کا اور روشن حقیقت ہے سوسائٹی اور سماج کے حالات کا ۔ لیکن اوشا ! میں جانتی ہوں کہ اسکی حقیقت افسانہ سے زیادہ نہیں تم خود اسے پڑھکر بھول جاؤ گی ۔ اور بھول بھی جانا چاہیئے تاکہ دنیا میں میرے غم میں شریک ہونے والا کوئی نہ رہے ۔۔۔ خیر سنو !

بچپن کے ساتھ معصومیت بھی رخصت ہو گئی اور شباب اپنی دلفریبیوں کے ساتھ آ پہنچا ۔ ہندوستانی رسم و رواج کے مطابق میں قیصر کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک کر دی گئی ۔ اس واقعہ کو میرے ارادہ سے اتنا ہی تعلق تھا جتنا پانی کو بہاؤ سے ۔ قیصر گورنمنٹ کالج میں نفسیات کے پروفیسر تھے ۔ ان کا دل ہیرے کی طرح شفاف اور شبنم کی طرح پاک تھا ۔ وہ شادی کو ایک مقدس مذہبی معاہدہ سمجھتے تھے ۔ نفسانی خواہشات کا ذریعہ نہیں شمع اور پروانہ کی محبت میرے خیال میں شاعرانہ پیداوار تھی لیکن قیصر کی محبت نے اسے سچا کر دکھایا لیکن میں ہندوستانی عورت ٹھہری جسکے نزدیک محبت کا اعتراف سکون اور خاموشی ہے

شادی کے چند ہی مہینے کے بعد انہوں نے اپنی معرکتہ الآرا کتاب "نفسیات اور محبت" مکمل کر لی جس نے انکی شہرت میں چار چاند لگا دئے یہ کتاب انکے دل کی کیفیتوں پر پوری طرح روشنی ڈالتی ہے اس کے دیباچہ میں لکھا تھا ۔

" یہ کتاب شاعرانہ اور فلسفیانہ حقائق پر مبنی نہیں اور نہ صرف فردوسی حوریں اسے پا سکتی ہیں بلکہ ۔۔۔ اس جنت ارضی میں بھی جسکا وجود شاعروں کے نزدیک مصیبت کا باعث ہے سچی محبت موجود ہے لیکن اسکے لئے ضرورت ہے نگہ بے نیاز اور شفاف دل کی "

آگے چل کر لکھتے ہیں " حوریں بہشت ہی میں نہیں رہتیں بلکہ ہمارے شفاف دل اور بلند تخیل میں بھی ان کا وجود ہے چنانچہ میں اس کتاب کو ایک ایسی ہی ارضی حور کے نام منسوب کرتا ہوں جسکی محبت اور صداقت اسکی تصنیف کا باعث ہوئی "

اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد متعدد یونیورسٹیوں نے انہیں لیکچر کی دعوت دی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ انکی شہرت ہندوستان کی سرحد کو عبور کر کے سمندر کے اس پار جا پہنچی اور آکسفورڈ یونیورسٹی نے بھی لیکچروں کی دعوت دی جس کا موضوع

علامہ شبلی نعمانی علیہ رحمہ

کے

دو غیر مطبوعہ خطوط

بنام

جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب ام۔اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی سابق وزیر تعلیم صوبہ بہار

مخدومی —

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

شبلی — لکھنؤ —

[illegible] ۱۹۱۲ء

عنایت فرمایم السلام علیکم

عنایت نامہ پہنچا۔ سفرنامہ کا اگر علٰحدہ چھپے لیکن بہ خط جلی چھپے

اصلی دوبارہ چھپوا رہا ہوں، تاہم کاربراری کے لیے بلحاظ اڈیشن کا

ایک نسخہ ارسال ہے۔

میں خود چاہتا ہوں کہ اسکا انگریزی ترجمہ شائع کیا جائے کیونکہ اصل خطاب

انگریزوں ہی یا ہندوؤں سے ہے۔

الفاروق وغیرہ ارسال خدمت ہیں، آپ کی کام کی چیز دو نسخے

رسائل شبلی اور کتب خانہ اسکندریہ و الجزیہ میں لیکن

[illegible] دونوں سرحد [illegible] بھیجے

آپ ڈیوٹی شاپ سے علم سے طلب کیجئے

آپ جن مضامین پر لکھنا چاہتے ہیں انکی کتب ذیل ملاحظہ ہوں

اسلام کی دنیوی برکتیں از مولوی چراغ علی (از ڈیوٹی شاپ) پروفیسر لیبان کی کتاب

تمدن عرب — پروفیسر سیدیو (فرنچ میں) کی کتاب تاریخ اسلام بجز

پروفیسر [illegible] کی کتاب فلسفہ یہود و اسلام پر فرنچ زبان میں

"ہندوستان پر اسلام کا اثر" اسکی نسبت میرے دو مضمون الندوہ میں چھپے ہیں

لیکن وہ پرچے نہیں رہے جس وقت دستیاب ہوں تو بھیجوں گا [illegible] سال ندوہ

آپ اس کام کو [illegible] اور اسلام کی خدمت کر سکتے ہیں

شبلی

۱۴ مارچ ۱۹۱۰ء

تلخیص و تبصرہ

شہزادی گورآما

از جناب ربط ہاشمی، فاضل ادب

اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط میں ایک چھوٹی سی ریاست جنوبی ہند میں واقع تھی۔ وہاں کے لوگ اسے "کوڈاگا" کہتے تھے لیکن تاریخ میں وہ کرگ کے نام سے موسوم ہے۔ میسور کا حکمران اس وقت حیدر علی تھا۔ میسور کے بغل ہی میں ریاست کرگ واقع تھی۔ اس ریاست کو ہمیشہ حیدر علی کا خدشہ لگا رہتا تھا۔ چنانچہ ایک بار یہ تباہ ہوتے ہوتے رہ گئی۔

انیسویں صدی کے آغاز میں ویرا راجہ تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنے حدود سلطنت میں ہر ایک کے داخلہ کو بند کر دیا۔ اس کے دماغ میں ایک خیال گذرا کہ جس طرح بھی ہو سکے۔ بنگلور پر قابض ہو جائے۔ چنانچہ اپنے ساتھیوں کو اس بات پر آمادہ کیا۔ ناعاقبت اندیش مشیرکاروں نے حملہ کا مشورہ دیا۔ بنگلور پر اس نے حملہ کر دیا۔ اس کا حملہ بے سود ثابت ہوا اور وہ ناکام واپس گیا۔

ناکامی نے اس کے دماغ میں فتور پیدا کر دیا۔ اس نے شاہی خاندان کے تمام آدمیوں کو قتل کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اس نے چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کو بھی نہ چھوڑا۔ اکثر وہ اپنے ہاتھوں اپنے خاندان کے افراد کو تہ تیغ کر دیتا۔ اس کے کمر میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی ہتھیار ضرور ہوتا۔ ہمیشہ وہ موقع کا منتظر رہتا۔ جب کبھی بھی موقع ملتا وہ ان کا کام تمام کر دیتا۔ اس طرح اس نے ایک ایک کو چن چن کر خاتمہ کر دیا۔

آخر ش برٹش گورنمنٹ نے مداخلت کی۔ راجہ کو پہلے طرح طرح سے سمجھایا گیا کہ وہ ان حرکتوں سے باز آجائے۔ تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ گورنمنٹ برطانیہ کے حدود مملکت میں شامل کر لیا گیا۔ چونکہ کرگ کا کوئی دوسرا وارث مرد کی جنس کا باقی نہ رہا تھا۔ "میرا کا" سے جو کرگ کا دارالسلطنت تھا سترہ لاشیں نکلیں جو ایک غار میں ڈال دی گئی تھیں۔

گو ویرا راجہ اپنے پورے خاندان کا قاتل تھا۔ پھر بھی سرکار انگلشیہ نے اپنے مفاد کا خیال کرتے ہوئے اسے معاف کر دیا۔ قتل کی یاداشت یہ مقرر ہوئی کہ راجہ اپنی سلطنت کے حدود سے ہمیشہ کے لئے باہر چلا جائے۔ اور کبھی سلطنت کی خواہش نہ کرے۔ مرتا کیا نہ کرتا راجہ نے اپنی لڑکی گورآما کے ساتھ کرگ کو ہمیشہ کے لئے الوداع کہا۔ گورآما بڑی حسین اور دانشمند لڑکی تھی۔ راجہ اسے دل و جان سے چاہتا تھا۔ سلطنت کے جانے کا غم بہت بڑا غم تھا۔ راجہ کے اندوہ و ملال کی حد نہ تھی، کیونکہ اپنی آبائی ریاست سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا جانا۔ جلاوطنی کی زندگی پر مجبور کیا جانا یہ کوئی معمولی مصائب نہ تھے۔ یکایک اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اور اس کی آنکھیں بعد از وقت کھلیں جب کہ مرض مزمن ہو چکا تھا۔ اور اس کا کوئی علاج نہ تھا۔ دل مسوس کر رہ گیا۔

جلاوطن راجہ اپنی اکلوتی بیٹی کے ساتھ پہلے پہل "ویلور" میں اقامت گزیں ہوا۔ پھر بنارس میں رہنے لگا لیکن اب ہندوستان

میں رہنے سے اس کا دل دکھتا تھا اور اس کو یہاں کا رہنا نہ بھاتا تھا۔ آخر کار اس نے سنہ ۱۸۵۲ء میں سرکار سے انگلستان جانیکی اجازت طلب کی۔ اس نے سرکار کو لکھ دیا کہ وہ اب وہیں ہمیشہ کے لئے بس جانا چاہتا تھا، اجازت ملنے کے بعد راجہ اپنی لڑکی کے ساتھ ہندوستان سے ہمیشہ کے لئے چلا گیا۔

راجہ جیسے ہی انگلستان پہونچا ویسے ہی ملکہ وکٹوریہ سے ملاقات ہوئی، ملکہ گورآما کو دیکھ کر اس کی گرویدہ ہوگئی۔ ملکہ نے فوراً اس کے دیکھ بھال کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ گورآما اس وقت کمسن تھی۔ راجہ کی بھی خوب خوب خاطر و مدارات ہوئی۔ راجہ نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا۔ ملکہ نے گورآما کا نام اپنے ہی نام پر وکٹوریہ رکھا۔

اس کے بعد گورآما یعنی وکٹوریہ لیڈی لوجن کے سپرد کی گئی جو لندن کی عورتوں کی سوسائٹی میں کافی رسوخ رکھتی تھی۔ لیڈی لوجن نے وکٹوریہ کی اچھی طرح نگرانی و نگہداشت کی اور اس کا تعارف تمام انگریزی سوسائٹیوں میں کرا دیا۔ تھوڑی مدت بعد گورآما یعنی وکٹوریہ کی بڑے بڑے لوگوں سے شناسائی ہوگئی۔

سنہ ۱۸۵۹ء تک وکٹوریہ جوان ہوگئی۔ جوانی نے اس کے حسن میں چار چاند لگا دیا اور اس میں کافی دلکشی پیدا ہوگئی۔ اسی زمانہ میں لیڈی لوجن کا بھائی کلونل کیمبل پینشن لیکر لندن پہونچا۔ وہ مدراس کے فوج میں ایک اعلیٰ عہدہ پر ممتاز تھا۔ وکٹوریہ اور کیمبل میں محبت ہوگئی۔ مختصر کورٹ شپ کے بعد وکٹوریہ کی شادی سنہ ۱۸۶۰ء میں کیمبل کے ساتھ ہوگئی۔

شادی کے بعد وکٹوریہ بڑی عیش و عشرت کی زندگی گذارنے لگی، دونوں میں بڑی محبت تھی۔ ویرا راجہ بھی اپنی لڑکی ہی کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ لیکن تین سال کے بعد ہی اس کا انتقال سنہ ۱۸۶۳ء میں ہوگیا۔ وہ کنسل گرین سمیٹری میں مدفون ہوا۔ باپ کی موت کے بعد وکٹوریہ زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہی۔ ایک سال بعد وکٹوریہ کو ایک لڑکی پیدا ہوئی اور اس کے بعد ہی اس کا انتقال ہوگیا۔

کیمبل نے اپنی محبوب بیوی کی جدائی کو بڑی بہادری و جوانمردی سے برداشت کیا۔ وہ تین سال تک لندن میں مقیم رہا۔ اس کے بعد سنہ ۱۸۶۷ء میں ایک صبح کو اپنی بیوی کے تمام شاہی جواہرات کو ایک ہینڈ بیگ میں رکھ کر وہ گھر سے نکلا۔ لوگوں نے اسے ہینڈ بیگ کے ساتھ جاتے دیکھا۔ لیکن بعد کو پھر اس کا پتہ نہ چلا۔ پولیس نے بڑی سرگرمی سے تفتیش و تلاش کی مگر ناکام رہی۔ ہنوز یہ معمہ حل نہ ہو سکا کہ کیمبل خود کہیں روپوش ہوگیا، یا کسی نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ بہر نوع کرگ کی شاہی جواہرات ہمیشہ کیلئے لاپتہ ہوگئے۔

ادبیات

تنزیہات

از حضرت مولانا آزاد سبحانی ربانی

مولانا آزاد سبحانی نے اپنے ابھی حال کے سفر بہار میں یہ غزل لکھی ہے جبکہ وہ مسلم لیگ کے اجلاس بہار میں صدارت کیلئے تشریف لائے تھے۔ موصوف نے یہ غزل ندیم میں اشاعت کیلئے عنایت کی شکریہ پیش ہے۔ یہ امر ذہن نشین رہے کہ موصوف فلسفہ الہیات میں اعلیٰ بصیرت رکھتے ہیں۔
ندیم

جو کچھ دیکھا سنا تھا ما سوا تھا
غلط سمجھے کہ خود وہ دلربا تھا

کہاں اسکی تجلی اور آنکھیں
جو چمکا سامنے وہ شعبدہ تھا

نہ تھا خود حسن آتشناک تاباں
کوئی شعلہ بھڑکتا آ گیا تھا

مہ انور پہ دھوکا کھا گیا فہم
کہ اس کسوت میں خود وہ مہ لقا تھا

گل مقصود کی تصویر تھا صرف
وہ غنچہ جو گلستاں میں کھلا تھا

کہاں وہ جسم نازک تر ز ہر شئے
مرے ہاتھوں میں دامانِ قبا تھا

سمجھتے تھے جسے آوازِ منزل!
وہ رستے کا فقط بانگِ درا تھا

کہاں تھا نور غیب الغیب روشن
فقط اک پرتوِ جلوہ فزا تھا

ادائیں اسکی تھیں تابان و رقصاں
گماں سمجھا کہ خود وہ خوش ادا تھا

سر پرواز تھا اس لامکاں تک
بہت نا فہم اپنا حوصلہ تھا

نہ تھی ممکن ہی جب اس تک رسائی
شکایت کیا جو جذبہ نارسا تھا

نہ ہوتی لاگ اس بے مدعا سے
بحمد اللہ کہ دل بے مدعا تھا

نہ کچھ ہاتھ آیا سبحانی بجز وہم
اگرچہ جلووں سے عالم بھرا تھا

تأثراتِ جدیدہ

از حضرت عبدالباری آسی لکھنوی

احباب کے رنج پر خوشی کرتے ہیں　　گاہ و بیگاہ شغل بھی کرتے ہیں
ایذا دہیں پھر بھی کافروں پر جاری　　کافر بھی جناب من یہی کرتے ہیں

ماضی پہ میں جب نگاہ کر لیتا ہوں　　حالت غم سے تباہ کر لیتا ہوں
کچھ اور تو دسترس نہیں ہے لیکن　　ہر سانس پہ ایک آہ کر لیتا ہوں

اس خوف کو دل سے جدا نہیں کر سکتا　　حسب منشا خطا نہیں کر سکتا
مرنے کا لگا ہوا ہے دھڑکا یعنی　　زندہ ہیں تو کچھ خدا نہیں کر سکتا

کس بات پہ آپ اتنے محمول ہوئے　　کیوں عید کی سرخوشی میں مشغول ہوئے
روزے تو ضرور رکھ لئے ہیں لیکن　　کچھ یہ بھی خبر سنی کہ مقبول ہوئے

کس واسطے رات دن مصیبت جھیلیں　　اُٹھ بادۂ ناب جامِ مے سے کھیلیں
اس میں بھی سرور تو کہاں ہے لیکن　　اتنا ہے کہ زندگی کو دھوکا دے لیں

گلزارِ خلیل

از حضرت خلیل بگوسرائی

گل نہیں، سبزہ نہیں، خوشبو نہیں، چادر نہیں — خاکِ تربت کے سوا کچھ خاکِ تربت پر نہیں
مانعِ گردش حیا ہے اون کی چشمِ مست کو — مے تو ہے ساغر میں، لیکن دور میں ساغر نہیں
پرتوِ خورشیدِ حسرت نے دکھایا یہ اثر — دامنِ تر کا گماں اب دامنِ تر پر نہیں
آج دیکھیں کس طرح کرتے ہیں آپ انکارِ قتل — آپ کا خنجر نہیں ہے یا ہمارا سر نہیں
طور کے جلوے کا اب تک بھی نمایاں ہے اثر — جو نہ ہو آتش بدل ایسا کوئی پتھر نہیں
کیوں بنے تصویر آئینے میں صورت دیکھ کر — تم تو کہتے تھے یہی، میرا کوئی ہمسر نہیں
کس طرح برسات اب کے سال گزرے گی خلیل — مے نہیں، ساقی نہیں، شیشہ نہیں، ساغر نہیں

نگارخانۂ تصورات

از جناب سید عزیز الحق صاحب عزیز عظیم آبادی

ظہورِ جلوۂ حسن و جمال ہو جائے — کبھی ہماری طرف بھی خیال ہو جائے
تصورات کے جلوے اگر نہ ہوں دلکش — تو ایک دم کا بھی جینا محال ہو جائے
ملیں نہ وہ تو ملے موت کا پیام مجھے — نہ ہو جو وصل میسر وصال ہو جائے
کبھی تو چہرۂ پر نور سے نقاب اُٹھے — کبھی تو خاطرِ حسن سوال ہو جائے
سنے جو کوئی فسانہ مری شبِ غم کا — عذابِ حشر بھی خواب و خیال ہو جائے
وہ زہر بھی مجھے دیدیں جو اپنے ہاتھوں سے — حرام موت بھی مجکو حلال ہو جائے

ترے کرم سے نہیں اے کریم کچھ یہ بعید
عزیزِ خستہ جگر باکمال ہو جائے

فردوسِ خیال

از جناب بدرالدین صاحب کاملؔ عزیزی بہار شریف

ہم اپنا قصہ کہہ کر رو رہے ہیں — جو سننے والے تھے وہ سو رہے ہیں
مزے کی نیند ہم تو سو رہے ہیں — وہ کیوں مرقد پہ آکر رو رہے ہیں
بچھایا جنکی خاطر پھول میں نے — وہ میرے حق میں کانٹے بو رہے ہیں
مئے صافی ہے اب تو شیخ صاحب — ریاکاری کے دھبے دھو رہے ہیں
کریں تلقین ترکِ مئے نہ واعظ — کہ خود آلودہ دامن ہو رہے ہیں
چلی ہے ان دنوں وہ صرصرِ یاس — چراغِ آرزو گل ہو رہے ہیں
دمِ آخر بھی وہ آئے نہ کاملؔ! — ہم آخر آج رخصت ہو رہے ہیں

میرے لئے

از جناب سید شاہ محمود ضمیر الحق صاحب ضمیرؔ عمادی

اور اگر کچھ بھی نہیں ہے اے خدا میرے لئے — وقف کردے اک دلِ بے مدعا میرے لئے
بن گئی ہے زیست پیغامِ قضا میرے لئے — ابتدا ہی ہوگئی ہے انتہا میرے لئے
ہائے توبہ میں نے کیوں کی تھی بھری برسات میں — رات دن بیچین پھرتی ہے گھٹا میرے لئے
کس نے دامن سے ہوا دی تھی بوقتِ بیخودی؟ — ہوگئی ناسازِ دنیا کی ہوا میرے لئے
مجھکو طوفانِ حوادث کا نہیں غم اے ضمیرؔ — بھیجدے گا ناخدا کوئی خدا میرے لئے

آہ

از جناب نظرؔ عمادی عظیم آبادی

خیال و خواب کے عالم میں آنے والے آ — تخیلات کی دنیا بسانے والے آ
متاعِ صبر و خرد لے گئیں تری آنکھیں — حواس و ہوش کو میرے چرانے والے آ
پھر اپنے صبحِ مسرت کی ہو رہی ہے شام — کدھر ہے اے مری بگڑی بنانے والے آ
قسم ہے تجکو تری کفر ساز آنکھوں کی — خدا کے بندوں کو کافر بنانے والے آ
بھٹک رہا ہے نظرؔ وادیٔ محبت میں — ہجومِ یاس میں رستہ دکھانے والے آ

نوائے نجم

از جناب نجم کاکوی

جلائے جاتے ہیں مجھکو مٹائے جاتے ہیں ستم تو یہ ہے کہ وہ مسکرائے جاتے ہیں
فسانۂ غمِ ہستی سنائیں کیا ہمدم بنائے جاتے ہیں ہم اور مٹائے جاتے ہیں
پلائی ہے ہمیں ساقی نے اسقدر شب بھر خمار آنکھوں میں ہے ڈگمگائے جاتے ہیں
کوئی سنے نہ سنے داستانِ دل اپنی ہم اپنے آپکو ہر دم سنائے جاتے ہیں
سنا رہا ہوں جو اُن سے نجم ماجرائے فراق نگہ وہ نیچی کئے مسکرائے جاتے ہیں

رقیبوں سے حضرت جو مل جائے فرصت

از جناب اختر قادری بلیاروی ام۔ اے

دکھا کر مرے دل کو کیا پائیے گا رہے یاد! اک روز پچھتائیے گا
رقیبوں سے حضرت جو مل جائے فرصت مری قبر پر بھی چلے آئیے گا
ہے بازارِ الفت میں نایاب یہ شئے نہ ڈھونڈنے سے جنسِ وفا پائیے گا
ستانا ہی اور بیکسوں کو ستانا! زمانے میں بدنام ہو جائیے گا
تمنائے دیدار ہے حضرت دل! مگر تابِ نظارہ کیا لائیے گا

انکار

از جناب سید ابراہیم حسین صاحب برقؔ

جسکو سودائے زلفِ یار نہیں ہے وہ دیوانہ ہوشیار نہیں
دل نہ جا خط و خالِ دنیا پر حسنِ ظاہر کا اعتبار نہیں
کس سے اُولجھے گا آکے دستِ جنوں اب گریباں میں ایک تار نہیں
زندگانی پہ ساری امیدیں زندگانی کا اعتبار نہیں

کچھ نہیں لطفِ زندگی اے برقؔ
جبکہ پہلو میں گل عذار نہیں

”ترانۂ جوگی“

از جناب جوگندر پرشاد سروا ستو جوگی

مرا دل تجھے دلربا جانتا ہے — خدا جانے تو مجھ کو کیا جانتا ہے
جو جائے بھی قاصد تو کس سمت جائے — کوئی اس کے گھر کا پتہ جانتا ہے
جفا انکی خصلت سہی، پر مرا دل — وفا کے سوا اور کیا جانتا ہے
برا آپ نے بھی جو سمجھا تو کیا غم — مجھے تو زمانہ برا جانتا ہے
کسی در پہ جوگی ہے دھونی رمائے — کوئی اپنے در کا گدا جانتا ہے

افکار کمالی

از جناب ابوالفرح سید محمد انوارالحق صبا حسینی کمالی

پوشیدہ دشمنوں میں شب بزم مل رہی ہے — اب صبح ہو رہی ہے سب بات کھل رہی ہے
محفل کا سب تجمل سوز و گداز سے ہے — پروانے جل رہے ہیں اور شمع گھل رہی ہے
زینت فروشیوں پر لو آ گئیں بہاریں — جنس تجلی گل کانٹوں میں تل رہی ہے
مقتل میں ہو رہی ہے پڑتال حوصلوں کی — کچھ تپ رہی ہے گردن کچھ تیغ تل رہی ہے
ہم پرسش جزا سے بیخوف ہیں کمالی — تا زیست ہم کو حب شاہ رسل رہی ہے

کلام ہنر

از جناب ہنر استھانوی

نہ بن آئے فلا طون زماں سے — اگر بالا پڑے جور بتاں سے
اٹھیں گے آن پر سارے جہاں سے — نہیں ہم دبنے والے آسماں سے
اے ظالم ترے ہوتے غضب ہے — ستم کی آرزو اور آسماں سے
شباب آتے ہی تم کیا سے ہوئے کیا — ملی یہ حسن کی دولت کہاں سے

وہ کہتے تھے ہنر مجھ سے نہ بولو
سنا تھا میں نے یہ انکی زباں سے

بیر بتیاوی

از مولوی ابونعیم سیّد محمد عبدالحکیم صاحب ارمان ہاشمی

جناب مہابیر صاحب بیر مرحوم بتیاوی ایک غریب پسر کمہار تھے، خاندانی پیشہ ان کا ذریعۂ معاش تھا۔ گرچہ ان کے باپ جاہل تھے مگر اُردو
سے انہیں سچی محبت تھی، اسلئے انہوں نے ہندی و دیگر علوم کے بجائے اپنے ہونہار لخت جگر کو اُردو فارسی کی تعلیم دلا کر اپنی محبت کا مکمل
پیش کر دیا۔ خداداد ذہانت، فطری طباعی کے باعث نہایت ہی قلیل عرصہ میں ان دونوں زبانوں کے اندر پوری دستگاہ اور کافی مہارت
کر لی، بعدہٗ عربی پڑھنا شروع کی مگر افسوس اپنے والد کی بے وقت رحلت اور زمانہ کی نامساعدت کے باعث انہیں عربی نصاب کی تکمیل کر نیکا
نہ مل سکا۔ اور مجبوراً سلسلۂ تعلیم منقطع کر کے آبائی پیشہ اختیار کر لینا پڑا۔

طالب علمی کے زمانہ ہی سے جناب موصوف کی طبیعت شعر و سخن کی طرف مائل تھی۔ اسلئے علمی مشغلہ سے علٰحدہ ہو جانے کے بعد بھی اوقات صرف
شعر و سخن کہکر دل بہلایا کرتے، چنانچہ بہت ہی کم مدت میں اپنی زود گوئی کے باعث فارسی و اردو کے دو دیوان مرتب کر لئے۔ لیکن غربت
کے باعث انہیں شایع کرنے سے مجبور رہے۔ بتیا کی شاعری کی تاریخ میں آپ کو درجۂ اولیت حاصل ہے، بتیا جیسی زمین شور میں ایک
کمہار کے گھر اردو فارسی کا سنبل پیدا ہونا، ان زبانوں کے محبوب و ہردلعزیز ہونے کا بین ثبوت اور کھلی ہوئی دلیل ہے، ان کی عمر نے وفا نہ کی،
۱۵ برس قبل تیس برس کی عمر میں وہ راہیِ ملکِ عدم ہو گئے۔ چونکہ ارکانِ اسلام کے پابند تھے، قرآنِ پاک کی بلاناغہ تلاوت کرتے تھے۔
ان کی لاش کے لئے ہندو مسلمانوں میں نزاع ہو گئی، حقیقت آگاہ مسلمان انہیں مسلمان سمجھتے تھے، اور ہندو پسر ہونے کی وجہ سے عوام
ہندو تصور کئے گئے، بالآخر ان کی لاش سپرد گنگا ہوئی، ہمیں صد حسرت و افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان کی اولاد نے ان کے
قدر نہ کی اور چند اہل ذوق حضرات کے دست برد سے ان کے دونوں دیوان منتشر اور پراگندہ ہو گئے۔ خوش قسمتی سے اردو دیوان کے
پراگندہ اوراق میرے ہاتھ آئے ہیں، چونکہ اساتذہ کے دواوین میرے پاس موجود نہیں لہذا ان کے کلام کی تحقیق و تفتیش کرنے کا مجھے
نہیں ملا۔ بہرکیف ایک حمد اور دو غزلیں ہدیۂ ناظرین ہیں۔ ارباب ذوق خود کلام دیکھ کر ان کے پاک جذبات، اعلیٰ تخئیل، شوخیِ طبیعت
کلام کی قدرت کا اندازہ کر لیں گے۔ اگر کہیں کہیں شاعرانہ مسامحات نظر آئیں تو وہ لائق اعتنا نہیں، ان کا کلام مطابق اصل ذیل میں پیش ہے:

حمد

سرتاجِ خسرواں ہے اللہ نام تیرا — ارفع ہے ذات تیری اعلیٰ مقام تیرا
کچھ عرش ہی نہیں ہے جائے قیام تیرا — دل کے قریب پایا ہم نے مقام تیرا
عاصی ہے نام میرا، غفّار نام تیرا — عصیاں ہے کام اپنا، بخشش ہی کام تیرا
یہ عنصرِ مخالف اس جسم عنصری میں ،، — یکجا کیا ہوا ہے، ربّ الانام تیرا

اس شمع نورِ وحدت کے رُوئے آتشیں پر
پروانہ وار جلنا اے دل ہے کام تیرا

اے مبداءِ خلائق اے علتِ دو عالم
پیدا کیا ہوا ہے عالم تمام تیرا

بیّن دلیل تیری ہستی کی دے رہا ہے
یہ ارضی و سماوی شمسی نظام تیرا

اے مرغِ روح اپنا دامن سنبھالے رکھنا
دامِ فریبِ دنیا شاید ہو دام تیرا

اے نفس دیو سیرت ضربِ مجاہدے سے
کردونگا اک نہ اک دن قصہ تمام تیرا

غش کیوں نہ مثلِ موسیٰ جانِ حزیں کو آئے
جب کوہِ طورِ دل ہو دار القیام تیرا

صوفی ہوں یا مشائخ ابدال یا قطب ہوں
وردِ زباں ہے سب کے ہر وقت نام تیرا

کہتے ہیں جو مقیدِ دیر و حرم کا تجھکو
آئیں بغور دیکھیں جلوہ ہے عام تیرا

اے بسمؔر تیری باتیں کُل کانِ معرفت ہیں
آتا ہے وجد ہمکو سُنکر کلام تیرا

گو وصل ہو لیکن ہمیں باور تو نہیں ہے
وعدوں کا یقین تیرے ستمگر تو نہیں ہے

سیماب ہے یا دانۂ اسپند بر آتش
پہلو میں ہمارے دلِ مضطر تو نہیں ہے

وہ ناز سے چلتے ہیں تو اُٹھتی ہے قیامت
قدموں سے لگا فتنۂ محشر تو نہیں ہے

ملتا نہیں ہمکو دلِ گم گشتہ ہمارا
دیکھو تو کہیں جوڑے کے اندر تو نہیں ہے

رہ رہ کے بھڑک اُٹھتے ہیں شعلے سے جگر میں
پوشیدہ میرے سینہ میں اخگر تو نہیں ہے

کل باغ میں اُس شوخ سے کہتے تھے عنادل،
بہتر تیرے گالوں سے گُلِ تر تو نہیں ہے

رہ رہ کے ستم کیجیے، تھم تھم کے تظلّم
دل جور و جفا کا ابھی خوگر تو نہیں ہے

چاہا جو حسینوں کو تو کیا اُس نے خطا کی
آخر تو یہ دل ہے کوئی پتھر تو نہیں ہے

اے بسمؔر خلش ہوتی ہے رہ رہ کے جگر میں
پنہاں کہیں اس میں کوئی نشتر تو نہیں ہے

دیگر

مجھکو شہیدِ تیغِ ادا کیا بنا گئے
گویا حیات و موت کا جھگڑا چکا گئے

وہ جاتے جاتے فتنۂ محشر اٹھا گئے
دیوانہ کر گئے، ہمیں مجنوں بنا گئے

بوسہ جو میں نے مانگا تو پہلے کہا کہ لو
پھر کہہ کے کوئی آتا ہے کنی کٹا گئے

تم نے جو اپنے دستِ حنائی سے دی شراب
چپکے سے شیخ جی بھی غٹا غٹ اُڑا گئے

مجھکو دکھا کے اپنا جمالِ جہاں نما
مُوسےٰ کیطرح محوِ تجلےٰ بنا گئے

آخر ہمارے جذبۂ دل نے کیا اثر
وہ رفتہ رفتہ راہ پر اے بسمؔر آ گئے

نئی کتابیں

ہندوستان کی صنعت اور تجارت - از مولوی منت اللہ صاحب رحمانی - ام - ال - اے - ۲۱۳ صفحے ناشر مکتبہ سلفیہ مونگیر

اس رسالہ میں ہندوستان کے عہد قدیم خصوصاً اسلامی ی ترقی یافتہ صنعت و حرفت اور ترقی کے وجوہ کو مستند ماخذ ..ا سے تفصیل سے دکھایا ہے - اس کے بعد ہندوستان میں پی تجارتی کمپنیوں کی آمد اور ہندوستانی تجارت سے ان کی پیی بیاں کی گئی ہے - اس سلسلہ میں مختلف یورپیں اقوام طریقہ رہا - اسکو مفصل طور پر پیش کیا ہے - پھر ہندوستانی ت و حرفت اور تجارت کو برباد کرنے کے جو جو وسائل اختیار گئے ان کو تشریح سے پیش کیا گیا ہے - اور ان اسباب انع کو درج کیا ہے، جو اس وقت ہندوستانی تجارت و عت و حرفت کی ترقی میں سد راہ تھے اور دوسرے ملکوں کو فائدہ انے کیلئے ہندوستان کو نقصاں پہنچا کر یہاں کی صنعت ارت کو جس طرح نقصانات پہنچائے گئے ہیں اس .... کے جو نتائج ہندوستان میں

ہوئے انہیں بیاں کیا گیا ہے - اس موضوع پر اس سے پہلے وہیں کئی کتابیں شایع ہوئی ہے لیکن یہ سب میں جامع اور حث کے لحاظ سے وقیع ہے - امید ہے کہ اسکی عام اشاعت ن اور ملک اس رسالہ کے افادی پہلوؤں سے پورا فائدہ اوٹھائیگا۔

رباعیات عرش فاروقی مرتبہ جناب سید الطاف علی صاحب بریلوی بی - اے - (علیگ) ۴۸ صفحے تقطیع چھوٹی قیمت ۴؍

پتہ سلطان جہاں منزل، علی گڈھ

منشی اعتماد الدین احمد صاحب عرش بریلی کے نوجوان شاعر تھے افسوس کہ نوجوانی میں اس دار فانی کو الوداع کہا کم عمری کے باوجود منظوم کلام کا وافر حصہ جمع ہو چکا ہے - جناب الطاف علی صاحب بریلوی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے موصوف کے کلام میں سے چند رباعیات جن میں بیشتر "جوانی" پر ہیں "رباعیات عرش فاروقی" کے نام سے شائع کی ہیں - یہ رباعیات مختلف سخن سنج اصحاب کی نظر سے گذر کر خراج تحسین وصول کر چکی ہیں جناب نواب حبیب الرحمن خان صاحب شروانی فرماتے ہیں "عرش فاروقی مرحوم کے کلام میں آمد، جودت اور جدت ہے سلاست کے مضموں آفرینی ہے عام سطح سے پایۂ کلام بہت بلند ہے - اتنی کم عمری کے لحاظ سے تعجب آفریں ہے - افسوس مرحوم کی جوانی کو نظر لگ گئی" - مرتب نے دیباچہ میں شاعر کے مختصر سوانح حیات بھی چھاپے ہیں جو اپنی جگہ کچھ کم عبرت آموز نہیں -

حسن و عشق - مرتبہ جناب محمد صدیق صاحب حیدرآبادی حجم ۴۸ صفحے، لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ قیمت ۴؍

مرتب کو اردو ادبیات کا پاکیزہ ذوق عطا ہوا ہے موصوف اپنے مطالعہ کے وقت پسندیدہ اشعار منتخب کرتے گئے تھے انہیں مرتب کرکے "حسن و عشق" کے نام سے شائع کیا ہے منتخب اشعار صاف ستھرے سادہ اور سلیس ہیں جنمیں دقیق فلسفیانہ

مضامین سے علاوہ محض حسن و عشق کے واردات احوال وجذبات کی ترجمانی کیگئی ہے۔ .... اس دلچسپ ادبی گلدستہ کے .... اشعار اولاً دو عنوان "حسن" اور "عشق" کے مضامین میں تقسیم کئے گئے ہیں۔ پھر مختلف عنوان قائم کرکے ان کے تحت مختلف اساتذۂ قدیم و جدید کے ہم معنی اشعار یکجا کئے ہیں۔ کہیں کہیں فارسی کے اشعار بھی اپنی موزوں جگہ پر درج ہیں۔ "حسن" کے سلسلہ میں چند تحتانی ابواب یہ ہیں "کرشمہ حسن و جمال"۔ "عالم شباب"۔ "رخ و عارض .... لب و دہن"۔ "تکلم و تبسم"۔ "چشم و نظر"۔ "مژگان و ابرو"۔ "زلف و گیسو" "ادا و غمزہ" "شرم و حیا" اسی طرح عشق کی تفسیر میں بیس تیس متفرق عنوانات ہیں جیسے "بلاکشان محبت" "عشق و دل" "حدیث شوق" "وداع محبوب" "تصور حبیب" "ہجر و فراق" "افشائے محبت" و "انجام محبت" وغیرہ۔ رکیک و سخیف اشعار کے انتخاب سے دامن بچایا گیا ہے۔ یہ رسالہ نوجوانوں میں شعر و شاعری کا ستھرا مذاق پیدا کرنے کے لئے کارآمد ہوگا۔

اشرف الذکر حصہ اول مولفہ مولوی مظہر احمد صاحب ادیب بی۔ اے ۔ ۴۸ صفحے تقطیع چھوٹی

قیمت ۳؍ ۔ پتہ:۔ الگزنڈرا ہائی اسکول بھوپال

یہ دینیات کا مختصر رسالہ ہے جو اسکول کے طلبہ کے لئے لکھا گیا ہے اور محکمہ تعلیمات حکومت بھوپال نے تیسری جماعت کے لڑکوں کے لئے منظور کیا ہے۔ اس میں اولاً مختصر عقائد کا ذکر ہے۔ پھر نماز کے طریقے اور دعائیں درج کی گئیں۔ دعاؤں اور سورتوں کا لفظی ترجمہ بھی مندرج ہے۔ رسالہ بچوں کیلئے مفید ہوگا۔

رسول پاک: از جناب عبدالواحد صاحب سندھی جامعی ناشر مکتبہ جامعہ دہلی۔ ۶۴ صفحے خط جلی۔ قیمت ۴؍

جامعہ ملیہ سے بچوں کے لئے سیرت پاک پر معلوم نہیں کتنے چھوٹے چھوٹے رسالے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک اپنی انفرادی حیثیت سے کسی نہ کسی نمایاں خوبی پر مشتمل ہے۔ اس رسالہ میں "رسول پاک کون تھے؟ کیسے تھے؟ اور آپ نے کیا سکھایا" کے سوالوں کے جوابات دلنشیں پیرایہ میں بچوں کی سمجھ کے مطابق دئے گئے ہیں۔ امید ہے کہ یہ رسالہ بھی دوسرے رسالوں کی طرح سودمند ثابت ہوگا۔

جدید مطبوعات جامعہ

رگبی کی زندگی: ٹامس ہیوز کی شہرۂ آفاق تصنیف "ٹام براؤنس اسکول ڈیز" کا ترجمہ انگلستان کے مشہور ماہر تعلیمات ڈاکٹر ٹامس آرنلڈ کے اصول تعلیم کی نہایت صحیح تعبیر ہے۔ جسے ان کے شاگرد رشید ٹامس ہیوز نے اپنے مایہ ناز استاد کی وفات کے بعد شائع کیا تھا۔ اس کتاب کی اشاعت سے انگلستان کی ثانوی تعلیم کے نظام میں انقلاب سا ہوگیا تھا۔

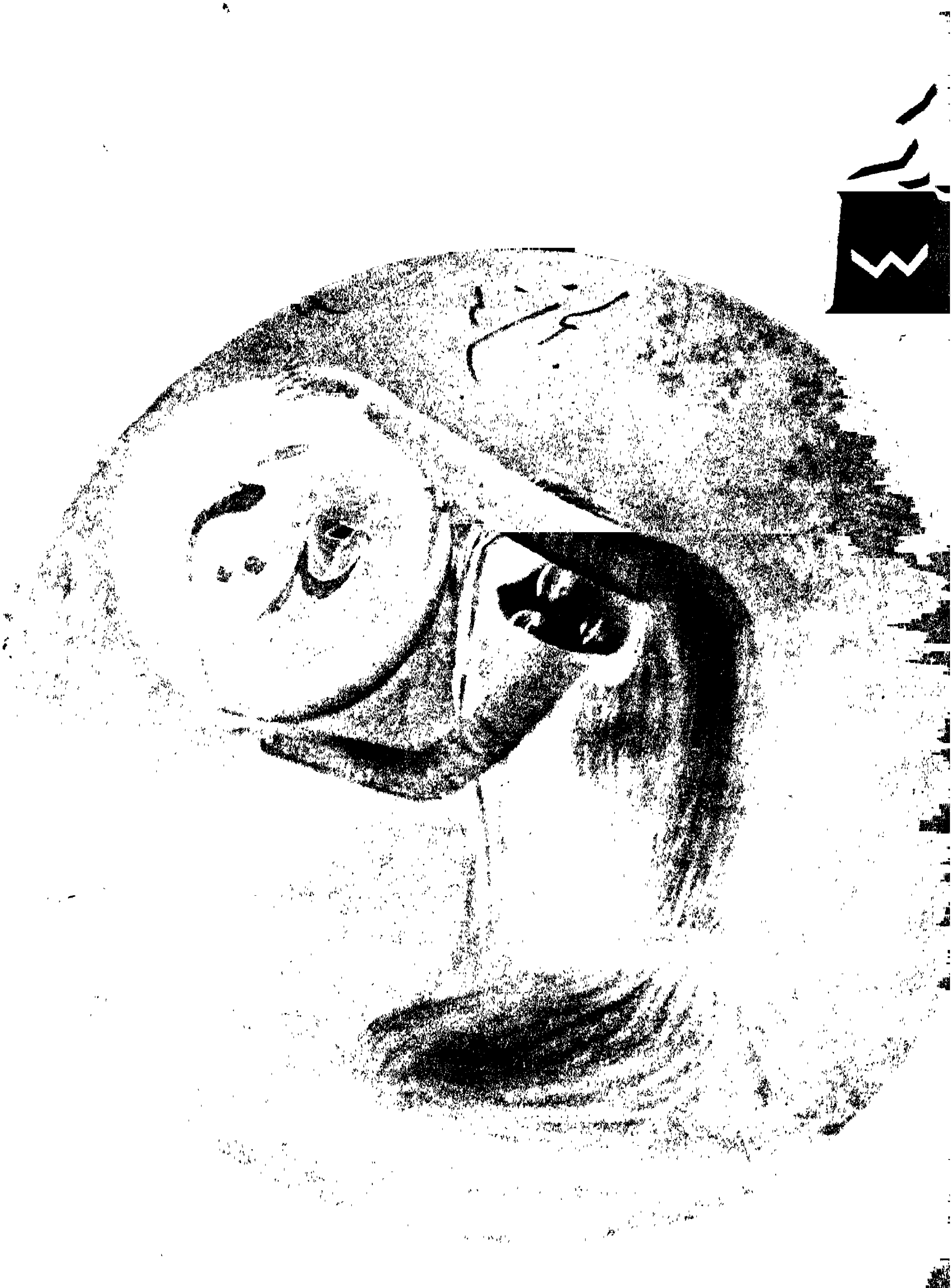
یہ کتاب ہے تو افسانے کے طرز پر لیکن اس میں ٹامس آرنلڈ کے ان تمام بنیادی اصولوں کی تشریح کی گئی ہے جن پر اس نے اپنے رگبی کے مدرسۂ ثانوی کے نظام کی بنیاد ڈالی تھی اور بعض ماہرین تعلیم کا خیال ہے کہ یہ ٹارڈ گرڈ اور سارٹر سارٹس جیسی معیاری کتابوں کے پہلو بہ پہلو رکھا جاسکتا ہے۔ قیمت عہ

خنداں: — خنداں ڈاکٹر بھی ہیں اور شاعر بھی مگر لوگوں کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ان کی ڈاکٹری زیادہ وبال ہے یا انکی شاعری۔ اسی قسم کے کرداروں نیز زندگی کے دوسرے دلچسپ پہلوؤں پر رشید احمد صدیقی صاحب کا اعلیٰ قسم کا مزاح، لطیف ترین طنز اور خواہ مخواہ دل کو گدگدا کر خوش کرنے والی تحریریں اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو موصوف کی یہ نئی تصنیف ملاحظہ فرمائیے۔ یہ چالیس مضامین کا مجموعہ ہے۔ قیمت مجلد ؎

انگلستان کا طریقۂ حکومت: — ہر ملک کا اپنا طریقۂ حکومت ہوتا ہے۔ اس کتاب میں برطانیہ کے دستور کی موٹی موٹی باتیں مبتدیوں کے لئے آسان اردو میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ قیمت ۵ر

صدر دفتر: — مکتبہ جامعہ۔ قرول باغ، نئی دھلی

شاخیں: — جامع مسجد دہلی۔ بیرون لوہاری دروازہ لاہور۔ امین آباد لکھنؤ۔ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳ سول ایجنساں:۔ کتابخانہ عابد شاپ حیدرآباد دکن۔ سرحد بک ایجنسی بازار قصہ خوانی پشاور



رسالہ ندیم گیا کے ارکانِ دوامی

حسبِ ذیل اہلِ ذوق اب تک رسالہ ندیم گیا کی دوامی رکنیت قبول فرما چکے ہیں

(۱) جناب نواب سید عبدالعزیز صاحب صدر المہام عدالت و امورِ مذہبی ممالک محروسہ سرکار عالیہ حیدر آباد دکن
(۲) خان بہادر نواب سید شاہ واجد حسین صاحب ایم۔ اے۔ سی خسرو پور
(۳) جناب سید حسن امام صاحب وارثی رئیس گیا۔
(۴) جناب آنریبل سید حسین امام صاحب ممبر کونسل آف اسٹیٹ
(۵) جناب سید مظہر علی امام صاحب حسنین منزل۔
(۶) جناب سید ابوالعاص صاحب رئیس ابوالعاص لین پٹنہ۔
(۷) جناب سید شاہ محمد باقر حسین صاحب آف خسرو پور
(۸) جناب سید علی حیدر صاحب گیا۔
(۹) جناب سید شاہ حسین سجاد صاحب رئیس بہار شریف
(۱۰) جناب مولوی سید محمد ایوب صاحب آبگلوی۔
(۱۱) جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدر آباد۔
(۱۲) جناب خان بہادر حاجی چودھری شیخ محمد بخش صاحب رئیس کٹھیار۔
(۱۳) جناب خان بہادر حبیب الرحمن صاحب رئیس رانچی
(۱۴) جناب پروفیسر سید مظفر الدین صاحب ندوی ایم اے کلکتہ
(۱۵) جناب ڈاکٹر سید اختر حسن صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ال
(۱۶) جناب سید شاہ رحمت اللہ صاحب ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر
(۱۷) جناب سید عبدالجلیل صاحب انسپکٹر اکسائز۔
(۱۸) جناب خواجہ غلام احمد صاحب بی۔ اے بی۔ ال۔ گیا
(۱۹) جناب مولانا سید محمد طٰہٰ صاحب اشرف استھوی۔
(۲۰) جناب مولوی عبدالکریم صاحب آزاد بھاگلپور
(۲۱) جناب مولوی محمد جمال صاحب ندوی گیا
(۲۲) جناب محمد حبیب الحسن صاحب عظیم آبادی کلکتہ
(۲۳) جناب سید رضا قاسم صاحب مختار پلامو
(۲۴) جناب سید آفتاب احسن صاحب ایم۔ اے سی حیدر آباد۔
(۲۵) جناب ڈاکٹر سید احمد امام صاحب گیا۔
(۲۶) جناب سید شاہ ذکا حسین صاحب رئیس بہار شریف پٹنہ
(۲۷) جناب غلام ربانی صاحب رئیس نورا۔ پوسٹ نوادہ گیا
(۲۸) جناب ڈاکٹر مطیع الرحمن صاحب نئی سرائے بہار شریف

طریقہ قبول رکنیت، صرف پچیس روپے یکمشت روانہ فرمائیں۔ رسالہ تاعمر مفت حاضر خدمت ہوگا اور مکتبہ ندیم کی مطبوعات نصف قیمت پر۔

منیجر ندیم گیا

مدیر - سید ...   ... تحریر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دار المصنفین اعظم گڈھ

برادر عزیز   السلام علیکم و رحمۃ اللہ

آپکا بہار نمبر دونوں پہنچ گیا تھا۔ کثرت اشغال اور آمد و رفت سفر کی مصروفیت نے بروقت جواب کا موقع نہیں دیا۔ نقش نگار پر آپکا نوٹ پڑھکر خوشی ہوئی۔ جزاک اللہ تعالیٰ۔ امید ہے کہ لوگوں کو پسند آیا ہوگا۔

بہار نمبر اپنی ظاہری اور معنوی خصوصیتوں کی بنا پر ... مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے بہار سے ایک نامور کی ... سید احمد صاحب بلگرامی کی انشاپردازی ... آزاد مرحوم کی یاد دلائی ہے۔ مولوی عبدالماجد نے احباب بہار کی یادکو تازہ کر دیا جنکی زیارت اور صحبت کا مجھے کئی بار اتفاق ہوا۔ ... اور ... کی ... سر فہرست میرا نام رکھکر میری عزت بڑھائی، اونہوں نے دل اپنا رکھا اور ...

میرا اونکی نسبت یہ حال ہے:

دل و دین باختم زین پیش و اکنون جان فدا کردم
محبت را ہمین یک وام بر من بود ادا کردم

"دید عاشق بہاری" نے تو مولوی روم سے اس شعر کی شرح کی ہے:

خوشتر آن باشد کہ سر دلبران
گفتہ آید در حدیث دیگران

اور مضامین بھی اچھے ہیں، مگر ان پھولوں میں ایک کانٹا بھی ہے، اور وہ جا بجا شباب آور ... تصویروں کی برہنگی۔ کاش آپ اسکو یاد رکھتے کہ ... آپ کچھ اور ... میں ... علمی و ادبی رسالوں ... حسن پرستی کی مثال کسی علمی و ادبی رسالہ میں ...

والسلام

... ۱۹۳۰ ستمبر

احمد ... خیریت ہے

DUPLICATE

باجلاس سردار ہزنام سنگھ صاحب بی۔اے۔ایل ایل۔بی جج مطالبہ خفیفہ سیالکوٹ

اشتہار

زیر آرڈر 5 رول 20 ضابطہ دیوانی

نمبر مقدمہ 91 بابت سال ۱۹۴۵ء

دی امپیریل سرجیکل کمپنی کچہری روڈ سیالکوٹ بذریعہ مسٹر اوج ناتھ مالک فرم مذکور

بنام

میسرز دامن اینڈ کو ریاست دھار سنٹرل انڈیا

DHAR STATE (CENTRAL INDIA)

دعویٰ دلا پانے 42/

بمقام ریاست مذکور

فرم بالائے ریاست مذکور تمن لینے سے عمداً گریز کرتا ہے۔ لہذا اشتہار زیر آرڈر 5 رول 20 ضابطہ دیوانی جاری کیا جاتا ہے کہ دگریدار مذکور 15/9/45 2 کو اصالتاً یا وکالتاً حاضر عدالت ہوکر پیروی مقدمہ نہیں کرے گا تو اس کے خلاف کارروائی یکطرفہ عمل میں آوے گی۔

بثبت مہر عدالت اور ہمارے دستخط سے آج بتاریخ
30 ماہ اگست ۱۹۴۵ء جاری کیا گیا۔

دستخط حاکم

مہر عدالت

ضروری اطلاع اس کے پڑھنے سے لاکھوں کا بھلا ہوگا

صاحبان! میں نہ اشتہاری حکیم ہوں نہ ڈاکٹر بلکہ ایک معمولی آدمی ہوں۔ بدقسمتی سے مجھے اپنے ہاتھوں اپنی جوانی کا ستیاناس کرنے والی عادت پڑ گئی تھی جس کے نتیجہ بد سے میں بالکل بےخبر تھا۔ اچانک عرصہ ڈیڑھ سال کے بعد مجھے نامردی کا ناہنجار مرض لاحق ہوگیا۔ سرعت۔ جریان۔ احتلام وغیرہ کی بے انتہا شکایتوں کے سبب میرا چہرہ دن بدن لاغر اور زرد ہوتا جاتا تھا۔ دیگر دل ہر وقت دھڑکتا سر چکراتا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آتا۔ گھبراہٹ سستی اور اداسی چھائی رہتی تھی۔ دوست احباب میری پژمردگی کا سبب پوچھتے تھے مگر میں کسی کو اپنی حالت سے آگاہ کرنا مناسب نہ سمجھتا تھا مگر درپردہ مشہور شہروں کے بڑے بڑے ڈاکٹروں اور حکیموں سے جن کے لمبے چوڑے اشتہاروں کی کوئی حد نہ تھی ادویات منگا کر استعمال کرتا رہا لیکن مجھے بالکل خاک بھی فائدہ نہ ہوا بلکہ علاوہ خرچ کے کئی اور تکلیفوں کا سامنا [illegible] اتفاق سے خوش قسمتی سے مجھے ملازمت کے ایک سلسلہ میں پشاور جانا پڑا [illegible] جگہ جا کر ٹھہرا۔ وہاں ایک فقیر سفر صورت [illegible] پہلے سے وہاں مقیم تھے۔ مجھ سے پوچھنے لگے کہ تم اداس اور تمہاری صورت مریضوں کی سی کیوں ہے [illegible] خضر صورت [illegible] کامل سنیاسی سے اپنا سارا دکھ درد کہہ ڈالنے کی ہدایت کی۔ چنانچہ میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ اب میں زندگی سے تنگ آ کر خودکشی کرنے پر آمادہ ہوں۔ [illegible] صاحب کمال نے ازراہ شفقت میرے حال زار پر رحم فرما کر ایک نسخہ کھانے کیلئے مقوی گولیوں کا اور دوسرا نسخہ رگوں اور پٹھوں کی سستی دور کرنے کیلئے مالش کا بتایا چنانچہ میں نے [illegible] ارشاد اس صاحب کمال کے لاتعداد جنگلی جڑی بوٹیاں اور کئی ادویات بازار سے خرید کر ہر دو جوہر کیمیا کو [illegible] اس صاحب کمال کے تیار کردہ استعمال کرنا شروع کیا۔ **ناظرین! میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر سچ کہتا ہوں** کہ سات روز ہی میری تمام شکایتیں رفع ہونی شروع ہوگئیں [illegible] آپ کو قابل فخر مرد کہنے کا مستحق ہوگیا۔ اگرچہ مجھے چند ہی روز کے استعمال سے ضبط کرنا دشوار ہوگیا۔ مگر بموجب ارشاد اپنے محسن خضر صورت کامل سنیاسی کے **اکیس روز** تک پرہیز اور علاج جاری رکھنا پڑا۔ میں ہر روز تین سیر ساڑھے تین سیر دودھ بآسانی ہضم کر لیتا تھا۔ میرا چہرہ بارونق۔ بدن مضبوط۔ بینائی طاقتور ہوگئی۔ اب میں ایسا قابل فخر مرد بن گیا ہوں کہ جس کے بیان کرنے کی تہذیب اجازت نہیں دیتی۔ [illegible] باقیماندہ دوائی کا نامرس کے مایوس مریضوں پر تجربہ کیا تو ہر قسم کی نامردی۔ سستی۔ جریان۔ احتلام۔ سرعت وغیرہ کے لئے اکسیر سے بڑھ کر پایا۔ پھر کئی ایک دور اندیش احباب کے اصرار اور عوام کے فائدہ کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ اشتہار بغرض رفاہ عام دیا جاتا ہے کہ جو صاحب اس شرمناک اور قبیح عادت کے شکار بن کر حظوظ انسانیت سے محروم ہو بیٹھے ہوں اور سینکڑوں روپیہ علاج معالجہ پر صرف کر کے مایوس ہوچکے ہوں وہ اس قلیل القیمت اور سریع الاثر دوائی کو استعمال کر کے صحت یاب ہو جائیں اور خدا کے فضل کے گیت گائیں۔ قیمت صرف لاگت ادویات اور خرچ اشتہار پر بمشکل اکتفا کرتی ہے۔ فائدہ بہت کم ملحوظ ہے۔

قیمت مقوی گولیاں فی شیشی جس میں ۲۱ روز کی ۴۲ خوراک موجود ہے صرف دو روپیہ ؏

قیمت روغن مالش طلاء جو ۲۱ روز تک رگوں اور پٹھوں کیلئے کافی ہے فی شیشی دو روپے آٹھ آنے ؏ جریان کیلئے یہ گولیاں از حد مفید ہیں۔ مادر زاد نامردی کے سوائے خواہ کسی قسم کی نامردی کا مرض کیوں نہ ہو اکسیر ہے۔ روغن مالش طلاء سے کسی قسم کی پھنسی یا آبلہ ہرگز نمودار نہ ہوگا۔

اس دوائی میں کشتہ وغیرہ کی آمیزش نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر بچہ۔ جوان اور بوڑھا بآسانی بغیر لحاظ موسم کے ان گولیوں کا استعمال کر سکتا ہے اور لطف یہ ہے کہ بس دوائی [illegible] کے بعد دوبارہ کسی دوائی کی ضرورت نہ رہے گی۔ آخر میں یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اشتہار کے نکالنے سے میری کوئی ذاتی غرض نہیں ہے اور نہ ہی میرا مدعا جعلی اشتہار شائع کر کے پبلک سے روپیہ کمانے کا ہے۔ بلکہ ہر خاص و عام کا فائدہ مدنظر رکھ کر احباب کے اصرار پر اشتہار شائع کیا جا رہا ہے۔ تندرست اور شوقین اصحاب بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ کیونکہ اس کے استعمال سے سست سے چست اور چست سے طاقتور بن جاتا ہے اگر بڑھاپے میں بھی لطف جوانی اٹھانا چاہتے ہیں۔ تو ان گولیوں اور روغن مالش طلاء کا استعمال کریں کیونکہ اس کے استعمال سے بدن میں خون صالح پیدا ہو جاتا ہے۔ الغرض جب تمام چرخا ڈھیلا ہوگیا ہو تو ان کا استعمال کریں اور فائدہ اٹھائیں۔ مخفی نہ رہے کہ تمام دنیا کی دواؤں سے عجیب و غریب علاج ہے۔

نیز عورتوں کی جوانی قائم رکھنے کے لئے ۔ جو عورتیں مردوں کی طرح جریان الرحم یا اخراج رطوبت یعنی لیکوریا جیسے خطرناک امراض میں مبتلا ہوں۔ ان کے لئے مقوی گولیاں از حد مفید ہیں۔ ضرورت مند اصحاب تجربہ کریں۔ مکمل پرچہ ترکیب ہمراہ دوا ہوگا۔ محصول ڈاک ؏ علاوہ۔ تمام خط و کتابت پوشیدہ رکھی جاتی ہے۔

خاص نوٹ } وہ اصحاب جو ہم سے دوائی منگا کر استعمال کریں۔ اخبار کا حوالہ ضرور دیں۔ کیونکہ کئی اصحاب نے پیشہ اختیار کر رکھا ہے کہ ہم سے دوائی منگا کر زیادہ قیمت پر فروخت کر دیتے ہیں۔ لہذا فقیر خضر صورت سنیاسی کے قول کے مطابق اس کی کمائی کماناگناہ ہے۔ یہ گورنمنٹ آف انڈیا سے رجسٹرڈ ہیں۔ آرڈر دیتے وقت اپنا پتہ صاف اور خوشخط لکھیں

غیر ممالک سے قیمت پیشگی۔

ضروری اطلاع

یاد رہے کہ میری دوائی صرف نامردی سستی جریان احتلام سرعت۔ کمزوری اور [illegible] اور جریان الرحم و لیکوریا کے لئے مخصوص ہے [illegible]

شرطیہ علاج اور شرطیہ وعدہ

ہندو کو دھرم اور مسلمان کو ایمان کی قسم ہے کہ اگر میری دوائی کے استعمال سے حسب دل خواہ فائدہ نہ ہو [illegible]

عورتوں کے پرسوت کی بیماری اور سفید رطوبت

دُور کرنے کی زود اثر اور لاثانی دوا

نسوانی

رجسٹرڈ

قیمت فی شیشی ایک روپیہ



آجکل ہر گھر میں بیاہی ہوئی اور جوان عورتوں کو سفید سفید رطوبت آنے کی شکایت رہتی ہے جسکی وجہ سے اُن کے بدن میں کمزوری بڑھتی جا رہی ہے اور بہت تھوڑی عمر میں چہرے کی چمک اور بدن کی پھرتی غائب ہو جاتی ہے۔ یہ رطوبت جسکو پرسوت کی بیماری بھی کہتے ہیں مثل پانی کے سفید سفید قطرہ نکلتا رہتا ہے اور اکثر میلے رنگ کی گاڑھی گاڑھی سفید رطوبت برابر نکلا کرتی ہے اور کپڑے پر دھبّہ آجاتا ہے۔ اِسکی وجہ سے تھوڑے دِن میں بدن پیلا پڑکے سوکھنے لگتا ہے (۱) ٹانگ میں درد (۲) آنکھ تلے اندھیرا (۳) اُٹھتے بیٹھتے سر چکرانے لگتا ہے (۴) کوئی چیز کھانے کو جی نہیں چاہتا (۵) ہاتھ پیر کا تلوہ جلتا رہتا ہے (۶) کمر میں درد (۷) طبیعت میں سُستی (۸) بھوک نہ لگنا (۹) مرد کی صحبت سے جی گھبرانا (۱۰) حمل نہ رہنا (۱۱) یا حمل گر جانا (۱۲) یا اولاد کمزور پیدا ہونا (۱۳) اولاد پیدا ہوکر زندہ نہ رہنا۔ غرضکہ اِن سب بیماریوں کے لئے اگر آپ ہمارے یہاں کی لاجواب دوا نسوانی استعمال کرائیں گے تو خدا چاہے تو عورت کی جملہ مندرجہ بالا شکایتیں جاتی رہینگی۔ عورت کی کمزوری سستی۔ لاغری دُور ہوکر بدن میں پھرتی ہاتھ پیر میں طاقت۔ چہرہ پر رونق۔ اور دِل میں جوانی کی اُمنگ آجائیگی۔ صرف تین شیشی نسوانی پلانے سے رطوبت کا آنا بند ہو جائیگا۔ قیمت فی شیشی۔ ایک رُوپیہ۔ تین شیشی کی قیمت۔ دُو روپیہ بارہ آنہ۔ محصول علاوہ

قدرتِ خدا کا تماشہ دیکھئے۔ بانجھ عورت کو حمل قرار پا گیا۔

جناب محمد اسحاق صاحب۔ ضلع سلطان پور سے تحریر فرماتے ہیں۔ کہ مَیں نے چھ شیشی نسوانی منگا کر استعمال کیا۔ حالانکہ عورتیں بالکل بانجھ تھیں۔ اب خدا کے فضل و کرم سے دونوں عورتیں حاملہ ہیں۔ مَیں تہہ دل سے آپ کا مشکور ہوں۔ لہذا تین شیشی نسوانی اور روانہ فرمایئے۔ (فرمائش لکھتے وقت "ندیم" کا حوالہ دیجئے)

ملنے کا پتہ ایس۔ اے۔ بی بخشی کمپنی۔ گھڑی والی کوٹھی ۳۲/۲ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ

صوبہ بہار کے اسکولوں اور کتب خانوں کے لئے گورنمنٹ سے منظور شدہ

رسالۂ ندیم گیا

قیمت سالانہ للعہ — ششماہی ۶/
قیمت فی پرچہ ۵/

مرتبہ :- سید ریاست علی ندوی،

ماہ شعبان المعظم سنہ ۱۳۵۹ھ مطابق ماہ ستمبر سنہ ۱۹۴۰ء — ۱۶(3)

عنوان	مضمون نگار	صفحہ
نظرات	سید ریاست علی ندوی	۱۳۲-۱۳۰
مقالات :- عرب انشا پردازوں کی انشا پردازی		۱۳۸-۱۳۳
ایران	جناب سید محبوب حسن صاحب وارثی بی اے، ال ال بی علیگ	۱۴۴-۱۳۹
مولانا عبد الصمد اوگانوی بہاری	مولانا مسعود عالم صاحب ندوی	۱۴۷-۱۴۵
افسانہ و محاضرات :- دھوکا	جناب پروفیسر شبلی ابراہیمی ایم اے	۱۵۰-۱۴۸
سندر	جناب سید نصیر حیدر صاحب بی اے، ڈپٹی کلکٹر گیا	۱۵۶-۱۵۱
لغزش	جناب رحمت علی صاحب صابر نور محلوی	۱۶۳-۱۵۷
من کی چاہ (شیکسپیر کی شہرۂ آفاق تمثیل)	جناب سعید الحق صاحب دسنوی بی اے (آنرز)	۱۶۹-۱۶۴
عجیب انسان کی آخری قسط	جناب محمد احسن صاحب پھلوی پوری	۱۷۳-۱۷۰
تقریظ و انتقاد :- بہار نمبر سنہ ۴۰ء پر ایک نظر	جناب عبد الباقی صاحب بی اے جامعی، مفصل پروپگنڈا افیسر صوبہ بہار	۱۸۱-۱۷۴
مراسلہ و مناظرہ :- نواب صاحب مرحوم کی ایک سے زیادہ	جناب سید رضا قاسم صاحب مختار	۱۸۲
صاحبزادیاں تھیں		۱۸۳
ادبیات :- قطعہ رحلت سراپا حسرت جناب سید محمد عاشق صاحب وارثی مرحوم	حضرت مبارک عظیم آبادی	۱۸۴
قطعہ گل تعزیت	علامہ فضل حق آزاد عظیم آبادی	۱۸۵
قطعہ تاریخ انتقال پر ملال مولوی سید محمد عاشق وارثی مرحوم	حضرت رسا ہمدانی گیاوی ایم اے	۱۸۵
نور خدا معشوق محمد عاشق	جناب ابو محمد سید حسن امام وارثی رئیس گیا	۱۸۶
قطعہ تاریخ ارتحال حضرت احسن مارہروی مرحوم	"	۱۸۶
قطعہ تاریخ ارتحال حضرت حافظ سید علی حسن صاحب احسن مارہروی	حضرت مبارک عظیم آبادی	۱۸۷
کلام محویؔ	پروفیسر مولانا محوی صدیقی لکھنوی	۱۸۸
رباعیات شاکر	جناب پیارے لال شاکر میرٹھی	۱۸۹
کلام آزاد	مولانا آزاد سبحانی	۱۹۰
اک معمہ ہے یہ انسان کیا ہے	حضرت رسا ہمدانی گیاوی ایم اے	۱۹۱
جذبات قیس	جناب جی۔ آر۔ قیس شیخپوروی	۱۹۲
نئی کتابیں	"	۱۹۳

سید ریاست علی ندوی ایڈیٹر و پرنٹر پبلشر نے ندیم پریس کچہری روڈ گیا میں چھپوا کر دفتر ندیم گیا سے شائع کیا۔

نظرات

آہ مولوی سید محمد عاشق، مرحوم!

افسوس کہ مولوی سید محمد عاشق صاحب وارثی، ایڈوکیٹ گیا نے ۲۶ رجب المرجب ۱۳۵۹ھ مطابق ۳۱ اگست ۱۹۴۰ء کو ۵۶ برس کی عمر میں اس دارفانی کو الوداع کہا۔ مرحوم صوبہ بہار کے مشہور وارثی فقیر حضرت پیر بادشاہ صاحب علیہ الرحمۃ کے پوتے، اور ہمارے شہر کے ممتاز وکیل مولوی غنی حیدر صاحب وارثی مرحوم کے داماد تھے۔ علی گڈھ میں تعلیمی دور ختم کرنے کے بعد، گیا میں وکالت کا پیشہ شروع کیا۔ وہ فطرۃً ذہین، خلیق، طباع اور قوت حافظہ میں بے مثال تھے۔ چند ہی دنوں میں گیا میں وکیلوں کی صف اول میں آئے۔ پھر شان امتیازی حاصل کی، اس کے بعد رفتہ رفتہ صوبہ کے ممتاز وکلاء کی صف میں گنے جانے لگے۔

مرحوم کی سیاسی زندگی کا آغاز معاشی حیثیت سے فارغ البالی کے بعد سنہ ۳۷ء سے ہوا۔ جب کہ انہوں نے مسلم لیگ کی نئی تحریک کو لبیک کہا، اور اس کے لئے عملی قدم اٹھایا۔ وہ جس تیزی سے اپنے پیشہ میں بڑھے، اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ وہ اپنی سیاسی زندگی کے اعتبار سے سیاست کے مطلع پر گھنگھور گھٹا کی طرح اٹھے، بجلی کی طرح کوندے۔ اور پورے صوبہ کی فضا پر چھا گئے۔ محض سال دو سال کی سیاسی خدمات سے یہ اثر و نفوذ پیدا کیا کہ اپنی سیاسی بزم میں صف اول کے رہنماؤں کے دوش بدوش آ گئے۔ اور مرکزی مسلم لیگ کی مجلس کارکن کے رکن منتخب کر لئے گئے۔ ہندوستان کے مسلمان سیاسی قائدین میں سے اگر کسی سے ان کو مثال دی جا سکتی ہے تو وہ مولانا شوکت علی مرحوم تھے۔ وہ اپنے جوش و خروش، خود اعتمادی، انہماک وفور جذبات، آتش بیانی، اور دو ٹوک باتیں کہہ کر مجمع کو اپنی طرف مائل کر لیتے، اور ہر مجمع میں تیغ براں بن کر چمکنے میں سراپا مولانا شوکت علی مرحوم کے مثیل تھے۔ مرحوم کے سیاسی مسلک و طریق کار سے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو، مگر ان کی قابلیت، دلیری، جوش عمل، بے خوفی، ہر دلعزیزی اور قومی خیرخواہی سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو، وہ جس محفل میں ہوتے اس پر چھا جاتے، یا دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے۔ وہ ان تھک کام کرنے والے، نڈر، پُر دل، اور پُر امید تھے۔ پچھلے سالوں میں جب فرقہ وارانہ فسادات ہوئے تو وہ سینہ سپر ہو کر اُٹھ کھڑے ہوئے، اور بعض مشہور مقدموں میں کام کر کے مقدموں کی کایا پلٹ کر دی۔ ان کی آیندہ زندگی سے مسلمانان بہار کی غیر معمولی توقعات وابستہ تھیں۔ ان کی ناگہانی موت کے سانحہ کی خبر جب شہر میں پھیلی تو شہر کی پوری اسلامی آبادی سوگوار ہو گئی، اور جنازہ میں شہر کے بالغ مسلمان مردوں میں سے ۹۰ فیصدی آبادی نے ضرور شرکت کی۔ اور دو میل پیادہ جنازہ کی مشایعت میں گئی۔ کسی مسلمان کے جنازہ پر ایسا اژدہام اس شہر میں دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ ان کا تعلق صرف گیا سے نہیں، پورے صوبہ بہار سے تھا، اسلئے پورے صوبہ میں ان کی موت پر بجا ماتم کیا گیا۔ ان کی تدفین اپنے لگائے ہوئے باغ میں جو شہر سے دو میل جانب مشرق قصبہ آنگن کی آبادی سے باہر ہے، عمل میں آئی۔ دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ اپنی رحمتوں کے پھولوں سے ان کے دامن کو بھر دے [illegible] رحمت کے انوار کی بارش فرمائے، اور ان کے صاحبزادوں جناب سید محبوب احمد صاحب وارثی بی۔ اے۔ ایل ایل بی وغیرہ اور دوسرے اعزہ و اقرباء کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

ادہر چند مہینوں میں اردو ادب و شاعری کے کئی لعل شب چراغ بجھ گئے، حضرت عشرت لکھنوی مرحوم کے ماتم سے ابھی ہم فارغ نہیں ہوئے تھے کہ اردو ادب ایک دوسرے ادیب و شاعر حضرت احسن مارہروی کی خدمات سے ہمیشہ کیلئے محروم ہوگئی، مرحوم کی عمر ادب و شاعری کی خدمت میں گزری، وہ سخنور و سخن سنج تھے، "ریاض سخن" کے نام سے سنہ ۱۸۹۶ء میں ایک گلدستہ جاری کیا۔ وہ فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، ان کے سایہ شفقت میں رہکر "جلوۂ داغ" کے نام سے ان کے سوانح حیات شائع کئے۔ پھر فصیح الملک داغ کے مستعمل محاورات کو "فصیح اللغات" کے نام سے یکجا کرنا شروع کیا۔ لاہور سے "فصیح الملک" ایک سالہ نکالا، پھر داغ کا باقی ماندہ غیر مطبوعہ کلام "یادگار داغ" میں مرتب کیا۔ اسی طرح ولی دکنی کے دیوان کی ترتیب و تصحیح کی خدمت انجام دی، جو ضخیم مجلد میں انجمن ترقی اردو کیطرف سے شائع ہوا۔ ان کی اخیر تصنیف "تاریخ نثر اردو" ہے جس میں حواشی کے ساتھ مختلف دور کے منثورات کے اقتباسات یکجا کئے ہیں، ادھر چند سال سے علی گڈھ میں اردو کے لکچرر ہوگئے تھے، آخر عمر میں اس سے سبکدوش ہوئے۔ مرض وفات میں علاج کے لئے عظیم آباد پٹنہ تشریف لائے، اور یہیں ۳۰ راگست کو اردو ادب و شاعری کا یہ قدیم خدمتگذار ہمیشہ کیلئے ابدی نیند سوگیا، خدا ہمارے ادیب و شاعر کو اپنی رحمت کے انعام و اکرام اور صلہ سے سرفراز فرمائے۔

نوبل پرائز کو بین الاقوامی علمی اعزاز و امتیاز کا درجہ حاصل ہے۔ اسوقت تک دنیا کے کسی مسلمان فاضل کو اس اعزاز سے سرفراز نہیں کیا گیا تھا۔ علامہ سر اقبال مرحوم کا نام اور ایک ترکی اور ایک مصری شاعر کے نام کبھی کبھی اس اعزاز کیلئے لئے گئے، مگر انتخاب کی نوبت نہ آئی۔ حسن اتفاق کہ یہ سعادت حیدرآباد دکن کے ایک نامور نوجوان فاضل کی قسمت میں تھی، وہ جناب ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی، بی۔اے (عثمانیہ) ایم۔اے (کیمبرج) پی۔ایچ۔ڈی (لائپزک) پروفیسر ریاضیات جامعہ عثمانیہ ہیں۔ سنہ ۴۰ء میں طبعیات کے نوبل پرائز کیلئے ان کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔ انہیں یہ اعزاز "کوانٹم" پر ان کی محققانہ تصنیف کی بدولت حاصل ہوا، جس کو ابھی حال میں جامعہ عثمانیہ نے شائع کیا ہے۔ یہ دنیا کے سب سے پہلے مسلمان ہیں جو اس اعزاز سے سرفراز کئے گئے، اور دنیا میں نوبل پرائز پانیوالوں میں سب سے کمسن ہیں۔ ہندوستان میں سر رابندر ناتھ ٹیگور ۔۔۔۔۔۔ اور سر سی۔ وی۔ رامن کو یہ انعامات مل چکے ہیں لیکن اسوقت جبکہ وہ بڑھاپے کی منزل میں قدم رکھ چکے تھے۔ ڈاکٹر رضی الدین جوان سال و جوان بخت ہیں۔ ان کی پیدائش اسی صدی میں سنہ ۱۹۰۶ء کی ہے۔ انہوں نے سنہ ۲۵ء میں جامعہ عثمانیہ سے بی اے پاس کیا، اور ریاضی میں امتیاز حاصل کیا۔ سنہ ۲۶ء سے سنہ ۳۱ء تک یورپ کی مختلف یونیورسٹیوں میں رہے۔ سنہ ۳۱ء میں وطن آئے اور اپنی یونیورسٹی میں ریاضیات کے پروفیسر مقرر ہوئے۔

ڈاکٹر رضی الدین کی اس محیر العقول کامیابی پر جامعہ عثمانیہ کو ناز ہوسکتا ہے، یہ وہی گہوارہ ہے، جہاں ذریعہ تعلیم شروع سے آخری درجہ تک اردو زبان ہی ہے۔ اس واقعہ نے اردو کے کامیاب تعلیمی زبان ہونے پر مہر تصدیق ثبت کردی۔ ہم اس اعزاز پر جناب ڈاکٹر صاحب موصوف اور ان کے تعلیمی و علمی گہوارہ کو تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔

نیاز کے مزخرفات کا ذکر پچھلے مہینہ میں ان صفحوں میں آیا تھا۔ اسی سلسلہ میں روزانہ ہند کو بھی مخاطب کیا گیا تھا۔ خوشی ہوئی کہ مولانا ملیح آبادی نے "ندیم کا اعتراض" کے عنوان سے اس مسئلہ میں اپنی روش کی تصریح فرمائی، اور مذہبیات میں نیاز کے دخل در معقولات کو ان کے جہل سے تعبیر کیا، اور اسکی حمایت کرنے سے برائت ظاہر کی۔ ندیم نے تو اس سلسلہ میں براہ راست حمایت کا الزام بھی نہیں لگایا تھا، بلکہ ان کی بالواسطہ حمایت کا گلہ کیا تھا ——— خیر اب یہ کوئی قابل اعتنا چیز بھی نہیں رہی۔ البتہ اس سلسلہ میں بعض اور باتیں ان کے قلم سے نکل گئی ہیں۔ مناسب ہے کہ ان غلط فہمیوں کو بھی رفع کردیا جائے۔ افسوس ہے کہ ہفتہ وار ہند کا وہ پرچہ پرانے اخباروں میں مل کر اسوقت نظروں سے اوجھل ہوگیا ہے، ورنہ انکے خیالات انہیں کے لفظوں میں پیش کئے جاتے۔ بہرحال انکے لکھنے کا مدعا یہ تھا کہ مذہبیات میں نیاز کا جہل مسلم ہے۔ تاہم ان کو اپنی رائے کے ظاہر کرنے کا حق حاصل ہے، اور اس لحاظ سے انہیں اسلام سے خارج کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔

ہم ہندوستانیوں کے پاس چند مہمل اور بے معنی لفظوں کے ساتھ یہ "آزادی رائے" کا لفظ بھی یورپ سے تحفہ بن کر آیا ہے، اور اس کے مفہوم کے صحیح حدود متعین کئے بغیر ہم موقع بے موقع اسکو استعمال کرتے ہیں۔ مولانا ملیح آبادی کو ہم سے شکایت ہے کہ اس موقع پر انہیں مخاطب کرتے وقت سوشلزم کا نام ناحق زبان پر لائے، لیکن مولانائے موصوف اپنے ذہنی نشو و نما سے جس ماحول میں ہیں، جب تک اسی ماحول کی جانی پہچانی چیزوں کو انکے سامنے مثال نہ دیجائے، ان کے ذہن میں کسی مسئلہ کی تفہیم کا ہونا دشوار ہے، پہلے مناسب ہے کہ نیاز کے معاملہ میں اس آزادی رائے کے مسئلہ کو بھی مولانائے موصوف ہی کی ایک تحریر کے آئینہ میں دیکھا جائے۔

ابھی مسٹر ایم ۔ این رائے نے جو سیاسی روش اختیار کی ہے اس پر وہ ایک سے زیادہ مرتبہ لکھ چکے ہیں ۔ وہ جس روپ میں اسوقت ایم ۔ این ۔ رائے کو پبلک میں لانا چاہتے ہیں پچھلے مہینے میں ہم نے اسی لباس میں نیاز کو بھی پیش کیا تھا ۔ یقین نہ ہو تو روزانہ ہند کی تحریر کا ذیل کا اقتباس صرف ناموں کو بدل کر ملاحظہ فرمائیں ۔

" چند روز ہوئے ہم مسٹر نیاز محمد خاں نیاز کے تازہ بیانوں اور تحریروں پر اعتراض کر چکے ہیں ، مگر معلوم ہوتا ہے مسٹر نیاز طے کر چکے ہیں کہ الحاد و زندقہ کی حمایت کرتے ہی رہیں گے ۔ مسٹر نیاز مسلمان رہ چکے ہیں اسلئے اندیشہ ہے کہ ہمارے ملک کے بعض نوجوانوں کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں ۔ ...... انہوں نے ہر ممکن طریقہ سے گمراہی پھیلانے کی کوشش کی ہے ...... مسٹر نیاز کو آزادی ہے کہ وہ صاف لفظوں میں کہیں کہ مسلمانوں کو الحاد کا پورا پورا ساتھ دینا چاہیئے ۔ اگر وہ ایسا کہیں تو ہمیں ان پر اعتراض کرنیکی ضرورت نہ ہو ، کیونکہ مسلمانوں کو معلوم ہو جاتے گا کہ ان کا عقیدہ کیا ہے ، مگر ہمارا اعتراض اس واقعہ پر ہے کہ وہ زندقہ کے طرفدار بن گئے ہیں ۔ مگر دعویٰ یہی کئے جا رہے ہیں کہ وہ زندقہ کے مخالف ہیں ، اور ایسی دلیلوں سے کام لے رہے ہیں جو دجل کی حد تک پہونچی ہوئی ہیں ۔ ...... ہمیں مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ مسٹر نیاز نے یہ نیا روپ بھر کر اپنے آپکو ہمیشہ کیلئے برباد کر لیا ۔ اب ہم انہیں نہ مسلمان سمجھ سکتے ہیں نہ مذہب کا حامی ، اب وہ الحاد پسند ہیں اور انکی باقی زندگی الحاد پرستی میں گذرے گی ۔ ہمیں معلوم ہے کہ مسٹر نیاز کے گروپ میں چند سچے اور مخلص نوجوان شامل ہیں ، سخت حیرت ہوگی اور سخت ماتم کا موجب ہوگا اگر یہ نوجوان اب بھی اس موقع پرست آدمی کیساتھ وابستہ رہیں ۔ ہم ایک لمحہ کیلئے بھی یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ مسٹر نیاز کے موجودہ خیالات ایماندارانہ ہیں ، کسی ایماندار انسان کے خیالات میں ایسی تبدیلی عقلاً ممکن ہی نہیں ...... اگر مسٹر نیاز کو اب بھی کوئی ایماندار سمجھے گا تو پھر لغت سے غداری کا لفظ ہمیشہ کیلئے نکال دینا پڑے گا ۔ " (روزانہ ہند مورخہ ستمبر سنہ ء)

ع کہئے یہ حکم ہے کہئے وہ ارشاد ہے ۔

ہم نے پچھلے مہینے میں نیاز کے متعلق جو کچھ عرض کیا تھا ، وہی سب کچھ اس مذکورہ بالا اقتباس میں ہے ۔ ہمیں نیاز کے متعلق اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں کہنا ہے ۔ انہوں نے حسب طور پر مسٹر رائے سوچتے ہیں ہم نے اسی طور پر مسٹر نیاز کے متعلق سوچا ۔ ہمیں یقین ہے کہ اب مولانا ملیح آبادی مسٹر رائے و نیاز کے اس وصف مشترک پر مذکورہ بالا

مقالات

عرب انشا پرداز اور اُن کی انشا پردازی

از سیّد ریاست علی ندوی،

(۳)

چوتھی صدی کے انشا پردازوں میں ابوبکر الصولی (۳۳۵ھ) جو کتاب "الاوراق" اور "ادب الکاتب" کا مصنف ہے، احمد بن عبد ربہ (۳۲۸) جس کی "العقد الفرید" ہے، اور جعفر بن قدامہ بن زیاد الکاتب (۳۱۹) ہیں۔ ہم اس صدی کے انشا پردازوں کے زمرے میں ایسے بہت سے لوگوں کو جانتے ہیں جنہوں نے ادب عربی کو اپنے فضل و کمال سے زینت دی، منجملہ اُن کے ابو الفضل بن عمید وزیر بنی بویہ (۳۶۰) ہے، اس کا باپ بھی جو دولتِ سامانیہ کے صیغہ مراسلات میں مامور تھا ایک بہترین انشا پرداز تھا، اور ابن عمید کی یہ خاص خصوصیت ہے کہ یہ فن کتابت میں طریقہ سجع اور فن بدیع کے اکثر حصوں کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ کہا جاتا ہے کہ عبد الحمید کے ہاتھوں طریقہ خط و کتابت کی بنا پڑی اور ابن عمید کے ہاتھوں اختتام کو پہونچی۔ جیسے یہ کہا جاتا ہے کہ ایک بادشاہ یعنی امرء القیس نے شعر و شاعری کی ابتدا کی اور دوسرے بادشاہ یعنی ابو نواس حمدانی نے اسے اختتام تک پہونچایا، اور جن اوصاف سے ابن عمید متصف ہے وہی صاحب بن عباد (۳۸۶) میں بھی پائے جاتے ہیں، کیونکہ اُس نے بھی تحقیق اور سجع میں وافر حصہ پایا ہے۔

وہ خود کہا کرتا تھا کہ "ایک صدی کے چار انشا پرداز ہیں۔ استاذ رئیس یعنی ابن عمید، استاذ ابو القاسم یعنی عبد العزیز بن یوسف ابو اسحٰق یعنی صابی، اور اگر چاہو تو چوتھے کا نام بھی لے لو یعنی میں،

اسی صدی میں ابوبکر خوارزمی (۳۸۳) کا نام بھی آئے گا، یہ اسلوب تحریر میں ابن عمید کا پیرو تھا، اس کے جو رسائل شایع ہو چکے ہیں وہ بلاغت و فصاحت کا ایک نمونہ ہیں، باوجودیکہ اس کی تحریریں مسجع ہوتی ہیں اور وہ اسے کبھی نظر انداز نہیں کرتا۔ اور بدیع الزمان ہمدانی صاحب "الرسائل" و "المقامات" اپنی طبعی حیثیات کے لحاظ سے خوارزمی پر تفوق رکھتا ہے، وہ سجع اور انواع بدیع سے اکثر اوقات کوئی تعرض نہیں کرتا۔ اور جب کبھی ان سے کام لیتا ہے تو خاص خاص مواقع پر مخصوص جملے استعمال کرتا ہے۔ لیکن پھر اپنی فطری حالت پر عود کر آتا ہے، اور اس طرح اس کے اقوال جا کر دل سے پیوست ہو جاتے ہیں،

ہم نے صابی کے ایسے جتنے رسائل پڑھے جو اُس نے خلفا کی جانب سے لکھے ہیں (بعض علیحدہ شایع ہوئے ہیں اور بعض رسائل کے اقتباسات "صبح الاعشیٰ" میں منقول ہیں) وہ ملاحت آمیز سجع کے بہترین قالب میں ڈھالے گئے ہیں۔ اور اُن کو بعض عہد ناموں میں وہ چھوڑ بھی دیتا ہے، اور اگر وہ بدیع کے طریقہ پر سجع کو چھوڑ دیتا تو اُس کی کتابیں اسلاف کی اُن کتابوں میں ہوتیں جن پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے، اور وہ آنے والے کے لئے بہترین معلم ثابت ہوتیں۔

اس صدی میں جو ماہرین گذرے ہیں اُن میں ابو الفرج الببغا، عبد اللہ بن عمرو الفیاض کاتب و ندیم سیف الدولہ، اور

ابوالقاسم علی الاسکافی نیشاپوری ہیں، ابوالقاسم جاحظ کی طرح اپنی نثر کے لحاظ سے علوئے رتبہ رکھتا ہے، اور اسی طرح شاعری میں کمرور نظر آتا ہے، پھر علی بن ہند مصنف "الکلم الروحانیہ" یحییٰ بن عدی (۳۶۴) صاحب "تہذیب الاخلاق" یا تسیاسۃ النفس"، ابن حبان بستی (۳۵۴) صاحب "روضۃ العقلاء"۔ حاتمی صاحب "الرسالۃ الحاتمیہ" (اس میں حاتمی اور متنبی کے درمیان متنبی کی سرقات و معائب شاعری پر جو مباحث ہوئے تھے، انکی تفصیل ہے) قاضی تنوخی (۳۸۳) مصنف "النشوار" و "الفرج بعد الشدۃ" قدامہ ابن جعفر الکاتب (۳۳۷) مصنف "نقد الشعر" و "کتاب الخراج" ابن نباتہ صاحب "الخطب"۔ ابوجعفر محمد بن عباس وزیر المکتفی والمقتدر، اور ابومنصور مغوی (۳۷۵) ہیں، اور اس صدی کے ادبار کا امام ابوالعلامعری ہے، اس پر شاعری زیادہ غالب تھی، اس کی تحریر مصنوعی اور دشوار تھی اس کی طبیعت میں خشکی زیادہ تھی، لیکن اس کا رسالہ "رسالۃ الغفران" جسے ابن قارح کے جواب میں لکھا تھا (دونوں رسائل طبع ہو چکے ہیں) اٹلی کے مشہور شاعر ڈانٹے کے افسانوں سے بہت زیادہ مشابہت رکھتا ہے اور وہ اُن خیالی افسانوں میں ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ شاعری اور تخیل میں معرہ کا ایک نابینا اٹلی کے ایک ماہر فن کا استاد ہے، یورپ کے بعض مستشرقین کے اس پر مباحث موجود ہیں کہ ڈانٹے نے اپنی حکایات الٰہیہ میں سے تین حکایات "جہنم"، "مطہر"، اور "جنت"، اور بالخصوص حکایت "جہنم"، کو جنہیں سنہ ۱۳۰۰ سے ۱۳۱۸ء تک اُس نے لکھا معری کے "رسالۃ الغفران" سے اقتباس کیا ہے، اور اس نے اپنا تخیل، تصور اسی کے بنائے ہوئے سانچے پر قایم کیا ہے۔

معری نے ابوتمام طائی کے دیوان پر "ذکری حبیب" کے نام سے "دیوان ابی عبادہ بحتری" پر "عبث الولید" کے نام سے اور ابوطیب متنبی کے دیوان پر "معجز احمد" کے نام سے جو کچھ لکھا ہے اُن سے اسرار زبان عربی پر اس کے احاطہ اور کلام عرب پر اس کے کامل عبور اور اُس کے ادبی تنقید کے بہترین ملکہ کا پتہ چلتا ہے، اُس نے اپنے "دیوان" اور "لزومیات" میں جس فلسفہ کی دعوت دی ہے اس میں معری یہاں پر انشاپرداز کے بجائے لغوی اور فلسفی کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس صدی کے ماہرین میں علی بن خلفا کا بھی شمار ہے، اس کی کتاب کے بعض اجزا قلقشندی نے اپنی "صبح الاعشیٰ" میں نقل کئے ہیں، پانچویں صدی ہجری بہت سے انشاپردازوں کے ظہور سے ممتاز ہے۔ زمانہ کے ہاتھوں جن جن کی کتابیں ہم تک پہونچ سکی ہیں اُن میں سب سے زیادہ مشہور امیر قابوس بن وشمگیر (۴۰۲) مصنف "کمال البلاغۃ" ہے کیونکہ اس کی کتابیں سراپا موسیقی اور بغیر قافیہ و ردیف کے معجزانہ شاعری ہیں، لیکن اس پر صنعت سجع غالب ہے، اور اس کے کلام میں یہی چیز بہت استوار نظر آتی ہے جو اُس کے تمام ادب میں نمایاں ہے۔ بخلاف ثعالبی (۴۲۹) کے جو اس عہد کے انشاپردازوں کا سرخیل ہے۔ اس کی تصنیفات زیادہ تر ادب اور لغت میں ہیں اس کی کتاب "فقہ اللغت"، کا مقدمہ اپنے زمانہ اور اپنے زمانہ مابعد کے طریقہ انشا ترسیل میں ایک بلند مرتبہ رکھتا ہے اور اگر وہ اپنی کتاب "یتیمۃ الدہر" میں جس میں اس عہد کے ادبار کے تذکرے ہیں، طریقہ سجع نہ اختیار کرتا جیسے اس نے اپنی کتاب "المضاف والمنسوب" اور "لطائف المعارف"، وغیرہ میں اسے نظر انداز کر دیا ہے، تو اُس پر کوئی خردہ گیری نہ کیجا سکتی، اور اسی طرح ابن رشیق قیروانی (۴۵۶) کے متعلق کہا جاتا ہے، یہ کتاب "العمدہ" کا مصنف ہے جو ادب کی اُن چند کتابوں میں ہے جن پر ابوعبداللہ بن شرف القیروانی نے اپنے "رسائل الانتقاد" میں تنقید کی ہے۔ لوگ زمانہ گذشتہ میں فن ادب کی تحصیل کے لئے ان چار کتابوں یعنی جاحظ کی "البیان والتبیین"، ابن قتیبہ کی "ادب الکاتب" مبرد کی "الکامل" اور ابوعلی القالی کی "الامالی" پر اعتماد کرتے تھے، پھر انہیں چار کتابوں کی یا تو شرح لکھی گئی یا ان کا خلاصہ تیار کیا گیا، اور یا ان پر

تنقید و تبصرے لکھے گئے۔ ان میں سے ایک ابن قتیبہ ابن السید البطلیوسی کی شرح ادب الکاتب ہے۔ اور ابو عبید البکری صاحب کتاب "معجم ما استعجم" نے ایک جز رمیں "التنبیہ علی اوہام ابی علی فی امالیہ" کے نام سے امالی القالی پر تنقید لکھی ہے۔

چوتھی صدی کی ابتدا میں جن انشا پردازوں کی وفات ہوئی ان میں سے ایک ابو حیان توحیدی ہے۔ یہ انشا میں ایک خاص طریقہ کا موجد ہے۔ جیسا کہ ہم نے اس کی کتاب "المقابسات"۔ رسالۃ الصدیق والصدیقہ" اور "الاشارات الالٰہیہ" میں مطالعہ کیا ہے، ثعالبی نے کہا کہ آل بویہ کے منشیوں میں صرف تین انشا پرداز یعنی ابو القاسم عبد العزیز بن یوسف، ابو احمد عبد الرحمن بن الفضل شیرازی اور ابو القاسم علی بن قاسم قاشانی ہیں، پھر ان میں سے ہر ایک کے کلام کے چند لطیف نمونے دئے ہیں اس صدی کے مولفین اور بہترین انشا پردازوں کے طبقہ اولی میں یہ چند لوگ شمار کئے جا سکتے ہیں۔ ابو الفرج اصفہانی صاحب "الاغانی"۔ ابو الحسن علی بن عبد العزیز صاحب کتاب "الوساطۃ بین المتنبی وخصومہ" اور امیر عبد اللہ میکالی، میکالی بہترین منشیوں میں ہے، لیکن اس کی تحریر میں سجع بہت نمایاں ہے، اور اسی طرح ابو النصر عتبی کی کتاب "تاریخ ابن سبکتگین" المعروف یمینی کی عبارت میں بھی سجع غالب ہے۔ باوجودیکہ یہ بہترین انشا پردازوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

اس صدی کے انشا پردازوں میں ابن موصلایا (۴۹۸ھ)، ابن ناقیا (۴۸۵ھ) اور الموفق بن خلال ہیں، الموفق مصر میں حافظ عبیدی کے عہد میں دیوان انشا کا افسر اعلی تھا، (اسے خط و کتابت پر کامل عبور تھا جس طرح چاہتا لکھ سکتا تھا) یہ اپنے رسائل کے لکھنے میں عبارت میں سجع وغیرہ کے لحاظ کے بجائے معانی پر زیادہ توجہ رکھتا تھا، فن انشا مصر میں دولت علویہ کے زمانہ میں پورے شباب پر تھا۔ اور ہمیشہ کوئی ایک انشا پرداز شخص دیوان مکاتبات میں بحیثیت افسر خدمات انجام دیا کرتا تھا، اور اپنے قلم کے زور سے اپنا اقتدار قائم رکھتا تھا، اس صدی کے انشا پردازوں میں جن لوگوں کے رسائل اب تک ملتے ہیں وہ ہلال بن محسن صابی (۴۴۸ھ) اور حفید ابو اسحق صاحب "الرسائل" اور مولف کتاب "اخبار الوزراء" ہیں، اور اس صدی کے بہترین منشیوں میں ابن مسکویہ ہے "تہذیب الاخلاق" "الفوز الاصغر" اور "تجارب الامم" کا مولف ہے اگرچہ لوگوں نے اسے طبقات حکماء میں داخل کیا ہے۔ لیکن اس کی تحریر انشاء مرسل بدیع کا ایک نمونہ ہے۔ اور منجملہ ان منشیوں کے ایک ابو طاہر محمد بن حیدر (۵۱۷ھ) بھی ہے، یہ "قانون البلاغت" کا مصنف ہے جو اب تک زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکی۔

اسی صدی میں اندلس میں وزیر ابن زیدون (۴۶۳ھ) اپنی نظم ونثر دونوں میں ماہر گذرا ہے، اس کے رسائل جو ولادہ بنت المستکفی کی زبان سے ادا کئے گئے ہیں وہ طرب انگیز ہیں۔ اسی طرح وزیر ابن حزم اندلسی (۴۵۶ھ) کے متعلق کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے زمانہ کے تمام علماء میں بہترین انشا پرداز تھے، اور ان کی بہت سی بہتر بہتر تصنیفیں ہیں، خصوصاً ان کی کتاب "طوق الحمامہ" اور ایک رسالہ جو فن اخلاق میں ہے، ترقی یافتہ ادب کا بین ثبوت، اور اپنے زمانہ کی تحریر کا نمونہ پیش کرتی ہیں جو اپنی ادبی حیثیات کے لحاظ سے فرانس کے نونس چہار دہم کے مشابہ ہے۔

اندلس میں اسی صدی یا اس کے قریب قریب زمانہ میں بہت سے انشا پرداز پیدا ہوئے جن میں بعض ایسے ہیں جنہوں نے بار وزارت کو سنبھالا، اور زیادہ تر یہ دیکھا گیا ہے کہ گذشتہ زمانہ میں جو بہترین انشا پرداز ہوتا وہی عہدہ وزارت پر بھی سرفراز کیا جاتا جس طرح اس زمانہ میں سحر بیان مقرر وزیر اعظم کے عہدہ پر متمکن ہوتا ہے، اس عہد کے انشا پردازوں کے چند نام یہ ہیں۔ باجی، ابن باغ، ابن صاج،

ابن عبدون، ابن ابی خصال، ابن عبد العزیز، ابن سقاط، ابن قصرہ (ابن قصرہ قدیم انشاپردازی کے طریقہ پر شاندار الفاظ، صحیح معانی استعمال کرتا تھا، طریقہ سجع وغیرہ کی طرف التفات نہیں کرتا تھا جیساکہ بعض پچھلے انشاپردازوں نے یہ طریقہ اختیار کرلیا تھا، البتہ اس کے بعض رسائل کی عبارتوں میں بلاتکلف سجع بھی آگیا ہے، لیکن اس میں آتا ہے آورد نہیں) ابن عبد الغفور، ابن عمار، ابن افلس، ابن سالم، منذر بن سعید، ابن الامین، ایمن لبانہ، ابن عبد البر القرطبی، ابن سعید مورخ، ابن حیان، ابن قوطیہ، ابو عبید بکری صاحب "معجم ما استعجم" و "المسالک الممالک"، ابن طفیل صاحب رسالہ "حی بن یقظان" جس میں فلسفہ نشو و ارتقاء کی طرف بعض اشارات ہیں، بطلیموسی، ابن تومار، ابن ہود، نحلی، اشبونی قسطلی، ابن لبون، ابن زیمن، نمیری، سرقسطی، ابن تلاس، قضاعی، بہاری، حجاری، دانی، بلنسی اور طلیطلی وغیرہ ہیں، ان میں سے ہر ایک شخص بہترین انشاپرداز ہے جس کی عبارت صاف اور الفاظ شستہ ہوتے تھے، اور یہ کوئی حیرت انگیز امر نہیں اسلئے کہ اندلس نے ادبیات کے لئے ایسے بہت سے جلیل القدر علما پیدا کئے ہیں جن کی تحریروں سے عربیت کی خوشبو آتی ہے۔ اسپین کے بعض علماء مستشرقین نے اندلس کے علماء عرب کی سوانح عمریاں جمع کی ہیں، اور اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اندلس کے اصحاب منزلت کی تعداد تیس ہزار ہے جن میں عالم، ادیب، فقیہ، مہندس اور طبیب وغیرہ ہیں، اور فتح ابن خاقان (۵۲۹ھ) صاحب "قلائد العقیان" و "مطمح الانفس" نے بھی بعض ادباء کے تذکرے جمع کئے ہیں جیسے کہ ابن بسام نے "الذخیرہ" میں علماء اندلس اور دوسرے لوگوں کو جمع کیا ہے۔

وزراء بغداد میں بہترین انشاپردازوں میں سے وزیر علی بن عیسیٰ، وزیر ابو الحسن ابن فرات، اور یحیٰی بن عیسیٰ بہت شہرت رکھتے ہیں علی بن عیسیٰ نے خط کتابت میں جو طریقہ اختیار کیا، اس میں اُنکا کوئی ہمسر نہیں ہے، ان انشاپردازوں کی جماعت میں ابو علی بن خاقان اور محمد بن عبد الملک وغیرہ بھی ہیں، ان کے علاوہ اور بہت سے ایسے انشاپرداز تھے جن میں سے بعض نمایاں اور بعض گمنام رہتے تھے، لیکن ان مشہور لوگوں سے گمنام لوگ زیادہ ماہر ہوتے تھے،

اس زمانہ میں جو لوگ اپنی نثر کی وجہ سے زیادہ مشہور ہوئے، ان میں حریری صاحب "مقامات" و "درۃ الغواص" ہے، اسے اپنی "مقامات" کی وجہ سے انشاء میں پورا پورا حصہ ملا لیکن اس کی نثر سراپا تصنع و تکلف ہے، اور اگر ہمیں اس کی اور حجۃ الاسلام غزالی (۵۰۵ھ) کی نثر میں ترجیح کا اختیار دیا جائے تو ہم بلاتکلف غزالی کی تحریر کو ترجیح دیں گے، اور خصوصاً اُن کی "احیاء" کی تیسری جلد، اور ان کے بعض رسائل مثلاً "التفرقۃ بین الاسلام والزندقہ"، "تہافۃ الفلاسفہ" "الرد علی الباطنیہ" میں ان کی جودت طبع نمایاں نظر آتی ہے، یا راغب اصفہانی کی نثر جو ان کے "الذریعۃ الی المکارم الشریعہ"، "تفصیل النشاتین" اور "المحاضرات" میں یا ماوردی کی نثر، جو "ادب الدنیا والدین" اور "الاحکام السلطانیہ" میں دکھائی دیتی ہے،

ابن خشاب کہا کرتا تھا کہ "حریری صرف "مقامات" کا آدمی ہے، یعنی وہ اس اسلوب کے علاوہ کسی دوسرے اسلوب میں عمدہ نثر نہیں لکھ سکتا اس لئے اگر اس کے علاوہ وہ کہیں اور قدم رکھے تو کچھ نہیں کہہ سکتا، اور شاید جار اللہ زمخشری (۵۳۸ھ) کو اُس کی عمدہ نثر کی وجہ سے حریری پر فوقیت دیجاسکتی ہے۔ کیونکہ اُس کی مسجع عبارت ہوتی تھی۔ اس کی تفسیر "کشاف" "الکلم النوابغ" اور "الفائق"، اپنی عمدگی اور پاکیزگی کے لحاظ سے انتہائے کمال پر ہے۔ زمخشری اور رشید الدین الوطواط کے درمیان مناظرہ تھا۔ لیکن زمخشری کا اسلوب بیان اعلیٰ اور اپنی علمیت کے

اعتبار سے زیادہ وسعت رکھتا تھا، اور اسی صدی کے انشا پردازوں میں مشہور واعظ و مصنف ابوالفرج ابن جوزی (۵۹۷) کا بھی شمار ہے۔ انہوں نے بہت سی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ منجملہ ان کتابوں کے ایک "الاذکیا" اور ایک "اخبار الحمقاء والمغفلین" ہے، اس قسم کی یہ کتابیں ایسی ہیں جن پر فرانسیسی نام فولوکلر (قصص۔ روایت) FLOKLORE یعنی عادات و تقالید کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ اور عربی میں اس قسم کی اور بہت سی کتابیں ہیں جیسے حسن بن حبیب مغسر کی "عقلاء المجانین" ہے۔ تاریخ کا بیان ہے کہ بہت سے انشا پردازوں نے خصوصاً قرن اول میں بہت سے ایسے قصص و حکایات وضع کئے جو اس زمانہ کے مغربی اقوام کے قصص (ناول) سے زیادہ مشابہ ہوتے تھے، جن سے ان کا مقصود دماغی تربیت، نشر دعوت، اور عامۃ الناس کے لئے مشاغل پیدا کرنا تھا، کیونکہ وہ مہمات حکومت میں حصہ لینے سے روکے جاتے تھے، اور ان لوگوں نے بہت سی رات کو سنائی جانے والی داستانیں اور خرافات لکھے، جن میں سے بعض فارسی، ہندی، رومی اور بابلی زبان سے عربی میں ترجمے کئے اور بعض لوگوں نے خود تصنیف کئے، اور بعض لوگوں نے عشق و محبت کی داستانیں قلمبند کیں، جن میں ان عشاق کے حالات درج کئے جو زمانہ جاہلیت یا اسلام میں گرفتار عشق ہوئے تھے۔ بعض لوگوں نے صرف خوش طبع معشوقوں کا ذکر کیا، اور بعض لوگوں نے ان عشاق کے حالات لکھے جن کا تذکرہ صرف داستاں گوئی میں کیا جاتا ہے۔ پھر متاخرین نے الف لیلہ و لیلتہ لکھی جس نے مشرقی عرب کی طرح مغرب میں بھی شہرت حاصل کی اور یورپ کی اکثر زبانوں میں اس کے ترجمے ہو گئے، اسی طرح قصہ سندباد بحری "الظاہر"۔ اور "تغریبتہ بنی ہلال" کے متعلق کہا جاتا ہے، لیکن ان کتابوں کو ادبیات عالیہ میں شمار نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ عامۃ الناس کی کتابیں ہیں۔ ان کو بلند پایہ انشا پردازوں نے نہیں لکھا ہے۔

اور جو لوگ اس صدی میں پیدا ہوئے اُن میں ضیاء الدین بن اثیر مصنف "المثل السائر" ہیں، کیونکہ یہ بھی سجع بدیع کے لحاظ سے اچھے انشا پرداز تھے۔ یہ وہی ہیں جن پر ابن ابی الحدید مدائینی نے خردہ گیری کی ہے، اور انہوں نے اپنی نکتہ چینیوں کو ایک کتاب میں جمع کیا ہے جس کا نام "الفلک الدائر علی المثل السائر" رکھا ہے۔

اس زمانہ کے انشا پردازوں کے سرخیل یقینی طور پر قاضی فاضل وزیر صلاح الدین ہیں۔ وہ ہر اعتبار سے سید المنشئین ہیں، عام ازیں کہ سجع کا لحاظ کریں یا نہ کریں۔ گرچہ بالعموم سجع کا دامن اُن سے نہیں چھوٹتا تھا، اگر ان کے تمام رسائل موجود ہوتے تو بہت سی جلدیں ہو جاتیں، لیکن اُن کی تحریر محض تھوڑی سی "صبح الاعشی" میں ملتی ہے، اور ان کے چند دیگر "رسائل" علٰحدہ ہیں اور اُن کی کچھ عبارت "الروضتین" میں منقول ہے، ان کی تحریر سے طبیعت کو ایک خاص انبساط حاصل ہوتا ہے۔ ان کے بعد عماد الدین کاتب اصفہانی کا مرتبہ آتا ہے، یہ انہیں کے طریقہ پر گامزن ہوئے۔ لیکن ان کا دوسرے انشا پردازوں پر اپنے تفوق کا ادعا کرنا ایسا ہی ہے، جیسا مصنف "المثل السائر" نے کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ادعا سے وقار علم کو صدمہ پہونچتا ہے، گرچہ وہ صحیح کیوں نہ ہو، ان کی کتاب "الفتح القسی" اور "زبدۃ النصرۃ" ان کے لٹریچر کا نمونہ اور ان کے سجع و ترسیل کے صحیح نمونے ہیں، کاتب فاضل عماد الدین کے عہد میں ایک دوسرا ہزل گو انشا پرداز جوہرانی (رکن الدین ابو عبداللہ ۵۸۵) نامی پیدا ہوا، اس نے "المنامات والرسائل" لکھی ہے جو ابھی تک طبع نہ ہو سکی، جب وہ الجزائر سے شام کی طرف ہجرت کر کے آیا تو اسے یقین ہو گیا کہ قاضی عماد الدین کی موجودگی میں اُس کی بضاعت علم کام نہ آ سکی۔ اس لئے ہزل گوئی کا طریقہ اختیار کرنے پر مجبور ہوا۔ جیسا کہ ابن

خلکان نے وفیات الاعیان میں کہا ہے .... اس لئے ہزل گوئی کی طرف متوجہ ہوا اور اسی میں اپنا بازار گرم کیا" اور اسی صدی میں ابن منقذ صاحب کتاب" الاعتبار" ہے، اس کتاب میں شجاعت کے وہ قصّے لکھے ہیں جو اسے اور اُس کے خاندان کو پہلی جنگ صلیبی میں قلعہ سیرز پر پیش آئے، اور اس میں صلیبیوں کے عادات، حالات، اور اُن کی بہادری کا عجیب و غریب طریقہ سے ذکر کیا ہے - پھر یحییٰ بن زیاد شیبانی ہے، اس پر امور تحریر روانت کا علم ختم ہوگیا - اور پھر ابن صیرفی مصنف " الاشارۃ " ——— اور" قانون دیوان الرسائل " ہے -

ساتویں صدی ہجری - ساتویں صدی کے انشا پردازوں میں جو لوگ انشار کے اعلیٰ طریقوں پر گامزن ہوئے ان میں محی الدین عبد الظاہر اور ان کے لڑکے محمد فتح الدین ہیں، یہ دونوں باپ بیٹے اپنے زمانہ اور اپنے قریب کے زمانہ کے نظام انشار کے واضع ہیں، ابن عبد الظاہر کی جو تحریر " صبح الاعشیٰ "، میں منقول ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بلاغت فاضل عماد اور دوسرے اسلاف کی بہ نسبت گری ہوئی ہے - اور جو لوگ شہروں اور آثار کے نقشے کھینچنے میں ماہر ہوئے ان میں سے فلسفی عبد اللطیف بغدادی (۶۲۹) ہے، اس کی کتاب" الافادۃ والاعتبار" اس امر کی بنا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے بہترین بلغار میں تھا اور اسی صدی میں منجملہ اُن کے وزیر عبد المحسن ابن حمو (۶۴۳)، بہاء الدین ربلی اور کمال ابن عدیم (۶۶۶) ہیں اور ابن جبیر کنانی اندلسی (۶۱۴) کا سفر نامہ مشرق بھی ادب عالی میں شمار کیا جاتا ہے، اس لئے کہ اس نے اپنے زمانہ کے شہروں کے جو حالات بیان کئے ہیں اس میں اپنے اسلاف مثلاً ابن بطلان اور ابن فضلان سے فوقیت لے گیا ہے - اسی طرح اس کو ان شہروں کی نقشہ کشی میں اپنے بعد کے آنے والوں مثلاً عبدری (۶۸۸)، بلوی (۷۴۰)، ابن بطوطہ (۷۷۹) زرکشی (۷۹۴) اور ابن ابی البرکات نجدی (۸۹۵) پر تفوق حاصل ہے ابن ابی البرکات کا سفر پانچویں صدی کے نصف اول میں عراق سے شام کی طرف ہوا تھا اور اپنی مطول جغرافیانہ کتابوں میں جو آثار چھوڑے ہیں - اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہروں اور باشندوں کے حالات بیان کرنے میں اس کے فضل و ادب اور اس کے صحیح ذوق کا پتہ چلتا ہے، اور ہم نے معجم البلدان میں بھی اسی قسم کی تھوڑی بہت چیزیں پڑھی ہیں - اور احمد ابن فضلان کی عبارتیں بھی مطالعہ کی ہیں جس کو ۳۰۹ھ میں المقتدر باللہ العباسی نے شاہ صقالبہ کے پاس بھیجا تھا، اور ان سے بھی اس کے ذوق، فضل، علم اور ادب کا پتہ چلتا ہے -

بس یہی ہے ساتویں صدی ہجری تک کے عرب انشا پردازوں کے ادبی خدمات کا مختصر جائزہ - اگر کبھی موقع ملا تو اس کے بعد کے دور پر بھی نظر ڈالی جائیگی - سردست اس سلسلہ کا یہیں پر خاتمہ کیا جاتا ہے -

ایران

رضا شاہ پہلوی کے دَورِ حکومت میں

از جناب سید محبوب احمد صاحب وارثی بی۔اے۔ ال۔ال۔بی (علیگ)

جنگِ عظیم سے پیشتر ایران کی تصویر اگر آپنے دیکھی ہے اور جنگِ عظیم سے فوراً بعد کے حالات اگر آپ کو معلوم ہیں تو آپ میرے اس بیان کی تصدیق کریں گے کہ اُس وقت ایران میں فی الحقیقت کوئی ایرانی حکومت نہ تھی، بلکہ ملک مختلف جنگجو فرقوں کی ذاتی ملک بنا ہوا تھا۔ زندگی کے ہر شعبے میں انحطاط اور پستی کا عکس صاف دکھائی دے رہا تھا۔ تعلیمی پستی۔ مالی کمزوری اور اقتصادی زبون حالی کے علاوہ فوج کی ابتر حالت خاص طور پر ناقابلِ اطمینان تھی۔ بادشاہ وقت کو اپنی رنگ رلیوں سے فرصت نہ تھی۔ رعایا کو ملک کی فلاح و بہبود کی فکر نہ تھی۔ فوج کی ذہنیت خراب ہو چکی تھی۔ ملک کی حفاظت کا خیال ملک کے باشندوں کے دماغ سے نکل چکا تھا۔ ملک کی تجارت، صنعت حرفت، یہانتک کہ ملک کے سرمایہ پر بھی غیر ملکیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ صرف نام نہاد حکومت باقی رہگئی تھی، جس کی باگ ڈور ایک عیش پسند اور بے عمل بادشاہ کے ہاتھ میں تھی۔ غرضکہ ایران ایک چراغِ سحری تھا ہوا کے ایک جھونکے کا انتظار تھا اور بس۔

خدا خدا کر کے سنہ ۱۹۱۸ء میں جنگِ عظیم ختم ہوئی۔ تقریباً تین سال صلحناموں کی شرایط کے مطابق "مالِ غنیمت" کی تقسیم میں صرف ہوگئے۔ ایران کے حصے میں نقصان کے سوا کچھ نہ آیا۔ بالآخر قدرت کو ایران کی قسمت پر ترس آیا اور ایران کی فوج کے ایک وفادار جانباز اور عاقبت اندیش سپاہی کو ایران کی اصلاح اور از سرِ نو تعمیر کی خدمت پر مامور کیا گیا۔

اس ضمن میں اس سپاہی کی سوانح حیات کا مختصر تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ دنیا جانتی ہے کہ اس سپاہی کا نام اُس وقت صرف محمد رضا تھا۔ لیکن اب دنیا اُسے رضا شاہ پہلوی کے نام سے یاد کرتی ہے۔ رضا شاہ پہلوی کی صحیح تاریخ پیدایش ہنوز معلوم نہیں ہو سکی ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ سنہ ۱۸۷۳ء میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والدِ بزرگوار ایک معمولی کاشتکار تھے اور ان کی اوائل زندگی غریب کسانوں اور جاہل کاشتکاروں میں بسر ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے ایک معمولی مدرسے میں ہوئی جس کی مدّت نہایت قلیل بیان کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس ابتدائی تعلیم کے بعد انہوں نے کسی اسکول یا کالج میں کبھی باضابطہ تعلیم حاصل نہ کی۔

شباب کی پہلی منزل میں قدم رکھتے ہی وہ ایک سپاہی کی حیثیت سے ایران کی فوج میں داخل ہوئے۔ اور اُس وقت تک اس خدمت کو انجام دیتے رہے، جب تک قدرت نے ان کو دوسری اہم اور شاندار خدمت تفویض نہ کی۔ جنگِ عظیم نے ایران کو جو نقصان پہونچائے تھے اُن کا احساس ایران کے نوجوانوں کے دلوں میں پیدا ہوا اور انہوں نے ایران کی اصلاح کی

تھانی۔ نوجوانوں کے دلوں میں احساس تو پیدا ہو گیا لیکن اس احساس سے ملک کو مستفید کرنے کے لئے ایک قائد کی ضرورت تھی۔ قدرت نے اس ضرورت کی تکمیل کے لئے رضا شاہ پہلوی کو منتخب کر لیا تھا۔ چنانچہ نوجوانوں کی نگاہیں آپ کی جانب اٹھیں اور انہوں نے آپ کی قیادت میں اپنا کام شروع کیا۔

ضرورت تھی کہ سب سے پہلے بادشاہ وقت کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا جائے۔ کیونکہ اس بادشاہ کو تخت سے اتارے بغیر اُنہیں اپنے مقصد میں کامیابی ممکن نہ تھی۔ چنانچہ ۲۱ فروری ۱۹۲۱ء کو صرف ڈھائی ہزار فوج نے رضا شاہ پہلوی کے زیر کمان شب وقت ایران کے دار السلطنت پر حملہ کیا اور ایک قطرہ خون بہائے بغیر آسانی کے ساتھ دار السلطنت پر قبضہ کر لیا۔ تین سال تک رضا شاہ پہلوی اپنی قلیل فوج اور ملک کے نوجوانوں کی امداد سے ایران کے بادشاہ کا کامیاب مقابلہ کرتے رہے۔ بالآخر ۲۵ اپریل ۱۹۲۴ء کو ایران کی پارلیامنٹ (مجلس ایران) نے احمد شاہ قاچار کو تخت سے اُتار کر زمام حکومت رضا شاہ پہلوی کے سپرد کر دی۔

قبل اس کے کہ رضا شاہ پہلوی کے عہد حکومت میں ایران کے اصلاحات اور ترقیوں کا ذکر کروں مناسب سمجھتا ہوں کہ رضا شاہ کے مشن سے آپ کو واقف کر دوں۔ یہ مشن مجھ سے نہیں بلکہ خود رضا شاہ کی زبانی سُنیئے۔

۵ جنوری ۱۹۳۳ء کو ایک ملاقات کے دوران میں اپنی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے مشہور انگریز سیاح روسیٹا فوربس کو رضا شاہ پہلوی نے ذیل کا جو بیان دیا تھا اس سے اُن کے مشن کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے :-

"میرے ملک کو سب سے پہلے غیر ملکیوں اور بدیسیوں کی امداد کے بغیر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا طریقہ سیکھنا ضروری ہے امید کی جاتی ہے کہ چند سال بعد امور سلطنت کی انجام دہی کے لئے غیر ایرانیوں کی تقرری کی ضرورت باقی نہ رہیگی۔ اور ہمارے ملک کے باشندے اس بار گراں کو آپ سنبھال لیں گے۔ آپ کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم لوگ ایک بڑی سلطنت کے چشم و چراغ ہیں۔ اور ہمارے تجربات اُن صدیوں سے ہمیں ورثہ میں ملے ہیں جب ایشیا تمام اقوام عالم کی رہنمائی اور رہبری کر رہا تھا۔

ہمارے ملک کے باشندے عرصہ دراز تک غیر ملکیوں کی معاونت کے سہارے زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اب وہ اپنے جوہر کو پہچانیں اور اُن میں آزادیٔ فکر اور آزادیٔ عمل کا صحیح جذبہ پیدا ہو۔

ہر ملک کی تہذیب جداگانہ ہے۔ میں ہرگز یہ نہیں چاہتا ہوں کہ ایرانی انگریزوں کی اندھی تقلید شروع کر دیں۔ ایرانیوں کو مقلد ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ خود شاندار روایتوں کے حامل ہیں۔ میں اپنے ملک کے باشندوں کو بہترین ایرانی بنانے کا آرزو مند ہوں۔ میں اُنہیں نہ بالکل مغربی دیکھنا چاہتا ہوں اور نہ سراسر مشرقی۔

ایران اپنے گھر کی ملکہ ہے اور اُسے استحقاق حاصل ہے کہ وہ اپنی دولت میں اضافہ کرے۔ اور اس کی حفاظت خود اپنی قوت بازو سے کرنے کی طاقت پیدا کرے۔" (ڈیلی میل مورخہ ۶ جنوری ۱۹۳۳ء)

اصلاحات

فوج رضا شاہ پہلوی نے ایک سپاہی ہونے کی حیثیت سے سب سے پہلے فوجی اصلاحات کی ضرورت محسوس کی۔ ذاتی تجربات کی بنا پر

نہیں فوج کی از سرِ نو تنظیم میں کوئی خاص دشواری محسوس نہ ہوئی۔ ۱۹۲۵ء میں رضا شاہ پہلوی نے ایران کی مجلس قانون ساز
سے ایک فوجی قانون پاس کرایا جس کے رُو سے فوج کے جملہ انتظامات وزارت جنگ کے سپرد کر دیے گئے۔ اور فوج کی تعداد
میں اضافہ کرنے کی خاطر ملک میں فوجی تعلیم اور فوجی خدمات جبری قرار دی گئیں۔ لیکن یونیورسٹی کی تعلیم یافتہ لوگوں کو بری
کر دیا گیا۔ فوجی افسروں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک کالج بھی قایم کیا گیا۔ جس میں ہنوز افسروں کو جدید ترین فوجی تعلیم دیجاتی ہے
خلیج ایران میں بحری فوج کا ایک دستہ تیار کیا گیا جس کے پاس جدید ترین بحری سامان جنگ موجود ہیں۔ ہوائی حملوں سے بچنے
کے لئے ملک کی ضرورت کے مطابق ایران نے ہوائی بیڑے بھی تیار کر لئے ہیں جو ایرانی ہوابازوں کی نگرانی میں نہایت مستعدی
اور دلیری کے ساتھ اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ جنگ چھڑنے سے پہلے ہی ایران کے پاس تقریباً پچاس ہزار
باضابطہ اور مسلح فوج موجود تھی جس کی دیکھ بھال خود رضا شاہ پہلوی کیا کرتے ہیں۔

تعلیم احمد شاہ قاچاری سابق شہنشاہ ایران کے دورِ حکومت میں ملک میں عام جہالت کا دور دورہ تھا۔ ملک کے باشندوں
کو تعلیم حاصل کرنے کا نہ خود شوق تھا اور نہ حکومت کو اس کا خیال تھا۔ حکومت کے مختلف شعبوں میں غیر ملکی تعلیمیافتہ اشخاص
کثرت سے کام کر رہے تھے اور ملک کے باشندے جہالت کے باعث نانِ شبینہ کے محتاج تھے۔ ملک کی تجارت صنعت و حرفت
غرضکہ ہر چیز پر بدیسیوں کا تسلط تھا کیونکہ وہ لوگ تعلیمیافتہ تھے۔ اور ایرانی تعلیم سے نابلد تھے۔ ملک میں جہالت اس شدت
کے ساتھ کارفرما تھی کہ یہاں محض دو ایک اسکول کالج کھولنے سے ملک کی عام جہالت ہرگز دُور نہ ہو سکتی تھی اسلئے رضا شاہ
پہلوی نے ایک مکمل اسکیم کے ذریعہ ملک میں عام تعلیم رائج کی۔ ابتدائی تعلیم ہر مرد اور عورت کے لئے جبری اور لازمی قرار
دی گئی۔ اور مزدور پیشہ لوگوں کی ابتدائی تعلیم کے لئے ہر شہر اور قصبے میں شبینہ مدرسے قایم کئے گئے۔ اس کے علاوہ ملک
کے مختلف مقامات پر حکومت کی جانب سے متعدد اسکول اور کالج قایم کئے گئے۔ جب ان سے بھی ملک کی ضرورت پوری
ہوتی نظر نہ آئی تو حکومت نے ایرانی نوجوانوں کو وظیفے دیکر یورپ کے مختلف ترقی یافتہ ممالک میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا۔ ایرانی
طالبعلم ہر سال کثیر تعداد میں حکومت سے وظیفے لیکر مختلف ممالک میں مختلف علوم و فنون سیکھنے جایا کرتے ہیں۔ موجودہ جنگ
شروع ہونے سے پیشتر ایران کے تقریباً پندرہ سو طلبا جن میں لڑکیاں بھی شامل ہیں یورپ کے مختلف ممالک میں مختلف
علوم کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ آج ایران کے ۲۴ صوبوں میں مرد اور عورت یکساں طور پر تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

۱۹۲۱ء میں ایران میں ۶۲۱ اسکول تھے۔ جن میں ۵۵ ہزار طلبا تعلیم پا رہے تھے۔ لیکن اسکولوں کی تعداد اب تقریباً
ہزار تک پہونچ چکی ہے اور طلبہ کی تعداد ۲۷۵۶۸۰ ہے۔ ان اسکولوں میں ہر قسم کی جدید تعلیم دیجاتی ہے۔

عام تعلیم کے ساتھ حکومت کی طرف سے جسمانی تعلیم کا بھی نہایت اعلیٰ انتظام ہے۔ جسمانی ورزش کے لئے ہر جگہ اسکول
اکھاڑے حکومت کے خرچ سے قایم ہیں۔ جہاں ورزش کے جدید ترین سامان موجود ہیں اور ورزش کی تعلیم کے لئے
اساتذہ بھی مقرر کر دئے گئے ہیں۔

ایران میں عام تعلیم رائج کرنے کا ایک مقصد یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ تعلیم کے ذریعے ایرانیوں کے دلوں میں وطن کی محبت کا جذبہ پیدا کیا جائے تاکہ ہر تعلیمیافتہ ایران کی ترقی کا دل سے خواہشمند ہو، اور اپنی خواہش کی تکمیل کی کوشش کرے۔ چنانچہ ایرانی طلبہ کی سب سے پہلی بڑی جماعت کے فرانس روانہ ہونے کے وقت رضا شاہ پہلوی نے طلبہ کو جو پیغام دیا تھا، اُس سے بھی اس مقصد کا پتہ لگتا ہے:-

"تمہارے پہونچنے سے پیشتر میں تمہیں یہ بتادینا ضروری سمجھتا ہوں کہ فرانس ایک ایسا ملک ہے جہاں حُبّ الوطنی کی سب سے زیادہ قدر ہے۔ تمہیں فرانسیسیوں سے سبق حاصل کرنا چاہیئے، اور جس طرح وہ اپنے ملک سے محبت کرتے ہیں اُسی طرح تمہیں بھی ایران سے محبت کرنا چاہیئے۔ مجھے امید ہے کہ فرانس سے واپس آکر تم ایران پر نثار ہونا اپنی زندگی کا مقصد اولین اور اپنی تعلیم کا ماحصل تصوّر کروگے"

قوانین اس باب میں رضا شاہ پہلوی نے سب سے پہلے سرمایہ داری کے قانون میں اصلاحات کی۔ ملک کے مروجہ قانون کی مطابق غیر ملکیوں کو ایران میں اپنا سرمایہ لگانے سے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ اس آزادی اور ملک کی مالی ابتری سے فائدہ اُٹھا کر غیر ملکیوں نے اپنے سرمایہ کا جال ایران کے ہر گوشہ میں بچھا رکھا تھا، اور وہ دن دُور نہ تھا جب کہ تجارت اور صنعت وحرفت پر قابو پانے کے بعد غیر ملکی سرمایہ دار حکومت پر بھی قبضہ جما لیتے۔ چنانچہ اس خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے ۱۹۲۹ء میں سرمایہ داری کا قانون پاس کیا گیا، جس کے رُو سے غیر ملکی سرمایہ داروں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کا خاتمہ ہوگیا۔ اور ملک اس خطرہ سے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوگیا۔

ضابطہ دیوانی کا نیا قانون پاس کرکے لگان کے اصُول متعین کردئے گئے۔ اور قانون شریعت کو ملک کی ضرورت کے مطابق باضابطہ طور پر ملک میں رائج کیا گیا۔ جنگ عظیم سے پیشتر ایران میں شخصی آزادی کے نام سے بھی لوگ واقف نہ تھے۔ نئے تعزیرات ایران نے ملک میں پہلی شخصی آزادی قایم کی اور شہریوں کے حقوق وفرائض بھی متعین کردئے۔

مختلف تجارتی قوانین پاس کرکے ملک کی تجارت اور صنعت وحرفت کو پستی کے غار سے نکال کر ترقی کی راہ پر لگا دیا گیا، جس پر آج وہ نہایت تیزی کے ساتھ گامزن ہیں۔ تجارتی قوانین نے ملک کی اقتصادی حالت کو بھی درست کردیا ہے۔

ایران کی مرکزی حکومت کے نیم جان ہونے کے باعث ملک کے اندرونی انتظامات اور بیرونی معاملات پر مہلک اثر پڑ رہا تھا۔ چنانچہ ایک قانون کے ذریعے مرکزی حکومت کے اقتدار کو از سر نو قایم کیا گیا۔ اس قانون کی مدد سے ایران کے اندرونی انتظامات بھی درست ہوگئے۔ اور بیرونی ممالک نے بھی ایران کی آزادی اور بڑھتی ہوئی طاقت کو تسلیم کرلیا۔

صنعت وحرفت ایران میں جنگ عظیم سے پہلے صنعت وحرفت کو ترقی دینے کا خیال بھی موجود نہ تھا۔ اسّی فیصدی باشندے کاشتکار ہونے کی وجہ سے زراعت ہی کو آمدنی کا واحد ذریعہ جانتے تھے۔ صنعتیں ملک میں موجود تھیں لیکن حکومت کی عدم توجہی کے باعث ملک کو اُنسے کوئی فائدہ حاصل نہ تھا۔ سابق شاہ ایران کے تخت سے کنارہ کش ہونے کے بعد حکومت نے

اس شعبے کی امداد کو بھی اپنا فرض جانا چنانچہ آج ایران میں چالیس نئی فیکٹریاں قایم ہیں جو ملک کے سرمایہ اور ملک کے باشندوں اور حکومت کی امداد کی وجہ سے دن دُونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہیں۔ کپڑے اور روئی کے کارخانے خاص طور پر ترقی پذیر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ روئی کا سب سے بڑا کارخانہ ضلع ماژندران (ایران) میں واقع ہے۔

ریلوے | خلیج ایران سے شروع ہو کر ملک کے انتہائی کناروں تک پھیل چکی ہے۔ اس کا رقبہ تقریباً دو ہزار کیلو میٹر تک پہونچ چکا ہے۔ اس کے سرمایہ میں کسی غیر ملکی کا کوئی حصہ نہیں ہے اور نہ اس کے نظم و نسق میں کسی غیر ملکی کا ہاتھ ہے۔ ایران کی ریلوے دس سال کی مسلسل محنت کے بعد تیار ہوئی ہے۔ اس کی تیاری پر ایران نے ۲۸۵۰۰۰۰۰ (دو کروڑ پچاسی لاکھ پاونڈ) خرچ کئے ہیں۔ اس ریلوے نے سفر کی سہولتیں بہم پہونچانے اور تجارت کو فروغ دینے کے علاوہ ایران کی سیاسیات پر بھی نہایت اچھا اثر ڈالا ہے۔

مالیات | سنہ ۱۹۲۴ء سے ملک کی مالی حالت میں ترقی کے آثار نظر آنے لگے۔ سالانہ بجٹ کی ترتیب و تشکیل اس انداز سے کی گئی کہ روزانہ کے ضروری اخراجات کے علاوہ مختلف شعبوں کی ترقی و توسیع کے کثیر اخراجات بھی ملک کی آمدنی سے پورے ہو جاتے ہیں۔ سنہ ۱۹۲۶ء سے ملک کی آمدنی میں اضافہ شروع ہوا اور آج اضافہ ۴۵ فیصدی تک پہونچ چکا ہے۔

ایران کی موجودہ آمدنی تقریباً ۱۵۲۷۰۱۸۰۰۰ (ایک ارب ۵۲ کروڑ ۷۰ لاکھ اٹھارہ ہزار) رائل ہے۔ ۸۰ رائل کا ایک پونڈ ہوتا ہے یعنی ۲۷ کروڑ روپے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ایران کی موجودہ ترقی رضا شاہ پہلوی کی علو ہمتی، روشن خیالی اور تدبر کی مرہون منت ہے۔ اور بجز رضا شاہ کوئی دوسرا شخص داد کا مستحق نہیں ہے۔ لیکن یہ خیال جتنا عالمگیر ہے اتنا ہی غیر معتبر بھی ہے۔ رضا شاہ پہلوی ایران میں اصلاحات کے رائج کرنے کے موجد نہیں بلکہ متبع ہیں۔ درحقیقت ایران اگر رضا شاہ پہلوی کا مرہون منت ہے تو کمال اتاترک کا بھی ممنون احسان ہے کیونکہ رضا شاہ پہلوی نے ایران میں جتنے اصلاحات جاری کئے وہ اتاترک کے کارناموں سے اخذ کئے گئے ہیں۔ اتاترک کے کارنامے اُن کی زندگی کے لئے خضر راہ ثابت ہوئے اور بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ رضا شاہ نے جو کچھ سیکھا وہ کمال اتاترک سے سیکھا۔ آج ایرانی زندگی کے ہر شعبے میں اتاترک کے کارناموں کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ تہذیب۔ معاشرت۔ سیاست غرضکہ ہر شے میں کمالی ترکی کا گہرا رنگ نظر آتا ہے۔ طہران اور انقرہ میں مشابہت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ تمیز کرنا دشوار نظر آتا ہے۔

ایران کی موجودہ ترقی کے میدان میں مردوں کے پہلو بہ پہلو عورتیں بھی سرگرم عمل ہیں۔ یہ مخلوط طریق عمل ایران کی آیندہ ترقیوں کے لئے ایک فال نیک ہے۔ طبقہ نسوان کی بیداری آیندہ نسلوں کی بیداری مغزی کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے۔ امید کیجاتی ہے کہ مستقبل قریب میں ایران ترقی کے آخری زینے طے کر کے اپنے ہمسایوں کے مدمقابل ہو جائے گا۔

دستوری اصلاحات | ایران کے دستوری اصلاحات کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ موجودہ دستور ایران کے مطابق ایران کا بادشاہ صرف پہلوی خاندان کا رکن ہو سکتا ہے۔ ایران کی بادشاہت موروثی ہے۔ بادشاہ کا بڑا بیٹا ولی عہد سلطنت ہوتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ ایرانی ماں کی بطن سے پیدا ہوا ہو۔ اگر بادشاہ کی کوئی اولاد نرینہ نہ ہو تو ولی عہد کا انتخاب بادشاہ کی

نامزدگی کے مطابق نیشنل اسمبلی کیا کرتی ہے۔ ہر بادشاہ کو تاجپوشی کے وقت قرآن ہاتھ میں لیکر یہ حلف اٹھانا پڑتا ہے کہ وہ اپنے دَورِ حکومت میں ایران کی آزادی کو برقرار رکھے گا اور دستور کی پابندی کرتے ہوئے مذہب کی حفاظت اور ملک کی فلاح و بہبود کے لئے ہر ممکن کوشش کو عمل میں لائے گا۔ بادشاہ کے اختیارات لامحدود ہیں اور دستور کے مطابق "ایران کا بادشاہ کسی جرم کا ذمہ وار قرار نہیں دیا جا سکتا ہے"۔

بادشاہ ایران کو ایران کی بحری، برّی اور ہوائی فوجوں کا سالار اعظم تصوّر کیا جاتا ہے۔ اس کا ہر حکم واجب التسلیم ہے اور اس کے اختیارات کا استعمال اُس کی مرضی پر موقوف ہے۔

بادشاہ کے علاوہ امورِ سلطنت کی انجام دہی کے لئے وزراء کا تقرر بھی لازمی ہے۔ وزراء کی تقرری بادشاہ خود کرتا ہے۔ لیکن ہر وزیر کا مسلمان اور ایرانی النسل ہونا لازمی ہے۔ ہر وزیر اپنے شعبے کے انتظامات کا ذمہ دار ہے۔ اور نیشنل اسمبلی کو اختیار حاصل ہے کہ وہ عدم اعتماد کا ووٹ پاس کر کے کسی ایک وزیر یا تمام وزراء کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دے۔ عدم اعتماد کے ووٹ کے علاوہ اسمبلی کو وزراء پر مقدمہ چلانے کا بھی اختیار حاصل ہے۔ لیکن ایسے مقدموں کی سماعت عام عدالتوں میں نہیں ہو سکتی ہے۔ سنہ ۱۹۲۶ء تک ۸ وزراء اور ۳ نائب سکریٹری پر مشتمل ایک کابینہ تھی۔ لیکن اب کابینہ میں ۱۲ وزراء ہیں۔ وزیر اعظم کا انتخاب رضا شاہ پہلوی کیا کرتے ہیں۔ اور دیگر وزراء کو وزیر اعظم منتخب کرتا ہے۔ ہر وزیر کے ذمہ ایک علیحدہ شعبہ ہے۔ جس کے نظم و نسق کا وہ خود ذمہ دار ہے، اور نیشنل اسمبلی بھی اس کو اپنے شعبے کا جوابدہ تصور کرتی ہے۔

دفترِ خارجہ کے مختلف شعبے ہیں۔ پہلا شعبہ اسلامی ممالک مثلاً ترکی۔ افغانستان۔ عراق، مصر، اور حجاز کے تعلقات کا ذمہ دار ہے۔ دوسرا شعبہ روس۔ پولینڈ، اور بلقان کے معاملات سے متعلق ہے۔ اور تیسرا شعبہ یورپ۔ ایشیاء اور امریکہ کے معاملات کا ذمہ دار ہے۔

دستور کے مطابق ایران میں دو ایوانوں کا قیام ممکن ہے لیکن ملک کی ضروریات کے لحاظ سے ایک ایوان ہے جسے نیشنل اسمبلی کہتے ہیں۔ اس کے اراکین کی تعداد فی الحال ۱۳۶ ہے۔ لیکن بوقت ضرورت ۲۰۰ تک ہو سکتی ہے۔ اسمبلی کی میعادِ حیات صرف دو سال ہے۔ ۳۰ سال سے ۷۰ سال تک کی عمر والے اسمبلی کے رکن منتخب ہو سکتے ہیں۔ اسمبلی کے اختیارات بہت وسیع ہیں۔ نئے قوانین کا پاس کرنا اور پرانے قوانین میں ترمیم و تنسیخ کرنی اسمبلی کے اختیاراتِ خصوصی میں شامل ہیں۔ ملک کی آمدنی و اخراجات کا سالانہ بجٹ اسمبلی میں پیش ہونا لازمی ہے۔ ملک کی آمدنی کا کوئی حصہ اسمبلی کی منظوری کے بغیر خرچ نہیں کیا جا سکتا ہے۔

ایران میں جمہوریت صحیح معنوں میں رائج ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی بادشاہ کے اختیارات بھی لامحدود ہیں۔ ایران کی اصلاحات ترکی کی اصلاحات کی تصویر ہیں۔ لیکن ایران کے دستورِ اساسی میں برطانیہ کے دستورِ اساسی کی روح کارفرما ہے۔

ایران میں مسلمانوں کی آبادی اس وقت تقریباً ۱۵۰۰۰۰۰۰ (ایک کروڑ پچاس لاکھ) ہے۔ اور ترکی کی مانند ایران نے بھی مذہبی رسومات کی قید و بند سے آزادی حاصل کر لی ہے۔ لیکن اسلامیت پردہ برقرار ہے۔ اور یہی موجب شکر ہے۔

مولانا عبد الصمدؒ اوگانوی بہاری

(۷۷ ۱۲ - ۱۸ ۱۳ ھجری)

از مولانا مسعود عالم صاحب ندوی

[ابو یحییٰ محمد امام خاں نوشہروی کی (تراجم علمائے حدیث ہند) کا ذکر اخباروں اور رسالوں میں آچکا ہے مولوی ابو یحییٰ صاحب ایک عرصہ سے ہندوستان کے علمائے حدیث کا مبسوط تذکرہ مرتب کر رہے ہیں۔ دو تین سال ہوئے کہ اس کی پہلی جلد شائع ہوئی ہے، جس میں دہلی اور یوپی کے علم برداران کتاب و سنت کی سوانح عمریاں ہیں۔ دوسری جلد بہار اور پنجاب کے حاملین شریعت کی زندگیوں پر مشتمل ہو گی۔ مصنف کے اصرار پر عاجز نے اپنے وطن اور خاندان کے نامور اور باعمل عالم کی سوانح مرتب کر کے انہیں بھیج دی ہے۔ ابھی دوسری جلد کی اشاعت میں کچھ دیر ہے۔ اس لئے نامناسب نہ ہوگا اگر اس سے پہلے یہ تذکرہ ندیم میں شائع کر دیا جائے۔

یہ تحریر آج سے کوئی چھ سات مہینے پہلے مصنف کتاب کو بھیجی گئی تھی۔ اتفاق سے بعد کو بعض فروگذاشتوں کا علم ہوا۔ "نقل ثانی" میں اس کی تصحیح کر دی گئی ہے۔ نیز بعض اضافے بھی کئے گئے ہیں۔

مولانا عبد الصمد کی وفات ۱۳۱۸ھ ہجری میں ہوئی، اس لئے اب ان کے دیکھنے والے اور ہم نشین بھی کم ملتے ہیں۔ بہت ممکن ہے اس اجمالی تذکرہ میں کچھ مسامحت رہ گئی ہو۔ پرانے اہل علم اور واقف کار صاحبوں کی نظر میں اگر کوئی بیان مستند نہ ہو تو تصحیح کر دی جائے۔ علم کی خدمت ہو گی اور عاجز ممنون ہوگا۔ مسعود عالم]

مولانا حکیم ابو المجد عبد الصمد بن منشی فتح علی بن سید شاہ فرحت حسین کی ولادت بہار شریف (پٹنہ) سے پانچ کوس پورب ایک بستی اوگانواں میں ہوئی (۱۲۷۷ھ / ۱۲۶۷ف) موصوف کے آباؤ اجداد مراواں لکھی سرائے (مونگیر) کے رہنے والے تھے۔ سید شاہ فرحت حسین کی شادی اوگانواں کے قاضی خاندان میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد ان کی اولاد نے وہیں بود و باش اختیار کر لی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، کچھ دنوں بہار شریف میں پڑھتے رہے۔ معقولات کی کتابیں حسین آباد (مونگیر) میں ایک شیعی عالم سید مرتضیٰ حسین صاحب سے پڑھیں۔ علم کی پیاس وطن میں نہ بجھی تو رخت سفر باندھ کر حافظ عبد اللہ غازیپوری کے بابرکت درس میں حاضر ہوئے۔ "چشمۂ رحمت"[1] میں موفقت و سلم کی سبیل جاری تھی، جہاں تشنہ کامان علم دور دور سے اپنی پیاس آکر بجھاتے تھے۔ غازیپور کچھ رہ کر استاذ الکل مسند نشین درس ولی اللہی، مولانا سید نذیر حسین میاں صاحب سورج گڑھی بہاری (محدث دہلوی) کی خدمت میں باریاب ہوئے۔ حدیث کی باضابطہ

(۱) غازی پور کا قدیم مدرسہ جو اب تک قایم ہے، گو زمانہ کے ہاتھوں اس پر بڑا انقلاب آیا ہے۔

تحصیل کی۔ اور سندو اجازت لے کر کامیاب لوٹے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ میاں صاحب کی درسگاہ سے ایک متاع بیش بہا اور بھی لائے جو صرف اللہ کے برگزیدہ بندوں کو ملا کرتی ہے۔ یہ متاعِ گراں مایہ اتباعِ سنت، دعوتِ توحید، اور خدمتِ دین کا غیر فانی ولولہ تھا، جس نے ان کو مرتے دم تک سرشار اور مصروفِ عمل رکھا۔ دِلّی سے واپسی کے بعد وہ جہاں رہے، اور جس حال میں، اس فرض سے غافل نہیں ہوئے۔ ان کی خوش بیانی اور خطابت اس فرض کی ادائی میں بڑی مددگار ثابت ہوئی۔

علوم دین سے فراغت کے بعد طب کا شوق دامنگیر ہوا۔ لکھنؤ میں حکیم عبدالعزیز صاحب کی بافیض درس گاہ سے مستفیض ہوئے اور حکیم عبدالحفیظ صاحب کے مطب میں عملی تجربے کئے۔ اُس وقت لکھنؤ میں استاذ الاستاذ[1]، حضرت مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلی (م ۱۳۰۴ھ) کا طوطی بول رہا تھا۔ مولانا عبدالصمد مرحوم سے برابر علمی مذاکرے رہے۔ نیز دورانِ قیام لکھنؤ میں وعظ و پند کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا۔

(بہ روایت والد ماجد مولانا حکیم عبدالشکور صاحب مدظلہٗ)

تحصیلِ طب کے بعد کلکتہ مصری بازار[2] کے مدرسہ میں مدرس ہوئے۔ کلکتہ کے قیام میں انہیں حکیم مشرق سید جمال الدینؒ افغانی کی صحبت نصیب ہوئی (جو ان دنوں کلکتہ میں قیام پذیر تھے) مولانا سید علی اصغر صاحب (چھپرہ) راوی ہیں :۔

"مولوی عبدالصمد صاحب، سید جمال الدین کا تذکرہ بار بار عقیدت سے کرتے اور ان کے مختلف فقرے بھی نقل کرتے، ایک لطیف فقرہ (من برلٹ[3] شامی گویم) مزے لے لے کر بار بار دہراتے"۔

کلکتہ میں مولانا کا قیام زیادہ دنوں تک نہیں رہا۔ تھوڑی ہی مدت کے بعد دانا پور میں منتقل ہو گئے۔ جہاں وہ آخر عمر تک "مدرسہ محمدیہ" کی خدمت میں لگے رہے۔ دورانِ قیام دانا پور میں موصوف نے بہتیری خدمات انجام دیں، مشہور مصلح اور صوبہ کے نامور عالم و متبعِ سنّت مولانا محمد ابراہیم صاحب آروی کی اصلاحی تحریکوں میں برابر معاونت اور علمی تائید کرتے رہے۔ ندوۃ العلماء کے پہلے اجلاس میں اس صوبہ کے معدودے چند افراد شریک ہوئے تھے، ان میں ایک ممدوح بھی تھے، دوسرے شرکاء میں مولانا شاہ سلیمان صاحبؒ پھلواروی، مولانا وحید الحق[4] صاحبؒ استھانوی، اور مولانا محمد احسنؒ[5] استھانوی کے نام ملتے ہیں۔

مولانا کو تصوف سے بھی ذوق تھا۔ مولانا سید عبداللہ غزنویؒ کے خلیفہ شاہ ممتاز الحق صاحب (جو بہار ہی کے رہنے والے تھے اور حیدر آباد میں کافی بارسوخ تھے) سے بیعت و خلافت تھی۔ تصنیف و تالیف سے بھی شوق تھا۔ دو کتابیں زندگی ہی میں چھپ گئی تھیں۔

(۱) رفع الاشتباہ عن صفات اولیاء اللہ (۲) تسہیل التعلیم (قواعد فارسی)

---

(۱) استاذنا شمس العلماء مولانا ابوالفضل محمد حفیظ اللہ مدظلہ (سابق پرنسپل دارالعلوم ندوہ) کا شمار مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلی کے ارشد تلامذہ میں تھا، اور اس وقت شاید اپنے ساتھیوں میں صرف وہی بقید حیات ہیں، اطال اللہ بقاءہ۔ (۲) مصری بازار کی مسجد عرصہ تک وہابی باغیوں کی مجاہدانہ سرگرمی کا مرکز رہی ہے۔ مقدمہ سازش پٹنہ ۱۸۷۱ء کی روداد میں اس کا ذکر بار بار آتا ہے (ملاحظہ ہو "Wahabee Trial Patna") (۳) جیسے ہم بولتے ہیں (میں آپکو بتاؤں) میں عرض کروں الخ) (۴) مولانا عبدالصمدؒ کے ہم زلف تھے۔ مدرسہ اسلامیہ بہار شریف کے بانی کی حیثیت سے وہ اچھی طرح روشناس ہیں۔ (۵) تحفۂ حنفیہ کے ایڈیٹر اور مولانا محمد علیؒ مونگیری کے دست راست تھے، عرصہ تک ندوۃ العلماء کے مددگار ناظم رہے۔ ان کے صاحبزادے برادر معظم مولانا سید ہاشم ندوی اس وقت مد...

پہلی کتاب راقم کے سامنے ہے، اس کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تصوّف و حدیث پر مرحوم کی نگاہ اچھی تھی، زبان
صاف اور دُھلی ہوئی ہے۔

مرحوم دانا پور سے پٹنہ برابر آیا کرتے۔ جسٹس سید شرف الدین مرحوم، شمس العلماء حافظ محب الحق صاحب مدظلہٗ اور مولوی ...الدین صاحب مرحوم ایڈیٹر الپنچ سے دوستانہ تعلقات تھے۔ اُن کے خاص ملنے والوں میں اب صرف حافظ محب الحق صاحب زندہ (اللہ انہیں دیر تک سلامت رکھے) جسٹس شرف الدین صاحب کے لئے فقہ میں ایک کتاب بھی لکھی تھی جس کو انہوں نے انگریزی ...شایع کرایا ہے (بہ روایت والد ماجد مولانا حکیم عبداللہ کو صاحب مولانا سید اصغر علی صاحب مدظلہم)

مدرسہ احمدیہ آرہ کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۱۳۰۹ھ میں (جس کے صدر نواب محسن الملک تھے) سید شرف الدین مرحوم کی ...ہوئی اُردو تقریر ممدوح ہی نے پڑھی تھی (بہ روایت مولانا سید علی اصغر صاحب)

موصوف شعر بھی کہتے تھے، مولانا علیم الدین حسین نگر نہسوی کے رسالہ (فیصلۃ العلیم لرفع البہتان العظیم) مطبوعہ ۱۲۹۹ھ ...آخر میں آپ کی لکھی ہوئی منظوم تاریخ طبع درج ہے، صمد تخلص کرتے تھے۔

...ستانِ مختصر: مرحوم نے اپنی تمام زندگی تبلیغ توحید میں صرف کی۔ ان کی وفات کو چالیس برس ہو چکے ہیں، پر آج تک ...نواں کے سادات اور قاضی خاندان میں شرک و بدعت کا نام نہیں، اس حال میں کہ ہر طرف بدعات کی آندھیاں چھائی ہوئی ہیں ...ان کے یہاں نذر و نیاز کی رسمیں نہیں ہوتیں اسلئے آج تک اوگانواں کے سادات وہابی کہے جاتے ہیں۔

وفات عین جوانی میں ہوئی۔ ۱۳۱۸ھ میں دار آخرت کو چل بسے۔ گاؤں میں طاعون زوروں پر تھا، شب و روز لوگوں ...موت کرتے۔ اس عالم میں کہ خلق نفسی نفسی پکارتی تھی، مرحوم تجہیز و تکفین کی کل خدمات اپنے ہاتھ سے انجام دیتے۔ روزانہ ...دو موتیں ہوتیں، آخر ایک روز ان کی بھی طلبی ہو گئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ کل چالیس اکتالیس برس عمر پائی۔

اولاد میں برکت نہیں ہوئی، صرف ایک صاحبزادی یادگار تھیں، وہ بھی ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ میں انتقال کر گئیں۔ راقم نے ...پاک باز خاتون کی آغوش میں پرورش پائی ہے، اس لئے یہ شہادت دے سکتا ہے کہ آج تک کسی خاتون میں بدعات سے یہ نفرت ...نہ دیکھی۔ مرحومہ کی اولاد میں اس وقت ایک فرزند اور دو نواسیاں حیات ہیں، اللہ انہیں عمل صالح اور اتباع سنت کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

افسانہ و محاضرات

دھوکا

ازجناب پروفیسر شبلی ابراہیمی ایم۔اے

" میں تو پُوجا کی چھٹی منانے آج ہی بھاگلپور جارہا ہوں۔ تم لوگوں کا کیا پروگرام ہے ؟ " ونّے نے کہا۔

" دُور پاگل! بھاگلپور بھی کوئی جانے کی جگہہ ہے، اے رانچی چل۔ ..... میں تو رانچی جارہا ہوں " شنتّو نے کہا۔

" ہاں! رانچی تو پاگلوں کی جگہ ہے۔ ضرور جاؤ ..... میرا دماغ خراب تھوڑا ہی ہوا ہے .... میں تو بھاگلپور جاؤنگا۔ جہاں پوِتر گنگا کی صاف شفاف موجیں سدا ناچتی گاتی رہتی ہیں جہاں اچھی اچھی مچھلیاں ملتی ہیں۔ جہاں قسم قسم کی سبزیاں بکتی ہیں جہاں طرح طرح کی مٹھائیاں ہیں۔ جہاں بنگالی ٹولہ ہے۔ اپنی سوسائٹی ہے۔ جہاں سندر منوہر کنواریاں رہتی ہیں۔ اپنے لوگ ہیں۔ جہاں غم کا گذر نہیں۔ کھاؤ۔ پیو۔ گاؤ۔ بجاؤ۔ غم غلط کرو، اور موٹے ہو کر چلے آؤ۔" ونّے نے کہا

" واہ! واہ!! اچھی کویتا ہے۔ کالج میگزین میں چھپوا دو۔ پڑھنے والے یہ سمجھیں گے کہ تم سُورگباش ہو گئے ہو، اور پرلوک سے سُورگ کی تعریف لکھ کر تم نے میگزین میں چھپنے کے لئے بھیجدی ہے" راجو نے ہنستے ہوئے کہا۔

" لیکن سورگ میں اکیلا تھوڑا ہی جاؤں گا۔ تیرے بغیر وہاں کیا مزا آئیگا۔ تم بھی چلے چلونا! یہاں نرک میں رہ کر کیا کروگے ؟ ونّے نے کہا۔

" مجھ کو تو یہیں نرک میں جلنے دو۔ ہاں اپنی سورگ سے کچھ مچھلیاں، کچھ سبزیاں، کچھ مٹھائیاں اور ایک عدد اچھوتی کنواری آپسرا لیتے آنا" راجو نے کہا

اس پر سبھوں نے مل کر زور سے قہقہہ لگایا۔

" آج کس ٹرین سے جاؤ گے ؟" شنتّو نے پوچھا۔

" وہی جو گھا گھرا گھاٹ روڈ سے ۵ بجے چھوٹتی ہے" ونّے نے کہا۔

" اور جو عظیم گنج جنکشن سوا پانچ بجے پہونچتی ہے "

" ہاں "

" تو بس میں اور راجو تم سے عظیم گنج جنکشن ہی میں ملیں گے۔ کیونکہ ہم لوگ وہیں اسٹیشن کے قریب رہتے ہی ہیں، ہم لوگوں کو آسانی ہوگی۔ گھاگھرا گھاٹ آنے میں ہم لوگوں کے لئے بکھیڑا ہے۔ اور ہم لوگوں کو تو کچھ سورگ میں جانا نہیں ہے کہ بیٹھے بٹھائے مفت کی پریشانی مول لیں"

ٹرین وقت معینہ پر عظیم گنج جنکشن پہونچ گئی۔ شنتّو اور راجو پہلے ہی سے پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے۔ ونّے ایک انٹر کلاس کے خانہ سے جھانک رہا تھا۔ شنتّو اور راجو نے زور سے نعرہ لگایا، انقلاب جندہ باد۔ ونّے بابُو کی جے۔ ونّے خانہ سے باہر نکل آیا۔ تینوں نے قہقہہ لگانا شروع کیا۔ اتنے میں راجو کی نظر اُس خانہ میں جا پڑی جس میں سے ونّے اُترا تھا۔ اُس بنچ پر جو پلیٹ فارم سے متصل تھا، ایک سولہ سترہ سال کی حسینہ بیٹھی ہوئی تھی ——— اس کا چہرہ گول تھا، رنگ گورا، ناک اوسط، پیشانی چوڑی، آنکھیں

بڑی بڑی جن سے دلکشی کے شعلے نکل رہے تھے، بدن گدرایا ہوا، سیاہ ریشمی کا بلوس زیبِ بدن تھا۔ گورے گورے ہاتھ شانوں تک اور گردن اور سینہ کا کافی حصّہ کھلا ہوا تھا۔ ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں تھیں، گلے میں ایک نکلس اور ناک میں ایک جڑاؤ بیسر۔ سیاہ ریشمی ساری اس کے جسم کو ڈھانکے ہوئے تھی۔ سر آنچل سے ڈھکا ہوا تھا جس کے اندر سے کان کے خوبصورت جڑاؤ آویزے جھانک رہے تھے۔ ماتھے پر سیندر کا دلکش سرخ ٹیکا تھا۔ اور گرچہ ساری کا آنچل پن سے اٹکایا ہوا تھا مگر ہوا کے جھونکے بار بار شوخی سے اُس کے سر کے آنچل کو سرکا دیتے تھے، اور اُس کے سیاہ عنبر فشاں بال اور مانگ کے سرخ سیندر کو ظاہر کر دیتے تھے۔ اُس کا خوبصورت چہرہ سیاہ آنچل کے اندر سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے چاند بادل کے باریک، ملایم سیاہ پردے کے اندر سے اپنی ٹھنڈی دلکش چاندنی بکھیر رہا ہے۔ سر کا آنچل اُس کے سہاگ کا ثبوت دے رہا تھا۔ سامنے ایک پاندان رکھا ہوا تھا۔

راجو نے شنتو کو پیچھے سے ایک ٹھونکا دیا اور کنکھی مار کر اُس حسینہ کی طرف اشارہ کیا۔ شنتو نے دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر شرارت کی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

"ہو یار بڑے بھاگ والے۔ تم کو تو سورگ پہنچنے سے پہلے ہی حور مل گئی۔ اب جا کر کیا کروگے بھاگلپور؟" شنتو نے وِنے سے ہنستے ہوئے کہا۔

"اور یہ بھی تو بھاگلپور ہی جا رہی ہے...... اور میں نے اتنی دیر میں ایسا رام کر لیا ہے کہ جو چاہوں کروالوں" وِنے نے مسکراتے ہوئے کہا۔"

"جا! جا!! آئینہ میں مُنہ دیکھ آ" شنتو نے کہا۔

"یہ کہاں کے تو بڑے ویر آئے ہیں" راجو نے کہا

"اچھا بھائی جھگڑا کاہے کا ہے۔ امتحان لے لو" وِنے نے ایک دِل آویز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"اچھا! جا اُس سے ہم لوگوں کے لئے زیادہ نہیں دو کھلی پان بنوا کے لے آ۔ بس ہم لوگ ہار مان لیں گے" راجو نے کہا

"لیکن کچھ شرط بدلو۔ یوں روکھا پھیکا امتحان کا میں قائل نہیں" وِنے نے کہا۔

"ہاں! ہاں!! شرط بدلو۔ بھاگتا کون ہے؟" رہے پانچ پانچ سیر رس گلّے کی شرط" شنتو نے جوش کے ساتھ کہا۔

شنتو اور راجو دونوں نے وِنے کے ہاتھ پر ہاتھ مارا، شرط بد گئی ——

وِنے خانہ کے اندر گیا، اُس نے اُس سے کچھ کہا۔ وہ مسکرائی اور پاندان کھول کر پان لگانے لگی۔ شنتو اور راجو کا حیرت سے مُنہ کھلا ہوا تھا اور اُن کے چہروں سے شرارت کے سارے آثار غائب ہو گئے تھے۔

وِنے پان لیکر فاتحانہ انداز سے شنتو اور راجو کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا "اب لاؤ پانچ سیر رس گلّے" وِنے نے ایک فاتحانہ ہنسی کے ساتھ کہا۔

"ہاں بھائی! دینا ہی پڑیگا۔ کیا معلوم تھا کہ اب آوارگی دنیا میں اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ ——"

"ارے میں تو پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ کوئی کلکتہ کی رنڈی ہے۔ لیکن میں تو صرف تمہاری وجہ سے پھنس گیا" راجو نے شنتو کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ارے اب تو تم لوگ سادھنا بگھارنے لگے۔
جاؤ! جاؤ!! پہلے میرا پانچ سیر رس گلا اسٹال پر سے لے آؤ۔ پھر لیکچر دیتے رہنا۔ ورنہ گاڑی کھل جائیگی اور میرا رس گلا رہ جائیگا" ونے نے شنتو اور راجو کو دھکا دیتے ہوئے کہا۔

شنتو اور راجو رس گلا لے آئے۔ ونے نے رس گلا کی ہانڈی کھانے کے باہر ہی سے حسینہ کے ہاتھ میں دے دی اور اس نے مسکرا کر لے لی۔

اتنے میں گارڈ نے سیٹی بجائی اور ونے نے راجو اور شنتو کو جو پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے نہ معلوم کیا سوچ رہے تھے ——— پکارا ——— جلدی آؤ۔ گاڑی کھل رہی ہے۔ ونے نے دروازہ بند کر دیا تھا اور دروازہ سے منہ باہر نکال کر کھڑا ہوگیا تھا۔ راجو اور شنتو ونے کے بالکل قریب آکر کھڑے ہوگئے۔

"ہاں تو میں اب آپ لوگوں کا تعارف اپنی استری سریمتی لیلا دیوی سے کراتا ہوں۔ میں ان کے ساتھ بھاگلپور ان کے گھر جا رہا ہوں ....

ونے اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ راجو اور شنتو دونوں خوشی کے مارے پاگل ہوگئے۔ دونوں نے قہقہہ لگانا ش کیا۔ ونے بھی ساتھ دے رہا تھا۔ ونے کی بیوی مسکرا تی۔ گاڑی کھل گئی اور تینوں نے ایک ساتھ بولنا شر کیا اور یہ پتہ چلنا مشکل تھا کہ کون کیا بول رہا ہے۔ زبانو کے ساتھ ساتھ ہاتھوں، انگوٹھوں، اور آنکھوں کے لطیف اش کنائے بھی چل رہے تھے۔ اسٹیشن کے ہنگامہ نے اس س میں اور گہرا رنگ بھر دیا تھا۔ ———

دھوکا ——— فریب ——— دغا ——— چوری
ڈکیتی ——— سینہ زوری ——— اسے قتل کہو تو
ارے باپ رے باپ، ایک دم سے پانچ سیر رس گلا کیجئے
کاٹ کر آنکھوں میں دھول دیکر لئے بھاگا جا رہا ہے ......
اسی لئے بھاگلپور کی یہ تعریفیں تھیں .... بیشک سو رگ
——— پھر پہونچتے ہیں بھاگلپور ——— ضرور
ہا ہا ہا ہا - ہیں ہیں ہیں ہیں - قہ قہ قہ۔
لو لو!! لو لو ———

ٹرین کی رفتار تیز ہوگئی۔ دونوں طرف سو ملنے لگے۔ ونے اور اس کی بیوی نظروں۔ اوجھل ہوگئے۔

سُندر

از جناب سید نصیر حیدر صاحب بی۔اے ڈپٹی کلکٹر گیا

سہ پہر کا وقت ہے اکبر نگر کے کنوئیں پہ بیاہی بن بیاہی ہر قسم کی عورتوں کا جمگھٹ ہے صاف ستھرے مٹی کے گھڑوں کی قطاریں لگی ہوئی ہیں، عورتیں آپس میں اٹھکھیلیاں کرتی جاتی ہیں اور پانی بھرتی جاتی ہیں کنواں کچھ گہرا سا ہے اس لئے پانی کھینچنے میں خاصی زحمت ہو جاتی ہے آج کی گپ کا زیادہ حصہ کل گاؤں میں راجہ صاحب کی آمد کے تذکروں سے بھرا ہوا تھا، راجہ کے ملازموں نے رعایا کو نذرانہ سلامی کے لیے تیار کر رکھا تھا، اور مال گذاری کی صفائی کا بھی یہی وقت مقرر تھا۔ اس وجہ سے رعیتوں میں بڑی دوڑ دھوپ ہو رہی تھی۔ اور راجہ کی کچہری کے سامنے ایک بڑے میدان میں شامیانہ نصب کیا گیا تھا جس میں محفل اور ناچ رنگ کا سامان تھا، گاؤں کی عورتیں اس چہل پہل کے دیکھنے کیلئے ہمہ تن شوق بن گئی تھیں، ان عورتوں کی گفتگو سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ سب کی سب روپیہ کے سامان سے سبکدوشی حاصل کر چکی تھیں کیوں کہ گاؤں میں یہ بات مشتہر کردی گئی تھی کہ امسال راجہ صاحب خود تشریف لاتے ہیں، اگر کسی کے ہاں بھی بقایا رہ جائے گا تو مقامی عمال کی سخت بدنامی کا باعث ہوگا، اسی وجہ سے ہر شخص نے قرض لے کر روپیہ جمع کر رکھا تھا سب عورتوں کے چہرے پر بشاشت اس امر کو ظاہر کر رہی تھی کہ ان کے مردوں نے روپیہ کا سامان کر لیا ہے مگر بچاری شیام کنور اپنے گھڑے کے پاس ملول بیٹھی تھی، اور اس دلچسپ گفتگو میں موقع مناسبت سے صرف ہوں ہاں کر رہی تھی اس کی شانزدہ سالہ نوجوان لڑکی، سندر کنور پانی کا گھڑا کنوئیں سے نکال رہی تھی، اور وہ بھی کچھ اداس سی تھی، اسی اثنا میں ایک دوسری عورت نے شیام کنور سے پوچھا، کیوں بہن تمہارے روپیوں کا کچھ سامان ہوا، تم کو تو شاید بہت زیادہ مالگذاری ادا کرنی پڑتی ہے۔

شیام کنور:۔ مجھے کوئی چارہ نہ رہا روپیہ اس فصل میں دینا ہی تھا جو کچھ پیدا ہوا تھا وہ سندر کے باپ کے سرادھ میں خرچ ہوگیا، اب ٹکا پاس نہیں ہے راجہ کے سپاہیوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے ہزار تدبیر کی مگر کوئی سامان نہ ہوا، اب عزت و حرمت کا پرمیشور ہی رکھوالا ہے، یہ کہہ کر اسکی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور آنسو کی لڑیاں نکلیں،

شیام کنور اگرچہ چالیس سال سے زائد کی عورت ہے، اس سن میں بھی چہرے کی چمک دمک اور رنگ روغن سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ عورت اپنے وقت کے حسینوں میں شمار کی گئی ہو تو تعجب نہیں اس کا شوہر اودے سنگھ ایک ذی حیثیت، ذی اثر اور معزز زمیندار تھا، اس کے کئی اولاد ہوئی مگر سب کی سب جوان ہو ہو کر مر گئیں، اودے سنگھ ہمیشہ خائف رہتا کہ اس کی پیاری بیٹی سندر کنور بھی کہیں داغ مفارقت نہ دے جائے کیونکہ اس کے سب لڑکے لڑکیاں چودہ پندرہ برس کے ہو ہو کر سدھار گئے۔ یہی وجہ تھی کہ باوجود کئی اچھی جگہوں سے پیام آنے کے، اودے سنگھ نے سندر کو کہیں منسوب نہ کیا، اس کا خیال تھا کہ شاید سندر بھی نہ بچے، سندر کی پرورش نہایت آزادانہ طریقہ پر ہوئی تھی، اس کو اچھی تعلیم

دی گئی تھی، شکار، نیزہ بازی، تیر اندازی اور دیگر فنونِ جنگ میں بھی اُسے مردوں کی طرح مہارتِ تامہ حاصل تھی، اُس کے اُبھرے اُبھرے شانے، سڈول بازو، بھری بھری انگلیاں، مدور پنڈلیاں گداز سینہ اور خون سے لبریز رخسار سے اس بات کی دلیل تھے وہ اک حسین قوی اور دلیر لڑکی تھی، گاؤں کے نوجوان لڑکوں کی نظریں ہمیشہ اُس کی جانب اٹھی رہتیں، مگر کسی کی ہمت نہ پڑتی کہ وہ . . . کچھ سبقت کر سکے، اُس کی بہادری مشہور اور اس کا حسن معروف تھا۔

سندر نے اپنے بھائی بہنوں کا مرنا دیکھا تو ضرور تھا مگر کم سنی کے باعث اُس کا اثر فراموش کر گئی تھی، باپ کی علالت نے سندر کو اس درجہ متوحش کر دیا تھا کہ وہ چار مہینہ تک اپنے باپ کی پٹی سے لگی بیٹھی رہی، آخر ہونا تھا وہی جو ہوا، مگر اس علالت میں گھر کا تمام اثاثہ، غلہ، زیور، برتن سب کچھ کام آگیا، قرض کا بار سر پر الگ آ پڑا۔ سال کی فصل اودے سنگھ کی آخری خدمت میں صرف ہو گئی، جائداد مکفول ہو گئی اور دو سال کی مالگذاری باقی رہ گئی، زنانہ کارخانہ ہوتے ہی عسرت نے گھر دیکھ لیا، وہی سندر جو کہ کبھی شان و شوکت کی زندگی بسر کرتی تھی اب اپنی ماں کے ساتھ معمولی عورتوں کی طرح کنواں پر پانی بھرنے کے لئے مجبور تھی، ایسی حیثیت باقی نہ تھی کہ یہ کام دوسروں سے لئے جاتے کیونکہ دولت اس گھر میں اب عنقا تھی، پھر بھی یہ سندر ہی کی تعلیمی جرأت کا نتیجہ تھا کہ باوجود اپنی ماں کے اصرار کے کام خود سے سنبھال بیٹھی اور اپنی ماں کو اطمینان دلا دیا کہ وہ تا زندگی اُس سے جدا نہ ہو گی۔

اودے سنگھ کا اب کوئی قریبی عزیز نہ تھا، دور کے رشتہ دار اُس کی زندگی ہی میں اس کے تمول پر خار کھاتے تھے، اودے سنگھ کی موت اور اُس کے گھر کی تباہی اور بربادی نے اُن کے دل کو چین اور آنکھوں کو سرور بخشا، حتیٰ کہ اودے سنگھ کے اک چچا زاد بھائی نے زمیندار کے عمال کو اُبھار کر اس بات پر آمادہ کرایا کہ اگر روپیہ نہ ادا ہو سکے تو اودے سنگھ کی بیوہ شیام کنور کو سرِ دربار بلا کر رسوا کیا جائے دوسری طرف لوگ تیار تھے کہ کسی نہ کسی طرح اودے سنگھ کی بیش بہا جائداد کوڑیوں کے مول حاصل کر لی جائے۔

شیام کنور کے آنسوؤں کی لڑیاں ختم نہ ہو چکی تھیں کہ سندر پانی کا گھڑا لیکر آ پہونچی اور ماں کو ملول دیکھ کر بولی، اماں کیوں غمگین ہو، رونے سے کیا ہوتا ہے، پرمیشر پر بھروسہ کرو، اور گھر چلو، یہ کہہ کر سندر اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کر گھر روانہ ہو گئی۔

سندر کا مکان دیہات کے لحاظ سے محل تھا، چاروں طرف پختہ چار دیواری تھی اور مکان کے بیچ میں کشادہ صحن تھا اور چار بڑے بڑے کمرے تھے، باہر کے حصہ میں اک وسیع برآمدہ اور تین کمرے تھے، سندر اتر رخ کے ایک صاف ستھرے کمرے میں ایک تخت پر بیٹھی ہوئی ترکاری تراش رہی تھی، اور اسکی ماں باورچی خانہ میں آگ روشن کر رہی تھی، سات بجے شام تک کھانے سے فراغت ہو گئی اور دونوں ماں بیٹیاں آ کر کمرے میں پڑ رہیں سندر نے اندر باہر کے دروازوں کو اچھی طرح دیکھ بھال کر بند کر دیا، کوئی نو بجے ہوں گے کہ دروازے پر دستک سنائی دی، اور سندر اور اسکی ماں دونوں کی دونوں، کان لگا کر سننے لگیں آخر جب یہ یقین ہو گیا کہ کوئی اُسی کے مکان پر آواز دے رہا ہے تو شیام کنور اُٹھی اور باہر کے دروازے پر جا کر پوچھا کہ کون ہے؟

آواز: ۔ دروازہ کھولو، ہم ہیں راجہ کے ملازم۔

شیام کنور: ۔ تو صبح کو تکلیف کیجئے گا، اس وقت ایسی کیا ضرورت ہے

آواز :۔ نہایت ضروری کام ہے' میں ہوں ہرپال سنگھ۔

ہرپال سنگھ گاؤں کا گماشتہ تھا اور اودے سنگھ کا دور کا رشتہ دار بھی' شیام کنور اس کی آواز پہچان گئی تھی' اس نے اس نے بلاخوف وخطر دروازہ کھول دیا'

ہرپال سنگھ :۔ میں تم سے یہ دریافت کرنے آیا ہوں کہ روپیہ کا سامان ہوا یا نہیں

شیام :۔ میں نے بہت کوشش کی' مگر کامیابی نہ ہوئی۔

ہرپال :۔ تو کل بڑی بے عزتی کا سامنا ہے' ہردیال نے راجہ کو ورغلا دیا ہے کہ اودے سنگھ کی بیوہ نے سربازار کہا ہے کہ راجہ ہمارا کیا کرلیں گے' راجہ نہایت برہم ہے اور ہم کسی طرح اس میں کچھ نہیں کرسکتے۔ اگر روپیہ کا سامان نہیں ہوا ہے تو کل یقیناً بڑی فضیحتی ہوگی۔

شیام :۔ تو اب کرنا ہی کیا ہے جو کچھ قسمت میں لکھا ہے وہ ہو کر رہیگا'

ہرپال :۔ ایک صورت میرے دماغ میں آئی ہے' سندر کی نسبت طے کرکے کہیں سے روپیہ کا سامان کیا جا سکتا ہے۔ آخر اسکو بیاہنا ہی ہے تو کیوں نہیں ابھی ہی یہ بات طے ہو جائے۔

ہرپال :۔ رام چندر سنگھ کے لڑکے کی نسبت تلاش ہو رہی تھی' میں نے سندر کا ذکر چھیڑ دیا اور رام چندر سنگھ فوراً راضی ہو گئے' میں نے مالی دقتوں کا بھی اعادہ کیا اور وہ کل قرض ادا کرنے کو تیار ہو گئے' میرے خیال میں اس سے زیادہ اچھی بات نہیں ہو سکتی۔

رام چندر سنگھ مرزا پور نامی ایک گاؤں میں جو کہ اکبر نگر سے دو کوس کے فصل پر تھا رہتا تھا' یہ اک ذی حیثیت زمیندار مگر حد درجہ ظالم شخص تھا' لوگ اس کے نام سے کانپتے رہتے تھے' کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ اس کا مد مقابل ہو سکے' کوئی اگر دبتی تھی تو اودے سنگھ سے اور یہی وجہ تھی کہ وہ اودے سنگھ کا جانی دشمن تھا' اودے سنگھ کی زندگی میں تو وہ اس کا کچھ بگاڑ نہ سکا مگر اس کے مرنے کے بعد رام چندر نے طرح طرح کی کوششیں اودے سنگھ کی جائداد کے حاصل کرنے میں کیں' مگر جب کوئی حکمت کارگر نہ ہوئی اور شیام کنور نے اس کے تمام ارادوں کو ٹھکرا دیا تو وہ یہ نئی چال چلا۔

شیام اس تجویز کو سن کر بت ہو گئی' کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ اسکی ہستی اسوقت دو مشکل ترین کیفیتوں کا مجموعہ بن گئی تھی' ایک طرف یہ دربار کی بے عزتی کا سامان اور دوسری جانب شوہر کے بدترین دشمن سے سمدھیانا' اس گرداب کے دو آبے میں وہ ہاتھ پیر چلا رہی تھی اور غور و فکر کے سمندر میں ڈوبی ہوئی تھی' آخر جذبات شرافت غالب آگئے۔ اور اس نے ٹھان لی کہ چاہے کچھ بھی ہو' وہ رام چندر کی خواہش کسی طرح بھی قبول نہیں کرسکتی۔

جب شیام کنور بہت دیر تک خاموش رہی تو پھر ہرپال سنگھ یوں بولا :۔

ہرپال :۔ تم چپ کیوں ہو' آخر میں بھی سندر پر کوئی حق رکھتا ہوں میرے خیال میں خاندانی عزت کو برقرار رکھنے کی اس سے بہتر کوئی دوسری صورت نہیں' چند ہی دنوں میں' پھر وہی اگلا سا وقار قائم ہو جائے گا۔

شیام :۔ مگر ہرپال سندر کے باپ کی روح مجھے کیا کہے گی' میری ہمت تو نہیں پڑتی کہ میں ہامی بھروں' مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ وہ میرے سامنے کھڑے ہو کر مجھے منع کر رہے ہیں۔

ہرپال :۔ بھابی ایسا غضب تو نہ کرو کہ خاندان بھر کی ناک کٹواؤ' تم اور سندر اگر سر دربار بلائی گئیں تو ہماری عزت اس علاقہ میں کیا خاک رہ جائے گی' اور سنو تو' کیا رام چندر سنگھ میں ایسے کیڑے پڑ گئے ہیں کہ ہم ایسی بے رخی سے اس کی بہترین تجویز کو ٹھکرا دیں' اختلاف رائے تو اکثر باپ بیٹے میں ہوا کرتا ہے' مگر مجھکو خوب معلوم ہے کہ

جب کبھی بھی مڈبھیڑ ہو جاتی تھی تو بھائی اودے سنگھ اور رام چندر سنگھ میں صاحب سلامت اور ہر طرح کی باتیں ہوا کرتی تھیں میں نے تو کبھی بھی ان دونوں کو آمنے سامنے تو تو میں میں کرتے نہیں دیکھا۔ میرے خیال میں سندر کے لئے اس سے بہتر نسبت نا ممکن ہے۔

شیام کنور نے ہر پال سنگھ کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اچھا صبح کو ہم اس کا جواب دیں گے۔ ہرپال نے بھی اس وقت زیادہ زور دینا مناسب نہ سمجھا اور روانہ ہو گیا۔

شیام کنور جو لوٹی تو دیکھا کہ سندر صحن میں پڑی ہوئی ہے۔ گھبرا کر لپکی تو دیکھا کہ سانس تو چل رہی ہے مگر ہوش نہیں۔ پانی لا کر منھ پر چھینٹا اور سندر نے آنکھیں کھول دیں اور بے ساختہ پوچھا کیا چچا جی چلے گئے۔

شیام:۔ کیوں بیٹا یہ تم غش کیوں کر گئیں۔

سندر:۔ نہیں اماں میں صحن میں ضرورت کے لئے نکلی اور ٹھوکر کھا کر گر گئی۔ اب اچھی ہوں تم تردد نہ کرو۔ کیوں اماں چچا جی کس لئے آئے تھے۔ کیا کچھ روپیہ کا سامان ہوا ہے۔

شیام:۔ نہیں بیٹا۔ روپیہ کہاں سے ہوتا۔ ہاں تم سے چھپانا ہی کیا ہے۔ بیٹا۔ وہ رام چندر سنگھ کے لڑکے کی نسبت تم سے کرنے آئے تھے۔

سندر:۔ اور وہ اس کے عوض میں روپیہ ادا کر دیں گے۔

شیام:۔ شرما کر ہاں۔

سندر:۔ کیوں اماں چچا جی نہ جانتے ہوں مگر تم تو خوب جانتی ہو پتا جی کو رام چندر سنگھ سے کس قدر نفرت تھی۔ اب وہ چاہتے ہیں کہ ان کی بیٹی کو اپنے گھر لے جا کر باپ کا عوض بیٹی سے وصول کریں۔ اس کے سوا اُن کی غرض اور کیا ہو سکتی ہے۔

شیام:۔ بیٹا! میں نے تو ہرپال سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں یہ نسبت منظور نہیں کر سکتی مگر جب وہ بہت مصر ہوئے تو میں نے کل پر ٹال دیا۔

سندر:۔ مجھے مرجانا قبول ہے مگر اپنے باپ کے جانی دشمن کے گھر جانا ہرگز منظور نہیں۔ ماسوا اس کے اماں تم بھول گئیں میں نے تو تم سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں اپنی تمام زندگی تمہارے چرنوں میں گزاروں گی۔ کیا ابھی سے میں تم پر بھاری ہو گئی۔ تم ماں ہو اس لئے صاف صاف کہتی ہوں۔ اگر تم مجھ کو وہاں بیاہ ہی دینے پر تلی ہوئی ہو تو تمہیں اختیار ہے میں کیا کر سکتی ہوں۔ مگر اماں ایسا کر کے بہت پچھتاؤ گی۔

شیام:۔ نہیں بیٹا! تم اطمینان رکھو۔ میں ہرگز تمہارے باپ کے دشمن سے ناتا نہ جوڑوں گی۔ مگر ہائے قسمت۔ ذلت سے رہائی نہیں۔ کل سر دربار جو رسوائی ہو گی اُس کا خیال جان مارے ڈالتا ہے۔

یہ کہہ کر شیام کنور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور سندر بھی آبدیدہ ہوئی۔ سندر کے دماغ میں رام چندر کے لڑکے بھوپال سنگھ کی تصویر پھر گئی اور اُسے اپنا اک پہلا واقعہ یاد آگیا۔ بات یہ ہوئی تھی کہ سندر ایک دن تیر اور کمان لے کر پہاڑ کی جانب گئی ہوئی تھی۔ سامنے سے ایک ہرن چھلانگیں بھرتا ہوا آنکلا اور ساتھ ہی ساتھ دوسری جانب سے بھوپال سنگھ تیر کمان سے جوڑے لپکتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ اور اُس نے ڈپٹ کر سندر سے کہا کہ دیکھو خبردار یہ میرا شکار ہے۔ تم کہیں تیر نہ مار بیٹھنا۔

سندر:۔ تم کو معلوم ہونا چاہئیے کہ ہرن پر تمہارا کوئی اختیار نہیں کیونکہ تمہارے تیر نے ابھی تک اس کو زخمی نہیں کیا ہے اور شکار جب تک چوٹ کھایا نہ ہو دعویٰ درست نہیں۔

بھوپال:۔ فضول نہ بکو۔ یہ جنگل ہمارا ہے اور جو شکار اس میں ہے وہ میری ملکیت ہے۔

سندر:۔ تو تم رام چندر سنگھ کے لڑکے ہو۔ اگر ایسا ہے تو تمہارا

خیال غلط ہے، تمہاری سرحد کا پتھر وہ گڑا ہوا نظر آتا ہے جب ہرن وہاں آپس جائے گا تو تمہارا ہے۔

بھوپال:۔ مگر میں بغیر اس ہرن کو شکار کئے نہیں جاؤں گا آخر یہ جنگل تو تمہارا نہیں ہے۔

سندر: بے شک یہ جنگل اور پہاڑ ہمارا ہے۔

بھوپال:۔ تو کیا تم ہی سندر کنور اودے سنگھ جی کی بیٹی ہو۔

سندر:۔ ہاں میں ہی ہوں

اتنا کہہ کر سندر تیر اور کمان سنبھال کر انداز غرور اور سرنا زدلبری سے مکان کی جانب پلٹ پڑی۔ اس واقعہ کے بعد اُس کو بھوپال سے ایسی نفرت پیدا ہوئی کہ وہ اُس کی صورت دیکھنے کی روادار نہ تھی، وہ خوب سمجھ گئی تھی کہ بھوپال ضرور اسے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا، چنانچہ اودے سنگھ کی زندگی ہی میں بھوپال نے اس امر کی تحریک کرنی چاہی مگر اودے سنگھ کے نوشتے کسی کو پیام دینے کی جرأت نہ پڑی، کیونکہ اودے سنگھ کے انداز سے پتہ چل گیا تھا کہ وہ اس تحریک کو ذلت کی نگاہ سے دیکھے گا، اودے سنگھ کی موت نے پھر باسی کڑھی میں اُبال پیدا کیا اور بھوپال نے ہرپال سنگھ کو گانٹھ کر یہ تجویز پیش کی، مدعا یہ تھا کہ وہ کسی طرح سندر سے اپنا انتقام لے اور اس کے باپ اودے سنگھ کی روح سے خیالی بدلہ لے کر اپنی آرزو پوری کرے۔

سُندر نے اپنی ماں سے اس واقعہ کو نہیں کہا، مگر وہ تیار بیٹھی تھی کہ قبل اس کے کہ بھوپال سنگھ اُس پر اختیار حاصل کرے وہ اُس کے قبضہ قدرت سے باہر ہو گی۔

سندر دربار کی بے عزتی برداشت کرنی بھوپال کے پلے بندھنے سے کہیں زیادہ بہتر سمجھتی تھی، تاہم کل کے خیال نے اسے پریشان کر رکھا تھا، کچھ دیر کے بعد شیام کنور سوچتے سوچتے سوگئی، مگر سندر کو نیند کہاں وہ اٹھی اور صحن میں جا کر زار و قطار رونے اور پرماتما کی درگاہ میں گڑگڑانے لگی، اسی التجا و زاری میں تو رکا تڑکا ہو تا دکھائی پڑا اور سندر تیزی کے ساتھ حسب معمول گنگا اشنان کو روانہ ہو گئی، منہ اندھیرے ہی غسل کر کے وہ مندر میں داخل ہوئی اور پوجا کرتے کرتے اُس کی آنکھوں نے ساون بھادوں کی جھڑی لگا دی حتیٰ کہ وہ روتے روتے غش کھا گئی۔

آنکھ جو کھلی تو دیکھا کہ ایک حسین نوجوان اُس کے مونہہ پر پانی چھڑک رہا ہے، وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی اور گھونگھٹ نکال کر بھاگنے کو تیار ہو گئی، مگر قبل اس کے کہ وہ روانہ ہو اُس نے ایک اچٹتی سی نگاہ اپنے محسن پر شکریہ کی ڈالی اور آگے بڑھی اس بے ساختہ پن کی حرکت نے اُس نوجوان کو جرات دلائی اور وہ دل تھام کر بولا:۔

کیا میں ایسا گنہگار ہوں کہ میری گستاخی ناقابل معافی ہے۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میں اشنان کر کے پوجا کیلئے آیا اور یہاں سچ مچ کی دیوی کو غش میں پا کر پوجا پاٹ بھول گیا اور آپ کو ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگا، بڑی خیریت یہ ہوئی کہ آپ فوراً ہوش میں آگئیں، معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی غشی کسی مصیبت عظیم کے باعث تھی۔

سندر:۔ (دبی آواز میں) آپ کا شکریہ میں فلک کی ستائی ہوں اور میری التجا دیوتاؤں تک کو ناگوار ہے، کاش میں پیدا نہ ہوتی

نوجوان:۔ کیا میں اس راز سے آگاہ ہونے کی جرأت کر سکتا ہوں شاید میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔

سندر:۔ میرا راز اظہر من الشمس ہے، آپ شاید نو وارد ہیں اس لئے

نہیں جانتے' میں اودے سنگھ کی بیٹی ہوں' کل میری اور میری ماں کی عزت راجہ کے سامنے باقی خزانہ کیلئے سر دربار اتاری جائیگی۔ اس سے زیادہ آبرو شکن تجویز کل شب کو میرے باپ کے اک جانی دشمن نے کی تھی' ہم دونوں ماں بیٹیوں نے دربار کی ذلت کو ہمیشہ کی رسوائی پر ترجیح دی۔ مگر دیکھئے میں آپ سے اپنی دکھ بھری داستان کہہ کر آپکو بھی پریشان کر رہی ہوں۔ یہ کہہ کر سندر تیزی کے ساتھ نکل گئی اور نوجوان دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا۔

راج نگر میں آج بڑی دھوم ہے نوجوان راجہ بیاہا جا چکا ہے۔ اور اس کی دلہن اپنی سسرال آ رہی ہے سارے شہر میں چراغاں ہوا ہے جگہ جگہ پر ناچ کا سامان ہے آتش بازیاں چھوٹ رہی ہیں کوئی گھر ایسا نہیں جہاں سامان آرائش نہ ہو اور چونکہ راجہ بہت ہی ہر دلعزیز ہے اسلئے رعایا نے بھی دل کھول کر اس کی خوشی میں خوشی منانے کی ٹھان لی ہے۔

راجہ کے محل کی دھوم دھام کا تو کہنا ہی کیا تھا' روشنی سے سارا مکان نور کا ٹکڑا بنا ہوا تھا' اور سامان آرائش سے جنت کا نمونہ' راجہ دولہا بنا ہوا سارے مکان میں ٹہل رہا تھا' جب لوگ منتشر ہوئے تو وہ خلوت میں گیا' اسکی نئی نویلی دلہن' گھونگٹ میں آئی ہوئی اک چاندی کے پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی' راجہ کی آمد نے اسے متنبہ کر دیا اور وہ سنبھل کر بیٹھ گئی' راجہ نزدیک جا کر اس نازنین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔

راجہ:۔ مجھ سے تو تمہیں شرم نہیں کرنی چاہئے' میں نے ان آنکھوں کی جادو طرازیاں' ان گالوں کی محبوبیاں اور ان لبوں کی شیرینیاں پہلے ہی دیکھی ہیں اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ میرے لبوں نے ان لبوں کو پیام وصل دیا ہے۔

اتنا سن کر وہ نئی نویلی دلہن اپنے آپے میں نہ رہی راجپوتی رگ شرافت جوش میں آ گئی' اور وہ غصہ میں تھر تھر کانپنے لگی' اس نے زور دیکر کہا کہ یہ سراسر جھوٹ بہتان اور ظلم ہے ساتھ ہی ساتھ طیش میں اس نے اپنے رخ سے آنچل ہٹا کر راجہ کی نظر سے نظر ملا کر چاہا کہ اسے جھٹلائے' مگر جونہی راجہ کی آنکھوں سے آنکھیں ملیں وہ ہلکی چیخ کے ساتھ راجہ سے لپٹ گئی اور دبی زبان سے آہستہ آہستہ راجہ کے سینے پر منہ رکھے ہوئی

بیشک تم سچے ہو اور میں جھوٹی' تم نے اسی دن مجھے ہی نہیں دل کے مندر میں اجالا کر دیا تھا مگر مجھے کیا خبر کہ تم ہی راجہ ہو میں تو تمہیں اک نوجوان اجنبی سمجھتی تھی' اور اپنی مصیبت کا ایک غمگسار' سچ سچ (ہنس کر) تم نے بڑا دھوکا دیا۔

راجہ مسکرا رہا تھا اور اس کے لب سندر کے گورے گورے گالوں سے خراج حسن وصول کر رہے تھے۔

لغزش

از جنابؒ رحمت علی صاحب صابر نور محلوی

گرمی کے دن تھے اور شام کا وقت۔ بہرام پور گاؤں کی مغربی جانب پنگھوٹ کے کنارے اُگی ہوئی لمبی لمبی گھاس میں دو تین لڑکیاں کوئی چیز تلاش کر رہی تھیں۔ شام کا جھٹپٹا بڑھتا جا رہا تھا۔ مگر اُن کی دیوانہ وار تلاش بدستور جاری تھی۔ اور اُن کے گھڑے پگڈنڈی کے پاس بڑی بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ اس ناکام جستجو سے تنگ آ کر ایک اپنی اوڑھنی سے پیشانی سے بہتے ہوئے پسینے کو خشک کرتے ہوئے بولی۔

"رابی! کیوں دیکھ لیا دل لگی کا مزا!!"

"کیوں میں نے کیا کیا!" دوسری تنک کر بولی۔

پہلی غصّے سے ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ "لو جیسے غریب نے کچھ کیا ہی نہیں۔ اری اگر تو بھابھی کو نہ گدگداتی تو بھاگتے وقت اُن کا "بُندا" کیوں گرتا۔ لے اب بیٹھی ہوئی گھاس کرید!"

"تم تو فضول ہی بگڑ رہی ہو بانو!" رابی اُن کے غصّے کو دھیما کرنے کی غرض سے بولی "میں نے تو ذرا سا گدگدایا ہی تھا کہ بھابھی جان چھوڑ کر بھاگیں۔...... اس کا تو میرے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ بُندا انہوں نے کان کی لو ہی پر چھوڑا ہے، جو ذرا سا بھاگتے ہی گر جائیگا......"

"اچھا اب تو تمہارے فرشتے جان گئے نہ!" بانو طنزیہ بولی "مانا کہ سسرال بھیا کچھ نہ کہیں گے۔ مگر عبشان خالہ سے جان کیونکر چھوٹیگی؟"

"میں خالہ سے کہہ دونگی کہ بُندا میری ہی غلطی سے گُم ہوا ہے"

"اونہہ! جیسے کہہ ہی تو دیگی۔ اور خالہ اسے سُنکر چُپ ہو جائیگی"۔ بانو بولی "نہ بیوی ایسی بھول بھی نہ کر بیٹھنا۔ ورنہ یہ بھونرے کا کالا چونٹا جو لئے پھر رہی ہو، چھلا ہوا کدو بن جائیگا"۔

"تم تو فضول ہی آپس میں جھگڑ رہی ہو" تیسری بولی۔ جو ابھی تک خاموشی سے دونوں کی باتیں سُن رہی تھی۔ "اندھیرا ہو رہا ہے ایک دفعہ ہمیں پھر دیکھ لینا چاہیے۔ شاید اللہ میاں رحم کر دیں"۔

"بھلا تم ہی کہو بھابھی!" رابی شرما کر بولی۔ "آخر ہم نے کون سا قصور کر دیا جو بانو میرے پیچھے یوں تنجے جھاڑ کر پڑ گئی"۔ وہ رونے لگی۔

"اب ٹسوے بہلنے سے کام نہ چلے گا" بانو بولی۔ "اب سیدھی طرح سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے بُندا ڈھونڈ لو۔ رونے کیلئے بہت وقت پڑا ہے"۔

تینوں پھر گھاس کی پتی پتی کریدنے لگیں۔ مگر بُندے کو نہ ملنا تھا اور نہ ملا۔ تھک ہار کر تینوں اپنے گھڑوں کے پاس آ کھڑی ہوئیں۔ مگر نگاہیں بدستور گھاس کی پتیوں میں اُلجھی ہوئی تھیں۔ اتنے میں درختوں کے جھنڈ میں سے کسی کے پگڈنڈی پر چلنے کی چاپ سنائی دی۔ تینوں چونک کر ادھر دیکھنے لگیں۔

"یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو" آنیوالے نے دُور ہی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں فجو بھیا"۔ رابی اپنا آنچل ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔ اور آنیوالے کو آگے بڑھتے دیکھکر بھابھی سمٹ کر کھڑی ہو گئی اور گھونگھٹ نکال لیا۔

"سورج کب کا ڈوب گیا اور تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو"۔ فجو نے اُنہیں کھڑے دیکھ کر دوبارہ سوال کیا۔

"ہاں اب جاتی ہیں" بانو جھک کر گھڑا اٹھاتے ہوئے بولی "ذرا تاجو بھابھی کا......" رابی نے جلدی سے اُس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور ملتجیانہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

"آخر کیا بات ہے بانو!" فجو آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "معلوم ہوتا ہے کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے" دونوں لڑکیاں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔ اور تاجو ہٹ کر دونوں کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔ بانو نے دو تین دفعہ کہنے کے لئے زبان کھولی۔ مگر ہمت نہ پڑی۔ آخر کار رابی خود ہی بول اٹھی۔

"میں نے تاجو بھابھی کو ذرا گدگدایا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ بھاگیں تو ندا ہیں کہیں گر گیا۔ اب ہم ڈھونڈتی ہیں تو ملتا ہی نہیں......"

"اور بھابھی۔ عیشان خالہ کے خوف سے کانپ رہی ہیں" بانو فکرمند ہو کر بولی "وہ کان بوچا دیکھیں گی تو کیا کہیں گی ......"

"کہہ دیں کہ گر گیا۔" رابی بیچ ہی میں بول اٹھی۔ "وہ کہیں کھا تو نہ جائنگی"

"بڑی آسانی سے کہہ دیا کہہ دیں کہ گر گیا،" بانو غصے سے بولی "تمہیں بھی جب خالہ عیشان کی سی ساس ملیں گی تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا"

"یہ تو بہت برا ہوا،" فجو اپنی چھڑی سے زمین پر لکیریں کھینچتے ہوئے بولا۔ "بُندا نہ ملا تو شاید غریب پر کیا بیتے ..... اچھا کتنے ایک کا ہوگا" اس نے بانو کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ "دس بارہ سے تو کم کا نہ ہوگا۔ ہے نہ بھابھی!" یہ کہہ کر اس نے گھوم کر تاجو سے پوچھا مگر وہ گھونگٹ نکالے اسی طرح اوڑھنی کے پلو کو انگلی پر لپیٹتی رہی

"بانو!" فجو بولا "تم اور رابی فجر میں آکے اسے تلاش کرنا۔ اگر مل گیا تو خیر...... ورنہ میں رابی کی جگہ دام دے دونگا...... سمجھیں"۔

یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔ اور چھڑی گھماتا ہوا رخصت ہو گیا۔ رابی اور بانو تعریف بھری نگاہوں سے اسے جاتے ہوئے کھڑی دیکھتی رہیں۔ جیسے ہی وہ درختوں کے جھنڈ میں نظروں سے غائب ہو گیا تو تاجو نے گھونگٹ بڑھا دیا اور ادھر دیکھنے لگی۔ رابی پھر پہلی ہی شوخی کے ساتھ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔

"کیوں دیکھی فجو میاں کی ہمت، کسی کا دکھ سنا نہیں کہ مدد کے لئے آمادہ ہو گیا۔ غریبوں کے لئے تو بیچارا جان دیتا ہے"

"ٹھیک کہتی ہو بہن!" بانو بولی "میں نے تو اس کا سا ہنس مکھ ہمدرد اور ملنسار جوان اب تک نہیں دیکھا۔ جب سے بیچارہ یہاں سے گیا ہے چودھری کی بیٹھک سونی سونی معلوم ہوتی ہے"

"یہ کون تھے بانو!" تاجو ان کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے بولی۔

"ایک دو دفعہ میں نے کہیں انہیں دیکھا ہے"

"دیکھا کہاں ہوگا۔ یہیں گھومنے آئے ہوں گے" بانو بولی "یہاں رہتے تھے تو بلا ناغہ آیا کرتے تھے......"

"اور انہوں نے بھی غالباً آپ کو دیکھا ہوگا" رابی شرارت بھرے لہجے میں بولی "سچ ہے اچھی چیز کو سبھی پسند کرتے ہیں" تاجو کا فرطِ حیا سے چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور اس نے شرما کر گردن جھکالی "کیوں شرما گئیں۔ ابھی ابھی تو ان کے بارے میں دریافت کر رہی تھیں۔ خیر تو سنو ہمارے گاؤں کے جو نمبردار ہیں نہ، یہ ان کے بھانجے ہیں۔ ان کا گھر تو کہیں لائل پور کے آس پاس ہے۔ مگر خود انہوں نے پرورش یہیں پائی ہے۔ پڑھائی کی وجہ سے انہیں یہاں سے جانا پڑا۔ سنا ہے لاہور میں چودھویں جماعت میں پڑھتے ہیں۔ بڑے ہی ہنس مکھ اور زندہ دل نوجوان ہیں۔ جب کبھی چھٹی ملتی ہے تو بھاگے ہوئے یہاں پہنچ جاتے ہیں۔ اب کی بھی شاید گرمی کی چھٹیاں گزارنے آئے ہیں۔ چہرہ مہرہ اور رنگ روپ تو تم نے دیکھ ہی لیا ہوگا۔ ورنہ وہ بھی بتا دیتی کہ گورے چٹے اور منہ لگتے جوان ہیں .... بس کہ کچھ اور بتاؤں"

"بس یہی کافی ہے،" تاجو مسکراتے ہوئے بولی۔ رابی اور تاجو دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ اور پھر آہستہ آہستہ اپنے گھروں کی طرف بڑھیں

جو کچھ اوپر بتایا گیا ہے فجو اس سے بھی دو چار رتی زیادہ ہی تھے ان کا شمار کھاتے پیتے گھرانوں کے ان نوجوانوں میں ہوتا تھا جنہیں

کھانے کمانے کی تو کوئی ضرورت نہیں ہوتی، البتہ غریبوں کی بہو بیٹیوں کو گھورنا اور اُن سے چھیڑ چھاڑ کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ فجو چونکہ تعلیم یافتہ نظر باز تھا۔ اس لئے اُس نے اس مشغلے میں بھی جدّت پیدا کرلی تھی۔ اور ذوقِ نظارہ بازی کے لئے ہمدردی اور ملنساری کا ڈھونگ رچا رکھا تھا۔ ایک متموّل گھرانے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے لوگ اُسے عزّت کی نگاہوں سے تو دیکھتے ہی تھے، اور کچھ اُس نے غریبوں کی وقت بے وقت مدد کر کے اور بھی ہر دل عزیزی حاصل کرلی تھی۔ وہ اس پارٹ کو اس ہوشیاری سے انجام دیتا تھا کہ کوئی اُس کے دلی مقصد کو نہ پا سکتا تھا۔ اسکول کے زمانہ میں تو وہ بلاناغہ پنگھٹ پر گھومنے جاتا تھا۔ مگر کالج میں جانے کے بعد اس معمول میں فرق آگیا۔ اب جب کبھی چھٹیاں ہوتیں تو ذوقِ نظر کی آسودگی کا سامان ہوتا۔ اس دفعہ جو وہ چھٹیوں میں آیا تو ایک نئی ہی صورت نظر آئی۔ وہ تھی سراج کسان کی نئی نویلی بہو۔ ...... نشۂ جوانی میں مخمور ...... شباب و رعنائی کی مجسم تصویر ...... فجو کی آنکھوں میں چکاچوند سی ہوگئی۔ اور اسے اپنے مشغلۂ نظر بازی میں ترمیم کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اور دل میں طرح طرح کی خواہشیں کروٹیں لینے لگیں۔ کئی دن گذر گئے۔ وہ دُور ہی سے درختوں کی آڑ لیکر شباب و رعنائی کے اس عدیم النظیر پیکر کو دیکھتا رہا۔ آگے جانے کی ہمّت نہ ہوئی اور پھر اُسے متوجہ کرنے کا کوئی بہانہ بھی دماغ میں نہ آتا تھا۔ آخر کار "بندے" کی گمشدگی سے یہ نادر موقعہ بھی اُس کے ہاتھ آگیا۔ اور وہ اپنی بے لوث ہمدردی کا سکّہ تاجو کے دل میں بٹھانے میں کامیاب ہوگیا۔

دوسری شام تاجو رابی کے ساتھ گھڑا لئے ہوئے پنگھٹ کی طرف جا رہی تھی۔ کہ فجو راستے میں مل گیا اور پوچھنے لگا۔

"کیوں بُندا ملا رابی!"

"ہاں مل گیا بھیا" رابی مُسکرا کر بولی "اور نہ بھی ملتا تو تاجو بھابھی کو اسکی فکر تھوڑی تھی۔ آپ تو نیا لا ہی دیتے۔" یہ کہہ کر اُس نے کن انکھیوں سے تاجو کی طرف دیکھا جو گھونگٹ نکالے ہوئے اسکی اوٹ میں چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"اچھا ہوا جو مل گیا" فجو بولا "ورنہ میں تو رات بھر خواب میں علیشان خالہ کو غصّے میں لال پیلا ہی دیکھتا رہا" یہ کہہ کر وہ ہنس پڑا۔ رابی بھی ہنسنے لگی۔ اور تاجو مُسکرا پڑی۔

تاجو پہلے تو بہت لجاتی رہی۔ مگر رابی اور دوسری لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ نے آخر اُسے بھی بے حجاب ہی کر کے چھوڑا۔ اب تو وہ بھی کبھی کبھی فجو سے ایک آدھ فقرہ مذاق کے طور پر کہہ دیتی۔ اور جواب میں وہ بھی کوئی چٹکی لے لیتا۔ اس کے کوئی پندرہ بیس روز بعد فجو کو وہ تنہا ہی پنگھٹ پر مل گئی۔ تاجو اُسے پنگھٹ پر دیکھ کر بہت گھبرائی اور چاہا کہ جلدی سے گھڑا بھر کر لوٹ جائے۔ مگر فجو اُسے یوں آسانی سے چھوڑنے والا نہ تھا۔ اور وہیں پتھر پر بیٹھے بیٹھے بولا۔

"آج جلدی ہے کیا۔ جو آتے ہی گھڑا بھر کے لوٹ چلیں!"

یہ سُنکر اُس نے گھڑا اتار کر پھر گیلی زمین پر رکھ دیا۔ اور اپنی اوڑھنی کا آنچل سنبھال کر کھڑی ہوگئی۔ فجو بھی چھڑی گھماتا ہوا۔ اُس کے قریب آگیا۔ تاجو نے تنہائی کی وجہ سے اپنے جسم میں پھریری سی محسوس کی اور سمٹ کر کھڑی ہوگئی۔ اور فجو بے مدّعا نگاہوں سے گھڑے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ایک دن رابی کہہ رہی تھی کہ تاجو بھابھی لکھنا پڑھنا بھی جانتی ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟"

وہ سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ فجو نے اپنا سوال پھر دہرایا تو وہ پاؤں کے انگوٹھے سے زمین پر لکیریں کھینچتے ہوئے بولی۔

"یوں ہی کچھ معمولی اردو لکھ پڑھ لیتی ہوں۔"

"اچھا ...... میں تو اُس باتونی چھوکری کی باتوں پر اعتبار ہی نہ کرتا تھا۔"

فجو اشتیاق بھری نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"خیر یہ سُنکر جی بہت خوش ہوا۔کہ تم پڑھی لکھی ہو۔مگر افسوس ہے کہ.........." اُس کے چُپ ہوجانے سے تاجو نے گھبرا کر اپنا مُنہ اوپر اٹھایا۔اور اُسے دوسری طرف متوجہ دیکھ کر بولی۔

"آپ چپ کیوں ہوگئے! کہئے نہ!!"

"ہاں ہاں.........تو میں کہہ رہا تھا کہ تم پڑھی لکھی ہو۔اور سراج ان پڑھ تمہارے ماں باپ نے یہ بے جوڑ شادی کس طرح کردی۔اور پھر سُنا ہے کہ عیشان خالہ کا سلوک بھی تم سے اچھا نہیں۔

تاجو نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔اور ہلکی سی سسکی بھرتے ہوئے بولی۔

"تقدیر کا لکھا کون مٹا سکتا ہے۔فجو بابو! میرے ابا مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔اور مجھے بھی گھر آکر پڑھایا کرتے تھے۔اُن کا ارادہ تھا کہ مجھے اچھی تعلیم دلائیں۔مگر خدا کو یہ منظور نہ تھا۔اُنہیں دمے کا شروع ہی سے عارضہ تھا۔ایک دفعہ تو ایسا دورہ پڑا۔کہ چار دن اور چار رات تک بہت بیکل رہے۔اور پانچویں دن مجھے اور میری ماں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر چل بسے۔جو کچھ روپے پیسے تھے وہ کچھ تو اُن کے علاج معالجے میں لگ گئے۔اور باقی بنئے نے لے لئے۔میں جوان ہوچکی تھی۔ماں کو میری شادی کی فکر تھی۔کوئی اچھا بر نہ ملتا تھا۔اور جو ملا بھی تو ہماری غریبی آڑے آئی۔اور معمولی جہیز پر کوئی مجھ سے شادی کرنے پر تیار نہ ہوا۔بڑی تلاش اور کوشش کے بعد میری شادی کی یہاں بات چیت ہوئی اور چند مہینے بعد یہ تقریب بھی انجام پاگئی۔اور میں رخصت ہوکر آگئی۔میرے شوہر لاکھ ان پڑھ اور غریب سہی۔مگر ہیں شریف، اور مجھے دل سے چاہتے ہیں۔اور یہی میرے لئے بہت ہے۔اُنکی خدمت و حکم برداری کرنا میرا اولین فرض ہے۔جسے میں آخری دم تک پورا کرنے کی کوشش کرونگی۔رہ گئی عیشان خالہ تو ان کی شکایت کیسی۔بڑھاپے میں مزاج کچھ چڑچڑا ہو ہی جاتا ہے۔اُن کے ٹوکنے کا مجھے کوئی رنج نہیں......"

"تمہاری باتیں سُنکر میرا دل بہت خوش ہوا"۔فجو اپنی چھڑی سے گیلی زمین پر دائرے بناتے ہوئے بولا"سچ پوچھو تو ہندوستانی شوہروں کو ایسی ہی خدمتگزار اور وفاشعار بیویوں پر ناز ہے۔خدا تمہیں تمہارے ارادوں میں کامیاب کرے"۔

تاجو اپنی تعریف سُنکر پھولی نہ سمائی۔فجو پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"اچھا تو میں تمہیں پڑھنے کے لئے کتابیں دونگا۔جب کبھی فرصت ملے اُنہیں پڑھا کرنا۔اس طرح تمہارا جی بھی لگا رہیگا۔اور معلومات میں بھی اضافہ ہوگا........اگر کسی وقت کسی چیز کی ضرورت پڑے تو مجھے یاد کرنا۔میں تمہاری ایسی بلند خاتون کی خدمت کرکے بہت خوش ہونگا"۔

یہ کہہ کر وہ چھڑی گھماتا ہوا کھیتوں کی طرف بڑھ گیا۔اور تاجو تعریف بھری نگاہوں سے کھڑی اُسے دیکھتی رہی اور بولی۔

"کتنا شریف اور سیدھا سادہ جوان ہے"۔

فصل نہ ہونے کی وجہ سے سراج کا ہاتھ بہت تنگ تھا۔سرکاری لگان کی ادائی کا موقع سر پر آپہونچا تھا۔مگر اب تک روپے کا انتظام نہ ہوا تھا۔فجو کو کسی نہ کسی طرح اُس پریشانی کا حال معلوم ہوگیا۔اور اُس نے دوسرے ہی دن اپنی گرہ سے لگان کی رقم ادا کردی۔اس طرح وہ اُن کے گھر آنے جانے لگا۔ماں بیٹا اُس کے ممنون احسان ہونیکی وجہ سے اُس کی خاطر و مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے اور اُسے اپنا سچا ہمدرد اور بہی خواہ سمجھتے تھے۔اور تاجو بھی اُس کی بے غرض امداد اور بے لوث ہمدردی کی وجہ سے بہت متاثر تھی۔اُس نے جو کچھ فجو کے بارے میں سُنا تھا۔اُسے اُس سے بھی کچھ زیادہ ہی پایا۔پہلے تو وہ اسے دیکھتے ہی گھونگٹ نکال لیا کرتی تھی۔مگر اب یہ بھی برائے نام ہی رہ گیا تھا۔اور وہ ایک دوسرے سے براہ راست گفتگو بھی کرنے لگے حسب وعدہ

فجو نے اُسے مطالعے کے لئے کتابیں بھی مہیا کرنی شروع کر دیں کتابوں میں بیشتر تعداد گھٹیا درجے کے عشقیہ ناولوں کی ہوتی تھی جنہیں نفسانیت کے غلام اور پست اخلاق مصنفوں نے جذبات میں ہیجان اور سفلی جذبات کو بھڑکانے کے لئے وہ وہ حیاسوز اور عریاں مناظر قلمبند کئے تھے کہ توبہ بھلی جن کا مطالعہ سنجیدہ مزاج طبقے کی اخلاقی تباہی اور معاشرتی زندگی کی بربادی کا پورا پورا سامان اپنے اندر رکھتا تھا۔

ان اخلاق سوز افسانوں کے مطالعے نے تاجو کی دُنیا ہی بدل دی۔ اُس کے پاؤں ڈگمگانے لگے۔ اور وہ سیدھی راہ کو چھوڑ کر گم کردہ راہ مسافر کی طرح ایک نئی منزل میں قدم زن ہونے پر مجبور ہو گئی۔ اس نئی دنیا کے سراب آلود اور فریب آسا نظاروں نے اُس کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دی اور اُسے اپنی موجودہ طرز زندگی سے نفرت ہو گئی۔ اور وہ جان بوجھ کر اپنے فرائض منصبی سے پہلو تہی کرنے لگی۔ فجو سے اوباش نوجوان کی ہمنشینی آگ پر تیل ثابت ہوئی۔ اور وہ رات دن افسانوی محبت کے خواب دیکھنے لگی۔

سراج ایک سیدھا سادہ غریب نوجوان تھا جو تاجو سے محبت کرتا تھا اتنی محبت جتنی کہ ایک شوہر کو اپنی بیوی سے کرنی چاہئے۔ اس کی محبت میں ظاہر میں گرمی اور بیقراری نہ تھی۔ اُس کے الفاظ میں تصنع اور بناوٹ کا شائبہ تک نہ تھا۔ مگر فجو کے دماغ میں حیوانی خواہشات کا طوفان بپا تھا۔ اُس کے رگ و پے میں ہوس پرستی اثر انداز ہو چکی تھی۔ جب وہ گفتگو کرتا تو اُس کے لہجے سے اضطراب و دلی بیقراری کا اظہار ہوتا اور تاجو اس رومانی گفتگو کی سماعت اور اوضاع و اطوار سے تمام ہونوالی بیقراری سے متاثر ہو کر روز بروز حشر انگیز جذبات کی رَو میں بہتی جا رہی تھی۔ ناولوں کے فحش مواد نے اُس کی قوتِ تمیز اور فہم و ادراک کو یہاں تک بیکار کر دیا تھا۔ کہ وہ اپنے سادہ لوح شوہر اور اپنی موجودہ زندگی سے نفرت کرنے لگی۔ .... وہ غریب افسانوی محبت کو کس طرح عملی جامہ پہنا سکتا تھا۔ جبکہ وہ ریاکاری اور فریب کی دنیا سے بالکل نابلد تھا۔

فجو کی آمد و رفت سے قبل وہ ویرانے میں کھلی ہوئی اُس کلی کی طرح تھی جو اپنی قدر و قیمت سے ناآشنا ہو۔ مگر آج وہ اپنی قدر و قیمت سے اچھی طرح آگاہ ہو چکی تھی۔ اور اُسے رہ رہ کر فجو کا یہ فقرہ یاد آتا تھا "تاجو! تم نہیں جانتیں کہ تم کیا ہو۔ کاش میں تمہیں بتا سکتا اور تم جان سکتیں کہ تمہارا یہ گورا سا رنگ۔ یہ مدبھری سیاہ آنکھیں۔ یہ بھونرے سے سیاہ بال اور یہ نرم و نازک ہاتھ اوپلے تھاپنے اور کھرپے سے گھاس کھودنے کے لئے نہیں بنے۔ بلکہ ...." اس سے زیادہ نہ فجو نے کہی کہا اور نہ تاجو میں اس کے سننے کی تاب تھی۔

ایک رات .... ہاں جولائی کی ایک رات کو جب کہ آسمان پر گہرے سیاہ رنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ دن بھر کی محنت کے بعد سراج ایک کھری سی چارپائی پر اطمینان سے سویا ہوا تھا۔ یکایک باہر سے ہلکی سی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ جھونپڑی کے اندر سے جواب میں کسی نے دیا جلایا اور اُسے کھڑکی کے سامنے لے جا کر دو تین بار گھمایا۔ یہ تاجو تھی اُس نے ایک چھوٹی سی گٹھڑی جو پہلے ہی سے باندھ کر رکھی ہوئی تھی۔ اٹھا کر بغل میں لے لی۔ اور دبے پاؤں باہر نکلنے لگی۔ سراج نے بڑبڑاتے ہوئے کروٹ لی۔ اور چارپائی کی چولیں چرچرانے لگیں۔ تاجو سہم کر اندھیرے میں کھڑی ہو گئی۔ اُس نے گٹھڑی کو پھر اُسی جگہ رکھ دیا اور اطمینان سے اپنی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ باہر سے پھر سیٹی کی آواز آئی۔ وہ پھر اُٹھی گٹھڑی اٹھائی دیئے کی روشنی سراج کے پُروقار اور سادہ چہرے پر پڑ رہی تھی۔ تاجو نے ایک آہ بھری اور اُس پر ایک الوداعی نگاہ ڈال کر دبے پاؤں باہر نکل آئی۔ اُسے دیکھتے ہی نیم کے نیچے سے ایک سایہ اُس کی طرف بڑھا۔

"تم آگئیں تاجو!"

"ہاں فجو"۔ دونوں تیزی سے سڑک پر ہو لئے۔

اُنہیں ایک قصبے کی سرائے میں ٹھیرے ہوئے ایک ہفتہ سے زیادہ عرصہ گذر چکا تھا۔ اس مختصر سے عرصے ہی میں فجو کا وہ جذباتی دور ختم ہو چکا تھا۔ جس نے اُسے اس قابل نفرت حرکت کے کرنے پر اکسایا تھا ہوس انگیز جذبات کی فراوانی، حیوانی خواہشات کا دل و دماغ کو فکر فردا سے بے نیاز کر دینے والا وقتی جوش کڑھی کی اُبال کی طرح سرد ہو چکا تھا۔ اور وہ رہ رہ کر اُس منحوس گھڑی کو کوس رہا تھا، جبکہ وہ رات کی تاریکی میں تاجو کو ساتھ لئے ہوئے چوروں کی طرح گاؤں سے بھاگا تھا۔ تاریک مستقبل کا زہرہ گداز تصوّر آٹھوں پہر اُسے لرزہ براندام کئے رہتا تھا۔ وہ رات دن اِس ذہنی اضطراب اور روحانی خلش سے چھٹکارے کی تدبیریں کرتا تھا۔ مگر کوئی تدبیر بھی کارگر نہ ہوتی تھی۔ اُسے گرد و پیش کی ہر ایک چیز سے خوف معلوم ہوتا تھا۔ اور محسوس ہوتا تھا جیسے کہ دنیا کی ہر ایک چیز اُس کی اس حرکت پر اُسے نفریں کر رہی ہے۔ تاجو کے کہنے پر اُس نے دو ایک جگہ نوکری کی بھی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ وہ بی۔ اے پاس تھا۔ مگر شہر میں اُسے بیس روپے کی نوکری بھی نہ ملتی تھی۔ اُسے اپنی بے بسی پر رونا آ گیا۔

ایک دن شام کو وہ دن بھر کی سرگشت کے بعد لوٹ رہا تھا کہ اُس نے راستے میں ایک مجرم کو دیکھا جسے دو سپاہی لئے جا رہے تھے۔ مجرم کا سر جھکا ہوا تھا۔ اُس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی اور کمر میں رسّی باندھکر ایک سپاہی اُسکو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا فجو یہ نظارہ دیکھتے ہی تھرتھرا اٹھا۔ اگر وہ لیمپ کے کھمبے کا سہارا نہ لے لیتا تو یقیناً گر جاتا۔ سپاہیوں میں سے ایک نے گردن گھما کر فجو کی طرف دیکھا۔ اُن چھوٹی چھوٹی مگر تیز اور چمکدار آنکھوں میں بلا کی سختی تھی۔ فجو کو اس طرح معلوم ہونے لگا جیسے کہ وہ کہہ رہا ہو" ایک شادی شدہ عورت کو بھگا لائے ہو نہ! ٹھیرو تمہیں بھی گرفتار کرتا ہوں" سپاہی مجرم کو لئے ہوئے چلے گئے۔ مگر فجو ابھی تک لیمپ کے کھمبے سے لپٹا کھڑا تھا اور آنکھیں اُسی راستے پر لگی ہوئی تھیں جس پر کہ سپاہی مجرم کو لئے ہوئے گئے تھے۔ جب وہ نظر سے اوجھل ہو گئے۔ تو وہ بمشکل تمام سرائے میں واپس آیا تو تاجو اسے دیکھتے ہی مسکراتی ہوئی اُٹھی۔

" کہو! کہیں نوکری کا بندوبست ہوا ؟" اُس نے اپنی بلا خیز آنکھوں سے فجو کا استقبال کرتے ہوئے پوچھا۔

فجو نے کوئی جواب نہ دیا اور بڑھکر چارپائی پر لیٹ گیا۔

" خیر تو ہے !" تاجو اُس کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھے ہوئے بولی " تم آج بہت سُست دکھائی دیتے ہو !! "

فجو نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور سسکیاں لینے لگا۔ تاجو ضبط نہ کر سکی، اور جلدی سے اُس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ اور بالوں میں اپنی حنا آلودہ انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے بولی۔

" نوکری نہیں ملی نہ سہی۔ ابھی تو میرا تمام زیور باقی ہے۔ جب تک خدا کہیں نہ کہیں انتظام کر ہی دے گا۔ گھبراتے کیوں ہو "

" میں نوکری کے لئے نہیں روتا" فجو روندھے ہوئے گلے سے بولا۔ " بلکہ اپنی حماقت پر رو رہا ہوں ...."

" حماقت ! حماقت کیسی ؟ تم بھی آج عجیب باتیں کرتے ہو ——"

" میں نے تمہیں بھگا لانے میں انتہائی بیوقوفی کی۔ اب مجھے اپنی جلد بازی پر افسوس ہو رہا ہے اور میری وجہ سے تمہیں بھی تکلیف اٹھانی پڑی۔"

" اس تکلیف میں بھی ایک راحت ہے فجو !" وہ ایک شیریں تبسم کے ساتھ بولی " ہمت کیوں ہارتے ہو۔ دیکھو تو سہی کیا کچھ ہوتا ہے۔"

ہوتا کیا ہے ؟ وہ بولا " میرے خیال میں تو ہمیں واپس چلنا چاہیئے "

" واپس۔ نہیں فجو اب ہم واپس نہیں جا سکتے۔ اُس رسم و رواج کی پابند زندگی کے دروازے ہم پر بند ہو چکے ہیں۔ سماج کی نظروں میں ہم مجرم ہیں۔ ایسے مجرم جن کا جرم کبھی بھی معاف نہیں کیا جا سکتا...... اُس گاؤں کو چھوڑ کر تم جہاں کہیں بھی مجھے چاہو لے چلو۔ میں دنیا کے دوسرے

ے تک تمہارے ساتھ جانے کے لئے تیار ہوں۔ مگر اُس گاؤں اور اُس گھر
ں تو مرتے دم تک نہ جا سکوں گی۔ بولو تیار ہو نہ !" مگر فجو نے کوئی
واب نہ دیا اور کروٹ بدل کر سو گیا۔

اگلی صبح تاجو اُٹھی تو فجو کی چارپائی خالی تھی۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا
س کا سوٹ کیس اور بستر بھی غائب دیکھا غریب نے سر پیٹ لیا۔ کچھ
ھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے اور کہاں جائے۔ اُسے محبت کے پردہ میں
دکر نیوالا بزدل عاشق راہِ فرار اختیار کر چکا تھا۔ اُس نے انتظار کیا مگر بسود
ہر طرف سے مایوس ہو کر اُس نے سرائے کا کسی نہ کسی طرح حساب چکایا۔
اپنے کپڑوں کی بقچی دبائے ہوئے باہر نکلی اور ایک طرف کو چل پڑی۔

دھری فضل احمد بی۔ اے بی۔ ٹی ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولز، علاقے کے اسکولوں کے
ینے کی غرض سے موروثی پور ڈاک بنگلہ میں اترے ہوئے تھے۔ آپکے ساتھ دو
سٹنٹ ڈپٹی انسپکٹر بھی تھے صبح کے ناشتے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ اردلی نے
ھری خیر دین نمبردار کے آنیکی اطلاع دی۔ آپنے اُنہیں اندر لانیکے لئے کہا۔ تھوڑی
یں چودھری صاحب اپنی طرہ دار پگڑی کو سنبھالتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ اور
سپکٹر صاحب اُنہیں دیکھتے ہی بولے۔

ہئے چودھری صاحب کیسے آنا ہوا !" اور پھر ایک کرسی کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
ں ہی سلام کی غرض سے چلا آیا۔" نمبردار صاحب بولے" اور ایک کام بھی تھا۔"
یے کہئے۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو میں ہر وقت بجا لانیکے لئے تیار ہوں"
پ جانتے ہیں کہ اس علاقہ میں صرف دو ہی گرلز سکول ہیں اور دونوں کے
وں ہمارے گاؤں سے بہت دور ہیں۔ میرا عرصے سے ارادہ تھا کہ کہیں نزدیک
یک آدھ گرلز اسکول کھول دیا جائے۔ مگر ہر دفعہ حالات کچھ ایسے پیش آتے رہے کہ یہ ارادہ
تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ آخر میری دیرینہ آرزو پوری ہوئی اور ہمیں ایک ماہرِ فن معلمہ
سر ما حاصل ہو گئیں۔ اور ہم نے پرائیویٹ طور پر اپنے گاؤں میں بچیوں کیلئے ایک مکتب
ری کر دیا۔ اور معلمہ موصوفہ نے چھ ہی ماہ کے قلیل عرصے میں اپنی قابلیت اور
حُسنِ اخلاق کیوجہ سے گاؤں کی لڑکیوں میں تعلیم سے اس قدر دلچسپی پیدا کر دی ہے
کہ دن پر دن طالبات کا نمبر ترقی پذیر ہے۔ خوش قسمتی سے آپ ضلع کے انچارج ہیں
اور میں چاہتا ہوں کہ آپ کوشش کرکے اس مکتب کو بھی منظور کرا کے سرکاری
امداد کی منظوری دلا دیں۔"

" مگر وہ معلّمہ کون ہے ؟"

" ایک لاوارث بیوہ ہے، جس کا گھر ضلع لائل پور میں کسی جگہ ہے۔ مگر اب بیداُس کا
کوئی رشتہ دار سوائے ساس کے زندہ نہیں۔ اور ہم نے مکتب میں اُسکے رہنے کا انتظام
کر دیا ہے...." "اچھا میں کل صبح مکتب کو دیکھنے کیلئے آؤں گا۔ اور پھر کوئی
خاطر خواہ انتظام کر دیا جائیگا۔" چودھری صاحب شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گئے۔

اگلی صبح حسبِ وعدہ انسپکٹر صاحب بغرضِ معائنہ تشریف لائے اور چودھری صاحب گاؤں کے
دو ایک معزز آدمیوں کے ساتھ اُنہیں مکتب میں لے گئے۔ گاؤں کی ننھی مُنی بچیاں
صاف ستھرا لباس پہنے قطار در قطار اپنے معزز مہمان کی پیشوائی کے لئے کھڑی تھیں
انسپکٹر صاحب نے چند بچیوں سے سوال کئے۔ جن کا اُنہوں نے بڑی ہوشیاری سے
جواب دیا۔ یکایک اُنہیں کوئی خیال آیا اور وہ چودھری صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

" اُستانی صاحبہ کہاں ہیں.......!"

چودھری صاحب نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر بولے۔ " ابھی تو یہیں تھیں۔ شاید
دوسرے کمرے میں ہوں۔ اچھا میں بلاتا ہوں"۔ چند منٹ بعد وہ اُستانی جی
کو لئے ہوئے واپس آئے۔ وہ سر جھکائے ہوئے تھی۔

"آپکی اس محنت اور قابلیت پر میں آپکو مبارکباد دیتا ہوں" انسپکٹر صاحب نے کہا
" شکریہ !" یہ کہکر اُس نے نگاہیں اوپر اُٹھائیں —— انسپکٹر صاحب چونک
پڑے اور بے اختیار اُن کے مُنہ سے نکلا —— " کون تاجو !"

" ہاں فجو چودھری " —— انسپکٹر صاحب بمشکل گرتے گرتے بچے، اور جلدی
ہی سنبھل کر بولے —— " اچھا میں کل آؤنگا۔ آج مجھے موروثی پور والی اسکول کا
معائنہ کرنا ہے۔" یہ کہکر وہ نمبردار صاحب کے ساتھ ساتھ باہر نکل آئے۔ اور بھولی بسری
باتوں کی یاد سے اُنہیں رات بھر نیند نہ آئی اور اُنہوں نے کروٹیں بدلتے بدلتے صبح کر دی۔ —— دوسری صبح وہ تنہا ہی مکتب کی طرف روانہ ہو گئے۔ لڑکیاں حسبِ معمول چٹائیوں پر بیٹھی آموختہ یاد کر رہی تھیں۔ اُنہیں دیکھتے ہی ۲

شکسپیئر کی شہرۂ آفاق تمثیل "AS YOU LIKE IT" کا ترجمہ

من کی چاہ

مترجمہ جناب سعید الحق صاحب دسنوی بی۔اے (آنرز)

(۲)

تیسرا منظر

محل میں ایک کمرہ

سلیا:- کیوں بہن روزلینڈ، کیوپڈ تم پر رحم کرے خاموش کیوں ہو

روزلینڈ:- بات کچھ ایسی ہی ہے کہ چپ ہوں۔

سلیا:- کیا تم اپنے والد کے خیال میں محو ہو۔

روزلینڈ:- نہیں کچھ اپنے لڑکے کے باپ (شوہر) کا بھی خیال ہے۔ دنیا مصیبتوں کا گھر ہے۔

سلیا:- یہ مشکلیں مثل ان کانٹوں کے ہیں جو مزاحاً کسی پر پھینک دئے جائیں اگر ہم لوگ احتیاط سے صحیح راستہ پر نہ چلیں تو یہ کانٹے ہم لوگوں کے دامن میں لگ جائیں۔

روزلینڈ:- ان کانٹوں کو کپڑوں سے نکال کر پھینکدیتی مگر یہ وہ کانٹے ہیں جن کی خلش دل میں ہوتی ہے۔

سلیا:- تو ان کانٹوں کو نکال کر پھینک دو۔

روزلینڈ:- افسوس، بس کی بات نہیں۔

سلیا:- کیا یہ ممکن ہے کہ تم یکایک اورلینڈو کے دام محبت میں گرفتار ہو گئی ہو۔

روزلینڈ:- میرے والد اور ان کے والد دوستی اور محبت کے رشتہ میں منسلک تھے۔

سلیا:- تو کیا اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تم ان کے لڑکے کے دام عشق میں گرفتار ہو جاؤ، میرے والد تو اس کے والد سے متنفر تھے تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اس سے متنفر ہو جاؤں، میں تو اورلینڈو کو نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی ہوں۔

روزلینڈ:- نہیں پیاری، میری خاطر اس سے نفرت نہ کرو۔

سلیا:- میں کیوں نفرت نہیں کروں؟ کیا وہ اس کا مستحق نہیں ہے

روزلینڈ:- نہیں، تم اس سے محبت کرو چونکہ میں اس سے محبت کرتی ہوں، دیکھو چچا آ رہے ہیں۔

سلیا:- آنکھیں نہ معلوم کیوں غضبناک ہیں۔

(ڈیوک فریڈرک اپنے امرا کے ساتھ داخل ہوتا ہے)

ڈیوک فریڈرک:- اب یہاں سے جانے کا سامان کرو، اور میرے دربار کو چھوڑ دو۔

روزلینڈ:- چچا، آپ یہ مجھ سے فرما رہے ہیں۔

کیوپڈ (cupid) عشق کا کور چشم دیوتا۔ یہ تیر پھینکتا رہتا ہے اور جس مرد یا عورت کو یہ تیر مجروح کرتا ہے وہ دام شوق میں گرفتار ہوتا ہے / ہو جاتی ہے۔

ڈیوک فریڈرک :- ہاں بھتیجی! اگر دس دن کے بعد میرے دربار کے بیس میل کے احاطے کے اندر پائی جاؤ گی تو تم کو سزائے موت دی جائے گی۔

روزلینڈ :- میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ مجھکو میرے قصور سے آگاہ کیجئے، میں نے حتی الامکان کوئی کام ایسا نہیں کیا جو آپ کی خفگی کا باعث ہو۔

ڈیوک فریڈرک :- دغا بازوں کی ایسی ہی چکنی چپڑی باتیں ہوتی ہیں، اگر انکی باتوں پر دھیان دیا جائے تو وہ بالکل معصوم ہیں، بس یہ کہنا کافی ہوگا کہ مجھ کو تم پر اعتبار نہیں ہے۔

روزلینڈ :- لیکن اس بے اعتباری کی وجہ سے میں غدار نہیں کہلا سکتی ہوں، آپ یہ فرمائیں کہ میری غداری کا خیال کیونکر پیدا ہو۔

ڈیوک فریڈرک :- تم اپنے باپ کی لڑکی ہو، بس یہی تمہاری غداری کا کافی ثبوت ہے۔

روزلینڈ :- جب آپ اس قلمرو کے مالک ہوئے اسوقت بھی میں اپنے باپ کی بیٹی تھی، جب آپ نے میرے باپ کو جلاوطن کیا اسوقت بھی میں وہی تھی، غداری کوئی موروثی چیز نہیں، اس کے علاوہ میرے والد کبھی بھی غدار یا دغا باز نہیں تھے۔

سیلیا :- اباجان، میری بات تو سنئے۔

ڈیوک فریڈرک :- سیلیا! میں نے اسکو تمہاری خاطر روک لیا تھا، نہیں تو وہ بھی اپنے باپ کے ساتھ ماری ماری پھرتی۔

سیلیا :- اسوقت میں نے آپ سے اس بات کی التجا نہیں کی تھی، آپ نے جو کچھ کیا اپنی مرضی سے کیا، لیکن اب میں اسکو جانتی ہوں اور اسکی قدر کرتی ہوں، اگر وہ غدار ہے تو میں بھی غدار ہوں ساتھ سونا، ساتھ اٹھنا، ساتھ پڑھنا، ساتھ کھیلنا، ساتھ کھانا، ہم لوگ جہاں بھی جاتے تھے جونو[1] (Juno) کے بطوں کی طرح ساتھ جاتے تھے

ڈیوک فریڈرک :- وہ بڑی شاطر ہے، اسکی خاموشی، اس کا صبر، یہ سب چیزیں لوگوں پر جادو کا اثر کرتی ہیں اور لوگ اسکو رحم کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، تم احمق ہو، اسکی وجہ سے تمہاری قدر نہیں ہوتی ہے۔ اس کے چلے جانے کے بعد تمہاری قدر و منزلت بڑھے گی، اس لئے اب زبان نہ کھولو، میرا حکم جب صادر ہو گیا وہ ٹل نہیں سکتا، وہ جلاوطن کی جائے گی۔

سیلیا :- تو پھر مجھکو بھی جلاوطن کر دیجئے، میں اسکے بغیر نہیں رہ سکتی۔

ڈیوک فریڈرک :- تم احمق ہو بھتیجی، تم اپنا سامان کرو، اگر مقررہ وقت کے بعد تم یہاں پائی جاؤ گی تو پھر تم ہو اور موت۔

(ڈیوک فریڈرک اور امرا چلے جاتے ہیں)

سیلیا :- میری غریب روزلینڈ، تم کہاں جاؤ گی، لیکن تم مجھ سے زیادہ غم نہ کرو۔

روزلینڈ :- مجھکو غم کرنے کی زیادہ وجہ ہے۔

سیلیا :- نہیں بہن، نہیں، غم نہ کرو، ابا نے مجھ کو بھی جلاوطن کر دیا ہے۔

روزلینڈ :- نہیں، یہ تو نہیں ہوا ہے۔

سیلیا :- نہیں ہوا ہے؟ تب تم کو مجھ سے محبت نہیں ہے، کیا ہم تم دو ہیں؟ کیا ہم لوگوں کو کوئی جدا کر سکتا ہے؟ میرے ابا دوسرا وارث تلاش کرلیں۔ اب ہم لوگ تدبیر سوچیں کہ کیونکر اور کہاں بھاگ کر چلے جائیں۔ تم ہرگز تنہا نہیں جا سکتی ہو۔ یہ خیال خام دل سے دور کرو

روزلینڈ :- نہ معلوم ہم لوگ کہاں جائیں گے؟

سیلیا :- ہم لوگ چچا کی تلاش میں آردن کے جنگل میں نکل چلیں گے۔

---

[1] جونو (Juno) یونانیوں کے اعظم ترین دیوتا جوپیٹر کی بیوی۔

روزلینڈ :۔ بہت سے مصائب کا سامنا کرنا پڑیگا' دنیا میں حسن کے چور زر کے چور سے زیادہ ہوتے ہیں۔

سیلیا :۔ میں کوئی معمولی لباس پہن لونگی اور چہرہ کو گیرو سے رنگ لونگی' تم بھی یوں کرنا اور تب ہم لوگ بلاخوف و خطر نکل جائیں گے۔

روزلینڈ :۔ اس سے زیادہ مناسب یہ ہوگا کہ چونکہ میں دراز قد ہوں اس لئے میں مردوں کا لباس پہن لونگی' میری کمر میں ایک بسولا ہوگا اور ہاتھ میں ایک برچھی۔

سیلیا :۔ اس بھیس میں تمہارا نام کیا ہوگا۔

روزلینڈ :۔ میرا نام گنی میڈ[1] (Gany mede) ہوگا۔

سیلیا :۔ اور میرا ایلینا[2] (Aliena) ہوگا۔

روزلینڈ :۔ بہن! کیا ہی مناسب ہو اگر اس مسخرہ کو بھی ہم لوگ ساتھ لے لیں' وہ سفر کی کلفتوں کو ہلکا کریگا۔

سیلیا :۔ وہ میرے ساتھ دنیا کے اس گوشہ سے اس گوشہ تک جائے گا۔ یہ کام میرے ذمہ چھوڑو' ہم لوگ جواہرات اور روپیہ ساتھ لے لیں' اور اب ہم لوگ گویا جلاوطن نہیں ہو رہے ہیں بلکہ آزادی کی زندگی بسر کرنے جا رہے ہیں۔

جزو دوم

پہلا منظر

آرڈن کا جنگل

ڈیوک سینیر (پرانا ڈیوک) :۔ ایمینس Amiens اور دوسرے امرا جنگل کے رہنے والوں کے لباس میں داخل ہوتے ہیں۔

ڈیوک سینیر :۔ دوستو اور ہمدمو کیا جنگل کی زندگی جس کے ہم لوگ عادی ہو چکے ہیں دربار کی زندگی سے بہتر نہیں' دربار میں ظاہری بھڑک اور طمطراق تو ضرور ہے مگر وہ امن اور شانتی سے کوسوں دور ہے' یہاں ہم لوگوں کو تبدیل موسم کا پتہ چلتا رہتا ہے' اور جب سرما کی ہوائیں چلتی ہیں تو گو میں کانپ جاتا ہوں میں مسکرا کر کہتا ہوں' یہ چاپلوس نہیں ہیں' یہ وہ مشیر ہیں جو مجھ کو میری اصلیت سے آگاہ کرتے ہیں' مصیبت کی تلخی میں بھی شیرینی ہے' اسکی مثال اس دریائی جانور[3] کی ہے جو ظاہرا بدصورت معلوم ہوتا ہے مگر اس کے کاسہ سر میں جواہر پنہاں رہتے ہیں' اس طرح ہم لوگوں کی زندگی گو شہروں کے ہنگاموں سے بہت دور ہے مگر عبرت بیں نگاہوں کے لئے درختوں' چشموں اور پتھروں میں معرفت کا ایک ذخیرہ ہے۔

ایمینس :۔ یاس نا امیدی میں بھی ایسی فلسفیانہ نگاہ ڈالنا حضور ہی کا کام ہے۔

ڈیوک سینیر :۔ شکار کو چلوگے؟ لیکن مجھ کو ان غزالوں پر رحم بھی آتا ہے کہ وہ بیچارے اپنی ہی قلمرو میں اس طرح زخمی کئے جاتے ہیں۔

پہلا امیر :۔ ژاک اس پر بہت افسوس کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آپ اپنے بھائی سے بھی بڑھ کر غاصب ہیں' آج میں اور امینس جو نکل کھڑا ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک درخت کے نیچے ژاک بیٹھا ہوا ہے' پاس ہی ایک چشمہ بھی ہے اور چشمہ کے کنارے ایک

۱؎ گنی میڈ (Gany mede) ایک حسین لڑکا جو یونانیوں کے دیوتا جیوپیٹر کے دربار میں ساقی گری کا کام انجام دیتا تھا۔

۲؎ ایلینا (Aliena) اس کے لغوی معنی بدیسی اور غیر ملکی کے ہیں۔

۳؎ شیکسپیئر نے جو لفظ استعمال کیا ہے وہ toad ہے۔ یہ مینڈک کی ایک قسم ہے۔ اس زمانہ کے لوگوں کا یہ عام واہمہ تھا کہ اس کے سر میں جواہر پنہاں رہتے ہیں۔

ہرن جو شکاری کے تیر سے زخمی ہو گیا تھا کھڑا ہوا ہے اسکی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور آنسو چشمہ میں گر رہے ہیں۔

ڈیوک سینئر:- تو ژاک نے اسپر کچھ فلسفہ ریزی نہیں کی۔

پہلا امیر:- ہاں ہزاروں استعاروں سے کام لیا۔ پہلے تو یہ کہا کہ وہ دیکھئے آنسو چشمہ میں گر رہے ہیں۔ دنیا کا یہی رنگ ہے جنکو کسی چیز کی ضرورت نہیں انہیں کو وہ چیز ملتی رہتی ہے۔ اس کے بعد اس نے کہا "یہ صحیح ہے کہ مصیبت میں دوست بھی ساتھ نہیں دیتے" اس کے بعد اس نے کہا کہ ہم لوگ سب ظالم اور غاصب ہیں اسلئے کہ ان جانوروں کو مارتے ہیں۔

ڈیوک سینیر:- کیا تم نے اس کو اسی خیال آرائی میں محو چھوڑا۔

دوسرا امیر:- حضور عالی وہ ہرن کی حالت پر تنقید و تفسیر کر رہا تھا

دوسرا منظر

محل میں ایک کمرہ

(ڈیوک فریڈرک امرا اور خدمتگار داخل ہوتے ہیں)

ڈیوک فریڈرک:- کیا یہ ممکن ہے کہ کسی نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا یہ ممکن نہیں۔ دربار کے بعض لوگ بھی اس سازش میں شریک ہیں۔

پہلا امیر:- میں نے تو نہیں سنا کہ کسی نے بھی اسکو دیکھا' اسکی سہیلیوں نے اسکو سوتی ہوئی دیکھا تھا اور صبح سویرے دیکھا تو بستر خالی ہے۔

دوسرا امیر:- حضور عالی! وہ مسخرا بھی غائب ہے' شہزادی کی دایہ ہسپیریا (Hisperia) کا بیان ہے کہ اس نے اچانک سن لیا تھا کہ آپکی لڑکی اور بھتیجی اس کشتی باز کی تعریفیں کر رہی تھیں جس نے چارلس کو شکست دی تھی' اسکو یقین ہے کہ وہ نوجوان یقیناً ان لوگوں کے ساتھ ہے۔

ڈیوک فریڈرک:- اس کے بھائی کو بلاؤ۔ یہ کام فوراً کرو۔ ان فرار شدہ لوگوں کو واپس لانے کی ہر ممکن کوشش کی جائیگی

تیسرا منظر

اولیور کے مکان کے سامنے

اورلینڈو:- کون ہے؟

ایڈم:- کون؟ میرے چھوٹے مالک؟ میرے اچھے آقا! سر اولینڈ کی یادگار؟ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ آپ کیوں اوصاف حمیدہ کے مالک ہیں؟ آپ نے ڈیوک کے پہلوان کو کیوں شکست دی؟ بعض لوگوں کے اوصاف انکی تباہی کا باعث ہوتے ہیں۔ آہ یہ کیسی دنیا ہے کہ بعضوں کے اوصاف ان کے دشمن بن جاتے ہیں

اورلینڈو:- آخر واقعہ کیا ہے؟

ایڈم:- اے وائے نصیب۔ اس گھر کے اندر مت آیئے یہاں آپکی جان کا دشمن رہتا ہے۔ آپکے بھائی نے آپکی تعریفیں سنی ہیں اور اس کا ارادہ ہے کہ آج رات آپکی خوابگاہ میں آگ لگا دے اور آپ کو بھی جلا دے۔ اگر یہ تدبیر کامیاب نہیں ہوئی تو پھر دوسرے ذریعے سے آپکی ہلاکت کا سامان کریگا۔ یہ گھر ایک مقتل ہے اس سے دور ہی رہنا بہتر ہے۔

اورلینڈو:- ایڈم' تو آخر میں کہاں جاؤں۔

ایڈم:- جہاں کہیں بھی جایئے' لیکن یہاں مت آیئے۔

اورلینڈو:- کیا میں باہر جا کر بھیک مانگوں؟ یا راہزنی کر کے روزی کماؤں؟ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ خونی بھائی کے مظالم سہوں

ایڈم:- نہیں ایسا نہ کیجئے۔ میرے پاس پانچ سو کراؤن ہیں جو میں نے بڑھاپے کے لئے بچا کر رکھے ہیں اور وہ جو کوؤں اور چڑیوں کو روزی مہیا کرتا ہے میرا سامان کریگا' یہ روپیہ لیجئے اور میں آپ کے ساتھ آؤنگا

خادم بن کر جیونگا، میں بوڑھا ہوں لیکن مضبوط ہوں ایام شباب میں مسکرات کو میں نے چھوا تک نہیں اور میری جوانی بالکل بیداغ گزری ہے۔

اورلنیڈو:۔ تو ایک پرانے زمانہ کی یادگار ہے جب لوگ فرض شناس تھے اور بے غرضی سے کام کرتے تھے، تو اس زمانہ کا نہیں معلوم ہوتا ہے جب لوگ اپنی خود غرضی کی وجہ سے صرف ترقی اور اعلیٰ مناصب کے کوشاں رہتے ہیں۔

ایڈم:۔ میرے آقا، میں اپنی آخری سانس تک آپکے ساتھ رہکر اپنی وفاشعاری کا ثبوت دونگا، سترہ برس کے سن سے لے کر اسّی کے سن تک یہاں رہا، مگر اب یہاں نہیں رہوں گا، آپکے ساتھ رہ کر نمک خواری کا حق ادا کرونگا۔

چوتھا منظر

آرڈن کا جنگل

{روزلینڈ ایک لڑکے کے لباس میں اور سیلیا ایک چرواہن کے لباس میں اور ٹچ اسٹون داخل ہوتے ہیں۔}

روزلینڈ:۔ یا خدا میں پریشان ہو گئی۔

ٹچ اسٹون:۔ اگر میرے پیر نہ تھکیں تو مجھے پریشانی کی پروا بھی نہ ہو

روزلینڈ:۔ جی چاہتا ہے کہ عورت کی طرح چلاؤں، مگر اپنے مردانہ لباس کی لاج رکھنی ہے۔

سیلیا:۔ میں اب ایک قدم آگے نہیں چل سکتی۔

روزلینڈ:۔ ہم لوگ آرڈن کے جنگل میں پہونچ گئے۔

ٹچ اسٹون:۔ اچھا آرڈن میں پہونچ گیا، میں بھی کیا احمق ہوں کہ گھر کے راحت و آرام کو چھوڑ کر یہاں چلا آیا۔ لیکن مسافروں کو صبر سے کام لینا چاہیے۔

روزلینڈ:۔ ہاں صبر کرو۔ دیکھو کون آرہا ہے، ایک نوجوان پیر فرتوت سے گرم گفتار ہے۔

{کورِن (Corin) اور سِلویس (Silvius) داخل ہوتے ہیں۔}

کورِن:۔ اگر یہ حال رہا تو وہ تم کو اور بھی ذلیل سمجھے گی۔

سلویس:۔ کورن۔ کاش تو میری محبت کی گرمی محسوس کر سکتا

کورن:۔ کچھ قیاس کر سکتا ہوں اس لئے کہ میں بھی عشق کر چکا ہوں

سلویس:۔ نہیں کورن، بڑھاپے کی وجہ سے تو قیاس نہیں کر سکتا ہے، گو میں مانتا ہوں کہ ایام شباب میں تو نے اپنی معشوقہ کی یاد میں رات اشکباری اور گرم فغانی میں گزاری ہو، لیکن ذرا یہ تو بتا کہ عشق میں آکر کتنی حماقتیں سرزد ہوئیں۔

کورن:۔ ہزاروں، لیکن میں بھول گیا ہوں۔

سلویس:۔ تب کیا عشق کا شکار رہا، ایک ایک حماقت یاد رہنی چاہیئے۔ اگر تجھ کو یاد نہیں ہے تو تو نے عشق نہیں کیا ہے، اگر محبوبہ کی تعریف میں اتنا بھی رطب اللسان نہیں ہو کہ سننے والا تھک نہ جائے تو پھر عشق کیا کیا، یا اگر تو یک بہ یک لوگوں کی جماعت سے علیحدہ نہ ہو گیا ہو تو پھر عشق کیا ہوا، فی بی (Phebe) فی بی فی بی۔

(چلا جاتا ہے)

روزلینڈ:۔ خدایا! اس چرواہے کا جذبۂ محبت میرے جذبۂ الفت سے بہت مشابہ ہے۔

ٹچ اسٹون:۔ میرا بھی یہی قصہ ہے۔

سیلیا:۔ بھوک کے مارے تو جان جا رہی ہے، کاش کوئی زر کے عوض کچھ کھانا دیتا۔

روزلینڈ:۔ چرواہے، میں تجھ سے التجا کرتی ہوں کہ کسی طرح بھی ہو خواہ زر کے بدلے یا محبت کی بنا پر ہم لوگوں کو اس جنگل میں کچھ

کھانے کا سامان مہیا کردو کوئی ایسی جگہ لے چلو جہاں آرام کر سکیں اور کھا سکیں، میرے ساتھ ایک نوخیز لڑکی ہے جو سفر کے تکان سے چور ہے اور بیہوشی کی سرحد پر ہے۔

کورن:- جناب عالی! مجھ کو اسکی حالت پر رحم آتا ہے، کاش میرے پاس اتنا سامان ہوتا کہ اسکی مصیبت میں کام آسکتا، لیکن میں خود دوسرے آدمی کا چرواہا ہوں، میرا آقا درشت مزاج ہے اور سخاوت سے کوسوں دور رہتا ہے، اسکی جھونپڑی اسکے گلے اور اسکی چراگاہیں بکنے والی ہیں۔

روزلینڈ:- تو پھر کون شخص ان چیزوں کو خرید رہا ہے۔

کورن:- وہی نوجوان جس کو ابھی آپ نے دیکھا۔

روزلینڈ:- اگر ایمانداری سے یہ کام ہو سکے تو وہ سب چیزیں ہم لوگوں کے لئے خرید لو اور روپیہ ہم سے لے لو۔

سلیا:- اور ہم لوگ تمہارے مشاہرہ میں اضافہ کر دیں گے، مجھ کو یہ جگہ پسند ہے۔

کورن:- میرے ساتھ آیئے، اگر دیکھنے کے بعد آپ لوگ ان چیزوں کو پسند کریں گے تو میں آپ کا غلام ہو جاؤں گا۔ اور آپ کے روپیہ سے ان چیزوں کو خرید لیا جائے گا۔

پانچواں منظر

جنگل کا دوسرا حصہ

(امینس اور ژاک داخل ہوتے ہیں)

امینس:- اس سر سبز درخت کے نیچے جو شخص میرے ساتھ آرام لینا اور طیور کے ساتھ نغمہ سنجی کرنا چاہتا ہو وہ یہاں آئے یہاں وہ دشمن کے خوف سے محفوظ رہے گا۔ سوائے سرما اور خراب موسم کے اور کوئی دوسری چیز باعث تکلیف نہ ہوگی

ژاک:- کچھ اور۔

امینس:- موسیو ژاک، تم ان باتوں سے افسردہ دل ہو جاتے ہو

ژاک:- کچھ اور سامعہ نوازی کرو۔

امینس:- اچھا ایسا ہی ہوگا، مگر ڈیوک آج دن بھر تمہاری تلاش میں ہے، اور وہ یہاں پانی پینے کی غرض سے آئے گا۔

ژاک:- اور میں دن بھر اس سے دور رہنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

امینس:- جو شخص حوصلوں سے دور رہتا ہے اور آفتاب کے نیچے صبر و قناعت کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ وہ یہاں چلا آئے، یہاں سرما اور خراب موسم کے سوا کوئی اور دشمن نہیں ملے گا۔

ژاک:- اگر کوئی شخص ایسا خر دماغ ہو کہ اپنی دولت، آرام اور راحت کو خیرباد کہنا چاہتا ہو تو وہ یہاں چلا آئے اس کے ایسے احمق یہاں بہت ملیں گے۔

چھٹا منظر

(اورلنیڈو اور ایڈم داخل ہوتے ہیں)

ایڈم:- پیارے آقا! اب میں چل نہیں سکتا، اب یہیں میری قبر ہوگی۔

اورلنیڈو:- تھوڑی دیر صبر و سکون سے کام لو میں نکلتا ہوں، یا تو خود جانوروں کا شکار بن جاؤنگا یا تمہارے لئے کھانے کی چیز مہیا کر دونگا، میں فوراً واپس آتا ہوں۔

براہ مہربانی جواب طلب امور کے لئے جوابی خط لکھیں۔

"منیجر"

ٹارزن

یعنی

عجیب انسان کی سب سے آخری قسط

(از جناب محمد احسن صاحب بھلوہی پوری۔ کھگول۔ پٹنہ)

باب ۵۴

ساحل پر

دوسرے دن علی الصباح ٹارزن جین کو ساتھ لے کر اس کوٹھری کی طرف روانہ ہوئے جسے سمندر کے کنارے ان کے والد نے بنایا تھا، اور جہاں لڑکپن میں وہ رہ چکے تھے۔ چار وزیری حبشی کلیٹن کی لاش اٹھائے ہوئے ان کے ساتھ چلے۔ ٹارزن کی رائے تھی کہ کلیٹن کو اُسی جگہ سپرد خاک کیا جائے جہاں انکے والد لارڈ گریسٹوک آرام کر رہے ہیں۔ جین پورٹر نے اس رائے پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ ایسی معقول تجویز کے لئے اُس نے اپنے دل ہی دل میں ٹارزن کی دانش اور نیک طینتی کی تعریف کی۔ اُسے تعجب ہوا کہ جنگل میں پیدا ہونے اور وہیں جانوروں کے درمیان پرورش پانے کے باوجود بھی ان کا دل اتنا نرم کس طرح ہوا۔ ایسی نرمی اور رحمدلی تو صرف متمدن دنیا میں پیدا ہونے اور پرورش پانے والے انسانوں ہی میں پائی جاتی ہے۔

بلیچ وڈن میں سے تقریباً تین میل راستہ ان لوگوں نے طے کیا ہوگا کہ آگے آگے چلنے والے وزیری ناگہاں رُک گئے اور اُنہوں نے انگلیوں سے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ اُدھر سے سمندر کے کنارے کنارے ایک بڈھا آدمی چلا آرہا تھا، جس کے سر ریشمی ہیٹ تھی، آنکھیں زمین پر جھکی ہوئی تھیں اور اُس ہاتھ کوٹ کی جیب میں پڑے ہوئے تھے۔ وہ بظاہر کسی گہر فکر میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

اُس پر نظر پڑتے ہی تعجب اور مسرّت کی ایک چیخ مار جین پورٹر آگے بڑھی۔ آواز سُنکر اُس معمر آدمی نے بھی سر اُٹھ اور جب اس کی نگاہ جین پورٹر پر پڑی تو اُس نے بھی خوش ہو اُسے چھاتی سے لگا لیا۔ بیچارے پروفیسر پورٹر کی آنکھوں آنسو کے قطرے ٹپکنے لگے۔ اُنہیں امید نہ تھی کہ ان کی لڑکی پھ اُن سے ملے گی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب اُنہوں نے ٹارزن کو پہچانا تو ان کے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ لوگوں نے اچھی طرح یقین دلایا تھا کہ وہ مر گئے۔ اب اُنہیں صحیح و سالم سامنے کھڑ ہوا دیکھ کر اپنی آنکھوں پر پروفیسر پورٹر کو یقین ہی نہیں ہو تھا۔ کلیٹن کی موت کا حال سُنکر اُنہیں بہت رنج ہوا۔ اُنہو کہا کہ "میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ مسٹر تھیورن نے تو ہم لوگو سے کہا کہ اُنہیں مرے ہوئے بہت دن ہوگئے!"

ٹارزن نے پوچھا "کیا تھیورن آپکے ساتھ ہے؟"

پروفیسر نے کہا "ہاں، چند روز ہوئے کہ وہ ہم سے آ

اور وہی ہمیں آپ کی کوٹھری میں لے گئے۔ ہم آپکی کوٹھری
یچھ ہی شمال کی طرف ٹھیرے ہوئے تھے۔ مسٹر تھیورن آپ
ں کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔"

ٹارزن نے کہا "ضرور، اور ساتھ ہی اُنہیں تعجب بھی ہوگا۔"

تھوڑی دیر کے بعد یہ لوگ اُس چھوٹے سے میدان میں
جس میں ٹارزن کی کوٹھری تھی۔ متعدد آدمی ادھر اُدھر
رہے تھے لیکن سب سے پہلے جس آدمی سے ٹارزن
قات ہوئی وہ ڈی۔ آرنٹ تھے۔

ٹارزن نے چلّا کر کہا "اوہ پال! یہ تم ہو یا میری آنکھوں
وکا ہو رہا ہے! تم یہاں کہاں؟"

ڈی۔ آرنٹ سے باتیں کرنے سے پتہ لگا کہ ان کا جہاز
ے ہی کنارے گشت لگاتا ہوا جنوب کی طرف جا رہا تھا،
اس جنگل کے پاس پہنچا تو ڈی آرنٹ اور ان کے ساتھی افسروں
ے ہوئی کہ وہاں ایک دن کے لئے اُتر کر اُس جنگل اور اُس
ی کو دیکھ لینا چاہیے جس میں وہ پہلے آئے تھے، اور جہاں
واقعات میں اُنہیں حصّہ لینا پڑا تھا۔ اُترنے کے بعد لارڈ ریجرڈ
ن کے ساتھیوں سے ان لوگوں کی ملاقات ہوئی اور اس کے
ے طے پایا کہ دو روز وہاں ٹھیر کر سب لوگ جہاز پر چلے چلیں اور
ہذب دنیا کی طرف روانہ ہو جائیں۔

ہیزل اسٹرانگ، اس کی ماں، اسمرلڈ اور مسٹر سموئیل
بنڈر بھی جین پورٹر کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور دیر تک
کے گذشتہ حالات دریافت کرتے رہے۔ سب کا خیال تھا کہ
رزن مدد نہ کرتے تو جین پورٹر کا زندہ آفت سے بچ نکلنا ناممکن
ن لوگوں نے ٹارزن کی اتنی تعریف کی کہ اُنہیں آخر وہاں سے ہٹ جانا پڑا۔

سب ہی لوگوں کو وزیریوں کو دیکھ کر تعجب ہوا۔ اور سب ہی نے
تحفہ کے طور پر کچھ نہ کچھ ان کو دیا۔ بیچاروں کو جب معلوم ہوا کہ ان کا
سردار اب ان کا ساتھ چھوڑ کر چلا جائے گا تو سب ہی افسوس
کرنے لگے اور غمگین ہو گئے۔

اب تک لارڈ ریجرڈ اور مسٹر تھیورن سے ان لوگوں کی
ملاقات نہ ہوئی تھی۔ وہ دونوں سویرے ہی سے شکار کی تلاش
میں گئے ہوئے تھے اور اس وقت تک واپس نہ آئے تھے۔

جین پورٹر نے ٹارزن سے کہا "وہ آدمی جس کا نام تم
روکف بتا رہے ہو، تمہیں دیکھ کر بہت متعجب ہوگا۔"

ٹارزن نے سنجیدگی سے کہا "اُس کا تعجب زیادہ دیر نہ رہنے
پائے گا۔" ان کے خشک لہجہ کو سُن کر جین پورٹر نے سر اُٹھا کر
ان کے مُنہ کی طرف دیکھا۔ وہاں جو آثار اُسے نظر آئے ان سے وہ
گھبرا اُٹھی۔ اُسے شُبہ ہوا کہ وہ اپنے دل سے کوئی ایسا کام نہ کر
بیٹھیں جس سے پیچھے متاسف ہونا پڑے۔ اُس نے کہا "میرے
ٹارزن! جنگل میں انصاف کرنے کے لئے نہ تو کوئی عدالت ہوتی
ہے۔ اور نہ کوئی منصف! وہاں فیصلہ ہوتا ہے تو صرف قوت سے
اگر تم مہذب آدمیوں کے پاس نہ پہنچ گئے ہوتے، متمدن دنیا میں
نہ جانے والے ہوتے تو تم جس طرح سے بھی چاہتے اُسے سزا
دے سکتے تھے۔ اب جب کہ تم اس کا فیصلہ دوسرے طریقے
سے کرا سکتے اور اُسے مناسب سزا دلا سکتے ہو تو اس وقت
اس کی جان لینا ایک طرح سے ظلم کرنا کہا جائے گا۔ قانون
اگر تمہیں گرفتار کرنا چاہے گا تو اس کی بات تمہارے دوستوں
کو بھی ماننی پڑے گی۔ اگر تم گرفتار ہونے سے انکار کرو گے تو
بات بڑھے گی، اور ہمیں رنج اور افسوس ہوگا! تمہاری وجہ سے
ہم لوگوں کو فکر اور تردد میں مبتلا ہونا پڑے گا۔ میں پھر تمہیں اپنے

سے جدا نہیں کر سکتی میرے ٹارزن! وہ شیطان اس لائق نہیں ہے کہ اُس کی وجہ سے ہم اپنے آرام اور چین کو تباہ و برباد کر دیں۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ وہ آئے گا تو تم اُسے صرف کپتان ڈفرن کے سپرد کر دوگے اور اُس کے ساتھ کچھ نہ کروگے!"

ٹارزن نے دیکھا کہ جین پورٹر کا کہنا مناسب ہے، اُنہوں نے اس کی مرضی کے مطابق وعدہ کر دیا۔ نصف گھنٹہ بعد روکف اور لارڈ رچرڈ جنگل سے باہر نکلے۔ پہلے لارڈ رچرڈ ہی کی نظر ان نئی نزیریوں پر پڑی جو جہاز کے ملاحوں سے باتیں کر رہے تھے، اس کے بعد اُنہوں نے ایک بلند و بالا قد آور آدمی کو لفٹننٹ ڈی۔ آرنٹ اور کپتان ڈفرن سے باتیں کرتے دیکھا۔ وہ سمجھ گئے کہ چند نئے آدمی ان کی قیامگاہ پر آئے ہیں۔ اُنہوں نے روکف سے کہا "وہ کون ہے؟ پہچانتے ہو؟" روکف نے مڑ کر اُدھر دیکھا جدھر لارڈ رچرڈ نے اشارہ کیا تھا۔ ٹارزن پر نظر پڑتے ہی اور اُنہیں اپنی طرف دیکھتا ہوا دیکھ کر اُس کے پاؤں لڑکھڑائے اور چہرہ سفید ہو گیا۔

اُس کے مُنہ سے ہلکی سی چیخ کی آواز نکلی۔ اس سے پہلے کہ لارڈ رچرڈ سمجھ سکیں کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے اُس نے اپنی بندوق کاندھے سے اُتاری اور ٹارزن کی طرف نال کر کے نشانہ لگا کر گھوڑا دبا دیا۔ رچرڈ بالکل پاس ہی تھے، بندوق کا گھوڑا دبنے کے ایک لمحہ پہلے اُنہوں نے ہاتھ کا جھٹکا اس کے نال پر دیا اور وہ گولی جو ٹارزن کی چھاتی میں گھسنے کے لئے چھوڑی گئی تھی سنسناتی ہوئی ان کے سر کے اوپر سے نکل گئی۔

اس سے پہلے کہ شیطان روسی پھر گولی چلا سکے ٹارزن اس کے سر پر پہنچ گئے اور جھٹکا دے کر اُنہوں نے بندوق اُس کے ہاتھ سے چھین لی۔ کپتان ڈفرن، لفٹننٹ ڈی۔ آرنٹ اور جہاز کے دس بارہ ملاح گولی چلنے کی آواز سُنتے ہی دوڑ پڑے نے روکف کو خاموشی سے ان کے سپرد کر دیا۔ اُنہوں نے ج[illegible] کپتان کو پہلے ہی سب بات بتا دی تھی۔ اس کے حکم سے کو ہتھکڑی اور بیڑی پہنا کر جہاز پر پہنچا دیا گیا۔

قیدی کے لے جائے جانے سے پہلے افسر سے اجاز[illegible] ٹارزن نے اُس کی تلاشی لی۔ اُنہیں اُس کے کوٹ کے ا[illegible] میں وہ کاغذات مل گئے جن کو اُس نے جہاز پر اُنکی جیب سے چُرا[illegible]

گولی کی آواز سُنکر جین پورٹر اور نزدیک کے چند[illegible] بھی موقع واردات پر آگئے تھے، روکف کے گرفتار ہونے جین پورٹر نے لارڈ رچرڈ سے ملاقات کی۔ تھوڑی دیر کے [illegible] کی تلاشی لیکر ٹارزن بھی وہاں آگئے۔ جین پورٹر نے ٹار[illegible] طرف اشارہ کر کے کہا :-

"یہ جان کلیٹن لارڈ گرسٹوک ہیں، لارڈ رچ[illegible]

لارڈ رچرڈ کو یہ سُنکر بڑی حیرت ہوئی۔ اُنہیں یق[illegible] نہیں ہو رہا تھا۔ آخر جب ڈی۔ آرنٹ، جین پورٹر اور خو[illegible] نے سب حال مفصل سُنایا تب اُنہیں یقین ہوا۔ اُس وقت [illegible] ٹارزن کی بڑی تعریف کی اور جین پورٹر کو بھی مبارکباد د[illegible]

غروب آفتاب کے قریب ان لوگوں نے کلیٹن کی[illegible] وہیں سپرد خاک کیا جہاں ان کے چچا اور چچی، لارڈ اور لی[illegible] ابدی نیند میں آرام سے سو رہے تھے۔ ٹارزن کے کہنے [illegible] بندوقوں کی تین سلامی دی گئی اور سر جھکائے ہو[illegible] وہاں سے واپس ہوئے۔

اس کے بعد کپتان ڈفرن سے ملاقات کر کے ٹار[illegible] اُنہیں جہاز دو روز اور روکنے کے لئے کہا اور وجہ یہ بتائی[illegible] جنگل کے اندر دو میل دُور سے اپنا کچھ سامان جہاز پر لا[illegible]

کپتان ڈفرن نے خوشی سے اس درخواست کو منظور کیا۔

دوسرے روز دوپہر کے وقت ٹارزن اور ان کے وزیری حبشی اپنا سامان لیکر واپس ہوئے۔ لوگوں نے جب خالص سونے کی اینٹیں دیکھیں تو وہ طرح طرح کے سوال ٹارزن سے ان کے متعلق کرنے لگے۔ وہ صرف مسکراتے جاتے تھے۔ انہوں نے جواب دینے سے بالکل انکار کیا اور یہ بھی نہ بتایا کہ وہ کہاں سے لائی گئی ہیں۔ انہوں نے صرف اتنا کہا "اسی قسم کی بیشمار اور میں پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ یہ جب خرچ ہو جائیں گی تو پھر انہیں لینے کے لئے آؤنگا۔"

دوسرے دن ٹارزن ان اینٹوں کو بھی جو باقی رہ گئی تھیں لے آئے، اور انہیں گن کر ترتیب کے ساتھ رکھ دیا۔ کپتان ڈفرن نے کہا "بھائی اتنا بڑا خزانہ رکھتے ہوئے میرا دل ڈرتا ہے! میں نے اکثر سنا ہے کہ جہاز پر بلوہ ہو گیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ جہاز کے ملاح ہمارے گلوں پر چھری پھیر دیں اور یہ ساری دولت خود لے لیں۔"

دوسرے روز صبح کو جب کہ سب لوگ روانہ ہونے کی تیاری کر رہے تھے، ٹارزن نے جین پورٹر سے کہا "جین! لوگوں کا عموماً یہ خیال ہوتا ہے کہ جانوروں کا دل انسانیت سے ناآشنا ہوتا ہے۔ لیکن میرا دل اس سے بالکل مختلف ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہماری شادی اسی کوٹھری میں ہو جہاں میں نے بچپن میں پرورش پائی ہے۔ جس کے نزدیک میرے والدین مدفون ہیں۔ اور جس کی چاروں طرف کے گنجان جنگل میں اپنی عمر کا بیشتر حصہ میں بسر کر چکا ہوں۔"

جین پورٹر نے خوش ہو کر کہا "میں بھی یہی چاہتی ہوں، میرے ٹارزن! اور کوئی جگہ اپنی شادی کے لئے مجھے اتنی پسند نہ آئیگی جتنا یہ جنگل، جہاں میرے جنگل کے مطلق العنان بادشاہ نے کھیل کود کر اپنی عمر کا بیشتر حصہ بسر کیا ہے۔"

دوسرے لوگوں سے جب اس کے متعلق رائے لی گئی تو انہوں نے بھی اس تجویز کو پسند کیا۔ سب لوگ ٹارزن کی کوٹھڑی اور اس کے دروازے کے پاس جمع ہوئے اور پروفیسر پورٹر پادری کی جگہ شادی کی رسم کی انجام دہی کے لئے تیار ہو گئے۔ اس وقت لارڈ رچرڈ نے ایک نئی تجویز لوگوں کے سامنے پیش کی۔ انہوں نے ہنس کر کہا "اگر مس. سٹرانگ منظور کریں تو میں اس سعید موقع کے حسن و خوبی کو اور دوبالا کردوں۔" یہ کہہ کر انہوں نے ہیزل اسٹرانگ کی طرف دیکھا۔

ہیزل نے مسکرا کر سر جھکا لیا۔

دوسرے روز جہاز لنگر اٹھا کر روانہ ہوا۔ روانہ ہونے کے وقت جہاز کے عرشہ پر ایک دراز قد متناسب الاعضاء نوجوان اور ایک ماہرو کم عمر عورت کھڑی ہوئی سمندر کے ساحل کی طرف دیکھ رہی تھی، اور ساحل پر بیسیوں وزیری حبشی ناچتے گاتے، اور اچھلتے کودتے اپنے نیزے ہلاتے ہوئے سردار کو رخصت کر رہے تھے۔

نوجوان نے کہا "میری جین! جس جنگل میں میں پیدا ہوا اور جہاں پرورش و پرداخت کے بعد بڑا ہوا، اس سے جدا ہوتے ہوئے مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔ صرف اطمینان ہے تو اس وجہ سے کہ میں جس دنیا میں جا رہا ہوں، وہاں مجھے ایک نئی دلچسپی، بیحد مسرت، اور لاانتہا آرام ملے گا۔ کیا یہ کسی بھی انسان کے لئے کم ہے؟" اتنا کہہ کر سر جھکا کر ٹارزن نے جین پورٹر کے نازک اور دلکش لبوں کا آہستہ سے بوسہ لے لیا۔

ختم شد

تقریظ و انتقاد:-

بہار نمبر سنہ ۴۰ء پر ایک نظر

از جناب عبدالباقی صاحب بی۔ اے جامعی مفصل پروپگنڈا آفیسر صوبہ بہار

ندیم کا سالنامہ ملا۔ آپ نے سالنامہ کیا پیش کیا ہے مستقل تصنیف پیش کردی ہے۔ اور رفیق دارالمصنفین سے اسی کی توقع بھی تھی۔ بنوٹ نہیں خدا گواہ ہے دل سے مبارکباد نکل رہی ہے اور یہ اس لئے نہیں کہ آپ نے نا چیز کے دونوں مضامین چھاپ کر ندیم کی شان اکملیت گھٹا دی ہے بلکہ واقعی آپ کی تعمیری اور تخلیقی صناعی کی داد دینا ہی پڑتی ہے۔ ندیم کا حرف حرف بہاری وقار اور توازن کا ترجمان ہے۔ لیکن یہ آپ نے "ممتاز ترین" وغیرہ لکھ کر مبالغہ کیوں کیا۔ واقعیت کو واقعیت ہی رہنے دیجئے! احسان ہوگا

حضرت دیوجانس بہاری کا مضمون بہت پسند آیا۔ مضمون کا مقصد تعمیری ہے۔ اس مضمون کا جواب تو ہو ہی نہیں سکتا ہے لیکن اس قسم کی بحثیں ہمارے علمی و ادبی ارتقا کے اس دور میں نتیجہ خیز ہیں اور مفید بھی۔

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ کا ہمیں ممنون ہونا چاہئے کہ علامہ شبلی کے کردار پر جو نقاب پڑی ہوئی تھی اسے انہوں نے سرکایا ہے اور حق یہ ہے کہ یہ انہی کا حق تھا۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے بعض اشارات کر دئے ہیں۔ کیا وہ ندوی نوجوان جو اس انقلابی دور کی صف اول میں ہیں۔ ان اشارات سے کچھ اشارہ پائیں گے۔ اسلامی دنیا کے مجہولانہ اور دقیانوسی افکار کے بدلنے میں علامہ شبلی کا کیا حصہ ہے۔ یہ کسی علمی مطالعہ کا بہترین موضوع ہو سکتا ہے!۔

"بہار کی بہار" میں "باری جی" کی ضرورت نہ تھی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے تقشف و تورع کا ہمیں بڑا احترام ہے۔ لیکن کبھی کبھی ان کا طنز طنز نہیں رہتا۔ غالبانہ طرفداری بن جاتا ہے جو ان کے شایان شان نہیں۔

"سپاہی کی بیٹی" کتنا اچھا مضمون ہے۔ اسلوب بیان کی دلکشی کے کیا کہنے! بیان کا تسلسل اے سبحان اللہ! آبرو دبیر اور صفیر کی روحیں اس تمثیل نگار ادیب کی صنعت گرانہ نقاشی پر سر دھنتی ہوں گی۔ اور آخر میں یہ لیلیٰ مجنوں کا قصہ خوب ہی رہا۔ ادیب جلیل شاید جانتے ہوں کہ لیلیٰ اب نجد و حجاز کے جغرافیائی حدود کی پابند نہیں اور وہ "بین الاقوامی" ہو رہی ہے۔ اور مجنوؤں کا تو کیا کہنا۔ نام ہی لینا ہو تو کئی نام لئے جا سکتے ہیں۔ دبیر کی تخیل آرائی اور معنی آفرینی کے ساتھ ساتھ انیس کی واقعیت پسندی کا بھی پاس ہوتا تو لیلیٰ کے خفیہ دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ مجنوؤں کا نام بھی ضرور لیا جاتا۔ لیکن یہ اپنے اپنے دماغ کی ساخت ہے یہاں کب کسی کی دال گل سکتی ہے۔

فاتح بہار و بنگال محمد بن بختیار خلجی نہایت محققانہ مقالہ ہے۔ مولانا سید ابوظفر ندوی کی کاوش لایق تحسین ہے۔

اس مضمون میں اس استدلال کی کمی نظر آتی ہے۔ جو شبلی اسکول کا امتیاز ہے۔ طبقات ناصری کے حوالہ سے یہ لکھنا کافی نہ معلوم ہوا کہ نالندہ کی خانقاہ میں جو بودھ بھکشو تھے، وہ سب مارے گئے۔ اس واقعہ کی بنا پر عجیب و غریب تاویلیں ہو سکتی ہیں۔ تبت سے جو قدیم کتابیں ہندوستان آئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بودھوں کے تعلقات مسلمانوں سے بہت خوشگوار تھے اور جناب جو "ینگ" (تبت کا ایک مورخ ہے اور اس کی کتاب مشہور اشتراکی رہنما بابا راہل سنسکرتیاین کے پاس موجود ہے) لکھتا ہے کہ بودھ عالموں سے کھیلاجی (خلجی) کے تعلقات بہت اچھے اور دوستانہ تھے۔ مولانا نے مقالہ اتنا زبردست لکھا ہے کہ امید کی جاتی ہے کہ وہ مسئلہ کے اس پہلو کے ساتھ بھی پورا پورا انصاف کریں گے۔

عمدۃ الملک نواب داؤد خاں قریشی پر جناب ضیا قاسم مختار نے، نایاب موتی رول دئے ہیں۔ بڑی محنت کی ہے، بڑے بیش قیمت دفینے دریافت کئے ہیں۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ نواب داؤد خاں قریشی پر اعتماد کرنے میں اورنگ زیب نے کہاں تک تدبر کا ثبوت دیا۔ یہ بھی ایک اہم سوال ہے، اور داؤد خاں کے بہار میں تقرر سے مغلوں اور افغانوں کے دیرینہ خرخشوں کو کہاں تک تقویت پہنچی، یہ بھی ایک غور طلب مسئلہ ہے۔

"صوبہ بہار کے آخری ہندوستانی گورنر" کے متعلق کچھ کہنا بڑی جرأت کا کام ہے۔ لیکن اتنا کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ مضمون کی ترتیب کچھ یوں ہوئی ہے کہ قارئین آپ سے آپ یہ اندازہ لگالیں کہ اس وقت کے ہندو رؤساء نے مسلمان تاجداروں کی تخریب میں منظم سازش کی۔ ممکن ہے واقعہ کا یہ بھی ایک پہلو ہو، لیکن خود مسلمانوں نے آخری مسلمان تاجداروں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ زیادہ المناک داستان ہے۔ نام گنانے کی ضرورت نہیں کہ ان کے ورثا کے لئے آج بھی یہ حقیقت ناقابل برداشت ہوگی۔

قبلہ مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی کا مضمون، ایک مستقل تصنیف ہے۔ اس کی ایک ایک سطر ایک کتاب کا عنوان ہے۔ خدا انہیں تا قیام قیامت زندہ رکھے کہ بہاری ان کے فیوض و برکات سے مستفید ہوتے رہیں۔ مولانا کا کام اعلاء کلمۃ الحق ہے۔ دنیا تیوریاں چڑھائے تو چڑھایا کرے۔ اس کی پرواکب تک۔

'فردوسی اور دقیقی' پر اس سنجیدگی سے لکھ جانا ادبی تعصبات سے دامن بچا لینا "تنگ نظری کو سب کچھ کہہ جانے پر بھی دعوت مبارزت نہ دینا" پروفیسر طاہر رضوی ایم۔ اے ہی کے صناعانہ قلم کا ایک کمال ہو سکتا تھا، دوسروں کیلئے یہ بڑا مشکل کام تھا۔

"موجودہ طرز آفرینش اور اس کے اجزا" نہایت مفید مضمون ہے۔ جناب مظفر حسین صاحب ایڈوکیٹ نے بڑی صفائی کے ساتھ جدید معاشی و اقتصادی نظریوں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ مضمون اور پھیلتا تو اچھا تھا۔ اس میں ابھی بہت کچھ کہنے کی گنجائش بھی ہے اور ضرورت بھی۔

"تاریخ متعلمہ پر ایک نظر" میں ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی نے بڑے اختصار سے کام لیا ہے۔ اقتباسات دے کر بتایا جا سکتا تھا کہ لمبا اوقات چند سطریں، بتیسوں کتاب کا نچوڑ ہیں، خصوصاً تمدنی پہلو پر مصنف نے داخلی حیثیت سے جو روشنی ڈالی ہے، وہ انہیں مورخ کے ساتھ ساتھ مفکر کی پہلی صف میں لا کھڑا کرتی ہے۔ پھر بھی یہ ڈاکٹر صاحب کا

احسان ہے کہ انھوں نے مصنف کو سمجھنے کی کوشش فرمائی ہم سے تو یہ بھی نہیں ہوتا۔
"فن مصوری میں پٹنہ قلم" ہمیں تشنہ معلوم ہوا۔ پٹنہ قلم کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔ اور مغل آرٹ پر بھی کہیں کہیں بہت چھچھلتی ہوئی نظر ڈالی گئی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس موضوع پر کچھ لکھا جائے اور دل کھول کر بحث کی جائے' لیکن غالبًا ہمارے "شفقات" پیشانیاں چڑھائیں گے۔

'بہار اور اردو" اور "شاد کا تغزل" خوب مضامین ہیں حضرت حمید عظیم آبادی اور جناب سید شاہ ولی الرحمٰن کا یہ خاص موضوع ہے۔ طنزیات (SATIRI & HUMAR) میں بہار کا کیا حصہ ہے۔ یہ بھی ایک قابل غور حقیقت ہے۔ بہار میں ہندی اور اردو کا کیا تعلق رہا' یہ مسئلہ بھی محتاج توجہ ہے۔
"قلعہ رہتاس" کے متعلق مولانا عبدالرؤف نے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جس کی ضرورت تھی۔ اتنا جامع مضمون اب تک انگریزی اور اردو میں نہیں چھپا

اور پھر "شورش بہار میں" -- غدر میں گیا کے سیاسی حالات" تو بس ایک عجیب انوکھی چیز ہے۔ عنوان سے تھوڑی سی تکلیف ہوئی' اس لئے کہ یہ بہت بڑی حقیقت ہے کہ یہ "غدر" کیا؟ - اور اسے 'غدر' کہہ کر جانبدار اور کور باطن مورخوں کی ہاں میں ہاں کیوں ملائی جائے۔ لیکن خیر۔ میں نہ جانتا تھا کہ خواجہ جلال الدین کا قلم معجز رقم بھی ہے۔ اسلوب بیان کی دلکشی پہ بے ساختہ واہ نکلتی ہے اور پھر موضوع تو فطری طور پر ایسا ہے کہ ہندوستان کا ماضی حال اور مستقبل اسے اپنی تعمیر کا فولادی فریم سمجھے گا۔ مسٹر مونی کی مراسلت بالکل "کلاسیکی" (CLASSIC) ہے۔ فاضل مضمون نگار نے مسٹر موم مسٹر گرڈ ر کی مراسلتیں بھی اس سلسلہ میں درج کر دی ہوتیں تو مسٹر مونی کی مراسلت کا سیاق و سباق سمجھنے میں زیادہ سہولت ہوتی۔ اچھا صاحب۔ گیا تو آ گیا - یہ شاہ آباد پر اتنی سرسری نظر کیوں! شاہ آباد کی کوششوں کو زمانہ آئندہ کا مورخ طراز عنوان بنائے گا۔ کنور! تیرے عزائم کی پاکیزگی اور روشنیز گی کو' امر! تیرے ارادوں کی اہمیت کو کون بھلا سکتا ہے۔ مورخ تمہارے طریق کار سے اختلاف کرے لیکن تمہاری غیر معمولی صلاحیتوں سے انکار نہیں کر سکتا مضمون میں بصیرت بھی ملتی ہے' تحقیق' اجتہاد اور علم کا ذوق بھی ملتا ہے' اور اشارات تو بس غضب ہیں۔

جمیل مظہری کے افسانہ کی تعریف کیا کی جائے۔ شلرنے گوئٹے کو "فاوسٹ" کے کچھ چھپے ہوئے باب دیکھ کر لکھا تھا کہ مجھے فاوسٹ کے غیر مطبوعہ حصے پڑھنے کا بہت اشتیاق ہے۔ کیونکہ سچ پوچھئے تو میں نے جو کچھ پڑھا ہے' وہ ہرکلیس کے مجسمے کا ٹوٹا سا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ ان اجزا میں جو قوت تخیل اور رفعت طبع صرف کی گئی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کسی بڑے استاد کا کام ہے' میں پاتا ہوں کہ جہاں تک ممکن ہو' اس کے بلند اور جری کیرکٹر کی پوری نشوونما دیکھوں جو اس قصہ کا روح رواں ہے"۔ آج

جمیل کے اس افسانہ کے متعلق بھی یہ الفاظ دہرائے جائیں تو بے موقع نہ ہو۔

میں "فرض کی قربانگاہ" کو ادھورا اور نامکمل سمجھتا ہوں اور میری یہ دلی آرزو ہے کہ جمیل اپنے محمود کے ساتھ زیادہ انصاف کریں محمود سے ہمدردی کرنے کو جی چاہتا ہے جو اسے نہیں ملتی۔ ہماری آنکھیں محمود کے سینہ میں "دو روحیں" دیکھنا چاہتی ہیں۔ ایک تو شاعر کی حسن پرست، عشق پرور، شور انگیز، ہنگامہ خیز روح، اور دوسرے حکیم کی عرفان جو، حق پسند، سکون طلب، نظم آفریں روح۔ ان دونوں کی کشمکش کو دور کرنے پر اس کی نجات منحصر ہے۔ اسی کے ساتھ اس کے ذہن میں بلا کی وسعت اور ہمہ گیری ہے۔ اور اس کی طبیعت میں غضب کی آمد اور روانی۔ اس کے لئے یہ بھی ایک اہم مسئلہ ہے کہ اپنی تخلیقی قوت کے لئے کیا حدود اور کیا ضوابط مقرر کرے تاکہ وہ سیلابی دریا کے مانند کناروں کو توڑ کر آس پاس کی بستیوں کو ویران نہ کردے بلکہ سبک رو ندی کی طرح ایک مقررہ دھارے میں بہ کر اپنی روانی کو سیراب کرے اور زرخیز بنائے۔

سلیمہ کے کردار کو ہم یوں نکھرتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ سلیمہ محمود سے عمر میں بڑی ہے۔ وقار، متانت، نفاست مذاق، اصابت رائے اور حسن تدبیر میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ کچھ اس کی واقعی صفات اور کچھ شاعر کے تخیل کی کمال بینی (IDEALIZATION) غرض محمود اسے صنف نسوانی کا کامل نمونہ سمجھتا ہے۔ ان دونوں کی محبت برسوں تک افلاطونی عشق سے آگے نہیں بڑھتی۔ محمود اس کے کاروبار میں تصنیف و تالیف میں غرض ہر چیز میں مشورہ لیتا ہے اور اس کے مشورہ پر عمل کرتا ہے۔ جوش جوانی کے تقاضے سے وہ روحانی ارتباط کے علاوہ جسمانی وصل کا بھی طالب ہو مگر سلیمہ ان پیارے حیلوں سے جنہیں کچھ پاکدامن اور شائستہ عورتیں ہی خوب جانتی ہیں ٹالتی رہتی ہے۔ اور اگرچہ بعض دقتوں سے نکاح نہ ہو سکا مگر دونوں کے تعلقات اسی قدر استوار اور وفادارانہ رہتے ہیں۔ جیسے میاں بیوی کے اور آخر عمر تک ایسے ہی رہے۔

یہاں تک کہ محمود کی زندگی کا وہ دور آتا ہے جس میں ایک پیر دانشمند کی تصویر نظر آتی ہے۔ جو زندگی کے نشیب و فراز دیکھ چکا ہے جو اپنی فطری بےچینی، اپنی بے قید قوت تخلیق، اپنی بے روک جذبات پرستی کو ضبط و انضباط، اصول و قواعد، عقیدے و رتصب، تعین کے قابو میں لا چکا ہے، اپنے ملک کے ادب کے رومانی جوش و خروش کو کلاسیکی ترتیب و ہم آہنگی کے سانچے میں ڈھال چکا ہے، اپنی قوم کے مزاج کی وحشت اور شورش کو تنظیم اور تہذیب کی راہ دکھا چکا ہے، اور اب سکون و اطمینان سے بیٹھ کر اپنے کلام پر نظر ثانی کر رہا ہے۔ وہ اپنے گھر سے باہر بہت کم نکلتا ہے۔ لیکن اس کا گھر اہل علم، ارباب ادب اور ارباب عمل کا مرجع ہے۔ وہ تنقید و بزرگانہ مشوروں سے نوجوانوں کی کوششوں کو سیدھی راہ پر لگاتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ رومانی تحریک جسے وہ دبا چکا ہے اب پھر نئی نسل میں ابھر رہی ہے۔ مگر وہ اس سے خفا نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ جب تک دنیا قائم ہے شباب کا گرم خون طوفان و ہیجان بن کر ابلتا رہے گا۔ مگر اسے یہ بھی یقین ہے کہ جیسے اس نے رومانی زندگی کی تپ مدتوں سہ کر آخر میں ضبط و انضباط کی تبرید کی قدر پہچانی، اسی طرح دوسرے بھی ایک دن کریں گے۔ اور انہیں اس میں خود اس کے نسخوں سے مدد ملے گی۔ محمود کبھی کبھی آج بھی محسوس کرتا ہے کہ ناموس، آبرو اور اخلاقی قانون انسانوں کو زنجیروں میں جکڑ دیتا ہے اور ان کی زندگیاں کبھی کبھی برباد کر دیتا ہے وہ اب بھی سماج کو

انفرادی روح کی فریاد سناتا ہے، لیکن اخلاقی قانون کی زور شور سے حمایت کرتا ہے "رومانیت" کی دلدل جانے سے وہ اتنا مطمئن ہے کہ اس عمر میں بھی کبھی کبھی یہ درد مول لیتا ہے اور اس کے سوز و ساز کا لطف اٹھاتا ہے۔ سلیمہ اس کی ہمدرد و غمگسار ہے۔ محمود دیوان اور سلیمہ مجاور ہے، اور اس تعلق کا رسیلا پن دونوں کو مسرور رکھتا ہے۔

ممکن ہے جمیل اپنے محمود کے بارے میں اس طرح نہ سوچتے ہوں، لیکن ان کا محمود کوئی بے مقصد چیز نہیں۔ سماج کے لئے وہ قدرت کا بیش بہا عطیہ ہوسکتا ہے۔

پروفیسر اختر اورینوی کا افسانہ امید ہے کہ بہت مقبول ہوگا۔ واردات قلب اور محاکات نے جان ڈال دی ہے۔ موجودہ سماج کے بنیادی عدم توازن کی نعش، جس پر معاشرت کی سفید چادر ڈال دی گئی ہے۔ بڑے خلوص اور شدت کے ساتھ چاک کی گئی ہے، اور خوبی یہ ہے کہ خارجی دنیا کی بوسیدہ ردائے طمانیت کی بخیہ گری کی بھی کوشش نہیں کی گئی کہ دنیا والوں کو ننگی نگاہوں سے تلخ گھریلو حقیقتوں کو دیکھنے کی عادت ڈالنی چاہئے۔ کہ یہ عادت اور مزاج کی یہ افتاد انقلاب کیلئے ساز گار ماحول پیدا کرتی ہے۔

پروفیسر شبلی جانے کیوں مصر ہیں کہ مرد ہی کو حق ہے "عورت چننے کا" اور عورت اس حق سے کیوں محروم رہے اس کا جواب پروفیسر صاحب کوئی کیسے مانگے! یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا عورت اور مرد کا ذہنی و علمی مبادات' جنسی اتحاد کو مانع آسکتا ہے! جواب میں تاریخی فریب اور وجدانی طلسم کی آڑ نہ لینا پڑے گی، حقیقت سے بحث ہوگی۔

سہیل صاحب نے اچھی چیز لکھی ہے، یہ ان کا خاص رنگ ہوگیا ہے۔

کامریڈ انیس الرحمن اور کامریڈ خیر النساء کے افسانے بھی بالکل "کامریڈ" ہیں، اور ایک دوسرے کا منطقی نتیجہ۔ یہ ربط باہمی بہت معنی خیز ہے اور ہونا بھی چاہئے۔ خیال اور عقل کی اپنی اپنی حدیں بہت صاف ہوگئی ہیں۔

منظومات کا حصہ بہت اچھا ہے۔ ڈاکٹر عظیم الدین پی۔ ایچ۔ ڈی کی کمی سی محسوس ہوئی۔ حضرت صبا رشیدی نے بہار کا نغمہ خوب سنایا۔ ان کی ہر مے سے نشاط کا نغمہ نکلتا ہے۔ لیکن شاعر کا دل درد و الم کی لذت سے خالی نہیں، محاکات، منظر کشی اور مصوری کے بہتر نمونے نغمۂ بہار میں ملتے ہیں، اور شاعر صرف مناظر اور سراپا کا مصور نہیں، بلکہ جذبات کی مصوری میں بھی اسے استادانہ دسترس حاصل ہے۔ زبان میں ایسی شیرینی ہے کہ قند پارسی اور "قند بھاشا" میں ڈوبی ہوئی ہے۔ فارسی ترکیبوں کے ساتھ بھاشائی سادگی اور شیرینی مزہ دوبالا کر جاتی ہے۔

اور چہ حضرت جمیل مظہری کی "حقیقت اس کی" اور "افکار جمیل" تو اپنی مثال آپ ہی ہیں۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ جمیل کے مزاج شعریت پر اشراقیت، بھگتی، ویراگ، اور تھیوسوفی (THEOSOPHY) کا غلبہ ہو رہا ہے۔ "ندیم" شاعر کو ٹوک سکے تو اعتدال پر قائم ہونے کی امید ہوسکتی ہے۔ یہ ذہنی محرکات شاعر کو کتنا ہی بلند بنا دیں لیکن اس عالم آب و گل سے اسے دور لے جاتی ہیں۔ جو لوگ مجرد عن المادہ حقائق پر سر دھنتے ہیں اور اسی کو معیار کی بلندی اور حسن مذاق سمجھتے ہیں ان کے لئے تو یہی رنگ سب کچھ ہے، لیکن ہندوستان

ی بدلنے والی دنیا میں جہاں ماحول کی خارجی کیفیات نہایت صبر آزما اور جانگسل ہیں شاعری جانی بوجھی تلخ حقیقتوں کی مصوری کا نام ہونا چاہیے جو دلوں کو گرمائے اور واقعیت کی جیتی جاگتی تصویر ہو۔ یہ تخیل کی شاعری پر کوئی فنی اعتراض نہیں بلکہ دوستانہ مشورہ ہے۔ ہم تخیل کی شاعری میں شوخی و رنگین بیانی یا "شبابیات" کی بے اعتدالیاں نہیں دیکھنا چاہتے۔ لیکن حقیقت کی شوخیوں کو رخسار شاعری کا غازہ ضرور سمجھتے ہیں۔ آخر وہ شاعر جس نے

زریب کھائے ہیں رنگ و بو کے سراب کو پوجتا رہا ہے

اب طلسمات کی دنیا تو نہیں بسا سکتا۔ اس نے وہ علائق ترک کر دئے تھے' اور "صحیح نتیجوں" کی روشنی میں واضح اور معین "منزل" تو اس کا تھا۔

حضرت رضی' حضرت سہر کابری' حضرت جوہر فریادی' حضرت عبدالغنی شمس کی نظمیں خوب ہیں۔ جوان شعرا میں اجتبیٰ اور پرویز کو نگاہیں بیتابانہ ڈھونڈتی ہیں۔

"نوخیز عراق اور اس کا پہلا بحری بیڑہ" مولانا مسعود عالم ندوی کا مقالہ ہے۔ اور محنت سے لکھا گیا ہے۔ مولانا سے یہ امید بجا طور پر قائم کی جا سکتی ہے کہ ممالک اسلامیہ کی داخلی و خارجی سیاست پر وہ آیندہ بھی سیر حاصل بحثیں کریں گے۔ کہ یہ ان کا خاص موضوع ہونا چاہیے۔

جناب منصور کاکوی صاحب نے "مصر کی نئی سیاسی تشکیل" میں دریا کو کوزہ میں بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ وفد کے زوال پر ذرا اور تفصیلی بحث درکار تھی۔ فاروق کے سیاسی رجحانات کی بحث بھی بہت تشنہ رہ گئی ہے۔

اور آخر میں ہڑبونگ سبھا' کا تو کیا کہنا ہے۔ خدا مانپوری کو تا دیر قائم و دائم رکھے' کہ بہار میں طنزیات کے وہ امام ہیں لیکن یہ امام جب ہڑبونگ سبھا میں بھی امامت کا مدعی ہو جائے تو وہی دعا کرنی پڑتی ہے کہ "خیر سے بھتیا گھر کو آئیں" اور کیا۔

موجودہ شعرائے بہار کے ساتھ جناب بہزاد فاطمی اور جناب نسیم گورگانوی نے کافی انصاف کیا ہے۔ ہم یہ جاننا چاہتے تھے کہ بہار میں شاعری کا کوئی 'بہار اسکول' بھی ہو سکتا ہے یا نہیں' اور موجودہ بہاری شعرا کے مخصوص رجحانات کیا ہیں' اور پنجاب اسکول' دہلی اسکول' اور لکھنؤ اسکول سے انکی روش کچھ الگ ہے یا ایک ہی سی۔ امید ہے کہ جناب بہزاد فاطمی اور نسیم گورگانوی اس مسئلہ کے ساتھ آئندہ پورا پورا انصاف کریں گے۔

جناب گلاب چاند صاحب بی۔ اے کا مختصر سا مضمون "شاد کا امتیازی رنگ تغزل" ہمیں بہت جاندار معلوم ہوا۔ خدا ان کے ان رجحانات میں اور پختگی پیدا کرے۔

ڈاکٹر سید محمود اور آنریبل مسٹر سید عبدالعزیز کے متعلق بہت اچھا لکھا گیا ہے۔ امید ہے کہ 'حیات محمود' بہت جلد لکھی جائے گی اور حیات عزیز کی ترتیب کا کام بھی کوئی صاحب انجام دیں گے۔ ہمارا یہ کچھ عجیب سا خیال رہا ہے کہ سوانح حیات کی ترتیب کو مخالف کو انجام دینا چاہیے۔ اسی طرح ہم اسے اچھا سمجھیں گے کہ حیات محمود کوئی منصف مزاج لیگی لکھے اور حیات عزیز کوئی منصف مزاج کانگرسی!۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اس تجویز سے اتفاق کریں لیکن بہرحال یہ ہمارا خیال ہے۔

اگلے مشاہیر کے خطوط بیش بہا دستاویز ہیں اور ندیم نے انہیں چھاپ کر سیاسیات کے طلبہ پر بڑا احسان کیا ہے۔ ندیم کے واسطے سے ڈاکٹر سید محمود کا اس نوازش کے لئے جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔

'ندیم' کا سرورق بلاشبہ دیدہ زیب ہے اور پھر خوشی کی بات یہ ہے کہ مولانا ریاست علی ندوی اسی شان سے 'ندیم' کی رہبری پر تیار رہیں۔ ہمیں آرٹ کا بلاک "ساقی بنور بادہ برافروز جام ما ؛ مطرب بگو کہ کار جہاں شد بکام ما" فارسی شعر کے ساتھ اگر اس کا عنوان "آہنگ حیات" قائم کیا جاتا تو تصویر کا موضوع سمٹ آتا۔

"کارکنان رسالہ ندیم و ندیم پریس" کی تصویر بہت بھائی۔ اس میں کئی باتیں ہیں۔ ایک تو جناب ابو محمد سید حسن امام وارثی حسن (رکن اعزازی شعبۂ منظومات) کا وہ شکوہ و تجمل ہے جو پوری شان کے ساتھ انہیں ممتاز کر رہا ہے۔ دوسرے منشی محمد یوسف صاحب ہیں جو سراپا خوبیت بنے ہوئے ہیں۔ کیا اچھا ہوتا کہ منشی یوسف صاحب کی جگہ 'لفٹ آوٹ' کے عوض 'لفٹ ان' ہوتی۔ پھر ترتیب یوں ہوتی، سید نظام الدین صاحب رائٹ آوٹ' وارثی صاحب رائٹ ان' مولانا ریاست علی سنٹر فارورڈ' منشی محمد یوسف صاحب لفٹ ان' اور سید علی منظر امام صاحب "لفٹ آوٹ"۔ ترتیب لاجواب ہوتی اور تینوں Inside trio صوری اور معنوی اعتبار سے بہت زیادہ یکسانی پیدا کرتے۔ ہمیں مسرت ہے کہ 'ندیم' کی یہ ٹیم جو بارہ کھلاڑیوں پر مشتمل ہے (ایک لائنس مین یا اکسٹرا سمجھ لیجئے) وہ واقعی ٹیم ہی ہے اور بلا امتیاز منصب ہر کھلاڑی اپنی اپنی جگہ اٹل ہے۔ اور ایک بڑے مقصد کی کامیابی کا آرزومند یکسی ادارے کی کامیابی کے لئے یہ ٹیم ضمیمہ ناگزیر ہے۔

"اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز ہے حسن" بھی اچھی تصویر ہے۔ فرصت ہوتی تو بہن جی غالباً اس تصویر میں اور محنت کرتے۔ بہن جی ہم سے بہتر جانتے ہوں گے کہ EXPREMINIST ART اب وقت کی چیز نہیں رہی۔ اس تصویر کا پس منظر کوئی پہاڑ یا پہاڑ کی چوٹی، عورت انگڑائی لیتی ہوئی پہاڑ کی چوٹیوں کا سہارا لیتی' سامنے دور افق آسمان پر ایک تارا جھلملاتا ہوتا' عورت کھڑی ہوتی' اس کے قدموں میں شیر پڑا سویا ہوتا' تو تصویر ہمارے خیال میں کچھ اور ہو جاتی۔ حسن جب بھی مرکز کی طرف مائل پرواز ہوتا تو اپنے ماحول کو بھی مائل پرواز کرتا' اور یہ محویت کی ترغیب دیتی۔ بہرحال' بہن جی کی ذات پر بہار کو جتنا بھی ناز ہو بجا ہے۔

اجازت ہو تو کچھ ناقص گزارشیں آپ کی خدمت میں بھی پیش کروں۔ سالنامہ کی ترتیب سے غالباً پہلے ہی فاضل مدیر کو یہ طے کر لینا چاہئے کہ سالنامے میں کتنے ابواب قائم کرے گا۔ اور ہر باب میں کون کون سے مقالے اور مضامین ہوں گے' نیز یہ کہ اگر ممکن ہو تو ان مقالوں کا اجمالی خاکہ کیا ہونا چاہئے۔ اس ترتیب اور خاکہ کے مطابق اہل قلم حضرات سے مضامین لکھنے کی فرمائش ہونی چاہئے' اس سے ایک نقصان یہ ہوگا کہ نئے مضمون نگاروں کے لئے دقتیں بڑھ جائیں گی۔ لیکن ان کے لئے صلائے عام ہونا چاہئے۔ اور ان کے مضامین قائم کردہ ابواب کے تحت چھاپ دینے چاہئیں۔ یہ التزام کیا گیا تو کوئی اچھا موضوع نظرانداز نہ ہوگا۔ مضامین زیادہ جامع ہوں گے' اور سالنامہ زیادہ مفید ہوگا

سالنامۂ ندیم میں کچھ کمیاں ہیں جن کی طرف اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ راجگیر پر ضمناً اشارات آگئے ہیں لیکن کوئی اچھا مضمون نہ درج ہو سکا۔ بہار کے مختلف تاریخی دوروں پر کوئی جامع مضمون نہ چھپ سکا۔ بہار کی تمدنی زندگی پر مسلمانوں کے اثرات بھی اچھا عنوان تھا۔ اردو کی تعمیر میں بہار کا حصہ بھی مفید مضمون ہوتا۔ زبان اردو کی ترکیب میں پنجابی دکھنی اور گجراتی زبانوں کی طرح ماگدھی اور بھوجپوری کا حصہ بھی اچھا موضوع تھا۔ "موجودہ ادب کے رجحانات"۔ "ادب میں اشتراکیت اور رومانیت"۔ "ترقی پسند ادب" "تخلیقی ادب" اچھے عنوانات تھے۔ "یورپ کے موجودہ ادیب و افسانہ نگار اور ان کے جدید ادبی رجحانات" اچھا مضمون تھا۔ کسی ممتاز یورپین یا امریکن ادیب کے شاہکار کا ترجمہ بھی چھپنا چاہئے تھا۔ یادرفتگاں میں جناب امداد امام اثر کو نہ بھولنا تھا۔ کسی گمنام تصنیف پر کسی پہلو سے روشنی ڈالنی تھی۔

میں نہایت خلوص کے ساتھ سالنامہ کی عظیم الشان کامیابی پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ ادب اردو کو ندیم کے سالنامہ پر فخر ہوگا اور صوبہ بہار تو جتنا بھی ناز کرے کم ہے۔

تحفۂ ربیع الاوّل

اسلام کی حقیقت

مصنفہ جناب ابو ظفر محمد بدر الدین خاں بی۔اے آنرز سب رجسٹرار

اس کتاب میں بعثت نبی صلعم کی حالت، آپکی حالات زندگی۔ وصال، معراج و معجزات۔ اسلامی تمدن، انفرادی اور اجتماعی زندگی، اسلام اور حریت ضمیر، سرمایہ و مزدور کا ملاپ، پیغام عمل و حیات، مادہ و روح کا ربط۔ تعدد ازدواج کی تاریخی و سیاسی اہمیت، وحدانیت کا مفہوم۔ قومیت اور ہجرت کے فلسفے۔ قرآن مجید کی پیشین گوئیاں۔ اسلام کا یورپ میں اثر، اقتصادی و سماجی پیچیدگیوں، دولت و غربت کی باہم توازن آزمائیوں کا حل وغیرہ وغیرہ اس قسم کے بیشمار مضامین پر اس کتاب میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا کی تمام گتھیوں کو سلجھانے کا واحد ذریعہ اصول اسلام کی پیروی ہے۔ نیز قیام و مناجات بھی نئے طور پر درج کئے گئے ہیں۔ چند رائیں جو ابھی تک موصول ہوئی ہیں یہ ہیں :-

اخبار وحدت و الامان دہلی کی رائے (تاریخ ۱۱ ر و ۱۳ ر اگست سنہ ۱۹۴۰ء)

"مصنف نے اس مختصر کتاب میں پیغمبر اسلام کی حیات طیبہ پر روشنی ڈالتے ہوئے اسلام کی حقیقت، اسکی افادیت اور اہمیت کو بخوبی واضح کر دیا ہے۔ نیز بعض اہم اسلامی مسائل کو دلنشین پیرایہ میں بیان کرکے نہایت آسانی طریقہ پر سمجھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہ کتاب ہماری رائے میں ہر ایک مسلمان کے گھر میں ہونی چاہئے۔"

پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کی رائے :-

"آپکی یہ تصنیف اسم بامسمیٰ ہے۔ آپکی خواہش کے مطابق اگر اس کتاب کو مجالس میلاد میں پڑھا جائے تو عوام اس سے بہت زیادہ متمتع ہونگے۔ اور اس سے بہت سی خرابیوں کی اصلاح ہو جائیگی۔ خدائے پاک آپکو اس مفید خدمت کے لئے جزائے خیر عطا فرمائے"۔ قیمت کتاب ایک روپیہ۔ کتب فروش حضرات کمیشن۔ خط و کتابت کیجئے

ملنے کا پتہ :- مسٹر بدر الدین خاں کیر آف بدر الدین خاں سب رجسٹرار۔ پوسٹ بہیڑہ۔ ضلع دربھنگہ (صوبہ بہار)

باب المراسلۃ والمناظرہ

نواب صاحب مرحوم کی ایک سے زیادہ صاحبزادیاں تھیں

مخدوم محترم دامت معالیکم! سلام مسنون!

ندیم کا بہار نمبر ستمبر سنہ ۱۹۴۰ء موصول ہوا۔ چند کی نظر میں تو بہت خوب ہے لیکن مجھ سا کم سواد حقیقی معنوں میں بھلا آپ کی مساعی جمیلہ کی کیا داد دے سکتا ہے اور اگر اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر چند تحسین آمیز کلمات کا اعادہ بھی کرے تو وہ ارباب فکر و صاحبان نظر کی نگاہوں میں کب قابل قدر ثابت ہو سکتے کیونکہ من آنم کہ من دانم۔

حال ہی متذکرہ بہار نمبر میں "میت کی پریت" کے عنوان سے جو دلچسپ مقالہ اشاعت پذیر ہوا ہے اسکی خوبی تحریر و مخصوص دلکش طرز انشاء پردازی سے کون انکار کر سکتا ہے مگر یہاں تک صحیح واقعات کا تعلق ہے فاضل مقالہ نگار نے صفحہ ۲۱۴ پر نواب امداد امام صاحب مرحوم کا ذکر کرتے ہوئے مرحوم کی زوجہ ثانیہ کے بطن سے کئی صاحبزادوں کے علاوہ صرف ایک صاحبزادی کا جن کی شادی مولوی اسد رضا صاحب وکیل سے ہوئی سے متولد ہونا تحریر فرمایا ہے۔ یہ بیان سراسر حقیقت کے خلاف ہے جس کے اختلاف کا بہترین ثبوت خود نواب صاحب مرحوم کے ایک گرامی نامہ سے ملتا ہے جو انھوں نے محترمی پروفیسر طاہر رضوی کے نام ۳۰ بنگلہ گیا سے ۱۰ دیں ستمبر سنہ ۱۹۳۲ء کو تحریر فرمایا ہے ساتھ ہی اس کے یہ اظہر من الشمس ہے کہ مولوی اسد رضا صاحب کی اہلیہ محترمہ بفضلہ تعالیٰ ہنوز بقید حیات ہیں۔

بنا بریں حالات "میت کی پریت" لکھنے والے محترم بزرگ کا بیان اگر صحیح مان لیا جائے تو پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ نواب صاحب مرحوم نے اپنے متذکرہ والا نامے میں مدعا کے تحت مندرجہ ذیل اطلاع اپنے مکتوب الیہ کو آخر کیوں دی ہے؟

"۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ حال میں مجھے ایک بیٹی کا داغ اٹھانا پڑا ہے ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔"

نواب صاحب مرحوم کا لکھا ہوا متذکرہ اصل خط آپ کی و نیز ناظرین ندیم کی تشفی کے لئے ترسیل خدمت ہے توقع ہے کہ ندیم کی کسی قریب ترین اشاعت میں آپ نے اس عریضے کے ساتھ نواب صاحب مرحوم کے مکتوب گرامی کا عکس بھی ضرور شائع فرما دیں گے تاکہ مسافر تحقیق کو آگے کی منزلیں طے کرنے کا بہر طور موقع مل سکے۔

راقم سید رضا قاسم (مختار)

ندیم ہمارے لائق دوست جناب سید رضا قاسم صاحب ندیم کے دیرینہ کرمفرما ہیں۔ وہ اسکی جزئی سے جزئی فروگذاشت کو انگیز نہیں کر سکتے۔ بھلا اس بات میں کون سی "تحقیقی" اہمیت ہے کہ نواب صاحب مرحوم کے ایک سے زیادہ صاحبزادیاں ہوئیں اور ماں کی گود ہی میں تھیں کہ داغ مفارقت دے گئیں۔ "میت کی پریت" کے محترم مضمون نگار نے "صاحبزادی" سے مراد صرف انہی کو لیا تھا جو بڑا دساں کو پہنچیں اور اسی لحاظ سے موصوف نے ان کا تذکرہ کیا بہر حال مضمون "میت کی پریت" میں زیر بحث فقرہ یوں طور پر پڑھنا چاہیے "بطن سے کئی صاحبزادے اور صاحبزادیاں ہوئیں جن میں دو صاحبزادے اور ایک صاحبزادی حیات ہیں۔۔ ۔۔ ۔۔"

ذیل کے مکتوب کی اشاعت جو ہمارے لائق دوست نے ثبوت میں بھیجا ہے اس حیثیت سے چنداں ضروری نہ تھی لیکن اس سے جناب نواب صاحب مرحوم کے بعض دوسرے حوال پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس لئے اس کو اس سلسلہ میں شائع کر دیا جاتا

[illegible] گیا — مورخہ ۱۸ ستمبر ۱۹۳۱ء

عزیز مکرم [illegible] السلام علیکم — بعد دعائے خیر امور [illegible] گزارش کرتا ہوں —

۱۔ مجھے اس سال [illegible] کی جو [illegible] ہے اس سلسلہ [illegible] وقف ہے [illegible] سال [illegible] حالت [illegible] ہے کہ مجھے زندگی [illegible] ہے [illegible] ہے اور [illegible] کہ [illegible] وصول ہو [illegible] — [illegible] دیکھوں —

۲۔ میری تصنیفات سے [illegible] کی اجازت [illegible] ہے — میں [illegible] کا [illegible] اور جو [illegible] ہے [illegible] گا —

۳۔ [illegible] کتاب [illegible] مناظر المعاش کی [illegible] جلد [illegible] خدمت [illegible] کرتا ہوں — [illegible] قیمت [illegible]

۴۔ عرصہ ہوا کہ میں نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام ہدیہ قیصریہ ہے — یہ کتاب حضور ملکہ معظمہ [illegible] ہندوستان کی [illegible] ہے — [illegible] اگر [illegible] کیا جائے [illegible] — [illegible] ایک جلد میرے پاس رہ گئی ہے — اگر آپ اس کی طلب فرمائیں تو [illegible] میں بھیج دوں [illegible] کتاب اخلاق آموزی کے اعتبار سے [illegible] آپ [illegible] —

۵۔ مناظر المعاش کا ترجمہ انگریزی میں [illegible] ہو گا [illegible] ہو سکتے ہیں [illegible] سکیں —

۶۔ [illegible] صاحب [illegible] میں — [illegible] کا داغ اٹھانا پڑا ہے [illegible] اختیار کر لیا ہے [illegible] زندگی [illegible]

ادبیات

قطعۂ

رحلت سراپا حسرت جناب مولوی سید محمد عاشق وارثی مرحوم ایڈوکیٹ و صدر مسلم لیگ گیا

از حضرت مبارک عظیم آبادی

عاشقِ وارثی نے رحلت کی
یہ وہ تھے جان قوم و ملت کی
سید مستند رئیس گیا
ایڈوکیٹ نامی و یکتا
اٹھ گیا وہ مشیر قانونی
داوری گاہ ہو گئی سُونی
قوم و ملت کے جانثار تھے وہ
مردِ میدان کارزار تھے وہ
خیرکن، خیرخواہ، خیراندیش،
حامیٔ بیکساں حمایت کیش
کہہ رہی ہے یہ شانِ مسلم لیگ
تھے گیا میں یہ جانِ مسلم لیگ
صدر وہ یادگارِ مسلم لیگ
صدر وہ نوبہارِ مسلم لیگ
جس طرف دیکھو ان کا ماتم ہے
بڑے غمخوار قوم کا غم ہے
کر مبارک یہ سال فوت رقم
چل بسے آہ آج باغِ ارم

۱۳۵۹ھ

قطعۂ گل تعزیت

از علامہ فضل حق آزاد عظیم آبادی

زبانِ حال سے کہتی ہے مرگ بے ہنگام — نہ دل لگائے کوئی ہوشمند دنیا سے
جنازہ آہ یہ کس مست ناز کا اُٹھا — لیے ہیں ہات میں حوریں بھرے ہوئے کاسے
مقامِ خوف نہیں بندگانِ حق کے لیے — ٹپک رہا ہے یہی خالدین فیہا سے
وکیل زمزمہ سنج گیا عمیم الخلق — اُتار لاتے تھے مضموں جو عرشِ اعلیٰ سے
وہ بے گناہوں کے حق میں پیمبر تھے حق تو یہ ہے — بحقِ خلقِ خدا کم نہ تھے مسیحا سے
دریغ و درد وہ آہو خرام عاشق نام — سنِ وفات عیاں ہے "غزالِ رعنا" سے ۱۳۵۹ھ
خیال اِن کی جو دریا دلی کا آتا ہے — کلائی کرتے ہیں آنسو نکلکے دریا سے
اِک ابرِ فیض تھا آزاد کر گیا سیراب — رہیں جو شربتِ دیدار کے رہے پیاسے
یہ ہیں یہاں کے تماشے یہ ہے یہاں کی ریت — پلک جھپکتے ہیں کیا کچھ ہوا یہاں کیا سے

قطعہ تاریخ

انتقال پر ملال مولوی سید محمد عاشق وارثی ایڈوکیٹ گیا

(در صنعت تعمیہ)

از حضرت رسا ہمدانی گیاوی ایم۔ اے

جاں صدقہ کرکے یہ نعمت ملی — وہ اجازت پاکے وارث سے ملا
از سرِ آہ و الم لکھا رسا — آج عاشق جاکے وارث سے ملا

۱۳۵۷
۲
سنہ ۱۳۵۹ھ

نورِ خدا معشوق محمد عاشق

۱۹۴۰

ازجناب ابومحمد سید حسن امام صاحب ورثیؔ رئیس گیا

محمد عاشق نامی گرامی ؎ | وکالت پیشہ و سردار مسلم
نکو فرزند خیل جاجنیری | بمشرب "وارثی" بودست دایم
بروز شنبہ وقت ظہر ہیہات | بملک جاودانی گشت عازم
شب معراج شد تجہیز و تکفین | تفاول نیک ازیں طالع است لازم
یک و سی از اگست عیسوی بود | ہزار و نہ صد و چل سال با دم
اعزا اقربا احباب و ملت | ہمہ بیتاب گشتہ ہیچو راقم

حسن شاید کہ می یابد "جہان" را
محمد عاشق و معشوق مسلم

۱۳۵۵ + ۱۰۴ = ۱۳۵۹ ھ

قطعہ تاریخ

ارتحال حضرت احسنؔ مارہروی مرحوم

ازجناب ابومحمد سید حسن امام صاحب ورثیؔ رئیس گیا

حضرت احسنؔ فصیح الملک آں یادگار | داشت مارہرہ وطن بود فخر روزگار
بست و پنجم از رجب آدینہ وقت سعید | در عظیم آباد رحلت کرد آں فرد فرید
در شب معراج مارہرہ بآغوشش گرفت | مرحبا کے مرداں گوئید برایں اوج بخت

از سر امید گفتم اے حسنؔ زیبا تراست
با علی احسن بود ایزد دہد باغ بہشت

۱۱۰ + ۱۱۹ + ۱۶۱۰ = ۱۹۳۹ + ۱ = ۱۹۴۰ء

۱؎ — مارہرہ یا میری نہ از خاندانش بسے سادات کرام ہستند ۱۲

قطعۂ تاریخ

ارتحالِ پُرملال ومحن حضرت حافظ سید علی احسن صاحب احسن مارہروی مبرور

از حضرت مبارک عظیم آبادی

اللہ اللہ خاک مارہرہ کی مردم خیزیاں ... کیسے کیسے اٹھے اسکی خاک سے اہل قلم
تھے انہیں اہل قلم میں احسن مارہروی ... یعنی تھی ذات الکمالات انکی ذات مغتنم
اٹھ گیا افسوس دنیائے ادب سے وہ ادیب ... نقش بر دیوار یہ ہے اور وہ تصویر غم
خوبیاں تھیں انگنت ان میں محاسن بے شمار ... احسن احسن تھے کہاں سے لائیں اب احسن کو ہم
ہائے کیا شاگرد تھے یہ کیا لقب انکو ملا ... "دوست" لکھا ہے انہیں استاد نے وہ محترم
حق شاگردی کیا احسن نے تا امکان ادا ... "یادگار داغ" کی ترتیب تھی کار اہم
پھر سوانح داغ کے لکھے "شبیہہ داغ" نام ... پھر کیا "نثر فصیح الملک" کا ساماں بہم
چھاپنے والے تھے جلد از جلد مکتوبات داغ ... تھا امیر و داغ کا مضمون بھی زیب رقم
نا مرتب رہ گیا دیوان بھی احسن کا آہ ! ... آ گیا ہنگام رخصت چل بسے باغ ارم
خواجہ تابش ایسے بڑے مخلص بڑے مخلص نواز ... ان مراسم کو برس چالیس گذرے بیش و کم
ہائے رے اشفاق انکے ہائے رے انکا خلوص ... ہائے رے صدق و صفا مہر و وفا لطف و کرم
اب محبت نامے مارہرہ سے کس کے آئینگے ... اب کرینگے نامۂ اخلاص ہم کس کو رقم
دل بھر آتا ہے ٹپک جاتے ہیں آنسو بار بار ... آ رہے ہیں یاد احسن کے مراسم دمبدم

اشک ریزاں سال رحلت یہ مبارک نے کہا
انتقال احسن مارہروی عالی ہمم

۱۳۵۹ھ

کلامِ محوی

از پروفیسر مولانا محوی صدیقی لکھنوی

آیئے معجزۂ عشق کو عریاں کر دیں
ذرے ذرے کو جمالِ رخِ جاناں کر دیں

زندگی کے لئے پیدا رہِ امکاں کر دیں
دل میں ہم شمعِ محبت کو فروزاں کر دیں

کیوں نہ ہم عشرتِ جاوید کا ساماں کر دیں
کیوں نہ ہم دل کو نثارِ غمِ جاناں کر دیں

نہ رہے گا یہ قفس اور نہ نوائے صیاد!
دل میں جو آگ ہو گر اس کو نمایاں کر دیں

دلِ ناکام ہے اور حسرتِ آزادیٔ ہند
آگیا وقت کہ برپا کوئی طوفاں کر دیں

فطرتِ بندۂ مومن کا بدلنا ہے محال
لاکھ وہ نذرِ اجل داخلِ زنداں کر دیں

شیوۂ ضبط سے گر رخصتِ گریہ مل جائے
قطرۂ خونِ جگر زینتِ مژگاں کر دیں

دور کر جلوۂ ماضی رخِ زیبا سے نقاب
تاکہ ہم اپنے شبستاں میں چراغاں کر دیں

بحر و بر ابر و ہوا پھر ہوں ہمارے محکوم
آکہ زندہ روشِ عزمِ سلیماں کر دیں

دل کی دنیا پہ جو چھائے ہیں یہ غم کے بادل
نورِ باطن سے انھیں کیوں نہ گریزاں کر دیں

دیکھ لے حوصلۂ ذوقِ جنوں پھر دنیا
چاکِ افسردگیٔ دل کا گریباں کر دیں

ہمتِ عشق بنا دیتی ہے بگڑے ہوئے کام
ہم جو چاہیں تو بیاباں کو گلستاں کر دیں

نازشِ انجمنِ دہر ہے شمعِ امید
لاؤ ظلمت کدۂ دل کو درخشاں کر دیں

عشقِ بیتاب مرا آپ کا حسنِ بیباک
دل میں جو آئے وہ یہ فتنۂ دوراں کر دیں

خلشِ بیم و رضا کیوں رہے محوی باقی
کیوں نہ دل کو رہِ مقصود میں قرباں کر دیں

رباعیات شاکر

از جناب پیارے لال شاکر میرٹھی

دل کو جو تھی مرغوب ادب کی خدمت
تو بن گئی محبوب ادب کی خدمت
دیکھا جو زبوں حال ضعیفی نے کہا
کی آپ نے کیا خوب ادب کی خدمت

کرتا ہی رہا خوب ادب کی خدمت
بیحد تھی خوش اسلوب ادب کی خدمت
اس عمر میں آ کر کھلا مقسوم کا کھوٹ
ہوں اب ترا معتوب ادب کی خدمت

تھا زندگی کا دور ادب کی خدمت
کی میں نے بہر طور ادب کی خدمت
گھر پھونک کے عبرت کا تماشا دیکھا
ہے اس کے سوا اور ادب کی خدمت!

تا عمر گھٹا چھائی رہی کلفت کی
صورت نظر آئی نہ کبھی راحت کی
اندیشۂ فردا نے نہ چھوڑا اک روز
کیا خوب ہے خوبی یہ مری قسمت کی

نیرنگیِ افلاک نہ کیا کیا دیکھی
دنیا میں رہا پھر بھی نہ دنیا دیکھی
خدمت میں ادب کی جو گنوا دی سب عمر
اب روتا ہوں تقدیر کو دیکھا دیکھی

دل بجھ گیا دل کے داغ اب تک نہ بجھے
آثارِ بہارِ باغ اب تک نہ بجھے
لو ہو بھی گئی شبِ جوانی آخر
محفل کے مگر چراغ اب تک نہ بجھے

ہشیار ہو شاکر کہ تو پچھتائے گا!
کیا روز کے غم سے ترے ہاتھ آئیگا
ہنس کھیل کے جس طرح جوانی گزری
رو رو کے بڑھاپا بھی گذر جائے گا

کلامِ آزاد

از مولانا آزاد سبحانی

جو آگ دل میں نہاں تھی وہ اب عیاں ہوگی — جو آگ دل کی تھی وہ آتش جہاں ہوگی

اٹھے گا غلغلہ زیر فلک چو نفخۂ صور — کہانی اپنی نئے طرز سے بیاں ہوگی

نیا بنے گا طریق بیان حالتِ دل! — خموشی سیرِ حقیقت کی ترجماں ہوگی

جفا بنے گی وفا اور قضا پیامِ حیات — کچھ اس ادا سے ادا انکی مہرباں ہوگی

وہ بو جو بند تھی ابتک حصارِ غنچہ میں — سنا ہے بلبلِ خستہ سے پرفشاں ہوگی

اٹھائے جائینگے ذرے بھی آفتابوں تک

زمین عجز و مذلت بھی آسماں ہوگی

اِک معمہ ہے یہ انساں کیا ہے

(از حضرت رسا ہمدانی گیاوی۔ ایم۔ اے)

یہ نظم ماہر رموز سخن اخی المعظم سید حسن امام صاحب حسن وارثی باتقابہ کی فرمایش پر سر الکزنڈر پوپ کی انگریزی نظم "ESSAY IN MAN" سے ترجمہ کرکے مثنوی کی بحر میں لکھی گئی ہے۔ ترجمہ حتی الامکان لفظی اور بامحاورہ ہے۔

رسا ہمدانی

حق کو پہچاننا آساں نہیں — کیا معمہ ہر اک انسان نہیں؟
پہلے اُس سے کہ خدا کو جانے — آپ کو تو یہ بشر پہچانے!
ابتدا کی نہ خبر ہے اُس کو — انتہا کی نہ خبر ہے اُس کو
جانتا خود کو بڑا عاقل ہے — فخر اُس کا ہے کہ وہ کامل ہے
علم پر اپنے غرور اِس کو ہے — فلسفہ پر بھی عبور اُس کو ہے
کبھی وہم اِس کو سوا ہوتا ہے — کبھی بندے سے خدا ہوتا ہے
کبھی انساں سے بھی بڑھ کر ہے — کبھی حیوان سے یہ بدتر ہے
کبھی مصروف ہر اک کام میں ہے — کبھی یہ چین سے آرام میں ہے
کبھی جسمانی غرور اُس کو ہے — کبھی روحانی غرور اُس کو ہے
ایک دن اُس کو مگر مرنا ہے — اِس کی فطرت میں خطا کرنا ہے
اِس کی خصلت میں ندامت بھی ہے — اِس کی مشہور جہالت بھی ہے
باکمال آپ کو یہ جانتا ہے — خوش خصال آپ کو یہ جانتا ہے
خواہشوں میں یہ اُلجھ پڑتا ہے — کاہشوں میں یہ اُلجھ پڑتا ہے
آپ ہی آپ یہ حیران ہے کبھی — آپ ہی آپ پریشان ہے کبھی
کبھی اپنے سے لِئے شکوا ہے — کبھی روتا ہے کبھی ہنستا ہے
حد سے اپنی کبھی بڑھ جاتا ہے — آسماں پر کبھی چڑھ جاتا ہے
کبھی نخوت ہے خود آرائی ہے — کبھی پستی ہے جبیں سائی ہے
کبھی مخلوق کا یہ افسر ہے — کبھی شیطان سے یہ بدتر ہے
غلطی پر غلطی کرتا ہے مگر — پھر بھی انصاف کا دم بھرتا ہے
کبھی یہ فخر جہاں ہوتا ہے — آبرو اپنی کبھی کھوتا ہے

اے رسا پوپ نے یوں لکھا ہے
اک معمہ ہے یہ انساں کیا ہے

جذباتِ قیس

از جناب جی۔ آر قیس شیخوپوری

نگاہِ لطف سے وہ دیکھتے ہیں مجھکو محفل میں
کمی باقی ہے کچھ شاید ابھی بربادیٔ دل میں

کسی سے ہو کے وابستہ پڑی ہے جان مشکل میں
نہ مرنے ہی کی رخصت ہے نہ جینے کی ہوس دل میں

مرا ذوقِ سکوں پروردۂ آغوشِ طوفاں ہے
مجھے آرام مل سکتا نہیں آغوشِ ساحل میں

میں خود سوزِ نفس سے اک نئی دنیا بنا لونگا
ابھی چنگاریاں باقی ہیں کچھ خاکسترِ دل میں

نہ رنگِ عشق ہی بدلا نہ خوئے حسن ہی چھوٹی
غضب کی ٹکریں ہوتی رہیں طوفان و ساحل میں

مرا ذوقِ عمل ہے لفظ ناکامی سے مستغنی
بھلا بیٹھا ہوں میں مقصد کو جوشِ سعیٔ باطل میں

جہاں بینی ہے مشکل تر بقول شاعرِ مشرق
جگر کا خون پانی ہو تو پیدا ہو نظر دل میں

عجب اک ہو کا عالم عبرت افزائے نظارہ ہے
نہ مجنوں اپنے صحرا میں نہ لیلےٰ اپنے محمل میں

ضرورت عشق میں کیوں ہو مجھے عرضِ تمنا کی
تری آنکھوں سے ظاہر ہے نہاں ہے جو مرے دل میں

مرے سوزِ نفس سے ہے چراغاں عالمِ ہستی
مثالِ شمعِ محفل ہوں فروزاں تیری محفل میں

مرا ذوقِ قدم ہی قیس ہے خود ہادیٔ منزل
ضرورت کیوں مجھے ہو راہبر کی راہِ منزل میں

نئی کتابیں

جنگ آلودہ دنیا (۱۴ نقشے مع چارٹوں کے)

مرتبہ جناب وینکٹیش نارائن تواری، پبلشر انڈین پریس لمیٹڈ الٰہ آباد
۱۶۰ صفحے: لکھائی چھپائی اچھی، قیمت درج نہیں۔

یہ گرچہ ایک مختصر سی کتاب ہے، مگر اس میں تازہ معلومات کا ایک خزانہ اکٹھا کر دیا گیا ہے، اس میں پہلے دنیا کے ہر بڑے ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال کو سمجھایا گیا ہے، موجودہ حالات کیونکر پیدا ہوئے، انکی تفصیلات ہیں، ایک ملک کے دوسرے سے کیا سیاسی تنازعات ہیں، ان کو دکھایا گیا ہے۔ ہر ملک کی برسر اقتدار حکومت کی خواہشات مختلف ملکوں سے متعلق کیا ہیں، انہیں دکھایا ہے۔ کتاب کا پہلا باب "جنگ کے اہم واقعات" ہے۔ پھر "دنیا میں سامراجوں کی تقسیم"۔ اس کے بعد ہندوستان کے مختلف سیاسی مسائل و نظریات ہیں۔ پھر یورپ کا بیان آتا ہے۔ اور بلا استثنا ہر ملک پر علیحدہ علیحدہ اختصار و جامعیت سے نظر ڈالی گئی ہے۔ اسی طرح افریقہ، ایشیا کے مختلف ملکوں کا ذکر کیا ہے۔ مختلف براعظموں کے سیاسی مسائل پر نظر ڈالی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہر ملک کا جداگانہ نقشہ، اور ان کے مختلف مسائل کے لحاظ سے ان کی جداگانہ تقسیم دکھائی گئی ہے۔ مجموعی طور پر اہم جغرافی نقشے ہیں۔ اسکے بعد مختلف چارٹ اور صفحے ہیں، جن میں مختلف ملکوں کی فوجی طاقت، معاشی حالات، تجارتی مسائل، و اعداد و شمار غیر معمولی اہتمام سے یکجا کئے گئے ہیں۔ اردو دانوں کیلئے اس کتاب کے مطالعہ سے موجودہ جنگ کا سمجھنا اتنا آسان ہوگا کہ وہ کسی دوسرے ذریعے سے یہ آسانی حاصل نہیں کر سکتے۔

انڈین پریس شکریہ کا مستحق ہے کہ اس نے ایسی جامع کتاب مہیا کی کیا اردو میں بھی پیش کی۔ کتاب کی قیمت افسوس کہ درج نہیں، غالباً ۱۲ یا ۱ہ ہو۔ اگر دو ڈھائی روپے بھی اسکی قیمت رکھی جاتی تو افادی حیثیت سے یہ رقم زیادہ نہ ہوگی امید ہے کہ ناظرین اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

مصر کی رقاصہ

از جناب احمد شاہ بخاری، ایم اے کینٹب،
۴۸۲ صفحے، فلسکیپ سائز، ناشر ہاشمی بک ڈپو، لوہاری دروازہ، لاہور

اناطول فرانس کا شہرۂ آفاق ناول "تائیس" کسی تعارف کا محتاج نہیں، دنیا کی ہر زندہ علمی زبان میں اس کا ترجمہ کیا جا چکا ہے۔ اردو میں بھی اس کے دو ترجمے شایع ہو چکے ہیں۔ موسیو گیلے نے اس ناول سے اخذ کر کے ایک ڈرامہ اوپرا "(OPERA)" تیار کیا تھا۔ اور اس کا شمار بھی کلاسیکل کتابوں میں کیا جاتا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اس کا ترجمہ اردو کے مشہور اہل قلم پطرس نے "مصر کی رقاصہ" کے نام سے کیا ہے۔ ترجمہ میں مترجم کا زور قلم اپنی تمام خصوصیات اور پوری لطافت کیساتھ موجود ہے۔ ترجمہ کی صحت، صفائی، شستگی اور لطافت کیلئے لائق مترجم کا نام کافی ہے۔ جناب پطرس کی یہ تحریر ایک مدت کے بعد نگاہوں کے سامنے آئی ہے۔ امید ہے کہ اہل ذوق قدردانی سے کام لیکر اس کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

تحفۂ ربیع الاول

(اسلام کی حقیقت) از جناب ابوظفر محمد بدر الدین خاں صاحب بی اے (آنرز) سب جسٹرار۔ حجم ۴۰ صفحے، تقطیع چھوٹی
قیمت ۴ر، پتہ: مسٹر جناب بدر الدین خاں صاحب سب جسٹرار
مقام و ڈاکخانہ بہیڑہ۔ ضلع دربھنگہ

"تحفۂ ربیع الاول" یا "اسلام کی حقیقت" کو مجلس میلاد میں پڑھنے کیلئے ایک بصیرت افروز مقالہ کے طور پر ترتیب دیا گیا ہے۔ جسمیں آنحضرت صلعم کی سیرت پاک اور آپکی پاکیزہ تعلیمات بیان کی گئی ہیں، اور آپکی دعوت کو تشریح پیش کیا گیا ہے، کتاب گیارہ بابوں میں منقسم ہے۔ پہلے بعثت رسول کی ضرورت دکھائی گئی ہے۔ پھر سرسری سوانح پاک اور آپکی دعوت تعلیمات کا ذکر، پھر دکھایا ہے کہ اسلام کے ذریعہ دنیا میں روحانی و تمدنی ترقیاں کیونکر وجود میں آئیں۔ اور اسلامی تہذیب کے اثرات یورپ پہ کیا مترتب ہوئے۔ جا بجا یورپین مورخین کے خیالات اور انکی رایوں پر نقد کیا گیا ہے۔ اس رسالہ کا مطالعہ مفید ہوگا۔

بڑے دواخانہ کے چند مشہور مرکبات

١ **اکسیر ریّہ**:۔ کھانسی، نزلہ، زکام اور امراض تنفس کی بے نظیر دوا۔ قیمت فی خوراک ۲ر

٢ **حیامیٹ**:۔ جریان، سیلان اور کمزوری کی تیر بہدف دوا قیمت فی شیشی عہ ر

٣ **حیات آفریں**:۔ سل، دق، کھانسی اور جسمانی کمزوری کی لاثانی دوا ،، ،، عہ ر

٤ **شاہی سالسہ**:۔ خون کی صفائی اور پھوڑے پھنسی کی لاجواب دوا ،، ،، حہ ر

٥ **روح جگر**:۔ معدہ، آنتوں، جگر اور دائمی قبض کی بے مثل دوا ،، ،، حہ ر

نوٹ:۔ بڑے دواخانہ میں عالیجناب فسر الاطباء، ڈاکٹر حکیم محمد علی صاحب قریشی مریضوں کا معائنہ بالکل مفت کرتے ہیں۔

المشتہر

منیجر۔ بڑا دواخانہ (گرانڈ فارمیسی) نمبر ۲۶ ذکریا اسٹریٹ
(کنا پی سیل اسٹریٹ کی جانب) ٹیلیفون بڑا بازار نمبر ۵۲۰۷ کلکتہ

آئین ندیم

۱- ندیم ہر ماہ کے اخیر ہفتہ میں شائع ہوتا ہے۔
۲- اگر کسی خریدار کے پاس ڈاکخانہ کی غفلت سے کسی مہینہ کا پرچہ نہ پہنچے تو اسکی اطلاع دوسرے مہینے کی دس تاریخ تک دفتر میں بھیج دینی چاہئے۔ ورنہ رسالہ بقیمت روانہ ہوگا۔
۳- ندیم کا سالانہ زرچندہ مبلغ چار روپئے اور ششماہی دو روپئے چار آنے ہے۔
۴- ندیم میں ہر ماہ ۹۶ صفحے مضامین کیلئے وقف ہوتے ہیں۔ اشتہاروں کے صفحوں کا شمار علیحدہ ہے۔
۵- ندیم کے ۹۶ صفحے معنوی طور پر تقریباً چار حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ ایک حصہ میں بصیرت افروز علمی وتحقیقی نئے عنوان ومباحث سے لبریز مضامین ہوتے ہیں۔ اور ایک حصہ میں تاریخی وادبی آثار دلچسپ منظومات وغزلیات اور ذہن میں جلا پیدا کرنے والی تنقیدیں چھپتی ہیں بقیہ دو حصے یعنی ہر ماہ کے نصف پرچہ میں افسانے ہی افسانے رہتے ہیں۔ جن میں گل وبلبل کی دلچسپ داستانیں حسن وعشق کی وارداتیں انوکھے اور مزہ لینے والے انداز میں بیان کی جاتی ہیں لطیف احساسات وجذبات کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ تعلیمی معاشرتی، اصلاحی اور سیاسی خیالات ونظریات دلچسپ پیرایہ اور رنگین انداز بیان میں پیش کئے جاتے ہیں۔
۶- نمونہ کے پرچے کے لئے پانچ آنے کے ٹکٹ روانہ کئے جائیں ورنہ تعمیل ارشاد معاف۔
۷- جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ روانہ کریں ورنہ جواب کا ہرگز انتظار نہ فرمائیں۔

منیجر ندیم گیا



رسالہ ندیم گیا کے ارکانِ دوامی

حسب ذیل اہل ذوق اب تک رسالہ ندیم گیا کی دوامی رکنیت قبول فرما چکے ہیں

(۱) جناب نواب سید عبد العزیز صاحب صدر المہام عدالت و امور مذہبی ممالک محروسہ سرکار عالیہ حیدر آباد دکن
(۲) خان بہادر نواب سید شاہ واجد حسین صاحب ایم۔ اے۔ سی خسرو پور
(۳) جناب سید حسن امام صاحب وارثی رئیس گیا۔
(۴) جناب آنریبل سید حسین امام صاحب ممبر کونسل آف اسٹیٹ
(۵) جناب سید مظہر علی امام صاحب حسنین منزل۔
(۶) جناب سید ابو العاص صاحب نبیل ابو العاص لین پٹنہ۔
(۷) جناب سید شاہ محمد باقر حسین صاحب آف خسرو پور
(۸) جناب سید علی حیدر صاحب گیا۔
(۹) جناب سید شاہ حسین سجاد صاحب رئیس بہار شریف
(۱۰) جناب مولوی سید محمد ایوب صاحب آبگلوی۔
(۱۱) جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدر آباد۔
(۱۲) جناب خان بہادر حاجی چودھری شیخ محمد بخش صاحب رئیس کٹھیار۔
(۱۳) جناب خان بہادر حبیب الرحمن صاحب رئیس رانچی
(۱۴) جناب پروفیسر سید مظفر الدین صاحب ندوی ایم۔ اے کلکتہ
(۱۵) جناب ڈاکٹر سید اختر حسن صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ال
(۱۶) جناب سید شاہ رحمت اللہ صاحب ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر
(۱۷) جناب سید عبد الجلیل صاحب انسپکٹر اکسائز۔
(۱۸) جناب خواجہ غلام احمد صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ال۔ گیا
(۱۹) جناب مولانا سید محمد طٰہٰ صاحب اختر امتھوی۔
(۲۰) جناب مولوی عبد الکریم صاحب آزاد بھاگلپور
(۲۱) جناب مولوی محمد جمال صاحب ندوی گیا
(۲۲) جناب محمد حبیب الحسن صاحب عظیم آبادی کلکتہ
(۲۳) جناب سید رضا قاسم صاحب مختار پلاموں
(۲۴) جناب سید آفتاب احسن صاحب ایم۔ ایس سی حیدر آباد۔
(۲۵) جناب ڈاکٹر سید احمد امام صاحب گیا۔
(۲۶) جناب سید شاہ ذکا حسین صاحب رئیس بہار شریف پٹنہ
(۲۷) جناب غلام ربانی صاحب رئیس نوادہ۔ پوسٹ نوادہ گیا
(۲۸) جناب ڈاکٹر مطیع الرحمن صاحب نئی سرائے بہار شریف پٹنہ

طریقہ قبول رکنیت، صرف پچیس روپے یکمشت روانہ فرمائیں۔ رسالہ تاعمر مفت حاضر خدمت ہوگا اور مکتبہ ندیم کی مطبوعات نصف قیمت پر۔

منیجر ندیم گیا

صاحبان! میں یہ اشتہار دیتا ہوں کہ میں نہ ڈاکٹر بلکہ ایک معمولی آدمی ہوں۔ بدقسمتی سے مجھے اپنے ہاتھوں اپنی جوانی کا ستیاناس کرنے والی عادت پڑ گئی تھی جس کے نتیجہ میں بالکل بے خبر تھا۔ ڈیڑھ سال کے بعد مجھے نامردی کا نامبارک مرض لاحق ہو گیا۔ سرعت، جریان، احتلام وغیرہ کی بے انتہا شکایتوں کے سبب میرا چہرہ دن بدن لاغر اور زرد ہوتا جاتا تھا۔ دیکھو دل ہر وقت دھڑکتا رہتا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آتا۔ گھبراہٹ، سستی اور اداسی چھائی رہتی تھی۔ دوست احباب میری پژمردگی کا سبب پوچھتے تھے مگر میں کہ اپنی حالت سے آگاہ کرتا سب یہ سمجھتا تھا۔ بڑے بڑے مشہور شہروں کے بڑے بڑے ڈاکٹروں اور حکیموں سے رجوع کیا۔ لمبے چوڑے اشتہاروں کی کوئی مدد نہ دی۔ ادویات استعمال کرتا رہا لیکن مجھے بالکل خاک بھی فائدہ نہ ہوا۔ غرضیکہ کئی اور حکیموں کا سامنا کرکے بھی مایوس ہی رہنا پڑا۔ ... آخر خوش قسمتی سے مجھے ملازمت کے ایک سلسلہ میں پشاور جانا پڑا۔ پشاور سے ... جاکر ... وہاں ایک فقیر خضر صورت ... مجھ سے پوچھنے لگے کہ تم اداس اور تمہاری صورت رنجیدہ کیوں ہے؟ میرے پُر درد دل نے اس خضر صورت اور کامل سنیاسی سے اپنا سارا دکھ درد کہہ ڈالا ... کی ہدایت کی۔ چنانچہ میں نے یہی کہا کہ اب میں زندگی سے تنگ آکر خودکشی کرنے پر آمادہ ہوں۔

اس فقیر صاحب کمال نے ... میرے حال زار پر ... فرما کر ایک نسخہ کھانے کیلئے مقوی گولیوں کا اور دوسرا نسخہ رگوں اور پٹھوں کی سستی دور کرنے کیلئے مالش کا بتایا۔ چنانچہ میں نے حسب ارشاد ... صاحب کمال کے ... اجزاء جڑی بوٹیاں اور کئی ادویات بازار سے خرید کر ... اس صاحب کمال کے تیار کرکے ... کرنا شروع کیا! **ناظرین! میں حق ... کو حاضر و ناظر جان کر سچ کہتا ہوں** ... میری تمام شکایتیں رفع ہونی شروع ... اور میں اپنے آپ کو قابل فخر ... مستحق ہو گیا۔ اگرچہ مجھے چند ہی ... کے استعمال سے ... دشوار ہو گیا۔ مگر بموجب ارشاد اپنے محسن ... سنیاسی کے **اکیس روز** ... علاج جاری رکھنا پڑا۔ میں ہر روز تین سیر سا ... دودھ یا ساتھ ہی ہضم کر لیتا تھا۔ ... طاقت ... ایسا قابل فخر مرد بن گیا ہوں کہ جس کے بیان کرنے کی تہذیب اجازت نہیں دیتی۔ ... تجربہ کیا تو ... سستی، جریان، احتلام، سرعت وغیرہ کے لئے اکسیر سے بڑھ کر پایا۔ پھر ... فائدہ ... مد نظر رکھتے ہوئے یہ اشتہار بغرض رفاہ عام دیا جاتا ہے کہ جو صاحب ... اور قبیح عادت ... ہوں اور ... علاج ... صرف کرکے مایوس ہو چکے ہوں وہ اس قلیل القیمت اور سریع الاثر دوائی کو ... اور ... خرچ اشتہار ... کرتی ہے۔ فائدہ بہت ...

قیمت مقوی گولیاں فی شیشی جس میں ... ۴۲ خوراک موجود ہے صرف دو روپیہ ۸ ...

قیمت روغن مالش طلا جو ۲۱ روز تک ... رگوں اور پٹھوں ... کافی ہے ... فی شیشی دو روپے آٹھ آنے ...

... گولیاں ... مفید ہیں ... روغن مالش طلا سے کسی قسم کی پھنسی یا آبلہ ہرگز نمودار نہ ہوگا۔

اس دوائی میں ... جوان اور بوڑھا ... ان گولیوں کا استعمال کر سکتا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس دوائی کے استعمال کے بعد دوبارہ کسی دوائی کی ضرورت نہ رہے گی۔ آخر میں یہ بھی ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اشتہار کے نکالنے سے میری کوئی ذاتی غرض نہیں ہے اور نہ ہی میرا مدعا محض اشتہار شائع کرکے پبلک سے روپیہ کمانے کا ہے بلکہ ہر خاص و عام کا فائدہ مد نظر رکھ کر احباب کے اصرار پر اشتہار شائع کیا جا رہا ہے۔ تندرست اور شوقین احباب بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ کیونکہ اس کے استعمال سے سستی سے چستی اور ... سے طاقت ... جاتا ہے اگر بڑھاپے میں بھی ... جوانی اٹھانا چاہتے ہیں۔ ... گولیوں اور روغن مالش طلا کا استعمال کریں کیونکہ اس کے استعمال سے بدن میں خون صالح پیدا ہو جاتا ہے۔ الغرض جب تمام ... ہو گیا ہو تو ان کا استعمال کریں اور فائدہ اٹھائیں۔ ... دکھوں کا تمام دنیا کی دواؤں ... عجیب و غریب ... ہے۔

نیز عورتوں کی جوانی قائم رکھنے کے لئے ۔ جو عورتیں مردوں کی طرح جریان الرحم یا اخراج رطوبت یعنی لیکوریا جیسے خطرناک امراض میں مبتلا ہوں ... مقوی گولیاں ازحد مفید ہیں۔ ضرورت مند اصحاب تجربہ کریں۔ مکمل پرچہ ترکیب ہمراہ دوا ہوگا۔ محصول ڈاک ... علاوہ ... خط و کتابت پوشیدہ رکھی جاتی ہے۔

خاص نوٹ } دوا اصحاب جو ہم سے دوائی منگا کر استعمال کریں۔ اخبار کا حوالہ ضرور دیں۔ کیونکہ کئی اصحاب نے پیشہ اختیار کر رکھا ہے کہ ہم سے دوائی منگا کر زیادہ قیمت پر فروخت کرتے ہیں۔ لہٰذا فقیر خضر صورت سنیاسی کے قول کے مطابق اس کی کمائی کھانا گناہ ہے۔ ... آرڈر دیتے وقت اپنا پتہ صاف اور خوشخط لکھیں۔

غیر ممالک سے قیمت پیشگی۔

ضروری اطلاع

... کہ میری دوائی صرف نامردی، سستی، جریان، احتلام، سرعت، کمزوری اور لاغری اور جریان الرحم و لیکوریا کے لئے ... کا استعمال ...

شرطیہ علاج اور شرطیہ عدہ

... مسلمان ... دوائی کے استعمال ... تیر بہدف ...

نیز دار الشفاء گولیاں رجسٹرڈ ... اسٹاک ... پنجاب

بڑے دواخانہ چند مشہور مرکبات

۱ **اکسیریہ** کھانسی۔ نزلہ۔ زکام اور امراض شکم کی بے نظیر دوا۔ قیمت فی خوراک ۲؍

۲ **حیامیٹ**: جریان۔ سیلان اور کمزوری کی تیر بہدف دوا قیمت فی شیشی عہ؍

۳ **حیات آفریں**: سل۔ دق کھانسی اور جسمانی کمزوری کی لاثانی دوا " " عمہ؍

۴ **شاہی سالسہ**: خون کی صفائی اور پھوڑے پھنسی کی لاجواب دوا " " حعہ؍

۵ **روح جگر**: معدہ۔ آنتوں۔ جگر اور دائمی قبض کی بے مثل دوا " " حہ؍

نوٹ: بڑے دواخانہ میں عالیجناب افسر الاطباء، ڈاکٹر حکیم محمد علی عباس چشتی مریضوں کا معائنہ بالکل مفت کرتے ہیں۔

المشتہر

منیجر۔ بڑا دواخانہ (گرانڈ فارمیسی) نمبر ۲۶۔ ذکریا اسٹریٹ
(کنائی سیل اسٹریٹ کی جانب)، ٹیلیفون بڑا بازار نمبر ۵۳۰ کلکتہ

صوبہ بہار کے اسکولوں و کالجوں میں ۱۹۳۰ء سے منظور شدہ

رسالہ ندیم گیا

قیمت سالانہ للعہ
قیمت فی پرچہ ۵ر

ششماہی ۱ع
پرچہ ۵ر

مرتبہ: سید ریاست علی ندوی

جلد ۱۴ | ماہ رمضان المبارک ۱۳۵۹ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۴۰ء | نمبر ۴

	عنوان	مضمون نگار	صفحہ
نظرات		سید ریاست علی ندوی	۱۹۵ - ۱۹۷
مقالات	نواب اعتماد الدولہ کامگار خاں	جناب حکیم محمد نقی صاحب ہسوی	۱۹۸ - ۲۰۲
	بیگمات اودھ	جناب پیارے لال صاحب شاکر	۲۰۳ - ۲۰۹
افسانہ ومحاضرات	تبدیلی	جناب شاہ مقبول احمد صاحب کاشف ایم اے	۲۱۰ - ۲۱۴
	نرالی دنیا	جناب مرزا فدا علی صاحب خنجر لکھنوی	۲۱۵ - ۲۲۵
	ماڈل ویلج	جناب الیاس صاحب اسلام پوری	۲۲۶ - ۲۲۹
	من کی چاہ	جناب سعید الحق صاحب عاشق دسنوی بی اے	۲۳۰ - ۲۳۵
	بت پرست	جناب رفعت صاحب ہاشمی	۲۳۶ - ۲۳۸
	سرگوشی	جناب انسہ نسیمہ سوز	۲۳۹ - ۲۴۰
	گھنٹہ نہیں بجے گا	جناب سید صلاح الدین صاحب متعلم جامعہ	۲۴۱ - ۲۴۳
	کامڑیڈ ہرش	سید علی مظفر امام آبگلوی	۲۴۴ - ۲۴۶
آثار علمیہ وادبیہ	محترمہ ساوت کپلو کے چند خطوط		۲۴۷ - ۲۴۹
ادبیات	تبرکات آزاد	جناب علامہ فضل حق آزاد عظیم آبادی	۲۵۰
	موج طوفاں	حضرت نوح ناروی	۲۵۱
	زمزمۂ تازہ	حضرت سریر کابری مینائی	۲۵۲
	مری مطربہ چھیڑ دے پھر ترانہ	حضرت صبا رشیدی ایم اے	۲۵۳
	کلام نجم	جناب نجم ندوی بی اے۔ مترجم پٹنہ ہائیکورٹ	۲۵۴
تقریظ وانتقاد	بہار نمبر کو دیکھ کر	حضرت سریر کابری مینائی	۲۵۵
نئی کتابیں		ر	۲۵۶ - ۲۵۷

[illegible]

نظرات

افسوس کہ مولانا ابوبکر محمد شیث صاحب فاروقی ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے ۲۵ ستمبر ۴۰ء کو اس دار فانی کو الوداع کہا، مولانا مرحوم جونپور کے ایک سربرآوردہ خاندان علم و فضل کے چشم و چراغ تھے، اس خانوادہ کو ان اطراف میں دینی سیادت و رہنمائی کا فخر حاصل ہے، مولانا مرحوم دینی علوم خصوصاً فقہ میں مبصرانہ فضل و کمال رکھتے تھے، وہ مدت تک جونپور میں مقیم رہ کر اپنے خانوادہ کے ایک قدیم مدرسہ کے ذریعہ علم دین کی اشاعت کی خدمت انجام دیتے رہے، اس کے بعد کارکنان مسلم یونیورسٹی کی نگاہ انتخاب ان کی طرف اٹھی، اور ناظم دینیات کے عہدہ پر سرفراز ہو کر وہاں تشریف لے گئے، وہ اپنے عہدہ کے فرائض کے لحاظ سے یونیورسٹی کے طلبہ کے لئے "محتسب" کی شکل میں نمودار ہو سکتے تھے، مگر وہ قدیم مشرقی تہذیب و اسلامی اخلاق کے نمونہ تھے، اپنی رواداری، شیریں کلامی، نرم دلی، نکتہ رسی، اور اپنے عام اخلاق و عادات سے، طلبہ سے شیر و شکر ہو کر ان کے مخلص دوست بن گئے، طلبہ پروانہ وار ان کی طرف جھکے، اور مرحوم نے باتوں ہی باتوں میں طلبہ میں مذہبی زندگی پیدا کرنے اور انھیں مغرب زدگی اور فرنگیت سے دامن بچانے اور ہشیار رہنے میں وہ خدمات انجام دیئے جن کا انجام پانا بڑے بڑے لکچروں اور علمی مقالوں سے ممکن نہ تھا، دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ مرحوم کو اپنے انعامات سے سرفراز فرما کر ان پر اپنی رحمتوں کے پھول برسائے، اور ان کے برادران عزیز یعنی مولانا ابوالمعازی علی اعلیٰ ندوی و مولانا ابوالمکارم محمد عقیل ندوی وغیرہ کو صبر و سکون کی توفیق عطا فرمائے۔

حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی کی ایک نئی تصنیف رحمت عالم[1] کا مفصل تذکرہ اسی ماہنامہ میں کسی دوسری جگہ نظر سے گذرے گا۔ حضرۃ الاستاذ نے یہ کتاب ندوۃ العلماء کو عنایت فرما دی ہے، تاکہ اس کی قیمت سے چھوٹے بچوں کے لئے محمدیہ نام سے ایک دار الاقامہ (بورڈنگ) تعمیر کیا جائے۔ اس کتاب کے نسخے پانچ ہزار کی تعداد میں چھاپے گئے ہیں۔ ندوۃ العلماء کی بنا و تعمیر میں صوبہ بہار کا دیرینہ ہاتھ رہا ہے، ہمیں امید ہے کہ اس موقع پر بھی ہمارے صوبہ کے اہل خیر اپنی روایات کو برقرار رکھیں گے اور اس مبارک مہینہ میں اس کار خیر میں وافر حصہ لیں گے، اور اپنے اور اپنی عورتوں، بچوں، عزیزوں، اور نادار مسلمانوں میں تقسیم کرنے کے لئے رحمت عالم کے نسخے زیادہ سے زیادہ تعداد میں، مولانا مسعود علی صاحب ندوی منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ کے پتہ سے طلب کریں گے۔

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۲۵۶،

اکبرآباد آگرہ میں جامعہ اردو آگرہ، کے نام سے ایک نئی تعلیمی مجلس کی تاسیس عمل میں آئی ہے، اس مجلس کے آئین وضوابط عہدہ داروارکان، اور رودادِ کارگذاری بابت ۳۹-۱۹۳۸ء ہمیں موصول ہوئے ہیں، اس تعلیمی مجلس کے روح و رواں جناب پروفیسر محمد طاہر صاحب فاروقی (آگرہ) ہیں، جامعہ کے رئیس، جناب نواب سر احمد سعید خاں بہادر آف چھتاری بالقابہ، اور امیر جامعہ، آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو بالقابہ ہیں، اور مجلس منظمہ میں یوپی کی سب یونیورسٹیوں کے اردو شعبوں کے صدر، جامعہ ملیہ کے شیخ الجامعہ اور انجمن ترقی اردو، یوپی سکنڈری ایجوکیشن ایسوسی ایشن، اور یوپی ٹیچرس ایسوسی ایشن کے نمایندے شامل ہیں، اس جامعہ کی نگرانی میں اردو کی اعلیٰ قابلیت کے لئے تین امتحانات "ادیب" "ادیب ماہر" اور "ادیب کامل" کی سندیں جاری کی گئی ہیں، مختلف مقامات کے مشرقی و مغربی تعلیمی ادارے، اس مجلس کی نگرانی میں اپنے اپنے شہروں میں امتحانات کے سنٹر قائم کر سکتے ہیں، چنانچہ یوپی اور راجپوتانہ کے مختلف شہروں میں ۱۹۳۹ء میں متعدد سنٹر قائم ہوئے، جن کے ماتحت کامیابی سے امتحانات لئے گئے، توقع ہے کہ بہت جلد مختلف صوبوں کی حکومتیں اس تعلیمی مجلس کا الحاق منظور کریں گی، ضرورت ہے کہ ملک کے مختلف تعلیمی ادارے اس تعلیمی مجلس کی مساعی میں ہاتھ بٹائیں مفصل معلومات کے لئے پروفیسر محمد طاہر ایم اے رجسٹرار جامعہ اردو، آگرہ کے پتہ سے خط وکتابت کی جاسکتی ہے،

ہندوستانی کمیٹی صوبہ بہار کی طرف سے ایک سب کمیٹی، مختلف فنون کی اصطلاحوں کے ترجمے وضع کرنے کیلئے مقرر کی گئی تھی، چنانچہ جغرافیہ، حساب، الجبرا، اور جومیٹری کی اصطلاحیں، اس سب کمیٹی نے تیار کرلی ہیں، اور ان کو رائے عامہ کے لئے اہل علم کے پاس بھیجا گیا ہے، اسی سلسلہ میں اس کی کاپیاں ہمارے پاس بھی آئی ہیں، ہم نے سرسری نظر سے ان کو دیکھا، ہم دلی افسوس کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ جو نئے الفاظ وضع کئے گئے ہیں، وہ بڑے بھدے، نامانوس اور ناہموار ہیں، نیز علمی و تعلیمی حیثیت سے نہایت غیر تشفی بخش اور محل نظر ہیں، ہم اپنی مفصل رائے مع محل نظر ترجموں کے، کمیٹی کے پاس علحدہ بھیجیں گے، ان سطروں کے لکھنے کا مدعا یہ ہے کہ ہم کمیٹی سے صوبہ کے اردو داں طبقہ کے ترجمان کی حیثیت سے گذارش کرتے ہیں کہ ان اصطلاحات کے قبول کرنے میں عجلت سے کام نہ لیا جائے، ان پر غور و خوض کرنے کے لئے جو مدت مقرر کی گئی ہے وہ کافی نہیں، سردست اسے کچھ دنوں کے لئے ملتوی رکھا جائے، اور آخری فیصلہ کی تاریخ آگے بڑھائی جائے، ہمیں امید ہے کہ ہم اس اثنا میں اپنی مناسب تجویزیں کمیٹی کے پاس ارسال کر سکیں گے، امید ہے کہ ہندوستانی کمیٹی اس گذارش کو قبول کرے گی،

ناظرین ندیم کو ندیم کی کتابت اور شان خط کی طرف سے شکایتیں تھیں، ناظرین کو یہ سنکر خوشی ہوگی کہ ہم نے اب اس کا مناسب انتظام کرلیا ہے، اور چند دن ہوئے اعظم گڈھ سے ایک خوش نویس منشی عبدالغفار خاں بلالئے گئے ہیں، یہ منشی عبدالقادر خاں کے سگے بھائی اور شاگرد رشید ہیں جو، دارالمصنفین کے ہڈ کاتب ہیں اور سیرۃ النبی کی ضخیم جلدوں کی کتابت انہی کے قلم سے ہوئی ہے، یہ اس سے پہلے سرائمیر اعظم گڈھ کے رسالہ الاصلاح کے کاتب تھے، امید ہو کہ ایک دو مہینے کے بعد جب ہر ماہ کا پورا رسالہ انہی کے قلم سے لکھا جائیگا تو اسکی کتابت کا حسن آشکارا ہوگا،

ندیم کی توسیع اشاعت کے لیے ہم نے ناظرین کو نہ بار بار متوجہ کیا اور نہ کاغذ اور روشنائی کی عام گرانی کا گلہ کیا، کہ ہر کام اپنے قاعدہ سے ہوتا ہے، اور جو کچھ ہوتا ہے، وہ ہوتا رہتا ہے، اس کے باوجود ان کرمفرماؤں کے احساس فرض شناسی کا تذکرہ نہ کرنا تو احساس فراموشی کی حد تک جا پہنچے، جنھوں نے ادارہ ندیم کی درخواست و استدعا کے بغیر خود سے اپنے فرض کو پہچانا، اور ندیم کی توسیع اشاعت میں حصہ لیا، ذیل میں ایک مختصر فہرست پیش ہے جو ابھی ہمیں منیجر ندیم کے ہاتھوں ملی ہے ہم ان کرمفرماؤں کے دل سے شکر گذار ہیں۔

نمبر شمار	اسمائے گرامی	تعداد لائف ممبر	تعداد خریدار	نمبر شمار	اسمائے گرامی	تعداد لائف ممبر	تعداد خریدار
۱۔	جناب ابومحمد سید حسن امام صاحب والی رئیس گیا	۴	۱	۸	جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی	۰	۲
۲۔	جناب مولوی سید محمد ایوب صاحب آبگلوی	۳	۹	۹	جناب سید ابوالفتح محمد عثمانی صاحب وکیل	۰	۲
۳۔	جناب سید رضا قاسم صاحب مختار	۰	۱۰	۱۰	جناب ڈاکٹر محمد عنایت اللہ ایم، آر، سی،	۰	۱
۴۔	جناب سید وہبی احمد صاحب بلگرامی ڈپٹی مجسٹریٹ	۰	۵		ایس، ایل، آر، سی، پی (لندن)		
۵۔	جناب مولانا شاہ صبیح الحق صاحب عمادی	۰	۵	۱۱	جناب محمد ذکی صاحب ہاشمی عظیم آبادی	۰	۱
۶۔	جناب جی، آر، قیس شیخوپوروی	۰	۲	۱۲	جناب میر حمید صاحب رضوی	۰	۱
۷۔	جناب سید محمد فہیم صاحب سید آبادی	۰	۲		جناب سید محمد مجتبیٰ صاحب ایم اے ڈپٹی ارگنائزر محکمہ دیہات سدھار		۸

کیا دوسرے قدردانوں کو ان کرمفرماؤں کے اس اسوۂ حسنہ کے اتباع کی دعوت نہ دی جائے۔؟

نظرات کی آخری کاپی پریس میں جاچکی تھی کہ ابھی ۱۳ اکتوبر کے روزانہ ہند میں ندیم کے جواب میں مولانا ملیح آبادی کا مضمون "اپنے آپ کو مسلمان کہنے والے کی تکفیر" کے عنوان سے نظر آیا، جو گویا مسلمانوں کے شغل تکفیر کے خلاف ایک فتوی ہے، لیکن معاف فرمایا جائے کہ مولانا محترم اصل واقعات سے ہٹکر اصول کی دنیا میں تشریف لے گئے۔ مولانائے محترم سے اصل سوال یہ تھا کہ انھوں نے ایم، ان رائے کے متعلق فرمایا کہ "ایک لمحہ کیلئے یہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ مسٹر رائے کے موجودہ خیالات ایماندارانہ ہیں کیونکہ کسی ایماندار انسان کے خیالات میں ایسی تبدیلی عقلاً ممکن نہیں ہے اور اگر ابھی کوئی انھیں ایماندار سمجھے گا تو پھر لغت سے غداری کا لفظ ہمیشہ کیلئے نکال دینا پڑیگا"۔ اب جب کہ یہ ساری باتیں انقلاب پرستی سے ایم این رائے کی بغاوت کے باعث ان کے خلاف کہی جاسکتی ہیں تو یہی باتیں اسلام سے بغاوت کے باعث نیاز کے خلاف کیوں صحیح نہ ہوں ـــ مولانائے محترم اپنے ایک دلچسپ خط میں ایک فقرہ بھی لکھتے ہیں کہ "ایم، ان رائے اور نیاز کو ملانا آپ ہی سے ہو سکتا تھا، ایم، ان رائے کیا شوشلزم میں وہی جاہلانہ پوزیشن رکھتا ہے، جو نیاز کی دینی علوم میں ہے؟ ظاہر ہے نہیں" اس لحاظ سے تو نیاز کا جرم زیادہ سنگین ہے کہ وہ جہل کے باوجود نہ صرف دعاوی عالم بنے ہیں بلکہ جان بوجھ کر اپنے جاہلانہ مزعومات سے دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں۔ ـــ باقی رہا تکفیر مسلم کا اصولی مسئلہ اور اس کسوٹی پر نیاز کو پرکھنا تو اگر ضرورت ہوئی تو کسی مناسب فرصت میں مولانائے محترم سے علیحدہ سنجیدہ گفتگو کریں گے اور اپنے قارئین کو اس مسئلہ پر مطمئن کردیں گے، لیکن مولانا محترم کی خدمت میں یہ ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ اس وقت دنیا بڑے نازک دور سے گذر رہی ہے، یورپ کی موجودہ سیاسیات پر ان کے بصیرت افروز افتتاحیے قابل قدر اور صحیح رہنمائی کرنیوالے ہوتے ہیں، وہ اپنی ان مفید خدمات کو جاری رکھیں، کہا جاتا ہے کہ شوشلزم کا اصول ہے کہ اسے نہ مذہب سے عداوت ہے نہ محبت وہ اس اصول پر قائم رہکر ان مسائل سے بے تعلق رہیں جنکا تعلق خاص دینی مسائل سے ہے تو یہ ان کے اور دوسرے دونوں کے حق میں زیادہ مفید ہے، اور انھیں اپنے مفید خدمات کے انجام دینے کے بہتر سے بہتر مواقع حاصل رہیں گے

مقالات

نواب اعتماد الدولہ کامگار خاں

سنہ ۱۷۱۹ء ۔ سنہ ۱۷۷۲ء

از جناب حکیم محمد نقی صاحب ہسوی

کامگار خاں کی شخصیت اور اس کے کارناموں پر پردہ پڑچکا، آج اُس کا وہ گمنام مقبرہ جس میں وہ خواب عدم کی میٹھی نیند سو رہا ہے۔ ایک آشیانہ زاغ و بُوم بنا ہوا ہے، اور مقبرہ کی فلک بوس بوسیدہ دیواریں اس کے حال پر اس کے ارد گرد کھڑی رو رہی ہیں۔ حالانکہ اس نامور کی فاتحانہ زندگی اور اس کے مشہور کارنامے ہرگز اس لایق نہ تھے کہ آسانی سے بھلائے جاسکیں۔ میں آج کی صحبت میں اس کے حالات زندگی پر روشنی ڈالتا ہوں۔ میرا سرمایہ معلومات صرف اس کے خاندانی روایات ہیں، مگر پھر بھی تاریخ سے اس کی تطبیق کی کوشش کروں گا۔

کامگار خاں جنوبی صوبہ بہار کی ایک چھوٹی سی ریاست کا خود مختار فرمانروا تھا۔ اس کی ریاست باون ۵۲ پرگنوں میں پھیلی ہوئی تھی، اور تراسی ۸۳ چھوٹے چھوٹے زمیندار اور راجے اس کے محکوم اور زیر اقتدار تھے۔ اور انہیں میں اس کے خاندانی جان نثاروں کی جاگیریں اور حکومتیں بھی شامل تھیں۔ جن کو اُس نے جگہ جگہ پر قایم کیا تھا، جیسے کھرک پور۔ بیربھوم۔ آنتی۔ پکری برانواں۔ داؤ دنگر، چونکہ یہ ایک مسلم راجپوت خاندان کا فرد تھا، اسلئے دربار شاہی سے مہراجگی کا خطاب اس کے خاندان میں چلا آتا تھا۔ پھر شاہ عالم نے اس کی کارگزاریوں کے صلے میں اس کو نواب اعتماد الدولہ کا خطاب اور منصب ہشت ہزاری عطا فرمایا تھا۔ اس کا دار الحکومت علاقہ **گیا** کا مقام **ہسوہ** تھا۔

کامگار خاں کے مورث اعلیٰ اورنگ خاں عہدۂ تحصیلداری پر راجہ مان سنگھ کی وساطت سے پایۂ تخت دہلی سے بہار بھیجے گئے تھے۔ اور بارت محال ان کی جاگیر میں دے دیا گیا تھا۔ اسی خاندان میں صوبہ بہار کا یہ نامور فرزند کامگار خاں امانت خاں کے گھر میں پیدا ہوا۔

کامگار خاں اپنی خداداد استعداد کی بدولت معمولی جاگیردار سے ایک ریاست کے حکمران کے منصب عالی تک پہونچ گیا۔ اور اتنی شہرت حاصل کی کہ آج بھی اس کی بے نظیر شجاعت اور جود و سخا کی داستانیں اس کے مفتوحہ علاقہ میں زبان زد خلائق ہیں۔ اس نے ہزاروں ہزار جاگیروں کی سندیں بلا تفریق ملت و مذہب لوگوں کو دیں جو آج تک ان لوگوں کے پاس موجود ہیں۔ اور ہزاروں ہزار بندگان خدا اس کی لاخراج جاگیروں سے آج تک عافیت اُٹھا رہے ہیں۔

علماء۔ پنڈت۔ شعراء۔ پیرزادے جو بھی اس کے دربار عالی میں گئے، کبھی محروم واپس نہیں آئے۔ آپ ان سندوں کو دیکھیں گے تو حیرت کریں گے کہ کس طرح اس نے اتنی بڑی بڑی لاخراج جاگیریں بلا کسی معاوضہ کے ان لوگوں کے نام لکھ دیں۔

اس کے یہی بے مثل کارنامے ہیں جو اس کے نام کو ابد الآباد تک زندہ رکھنے کو کافی ہیں۔ جس کی مثال بہار کا کوئی دوسرا حکمران پیش نہیں کرسکتا۔ اس کی سندوں پر جو مہریں لگائی گئیں ہیں اُن کے الفاظ یہ ہیں :۔ " **از حق امانت کامگار اقبال یافت** "۔ امانت کامگار کا باپ ہے اور اقبال علی اس کے بیٹے کا نام تھا۔ یہ وہی بد اقبال اقبال علی ہے جس کے ہاتھوں سے ریاست

چھین لی گئی - اس مہر کے الفاظ سے پتہ لگتا ہے کہ کامگار نے بیٹے کے جشن ولادت کے موقع پر یہ مہر بنوائی ہوگی۔ اس کے قبل دوسری مہر تھی، جس میں " کامگار قادری " کے الفاظ کندہ تھے - جو بعض کاغذات میں پائے جاتے ہیں -

بعض خاندانی روایت کی بنا پر کامگار کی ولادت سنہ ۱۷۱۹ء اور وفات سنہ ۱۷۷۲ء میں کچھ اختلاف کے ساتھ بتائی جاتی ہے۔

تاریخ سیر المتاخرین میں اس کے کارناموں کے تذکرے سنہ ۱۷۴۳ء سے لیکر سنہ ۱۷۶۵ء تک ملتے ہیں۔ خاندانی روایات اور تاریخ کے مطالعہ سے پتہ لگتا ہے۔ کہ اس نے مہابت جنگ ناظم بنگالہ اور ہیبت جنگ صوبہ دار بہار کے ساتھ ملکر بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں[۱] - اور مرہٹوں کی جنگ میں کافی شہرت پائی ہے - بنگالہ کے ناظموں سے بھی اس کے گہرے روابط قایم تھے - یہ بھی وجہ ہے کہ ہمیشہ اس کے مقبوضات کی طرف سے چشم پوشی ہوتی رہی اور اس نے بہت جلد اپنی حکومت وسیع کرلی۔

اس کا ایک اور سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مسلم راجپوتوں کی ایک کثیر آبادی اطراف پنجاب سے لاکر صوبہ بہار میں جگہ جگہ بڑی بڑی بستیوں میں بسادی اور ان کو ہر قسم کے درجے، مناصب اور جاگیریں دے دے کر اپنی ریاست کو مضبوط اور مستحکم کرلیا۔

اس زمانہ میں ملک کے دوسرے حصوں کی طرح صوبہ بہار میں بھی طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا - بلکہ حقیقی معنی میں یہاں نہ کوئی مستقل حکومت تھی اور نہ کوئی مستقل حکمران -

کامگار مذہباً سنی المذہب تھا - مگر اس کا بیٹا اقبال علی شیعہ نوابوں کی صحبت میں شیعی ہوگیا تھا -

کہنے کو تو وہ میر جعفر ناظم بنگالہ کا صوبہ دار تھا، مگر درحقیقت میر جعفر اس پر کچھ دسترس نہیں رکھتا تھا - ظاہرا رام نرائن میر جعفر کا دم بھرتا تھا مگر درحقیقت وہ انگریزوں کا طرف دار تھا - مگر عین اسی ماحول میں دوسری طرف بہار میں کامگار اپنی وسعت فتوحات کی وجہ کر کافی غلبہ حاصل کرتا جاتا تھا، اور اس کی فوجی طاقت سے رفتہ رفتہ حکومت بھی خوف کھانے لگی تھی ان اسباب سے راجہ رام نرائن کامگار کا سب سے بڑا دشمن تھا - کیونکہ کامگار ہمیشہ اپنے مراسلات کے ذریعہ میر جعفر کو رام نرائن کے حالات سے مطلع کرتا رہتا تھا - اس کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ خود بامید رفاقت دیرینہ نیابت کا بھی متمنی تھا - اس خط و کتابت کا مفصل تذکرہ سیر المتاخرین میں پایا جاتا ہے[۲]

میر جعفر رام نرائن کو اس کی غداریوں کی وجہ کر نیابت سے برطرف کردینا چاہتا تھا، مگر انگریزوں کی پشت پناہی کی وجہ کر اس کی ہمت نہیں پڑتی تھی، اور کامگار کو اس کے غلبۂ اقتدار کی وجہ کر نیابت دینے سے ڈرتا تھا - رام نرائن کامگار کو اپنا رقیب سمجھتا تھا اور اس کی تخریب میں طرح طرح کی کوششیں کرتا تھا، کبھی انگریزوں کو اس کے اقتدار سے ڈراتا اور کبھی میر جعفر کو اس کی دشمنی پر آمادہ کرتا، مگر خود اس کے مقابلے میں آنے سے ڈرتا تھا -

ایک بار راجہ رام نرائن نے راجہ سندر سنگھ ٹکاری کو کامگار کے خلاف کھڑا کردیا - اور در پردہ حکومت سے کافی مالی اور فوجی امداد دے کر اس کے علاقہ پر حملہ کروادیا - ظاہرا یہ جنگ راجہ سندر سنگھ اور کامگار میں تھی، مگر درحقیقت یہ جنگ کامگار اور حکومت

---

[۱] ترجمہ سیر المتاخرین جلد دوم صفحہ ۱۲۷ و صفحہ ۲۰۳ - [۲] ترجمہ سیر المتاخرین جلد دوم صفحہ ۳۱۵

بہار سے تھی، جس کو مصنف سیر المتاخرین نے مخاصمتِ دیرینہ کے الفاظ سے کئی جگہ یاد کیا ہے۔

یہ جنگ "مُنواں ٹانڈا" کی جنگ کے نام سے مشہور رہے، جس میں بیشمار انسانوں کی جانیں گئیں اور زمین خون سے لالہ زار بن گئی۔ اس جنگ کے پہلے حملے میں کامگار کی فوج منتشر ہوگئی تھی جس سے اس کو کافی زک اٹھانی پڑی - مگر پھر جو اس نے دوبارہ سنبھل کر حملہ کیا تو وہ آن کی آن میں گیا۔ بشن پد کی سیڑھیوں پر چڑھ گیا - کامگار کی یہ ایک عظیم الشان فتح تھی - وہاں پہونچ کر اس نے اس فتح کی یادگار میں ایک چھوٹی سی مسجد بشن پد کے احاطے میں تعمیر کروائی جو آج تک وہاں موجود ہے [1] مگر اب اُس مسجد میں کسی کو اذاں دینے کی بھی ہمت نہیں۔

کامگار اور حکومتِ بہار | اس وقت حکومت کی باگ انگریزوں کی بدولت راجہ رام نرائن کے ہاتھوں میں تھی۔ اس جنگ میں سندر سنگھ کی مشکل سے جان بچی، اور اپنے ایک بہت بڑے علاقے سے اس کو ہاتھ دھونا پڑا۔

جب میر جعفر بہار آیا تو رام نرائن نے کامگار کے خلاف خوب خوب زہر اُگلا اور اس کے اقدار سے ڈرایا، اور سندر سنگھ کو اس کے خلاف کھڑا کیا اس نے کامگار کے قتل و غارت کی عجیب عجیب داستانیں گڑھ کر سنائیں - آخر سب نے مل کر میر جعفر کو اتنا مجبور کیا کہ اس نے مجبوراً کامگار کو نظر بند کرنے کا حکم دے دیا۔ [2] اس حکم کی اڑتی پڑتی خبر کامگار کے کانوں میں بھی پہنچ گئی - وہ بے خوف کئی دنوں تک وہیں مقیم رہا۔ پھر جرات کے ساتھ دربار میں آیا، یہاں آنا تھا کہ فوراً گرفتار کر لیا گیا - کامگار کافی تحفظ کے ساتھ دربار میں آیا تھا۔ اور دیگر انتظامات مکمل کر لیے تھے، چنانچہ اس کی حراست کی خبر بجلی کی طرح سارے شہر پٹنہ میں پھیل گئی - اور آن کی آن میں سارے شہر میں بغاوت پیدا ہو گئی - اور کامگار کے جاں نثار کمین گاہوں سے نکل کر ایوان حکومت پر ٹوٹ پڑے - میر جعفر اس واقعہ سے سخت گھبرا گیا اور کامگار کو اُسی وقت رہا کرنا پڑا۔

مصنف سیر المتاخرین نے قید کے اس واقعہ کو ضرور لکھا ہے بلکہ افسوس بھی ظاہر کیا ہے۔ مگر رہائی کا واقعہ جو خاص طور پر دلچسپ تھا۔ نظر انداز کر گیا ہے۔

اسی وقت سے کامگار حکومت بہار کا کھلا دشمن بن گیا، اور میر جعفر اور رام نرائن کی دشمنی کے ساتھ ساتھ حکومت انگلشیہ کی دشمنی بھی مول لیلی

کامگار اور شاہ عالم بادشاہ | اس کے بعد کامگار نے تخت شاہی دہلی کی پناہ پکڑنی چاہی چنانچہ اس نے شاہ عالم کو جو انگریزوں اور رام نرائن کے ہاتھوں سے شکست کھا کر چھتر پور میں مقیم تھا اپنا خاص معتمد بھیجکر بلوا بھیجا [3] - شاہ عالم اسکی امداد قبول کرنے پر آمادہ ہو گیا، چنانچہ وہ بہار کے لئے چل کھڑا ہوا۔

جب وہ سرحد بہار میں داخل ہوا تو کامگار پانچ چھ ہزار فوج کے ساتھ اس کے استقبال کو گیا - اور نہایت ادب و احترام کے ساتھ بادشاہ کو اپنے ساتھ لیتا ہوا ہسوہ پہنچا - اور ایک خاص محل جو بادشاہ کے فروکش ہونے کے خیال سے چند دنوں میں تعمیر کرایا تھا بادشاہ مع اپنی فوج کے اُس میں فروکش ہوا - اور تمام شاہی اخراجات کا کامگار خود کفیل ہوا - اور بارہ ہزار فوج اپنی اور اپنے جاں نثاروں کی جمع

---

[1] ندیم - افسوس کہ گیا جی کی یہ مسجد سال رواں کے پچھلے بلوہ میں شہید کر دی گئی۔ [2] ترجمہ سیر المتاخرین جلد دوم صفحہ ۳۱۵ - [3] ترجمہ سیر المتاخرین صفحہ ۳۵۴ و صفحہ ۳۵۶

کر کے حکومت کے مقابلے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس سے قبل بادشاہ چالیس ہزار فوج کی جمعیت سے بہار پر حملہ آور ہوا تھا۔ مگر حکومت نے اس کو آسانی سے شکست دے کر بہار سے نکال باہر کیا تھا۔ مگر اب جبکہ کامگار نے بادشاہ کا ساتھ دے دیا تو حکومت بہار باوجود کافی امداد حکومت انگلشیہ اور میر جعفر کے اس فتنہ کو دبا نہ سکی۔ اور کامل ایک سال تک بہار کو تاخت و تاراج کرتا رہا اور حکومت سے کچھ بنائے نہ بنی۔ اب کسی میں یہ ہمت نہ تھی کہ بادشاہ کے قدم بہار سے اکھاڑ دے۔ حالانکہ بادشاہ کے پاس نہ اُس کی فوج تھی اور نہ اسکے خاص رفقا لیکن پہلے ہی حملہ میں کامگار نے حکومت بہار کو ایسی بری شکست دی کہ پھر سوائے صلح کے دوسری راہ نظر نہیں آئی۔

اس جنگ میں گو کامگار کو اپنے بہت سے خاندانی بہادروں جیسے واد خاں، دلیر خاں، اصالت خاں وغیرہ کا داغ مفارقت اٹھانا پڑا، مگر اس نے حکومت بہار اور بالخصوص راجہ رام نرائن سے دل کھول کر اچھی طرح بدلہ لے لیا۔ رام نرائن پر تو اس نے اتنے نیزے کے ہاتھ مارے کہ اس کو رام نرائن کی موت کا یقین ہو گیا[1]

اسی طرح کئی انگریز کپتان اور ان کی ساری فوج کو جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔[2] اور میرن بھی تیروں سے سخت زخمی کر دیا گیا۔ میرن کا ماموں امین خاں ایک ہی تیر سے ڈھیر ہو کر رہ گیا۔[3]

جوش کا یہ عالم تھا کہ انگریزوں کے توپ اور گولوں سے ان بہادروں کے سر اُڑتے جاتے تھے مگر یہ لوگ سر بکف دشمنوں کے صف میں گھسے جاتے تھے۔ یہانتک کہ ساری توپ اور بندوق میدان میں چھوڑ کر ان کو بھاگ جانا پڑا۔

ایک دو بار کامگار کو موقعہ جنگ سے مصلحتاً ہٹ جانا بھی پڑا تھا۔ اور وہ صرف انگریزوں کے مقابلے میں کیونکہ شاہ عالم خالص انگریزی فوج سے لڑ کر ان کو برانگیختہ کرنا نہیں چاہتا تھا، کیونکہ شاہ عالم کو صرف حکومت سے جنگ تھی۔ اس وقت انگریز ظاہرا حکومت سے بے تعلق تھے۔ اور وہ بغیر شمولیت حکومت بہار کے سامنے آنا بھی نہیں چاہتے تھے۔

پھر کامگار بہار سے فوری اطمینان حاصل کر کے بادشاہ کی معیت میں میر جعفر کی تاک میں مرشد آباد کی طرف چل کھڑا ہوا مگر جس امید پر وہ مرشد آباد گیا تھا اس میں نا میاب نہیں ہو سکا۔ اور ایک کافی جھڑپ کے بعد اسکو واپس بہار آنا پڑا۔ اور سراج الدولہ کے ایک ہی خواہ شیخ عبدالوہاب کنتورہ کو شاہ عالم کے ساتھ سازش کے جرم میں میر جعفر کے ہاتھوں توپ دم ہونا پڑا۔[4]

یہ واقعات سنہ ۱۷۶۰ء کے ہیں لیکن سیر المتاخرین میں جن کو بُری طرح رنگا گیا ہے گویا دن کو رات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مؤرخ صاحب سیر المتاخرین بڑے فخر سے فرماتے ہیں کہ خود میجر کارنگ نے بادشاہ اور کامگار کو گیا مانپور کے متصل شکست فاش دیکر اس فتنہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ اور بادشاہ کو اور کامگار نے بھاگ کر اپنی جان بچائی اور موسیر لاس فرانسیسی جو بادشاہ کی مدد کو آیا تھا گرفتار کر لیا گیا۔[5] یہ تاریخی واقعہ ہے اسلئے اس کے جانچنے اور پرکھنے کا حق ہر ایک کو حاصل ہے۔ سخت حیرت ہوتی ہے کہ یہ کس قسم کی فتح تھی کہ دشمن کے مغلوب اور بے دست و پا کر دینے کے بعد بھی خود میجر کارنگ کو کیوں صلح کا پیغام بادشاہ کے پاس بھیجنا پڑا۔ اس پر بھی اُس مغلوب بادشاہ نے اس پیغام کو حقارت سے

---

[1] ترجمہ سیر المتاخرین صفحہ ۳۵۷ جلد دوم۔ [2] ایضاً صفحہ ۳۵۷۔ [3] ایضاً جلد دوم صفحہ ۳۵۹۔ [4] ایضاً صفحہ ۳۶۰۔ [5] ایضاً جلد دوم صفحہ ۳۸۶

ٹھکرا دیا، مگر جب نواب ہدایت علی حسب ایما گورنمنٹ انگلشیہ بیچ میں پڑکر بادشاہ کو سخت مجبور کرتے ہیں تو ناچار بادشاہ صلح پر آمادہ ہوتا ہے۔ ہم نے مانا کہ فاتح اور مفتوح میں صلح ہوتی ہے، مگر آپ نے کبھی یہ نہیں سُنا ہوگا کہ فاتح کو تاوان جنگ ادا کرنا پڑا ہو۔ بلکہ مفتوح ہمیشہ تاوان جنگ ادا کرتا ہے۔ اور پھر صلح بھی ہوتی ہے اس شان سے کہ میجر کارنگ سر سے ٹوپی اتار کر بادشاہ کی سواری کے ساتھ پیدل دوڑتا ہے، اور صلح کے وقت بادشاہ تخت پر ہوتا ہے اور میجر کارنگ اور دیگر انگریز افسران مع میر قاسم اور رام نرائن وغیرہ کے بادشاہ کے سامنے دست بستہ کھڑے ہوتے ہیں اور شرائط صلح مرتب کیے جاتے ہیں۔ ایک ہزار اشرفی نذرانہ دی جاتی ہے، اور چوبیس لاکھ روپیہ سالانہ خراج مقرر ہوتا ہے ــــــــــــ یہ کہنا کس درجہ مضحکہ انگیز ہے کہ انگریزوں کو شاہی احترام منظور تھا۔ اس وجہ کر اتنی عزت بادشاہ کی کی گئی ۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ سنہ ۱۷۷۱ء میں جب کہ عالم شاہی خراج یک لخت انگریزوں نے بند کر دیا تھا تو اُس وقت اُن کا یہ جذبۂ احترام کہاں چلا گیا تھا۔

حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ اس وقت جو کچھ مراعات شاہ عالم کے ساتھ کی گئیں وہ محض کامگار کی بدولت کی گئیں اور حکومت کو اس صلح سے صرف کامگار سے پیچھا چھڑانا منظور تھا۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ عالم کو بہار میں کامگار کی وجہ سے ذلیل ہونا پڑا مگر حقیقت یہ سراسر غلط اتہام ہے بلکہ کامگار نے بہار میں بادشاہ کی عزت رکھ لی، ورنہ اس سے قبل تو شاہ عالم کو جس ذلت سے بہار سے نکالا گیا تھا۔ اس کو دنیا اچھی طرح جانتی ہے۔

بادشاہ اس جنگ میں شاید مغلوب ہو گیا ہو، مگر کامگار ہرگز مغلوب نہیں ہوا۔ یہ عالی ہمت شخص صلح کے آخری آخری دن تک بادشاہ کو صلح سے روکتا رہا۔ اور ہر قسم کی امداد کا یقین دلاتا رہا[؎] بادشاہ کو اس کے جذبۂ وفاداری پر یقین تھا، مگر اس کو جانے کی عجلت پڑی ہوئی تھی، اس وجہ کر اس نے معذرت کر کے کامگار کو رخصت کیا۔

اس کے بعد حکومت بہار کی جان میں جان آئی ۔ اور کامگار کو بھی اطمینان کا موقع ہاتھ آیا۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد اس نے دوسرا محاذ جنگ پیدا کر لیا

(باقی آیندہ)

بیگماتِ اودھ

ازجناب پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی

واجد علی شاہ کی شخصیت اودھ کی تاریخ کے ساتھ ایسی وابستہ ہوگئی ہے کہ جس وقت ہم سلطنتِ اودھ کا کچھ ذکر کرتے ہیں تو خواہ
اہ واجد علی شاہ کا خیال آجاتا ہے اور اس کے ساتھ اُس زمانے کے عیش وعشرت کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ لیکن جب اُن رنگ
ین کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے تو سخت ناکامی ہوتی ہے۔

بات یہ ہے کہ ہندوستان میں زنانخانہ یا حرم کے ساتھ تقدس کا خیال بہت مضبوطی کے ساتھ گھر کئے ہے۔ چنانچہ وہاں کے
ی حالات کوئی ماما اصیل یا لونڈی باندی ظاہر کردیتی تھی۔ تو اسکی بہت کڑی سزا دی جاتی تھی۔ اسی وجہ سے یہاں کے حالات ہمیشہ تاریکی
رہتے تھے۔ امرا کے یہاں تو ایسے موقع پر صرف بے رحمی سے سزا دینا کافی سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جب شاہی غصہ بھڑک اٹھتا تھا تو
ں غریب کی جان پر آبنتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شاہی بیگمات کے رہنے سہنے کے حالات سے واقف ہونے کا کسی کو بہت کم موقع ملتا
ا۔ ہاں اکثر یورپین لیڈیاں حرم سرا میں آتی جاتی رہتی تھیں اُن سے بہت کچھ حالات معلوم ہوجاتے تھے۔ کچھ باتوں کی اطلاع خواجہ سراؤں
ے ہوجاتی تھی جو بیگمات کی خدمتگذاری کے لئے مخصوص تھے۔ ان کے علاوہ اُس زمانے کے لٹریچر سے بھی بہت کچھ مدد ملتی ہے۔ مرثیوں،
موں اور مثنویوں میں جابجا عورتوں کے رسم ورواج اور اُنکی معاشرت جھلکتی ہے۔ بہرحال اِن سنی سنائی باتوں نے اتنا مواد جمع کردیا ہے
محض خیال آرائی نہیں کرنا پڑتی۔

اچھا سب سے پہلے آپ اودھ کی ایک بیگم کی تصویر ملاحظہ فرمائیے۔ بوٹا سا قد اور کھلا ہوا گیہواں رنگ ہے۔ آنکھیں ایک تو یونہی
شیلی اور شرمیلی ہیں، سرمہ لگ جانے سے اُن میں اور بھی جادو بھر گیا ہے۔ ابرو کے بال اس احتیاط سے جمائے گئے ہیں کہ کہیں اونچا
ا نہیں معلوم ہوتا، پورے توس کی طرح کڑی کمان بنی ہوئی ہیں۔ چکنی چکنی بلند اور کشادہ پیشانی کتابی چہرے پر کالے کالے بالوں کی لٹیں
بلی کے عطر میں مہکتی ہوئی کچھ تو سامنے پڑی ہوئی ہیں اور باقی جو موباف کے پیچوں میں لپٹ گئی ہیں وہ چوٹی بنکر کمر پر لہرا رہی ہیں۔ کانوں میں
وٹی چھوٹی جڑاؤ بالیاں لٹک رہی ہیں۔ دلہن ہے تو ناک میں بڑی سی نتھ جس میں دو چمکدار موتیوں کے بیچ میں ایک یاقوت پڑا ہوا ہے
نہ بہت قیمتی کیل۔ اسیطرح تمام جسم زیور سے لدا ہوا ہے۔ ہاتھ کی ہتیلیاں، انگلیوں کے پور اور ناخن مہندی کے رنگ سے سرخ۔ نیم آستیں
ر کہ جس کے نیچے ایک تنگ کرتی ہے، اور کلیوں دار پائجامہ اتنا گھیر دار کہ چلتی ہے تو کئی کئی خواصیں پائنچوں کو سنبھالے رہتی ہیں۔ پاؤں میں
ب دار جوتا جو پائنچے اٹھ جانے کے باعث نظر آجاتا ہے۔ بہت سی پیش خدمتیں پیچھے کھڑی ہیں کہ سر کے زیورات کے موتی اور جواہرات
ترتیب ہوجائیں یا زربفت کے دوپٹے میں الجھ جائیں تو اُن کو درست کرتی رہیں۔

بیگمات کی اس بیچ در بیچ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ علیت پھرت سے وہ کتنی عاری ہوتی ہونگی۔ اُن کا کام زیادہ تر یہ تھا کہ محل میں بیٹھی رہیں اور ایک دوسرے سے باتیں کئے جایا کریں۔

گرمی کے موسم میں حرم کی بیگمات اکثر صحن میں نشست رکھتی تھیں۔ صحن میں ایک شبنمی تان دی جاتی تھی اور اُس کے نیچے فرش بچھا دیا جاتا تھا۔ محل کی خاتون بیچ میں مسند پر آکر گاؤ تکیہ سے لگ کر بیٹھ جاتی تھی۔ اور جو کوئی ملنے کو آتی وہیں سلام کو حاضر ہوتی۔ یہ بیگم صرف اپنے سے بڑی یا بڑے مرتبہ والی خاتون کے آنے پر یا کسی مرد رشتہ دار کو دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوتی تھی۔ جب محل کی خاتون محل کے اندر اپنے ملاقاتیوں سے ملتی تھی تو بیچ کے در میں ایک ستون سے ملا کر ایک گاؤ تکیہ رکھ دیا جاتا تھا اور سامنے ایک مسند بچھا دی جاتی تھی۔ اسی پر وہ بیٹھتی تھی۔ مسند پر اس کے علاوہ کوئی اور نہ بیٹھتا تھا۔ مسند کے نیچے ایک نفیس قالین بچھایا جاتا تھا جو اکثر دو گز لمبا اور دو گز چوڑا ہوتا تھا۔ مسند بالعموم زربفت کی ہوتی تھی اور اس کے گرد کلابتوں کی جھالر لگی ہوتی تھی۔ زانو توڑ کر بیٹھنے کے لئے دونوں پہلوؤں میں دو چھوٹے چھوٹے تکیے رکھ دیئے جاتے تھے۔ اگر بیگم صاحبہ کسی مہمان کو اپنی مسند پر بٹھا لیتی تھیں تو اس سے یہ سمجھا جاتا کہ وہ عورت یا تو مرتبہ میں اس سے بڑی ہے یا اس نے حد درجہ اخلاق اور خاطر مدارات کا ثبوت دیا ہے۔ اگر مہمان مرتبہ میں میزبان سے بہت زیادہ بلند ہوتی تو گھر کی مالکہ مسند کو چھوڑ کر کھڑی ہو جاتی تھی اور میزبان کو صدر میں جگہ دیکر خود مسند کے ایک گوشے میں بیٹھ جاتی تھی۔

شاہی محلات میں سب بیگموں کی ڈیوڑھیاں الگ الگ تھیں۔ ہر محل میں ملاقات کے کمرے تھے جن کو خلوت خانہ کہا جاتا تھا۔ ایک ہی محل میں ایک کمرہ سے دوسرے کمرہ میں جانے کے لئے پالکیاں استعمال ہوتی تھیں۔ کوئی بیگم خواہ بادشاہ کی نظر سے کتنی ہی گر جائے لیکن محل کی آرایش اور اُس کے رہنے سہنے کی طرز سے یہ ہرگز معلوم نہ ہوتا تھا کہ اس کے مراتب میں کوئی فرق آگیا ہے۔ محلات کے معاملوں میں بادشاہ دست اندازی نہ کرتے تھے۔

شاہی حرم سرا اور امرا کی محلسرا میں ہر جگہ پردے کی بہت سخت پابندی کی جاتی تھی۔ جب لونڈیوں اور باندیوں وغیرہ تک کو نامحرموں کے سامنے ہونے کی اجازت نہ تھی تو خود اُن کی بیگموں کو کون دیکھ سکتا تھا۔ بہو بیگم صاحبہ کا انتقال ہوا۔ غازی الدین حیدر نے ان کے ساتھ ان کے ملبوسات بھی دفن کرا دئے کہ اُن پر نامحرموں کی نظر نہ پڑے۔ اسی سے اور باتوں کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے۔

بیگمات شاہی کی خدمتگذاری کے لئے بہت سی پیش خدمتیں، خواصیں، مامائیں، اصیلیں ہوا کرتی تھیں۔ ہر محل ڈیوڑھی میں بیشمار لونڈیاں بھی ہوتی تھیں۔ ان میں سے کچھ خانہ زاد ہوتی تھیں اور کچھ غریب ماں باپ سے خرید لی جاتی تھیں۔ ان کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا جاتا تھا! اور یہ بھی نہایت سلیقہ سے اپنی مالکہ کی خدمت بجا لاتی تھیں۔ ان کے سلیقہ اور حسن خدمت کا معیار صرف اچھا گانا، اچھی داستان کہنا، اور اچھی طرح بات چیت کرنا ہوتا تھا۔ اس غلامی کی حالت میں بھی ان لونڈیوں پر کسی قسم کی سختی روا نہ رکھی جاتی تھی اور یہی وجہ ہے کہ ان لونڈیوں کی کثرت و قلت سے ہر گھر کی شان اور منزلت کا اندازہ ہوتا تھا۔ یا یوں کہئے کہ لونڈیاں امارت کے لوازم اور ریاست کی شان سمجھی جاتی تھیں۔

مسنز میر حسن علی اپنی کتاب "مسلمانانِ ہند کے بعض حالات" میں لکھتی ہیں:۔

.. اگرچہ ان لونڈیوں کو بیگمات کی ذاتی خدمتگذاری کی وجہ سے ہر وقت حاضر باش اور تعمیلِ ارشاد پر تیار رہنا پڑتا ہے، لیکن ان کے ساتھ سلوک بہت اچھا ہوتا ہے، اور ہر قسم کا سامان آرام و آسائش ان کے واسطے مہیا کیا جاتا ہے۔ باری بندھی ہوتی ہے اور معینہ اوقات پر ہر ایک اپنی باری سے اپنا کام کرتی اور خوش سلیقگی کے ساتھ اپنے مالک کی خدمت بجا لاتی ہے۔ انکی بیویاں ان پر اسیطرح مہر و محبت کی نظر رکھتی ہیں جیسے اور پیش خدمتوں اور خواصوں پر۔ اور اس غلامی کی حالت میں بھی ان پر کسی طرح کی سختی و درشتی روا نہیں رکھی جاتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ انھیں لونڈیوں کی کثرت و قلت سے ہر گھر کی شان اور منزلت سمجھی جاتی ہے۔ کیونکہ مسلمان سوسائٹی کی موجودہ حالت میں لونڈیاں امارت کے لوازم اور ریاست کی شان سمجھی جاتی ہیں۔ جو بیویاں نیکدل اور نیک مزاج ہوتی ہیں وہ اپنی لونڈیوں کی شادی جب وہ سنِ تمیز کو پہنچ جاتی ہیں۔ اُن کے مناسب حال لڑکے تلاش کر کے کر دیتی ہیں، اور جب اُن سے اولاد ہوتی ہے تو اس اولاد کو بہت ہوشیاری و خبرداری کے ساتھ پالتی اور پرورش کرتی ہیں، اور اکثر اوقات ان کی دلجوئی کے واسطے بچوں کے وظائف مقرر کر دیتی ہیں، یا خود انھیں کو طوقِ غلامی سے گلوخلاص کر دیتی ہیں ... ..

اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے۔ وہ تو اچھا سلوک تھا، اب ذرا سختیوں کا حال ملاحظہ کیجئے۔ ایک معزز بیگم نے ایک حسین لڑکی کو پال پوس کر بڑا کیا۔ لیکن اس کے انداز دلربائی نے مالک کا دل موہ لیا اور بیگم کی رقیب ہو گئی۔ بیگم نے عبرت دلانے اور اس کی ہمچشموں میں اُس کو ذلیل کرنے کے لئے اُس کو چاندی کی زنجیر میں جکڑ کر پلنگ پر ڈال دیا۔ پلنگ پر پڑے رہنا تو کوئی ذلت نہ تھی لیکن سزا یافتہ اور مجرم کی حیثیت سے بندھے پڑے رہنا ایسی سزا تھی جس نے بہت جلد خواص کا نشہ اتار دیا۔ لیکن ایسی فرشتہ خصلت بیویاں بہت کم ہوتی تھیں کہ اتنی نرم دلی سے کام لیں اور باندھیں بھی تو چاندی کی زنجیر سے۔ جو بیگمیں تیز مزاج اور تندخو ہوتی تھیں وہ قدرتاً انتہائی سختی سے کام لیتی تھیں اور ذرا سے اشتعال پر بڑی سے بڑی سزا دینے میں تامل نہ کرتی تھیں۔ اِن مظالم کا باعث زیادہ تر خواجہ سرا ہوتے تھے جن کو ہر وقت اور ہر حالت میں زنانخانے میں داخل ہونے کی اجازت تھی۔

خواصوں کے اس گروہ کے علاوہ ایک قابل ذکر گروہ کہاریوں کا ہے۔ ان کا کام یہ ہوتا تھا کہ محل کے اندر جب بادشاہ سلامت یا کوئی بیگم ایک جگہ سے دوسری جگہ جائیں تو یہ پالکی کو اپنے کاندھے پر اُٹھا کے لے جاتی تھیں۔ ان میں بعض کہاریاں بہت منہ چڑھی ہوتی تھیں۔ لیکن حرم شاہی کے عجائبات میں سب سے زیادہ متوجہ کرنے والی چیز زنانہ سپاہیوں کی موجودگی تھی۔ یہ عورتیں اپنے لانبے لانبے بالوں کا جوڑا باندھ لیا کرتی تھیں اور پھر اُسے سر پر رکھ کر پگڑی سے چھپا لیا کرتی تھیں۔ مردوں کی ایسی وردی پہنتی تھیں اور مردوں ہی کی طرح جسم پر ہتھیار رکھتی تھیں۔ ان کی باقاعدہ قواعد بھی ہوتی تھی۔ واجد علی شاہ کے عہد میں یہ زنانی فوج بہت نمایاں ہو گئی تھی، اور ان کی قواعد کے لئے خود بادشاہ نے فارسی اصطلاحیں اور کلمے مقرر کئے تھے۔

یہاں تک جو کچھ آپ نے سنا، یہ بیگمات اودھ کی سنجیدہ زندگی سے متعلق تھا۔ اب اُن کی تفریحات کا تذکرہ ملاحظہ فرمایئے:۔ نصیر الدین حیدر کے کھانے کی میز بہت بڑی تھی۔ کھانے کے بعد اسی میز پر کبھی مرغ، بٹیر وغیرہ کی جوڑیں ہوتی تھیں، کبھی کٹھ پتلیوں کا ناچ ہوتا تھا۔ طائفہ بھی حاضر ہوتا تھا۔ کھانے کے کمرہ کے ایک گوشہ میں پردہ پڑا ہوتا تھا۔ حرم شاہی کو اجازت

تھی کہ پردے کے اندر سے تماشا دیکھیں۔ ہاتھیوں اور درندوں کی لڑائی دیکھنے کے لئے بھی حرم شاہی ساتھ رہتا تھا۔ بیگمات کے علاوہ بہت سی نظر کردگانِ شاہی، زنڈیاں، ڈومنیاں، خواصیں، پیش خدمتیں اور پہرہ داریاں وغیرہ بھی جاتی تھیں۔ اسی طرح دیگر مردانہ تفریحات میں بھی بیگمات شریک ہوتی تھیں۔ لیکن ان کی تفریحات یہیں تک ختم نہیں ہو جاتی تھیں۔ اُن کے ذاتی مشاغل بھی ہوتے تھے۔ مثلاً تمام محلات اور مخصوص ڈیوڑھیوں میں بیگمات کے الگ الگ دربار ہوتے تھے ——— ڈومنیوں کا طائفہ اپنے کمالات سے بیگموں کو خوش کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور دلچسپ مشغلہ داستان گوئی تھا۔ اس خدمت کے لئے ہر محل میں دو چار داستان گو عورتیں ملازم ہوتی تھیں جو طرح طرح کی دلچسپ داستانیں بیان کیا کرتی تھیں۔ اس سلسلے میں داستان امیر حمزہ، الف لیلہ وغیرہ کو بہت فروغ ہوا۔ ان عورتوں کو بیشمار داستانیں حفظ ہوتی تھیں۔ پھر ان داستانوں کو اشارات و کنایات کے ساتھ سنایا جاتا تھا۔ کبھی کبھی بیگمات گنجفہ، شطرنج اور چوسر کے کھیلوں سے بھی اپنا جی بہلاتی تھیں۔ مثنویاں شہادت نامے اور مرثیے بھی پڑھے جاتے تھے۔ چاندنی راتوں میں کبھی کبھی آنکھ مچولی اور اسی قسم کے دوسرے کھیل بھی کھیلتی تھیں۔

ان تمام مشاغل کے علاوہ کچھ خاص و وقتی مشاغل بھی تھے، جن میں شادی اور غمی کی تقریبوں کو خاص اہمیت دیجاسکتی ہے۔ حکومت اور دولتمندی نے بیگمات کے ارمان بڑھا دئے تھے۔ ولادت سے لے کے شادی تک لڑکے کی ہر خوشی و کامیابی ایک تقریب بن جاتی تھی۔ پیدائش کے بعد ہی چھٹی، چھلّہ، اور درمیان کے بہان عقیقہ، کھیر چٹائی، دودھ بڑھائی، بسم اللہ، ختنہ اور سب سے بڑھکر عقد نکاح۔ یہ سب بجائے خود خوشی کی تقریبیں ہیں۔ بچوں کی سالگرہ بھی ہوا کرتی تھی۔ ان کے علاوہ غسل صحت یا کسی خاص مقصد کے پورے ہونے پر بھی خوشی کی غیر معمولی تقریبیں ہو جاتی تھیں۔ بڑے گھروں میں ان تقریبوں کے لئے بڑے بڑے اہتمام ہوتے تھے اور بعض تقریبوں کی مہینوں پہلے سے تیاریاں ہونے لگتی تھیں اور بیگمات کا انہماک بڑھ جاتا تھا۔ اکثر تقریبوں میں رت جگا بھی ہوتا تھا (اور اب بھی ہوتا ہے) جس میں ڈومنیاں "اللہ کی سلامتی" کا نغمہ گاتی ہیں۔ شب زندہ داری ہوتی ہے۔ مگر عبادت کے لئے نہیں بلکہ گانے بجانے، رات بھر دھما چوکڑی مچانے اور صبح ہوتے ہی مسجد میں جا کے اللہ میاں کا طاق بھرنے کے لئے۔

ہم کو بیگمات اودھ کی ایک نمایاں خصوصیت اور بھی نظر آتی ہے۔ یہ اُن کے مذہبی رسومات ہیں۔ ہندوستان میں مذہبی رسومات کی پابندی بڑی سختی سے کی جاتی ہے۔ فرمانروایان اودھ اور اُن کے خاندان والے شیعہ مذہب کے پیرو تھے۔ شاہی کا زمانہ تھا مذہب کی تمام رسمیں نہایت کرّو فر سے انجام دی جاتی تھیں۔ ان مذہبی رسموں میں سب سے زیادہ اہمیت محرم کو حاصل تھی۔ بیگمات شاہی کے امام باڑے محلات کے اندر علیحدہ علیحدہ تھے۔ بڑے بڑے امرا کی محلسراؤں میں بھی امام باڑے ہوتے تھے۔ محرم کے دنوں میں ان کی شان اور آرائش دیکھنے کے قابل ہوتی تھی۔ ان کی مجلسوں میں عورتیں ہی سوزخوانی و حدیث خوانی کیا کرتی تھیں۔ ماتم کے ساتھ نوحہ خوانی ہوتی تھی۔ بیگمات اپنے زیور بڑھا دیتی تھیں اور ساتویں تاریخ سے بالوں کو پریشان کر کے مختلف قسم کی نمازوں، دعاؤں، اور دیگر رسموں میں مشغول رہتی تھیں۔ محرم کی دسویں تاریخ کو سب فاقہ کرتی تھیں۔ بعض بعض خوش عقیدہ تو ساتویں تاریخ ہی سے کھانا پینا بند کر دیتی تھیں اور اُن کے حال و قال سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اُن کا کوئی عزیز دنیا سے اُٹھ گیا ہے۔ بلکہ اکثر بیگمات تو ایسی تھیں کہ اپنے عزیزوں کے لئے اتنا غم

نہ کرتی تھیں جتنا اپنے امام مظلوم شہید کربلا کیلئے کرتی تھیں اور کیوں نہ کرتیں؟ یہ بخشش کی سند تھی اور نجات کا ذریعہ۔ اہلبیت کی محبت جزو ایمان تھی جو روٹی تعزیئے کے ساتھ تقسیم کی جاتی ہے مسلمان عورتوں کے عقیدے میں ایک تبرک ہوتی ہے۔ اکثر بیگمات روٹی کا ایک ٹکڑا حاصل کرنے کے لئے اپنے نوکروں چاکروں کو تعینات کر دیتی تھیں حالانکہ خود منوں آٹے کی روٹیاں خیرات کراتی رہتی تھیں۔ محرم کے دنوں میں جدھر جاؤ دلدوز اور دلخراش نغمے کانوں میں پڑتے تھے۔ شب عاشور کو شام غریباں کی مجلس ہوتی تھی جس میں چراغ نہیں ہوتا۔ اکثر عورتیں شہر سے دور کربلا جایا کرتی تھیں اور وہاں ننگے سر اور ننگے پیر نوحے اور مرثیے پڑھا کرتی تھیں۔ بعض بیگمات کو سوز خوانی میں کمال حاصل تھا۔ مولانا شرر لکھتے ہیں:۔

"ایک سال چہلم کے موقع پر چند احباب کے ساتھ تال کٹورے کی کربلا میں ایک خیمہ میں شب باش ہوا۔ دو بجے رات کو یکایک آنکھ کھلی تو ایک ایسے دلکش نغمے کی آواز کان میں آئی جس نے سب دوستوں کو جگا کے بیتاب کر دیا۔ ہم سب اس آواز کے شوق میں خیمے سے نکلے اور دیکھا کہ آخر شب کا سناٹا ہے' چاندنی کھیت کئے ہوئے ہے اور اس میں عورتوں کا ایک غول تعزیئے لئے ہوئے آرہا ہے۔ سب بال کھولے سر برہنہ ہیں۔ بیچ میں ایک عورت شمع ہاتھ میں لئے ہے۔ اس کی روشنی میں ایک سرو قد نازنین چند اوراق میں سے پڑھ پڑھ کے نوحہ خوانی کر رہی ہے اور کئی اور عورتیں اُس کے ساتھ گلے بازی کر رہی ہیں۔ اُس سناٹے' اُس وقت اُس چاندنی' اُن برہنہ سر حسینوں اور اُس پرسوز وگداز نغمے نے جو سماں پیدا کر رکھا تھا' اُسکو میں بیان نہیں کر سکتا۔ نازک اداؤں کا یہ مجمع جیسے ہی کربلا کے پھاٹک میں داخل ہوا تو اُس سرو قد نازنین نے پریج کی دھن میں یہ نوحہ شروع کیا ؎

جب کاروانِ شہر مدینہ لٹا ہوا پہنچا قریب شام کے قیدی بنا ہوا
نیزے پہ سر حسین کا آگے دھرا ہوا اور پیچھے پیچھے بیبیوں کا سر کھلا ہوا

اس مناسب حال مرثیہ نے ایسا سماں باندھ دیا کہ شبہہ ہوتا تھا کہ ان اشعار کے ذریعہ سے وہ خاتون واقعۂ کربلا کی تصویر کھینچ رہی ہے' یا خود اسی ماتمی جلوس اور اپنے داخلۂ کربلا کی۔"

محرم کے علاوہ پنجتن اور ائمہ معصومین کی ولادت اور وفات کی تاریخوں میں بھی خاص اہتمام ہوتا تھا۔ ۱۳ رجب کو حضرت علی کی ولادت کا جشن ہوتا تھا جس میں قصائد پڑھے جاتے تھے۔ شب برات کو بھی جو امام مہدی آخرالزماں کی پیدائش کا زور ہے خوب جشن ہوتا تھا۔ رات کو مرد اور عورتیں دریا میں عریضہ ڈالتے تھے۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ شاہانِ اودھ اور اُن کے اہل خاندان شیعہ مذہب کے پیرو تھے۔ حکومت اور امارت نے شاہی بیگمات کے مذہبی انہماک کو بھی بہت بڑھا دیا تھا۔ چنانچہ بادشاہ بیگم کی مذہبی سرگرمی نے مذہب شیعہ میں نئی نئی بدعتیں ایجاد کیں جن کی وجہ سے بادشاہوں اور امرا میں طرح طرح کی طفلانہ مزاجیاں پیدا ہو گئیں۔ سب سے پہلے بیگم صاحبہ نے امام صاحب العصر کی چھٹی کی رسم قرار دی۔ اس رسم میں امام ممدوح کے حالات بیان کر کے ثواب حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی تھی بلکہ ہوتا یہ تھا کہ ہندوؤں کے جنم اشٹمی کے تیوہار کے موافق پورا زچہ خانہ مرتب کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد یہ ترقی ہوئی کہ صحیح النسب سیدوں کی خوبصورت

لڑکیاں لے کے ائمہ اثنا عشر کی بیبیاں قرار دی گئیں جن کا نام "اچھوتیاں" رکھا گیا' اور جب وہ اماموں کی بیبیاں تھیں تو پھر اُن کے وہاں اماموں کی ولادت بھی ہوتی' اور بارہ اماموں کی ولادت کی تقریبیں بڑے کروفر سے منائی جانے لگیں۔

"شجاع الدولہ کا طبعی میلان مہ جبیں عورتوں اور رقص وسرود کی طرف تھا جسکی وجہ سے بازاری عورتوں اور ناچنے والی طائفوں کی شہر میں اس قدر کثرت ہوگئی تھی کہ کوئی گلی کوچہ اُن سے خالی نہ تھا۔ نواب صاحب جب اضلاع کا دورہ کرتے اور سفر میں ہوتے تو نوابی خیموں کے ساتھ ساتھ رنڈیوں وغیرہ کے خیمے بھی شاہانہ شکوہ سے چھکڑوں پر لد لد کے روانہ ہوتے اور اُن کے گرد دس دس بارہ بارہ تلنگوں کا پہرہ رہتا۔ جب حکمراں کی یہ وضع تھی تو تمام امراء اور سرداروں نے بھی بے تکلف یہی وضع اختیار کرلی اور سفر میں سب کے ساتھ رنڈیاں رہنے لگیں۔ بداخلاقی اور بے شرمی کو ترقی ہوگئی۔ نصیر الدین حیدر اپنی زنانہ مزاجی اور طفلانہ حرکتوں کے لئے مشہور ہیں۔ واجد علی شاہ کو حسین اور آوارہ عورتوں کی صحبت مرغوب تھی۔ ان کے عہد حکومت میں ارباب نشاط کا بازار گرم ہوا اور تھوڑے ہی دنوں میں ڈوم ڈھاری ارکانِ دولت اور معززین سلطنت ہوگئے۔ کہاریاں' رنڈیاں خواصیں' محل میں آنے جانے والی عورتیں مثلاً سقنی۔ مہترانی وغیرہ تک بیگمیں بن گئیں تو ظاہر ہے کہ سوسائٹی کا نام ضرور بدنام ہوگا۔ جب مرد کھل کھیلے تو اُنکی عورتیں پارسا نہیں ہوسکتیں۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ لکھنؤ میں عورتوں کے اخلاق اتنے خراب نہیں ہوئے جتنے مردوں کے خراب ہوئے تھے"۔

جس طرح پرانے زمانے میں قسطنطنیہ کے ایوان شاہی کی روائتیں سنی گئی ہیں' اسی طرح اودھ میں بھی بدوضع اور معتوب بیگماتِ شاہی بہت ہی چپ چپاتے دنیا سے دور دفان کردی جاتی تھیں' اور یہ کام انھیں پیش خدمتوں یا خواجہ سراؤں کے ہاتھوں انجام پاتے تھے۔

ہم نے بیان کیا ہے کہ بیگمات اودھ میں بہت ہی کم درجہ عورات تھیں۔ لیکن ان میں جو بیگمات اعلیٰ خاندانوں سے تھیں' اُن کے اخلاق' حسنِ سلوک' نیکی' رحمدلی' روشن خیالی' عالی دماغی وغیرہ صفات کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ بعض بیگمات نے اپنے تدبر' ہمت وری اور دوراندیشی کا ایسا اچھا ثبوت دیا ہے کہ اگر کسی اور زمانے میں پیدا ہوئی ہوتیں اور گرد وپیش کے حالات ذرا تبدیل شدہ ہوتے تو اُن کے کارنامے نمایاں دنیا کی تاریخ میں بہت روشن حرفوں میں نظر آتے۔ پھر بھی اُن کی شجاعت پامردی پر آفریں کہنا چاہئے۔ ایسی بیگمات میں نواب عالیہ صدرالنسا بیگم (والدۂ شجاع الدولہ)۔ جناب عالیہ متعالیہ بہو بیگم صاحبہ (والدۂ آصف الدولہ)۔ بادشاہ بیگم صاحبہ (والدۂ نصیر الدین حیدر) خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ اودھ کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ کی والدۂ محترمہ نے بھی کچھ کم ہمت کا کام نہیں کیا کہ بیٹے کی وکالت کرنے کو ولایت تک گئیں۔

شاہی بیگمات تو اپنے ہاتھ سے کوئی کام نہ کرتی تھیں لیکن امرا کی بیگمات مختلف طریقوں سے اپنی ہنرمندی کا اظہار کرتی رہتی تھیں۔ سینا پرونا۔ کاڑھنا۔ گھروں کی صفائی کا انتظام کرنا' ماماؤں لونڈیوں اور پیش خدمتوں سے کام لینا وغیرہ نسوانی کام حسب ضرورت انجام دیتی تھیں۔ اور دسترخوان کی آراستگی میں تو انھوں نے ایسا اچھا سلیقہ پیدا کرلیا تھا کہ ان کے آگے

ارمی ماند پڑ گئے ۔ درحقیقت اس دور میں مرد گھروں میں بیٹھے کھیلا کرتے تھے ۔ گھر بار اور دنیا کا سارا کارخانہ فقط عورتوں کے چل رہا تھا ۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستانی زنانخانوں سے بڑھ کر کسی مہذب سے مہذب قوم کی عورتوں میں بھی یہ نیک نیتی یہ پاکدامنی اور یہ جوہر شرافت نظر نہیں آ سکتے ۔ ایک انگریز مصنف کا یہ قول بالکل درست ہے کہ "اگر ہندوستان کبھی نجات پائے گا رتوں کی عفت اور محاسنِ اخلاق کی وجہ سے نجات پائے گا"

یہ بیان نامکمل رہ جائے گا اگر پاندان کا ذکر نہ کیا جائے ۔ بعض محلات اور بیگمات کے پاندان کے خرچ کے لئے جاگیریں دی جاتی تھیں ۔ امرا میں بھی ہزار پانسو ماہوار پاندان کے خرچ کے نام سے بیگمات کو دیا جاتا تھا ۔ اس لحاظ سے گھر کی عورتوں میں پاندان نہایت ضروری چیز ہے جو رفتہ رفتہ صندوق، خزانے اور کیش بکس کا کام دینے لگا، اور اسی ضرورت وسعت اور جسم میں بڑھنا شروع ہوا، یہاں تک کہ دس دس اور بیس بیس سیر کے پاندان بننے لگے ۔ یعنی جتنا بڑا پاندان بڑی بیگم صاحبہ کی حیثیت اور وجاہت سمجھی جاتی تھی ۔

آخر میں یہ بھی عرض کر دوں کہ مرزا شوق کی مثنویوں اور رنگین صاحب کی ریختی سے جو خیالات بیگمات کے بارے ہو سکتے ہیں وہ حقیقت پر مبنی نہ تھے ۔ وہ تو بازاریوں کا تذکرہ ہے جو معزز گھرانے کی عورتوں کے سر تھوپ گیا ہے ۔ ویسے تو وقوم میں عورتوں کی زبان مردوں سے زیادہ دلکش ہوتی ہے ۔ لیکن لکھنؤ میں یہ خاص بات تھی کہ محلات اور محترم خاندان کی کی زبان میں نسائی دلفریبیوں کے علاوہ ادبی اور شاعرانہ نزاکتیں پیدا ہو گئی تھیں ۔ کچھ تو عیش و عشرت کے لوازم کی زیادتی نے رہب کی شاہانہ رسومات نے نئے الفاظ کا ذخیرہ جمع کر دیا تھا ۔ پھر قصیدہ خوانی اور مرثیہ خوانی کے ذوق نے ان کی زبان کو اور بھی بنا دیا تھا، اور امرائے لکھنؤ کی بہت سی بیگموں میں شاعرانہ مذاق پیدا کر دیا تھا جس کی جھلک لکھنؤ کے بعض گھرانوں میں اب بھی ہے ۔

فسانہ و محاضرات

تبدیلی

از جناب شاد سہسوانی احمد صاحب کاشف [illegible]

(۱)

ڈاکیہ کی آواز سنتے ہی چارپائی سے اُٹھ بیٹھا اور باہر دروازہ
ک گیا۔ ہلکے گلابی رنگ کا لفافہ دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ منظر صاحب
ازل ہوئے ہونگے۔ لفافہ چاک کرنے ہی کو تھا کہ اچانک پتہ پر نظر
ڑی۔ ہاتھ رک گئے۔ سر جھکائے ہوئے بیوی کے پاس پہنچا اور
فافہ حوالہ کر کے پھر اُسی چارپائی پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد
گھر والوں سے نظر بچا کے اہلیہ نے خط میری طرف بڑھا دیا۔
یرے عزیز دوست منظر نے میرے متعلق یوں دریافت حال
کیا تھا:۔

"منظفر پور
۲۹ اپریل سنہ ۴۰ء

محترمہ تسلیم

شاید اسے عرصہ دو ماہ سے کم نہیں ہوتا کہ میں نے احمد آباد سے سہیل صاحب کی خدمت میں کلکتہ کے پتہ پر ایک لفافہ روانہ کیا تھا۔ لیکن جواب نہ دیکر مجھے یقین دلایا جا رہا ہے کہ وہ بہت سرعت کے ساتھ تبدیل ہو رہے ہیں۔ آنکی اس تبدیلی میں کس کا ہاتھ کارفرما ہے؟ قطعی ناواقف ہوں گویا یوں سمجھئے کہ میرے لئے وہ کھو گئے ہیں نہ معلوم کس نے پا یا۔"

خط کا بقیہ حصہ ختم کر کے میں اپنی گذشتہ زندگی پر غور کرنے لگا مجھے اپنے دل و دماغ کی تبدیلی پر افسوس ہو رہا تھا۔ یہ منظر تھے جن کی ایک گھڑی کی جدائی شاق گذرتی تھی۔ اور کبھی الگ ہوئے تو خط و کتابت کا سلسلہ نیم ملاقات کی حد تک قائم ہو جاتا۔ میری تحریر دلنشیں بنکر اُن کے دل میں جگہ پاتی اور اُن کے معنی خیز مزاح سے میرا دل شگفتہ ہو جاتا چہرے پر بشاشت سی آجاتی ——— یہ اور اسی قسم کے خیالات میرے دماغ میں چکر کھانے لگے۔ گذشتہ یکجائیوں اور ہمنوائیوں کی تمام تصویریں نگاہوں میں گھومنے لگیں۔ میں اسیطرح اپنے تصورات میں کھویا ہوا تھا کہ میری بچی شہناز شور مچاتی ہوئی آئی اور شرارت سے خط چھین کے بھاگ گئی۔ گویا میری آنکھیں کھل گئیں۔ چونک سا گیا۔ وہاں سے اٹھ کر کمرے میں گیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ پھر اُسی موضوع پر خیالات مجتمع ہونے لگے۔ یکسوئی ہو چلی تھی کہ اہلیہ آموجود ہوئیں۔

"آخر آپ آج کل سارے جہان سے بیزار سے کیوں ہو گئے ہیں۔ سمجھتی تھی کہ میرے ہی خطوں کے ساتھ یہ طریقہ برتا جاتا ہو گا مگر معلوم ہوا کہ یہ خاص روش بھی عام ہو گئی۔ آپ کی طرف سے کسی کی مزاج پرسی گراں شاق ہے تو کم از کم دوسروں کے بڑھائے ہوئے ہاتھوں کی تو قدر کرتے۔ محبت اور خلوص ہی تو ہو گا جس نے منظر صاحب کو آپ کے نام خط لکھنے پر مجبور کیا ہو گا۔ میں

نہیں کہتی آپ ہی کا قول ہے کہ میں حلقۂ احباب کی وسعت کا قائل نہیں ـــــــ یہ ٹھیک بھی ہے دوستی اور راہ و رسم سے پہلے نباہ کا خیال مقدم ہونا چاہیئے۔ اور اسی خیال کے پیش نظر آپ کے اِنے گنے چند دوست ہیں جو آپ کی زبان میں کیا ب بھی ہیں پھر اُن کے ساتھ یہ بیگانگی کیسی؟ آخر اس کفرانِ نعمت کے کیا معنے"

"خیر اس داستان کو تو ختم کرو۔ کم از کم اس خط کا جواب لکھدو۔ سر دست تم ہی پر یہ فرض عائد ہوتا ہے"

(سنجیدہ کے چہرے پر مسکراہٹ کی لہر دوڑ جاتی ہے) "جی ہاں آپ کی عنایتوں سے اس قابل بھی تو نہیں رہی۔ میری طرف سے آپ ہی اب جواب لکھدیجئے اور میرے "عذر معقول" سے انکو آگاہ بھی کر دیجئے۔ میرے پاس لفافہ موجود ہے' ابھی لاتی ہوں"

اہلیہ کے سامنے لفافہ پر پتہ لکھ کر اپنے سرہانے میں ڈال دیا۔ خیال تھا کہ کبھی اور وقت ذرا یکسوئی کے ساتھ خط لکھونگا۔ لیکن زندگی میں جب ایک سستی سی آجاتی ہے تو عزم اور ارادہ سے انسان کنارہ کر لیتے ہیں۔ دھیان بھی نہ رہا کہ میں نے کسی کام کے لئے کوئی وقت مقرر کیا ہے یوں سمجھئے کہ بھول گیا۔ وہ ساعت ہی نہیں آئی کہ خط لکھوں۔ کئی دن کے بعد جب چادر بدلنے کے خیال سے اہلیہ نے بستر کو الٹ پلٹ کیا تو اُسی لفافہ پر نظر پڑی دل جل گیا تیز ہو کے کہنے لگیں:۔

"اس ہوش و حواس کے صدقے! آج کئی دن ہو گئے اور یہ لفافہ یہیں سڑ رہا ہے۔ میں سمجھ رہی تھی کہ مظفر پور پہنچ بھی گیا ہوگا۔ حد ہو گئی۔ مخلص اور لائق دوستوں کی قدر و قیمت آج معلوم ہوئی۔ جو غریب حافظہ میں بھی نہ رہ سکیں اُن کے لئے سچ ہے دل میں کہاں سے جگہ نکالی جائے"

"لاحول ولا قوۃ واقعی عجیب حالت ہو گئی ہے۔ خیر گرجنا برسنا ختم کرو۔ لو ابھی لکھے دیتا ہوں"

بدن جھاڑ کے اُٹھا اور ایک لمبا سا پرزہ جو انبار کے کاغذ کی طرح تھا اُٹھایا اور منتظر کے تمام جواب طلب امور پر تفصیل کے ساتھ لکھتا چلا گیا۔ خط کو یوں ختم کیا:۔

"چونکہ شہناز سلمہا کے نئے بھائی یا بہن کی تشریف
آوری کا زمانہ بہت قریب ہے اسی لئے جواب
میں خود لکھ رہا ہوں جو اصولاً میرا فرض نہ تھا۔
اس معاملہ میں اہلیہ سے زیادہ میں نادم ہوں
گردن نہیں اُٹھا سکتا' بڑی جراءت کی ہے تو اتنا
کہہ دیا ہے۔ اس مختصر ہی کو اپنے مان جانے کے
لئے دفتر سمجھو۔"

(۲)

صبح کے ناشتہ کے طور پر گرم گرم بیسنی روٹیوں کا دور تھا۔ گاؤں گاؤں کی تمام چیزوں سے مجھے عشق ہے۔ مزے آرہے تھے چٹخارے لے لے کر کھا رہا تھا۔ میں اور میرے سامنے چچا صاحب اور میرے برابر میری بچی شہناز تھی۔ توے سے روٹیاں اترتی تھیں اور ہمارا دسترخوان گرم ہوا جاتا تھا۔ اسی حالت میں میاں فہیم میرے نام کا ایک لفافہ لائے۔ بڑی کشمکش کا سامنا ہوا سامنے دسترخوان اور ہاتھ میں لفافہ کے اندر کرم شیر کا خط ہے۔ جب روٹیوں کی طرف ہاتھ بڑھتا تو لفافہ نظر سے دور ہو جاتا اور جب رفیق قدیم کی تحریر کا اشتیاقی غلبہ پاتا تو لقمے حلق میں اٹکتے۔ بہت دیر تک اس کھینچ تان کی تاب نہ لا سکا بالآخر اٹھ گیا لفافہ چاک کیا خط کا مضمون یہ تھا۔

"چکندپور
۶ جون سنہ ۴۰ء
مشفق بندہ تسلیمات
ایک طویل عرصہ ہوا کہ خط و کتابت کا سلسلہ بند ہے۔
گو برادرم فلک شیر سے تمہاری خیریت معلوم ہوتی
رہی۔ تم نے ایسی خاموشی اختیار کی ہے کہ معلوم
ہوتا ہے کہ کبھی دوستی اور ملاقات تھی ہی نہیں۔"

پوری تحریر بمشکل چوں توں ختم کی دل پر ایک افسردگی سی چھا گئی۔ یوں تو اپنی ہستی بارہا معلوم ہی ہوتی تھی مگر آج اس نے اپنا رہا سہا وقار بھی میری نظروں میں کھو دیا تھا۔ یہ شکایتیں میری ذات سے میرے ان مخصوص دوستوں کو تھیں جن کے ہر طرح کے سخت سست ظلموں اور نرم گرم رویوں کے باوجود دل انہی کی محبت کا تابع ہو کر رہنا پسند کرتا۔ یہ واقعات میرے حساس دل و دماغ کے لئے معمولی نہ تھے۔ ان مشفقوں کی عنایتوں اور نوازشوں کے گہرے نقوش جو میرے صفحۂ دل پر نقش تھے ابھر ابھر کے نگاہوں کے سامنے آ گئے۔ خیالات ہی کے عالم میں مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ منظر کا ہنستا ہوا چہرہ میرے سامنے ہے اور ظالم کی شریر نگاہیں مجھ سے پوچھ رہی ہیں۔ ع

آنکھیں تو ملاؤ دل کہاں ہے

اور ابھی یہ پیاری پیاری صورت ہٹنے بھی نہ پائی تھی کہ کرم اپنی کرم گستری کے ساتھ نگاہوں میں گھومنے لگے اور اپنی نوازش نگاہوں سے میری زندگی کی اس نئی کروٹ کا ہمدردانہ جائزہ لینے لگے۔ میں محجوب ہو رہا تھا اور وہ نگاہیں سینہ چیر کے دل کی تہوں میں ڈھونڈھ رہی تھیں، کہ کیا واقعی یہ دل دوستوں کی محبت سے خالی ہو گیا ہے۔

(۳)

تقریباً تین ماہ کا عرصہ ہوتا ہے کہ میں کلکتہ سے اپنے وطن موضع سلیم پور آیا ہوا تھا۔ یہاں دھوپ، ہوا، فضا اور کشادگی کی نعمت اتنی کثرت اور افراط سے خداوند فطرت کی طرف سے تقسیم ہوتی کہ مجھے اپنا دامن تنگ نظر آتا۔ انہی چیزوں کی کمی نے مجھے کلکتہ کے تنگ و تاریک مکانوں میں ستایا تھا اور آج یہی چیزیں تھیں کہ گاؤں میں ہر آدمی کے پاؤں کے آگے گویا ان کا ایک لازوال انبار لگا ہوا تھا اس سے فائدہ اٹھانے والوں میں ایک شانِ استغنا پائی جاتی تھی۔ بلکہ بعض اوقات کفرانِ نعمت کی حد تک انکی بے پروائی طرح طرح سے ظاہر ہوتی۔ ہوا کے تیز و تند جھونکوں کے سامنے اونچی اونچی دیواریں کھڑی کی گئی تھیں۔ روشن اور چمکدار دھوپ کے مقابل کھپریل اور تہ بہ تہ چھپر تیار کئے گئے تھے جدھر آنکھیں اٹھاؤ منزلوں میدان خالی ہے فضا کی اس بے پناہی کیلئے پہاڑوں اور ندیوں کے دامن کا سہارا لیا گیا تھا۔ سوچیے میرا محسوس کرنے والا دل ان پر کیف مناظر کو کیونکر نظر انداز کر سکتا تھا۔ خدا کے یہاں سے ان نعمتوں کی بارش ہوتی تھی اور میں لوٹتا تھا۔ کھیتوں میں پھرتا، میدانوں میں ہوتا ہوا پہاڑوں پر جاتا، ندی کے کنارے بڑے بڑے سایہ دار درختوں کے نیچے پاؤں پھیلا کے بیٹھ جاتا۔ کھیتوں میں کسانوں کی دلکش تانیں سنتا اور سوچتا کہ ان نغموں میں کون سا جادو ہے جو انہیں صدیوں سے غمِ حیات کی تلخی محسوس نہیں ہونے دیتا۔ اکثر ان کے مفہوم تک پہنچنے کی ناکام کوششیں بھی کرتا۔

گاؤں میں بڑے زمیندار اور نامی طبیبوں کی متعدد نشستیں اور بیٹھکے بنے ہوئے ہیں۔ اپنے اپنے مذاق کے مطابق لوگ صبح شام الگ الگ جگہوں میں جا کے بیٹھتے ہیں۔ کہیں مدک کے چھینٹے اڑ رہے ہیں، کہیں حقہ کے کش چل رہے ہیں، کہیں بڑے اہتمام سے آشمانی ڈھل رہی ہے، پٹنے اور کلکتے سے آئے ہوئے لوگوں سے اور بھی بزم کی رونق دوبالا ہے۔ جنگ کی خبریں اور حالات بیان کئے جا رہے ہیں، قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں، آلات جنگ کی حیرت انگیز ایجادوں پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی جا رہی ہے، فریقین جنگ کا مناظرانہ انداز سے موازنہ اور مقابلہ ہو رہا ہے۔ کبھی قدیم نمک خواریوں کا مظاہرہ ہو جاتا ہے، کبھی نیاز مندانہ شکایتیں لب پر آ ہی جاتی ہیں۔ بالآخر دنیا اور اسکی تمام فریب کاریوں پہ ماتم کر کے۔ لے خدا کا نام اور آرام کر — کہہ کے مجلس برخاست ہو جاتی ہے۔

گاؤں کی زندگی کا یہ پہلو مجھے پسند نہیں اس لئے ان تمام نشستوں اور بیٹھکوں کو میں قابل التفات نہیں سمجھتا۔ بیشتر یہاں سے کتراتا پھرتا اور بہت گھیرنے کے بعد پھنسا بھی تو گفتگو اور بحث میں حصہ لینے کے بجائے پیچھا چھڑانے کی فکر میں رہتا۔ گاؤں کے ہم عمر دوست احباب جن کی جماعت میں کسی زمانے میں میں روح رواں کی حیثیت رکھتا تھا۔ میری اس تبدیلی اور تنہا پسندی کا سبب میری اہلیہ کو قرار دیتے اور جب کبھی ادھر اُدھر راہ میں ملاقات ہو جاتی تو اپنے قیاس پر خلوت رنگین کی طرف اشارہ کرتے میں ان کی سادگی پر دل میں ہنسا کرتا اور سوچتا کہ جب تک کسی پر اپنا نقطۂ نظر واضح نہ ہو اپنے متعلق دوسروں کے نقطۂ نظر کافی دلچسپی کا سامان رکھتے ہیں۔ بزرگوں سے مڈبھیر ہوتی تو صحت اور تندرستی ہی کے خیال سے وہ ارباب نشاط کا رکن بننے کی دعوت دیتے۔ میں اپنی سمجھ کی کوتاہی تسلیم کر کے اُن کے سن و سال اور ریش دراز کا احترام کرتا۔ مہذب اور شائستہ صحبتوں کو چھوڑ کر کھیت کھلیان اور مویشی کسان سے میرا دلچسپی لینا یونیورسٹی اور کالج کے نئے سند یافتہ دوستوں کو بہت گراں گذرتا بعض جلد فیصلہ کرنے والی طبیعتوں کا اصرار رہتا کہ میں کلچرڈ سوسائٹی سے محرومی کا صاف اعلان ہوں تعلیم نے میرے زنگ آلود دل پر صیقل کا کوئی کام ہی نہیں کیا ہے۔

گاؤں کی ان تفریح گاہوں کے بعد پھر میری توجہ کا دوسرا مرکز اردگرد کے حالات تھے۔ میں اپنے گرد و پیش کے ماحول کو کبھی سرسری طور سے نہیں دیکھا کرتا۔ گھر والوں کی کھوکھلی سفید پوشی، تعلیم و تربیت سے محروم بچوں کی قدرتی آوارہ گردی۔ مالی مشکلات کی بنا پر عزیزوں میں ازدواجی تعلقات میں کشیدگی، بیماروں کے مناسب مگر گراں علاج کے سامنے جن جناّت، آسیب سایہ کی تاویلیں اور اس لئے دعا تعویذ اور جھاڑ پھونک میں پناہ کی جستجو، ان پڑھ بیویوں کی چیخ پکار اور بے صبری، نادار شوہروں کی کوفت اور دل گرفتگی، بڑے بوڑھوں کی نئے زمانے سے بیزاری، پیارے پیارے ننھے ننھے بچوں کی پیدائش پر حقیقی خوشی کا فقدان — یہ اور اس قسم کے دیگر حالات تھے جو میرے سامنے مستقل غور

ا؎ اطراف مگدھ میں تاڑی کے لئے یہ مہذبانہ اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ —— کاشت

دفکر کے موضوع بن کر پیش ہوتے تھے۔ سوچتا تھا اور سمجھ میں نہیں آتا تھا، غور کرتا تھا اور چکر آنے لگتے تھے، ڈھونڈھتا تھا اور راہیں نہیں ملتی تھیں۔ بارہا پوری پوری راتیں جاگ کے گذریں۔ اکثر چہل پہل اور زیب و زیبائش والے دن کونوں اور گوشوں میں گذرے۔ جس کو کم ظرف چھوٹی طبیعت کا کہا گیا میں نے اُسے ہمدردی کا مستحق سمجھا، جب کوئی آوارہ، بدچلن، بے پروا، بے فکرا اور ناعاقبت اندیش کہہ کر پکارا گیا میں نے اُسے دنیا کے محروموں میں شمار کیا، صحت مند اور تندرست معلوم بچے جب کند ذہن، کوڑھ مغز، کھلاڑی اور بدشوق کہہ کر پکارے، "بھولے رکھے گئے" تعلیم کے تمام جدید طریقوں کے خاکے میری نگاہوں میں گھومنے لگے مجھے ان سب کا اصلی سبب معلوم تھا۔ مجبوریوں، کوتاہیوں، خامیوں اور غلطیوں کو میں نے اتنے قریب سے دیکھا تھا کہ سب کی سب مجسم اور متشکل معلوم ہوتی تھیں۔

اسی ادھیڑبن میں کھویا ہوا رہتا تھا۔ اس مصروفیت نے مجھے بہت سے دلچسپ مشاغل سے الگ کر دیا تھا۔ بیک وقت متعدد فرائض کی انجام دہی مشکل تھی اس طرف زیادہ جھکنے کی وجہ سے دوستوں کی طرف سے غافل ہونا پڑا۔ احباب مجھے سمجھنے سے قاصر تھیں۔ دوستوں کے دل شکایتوں سے لبریز تھے، بزرگوار میری اس روش سے ناخوش تھے [illegible] سنسان زندگی سب کو گراں گذرتی تھی۔ مجھے خوب معلوم تھا مگر وہ اگلی زندگی جو نسانی، الفاظی، نقرے، جملے اور قہقہے سے عبارت تھی رخصت ہو چکی تھی اب یہ تقاضے کیونکر پورے ہوں کانٹوں میں گھر کر پھول کھلا رہ سکتا ہے۔ مگر کھٹک موجود ہو اور دل کا کنول کھلے ممکن نہیں۔

تحفہ ربیع الاوّل

اسلام کی حقیقت

مصنفہ جناب ابوظفر محمد بدرالدین خاں ایم اے آنرز سب رجسٹرار

اس کتاب میں بعثت نبی صلعم کی حالت آپ کی حالات زندگی۔ وصال، معراج و معجزات اسلامی تمدن انفرادی اور اجتماعی زندگی اسلام اور حریت ضمیر سرمایہ و مزدور کا ملاپ، پیغام عمل و حیات، مادہ و روح کا رابطہ اور ازدواج کی تاریخی و سیاسی اہمیت، وحدانیت کا مفہوم، قومیت اور ہجرت کے فلسفے قرآن مجید کی پیشینگوئیاں۔ اسلام کا یورپ میں اثر اقتصادی و سماجی بحث گیوں دولت و غربت کی باہم توازن آزمائیوں کا حل وغیرہ وغیرہ اس قسم کے بیشمار مضامین پر اس کتاب میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا کی تمام گتھیوں کو سلجھانے کا واحد ذریعہ اصول اسلام کی پیروی ہے نیز قیام و مناجات بھی نثر طور پر درج کئے گئے ہیں چند رائیں جو ابھی تک توصول ہوئی ہیں یہ ہیں۔

(اخبار وحدت وادالامان دہلی کی رائے (تاریخ ۱۱ و ۳ اگست سنہ ۱۹۴۰ء)

"مصنف اس مختصر کتاب میں پیغمبر اسلام کی حیات طیبہ پر روشنی ڈالتے ہوئے اسلام کی حقیقت اسکی افادیت و اہمیت کو بخوبی واضح کر دیا ہے نیز بعض اہم اسلامی مسائل کو دلکش پیرایہ میں بیان کرکے نہایت آسانی طریقہ پر سمجھانے کی کامیاب کوشش کی ہے یہ کتاب ہماری رائے میں ہر ایک مسلمان کے گھر میں رہنی چاہئیے"

پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کی رائے

"آپکی یہ تصنیف اسم بامسمیٰ ہے۔ آپکی خواہش کے مطابق اگر اس کتاب کو مجالس میلاد میں پڑھا جائے تو عوام الناس اس سے بہت زیادہ متمتع ہونگے اور ان میں ہی جرأمیوں کی اصلاح ہو جائے گی۔ خدائے پاک آپ کو اس مفید خدمت کیلئے جزائے خیر عطا فرمائے قیمت کتاب ایک روپیہ۔ کتب فروش حضرات کمیشن طے و کتابت سے طے کریں۔

ملنے کا پتہ مسٹر بدرالدین خاں کیرآف بدرالدین خاں سب رجسٹرار - پوسٹ بہیڑہ ضلع دربھنگہ (صوبہ بہار)

نرالی دنیا

از مرزا فدا علی خنجر لکھنوی

"شکریہ ——— کانسٹبل صاحب! بہت بہت شکریہ!"
مذکورہ جملہ ایک بیس سالہ نازنین کی زبان سے اُس وقت ادا ہوا جب نوجوان کانسٹبل سادہ لباس پہنے سبزی فروش کی دُوکان سے ترکاری خریدنے میں مشغول تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ٹاٹ کا چھوٹا سا تھیلہ لٹک رہا تھا اور اُس پر مختلف رنگوں کی آمیزش سے مور کی رنگین تصویر جھلک رہی تھی۔

برقی لہروں نے حسینہ کی آواز کانسٹبل کی سماعت تک پہنچائی۔ اُس نے گردن موڑ کے دیکھا۔ ایک لطیف پیکر اپنی تمام رعنائیوں کے جھرمٹ میں کھڑا مُسکرا رہا ہے۔ میٹھی میٹھی نگاہیں سحر فن آنکھوں کے غرفوں سے نکل نکل کے اُس کے پُرشباب چہرے پر جم گئی ہیں۔ ملتجیانہ انداز متقاضی ہے کہ وہ مرتاسانہ ذہنیت سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے ہمہ تن اُس کی جانب متوجہ ہوجائے۔

اُسے ایک ہفتہ قبل کا واقعہ یاد آگیا۔ جب وہ تھانہ دار کی معیت میں آٹھ دس سپاہیوں کے ہمراہ بدمعاشوں کے اڈے پر جُوا پکڑنے گیا تھا۔ رات کا ابتدائی حصّہ گزر چکا تھا۔ بازار بند پڑے تھے، اوباش منش عیاشوں کے سوا کوئی راستے پر نظر نہ آتا تھا۔

قمار خانہ ایک گندی گلی میں واقع تھا۔ داؤں لگانے والوں کو پولیس کے چھاپہ مارنے کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ دفعتہً حملہ ہوجانے سے وہ بدحواس ہوگئے۔ ہاتھ پاؤں تو بہت مارے لیکن فرار کی سب راہیں مسدود ہوچکی تھیں۔ نکاس کے تمام راستو پر پولیس کا زبردست پہرا بیٹھا تھا۔ چاروناچار ہزیمت قبول کرتے ہوئے اپنے آپ کو قانون کے حوالے کردینا پڑا۔

اس موقعہ پر زاہد (کانسٹبل) کو جس چیز نے انگشت بدنداں کردیا اسی نازنین کی موجودگی تھی! وہ اپنی سادہ لو اور طبعی نیکی کے باعث سمجھ ہی نہ سکا کہ ایسے حیا شکن اور ا سوز مقام پر نوجوان عورت کی موجودگی کیا معنے رکھتی ہے اس کا دل رحم و کرم کے جذبات سے معمور ہوگیا۔ حتیٰ کہ وہ اپ فرائض کو بھی یاد نہ رکھ سکا۔ بتعجیل اپنا باران کوٹ اتار کے حسینہ کو سر سے پاؤں تک چھپا دیا۔ خود اُس کے سامنے کھ ہوگیا کہ دوسرے کانسٹبل عورت کی موجودگی سے لاعلم رہ

زاہد نے بچاؤ کی جو تدبیر اختیار کی تھی وہ تجر سے کامیاب ثابت ہوئی۔ پولیس والوں نے اُس کی جان توجہ نہ کی۔ سب کے سب جواریوں کی گرفتاری میں سعی کرتے رہے اس پکڑ دھکڑ میں زاہد کے چوٹ بھی آگئی۔ اُس کا بایاں ہا بدمعاش کی چھری سے مجروح ہوگیا۔ نتیجہ میں کامیابی کا سہ اُسی کے سر بندھا کیونکہ اس اڈے کا سراغ لگانیوالا وہی

مجرموں کو رسّی سے جکڑنے کے بعد تھانیدا اور سب سپاہی قمار خانے سے نکل گئے۔ زاہد جان بوجھ سب سے پیچھے رہ گیا کیونکہ اُسے خفیہ طور سے حسینہ کو بھگا دینا

جب وہ نازنین کے سر سے باراں کوٹ جدا کر رہا تھا تو نازنین کی نظر بائیں ہاتھ کے زخم پر جا پڑی جس سے جیتا جیتا لہو پتلی دھار بن کر نکل رہا تھا۔ نازنین کسی مخصوص جذبہ کی بنا پر متاثر ہو گئی۔ اس نے فی الفور ململیں ساری پھاڑ کر خون پوچھا دوڑ کر گلاس میں پانی لائی اور کپڑا بھگو کر زخم پر پٹی باندھی۔

نہ معلوم کیوں زاہد نے یہ سب گوارا کر لیا! دل چاہنے پر بھی وہ حسینہ کا ہاتھ نہ روک سکا مرمریں بت کی طرح بے حس و حرکت کھڑے رہ کر پٹی بندھوالی۔ جب حسینہ ڈریسنگ سے فارغ ہوئی تو وہ رخصت ہو کر پولیس اسٹیشن کی جانب روانہ ہو گیا۔

پولیس کو بسا اوقات ایسے حادثے پیش آیا کرتے ہیں اس لئے احساس فنا ہو جاتا ہے۔ وہ وقت کے بہاؤ کے ساتھ ان کی یاد کو بہا دیتے ہیں۔ ان کا حافظہ ان چیزوں کو محفوظ رکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ پھر بھی زاہد کی لوح قلب پر حسینہ کی بھولی بھالی صورت مرتسم ہو کے رہ گئی تھی۔ جب وہ ہاتھ کی پٹی کو دیکھتا تھا بالکل غیر ارادی طور پر نازنین کے متعلق غور و فکر کرنے لگتا تھا حالانکہ اس کے سوچ بچار کا مفہوم خود اسکے ذہن میں بھی موجود نہ تھا! ہاتھ کا زخم مندمل ہو چکا تھا تاہم پٹی بدستور موجود تھی۔ کئی مرتبہ اس کی بوڑھی ماں نے ہاتھ کھولنا چاہا مگر کسی نامعلوم جذبہ نے اسے پٹی کھلوانے کی اجازت نہ دی۔

آٹھ دن گزر گئے۔ واقعہ پرانا ہو گیا مگر زاہد کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی ابھی یہ حادثہ گزرا ہے۔ حسینہ کا شگفتہ چہرہ ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے موجود رہتا ت
اس وقت یکایک اسے ہمکلام پا کر وہ ہکا بکا رہ گیا! دا
تو بہت کچھ چاہتا رہا لیکن فہم و فراست نے مدد نہ کی۔ وہ کہ
ہی نہ سکا کہ حسین مخاطب کو کیا جواب دے؟

نازنین اسے خاموش دیکھ کے پھر بولی "کیا میر
گھر تک، چلنے کی تکلیف گوارا کیجئے گا کانسٹیبل صاحب؟"

"تمہارا گھر کہاں ہے؟ زاہد نے سوال کیا۔ اور مجھے کس لئ
لے جانا چاہتی ہو؟"

"کچھ نہیں، حسینہ نے ساری کے آنچل کو انگلی میں لپیٹتے ہوئ
کہا۔ آپ کی شکر گزاری کرنا چاہتی ہوں۔"

"شکر گزاری! زاہد نے حیرت ظاہر کی۔ کس کام کی شکر گزار

"اگر آپ رحم نہ کرتے۔ حسینہ نے بتایا۔ تو اس روز میں ضرو
گرفتار ہو جاتی۔"

"ٹھیک ہے۔ زاہد نے کہا۔ لیکن وہ محض فطری رحم و کرم کا
تھا جو میرے فرائض کے سراسر منافی تھا۔"

"یہی چیز تو ہے۔ نازنین نے لفظوں پر زور دیا۔ جو مجھے شکر گز
کے لئے مجبور کرتی ہے۔"

"اچھا۔ زاہد نے ٹالنا چاہا۔ اس وقت کے بعد کبھی ادھر آ
تو تمہارے گھر ضرور آؤں گا۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔ نازنین نے تحکمانہ اصرار کیا۔ آپ کو اس
وقت چلنا ہوگا۔"

"اگر نہ جاؤں۔ زاہد نے استفہامیہ سوال کیا۔ تو تم کیا کرو گی"

"کچھ بھی نہیں۔ نازنین اپنی مجبوری کا احساس کرتے ہوئے ا
صرف دل مسوس کے رہ جاؤں گی۔"

"خیر چلو۔ زاہد نے آمادگی ظاہر کی، دو چار منٹ میں کیا بنے بگڑے گا"

نازنین کا نام چاہے جو کچھ بھی ہو لیکن عموماً موتی کہہ کر پکاری جاتی تھی۔ اُس کی پیدائش اور نسبی حالات پر لاعلمی کا پردہ پڑا تھا۔ کوئی نہ جانتا تھا کہ فی الحقیقت وہ کس خاندان کی چشم و چراغ ہے؟ اور کس طرح پھکو سے نشہ باز او باش کے ہتھے لگی ہے؟ البتہ آشناسب جانتے تھے کہ وہ حسن فروشی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ اُسے موسیقی میں خاصہ کمال حاصل ہے، دلربائی و دلبری میں اپنا جواب نہیں رکھتی جب وہ اپنی دل نشیں داؤں کے ساتھ کسی شباب زدہ قدر انداز آنکھوں کے تیر چلاتی ہے تو سینہ چھلنی کئے بغیر نہیں رہتی! جب سے اس نے عصمت فروشی کی دکان کھولی ہے اُس کی تمام ہم پیشہ جماعت کا بازار ٹھنڈا پڑ چکا ہے۔ حسن پرست طبقہ اکثر و بیشتر اس کی دکان کے چکر کاٹا کرتا ہے۔

عجیب سے عجیب تر یہ امر ہے کہ خود موتی اپنے پیشے سے خوش نہیں معلوم ہوتی! وہ بسا اوقات فکر پرور خلوتوں میں سر بہ زانو ہو کر واقعاتِ حاضرہ پر غور کرتی رہتی ہے۔ اکثر اُس کے یاقوتی لب تلخ تبسم سے آلودہ دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنے گاہکوں کو لوٹنا بھی پسند نہیں کرتی صرف اُسی قدر اکتساب کرتی ہے جو پھکو کے نشہ بازی اور روزمرہ کے مصارف کو کفایت کرے۔ حالانکہ زیادہ سے زیادہ زر کشی کے موقعے فراہم ہوتے ہیں۔ دل چلا لاک امیر زادے اظہارِ عشق کے جنون میں کمال فراخدلی سے اپنی جیبیں خالی کرنا چاہتے ہیں مگر موتی انہیں ان احمقانہ سخاوتوں پر جھڑک دیتی ہے!

باوجود اس کے وہ محض دلچسپی کے لئے ذلیل ترین قمار خانوں میں بھی شریک ہونے سے اجتناب نہیں کرتی جس مقام پر معمولی معمولی طوائف جانے سے احتراز کرتی ہیں وہ کھلے بندوں وہاں جاتی ہے اور تمام اُن خطروں کا مقابلہ کرتی ہے جو ایسے مقاموں پر پیش آیا کرتے ہیں مختصر یہ ہے کہ اس کی ذات اجتماع ضدین تھی اور کوئی صحیح طور پر اُس کی افتادِ طبیعت سے واقف نہ ہو سکا تھا۔

زاہد کو موتی کے گھر میں قدم رکھتے ہی ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی شوقین دولت مند کے آراستہ پیراستہ کمرے میں داخل ہو گیا ہے۔ در و دیوار پر حسین مناظر کے خوشنما مرقعے مختلف ممالک کی جمیل عورتوں کی عریاں و نیم عریاں تصویریں آویزاں تھیں۔ پالش سے جھلا جھل کرتے ہوئے شیشم کے دروازے جالی کے نفیس پردوں سے ڈھکے تھے۔ برکیٹوں پر چینی گلدان اور نظر کش کھلونے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ دری چاندنی کے فرش پر ایرانی قالین اور اس کے تین طرف مخملیں گاؤ تکیے رکھے تھے۔ فرش سے ملحق ولایتی ساخت کی بیش قیمت مسہری جملہ استراحت کے ساز و سامان کے ساتھ آراستہ تھی۔ اُس کے سوا کسی خوش باش گھر میں جن چیزوں کی موجودگی ناگزیر متصور ہو سکتی ہے وہ سب مہیا تھیں۔

زاہد نے عالم خیال میں بھی ان چیزوں کا تصور نہیں کیا تھا۔ اُس نے پہلے پہل موتی کو قمار خانے میں دیکھا تو محض اُس کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر گرفتاری سے محفوظ رکھا تھا۔ گمان تھا کہ کوئی معمولی حیثیت کی عورت ہو گی جو کسی نہ کسی طرح بدمعاشوں کے پھندے میں آ پھنسی ہے۔ اب اس کی خوش حالی کا سامان دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ موتی نے اس کا ہاتھ کھینچ کر صدر میں بٹھاتے

ہوئے کہا "کانسٹبل صاحب! آپ اس درجہ جونچکا کیوں ہو رہے ہیں؟ آرام سے بیٹھئے۔"

زاہد بیٹھ تو گیا لیکن گفتگو چھیڑنے کا کوئی عنوان سمجھ میں نہ آیا۔ بمشکل سے چند لمحہ بیٹھے ہوئے گزرے تھے کہ ہوٹل کا بوائے سفید وردی پہنے چائے کی کشتی لئے حاضر ہو گیا۔ موتی نے کشتی پوش ہٹا کر پہلی پیالی کیک اور بسکٹ کی طشتریاں بڑے چاؤ سے اس کے سامنے رکھیں پھر دوسری پیالی خود لے کر بولی "کانسٹبل صاحب! یہ خانۂ بے تکلف ہے۔ چائے نوش کیجئے ــــــ آپ تو بالکل بت ہو رہے ہیں۔ بیشک یہ جگہ آپ کے قابل نہیں پھر بھی کسی بندۂ احسان کی پیش کش رد نہ کرنا چاہئے۔"

زاہد کے بنائے کچھ نہ بنی۔ چائے بھی پی۔ کیک اور بسکٹ بھی کھائے۔ اس درمیان میں موتی نے چائے کی پیالی خالی کر کے سفید پانوں کی چند گوریاں بنائیں اور چاندی کی تھالی میں سجا کر پیش کر دیں۔

ایک گوری منہ میں رکھتے ہوئے زاہد نے کہا۔

"میں حیران ہوں کہ اس روز تم بدمعاشوں کی ٹولی میں کیسے پہنچ گئیں؟"

"یہ تو حیرانی کی بات نہیں۔ موتی نے کمال ڈھٹائی سے جواب دیا۔ جب اس فضا سے تنگ ہوتی ہوں جس میں آپ دیکھ رہے ہیں تو قمار خانوں یا شراب کی بھٹیوں میں چلی جاتی ہوں کیونکہ وہ جگہیں بھی لطف سے خالی نہیں ہوتیں۔"

"لطف سے خالی نہیں ہوتیں! زاہد نے متعجب ہو کر جملہ دوہرایا۔ وہ تو ایسی گندی جگہیں ہیں جہاں کا نام سن کر شرافت کان پکڑتی ہے۔"

"آپ نے سچ کہا۔ موتی نے تلخ تبسم کرتے ہوئے جواب دیا۔ ہمارے آئین میں شرافت ایک مہمل لفظ ہے جو اپنے اندر کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اگر آپ ہماری معاشرت کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ میں بھی اپنی ہم جنس کی طرح گوشت و پوست کا بنا ہوا دلکش کھلونا ہوں۔ اس کھلونے سے ہر کس و ناکس کھیل کر اپنی ہوس کی تشنگی دور کر سکتا ہے"

"یعنی؟" زاہد نے بے ساختہ سوال کیا۔

"یعنی میں طوائف ہوں۔ موتی نے حزنیہ لہجہ اختیار کر لیا۔ چند نقرئی و طلائی سکوں کے عوض بک جانے والی۔"

"کیا تمہارے والدین۔ زاہد نے دریافت کیا۔ تمہارے یہ کردار پسند کرتے ہیں؟"

"والدین؟ موتی نے بدستور غمگین لہجہ میں جواب دیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرے والدین کون تھے؟ اتنا جانتی ہوں کہ جنہوں نے میری پرورش کی جب ہوش سنبھالا تو اس پیشہ میں لا بٹھایا۔ اب میرا فرض ہے کہ ہر روز اس کے نشہ پانی اور بالائی مصارف کے واسطے روپیہ حاصل کروں اور دنیا کے اتھاہ سمندر میں زندگی کی کشتی چلاتی رہوں۔"

"کیا تم۔ زاہد نے پوچھا۔ اس زندگی سے خوش ہو؟"

"خوش ــــــ بہت خوش!" معلوم ہوا اس کی روح کی گہرائیوں میں اندوہ و قلق کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ اسکی آواز سے سوز پیدا تھا۔ اس کا سینہ شدت تاثر سے شق ہوا جاتا تھا مگر وہ جبراً اپنی طبیعت کو سنبھالے تھی۔

تھوڑی دیر خاموش رہ کر زاہد نے کہا "تمہارے جواب نے مجھے عجیب کش مکش میں مبتلا کر دیا ہے۔ تمہاری زبان سے ادا ہونے والے لفظوں سے تمہارا قلبی رجحان بالکل مختلف معلوم ہوتا ہے۔ اگر میرا قیاس غلط نہیں تو یقیناً تمہارا ضمیر پاک ہے

تم اس معصیت پاش ماحول سے قطعی بیزار ہو لیکن یہ نہیں سمجھ سکتا کہ تنفر کے ہوتے ہوئے بھی کون سی چیز تمہیں مجبور کئے ہے؟"

"جس کا دنیا میں کوئی دستگیر نہ ہو۔ موتی نے کہا۔

اسکی مجبوریاں بھی عین مرضی ہو جایا کرتی ہیں۔ آپ کی طرح نہ معلوم کتنے آدمیوں نے مجھ سے اسی طرح سوال کیا لیکن ان اللہ کے بندوں میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو ہاتھ تھام کر گناہ کے گڑھے سے نکال لیتا۔"

کتنا یاس آفریں کس قدر حسرت انگیز جملہ تھا۔ زاہد سر جھکائے دیر تک غور کرتا رہا۔ طبعی شرافت متقاضی تھی کہ گناہوں کی دلدل میں پھنسی ہوئی مجبور عورت کی امداد کا فریضہ ادا کیا جائے۔ عقل اس اقدام کی مانع تھی۔ بازاری عورتوں کی چالبازیوں کے سنے سنائے متحیر کن افسانے اعتبار کو بے اعتباری سے بدلنے پر آمادہ تھے۔ وہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اس موقع پر کیا طریقہ اختیار کرے؟ کافی دیر گو مگو میں گرفتار رہنے کے بعد اس نے کہا "تمہاری گفتگو نے ظاہر کر دیا کہ ہنوز شرافت کا احساس فنا نہیں ہوا ہے۔ لیکن معاشی کا فقدان نیک راستہ اختیار کرنے سے باز رکھے ہے۔ البتہ اس موقعہ پر ایک خیال حیران کرتا ہے اور بار بار دل میں یہ سوال پیدا ہے کہ کیا اس مذموم پیشہ کے علاوہ کوئی اور کام ایسا نہیں جو شکم پری و تن پوشی کا ذریعہ بن سکے؟"

"ہے ضرور ہے۔ موتی نے شعلے کی طرح بھڑکتے ہوئے جواب دیا۔ لیکن حسن و جوانی ہم لوگوں کے لئے جس طرح ایک نعمت ہے بالکل ویسے ہی وبال جان بھی ہے۔ ہوس کے بندے کام دینے سے پہلے رشوت یا شکرانہ کے طور پر وہ چیز طلب کرتے ہیں جسے ہم اپنی دکان میں رہ کر اشرفیوں کے مول فروخت کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ حاکم بنکر حکم بھی چلاتے ہیں۔ اس صورت میں آپ ہی انصاف کیجئے کہ ہم عصمت فروشی کو ترجیح نہ دیں تو کیا کریں جبکہ دونوں حالتوں کا حاصل ایک ہی ہو؟"

زاہد کا دل ساغر کی طرح رحیمانہ جذبات سے چھلکنے لگا۔ اس نے موتی کی مغموم و مایوس صورت پر عمیق نگاہیں ڈال کر جائزہ لیا۔ وہاں معصومیت کے سوا مکروریا کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس نے راسخ عزم لئے ہوئے کہا "یہ سچ ہے کہ دنیا میں گناہ کی فراوانی ہے، نفس پرستی و ہوس رانی کی بہتات نے پاکبازی کا تقریباً قریب قریب خاتمہ کر دیا ہے مگر اس کے یہ معنی تو نہیں کہ ایک سرے سے نیکی مفقود ہو چکی ہے۔"

اگر نیکی کا وجود ہے۔ موتی نے قلبی جوش و خروش سے کہنا شروع کیا۔ تو کسی مخفی گوشہ میں پڑی کس پرسی کا ماتم کر رہی ہوگی عام طور پر تو اس کی زبردست حریف بدی ہی حکمراں دکھائی دیتی ہے۔"

"یہ خیال صحیح نہیں۔ زاہد نے جواب دیا۔ دنیا مختلف مذاق کا گہوارہ ہے۔ صبح کے نور اور شب کی ظلمت کی طرح ہر چیز کی ضد پائی جاتی ہے اور یہی دلیل ہے اس امر کی کہ بدی کے پہلو بہ پہلو نیکی بھی موجود ہوگی۔ نیکی نہ ہوتی تو بدی کا وجود محال تھا۔"

"دلیل قوی ہے۔ موتی نے اقرار کیا۔ لیکن اس تلخ حقیقت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ مجھے ابتدا سے اب تک جتنے سابقے پڑے اُن میں بدی ہی کا عنصر بیش از بیش نظر آیا۔"

"میں تمہارا یہ شبہ باطل کرنے کی کوشش کرونگا۔ زاہد نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ اگر تم نیک دلی سے میری صلاح

پر عمل کرنا پسند کرو۔"

"میں راضی ہوں کانسٹبل صاحب!" موتی نے جواب دیا۔ "آپ جہاں ——— جس حال میں رکھنا چاہیں خوشی سے رہنے کو تیار ہوں۔"

موتی نے جملہ ختم کرتے ہی الماری کھول کر اپنے معمولی کپڑے نکالے اور پھر سوٹ کیس میں رکھنا شروع کئے۔ اُس کی مشغولیت ثابت کرتی تھی کہ وہ فی الفور اس زندگی کو ترک کرکے وہی معاشرت قبول کرے گی جو زاہد کے نزدیک مناسب ہوگی۔ لیکن زاہد کے واسطے یہ منظر نہایت تشویشناک تھا۔ وہ جوان ہونے کے باوجود خود مختار نہ تھا۔ اُس کے سر پر بڑے بھائی نیز بھاوج اور بیوہ و ضعیف ماں کا سایہ موجود تھا۔ ماں بھی وہ ماں جس نے اُس کے لئے اپنی جوانی کو بڑھاپے سے بدل دیا۔ عیش و راحت تج کر اُس کی پرورش کی اور اب جبکہ اُسے پولیس میں ملازمت حاصل ہو چکی تھی اس کی راحت رسانیوں میں ہمہ تن مصروف رہتی تھی۔ اب اس کی زندگی بسر کرنے کو صرف دو کام تھے۔ زاہد اور اس کے بڑے بھائی کی خدمت یا خدا کی طاعت و عبادت۔ شاید اُس کے زہد و پارسائی یہ صلہ تھا کہ خدا نے دونوں لڑکوں کو بے انتہا نیکی و شرافت کی توفیق عنایت کر دی تھی۔ وہ اُس کی اجازت کے بغیر کوئی کام نہ کرتے تھے۔ جدھر اس کی نگاہ جاتی تھی پروانہ وار اسی جانب مڑ پڑتے تھے۔

اطاعت کوشی کا یہی جذبہ تھا جو زاہد کو پس و پیش کی کشاکش میں مبتلا کئے تھا۔ اگرچہ اس نے حیلہ و حوالہ سے موتی کو فوراً ہی کسی اقدام سے روکنے کی سعی کی لیکن اس نے قبول نہ کیا بلکہ غیرت و شرم دلاتے ہوئے کہا۔ "کانسٹبل صاحب! آپ کچھ خیال نہ فرمائیں۔ مجھے یہ عیش ہزار مصائب سے زیادہ گراں ہے۔ میں پھولوں کی سیج پر استراحت کرنے کے بدلے خاک کے فرش پر اس لئے سونا پسند کروں گی کہ اس خواب میں معصیت کا خوف ہے نہ ذلت کا کھٹکا۔ میں آپ سے دولت کی بھی خواہاں نہیں۔ صرف پیٹ بھرنے کو دو روٹیاں اور تن ڈھکنے کو موٹا جھوٹا کپڑا اور بس!"

"تم نہیں مانتیں تو خیر۔" زاہد نے مجبوری ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "چلو لیکن جس وقت تک والدہ اور بڑے بھائی کی اجازت نہ ہو تمہیں اپنے گھر نہیں لے جا سکتا۔ شہر کے کسی معمولی محلہ میں کہیں ٹھہرا دوں گا اور رات کو ایک مرتبہ آ کر خبر لیتا رہوں گا۔"

"بیشک میں آپ کے گھر جانے کے قابل نہیں۔" موتی نے نہایت رنجیدگی سے اعتراف کیا۔ "لیکن اس صورت میں نباہ کیسے ہوگا؟"

"میری والدہ اور بھائی فرشتہ ہیں۔" زاہد نے یقین دلایا۔ "جب موقعہ محل دیکھ کر اُن سے کہوں گا تو ضرور میری بات مان لیں گے۔"

موتی کو زاہد کے ساتھ رہتے ہوئے کئی مہینے ہو گئے شہر کے کنارے جہاں غریبوں کے کچے پکے مکانوں کا سلسلہ دور تک پھیلا تھا ایک مختصر سی جھونپڑی میں وہ زندگی کی ساعتیں بسر کر رہی تھی۔ دیکھ لئے جانے کے خوف سے دن کی روشنی میں تو زاہد ادھر آنے کی جرات نہ کر سکتا تھا مگر جب رات کی پردہ پوش ظلمتیں روشن فضاؤں پر سیاہ ملاف

جو تھا۔ یکتی تھیں تو وہ عامۃ الناس کی راز جو نگاہوں سے بچتا بچاتا اُس کے پاس گھڑی دو گھڑی کو آ نکلتا تھا۔

یہ چوری چھپے کا طریقہ بجائے خود اُس کے حساس دل کے واسطے تیر و نشتر سے کسی طرح کم نہ تھا۔ وہ اخفا کا رمز سمجھتی اور ملول ہو جاتی تھی۔ اُسے یقین ہو چلا تھا کہ ان نیکیوں کے باوجود بھی وہ ہنوز اُس سطح سے بلند نہ ہو سکی جہاں پہلے کھڑی تھی۔ وہ اب بھی اس قابل نہیں کہ اُس سے شریف خاتونوں کا سا سلوک روا رکھا جائے۔ البتہ جو فرق محسوس ہو سکتا تھا وہ یہ تھا کہ اُس نے امارت و تونگری کی زندگی کو لات مار کر افلاس و تنگدستی کے ماحول میں رہنا پسند کر لیا ہے۔

سب سے زیادہ مصیبت یہ تھی کہ محلے کے بدنگاہ نوجوان یہاں بھی اُس کی [illegible] میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے تھے۔ کبھی کھڑکی کبھی چھت کی بلندی سے اُسے گھورا کرتے تھے۔ اگر اتفاقیہ کسی ضرورت سے صحن میں نکل جاتی تو کوئی منھ پھٹ آوازہ کسنے سے بھی باز نہ آتا۔ وہ خوف و بیم سے دروازے میں کنڈی لگائے تنہا بیٹھی رہتی۔ طعن و تشنیع سے بچنے کے لئے اُس نے اپنے آپ کو قید کر لیا تھا۔ اشد ضرورت کے بغیر کمرے سے نکلنے کا نام تک نہ لیتی تھی۔ وہ سارے مصائب محض اس امید میں گوارا کر رہی تھی کہ کبھی تو نصیب سیدھا ہوگا۔ کبھی تو زاہد کے بزرگ اُسے گھر کی بہو بنانا قبول کریں گے اور کبھی تو وہ بھی شریف سہاگن کہلانے کی مستحق سمجھی جائے گی

دن پر دن گزرتے گئے۔ اُس کے امتحان کا شدید ترین ایک موقعہ اور بھی آ گیا۔ واقعہ یوں ہوا کہ جس گھر میں اُس کا قیام تھا اُس کے برابر ہی ایک ایسا شخص آ کے مقیم ہوا جو زاہد کا قرابت دار تھا۔ گرمیوں کی فصل تھی۔ اُس نے اُمس اور مچھروں کی زحمت سے بچنے کو موتی کے دروازے کے سامنے پلنگ بچھا لیا۔

زاہد حسب معمول رات کو آیا لیکن ڈیوڑھی پر بوڑھے کو حقہ پیتے دیکھ کر اس خیال سے واپس گیا کہ مبادہ اُس کی نظر نہ پڑ جائے۔ موتی گھر کے اندر منتظر بیٹھی رہی۔ آنکھوں آنکھوں میں پہاڑ سی رات کٹ گئی۔ دوسری شب بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ وہ رات بھی موتی نے بیدار رہ کر گزار دی۔

ایک ہفتہ اسی طرح گزر گیا۔ نہ زاہد آیا نہ غیر حاضری کی کوئی وجہ معلوم ہو سکی۔ گھر میں جتنی جنس موجود تھی رفتہ رفتہ ختم ہو کر فاقوں کی نوبت پہنچی لیکن اس نے گھر سے نکلنے کی جرات نہ کی۔ ایک، دو، تین یہاں تک کہ چار کڑاکے کے فاقے گزر گئے اور زاہد کی بے وفائی کا یقین ہونے لگا۔ طرہ یہ ہوا کہ عین اسی موقعہ پر پتہ لگا کے اُس کی ایک ہم پیشہ یہاں پہنچ گئی۔ موتی کا حالِ زار دیکھ کر نہایت متاسف ہوئی۔ اُس کی نادانی پر کافی سرزنش کی۔ پھر مشورہ دیا کہ وہ اپنے عدیم المثال حسن کو فضول ضائع نہ کرے۔ تماش بین مردوں کا بھروسہ کرنا خطرناک بھول ہے۔ بہتر یہی ہے کہ وقت کی قدر کرتے ہوئے پھر اُسی زندگی کی طرف پلٹ پڑے جسے ذلیل و حقیر سمجھ کر ترک کر چکی ہے۔ دولت جمع کرنے کے یہی دن ہیں۔ یہ زمانہ گزر گیا تو پھر کچھ نہ ہو سکے گا۔ وغیرہ وغیرہ

موتی نے سنا لیکن اپنی رائے پر سختی سے قائم رہی۔ اس نے حیلہ و حوالہ سے اپنی ہمدرد سہیلی کو ٹال دیا۔ اس کا دل رکھنے کو یہ بھی کہہ دیا کہ "اگر دو روز اور زاہد

ے تو پھر میں اس مکان کو چھوڑ دوں گی۔"

بھیلی کے جانے کے بعد اس نے گھر سے قدم نکالا
نگ ملازمت تلاش کرنے کے سلسلے میں گئی مگر کامیابی نہ ہوئی۔
ں گھروں میں تو صرف اس اندیشے سے ملازمت نہیں دی
مبادا وہ اس کے عالم آشوب حسن میں گرفتار ہو کر گھر کا مالک
نتاری نہ کرنے لگے۔ بعض جگہ یہ کہہ کر دھتکار دی گئی کہ
ے گھر میں جوان جہان لڑکیاں موجود ہیں اُن کے اخلاق
ب اثر پڑے گا۔" مختصر یہ ہے کہ گلی کوچوں کی خاک چھاننے
عد رات کو بے نیل مرام واپس آگئی۔ یہ رات بھی گزری۔
وئی تو اُس میں اتنا دم نہ تھا کہ بستر سے اٹھ کر بیٹھ بھی سکے۔

عملی دنیا روزِ روشن کے ہنگاموں میں ڈوب گئی۔
ی کی آغوش میں سویا ہوا کاروبار جاگ اُٹھا۔ چہل پہل
م بازاری ہوئی لیکن موتی کے دل میں خاک اُڑتی رہی۔
م بیہوشی کے عالم میں بستر پر پڑی ہوئی الٹی الٹی سانسیں
یں مشغول تھی۔ حالت یہ تھی کہ پیٹ دھنستے دھنستے
ے مل گیا تھا۔ ہاتھ پاؤں میں سنسنی تھی اور آنکھوں
نیچے اندھیرا چھا رہا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب مردار
ں ہو جاتی ہے اور فاقہ کش جائز و ناجائز غذا کا امتیاز کئے
عدے کی آگ بجھانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ دشواری۔
ری تھی کہ موتی میں اپنے مقام سے حرکت کرنے کی
ت باقی نہ تھی کہ چل پھر کر ایسی غذا تلاش کر سکتی جو
ں جانے کے باعث کسی گوشہ میں پھینک دی جاتی ہے۔
باوجود ان سختیوں کے اُس کے شریفانہ عزم و ارادہ
زوری کو دخل نہ ہوا تھا۔ وہ مستعار زندگی کو ختم کر دینے

پر آمادہ تھی۔ لیکن دوبارہ اُس گندے ماحول کی طرف پلٹ
کر جانا پسند نہ کرتی تھی جہاں عارضی مسرتوں اور بے ثبات
تعیش کی تو بہتات تھی لیکن نفس کی طہارت و عزت کا نام و
نشان بھی نہ تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ وہ اپنے ارادے پر ثابت قدم
رہ کر انجام کی منتظر تھی۔ رفتہ رفتہ آفتاب بلند ہو کر کمال کی
حد تک پہنچ گیا۔ دفعۃً کسی نے صدر دروازے پر دستک دی
آواز برقی لہروں پر تیرتی ہوئی اُس کے کانوں تک پہنچی لیکن
نقاہت نے اُٹھنے نہ دیا۔ اس نے سنی اَن سنی کر کے سکوت
اختیار کیا۔ گمان تھا کہ آنے والا جواب نہ پا کر واپس ہو جائیگا
اور اُسے مکالمہ کی تکلیف سے امان ملے گی مگر تجربہ نے
یہ خیال غلط ثابت کیا۔ اولاً تو دستکوں پر کفایت کی گئی۔
جب متواتر دستکیں دینے کے باوجود جواب نہ ملا تو "موتی"
کہہ کر پکارنا شروع کیا۔

آواز پہچانی ہوئی تھی۔ معمول کے خلاف دن
دوپہر کو زاہد اُس کے پاس آیا تھا! نہ معلوم اس آواز میں جانے
کی کیسی طاقت مخفی تھی کہ یکایک سارے جسم میں توانائی آگئی
وہ ہرن کے مانند جھک کے اُٹھی اور دوڑ کر دروازہ کھول دیا۔

زاہد کے چہرے پر عموماً شباب کی شادابیاں
مسکرایا کرتی تھیں مگر اس وقت تو روحانی انبساط رگ رگ سے
ابلتی معلوم ہوتی تھی۔ آنکھیں خوشی کا مینہ برسا رہی تھیں،
ہونٹوں سے تبسم کے پھول جھڑ رہے تھے اور سینہ شادمانی کی
طغیانیوں سے تنگی محسوس کر رہا تھا۔

وہ قلبی مسرتوں کے باعث موتی کے اُترے
ہوئے چہرے اور انتہائی شکستگی پر توجہ نہ کر سکا ملاحظہ

اور جذبات کی فراوانیوں سے مغلوب ہو کر اُسے آغوش
میں لیتے ہوئے بولا " موتی! خدا کا شکر کرو کہ اُس کے
فضل و کرم سے فراق کی صعوبتیں دفع ہو گئیں۔ والدہ اور
بھائی نے تمہیں گھر میں لانے کی اجازت عنایت کر دی میں
اسی وقت تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کو آیا ہوں"۔

موتی تمام مصائب بھول گئی۔ تغافل کے
شکوے شکایات کا خیال دماغ سے ہوا ہو گیا جس چیز کی
آرزو میں یہ شدتیں برداشت کر رہی تھی مشکلیں حل کرنے
والی ذات نے اُسے پورا کر دیا۔ وہ خوش تھی ——
بے انتہا خوش! زندگی کا پانسہ بدل چکا تھا۔ اب کسی
بد اخلاق شخص کو اُس کی جانب گھورنے کی جرات
نہ ہو گی۔ انگشت نمائی کا ایذا رساں اور رسوا کن زمانہ
ختم ہو گیا۔ وہ ذلیل زندگی کی آلائشوں سے نکل کر عزت
و آبرو کی مقدس فضا میں داخل ہونے والی ہے۔ اُس کی
موتی جیسی آنکھوں سے خوشی کے گلابی گلابی آنسو بہہ کر
آستین کو تر کرنے لگے۔

زاہد اس کے حسین گریہ سے متاثر ہو کے
بولا " موتی! یہ تو خوشی کا ہنگام ہے۔ رو رو کر اپنے آپکو
افسردہ نہ کرو۔ میں چاہتا ہوں کہ والدہ، بھابی اور بھائی
تمہیں بشاش بشاش دیکھ کر میرے انتخاب کی داد دیں۔
ایسا نہ ہو کہ تمہارے جمیل چہرے کی پژمردگی بھابی کو نکتہ
چینی کا موقعہ دے۔ اور وہ مجھے چھیڑنے کو آوازے کسیں"۔

موتی نے فی الفور ساری کے آنچل سے
آنسو پونچھ ڈالے۔ فقر و فاقہ کی زحمتوں سے مرجھائے
ہوئے ہونٹوں پر تبسم نمایاں کیا اور جیزا دست دیا
میں پھرتی و تیزی پیدا کرنے کی سعی جاری کر دی۔

صالحہ نے موتی کی قدر کی جو ایک محبت والی
شریف ماں اپنے فرماں بردار بیٹے کی بیوی کی کر سکتی
ہے۔ اس نے موتی کو کلیجہ کا ٹکڑا سمجھ کے سینے سے لگایا۔
دلجوئی و مدارات کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جس
بات میں بہو کی رغبت محسوس کی اُسے فی الفور
اختیار کر لیا۔ گھر کے کام کاج میں بھی اپنا حصہ زیادہ رکھا
اگر موتی نے اپنے فرائض کا احساس کرتے ہوئے کام کرنا چاہا تو
یہ کہہ کر روک دیا کہ " ابھی تم مہمان کی حیثیت رکھتی ہو۔ تمہارا یہ فرض
نہیں کہ گھرداری کے بکھیڑوں میں الجھو۔ جب عقد ہو جائے گا تو
پھر تمہاری جٹھانی اور میں تینوں مل جل کر خانہ داری کے دھندے
انجام دیں گے"۔

زاہد کے بڑے بھائی تقی نے بھی پدرانہ شفقت
کا اظہار کیا۔ زیور، کپڑا، پھل پھلاری سے دلداری کی سعی کرتا
رہا۔ اس کی بی بی زرینہ بھی اکثر و بیشتر اُس کے پاس موجود
رہ کر اپنی میٹھی اور پاکیزہ باتوں سے ہمدمی کا فرض پورا کرتی رہی۔
کوئی شبہ نہیں کہ موتی کی یہ زندگی بہترین زندگی تھی۔ اُسے
محسوس ہو رہا تھا کہ پاک و شریفانہ معاشرت کیسی نعمت ہے؟
حقیقت میں یہی وہ انمول جواہر ہے جو دولتوں کے انبار
میں میسر نہیں ہوتا۔ اُس نے اپنی ہونے والی خوشدامن کی پاک
و پاکیزہ زندگی کا مشاہدہ کیا۔ معلوم ہوتا تھا کوئی فرشتہ ہے
جو اس کے قالب میں اپنے خالق کی عبادت و بندگی میں مشغول
رہتا ہے۔ اُس کی پر محبت باتیں، کریمانہ اخلاق، بزرگانہ شفقتیں
وہ نعمتیں تھیں جو دنیا کو جنت سے بدل دیتی ہیں۔ گھر میں صرف

ار آدمی تھے لیکن اُن کی نظیر تلاش کی جائے تو چار ہزار بلکہ چار
کھیں دستیاب نہ ہوسکے۔

انہیں چیزوں کا احساس تھا جس نے موتی کے
راج میں نمایاں تبدیلی پیدا کردی۔ اُس کے دل میں بار بار ایک
وال اٹھ کر خلش پیدا کرنے لگا " کیا میری پرمعصیت ہستی
س پاک پاکیزہ فضا کو گندلا نہ کردے گی؟ نہ معلوم کتنی ساعتیں
س نے غور و خوض میں گزار دیں۔ آخر وہ اس نتیجہ پر پہنچی کہ ان
رگوں میں بود و باش اختیار کرنے سے مجھے تو چار چاند لگ سکتے
یں لیکن میری ذلیل شخصیت اُن کے ناموس کے دامن پر کبھی نہ
مٹنے والا داغ بن کر نمایاں ہو گی!"

اُس کے ضمیر کی شرافت اس خود غرضی کو گوارا
کر سکی تھی۔ جن لوگوں نے کمال بےنفسی سے اس کو خاک
ذلت سے اٹھا کر اپنے برابر بٹھا لیا تھا وہ اُن کی کسرِ شان کو
تنہائی خودغرضی پر محمول کرتی تھی۔ یہی خیالات تھے کہ وہ اپنے
محسنوں سے جدا ہو کر کہیں دور بھاگ جانا چاہتی تھی اور کسی
یسے گمنام گوشہ میں المناک زندگی کے دن ختم کرنے کی آرزومند
تھی جہاں یا تو کوئی موجود ہی نہ ہو اور ہو بھی تو اُس کی حقیقت سے
نا آشنا ہو۔

یہ الم ریز خیال روگ کی طرح اُس کی جان کو لگ گیا
تھا۔ اس کا وقت غور و فکر میں بسر ہو جاتا تھا۔ دل کی مسرتیں
غم و یاس سے بدل چکی تھیں۔ روحانی افکار نے ظاہری خوبصورتی
کو ماند کر دیا تھا۔ اب وہ ہر ممکن حیلے سے نکاح کو روکنا چاہتی
تھی۔ کئی مرتبہ زاہد نے تاریخ مقرر کرنے کی التجا کی لیکن اس نے
ایک نہ ایک عذر کر کے ٹال دیا۔ صالحہ کے دریافت کرنے پر
بھی اصل راز کو افشا نہ کر سکی۔

ایک دن اُس کی خاموشیوں سے متوحش ہو کر زاہد
نے دریافت کیا " موتی! موجودہ انقلاب کی وجہ سمجھنے سے میری
عقل عاری ہے۔ کیا تم وہی موتی نہیں ہو جو بضد ہو کر مجھے مجبور
کرنا چاہتی تھیں کہ میں تمہیں والدہ کی خدمت میں پیش کر کے باقاعدہ
شریک زندگی بنا لوں؟ پھر کیا باعث ہے کہ جب تمہاری یہ خواہش
پوری کر دی گئی تو تم آجکل آجکل کر کے ٹال رہی ہو؟ آخر زندگی
کی یہ بےکیفیاں ختم بھی ہوں گی یا اسی طرح تلخیوں کا سامنا رہے گا؟"

" میں عجیب کش مکش میں مبتلا ہوں زاہد!" موتی نے
افسردہ آواز میں کہا۔ " یہاں آنے سے پہلے خیال کرتی تھی کہ
تمہارے گھر پہنچ کر میرے روحانی آلام ختم ہو جائیں گے مگر"
" مگر ایسا نہیں ہوا۔" زاہد نے گھبرا کے کہا " کیوں
نہیں ہوا؟ کیا یہاں تمہارے ساتھ کوئی برا سلوک ہوا؟"

موتی نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔
اُس کے ساتھ کوئی برا سلوک ہوا ہوتا تو کہتی' یہاں تو اُس کے
وہم و قیاس سے زیادہ عزت و پاسداری کی گئی تھی۔ اس کا ضمیر
اس بڑھی ہوئی توقیر کو برداشت نہ کر سکا۔ دل کی پہنائیوں میں
دبی دبائی محبت نے مجبور کرنا شروع کیا کہ وہ اپنے ناپاک وجود
سے محسنوں کی نفس طہارت کو آلودہ نہ ہونے دے بلکہ اس
ماحول سے بھاگ کر کسی ایسے گوشہ میں مخفی ہو جائے جہاں زاہد
کی رسائی نہ ہو سکے۔

موتی کے غیر معمولی سکوت نے زاہد کو متوحش کر دیا۔
اُس نے پھر اصرار آمیز لہجہ میں کہا " موتی! تمہاری خاموشیاں
میرے صبر و تحمل کا سلسلہ قطع کئے دیتی ہیں! خدا کے لئے اس
اضمحلال و افسردگی کا باعث بیان کر دو۔ اگر تم اب بھی میری التجا قبول

نہ کروگی تو میں یقیناً دیوانہ ہو جاؤں گا۔"

موتی کے دل سے ایک دبی ہوئی آہ نکلی۔ اس نے ہر چند قلبی اضطراب کو مخفی رکھنا چاہا مگر ممکن نہ ہوا۔ دونوں نرگسی آنکھوں کے پیمانے چھلک پڑے اور وہ ساری کے آنچل میں منہ چھپا کر سسکیاں بھرتے ہوئے بولی۔ "زاہد! خدا کی قسم میرے خیال میں بھی نہ تھا کہ تمہاری ماں اور بھائی بھاوج نیکیوں کے ایسے بے نظیر مجسمہ ہوں گے۔ جبسے میں نے اس فضا میں قدم رکھا ہے اپنی گنہ آلود زندگی کے خیال سے ہلاک ہوئی جاتی ہوں۔ جتنا جتنا غور کرتی ہوں واضح ہوتا جاتا ہے کہ میں ان لوگوں میں رہنے کے قابل نہیں ——————"

"کیوں موتی؟" زاہد نے معترض سخن ہوتے ہوئے پوچھا کیا تمہاری ذات میں وہ پاکیزہ جوہر موجود نہیں جسے نفس کی شرافت سے تعبیر کیا جاتا ہے؟ کیا تم نے دنیوی جاہ و ثروت پر لات مار کے مجھ سے مفلس کا ساتھ اس لیے قبول نہیں کیا کہ وہ زندگی سراسر گناہوں کی تاریکیوں میں گھری ہوئی تھی؟ میری ماں تو تم کو پاکر اتنی خوش ہیں کہ پھولے نہیں سماتیں —————— میں تم کو محبت کا واسطہ دیتا ہوں کہ اس خیال کو دل سے نکال ڈالو۔"

"نہیں زاہد!" موتی نے منہ چھپائے ہوئے جواب دیا۔ "تم مجھے مجبور نہیں کر سکتے۔ میں تمہاری احسان مند ہوں۔ تم نے مجھے گناہوں کے سمندر سے نجات دے کر پاکیزہ زندگی بخشی یہ احساس متقاضی ہے کہ میں بھی شکر گزاری کا پورا حق ادا کرتے ہوئے تمہاری نسلی شرافت نجابت کو ذلت —————— کی آمیزش سے محفوظ رکھتے ہوئے فوراً یہاں سے دفع ہو جاؤں۔"

"آج تمہیں کیا ہو گیا ہے موتی؟" زاہد نے حیران ہو کے دریافت کیا۔ "جو اس طرح بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو۔ میری والدہ کے پاس چل کے بیٹھو۔ انکی تشفی بخش باتوں سے تسلی ہو جائیگی۔"

زاہد نے کہہ سنکر موتی کو صالحہ کے پاس بھیجا اور خود ضروری کام سے روانہ ہو گیا۔ صالحہ اور زرینہ نے معمول کے مطابق لطف کی میٹھی میٹھی باتیں شروع کیں۔ ہر ممکن تدبیر سے اُسکے قلبی وہم کو دور کرنے کی کوشش کی لیکن اسے کیا کر سکتی تھیں کہ انکی محبت سے بھری ہوئی پاک و بے ریا باتیں موتی کے محسوسات کی تقویت کا باعث ہوتی تھیں۔ وہ خود اپنی نظر میں کھٹکنے لگی تھیں۔ طبعی شرافت کو گوارا نہ تھا کہ وہ اُن کے پاس بیٹھ کر خود تو بلندی و عزت حاصل کرے لیکن انھیں ایک ذلیل عورت کو ساتھ رکھنے کے الزام میں دوسروں کے سامنے سبک ہونے کا موقعہ دے۔

یہ خیال دمبدم لحظہ بلحظہ قوی ہوتا گیا حتیٰ کہ ایک اندھیری رات میں جب سارا گھر پڑا سو رہا تھا اور صالحہ اپنے حجرے میں نماز شب پڑھنے میں مشغول تھی وہ زاہد کے نام ایک رقعہ چھوڑ کر نکل گئی۔

دوسری صبح زاہد نے اسکے کمرے کو خالی پایا تو دیوانہ وار تلاش شروع کی۔ گھر کا کونا کونا چھان مارا۔ وہ تو کہیں نہ ملی البتہ تکیہ کے نیچے سے اس کا چھوڑا ہوا رقعہ برآمد ہو گیا۔ اس نے مجنوں کی طرح متوحش نگاہوں سے پڑھنا شروع کیا۔

"زاہد! میں اپنے محسوسات سے مجبور ہو کر جا رہی ہوں اور تم سے ملتجی ہوں کہ اپنے دل پر قابو رکھتے ہوئے میری جستجو سے درگزر کرنا۔ تمہارے سامنے ترقی کا وسیع میدان پڑا ہے۔ اپنی مردانہ کوششوں کو اُس میدان میں صرف کرو۔ مجھے بھول جاؤ۔ میں تمہارے قابل نہ تھی۔ اگر تم نے میری خواہش کو مسترد کرتے ہوئے تلاش جاری کی تو یاد رکھو میں خودکشی کر لینے سے ایک لمحہ بھی تامل نہ کرونگی اور یہ خون تمہارے سر ہوگا۔"

تمہاری موتی

زاہد نے بے اختیار آہ کا نعرہ مارا۔ رقعہ ہاتھ سے چھوٹ کر

۲۲

ماڈل وِلیج

Model Village

از جناب الیاس صاحب اسلام پوری

دیہات سُدھار کی اسکیم سے کون ہندوستانی واقف نہ ہوگا۔ جب ہماری قومی حکومتیں قایم ہوئیں تو اس تحریک کی طرف خاص توجہ مبذول ہوئی اور ملک کے طول و عرض میں ایک ہنگامہ سا مچ گیا یا مچا دیا گیا۔ اس کی خبر کارکنان کو ہوگی۔ لیکن یہ مبالغہ نہیں اگر یہ کہا جائے کہ شہری تو شہری، دیہاتی بھی جن کے سادہ دماغ دنیا کے ان جھمیلوں کی طرف سے اکثر بے نیاز ہی رہتے ہیں، اپنے دیہات کے چپہ چپہ کو جنت کے پُرسکون گوشوں میں تبدیل ہوتے ہوئے محسوس کرنے لگے تھے۔ ان کے جذبات کا اندازہ آپ شاید ذیل کی ایک مختصر گفتگو سے لگا سکیں جو دمڑی ساؤ میرے گاؤں کے ایک حلوائی کی دوکان پر ایک شام کو ہو رہی تھی۔

نتھنی ملاح :- "کہو یار ہری گوپ! توُں تو بڑے بڑے لوگن کے دوار پر جات ہو۔ آجکل گاندھی بابا کے کی کھبر ہے،" (کہو یار ہری گوپ! تم تو بڑے بڑے لوگ کے دروازہ پر جاتے ہو آجکل گاندھی بابا کی کیا خبر ہے)

ہری گوپ :- "ارے یار! اب کی ہے، اب بڑا چھوٹا سب برور ہو جیہہن۔ گاندھی باباجے اوپائے نہ کیلن ہیں کی بس رے بس۔ ہم ہی گریب لوگن کے راج ہے گیل۔ کیبن مورکھ ہو کی تہرا ای ہو کھبر نیکھے۔ سُنو! ہم ہی لوگن کے چناؤ سے ادجیر بھیلن ہیں۔ اور ہم لوگن کے ایکار کرے کے واسطے کوشش کرتہین۔ اہی کارن سب سے پہلے دیہات سدھار کے پرستاؤ پاس بھیل ہے۔" (ارے یار! اب کیا ہے۔ بڑے چھوٹے اب سب برابر ہو جائیں گے۔ گاندھی بابا نے وہ ترکیب لڑائی ہے کہ واہ رے واہ۔ ہم غریبوں کی حکومت ہو گئی۔ کیسے احمق ہو کہ اتنی بھی خبر نہیں رکھتے۔ سنو ہم لوگوں کے انتخاب سے وزیر ہوئے ہیں۔ وہ ہم لوگوں کی ترقی کی کوشش کریں گے۔ اسلئے سب سے پہلے گرام سدھار کا ریزولیوشن پاس ہوا ہے)

دمڑی ساؤ :- جو اب تک اپنی گُڑ کی مٹھائیوں پر سے مکھیوں اور بھڑوں کو ہنکانے میں مصروف تھا "دیہات سدھار" کے نام سے چونکا اور پوچھنے لگا "کی بھیا ہری گوپ! ای سدھار سدھار کے کی کتھا ہئی تنی ہمرا کے بھی سمجھا دل جاؤ کی ای دیہات کے سدھار ہوت کیسے۔" (کیا بھیا ہری گوپ یہ سدھار سدھار کا کیا قصہ ہے۔ ذرا مجھے بھی سمجھاؤ کہ یہ دیہات کی ترقی ہوگی کیسے)

ہری گوپ :- (کھنکھار کر موچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے بولا) ابھی پورا پورا بات نئ کھُلل ہے۔ پر اتنا بات البتہ سب لوگن بولت ہین کہ دیہات کے لوگن سب گریب ہت۔ مورکھ ہت۔ ان پڑھ ہت، اُن کر حال بڑا کھراب ہے۔ اُن کا پڑھاوے لکھاوے کے سامان ہووے کے چاہی۔ رہے سہے کے طریقہ سکھاوے کے چاہی۔ جمیدار سب بڑ پاپی ہت۔ دیہات میں بڑا ابناے ہووت ہے۔ ان کا کے جور توڑے کے اوپائے ہووے کے چاہی۔ (ابھی پوری بات تو نہیں کھُلی ہے لیکن اتنا سب لوگ کہہ رہے تھے کہ دیہات کے لوگ بڑے غریب ہیں بیوقوف ہیں۔ جاہل ہیں۔ ان لوگوں کے پڑھنے لکھنے کا سامان ہونا چاہیے رہنے سہنے کا طریقہ سکھانا چاہیے۔ زمیندار بڑے ظالم ہیں۔ دیہات میں

لرح طرح کا ظلم ڈھاتے ہیں۔ ان کا زور توڑنا چاہیے۔)

مرّی ساؤ۔ "سچ ہے بھیا! بات ایکدم سچ ہے۔ ہمرے کے دیکھو
ڑکے مٹھائی بیچت بیچت جون بیتت بھیل مُدا لنگوٹی تک کے ٹھکانہ
نیکھے۔ اب جب زمیندار ختم ہوئی ہیں اور گریب بھی امیر ہو جیہیں تو ہمرا
دوکان میں بھی ترقی ہووے کے سامان ہوت ہے نا بھیا ہری گوپ!
سچ ہے بھیا! بات بالکل سچی ہے۔ مجھی کو دیکھو گڑ کی مٹھائی بیچتے بیچتے
ندگی ختم ہوئی، لیکن لنگوٹی بھی درست نہیں ہو سکی۔ اب جب زمیندار
ختم ہو جائیں گے اور غریب بھی امیر ہو جائیں گے تو میری دوکان میں بھی
ترقی کا سامان ہو گا۔ ہے نا بھیا ہری گوپ!) . . . .

یہ تھا عام احساس اور توقعات کا ایک دھندھلا سا خاکہ جو ناظرین کے
سامنے پیش کیا گیا۔

سنہ ۱۹۳۸ء کا زمانہ تھا۔ قومی تحریک بڑے زوروں پر تھی۔ روزانہ
اخباروں میں طرح طرح کی خبریں نکلتی رہتیں جو تقریباً سب کی سب اس
نوع کی ہوتیں "قوم نے دیکھ لی فلاح کی راہ" ہر محب وطن کا دل ایک ایک
خبر پر بلیوں اچھل جاتا . . . . اسی زمانہ میں میں نے
سُنا کہ ہماری ایک قومی مجلس نے ایک نیا گاؤں بسایا ہے جو بالکل نئے
اصول پر قایم ہے، اس کا نام اُمن پور ہے اور اسے ماڈل ویلج (Model
Village) کا خطاب بھی عطا کر دیا گیا ہے۔ میں خود کسی قومی تحریک کا رکن
نہ تھا لیکن تھا تو ہندوستانی ہی، ناممکن تھا کہ کوئی تمنا اس کے دیکھنے
کی دل میں پیدا نہ ہوتی۔ اپنا مستقبل یکایک اس طرح مجسّم ہو کر سامنے آجائے
اور دل تڑپ نہ اٹھے۔ میں سب کچھ دیکھ لینا چاہتا تھا کہ ہمیں کیا ہونا ہے
ہماری معاشرت، ہماری سوسائٹی اور ہمارے طریقہ بود و ماند کو کس بلندی
پر پہنچنا ہے۔ . . . .

سفر طویل تھا۔ تنہا جانا میں نے گوارا نہ کیا۔ اس لیے اپنے دوست
وجے کمار کو بھی ساتھ چلنے پر مجبور کیا اور وہ بھی چلنے پر رضامند
ہو گئے۔ وجے کمار بڑے جوشیلے قومی کارکن تھے اکثر و بیشتر وہ
تبادلہ خیالات میں مجھ سے اُلجھ بھی جاتے۔ اسلئے ان کی معیت حاصل
کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ بلکہ خود ان کی مسرت بھی
شامل تھی۔ دوسری صبح کو ہم لوگ روانہ ہوئے اور شام کے
وقت ریل کا سفر ختم کر کے شہر کے اسٹیشن پر پہنچے۔ دریافت کرنے
پر معلوم ہوا کہ ابھی پانچ کوس خشکی کا سفر باقی ہے اور اسے دیہات کی
خام سڑکوں پر جن کی مرمت اور صفائی صرف موسموں کے سپرد
ہوتی ہے گزارنا ہے۔

برسات کا موسم تھا۔ راہ کی دشواریوں کا علم پہلے کو نہ ہو سکا
ورنہ شاید ابھی یہ سفر چندے اور ملتوی کر دیا جاتا۔ لیکن اب جب کہ
اتنا قریب پہنچ چکے تھے، میری ہمت نے کسی طرح شکست گوارا
نہ کی۔ علی الصباح ایک ٹمٹم کرایہ کی گئی اور ہم لوگ روانہ ہو گئے۔
ناشتہ بھی نہیں کیا گیا اس کا افسوس تھا لیکن سڑک کی ناہمواریوں
کو دیکھ کر گونہ مسرت ہوئی، اسلئے کہ دوسری صورت میں جسم کے
تمام حصے سے زیادہ ہچکولے کی مصیبت شاید آنتوں کو برداشت
کرنی پڑتی۔ قدم قدم پر سڑی ہوئی کیچڑ ہوا کو متعفن کر رہی تھی
سڑک کے دونوں جانب گڑھوں کا پانی جو کھڑ کرکٹ سے ملکر ایک خاص
رنگ پیدا کر چکا تھا، اس درجہ کراہت انگیز تھا کہ ہر لحظہ دل اور اس سے
زیادہ وجے واپسی پر اصرار کرتے۔ لیکن میں دونوں کو یہ کہکر سمجھا
دیتا کہ جب خدائی جنت کا یہ حال ہے کہ لوگوں کو وہاں پہنچنے کے
لئے جہنم سے گزرنا ہو گا تو یہ تو انسانی پیداوار ہے۔ یہ اور بات ہے
کہ وہاں پہنچکر لوگوں کو واپس ہونا نہیں، اور ہم لوگوں کو پلٹنے میں بھی
تھوڑی تکلیف برداشت کرنی ہے۔ ملک و قوم کے لئے اتنی سی قربانی
کوئی زیادہ اہم نہیں۔ بہر حال افتاں و خیزاں کسی طرح چار میل ختم
ہوئے، اس کے بعد جو منظر سامنے آیا وہ انتہائی آزمایش کا تھا۔

چاروں طرف سمندر موجیں مارتا نظر آرہا تھا۔ سڑک۔ کھیت تالاب، ندی نالے۔ سب یکلخت زیر آب۔ پورا علاقہ سیلاب زدہ تھا۔ آگے بڑھنے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ مایوسی سے ہاتھ پاؤں سوج گئے۔ آپ بھی جانتے ہونگے مایوسی اور شکست امید ایسے موقع پر "دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا" کیسی دل شکن چیز ہے۔ بارے معلوم ہوا کہ کشتی سے بآسانی وہاں تک رسائی ممکن ہے۔ اور کرایہ کی کشتیاں بھی مل جاتی ہیں۔ تھوڑی دیر میں ایک کشتی کرایہ کر لی گئی۔ اور پھر ہم لوگوں نے "ہرچہ باداباد" کہہ کر کشتی کو پانی میں ڈالدیا۔ تقریباً ایک ساعت کشتی پر مسلسل چلتے رہے۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ ہم لوگوں کی منزل اب کچھ زیادہ دُور نہیں رہی ہے صرف ایک میل باقی ہے۔ اس عرصہ میں کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا۔ البتہ دور سے انجن کے بھک بھک کی سی آواز آجاتی۔ میں نے سمجھا کہ کہیں دُور پر کوئی چینی وینی کا کارخانہ ہوگا۔ لیکن جوں جوں ہم لوگ نزدیک پہنچ رہے تھے آواز تیز ہوتی جارہی تھی۔ آخر کار میں نے ملاح سے پوچھا "یہ آواز کیسی آرہی ہے"؟

"سرکار"! ملاح نے جواب دیا "اس پور جہاں اپنے جائی رہی۔ اوہیں میگہ کے پانی انجن سے پھینکل جائی رہی"۔ (سرکار جہاں آپ جارہے ہیں وہیں بارش کا پانی انجن سے پھینکا جارہا ہے)

میں حیرت زدہ ملاح کا منہ تکنے لگا۔ وجے کے لبوں پر ایک فاتحانہ تبسم کھیل رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا گویا وہ مجھ پر پختہ تبسم کا طنز کر رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ اب تک میری منہ زوری کچھ کچھ اور بحث و مباحثہ میں وجے سے میں نے کبھی شکست نہیں کھائی تھی۔ لیکن آج مجھے خود اپنی شکست کا اعتراف ہورہا تھا۔ ایک خاص قسم کی ندامت و پشیمانی محسوس کر رہا تھا اور ساتھ ہی وجے کی بالغ نظری کا دل ہی دل میں قایل ہوتا جارہا تھا۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔ آبادی کے ہم لوگ بہت قریب ہوتے جارہے تھے۔ ٹین کی چھاؤنیاں نظر آنے لگیں اور "پھوس کھپڑ" کی دیواریں آہستہ آہستہ اونچی ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ ہماری کشتی ایک بند کے سامنے جاکر رُک گئی۔

آفتاب کچھ بلند ہو چکا تھا۔ کرنیں بدلیوں سے چھن چھن کر آرہی تھیں۔ اس لئے ان میں وہ حرارت نہ تھی جو برسات کی صاف اور نکھری ہوئی دھوپ میں ہوتی ہے۔ گرمی کم تھی۔ ہم لوگ کشتی سے اُتر کر باندھ پر چڑھے۔ آبادی نشیب میں واقع تھی۔ سیلاب سے بچانے کیلئے گاؤں کے چاروں طرف مٹی کا بند باندھا گیا تھا۔ لیکن سیلاب کی حفاظت کا جو طریقہ اختیار کیا گیا تھا وہی مصیبت کی جڑ بن گیا۔ بارش کا پانی جو بستی میں جمع ہوجاتا اسکے نکلنے کی راہ نہ تھی۔ اسلئے یہ انتظام تھا کہ ہر سال انجن کے ذریعہ جمع شدہ پانی بند کے دوسرے جانب پھینک دیا جاتا۔ ان تمام حالات کے انکشاف پر بعض عجیب طرح کے سوالات میرے دماغ میں پیدا ہونے لگے ——

کیا یہاں غریب نہیں۔ کیا یہاں بے روزگاری معدوم ہوچکی ہے؟ پھر خود ہی میرا ذہن ایک فیصلہ پر پہنچ گیا یعنی ہماری قومی جماعت نے سب سے پہلے یقینی بے روزگاری کو نابود کردیا ہوگا ورنہ ظاہر ہے کہ یہ انجن پر فضول روپے ضایع نہ کئے جاتے۔ یہی کام یہاں کے غریبوں اور مزدور پیشوں سے لیا جاسکتا تھا۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ جو لوگ کھدر کے ایسے زبردست پرچارک ہوں کہ مل کے کپڑوں میں ارزانی اور مضبوطی کی مصلحتوں کو گوارا نہ کریں۔ جس جماعت کا سردار مشین سے اس درجہ متنفر ہو کہ اس کے نکالے ہوئے تیل کو بھی لوگوں کے استعمال کے لائق نہ سمجھے وہ ایسا لایعنی فعل یعنی مشین کے ذریعہ پانی پھکوانا کیسے گوارا کرلیتا۔۔۔۔۔۔۔ انہی خیالات میں الجھا ہوا میں آگے

بڑھتا گیا۔ گاؤں میں پتلی پتلی خام سڑکیں بنی تھیں۔ درمیانی سڑک پر دونوں جانب کاغذ کی چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں لگائی گئی تھیں۔ تھوڑی دُور پر ایک لمبا سا چبوترہ تھا، جس پر دیہاتی کپڑوں کی چھاؤنی تھی یہاں اس چبوترے کو کانسل ہال کا نام دیا گیا ہے۔ اسلئے میں بھی اسے اسی نام سے یاد کرونگا۔ کانسل ہال میں ایک کنارہ پر ایک میز تھی اور اس کے ایک جانب ایک کرسی رکھی تھی، یہاں کافی مجمع تھا۔ اور سب لوگ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد "بڑے بابو کی جے" کہہ کر چلا اُٹھتے باہر بچّے رنگین جھنڈیاں لئے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ آج اس بستی کی سالگرہ منائی جانے والی ہے۔ اور یہاں کے لیڈر جنہیں سب لوگ "بڑا بابو" کہتے ہیں ابھی ابھی آنے والے ہیں۔ بات پوری بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ ایک موٹر بوٹ کے آنے کی آواز آنے لگی اور سب لوگ کشتی کے اسٹیشن کیطرف دوڑ پڑے۔

موٹر بوٹ اسی بند کے نیچے آکر رکی۔ ایک سیاہ فام تن و توش والا انسان جو سر سے پیر تک کھدر پوش تھا اس پر سے اُترنے لگا۔ میرا دماغ کچھ عجب طرح کی فکر میں مبتلا ہو رہا تھا۔ بڑا بابو لیڈر، موٹر، بوٹ، کچھ الجھن پیدا کرنے والی چیزیں تھیں۔ میں انہیں ایک سلسلہ میں پرونا چاہتا تھا۔ لیکن ممکن نہ ہوا۔ مجھے زیادہ دیر تک اس الجھن میں رہنا نہیں پڑا اسلئے کہ مجمع مع بڑے بابو کانسل ہال میں پہنچ چکا تھا اور سب کے پیچھے ہم لوگ بھی۔ سب سے پہلے ایک گلاس افشردہ انار پیش کیا گیا، اس کے پی لینے کے بعد ہمارے بڑے بابو نے ایک گلاس دودھ پیا۔ اور پھر اپنی دھوتی کے زیریں حصّہ سے مونچھوں کو صاف کرتے ہوئے کرسی پر ذرا اچھل کر بیٹھ گئے ـــــــ جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی۔ جے کے نعروں اور تالیوں کی گونج میں بڑے بابو تقریر کیلئے کھڑے ہوئے، لیکن ابھی تقریر شروع نہیں کرنے پائے تھے کہ ایک طرف کچھ ہلچل ہوئی اور کچھ شور سنائی دیا بیٹھو! بیٹھو! خاموش! چپ رہو، کی صدا بلند ہوئی۔ بڑے بابو کھڑے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کرتے رہے۔ لیکن بے فائدہ۔ ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور ان کے قدموں میں گر کر کہنے لگا "بڑے بابو! اپنے آگیلن بڑا آسرا لگل رہے ہے۔ لچھمی کے دن سے بھوکل ہے، اگر کچھ کھائے کے دلوا دیل جائے" (بڑے بابو! آپ آگئے۔ بڑا انتظار تھا۔ لچھمی کئی دن سے بھوکی ہے اس کے کھانے کو کچھ دلوا دیا جائے۔)

وہ حد درجہ کثیف تھا۔ کپڑے بالکل پھٹے ہوئے تھے اور تقریباً ننگا تھا۔ بڑے بابو نے ایک کراہت کی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور لوگوں سے پوچھا کہ کیا قصّہ ہے۔ معلوم ہوا کہ اس کی ایک لڑکی لچھمی نامی تھی۔ برسات کا موسم تھا۔ کوئی روزگار نہ ملنے کے سبب کھانے پینے کا کوئی سامان ممکن نہ ہو سکا اور اس نے تڑپ تڑپ کر بھوک سے جان دے دی۔ اور یہ اسی وقت سے دیوانہ ہو گیا۔ بڑے بابو نے اشارہ کیا اور وہ جلسہ سے کشاں کشاں باہر نکال دیا گیا۔ جلسہ کی کارروائی پھر جاری ہو گئی ـــ ....

میں حد درجہ دل شکستہ ہو گیا۔ اتنا دل شکستہ کہ تقریر سننے کو بھی جی نہ چاہا۔ وہ مجھے کو زبردستی کھینچتا ہوا باہر آیا اور امن پور سے روانہ ہو گیا۔ تمام راہ میں جو کچھ سوچتا رہا وہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر تھا

مجھ کو معلوم ہیں پیرانِ حرم کے انداز
ہو نہ اخلاص تو دعوائے نظر لاف و گزاف

شیکسپیر کی شہرہ آفاق تمثیل "AS YOU LIKE IT" کا ترجمہ

"من کی چاہ"

از جناب سعید الحق صاحب دسنوی بی۔ اے (آنرز)

(۳)

ساتواں منظر

جنگل کا دوسرا حصہ

(کھانے کی چیزیں رکھی ہوئی ہیں ڈیوک سینیر امینیس اور امرا داخل ہوتے ہیں)

ڈیوک سینیر:۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ جانور کی شکل میں بدل گیا ہے اس لئے کہ اس کا کہیں بھی پتہ نہیں ہے۔

پہلا امیر:۔ حضور، وہ ابھی یہاں تھا اور نغمہ سنجی کر رہا تھا۔

ڈیوک سینیر:۔ خوب اگر وہ نوا سنجی کرے تو نظام کائنات میں بے ربطی پیدا ہو جائے۔

پہلا امیر:۔ وہ دیکھئے حضور۔ وہ آ رہا ہے۔

(ژاک داخل ہوتا ہے)

ڈیوک سینیر:۔ موسیو ژاک! سب لوگ تمہاری محبت کے خواہاں ہوں اور تم بھاگتے پھرتے ہو۔

ژاک:۔ ابھی ابھی جنگل میں ایک مسخرہ سے ملاقات ہوئی جو بوقلمون رنگے کپڑے میں ملبوس تھا، وہ قسمت کی دیوی پر لعنت ملامت کر رہا تھا، میں نے کہا السلام علیکم اے احمق مسخرے" تو اس نے کہا جب تک قسمت کی بخششیں مجھ پر نچھاور نہ ہوں مجھ کو احمق کے نام سے مت پکارو" اور تب اس نے ایک دھوپ گھڑی اپنے تھیلے میں سے نکالا اور کہا اسی طریقہ سے صبح و شام کا ابلق دوڑتا رہتا ہے، ایک گھنٹہ پہلے نو بجے تھے، اور ایک گھنٹہ بعد گیارہ بجیں گے، اور اس طرح ہر آنیو گھنٹے کے ساتھ ہم لوگ قبر سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ جب میں نے اس کے اس فلسفیانہ مقالہ کو سنا تو میں نے ہنسنا شروع کیا اور ایک گھنٹہ تک لگاتار ہنستا رہا، اور میرے پھیپھڑے کوے کی طرح معلوم ہو رہے تھے، مسخرے بھی ایسی خیال آرائی کر سکتے ہیں۔

ڈیوک سینیر:۔ یہ کونسا مسخرہ ہے۔

ژاک:۔ وہ درباری رہ چکا ہے اور اس کے دماغ میں جو بسکٹ کے ٹکڑے کی طرح خشک ہے ہر قسم کی باتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں، کاش میں بھی مسخرہ ہوتا اور میرے پاس بھی بوقلموں رنگ کا کپڑا ہوتا،

ڈیوک سینیر:۔ اچھا وہ کپڑا تم کو دیا جائے گا۔

ژاک:۔ یہی میری ایک درخواست ہے مجھکو اجازت دیجئے کہ جس چیز پر چاہوں تنقید کر سکوں تاکہ میں دنیا کو تمام نجاستوں سے پاک کر ڈالوں۔

ڈیوک سنیر :۔ تو نے خود ایک عیاش ہوس پرست کی زندگی بسر کی ہے تو زنبوروں کی طرح شہوت پرست رہ چکا ہے

ژاک :۔ اگر میں نخوت کو برا کہوں تو میں کسی خاص شخص پر حملہ نہیں کر رہا ہوں، اگر میں یہ کہوں کہ عورتوں نے شاہزادوں کو مفلس اور قلاش بنا ڈالا ہے تو میرا مطلب کسی خاص عورت سے نہیں ہے یہ کون شخص یہاں آ رہا ہے ؟

(اورلنیڈو تلوار لئے ہوئے داخل ہوتا ہے)

اورلنیڈو :۔ ٹھہرو اور کھانا بند کرو۔

ژاک :۔ یہ کیوں، میں نے ابھی کچھ بھی نہیں کھایا ہے ۔

اورلنیڈو :۔ اور جب تک میری ضرورت پوری نہ ہو جائے کچھ کھانا نہیں پڑے گا

ژاک :۔ یہ کس قسم کا مرغ ہے ۔

ڈیوک سنیر :۔ کیا مصیبت نے تجھکو اس جرأت کی تعلیم دی ہے یا تو اخلاق و اطوار سے ہی نا آشنا ہے ۔

اورلنیڈو :۔ یہ صحیح ہے کہ مصیبت نے میرے اخلاق کو مجھ سے چھین لیا ہے لیکن میں بھی تہذیب آشنا ہوں لیکن ٹھہرو، جو اس پھل کو چھوئے گا وہ گویا

ڈیوک سنیر :۔ آخر تم کیا چاہتے ہو، شرافت سے تمہارا کام نکل سکتا ہے، جبر سے نہیں ۔

اورلنیڈو :۔ مجھے کچھ کھانے کی ضرورت ہے ۔

ڈیوک سنیر :۔ تو بسم اللہ بیٹھو اور کھاؤ ۔

اورلنیڈو :۔ میں معافی کا خواستگار ہوں، میں سمجھتا تھا کہ سب لوگ جنگل میں ہیں اس لئے میں نے ایسا رویہ اختیار کیا تھا۔ اگر آپ لوگ تہذیب و تمدن سے روشناس رہ چکے ہیں، اگر کلیسا کے ناقوس کی آواز سن چکے ہیں ۔ اگر مہذب آدمیوں کے ہاں دعوتیں کھائی ہیں، اگر آپکے دل میں رحم ہے تو آپ مجھ پر رحم کیجئے ۔

ڈیوک سنیر :۔ یہ صحیح ہے کہ ہم لوگوں کے بھی اچھے دن گزر رہے ہیں اور کلیسا میں عبادت بھی کی اور آنکھیں اکثر رحم کی وجہ سے اشکبار بھی ہو چکی ہیں، اس لئے بیٹھ جاؤ اور اپنی ضرورت سے آگاہ کرو ۔

اورلنیڈو :۔ تو ذرا آپ لوگ کھانا روکیں اور جس طرح ایک ہرن اپنے بچہ کو لاتی ہے اسی طرح میں ایک بوڑھے شخص کو لاؤں گا۔ وہ بیچارہ میرے ساتھ محض محبت کی وجہ سے آیا ہے، بڑھاپا اور بھوک نے اسکو کمزور کر دیا ہے، جب تک اسکی ضرورت پوری نہ ہو میں ایک لقمہ بھی فرو حلق نہیں کروں گا ۔

ڈیوک سنیر :۔ اچھا جاؤ، لے آؤ، جب تک تم واپس نہیں آؤ گے ہم لوگ نہیں کھائیں گے ۔

اورلنیڈو :۔ شکریہ، ذرا آپ لوگوں پر اپنی رحمت نازل کرے

(چلا جاتا ہے)

ڈیوک سنیر :۔ صرف ہم ہی لوگ دنیا میں بدنصیب نہیں ہیں، دنیا مصیبتوں کا گھر ہے ۔

ژاک :۔ دنیا ایک اسٹیج ہے اور مرد اور عورت سب اپنا اپنا پارٹ کرتے ہیں، وہ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، ایک ہی آدمی اپنی زندگی میں سات مختلف پارٹ کرتا ہے، پہلے تو وہ دایہ کی گود میں بچہ کی حیثیت سے رہتا ہے اور روتا رہتا ہے، اس کے بعد وہ اپنا جزدان لیکر اپنی مرضی کے خلاف گھونگھے کی طرح رینگتا ہوا اسکول جاتا ہے ۔ اس کے بعد وہ عاشق زار بن جاتا ہے ۔ اور اس کا سینہ آتش عشق سے دہکتا رہتا ہے، اور اپنی محبوبہ کے ابروؤں کی تعریف میں قصیدے لکھتا رہتا ہے، تب وہ ایک جنگجو سپاہی کی حیثیت سے میدان میں آتا ہے، طرح طرح کی قسمیں کھاتا ہے، اسکی داڑھی چیتے کی داڑھی کی طرح ہوتی ہے، اپنی عزت و آبرو کے لئے جان دینے کے لئے تیار رہتا ہے ۔

اور بندوق اور توپ کے منہ کے سامنے بھی اپنی شہرت کی ہوس رکھتا ہے تب وہ کسی عدالت کا قاضی ہوتا ہے۔ اور اسکی توند مرغن غذاؤں سے پر رہتی ہے، آنکھوں سے رعب ٹپکتا ہے اور اسکی ریش ایک خاص وضع اور قطع کی ہوتی ہے وہ بہترین کہاوت اور ضرب المثل بولتا رہتا ہے چھٹے پارٹ کا وقت جب آتا ہے تو آنکھ میں عینک ہوتی ہے اور گالوں پر جھریاں پڑجاتی ہیں۔ اسکی جوانی کے موزے اب بہت چوڑے معلوم ہوتے ہیں اور اسکی آواز بچوں کی سی آواز ہوجاتی ہے آخری منظر وہ ہوتا ہے جب اسکی زندگی کی کتاب ختم ہورہی ہے وہ دوسرا بچپن ہے، ذات کا پتہ نہیں رہتا آنکھوں کی روشنی مفقود ہوجاتی ہے منہ کا مزہ بدل جاتا ہے غرضکہ

پیری و صد عیب چنیں گفتہ اند

ڈیوک سینیر:۔ خوش آمدید۔ اپنے معزز بوجھ کو رکھو اور اسکو کھانا کھلاؤ

اورلینڈو:۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

امینس:۔ سرما کی ہوائیں، چلو، چلو

تم اتنی بیرحم نہیں ہو
جتنی انسانوں کی احسان فراموشی
دوستی فریب ہے، الفت ایک دھوکا ہے
بس یہی زندگی بہترین ہے
اے آسمان تو پانی کو جما دے، جما دے
لیکن تو اتنا بیرحم نہیں ہے
تو جتنا احسان فراموش دوست
دوستی فریب ہے، الفت ایک دھوکا ہے

ڈیوک سینیر:۔ تم سر رولینڈ کے لڑکے ہو، تم بالکل اس کی زندہ تصویر ہو میں ڈیوک ہوں اور میرے اور تمہارے والد کے درمیان رفق و محبت کا رشتہ تھا۔

جزو سوم

پہلا منظر

محل میں ایک کمرہ

(ڈیوک فریڈرک، اولیور، امرا اور نوکر داخل ہوتے ہیں)

ڈیوک فریڈرک:۔ تم نے اسکو نہیں دیکھا ہے! یہ ممکن نہیں جہاں کہیں سنتے بھی ہو اس کو ڈھونڈ کر لاؤ۔ اسکو چراغ لے کر ڈھونڈھو۔ تم اسکو میرے سامنے حاضر کرو۔ نہیں تو ہمارے مقبوضات کے احاطہ میں تم نہیں رہ سکتے اور تمہاری زمین اور تمہاری کل چیزیں ضبط کرلی جائیں گی۔

اولیور:۔ مجھ کو اپنے بھائی سے کبھی بھی محبت نہ تھی۔

ڈیوک فریڈرک:۔ تب تو اور بھی قابل نفرین ہے۔ اسکو محل سے نکالو۔ اس کے گھر اور اسکی زمینوں پر قبضہ کرو۔

دوسرا منظر

آرڈن کا جنگل

(اورلینڈو ایک کاغذ لئے ہوئے داخل ہوتا ہے)

اورلینڈو:۔ یہ میرے اشعار جو وہاں آویزاں ہیں میرے عشق کی شہادت دیں گے۔ اور ملکۂ شب اپنی عفت مآب آنکھوں سے انکو دیکھے گی، اے روزلینڈ۔ ان درختوں پر میری محبت کے نغمے ہوں گے، انکی چھالوں پر میں اپنے خیالات کو لکھ دونگا تاکہ ہر دیکھنے والی آنکھ تیرے اوصاف سے آگاہ ہوجائے

روزلنیڈ :- جا اور ہر درخت پر اس حسین اور عفت مآب پری کا نام لکھ دے ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔

(روزلینڈ ایک کاغذ پڑھتی ہوئی داخل ہوتی ہے)

(روزلینڈ پڑھتی ہے) :- مشرق سے لیکر مغربی ہند تک[1]

روزلینڈ کی طرح کوئی بھی ہیرا نہیں

دنیا کی تمام حسین تصویریں

روزلینڈ کے سامنے سیاہ ہیں

اس لئے انسان کے دماغ میں

سوائے روزلینڈ کے اور کسی کی تصویر نہ ہو

(سیلیا ایک کاغذ پڑھتی ہوئی داخل ہوتی ہے)

(سیلیا پڑھتی ہے) :- میں ہر درخت کو زبان دار بنا دونگا مختلف کہاوتیں درختوں پر آویزاں کرونگا کوئی کہاوت دنیا کی ناپائیداری کے متعلق ہوگی کوئی ضرب المثل ٹوٹے ہوئے پیمانِ وفا کے متعلق ہوگا لیکن ہر شاخ پر روزلینڈ کا نام لکھدونگا تاکہ دنیا حسن و خوبی کے اس مرقع سے آگاہ ہوجائے قضاو قدر کا یہ تقاضا تھا کہ ایک ہی ذات تمام خوبیوں کا مجموعہ ہو[2]۔ قدرت نے ہلن[3] (HELEN) کے رخساروں کے حسن کا عطر کھینچا قلوپطرہ[4] (CLEOPATRA) کی شان و شوکت کی روح کھینچی اٹلینٹا[5] (ATLANTA) کے اوصاف اور لیوکریشیا[6] (LUCRATIA) کی عصمت کا جوہر کھینچا اور آسمان والوں کی مجلس نے یہ فیصلہ کیا کہ روزلینڈ کو ان تمام

---

[1] آفاقہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام بسیار خوباں دیدہ ام اما تو چیزے دیگری

[2] آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

[3] ہلن HELEN ۔ اسپارٹا کے بادشاہ مینیلوس MENELAUS کی ملکہ یونانیوں کے دیوتا جوپیٹر (JUPITAR) کی لڑکی جو لیڈا (LUDA) کے بطن سے پیدا ہوئی تھی یہ سرو قامت اپنے زمانہ کی حسین ترین عورت تھی ۔ پیرس PARIS اسکو ٹروائے (TROY) لے بھاگا اس لئے یونان اور ٹروائے (TROY) کے درمیان جنگ چھڑی اور خون آشام لڑائیاں ظہور میں آئیں۔

[4] قلوپطرہ CLEOPATRA ۔ مصر کی ملکہ جس نے رومن اینٹونی (ANTONY) سے بیاہ کیا تھا۔ دونوں کے عشق کی داستان ایک رنگین افسانہ ہے قلوپطرہ کا رنگ سانولا اور نمک ریز تھا لیکن اس کی دلکشی اور جاذبیت نے اینٹونی (ANTONY) کو وارفتہ بنا رکھا تھا شیکسپیر نے اپنے ڈرامہ اینٹونی اینڈ کلوپیٹرا ANTONY AND CLEOPATRA میں اسکی تعریف یہ کی ہے کہ اسکی گوناگوں دلکشی اور جاذبیت انقلاباتِ زمانہ کی شکست و ریخت سے محفوظ رہے گی جب اینٹونی ANTONY ایک لڑائی میں مارا گیا تو قلوپطرہ نے اپنے کو ایک سانپ سے ڈسوالیا اور ہلاک ہوگئی ڈرائڈن (DRYDEN) اور جورج برنارڈ شا (GEORGE BERNADSHAW) نے بھی (ANTONY AND CLEOPATRA) اینٹونی اینڈ کلوپیٹرا کے نام سے ڈرامے لکھے ہیں۔

[5] اٹلینٹا (ATALANTA) یونانی فرضی قصوں کی مشہور شکاری عورت جو اپنی تیز گامی کے لئے مشہور تھی اس نے یہ عہد کیا تھا کہ جو شخص اس کو دوڑنے کے مقابلہ میں شکست دیدے وہ اس شخص کو اپنا شوہر بنائے گی اور جو شخص مقابلہ میں شکست کھاجائے وہ موت کے گھاٹ اتارا جائے کتنے بدنصیب اپنی موت سے دوچار ہوئے آخر کار ہپّومینز (HIPPOMENES) نامی ایک شخص نے اسکو ایک تدبیر سے شکست دیدی جیوں جیوں وہ دوڑتا جاتا تھا اس نے تین سنہرے سیب گرادئے۔ اور اٹلینٹا رک کر سیبوں کو چننے لگی اور وہ ہپّومینز کے پیچھے رہ گئی۔

[6] لیوکریشیا (LUCRATIA) رومن فرضی قصے کی ہیروئن اسکٹس ٹارکوینس (SEKTES TARQUINUS) اس کے حسن کا دلدادہ تھا ۔ اور جب کسی حیلہ سے بھی اسکو اپنے قبضہ میں نہ لاسکا تو ایک رات جب حسن و عصمت کی یہ دیوی سوئی ہوئی تھی ٹارکوینس نے اسکی عصمت پر شبخون مارا اس باحیا خاتون نے اپنے جسم میں ایک چھری بھونک کر اپنی جان کا خاتمہ کرڈالا۔

ادصاف کا ایک مرقع بنایا جائے اور میں اس کا غلام بنکر رہوں، اورمروں -

سلیا :- تم نے یہ سب سنا -

روزلینڈ :- ہاں سنا تو -

سلیا :- مگر تعجب ہے کہ ہر درخت پر تمہارا نام کندہ ہے -

روزلینڈ :- میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں -

سلیا :- کیا تم بتا سکتی ہو کہ یہ سب کس کا کام ہے -

روزلینڈ :- یہ کوئی مرد ہے ؟

سلیا :- ہاں اور وہ تمہارا دیا ہوا مالا پہنے ہوئے ہے، شرماتی کیوں ہو ؟

روزلینڈ :- میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ اس کا نام بتاؤ -

سلیا :- تعجب، تعجب، بالا سے تعجب، اہا اہا اہا -

روزلینڈ :- آخر وہ کون شخص ہے ؟

سلیا :- وہ نوجوان اورلینڈو ہے جس نے پہلوان کو شکست دی تھی اور تمہارے دل کو بھی مسخر کیا تھا -

روزلینڈ :- نہیں ٹھیک بتاؤ، مذاق نہ کرو -

سلیا :- میں سچ کہتی ہوں -

روزلینڈ :- اورلینڈو ؟

سلیا :- ہاں اورلینڈو -

روزلینڈ :- جب تم نے اسکو دیکھا تو وہ کیا کر رہا تھا؟ اس نے کیا کہا، وہ کیسا معلوم ہوتا تھا؟ وہ یہاں کیا کرتا ہے؟ کیا اس نے میرے بارے میں کچھ پوچھا؟ وہ کہاں رہتا ہے؟ وہ تم سے کس طرح جدا ہوا؟ اور پھر تم کو اس سے کب ملاقات ہوگی؟ ایک لفظ میں سب کا جواب دو -

سلیا :- وہ ایک شکاری کی طرح معلوم ہوتا تھا -

روزلینڈ :- تب وہ صیاد میرے دل کے شکار کے لئے آرہا ہے -

سلیا :- وہ دیکھو وہ آرہا ہے -

(اورلینڈو اور ژاک داخل ہوتے ہیں)

ژاک :- میری التجا ہے کہ ان درختوں پر عشقیہ اشعار لکھ کر انکو خراب نہ کرو -

اورلینڈو :- میری درخواست ہے کہ آپ ان اشعار کو نہ پڑھیں -

ژاک :- تمہاری محبوبہ کا نام روزلینڈ ہے نا ؟

اورلینڈو :- ہاں -

ژاک :- مجکو اس کا نام پسند نہیں ہے -

اورلینڈو :- جس وقت اس کا نام رکھا گیا تھا اسوقت آپکی خوشی اور ناخوشی کا خیال نہ تھا -

ژاک :- مجھو اور قسمت کی دیوی پر لعنت و ملامت کریں -

اورلینڈو :- میں اپنے سوا کسی اور کو برا بھلا نہیں کہونگا اسلئے کہ میں اپنی برائیوں کو جانتا ہوں -

ژاک :- واقعہ یہ ہے کہ میں ایک احمق کی تلاش میں تھا اور تم سے ملاقات ہوگئی -

اورلینڈو :- وہ پانی کے چشمہ میں ڈوب گیا ہے۔ پانی میں دیکھو تو اس کا عکس معلوم ہوگا -

ژاک :- اب میں جاتا ہوں -

(ژاک چلا جاتا ہے)

روزلینڈ :- جناب کتنے بجے ہیں ؟

اورلینڈو :- یہ پوچھیے کہ کتنا دن چڑھا ہے - اس لئے کہ جنگل میں کوئی گھڑی نہیں ہے -

روزلینڈ :- تب یہاں کوئی سچا عاشق نہیں رہتا ہے نہیں تو

جو ہر لحظہ آہ و فغاں کرتا ہے وہ وقت کی رفتار سے ضرور آگاہ رہتا۔ وقت مختلف لوگوں کے ساتھ مختلف رفتار سے گزرتا ہے میں بتاؤں گا کہ کس کے ساتھ یہ لنگ کھا کر چلتا ہے اور کس کے ساتھ دلکی چال چلتا ہے اور کس کے ساتھ سرپٹ کی رفتار سے چلتا ہے۔

اورلنیڈو:۔ اچھا تو کس کے ساتھ دلکی کی چال سے چلتا ہے؟

روزلینڈ:۔ نوخیز لڑکی کے لئے شادی کے پیمان اور شادی کی تکمیل کے درمیان کا وقت بڑی کٹھن سے گزرتا ہے اگر وقفہ ایک ہفتہ کا بھی ہو تو وہ سات سال کا معلوم ہوتا ہے۔

اورلنیڈو:۔ اور کس کے ساتھ وقت لنگ کھا کر چلتا ہے؟

روزلینڈ:۔ اس پادری کے ساتھ جو لاطینی زبان سے ناآشنا ہو اور اس امیر کے ساتھ جس کو نقرس کی بیماری نہ ہو اس لئے کہ دونوں چین کی نیند سوتے ہیں۔

اورلنیڈو:۔ اور کس کے ساتھ سرپٹ چال چلتا ہے؟

روزلینڈ:۔ اس چور کے ساتھ جو پھانسی پر چڑھنے والا ہو۔

اورلنیڈو:۔ اور کس کے ساتھ وقت خاموشی سے ٹھہرا رہتا ہے؟

روزلینڈ:۔ وکیلوں کے ساتھ تعطیل کے زمانہ میں اس لئے کہ تعطیل میں وہ خوب سوتے ہیں اور انکو اس کا پتہ بھی نہیں چلتا ہے کہ وقت گزرتا ہے یا نہیں۔

اورلنیڈو:۔ تمہارے لہجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تم اس جنگل کے رہنے والے نہیں ہو۔

روزلینڈ:۔ میرے متعلق بہت سے لوگوں کا یہی خیال ہے درحقیقت میرے ایک بوڑھے چچا تھے جو اپنی جوانی میں مہذب اور متمدن جگہوں میں رہ چکے تھے۔ انھوں نے مجکو تعلیم دی ہے .. .. کوئی آدمی اس جنگل میں مارا پھرتا ہے اور تمام پودوں اور درختوں کی چھالوں پر روزلینڈ لکھا پھرتا ہے۔ اگر اس عشق کے مارے سے ملاقات ہو جائے تو میں اسکو کچھ مشورہ دوں۔ وہ دام عشق میں گرفتار معلوم ہوتا ہے۔

اورلنیڈو:۔ میں ہی وہ شخص ہوں۔

روزلینڈ:۔ مگر تم میں تو عشق کی کوئی بھی ایسی علامت نہیں پائی جاتی جو میرے چچا نے مجکو بتائی تھی۔

اورلنیڈو:۔ وہ کونسی علامتیں ہیں؟

روزلینڈ:۔ نہ تو تمہارے گال سوکھے ہوئے ہیں نہ تو آنکھیں دھنسی ہوئی ہیں نہ تو تمہاری داڑھی غیر اصلاح شدہ حالت میں ہے۔ اگر تم واقعی اسیر محبت ہو تو تمہارے موزوں میں موزہ بند نہیں ہوتے۔ تمہاری آستینوں میں بٹن نہیں ہوتے اور تمہاری ہر چیز سے پریشانی اور لاپروائی کا پتہ چلتا۔

اورلنیڈو:۔ کاش تم کو یقین ہوتا کہ میں درحقیقت اسیر محبت ہوں۔

روزلینڈ:۔ میں تو اسکو یقین نہیں کرسکتا۔ یہ جا کر اپنی محبوبہ سے جتاؤ۔ مگر وہ تم سے بھی زیادہ چالاک ہے۔ وہ اپنی محبت کا اقرار ہرگز تمہارے سامنے نہ کریگی لیکن سچ بتاؤ کہ روزلینڈ کی تعریف میں جو قصیدے درختوں پر لکھے ہوئے ہیں ان کے مصنف تم ہی ہو۔

اورلنیڈو:۔ قسم ہے روزلینڈ کے دست سیمیں کی۔ میں ہی وہ بدنصیب ہوں۔

روزلینڈ:۔ کہتے ہیں کہ عشق خلل ہے دماغ کا۔ یہ ایک جنون[1] ہے اور عاشقوں کو بھی کالی کوٹھری اور کوڑوں کی حاجت ہے

---

[1] شکسپیر نے اپنے ایک ڈرامے میں لکھا ہے کہ عاشق مجنوں اور شاعر کی دماغی ساخت یکساں ہوتی ہے۔

بت پرست

از جناب رفعت ہاشمی صاحب

بسنتی حقیقی معنوں میں تمام رعنائیوں کی حامل تھی۔ لیکن وہ اچھوت قوم سے تھی، بے حد حسین وجمیل مگر ایک کالے کلوٹے شامو نامی بھنگی کی شریک حیات۔

یہ دونوں برہمن نگر نام ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہا کرتے تھے۔

اچھوتوں کو کھلے بندوں مندر میں جانا تو کجا۔ گھر میں بھی مورتی پوجا کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں: تاہم ایک اچھوت کے دل سے دیوی دیوتاؤں کی عقیدت و احترام کو کوئی طاقت بھی چھین نہیں سکتی۔ چنانچہ بسنتی دیوتاؤں سے نہ صرف ازلی عقیدت ہی لے کر آئی تھی۔ بلکہ اسے ان سے عشق تھا۔ اور اسی عشق سے وہ ہر وقت مخمور رہا کرتی، مگر اچھوتوں کی بے بسی دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتی اور سماج کی بے مہریوں پر دن رات آٹھ آٹھ آنسو بہایا کرتی۔

وہ منہ اندھیرے سے اٹھتی۔ جھاڑو اور ٹوکری اٹھا کر سیدھی مہا دیو کے مندر کی طرف چلی جاتی اور باہر ہی سے سامنے رکھی ہوئی مہا دیو کی مورتی کے درشن کرتی۔ ہاتھ جوڑ کر سر جھکاتی اور دل ہی دل میں ان سے ہم جنسوں کی حالتِ زار بیان کر کے رحم و کرم کی طلبگار رہتی۔ اس کے بعد مندر سے باہر دور تک صفائی کرتی اور پھر گاؤں میں اپنے کام پر چلی جاتی۔

دوپہر کے وقت جب کام سے فارغ ہوتی تو گھر میں آکر نہاتی۔ کھانا وغیرہ پکاتی شوہر کو کھلا کر خود گاؤں کے باہر کھیتوں کی طرف چلی جاتی جہاں ان کے گرد کہیں کہیں لگے ہوئے کچھ جنگلی پھول چنتی پھر مندر کی طرف چلی جایا کرتی۔

دوپہر کے وقت مندر کا دروازہ بند کر دیا جاتا تھا۔ تاہم وہ باہر ہی بیٹھ کر پھولوں کو دروازے کی چوکھٹ پر رکھتی، سر جھکا کر مہا دیو کا سمرن کرتی اور پھر گھر واپس آکر کھانا کھاتی۔ یہ اس کا معمول تھا۔

شامو اور بسنتی کی شادی ہوئے ابھی ایک ہی برس گزرا تھا۔ دل اور اس کے جذبات تو ہر شخص کو یکساں طور پر ملے ہیں۔ شامو بسنتی سے بے حد محبت کرتا تھا۔ مگر بدگمانی محبت کے لئے زہر قاتل کا اثر رکھتی ہے۔ وہ اسے متواتر ایک برس سے روزانہ دوپہر کے وقت گھر سے غیر حاضر رہتے دیکھ رہا تھا۔ اور چونکہ حقیقت سے بالکل بے خبر تھا اس لئے بسنتی کی طرف سے طرح طرح کے شک و شبہات اس کے دل و دماغ میں جاگزیں ہو چکے تھے۔ اس نے کئی مرتبہ بسنتی سے اس بارے میں کچھ پوچھنا بھی چاہا مگر نہیں معلوم کہ کیوں ہمیشہ مہر بہ لب ہی رہا۔

مگر اس پردہ خاموشی میں بھی اس کا دماغ برابر اس عقدہ کو حل کرنے کی سعی کر رہا تھا اور آخر کار بہت دنوں کی سوچ بچار سے اس کے ذہن میں ایک تدبیر آئی کہ وہ کسی دن خفیہ طور پر اس کا تعاقب کرے۔ یہ خیال

اسے پیشتر کبھی بھی نہ آیا تھا لہذا اب وہ بالکل مطمئن تھا۔ وقت کا نہایت بے چینی سے انتظار کرنے لگا اور اسی وجہ سے اس دن کام سے بھی جلد فارغ ہو کر گھر آگیا۔

گرمی کا موسم تھا لو چلنے لگی تھی۔ کہ بسنتی گھر آئی۔ نہا کر کھانا پکایا شوہر کو کھلا کر خود باہر چلی گئی۔ شامو بھی اٹھا اور چپکے سے اس کے پیچھے ہولیا۔

وہ کھیتوں کی طرف گئی۔ کچھ جنگلی پھول چنے اور کسی طرف نظر اٹھائے بغیر مندر کی طرف جانے لگی۔ شامو برابر اس کے تعاقب میں تھا۔

بسنتی مندر کے دروازے پر پہنچی اور حسب معمول پھول دہلیز پر رکھنا چاہتی تھی کہ بھڑے ہوئے کواڑوں کی بڑی دراز سے اسے معلوم ہوا کہ دروازہ آج بند نہیں ہے۔ وہ ایک لمحہ کے لئے ٹھٹک گئی گویا کچھ سوچ رہی تھی۔ اور پھر اس نے آہستہ سے ایک کواڑ کو اندر کی طرف دھکیلا اور جھانک کر دیکھا

مندر سنسان پڑا تھا۔ سامنے بلند چبوترے پر مہادیو کی پیتل کی مورتی سونے کی طرح چمک رہی تھی اور صحن میں دھوپ بکھری ہوئی تھی۔

بسنتی نے سر دروازے سے باہر نکالا۔ چاروں طرف نگہ دوڑائی۔ شامو مندر کی اوٹ میں چھپ گیا اور وہ نہایت اطمینان مگر ایک خاص قسم کی بیخودی سے مندر میں داخل ہوئی اور دروازہ تقریباً بند کر دیا۔

ذرا سی دیر کے بعد حسرت و جوشش میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولی:۔

"بھگوان ہم دکھیوں پر دیا کرو۔"

معاً اسے معلوم ہوا کہ کوئی اس کے عقب میں کھڑا ہے اس نے اس نے برق کی سی تیزی اور گھبراہٹ میں مڑ کر دیکھا۔ مندر کا گول گپا پجاری بھر کم ٹھگنا اور ادھیڑ عمر پجاری اسے کھڑا دیکھ رہا تھا۔

وہ مندر سے ملحقہ کمرے میں سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ بسنتی کو مورتی کی طرف جاتے دیکھ کر اس کے پیچھے ہی کمرے سے باہر نکل کھڑا ہوا۔

اسے اس وقت صرف ایک دھوتی بندھی ہوئی تھی۔ اور زنار پڑا ہوا تھا۔ گردن ماتھے اور کانوں پر زرد رنگ کے تلک لگے ہوئے تھے۔ داڑھی مونچھیں اور سر صفا چٹ تھا۔ مگر چوٹی کمر تک دراز تھی۔

بسنتی کا دل دھڑکنے لگا اس نے نہایت عاجزی سے ہاتھ باندھ کر ملتجی آنکھوں سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا:۔

"مہاراج شما کیجئے اپرادھ ہوا"

"اپرادھ! ہاں اپرادھ اگر ہوا ہے تو ڈنڈ بھرنا پڑیگا"

پجاری نے مٹک کر جواب دیا۔

بسنتی نے پژمردہ چہرہ اوپر اٹھایا اور کہا۔

"مگر میں تو شما چاہتی ہوں کیونکہ میں کسی پاپ کی اچھیا کے انوسار مندر میں نہیں آئی"

"پاپ! تم نے مندر کو بھرشٹ کر دیا ہے اس سے بڑھ کر اور پاپ کون سا کرو گی"؟

پجاری نے سر ہلا کر جواب دیا۔

بسنتی کی آنکھوں سے دو آنسو بہ نکلے۔ مہنت پھر بولا۔

"پجار نہ کرو ڈنڈ کے نام سے ر۔ نے لگیں تمہیں سزا دے ایسا پاپی کون ہوگا"

بسنتی نے کوئی جواب نہ دیا اور پجاری کی طرف آنسوؤں سے

...تی ہوئی آنکھوں سے دیکھا جو بدستور کھڑا مسکرا رہا تھا۔ وہ پھر بولا
مگر بسنتی تمہیں آج اور یہاں ضرور سزا بھگتنی پڑیگی کیونکہ جب تم
ایک دیوتا ہوتے ہوئے دیوتاؤں کی پوجا کرتی ہو تو میں بھی ایک
...ری ہوتے ہوئے تمہیں سزا دے سکتا ہوں۔

یہاں اس نے ایک ہلکا سا شیطانی قہقہہ لگایا۔
بسنتی نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور گھٹی ہوئی آواز میں کہا
"مہاراج یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں"؟
پجاری نے اپنی آنکھوں کو حد سے زیادہ کھولتے ہوئے
...ب دیا۔
"تم سورگ کی اپسرا ہو اور میری نظروں میں دیوتا سمان ہی
...سزا ...... وہ ...... وہ بالکل معمولی ہوگی"۔
یہ کہہ کر اس نے اسے آغوش میں لینے کیلئے باہیں پھیلا دیں۔
حیرت و خوف سے بسنتی کا منہ تھوڑا سا کھل گیا اور وہ دو
...م پیچھے ہٹ گئی۔ پجاری آگے بڑھا۔ بسنتی الٹے پاؤں چلنے لگی اور
...اتھ ہی ساتھ مہنت کو غصے اور حیرت سے دیکھتی جاتی تھی۔ جو اسے
...ڑنے کے لئے اسی رفتار سے آگے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔
اب بسنتی کی پیٹھ مندر کی دوسری منزل پر جانے کے لئے
...ہوئی سیڑھیوں کی دیوار سے جا لگی۔ اس نے ایک لمحہ کیلئے مڑ کر سیڑھیوں
...طرف دیکھا اور پھر نہایت تیزی سے زینے پر چڑھنے لگی۔
بسنتی کو بھاگ کر سیڑھیوں پر چڑھتے دیکھ کر مہنت
...نے بھی عجلت سے کام لیا۔ مگر عین اسوقت مندر کا بھاری دروازہ
...تھوڑا سا کھلا اور شامو بپھرے ہوئے بھیڑیے کی طرح جلدی سے
...اندر داخل ہوا اور یہ کہتا ہوا پجاری کی طرف بھاگا کہ:۔
"ٹھہر تو جا بدمعاش میں تجھے ابھی ٹھیک کرتا ہوں"۔
بسنتی دوسری منزل پر پہنچی اور بھاگتی ہوئی کمرے

کی طرف آئی۔ مہنت اس سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ وہ
جونہی گھبراہٹ اور تیزی سے جنگلے پر گری "تڑاخ" کی سی ایک
بلند آواز آئی جنگلہ پرانا تھا۔ جو بسنتی کا یکلخت پڑا ہوا بار سہ نہ
سکا اور ٹوٹ گیا۔ ساتھ ہی بسنتی بھی ایک دلدوز چیخ کے ساتھ
دھڑام سے مندر کے صحن کے سنگین فرش پر جا گری۔ اس کا سر
پھٹ گیا اور خون کی دھار تیزی سے فرش پر بہنے لگی۔
پجاری بسنتی کے گرتے ہی اس کی جگہ آ کر ٹھہرا
اسوقت وہ ایک عجیب کش مکش میں پڑ گیا۔ دوسرے ہی لمحے شامو
بھی بھاگ کر سیڑھیاں عبور کر کے اس کے قریب آیا۔ اور ابھی
مہنت اسے اپنے قریب آتا دیکھ کر سنبھلنے بھی نہ پایا تھا
کہ شامو نے زور سے اُسے نیچے دھکا دے دیا۔
"ہائے بھگوان" کی بلند چیخ کے ساتھ ہی وہ
بھی قلابازیاں کھاتا ہوا نیچے گرا اور بسنتی کے قریب ہی خاک
و خون میں رنگین ہو گیا۔ لیکن ابھی وہ ٹھنڈا بھی نہ ہونے پایا
تھا کہ باہر سے بہت سے لوگوں کے بھاگتے ہوئے مندر
کی طرف آنے کی آواز آئی اور شامو بھی اسی جگہ سے چھلانگ
لگا دی۔

مندر کا دروازہ چوپٹ کھل گیا۔ اور دیہاتی مردوں،
عورتوں اور بچوں کا ایک چھوٹا سا ہجوم اندر داخل ہوا۔ مگر
یک لخت سب اندرونی خوفناک نظارے کی دید سے
مہادیو کے بت کی طرح ساکت و صامت ہو گئے۔
بسنتی اور پجاری خون میں لتھڑے ہوئے مردہ
پڑے تھے اور شامو دم توڑ رہا تھا۔

(الطبعوا)

سرگوشی!

از جناب انسہ نسیمہ سوز

"انشائے لطیف" سے ایک رومان نیز افسانہ کو ختم کرکے بنچ پر رکھ دیا۔ جاں بخش جمال آفرینیوں سے ساری فضا معمور ہو رہی تھی ——!

میں دور افق کی طرف دیکھنے لگی جہاں شفق آلود ابر کے ٹکڑے ادھر ادھر بکھر رہے تھے ——"

حنائی گھنی جھاڑیوں کے اس طرف۔ کوئی آہستہ آہستہ گنگنا رہا تھا، "کاش اسے تم ہو آجاتے"۔

ریحانہ —— یہ آواز جھاڑی کی طرف سے آئی ——"

تم آگئے —— ؟ مدھم کو جدا آواز میں جواب دیا گیا ——"

اب میں بنچ پر کھسک کر بیٹھ گئی اور ان لوگوں کی گفتگو دلچسپی سے سننے لگی!

"ارے! تم تو آج بہت اداس نظر آ رہی ہو؟"

"میں؟ اداس ہوں؟"

"ہاں تم آج بیحد غمگین ہو ——"

"میں پریشان کیوں ہونے لگی وہمی ہو تم"!

"اپنے دلی جذبات کو چھپانے کی کوشش نہ کرو ——"!

"میری قلبی باتیں کبھی تم سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی ہیں"!

لیکن —— یہ نم آنکھیں —— ؟ یہ مرتعش لب" اور یہ پریشان زلفیں"؟!

کچھ نہیں —— کچھ نہیں نجمی!

"مجھے تمہاری غمگین آنکھیں ایسی معلوم ہو رہی ہیں جیسے نرگس و شہلا کے کملائے ہوئے پھول" اور —— تمہاری آنکھوں میں آنسو اس طرح تیر رہے ہیں جیسے برگ گل پر قطرات شبنم"

گلاب کے پھولوں کے گرد سیاہ بھونرا اپنا راگ الاپ رہا تھا —— موسم بہار کی حسین تتریاں گل عباس کے پھولوں کے قریب رقص میں محو تھیں —— اور "سیشم بلند شاخ پر فاختہ کا جوڑا بیٹھا آسمان کی طرف تک رہا تھا ——"

نجمی تم بھی تو آج کھوئے کھوئے سے ہو؟؟

—— میں بالکل کھو گیا —— ریحانہ؟

کیوں کیا ہوا —— نجمی:

ریحانہ ——"؟

کیا بات ہے؟ تم اتنے افسردہ کیوں ہو؟

کل میری روانگی کا دن ہے ——

روانگی —— ؟؟

ہاں —— شاید"۔

ابھی تو چھٹیاں باقی ہیں!

لیکن مجھے تاکید سے بلایا جا رہا ہے"

کیوں —— کس لئے؟!

وجہ"؟ کیا بتاؤں —— وجہ؟

اف تمہاری تمام باتیں مکمل راز ہیں ——"

"میں مجبور ہوں"

"مجبوری" ——— ؟

ہاں انسانی زندگی محض مجبوری و ناچاری ہے"!

نجمی ——— ؟!

"اپنی آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں سے میری طرف نہ دیکھو"

"مجھے رونے دو نجمی ——— سسکی میں ملی جلی آواز آئی ——— "!

ایک فاختہ پھڑ پھڑاتا ہوا اڑ گیا ——— سیاہ بھونرا

ایک بڑے سے پھول پر پر پھیلا کر خاموش بیٹھ گیا ——— "

ناہید! امیں ایکدم چونک گئی باغ کے پھاٹک پر

سے عزت پکار رہے تھے ۔۔۔!

میں نے اشارہ سے انہیں خاموش رہنے کو کہا ——— "

کیا کر رہی ہو ناہید؟ وہ قریب آتے ہوئے بولے"

چپ ——— میں نے لب پر انگلی رکھ کر آہستہ سے کہا!

"آخر کیوں" وہ بنچ پر بیٹھتے ہوئے بولے!

بتاؤ دنگی میں ایکدم سانس میں بولی!

کیا ——— کیا وہ سرگوشی میں پوچھنے لگے!

"چپ" میں نے پھر آہستہ سے کہا! اور ان لوگوں کی گفتگو سننے لگی:

ریحانہ ——— "!

کہے جاؤ ——— نجمی! یہ آواز اس طرح تھرا رہی تھی جیسے

مضراب لگیں تار ——— "

مجھ سے میری زبان کی قوت گویائی سلب کر لو ——— میرے

نغمات کو مجھ سے چھین لو ——— میرا رباب توڑ ڈالو ———

ریحانہ ۔۔۔ ریحانہ!

تمہیں کیا ہوا ہے نجمی بتاؤ کیا ہوا ہے؟؟

کاش میں سماجی بندھنوں کو توڑ سکتا۔ کاش میں قانون اور دنیا

کی لاج کی پرواہ نہ کر سکتا۔ کاش میں ہر ناممکن کو ممکن کر سکتا ۔۔۔

یہ تم کیا کہہ رہے ہو نجمی ۔۔۔۔؟ تم سب کچھ کر سکتے ہو ۔ بہت کچھ!

گھبراہٹ ملی ہوئی تیز آواز سنائی دی۔

عزت حنا کی جھاڑیوں پر نظر جمائے ان لوگوں کی باتیں سمجھنے کی

کوشش کر رہے تھے ۔۔۔۔۔

ریحانہ ——— مجھے اس لئے بلایا جا رہا ہے کہ میری شادی

یاسمین سے قرار پا چکی ہے ۔۔۔۔

——— ایں ——— یاسمین؟ وہی یاسمینہ؟؟

زندگی ایک طویل آہ ہے ریحانہ ۔۔۔۔۔

اور مجبوری افسانہ زندگی کا عنوان ——— ان دونوں

کی گفتگو میں ایکدم مدھم پڑ گئی تھیں۔

عزت خاموشی سے انشائے لطیف کے اوراق کو الٹ رہے تھے"!

ہوا میں اب ایک رومان پیدا کرنے والی سرسراہٹ پیدا

ہو چلی تھی! یاسمین کی نازک نازک کلیاں کھل کر پھول بن گئی

تھیں ——— "!

تم ٹھیک کہتی ہو ——— میں سب کچھ کر سکتا ہوں ——

بہت کچھ !!!

کیا کہا ——— نجمی؟؟

اب تم اپنی آنکھوں کو خشک کر لو ——— "

اور تم اپنے آنسوؤں کو پونچھ ڈالو"

لیکن ——— مجھے رونے دو ——— نجمی ———

——— نہیں ——— اب تم نہ آنسو بہاؤ ——— ریحانہ!!

آخر کیوں ——— ؟؟

میں کل نہیں جاؤں گا ———

آخر کیوں ؟؟

(بقیہ مضمون بر صفحہ ۲۴۳)

گھنٹا نہیں بجے گا

از جناب صلاح الدین صاحب متعلم جامعہ

یہ واقعہ انگلستان کا ہے، کرامول کے زمانہ میں کسی نوجوان سپاہی کو کسی جرم کی بنا پر پھانسی کی سزا دی گئی تھی، جس کو وہاں کے ایک شاعر نے لکھا تھا، اس کے ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔ میں نے اسی واقعے کو ڈرامہ کی شکل میں تبدیل کر دیا ہے۔

صلاح الدین

افرادِ ڈرامہ

۱ کرامول ——————— صدر جمہوریہ

۲ جان ——————— مجرم سپاہی

۳ میری ——————— جان کی محبوبہ

۴ بڈھا گھڑیالی

۵ فوجی سپاہی اور عوام

پہلا منظر

(کرامول کا دربار۔ پرانے انگریزی درباروں کی طرح سجا ہوا ہے۔ بیچ میں ایک اونچی جگہ پر ایک سنہری کرسی لگی ہوئی ہے، معزز امراء اور درباری اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے ہیں۔ مسلح سپاہی باقاعدہ عمدہ وردیوں میں ملبوس کھڑے ہیں۔ سنہری کرسی کے سامنے کٹھہرے میں مجرم جان حسرت و یاس کی تصویر بنا کھڑا ہے۔ سارے درباری اس کی طرف گھور رہے ہیں اور رنجیدہ نظر آتے ہیں کیونکہ آج جان کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ زندگی یا موت۔ اتنے میں کرامول آتا ہے۔ سب لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ فوجی سپاہی ایک ساتھ سلام کرتے ہیں۔ کرامول بیٹھتے ہوئے سبھوں کو بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہے۔ اب سب لوگوں کے کان کرامول کی طرف لگ جاتے ہیں کہ دیکھئے کیا فیصلہ سناتا ہے۔ اتنے میں کرامول جان سے مخاطب ہوتا ہے اور کہتا ہے) کرامول "چونکہ تمہارا جرم ثابت ہو گیا ہے اس لئے تمہیں سزائے موت دی جاتی ہے"

(جان بیچ میں بات کاٹ کر روتے ہوئے)

جان "رحم کیجئے"

کرامول (اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے) "اور جب رات کو گرجا گھر کا گھنٹا بجے گا اسی وقت تمہیں پھانسی دی جائے گی"

جان (دوبارہ روتے ہوئے) "اے ہمارے مالک! ہماری خطا کو معاف فرمائیے"

کرامول (پیشانی پہ بل ڈالتے ہوئے) "نہیں تم اسی سزا کے قابل ہو، تم جیسے لوگوں کا زندہ رکھنا سلطنت کی بنیادوں کو کمزور

بنانا ہے، تمہاری زندگی ملک کے قانون کے نام پر ایک دھبہ ہے"۔

جان "رحم فرمائیے، آئندہ ایسا جرم نہیں ہوگا"۔

کرامول (انکار کرتے ہوئے) "تمہیں یہ ہمارا آخری فیصلہ ہے تمہیں سزا دی جائے گی اور ضرور دی جائے گی تاکہ تمہاری موت لوگوں کے لئے عبرت بنے"۔

(اس کے بعد دربار برخاست کر دیتا ہے اور سپاہی جان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر لے جاتے ہیں)

دوسرا منظر

(بڈھے گھڑیالی کے گھر کا ایک کمرہ، نہایت معمولی ٹوٹی پھوٹی کرسیاں پڑی ہیں، گھڑیالی ایک طرف بیٹھا پائپ کے لمبے لمبے کش لے رہا ہے۔ اتنے میں میری جان کی محبوبہ آکر اس کے پیروں پر گر جاتی ہے۔ بڈھا گھبرا سا جاتا ہے مگر اپنے کو سنبھال کر فوراً میری کو اٹھاتا ہے اور پوچھتا ہے)

بڈھا "بیٹی! تم کون ہو اور کیا بات ہے جو اتنی گھبرائی ہوئی ہو"

میری (افسردگی کے ساتھ) "اے محترم گھڑیالی آپ سے مجھے ایک کام ہے۔ آپ کے لئے بہت چھوٹا اور میرے لئے بہت بڑا۔ میری زندگی اور موت کا سوال ہے"

بڈھا "بیٹی صاف صاف کہو میں تمہاری باتوں کا مطلب بالکل نہیں سمجھا"

میری "نہیں پہلے آپ وعدہ کیجئے"۔

بڈھا "نا بیٹا وعدہ کیسے کر لوں پہلے بتاؤ، اگر کر سکا ہوگا کبھی دریغ نہ کرونگا"

میری "بہت آسان کام ہے۔ آپ بہت آسانی سے کر سکتے ہیں"۔

بڈھا "بتاؤ بھی تو"

میری "اے محترم گھڑیالی مہربانی فرما کر آج رات کو گھنٹا نہ بجائیے"۔

بڈھا (تعجب کی حالت میں) "کیوں؟"

میری "اے محترم گھڑیالی آج شاہ کرامول نے میرے منگیتر کو پھانسی کی سزا دی ہے اور جب رات کو گھنٹا گھر کا گھنٹا بجے گا، اس وقت میرا محبوب فرشتۂ موت کے پنجہ میں دیدیا جائیگا۔ اور اس کے بعد میرا جینا بھی بیکار ہوگا میں نے کرامول سے بھی گذارش کی اور وکیلوں کے پاس بھی جا کر رو رو کر کہا کہ کسی طرح وہ میرے محبوب کو بچالیں۔ لیکن کسی نے بھی میری نہ سنی۔ اب میں آخر میں آپکے پاس یہ امید لیکر آئی ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو اسکی جان بچا سکتے ہیں"

بڈھا "مگر بیٹی مجھ سے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بڑھاپے میں آکر نمک حرامی کا گناہ اپنے سر لوں"۔

میری (رو کر) "رحم کیجئے"۔

بڈھا "بیٹا میں کیا کر سکتا ہوں۔ میرے اختیار میں کیا ہے کہ جان بچا سکوں"۔

میری "آپ کے ہاتھوں میں سب کچھ ہے"۔

بڈھا "لیکن میں گھنٹا بجانے پر مجبور ہوں۔ میں یہ گناہ اپنے سر لیکر کبھی نہ مرونگا"

میری "مگر کسی کی جان بچانا تو بہت بڑا ثواب ہے۔ اگر بچا لیجئے گا تو وہ گناہ دھل جائیگا"

بڈھا (استقلال کے ساتھ) "نا بیٹا مجھ سے یہ ہرگز نہ ہو سکیگا۔ میں گھنٹا بجاؤں گا۔ اور ضرور بجاؤنگا"۔

(میری نا امید ہو جاتی ہے۔ اور کچھ سوچنے لگتی ہے کہ اتنے میں اس کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر سی آتی ہے اور وہ اٹھ کر تیزی سے چلی جاتی ہے۔)

تیسرا منظر

(ایک میدان میں عوام پھانسی کا تماشہ دیکھنے کے لئے جمع ہیں۔ کرامول بھی موجود ہے۔ ایک طرف جلاد اور سہما ہوا جان کھڑا ہے۔ اتنے میں ۹ بجا اور سبھوں کے کان گھنٹے کی طرف لگ گئے۔ مگر گھنٹا ہے کہ بجنے کا نام تک نہیں لیتا۔ اب سب لوگوں کو تعجب ہے کہ یا اللہ گھنٹا کیوں نہیں بجتا۔ جب کافی دیر ہو گئی تو کرامول نے ایک سپاہی کو بلایا اور کہا)

کرامول "جا کر گھڑیالی کو بلا لاؤ"۔

(سپاہی سلام کر کے چلا جاتا ہے، ابھی گھڑیالی آیا بھی نہیں تھا

کہ ایک لڑکی دوڑتی ہوئی آتی ہے۔ اور کراموں کے قدموں پر گر جاتی ہے۔ لڑکی کے ہاتھ زخمی ہیں اور وہ خون سے لت پت ہیں۔ کراموں متعجب ہوتا ہے، پھر اٹھا کر پوچھتا ہے۔)

کراموں "اے لڑکی یہ تیرا کیا حال ہو رہا ہے"

لڑکی (ہاتھ جوڑ کر) اگر جان بخشی ہو تو کچھ عرض کروں"

کراموں "بتا! تیری جان بخشی"

لڑکی "اے محترم صدر! آج گھنٹا نہ بجنے کی سبب میں ہی ہوں۔ کیونکہ میں نے یہ سوچ کر گھنٹے کا ٹلن پکڑ لیا تھا۔ کہ یہ بج کر کسی کی جان کیا لے گا (ہاتھ دکھا کر) اسی وجہ سے ہاتھ زخمی ہو گئے۔ اب آپ مہربانی فرما کر مجھے معاف فرمائے اور مجرم کو بھی جس سے کل میرے ساتھ شادی ہونے والی ہے"

(کراموں کو رحم آجاتا ہے، اور وہ کہتا ہے)

کراموں "جا تجھے بھی معاف کیا اور تیرے منگیتر کو بھی۔ خوش ہو جا کہ آج گھنٹا نہیں بجے گا اور تیرے منگیتر کی جان بچ جائیگی۔"

(سپاہی ان الفاظ کو سنتے ہی جان کے ہاتھ سے ہتھکڑیاں نکال دیتے ہیں۔ میری دوڑ کر جاتی ہے اور جان سے لپٹ جاتی ہے۔ تماشائی خوش خوش چلے جاتے ہیں کراموں اور سپاہی بھی چلے جاتے ہیں۔ دونوں محبوب ایک دوسرے کو خوش ہو کر دیکھتے ہیں۔)

پردہ

بقیہ مضمون صفحہ ۲۴۰ کا

ریحانہ ——"

بتاؤ —— بتاؤ —— ناجی؟ تعجب اور مسرت سے ملی ہوئی صدا باغ کی خاموشی میں تحلیل ہو گئی!

—— تم —— تم ہی میرے خوابوں کی حسین تعبیر ہو —— "ایکدم رازدارانہ لہجہ میں کہا گیا۔

مجھے —— تم سے شدید محبت ہے ریحانہ۔ اتنی ہلکی آواز آئی جیسے موجیں آپس میں ٹکرا گئیں۔

—— اور مجھے بھی تم سے دلی انس ہے ناجی" اسقدر مدھم آواز تھی جو بمشکل میں سن سکی!

دو شیشم پر فاختہ کا جوڑا آپس میں سرگوشی کر رہا تھا —— سیاہ بھونرا گلاب کے نوشگفتہ پھولوں کے قریب سرگوشی کے انداز میں نغمہ محبت الاپ رہا تھا حسین تتریاں اب تک رقص کر رہی تھیں —— دور تالاب کی طرف سے بانسری کی مدھم لیکن دلکش صدا آ رہی تھی

آفتاب غروب ہو چکا تھا —— اور رات باہم مل کر شاید سرگوشی کر رہے تھے ——"

—— ناہید —— ناہیدی.

عزت نے بالکل سرگوشی میں مجھے پکارا ——"

کامریڈ ہرکیشن

از جناب سید علی لطف امام آبگلوی ،

جیسے ہی ہرکیشن نے کروٹ لی۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں، اور فوراً اٹھ بیٹھا۔ آنکھیں ملتے ہوئے اس نے ٹیبل کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بوتل میں سے ایک گلاس ڈھال کر چڑھا گیا، اور پھر پلنگ پر دراز ہوگیا

صبح کے وقت آفتاب اپنے معمول کی طرح آج بھی نکلا۔ سوشیلا پلنگ پر سے اٹھ کھڑی ہوئی، اور اس کا ننھا سا بچہ بھی جو ماں کی چھاتی سے لگا ہوا تھا جاگ گیا۔ اور نہ معلوم کس کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ سوشیلا نے بچے کو پلنگ پر تھپکیاں دیکر سلا دیا اور خود گھر کے کام کاج میں لگ گئی۔ مکان میں جھاڑو دیکر چولہے کی راکھ صاف کی پھر گھر کے جو تھوڑے سے برتن تھے ان کو مانجا۔ اب آگ سلگانے کی باری آئی۔ مگر وہ پھر سوچنے لگی کہ آگ سلگائے تو پکائیگی کیا چند دنوں کی دوڑ دھوپ کے بعد رات ہرکیشن چند آنے پیسے جو لاسکا تھا۔ ان سے مشکل سے رات کے کھانے کا انتظام ہوسکا تھا۔ اب سوشیلا اس انتظار میں تھی کہ ہرکیشن اُٹھے تو ممکن ہو کہ دن کے کھانے کے لئے کوئی صورت پیدا ہو۔ وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ ہرکیشن بھی جاگ گیا۔ اور سوشیلا کو متفکر دیکھ کر اس نے اطمینان دلایا کہ ایشور نے چاہا تو ایک دو دن کی کوشش کے بعد اُس کو کہیں نہ کہیں نوکری ضرور مل جائیگی اور دونوں مل کر اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگیں گے۔ سوشیلا کو سمجھانے بجھانے کے بعد ہرکیشن نے جمائی لیتے ہوئے ٹیبل پر سے بوتل اٹھائی اور آخری گلاس بھی پی گیا۔ اور آہستہ آہستہ دروازہ کی طرف بڑھا سوشیلا ۔ کو لئے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے دروازہ تک آئی اور اس وقت تک کھڑی ہرکیشن کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتی رہی جب تک کہ ہرکیشن اُس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوگیا۔ اس کے بعد سوشیلا کمرے میں واپس آئی اور ہرکیشن کی چارپائی پر لیٹ کر سوچنے لگی کہ کس طرح کالج کی تعلیم ختم کرنے کے بعد ہرکیشن کی اور اس کی شادی والدین نے اپنی خوشنودی اور سماج کے ڈر کی وجہ سے کردی لیکن شادی کے بعد جب اخراجات روز بروز بڑھتے گئے اور نوکری کی یہ قلت کہ پڑھنے لکھنے کے بعد اگر نوکری ملتی بھی ہے تو اُن ہی خوش نصیبوں کو جن کے یہاں غریبوں کی جیب اور مزدوروں کی کمائی سے جمع کیا ہوا اندوختہ بہت کچھ موجود ہے۔ اور جن کی مدد سے وہ افسروں کی خدمت میں اعلیٰ سے اعلیٰ تحائف پیش کرکے سفارشیں حاصل کرتے ہیں۔ اور اسی اندوختہ میں سے افسران کی حیثیت کے مطابق ان کی خدمت میں رشوت دیتے ہیں جس کی وصولی کے بعد افسران اعلیٰ بحالی منظور کر لیتے ہیں۔

ہرکیشن کے پاس علم تو ضرور تھا کیونکہ وہ ایم۔اے کی ڈگری حاصل کرچکا تھا۔ لیکن سفارشیں اور رشوت کے لئے اس کے پاس کوئی سبیل نہیں تھی۔ تاہم وہ انتھک کوشش کر رہا تھا کہ کہیں نوکری مل جائے۔ لیکن نوکری نہیں ملنا تھی نہیں ملی۔ اور اب جبکہ وہ مہینوں کی دوڑ دھوپ کے بعد بالکل چور چور ہو چکا تھا، اس نے چاہا کہ اس غم کو غلط کرنے کے لئے شراب ہی پینا شروع کردے نوکری نہ ملے نہ ملے، دل کو اطمینان نصیب ہو جائے تو پھر وہ مزدوری ہی کرکے اپنا اور اپنی بیوی اور بچہ کے لئے کھانے کا سامان پیدا کر سکے۔ یہی وجہ تھی کہ ہرکیشن نے شراب پینا شروع کردی اور اس کو اس

علاج سے فائدہ بھی ہوا۔ دن رات کی سوچ فکر اور پریشانی دُور ہو گئی۔

ہرتیش خود دار طبیعت کا انسان واقع ہوا تھا۔ اس کو یہ گوارہ نہیں تھا کہ والدین یا سسرال کے مکان میں جا کر ڈیرہ ڈال دے۔ اگر وہ اس کی ذرا بھی خواہش کرتا تو رشتہ دار ہمیشہ خوش آمدید کہنے کے لئے تیار تھے۔ لیکن اس کی غیور طبیعت نے اس بات کو گوارا نہیں کیا اور ہرتیش اپنی بیوی اور بچہ سمیت آجکل نئے شہر میں مسافرانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ ان ہی خیالات کی چکر میں سوشیلا کو نیند آ گئی اور اس کا بچہ بھی ماں کی چھاتی سے چمٹ گیا۔

مکان سے نکل کر ہرتیش سر جھکائے ہوئے ایک طرف کو چل دیا اور مستقل چلتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ بالکل تھک گیا اور اس کو پیاس معلوم ہوئی اور گلا خشک ہونے لگا۔ اس نے زبان سے اپنے ہونٹھوں کو تر کیا اور ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گیا۔ اور پھر ہاتھ کا تکیہ لگا کر زمین پر لیٹ رہا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور ابر کے ٹکڑے اِدھر اُدھر آسمان پر دوڑ رہے تھے۔ گویا معلوم ہوتا تھا کہ ایک تھکے ہوئے مسافر کو آفتاب کی تمازت سے بچانے کے لئے یہ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ سماں ہرتیش کی نظروں میں خوب بھایا اور وہ تخیلات کے بحر میں ڈوب گیا۔ یکایک آنتوں نے پیٹ کے اندر غذا کی تلاش شروع کر دی، اور ہرتیش فوراً تخیلات کی بھنور سے نکل آیا اور کھڑا ہو گیا۔

اب شام ہونے کو تھی۔ آفتاب اپنی منزل کے قریب پہنچ چکا تھا اور عنقریب وہ دنیا کو گذشتہ رات کی طرح تاریک سے تاریک تر بنانے کے تہیّہ میں تھا کہ یکایک بجلی کوندی، اور دو تین سو کا غول انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگاتا ہوا ایک طرف دکھائی دیا۔ ہرتیش نے جمائی لی اور اُسی طرف چل دیا جس طرف یہ غول جا رہا تھا۔ اب آفتاب غروب ہو گیا اور ساری دنیا اندھیرے میں ہو گئی۔ ہرتیش آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ کبھی کبھی بجلی کے کوندنے کی وجہ سے آگے جاتا ہوا غول نظر آ جاتا تھا۔ انقلاب زندہ باد کا نعرہ تو ہر پانچ منٹ کے بعد سُنائی دیتا تھا۔ آخر کار یہ غول چلتے چلتے ایک بڑے میدان میں پہنچکر چاروں طرف منتشر ہو گیا۔ ہرتیش بھی ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔ لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ یہاں کیوں آیا　وہ اسی سوچ میں غرق تھا کہ اس کے کاندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا اور اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا کہ ہرتیش نے مسٹر رحمٰن کہہ کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا۔ مسٹر رحمٰن جو کہ اب کامریڈ رحمٰن تھا ہرتیش کا پکڑے ہوئے ڈائس کی طرف چلے۔ آج کا جلسہ کامریڈ رحمٰن ہی کے زیر صدارت منعقد ہوا تھا۔

ہرتیش اور مسٹر رحمٰن کالج کے ساتھی تھے۔ دونوں ایک ہی کمرہ میں رہتے تھے۔ اور آپس میں بہت بے تکلف اور گہرے دوست تھے۔ دونوں کا سبجکٹ تاریخ تھا، اور ایک دوسرے سے خوب خوب بحث ہوتی تھی۔ کالج کے مایۂ ناز طالب العلموں میں ان دونوں کا شمار ہوتا تھا۔ تقریر میں ان دونوں کے مقابلہ میں آج تک کسی کی بھی تقریر بہتر نہیں قرار پائی۔ پروفیسروں کا خیال تھا کہ کالج سے نکلنے کے بعد ہرتیش اور رحمٰن اپنے وقت کے مایۂ ناز مقرر اور مفکر ہونگے ایم۔ اے کے آخری سال میں ہرتیش اور مسٹر رحمٰن یونیورسٹی میں اوّل آئے تھے۔ اور تقریر میں ہرتیش اوّل آیا تھا۔ اس لئے جب یہ دونوں کالج سے اپنے اپنے مکان کو لوٹ رہے تھے تو اساتذہ کی طرف سے ایک پر تکلف دعوت دی گئی تھی جس میں یونیورسٹی کے تمام عہدہ داروں

علاوہ شہر کے معزز عمائد بھی مدعو کئے گئے تھے۔ اس وقت ہرکیش اپنی ایک دوست سے علیحدہ ہوئے جس کو آج پانچ برس کا زمانہ گذرا۔ کامریڈ رحمٰن چونکہ کھاتے پیتے گھرانے کا چشم چراغ تھا، قوم کی بہبود کا خیال اس کے دل میں لڑکپن سے تھا۔ اس لئے اس نے اس طرف یکدم خیال نہیں کیا۔ ہندوستان کی سیاسی جماعت کا اہم رکن بن گیا۔ کامریڈ رحمٰن نے اس پانچ برس میں جو کیا اس سے آج ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے۔ اس کی جوشیلی تقریر سننے کے بعد کس کا کلیجہ تھا کہ اس کی بات پر جان تک دے دینے میں ذرا بھی دریغ کرے۔ بارہا وہ جیل جاچکا لیکن جب بھی رہا ہوتا تو اور زیادہ جوش و خروش کے ساتھ کام میں انہماک دکھاتا۔ آج بھی یہ جلسہ اس کی رہائی کی خوشی میں منعقد ہوا ہے، ایک ہفتہ ہوتا ہے کہ ایک سال کی سزا بھگتنے کے بعد جیل سے خلاصی ہوئی ہے۔

ڈائس پر پہنچ کر کامریڈ رحمٰن نے ہرکیش کو اپنے پہلو میں کرسی دی، اور رسمی طور پر ہرکیش کا تعارف بھی مجمع سے کرایا۔ کامریڈ رحمٰن نے کہا کہ ہرکیش خاص کر اس جلسہ کی شرکت کیلئے آیا ہے، اور دل ہی دل میں خوشی ہوئی کہ اب ہرکیش بھی قومی خدمات سے دلچسپی لینے لگا۔ چند منٹ کے بعد جلسہ کی کاروائی یوں شروع ہوئی کہ کامریڈ نے باصرار ہرکیش کو تقریر کرنے پر مجبور کیا تو ہرکیش انقلاب زندہ باد کے پرشور نعرہ کی گونج میں تقریر کے لئے کھڑا ہوا، اور مسلسل ایک گھنٹہ تک ایسی جوشیلی تقریر کی کہ سارا مجمع جوش سے بھر گیا۔ اور سبھوں کو یہ یقین ہو گیا کہ جو کچھ یہ مطالبہ کر رہے ہیں وہ کم سے کم ہے، اور ان کا حق ہے۔ اس کے حاصل کرنے کیلئے جتنی بھی قربانی کی جائے کم ہے۔ مجمع کے جوش کا اندازہ کرتے ہوئے کامریڈ رحمٰن نے ہرکیش کو اٹھایا اور خود کھڑا ہوا۔ یکایک چاروں طرف سے تالیاں بجنے لگیں۔

کامریڈ رحمٰن نے تالیاں بند کرائیں، اور لوگوں کا شکریہ ادا کیا، اور مجمع کو یہ خوشخبری سنائی کہ اب اس کی عدم موجودگی میں ہرکیش ان لوگوں کی رہنمائی کے لئے بہت ہی لائق آدمی ہے جو اتفاقیہ طور سے مل گیا ہے۔ اس کے بعد جلسہ ختم ہو گیا اور سب لوگ اپنے مکان کی طرف چل دئے۔

کامریڈ رحمٰن کے کہنے پر منتظمین جلسہ نے زادراہ کے لئے پچیس روپے ہرکیش کو پیش کئے۔ لیکن ہرکیش نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا کہ اگر قومی خدمت بھی عوض پر کیجائے تو پھر قوم کی خدمت کا خدا نگہبان۔ لیکن کامریڈ رحمٰن نے یہ کہہ کر یہ عوض نہیں ہے، ہرکیش کی جیب میں پچیس روپے ڈال دئے۔ اس کے بعد سب لوگ ایک دوسرے سے مل کر رخصت ہوئے۔ ہرکیش بھی اپنے مکان کی طرف چلا یا۔

جب ہرکیش بازار میں پہنچا تو چاہا کہ گھر کے لئے کچھ سامان لیتا جائے لیکن رات بہت آچکی تھی، دکانیں بند تھیں، بہت تلاش و جستجو کے بعد بھی کوئی چیز اسے نہیں مل سکی کہ معصوم بچہ ہی کیلئے لے لے۔ آخر کار وہ بھوکا پیاسا گھر پہنچا۔ سوشیلا اس کے انتظار میں آنکھیں پھاڑے بیٹھی تھی۔ جیسے ہی دروازہ کی کنڈی بجی، وہ دوڑی اور جاکر دروازہ کھولا۔ ہرکیش نے داخل ہوتے ہی روپے سوشیلا کے ہاتھ میں دیدئے۔ سوشیلا سے خوشی کے آنسو ضبط نہ ہو سکے اور ڈھلک کر اس کے رخساروں پر آگئے۔ ہرکیش نے اپنے دامن سے ان کو پونچھا، گرچہ خود بھی اس کی آنکھوں میں سیلاب آیا لیکن کنارے تک پہنچ کر خشک ہو گیا۔

اب ہرکیش کی زندگی کا رخ بدل گیا ہے۔ وہ ملک کی قومی تحریکات کا سرگرم ممبر ہے۔ پچھلے جلسہ کی جوشیلی تقریر کا خمیازہ بھی اسے جلد بھگتنا پڑا۔ لیکن ایک سال کی سزا نے اس کے قومی خدمات کے حوصلہ کو ۴ اور بڑھا دیا ہے۔ ہرکیش کی زندگی میں [illegible] آج ہرکیش [illegible] ہے۔

آثارِ علمیہ ادبیہ :-

محترمہ سعادت کچلو کے چند خطوط

بنام جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب ایم اے پی ایچ ڈی

حادثہ جلیانوالہ باغ کی ایک یاد!

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را   گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

جلیانوالہ باغ کے ہیرو ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال تھے، ان کے مقدمات کی طرف اس زمانہ میں سارا ہندوستان متوجہ تھا۔ ڈاکٹر سیف الدین اور جناب ڈاکٹر سید محمود یورپ میں رفیق درس تھے۔ ڈاکٹر کچلو کے مقدمات کے سلسلہ میں انکی بیگم محترمہ سعادت کچلو کے چند خطوط جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب کے نام آئے تھے، وہ ذیل میں پیش ہیں۔ امید ہے کہ ان کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

امرتسر - کٹڑہ جیل سنگھ

معرفت میاں حفیظ اللہ صاحب وکیل و میونسپل کمشنر

۱۲ مئی سنہ ۱۹ء

برادر مکرم

آداب - آپ کا ہمدردی سے بھرا ہوا خط مجھے پرسوں گھر سے ہوتا ہوا یہاں ملا - جس سے میں آپ کی بڑی شکرگذار ہوئی - ڈاکٹر صاحب آپ کا ذکر مجھ سے اکثر کیا کرتے تھے - اس لیے میں اس رشتہ محبت سے پورے طور پر آگاہ ہوں - جو آپ میں اور ان میں قائم تھا اور ہے +

ڈاکٹر صاحب کو ۱۰ اپریل گزشتہ کو گورنمنٹ پنجاب کے حکم سے دھرم سالہ لے گئے تھے - جہاں وہ ۲۸ مئی تک بند رہے - وہاں ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ تھی - اب ۲۸ مئی سے واپس لائے گئے ہیں - اور اس دن سے لاہور سنٹرل جیل میں ہیں + ان پر مقدمہ چلائے جانے کی خبر ہے - لیکن ابھی تک تاریخ کا کوئی پتہ نہیں +

ہی ایک مہینے کے قریب اپنے گھر ہیں۔ لیکن اب اپنے والدہ کے گھر ہوں۔ اور آئندہ آپ خط لکھیں۔ تو انہیں کی معرفت لکھیں +

جس تکلیف اور تشویش سے دن گذر رہے ہیں۔ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ دعا کیجئے کہ توفیق میرے ساتھ اس مصیبت کو کاٹ سکیں۔ اور دونوں کام بخیر ہو۔ آمین ثم آمین

آپ کے بھائی کے انتقال کی خبر سے بڑا رنج ہوا۔ خدا ان کو غریق رحمت کرے۔ اور آپ لوگوں کو صبر بخشے۔ آمین +

آپ کی علالت کی خبر سے بھی پریشانی ہے۔ اپنی خیریت سے مطلع کریں۔ تاکہ تسلی ہو +

آپ کی ہمدردی اور تسکین بخشی کی خاص طور پر شکرگزار ہوں۔ اور آپ کے خط سے میرے دل کو بڑی تقویت ہوئی ہے۔ زیادہ والسلام

آپ کی بہن سعادت (رکھلو)

امرتسر ۴ جون

برادر مکرم

آداب۔ امید کہ میرا پہلا خط آپ کو مل گیا ہوگا۔ مقدمہ کی تاریخ ۹ ماہ حال مقرر ہوئی ہے۔ یعنی آئندہ پیر کے دن مقدمہ شروع ہو جائے گا۔ اطلاعاً تحریر ہے۔ دعا کیجئے کہ انجام بخیر ہو۔ آمین

امرتسر ۲۸ مئی

برادر مکرم

آپ کا ہمدردی سے بھرا ہوا خط مجھے کئی دن ہوئے ملا تھا۔ اس کا جواب جلدی نہ دے سکی۔ کیونکہ انہیں پریشانی کے ایام میں خدا تعالیٰ نے ایک لڑکا عطا کیا ہے۔ جو غریب آج نو روز کا ہے۔ آپ کا خط ملا تو میں جواب لکھنے کے بالکل قابل نہ تھی۔ اس لئے امید کہ معذور سمجھی جاؤں گی +

ڈاکٹر صاحب کے مقدمہ کی تاریخ ابھی معلوم نہیں ہوئی۔ لیکن غالباً آج یا کل تک ہو جائیگی۔ آپ اگر مقدمہ کی پیروی کے لئے آنا چاہیں۔ تو ایڈمنسٹریٹر مارشل لا ایریا لاہور سے اجازت طلب کریں۔ کسی اور بات کے دریافت کرنے کی ضرورت ہو۔ تو چیف سکریٹری گورنمنٹ پنجاب لاہور سے دریافت کرنا چاہیئے۔ جس وقت تاریخ معلوم ہوگی میں آپ کو فوراً اطلاع دونگی۔ آپ کی ہمدردی کی نہایت درجہ شکرگذار ہوں۔ دعا کیجئے کہ خدا تعالیٰ ان معصوم بچوں پر جن میں سے ایک پونے تین سال کی ہے اور دوسرا نو دن کا معصوم بچہ ہے رحم کرے۔ زیادہ نیاز

آپ کی مخلص بہن سعادت

آج بہت دنوں کے بعد آپ کو خط لکھ رہی ہوں ۔ دوران مقدمہ میں آپ کے کئی خطوط ملتے رہے ۔ جن کا کافی جواب میں نہ لکھ سکی ۔ اس وقت مجھے سارا زمانہ تیرہ و تار نظر آتا تھا ۔ اور معلوم نہیں ہوتا تھا ۔ کہ کیا ہوگا ۔ آخر کار عدالت نے اپنا فیصلہ سنا دیا ۔ اور حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا اُن کی خاطر جان نثار عدل پرور نے تجویز کی ۔ خداوند کریم کی رحمت کے قربان جائیے ۔ اسی کی بندہ نوازی تھی ۔ کہ میں صبر اور شکر کی تعلیم اس وقت کھا گئی ۔ اور میں نے اس سخت مصیبت کو خوشی کے ساتھ برداشت کر لیا ۔ گو بعد میں جیسا کہ آپ کو معلوم ہو گیا ہے لفٹنٹ گورنر پنجاب کے ترحم خسروانہ کی بدولت وہ سزا دو سال قید سخت سے بدل دی گئی ہے +

آپ کے دو نو خط جن میں ایک میرے بابا جی کے نام تھا ۔ اور دوسرا میرے ۔ مجھے مل گئے تھے ۔ میں اور اُن کے لیے میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں +

کچلو صاحب کا طرز عمل اس عرصہ میں نہایت عمدہ رہا ہے ۔ انہوں نے قابل تعریف حوصلہ سے کام لیا ۔ اور برابر مجھے اور دوسروں کو ہمت بندھاتے رہتے ۔ یہاں تک کہ عدالت کے فیصلے کے وقت بھی انہوں نے کچھ پرواہ نہ کی تھی +

میں اس عرصہ میں ان سے صرف تین بار مل چکی ہوں دو بار حوالات کورٹ میں اور ایک بار سنٹرل جیل میں (جس کو آج کل [illegible] کہتے ہیں) چونکہ ملاقات کی اجازت چھ مہینے میں ایک بار مقرر کی گئی ہے ۔ اس لیے دوسری ملاقات کے لیے مجھے ساڑھے پانچ مہینے کا اور انتظار [illegible]

[illegible] ایک ہی حلقہ رکھتے ہیں ۔ بستر اور بستر وغیرہ گھر سے بھیجتے ہیں ۔ کھانا جیل سے ملتا ہے ۔ گوشت کسی کھانے کی چیز بھیجنے کی اجازت نہیں ۔ لیکن سننے میں آیا ہے کہ کھانا اچھا اور تبدیلیاں حسب حیثیت ہوتا ہے +

ہزار ہزار شکر ہے کہ جس نے ان سخت مصیبت سے نجات بخشی ۔ اسی نے اس مشکل کو سہل کیا ہے ۔ اور اسی سے امید ہے کہ اس کو بھی آسان کرے گا ۔ لیکن بھائی جان جتنی سخت تکلیف اس خیال سے ہوتی ہے ۔ کہ یہ دو سال کس طرح گزریں گے ۔ بیان سے باہر ہے ۔

چھوٹے چھوٹے بچوں کی پرورش کی وجہ سے اور بھی تکلیف ہے ۔ اپنا دل کسی کام کو نہیں چاہتا ۔ لیکن بچوں کی وجہ سے بہت کرنی پڑتی ہے ۔ بچی جیل میں میرے ساتھ ملی گئی ۔ تو باپ کی گود سے نہ اترتی تھی ۔ کہتی تھی رہا جاتی ہوں اور ساتھ گھر کیوں نہیں چلتے ؟

پریوی کونسل میں اپیل کی درخواست کی گئی ہے ۔ ابھی تک منظوری کی خبر نہیں ہوئی نیز ان سوتی میں [illegible] کی معرفت لاہور رہا ہے + دیکھئے ۔ کیا خدا کا [illegible] ہے ۔ ورا [illegible] ڈاکٹر صاحب کو سزا نہایت [illegible] منصفانہ طور پر دی گئی ہے ۔

دکیل ان لاہوریئر [illegible] کا خیال ہے ۔ کہ مقدمہ بالکل بے جان ہے ۔ استغاثہ کی شہادت سوائے سرکاری گواہوں کے جو ملازم تھے اور دو ایک باہر کے گواہ جن کا بیان [illegible] ہمارے حق میں ہے ۔ ضرورت ہے کہ یہ سب واقعات اخبارات کے ذریعے سے روشنی میں لائے جائیں لیکن یہ بات میرے بس کی نہیں ۔ یہ ڈاکٹر صاحب کے ان دوستوں کا کام ہے ۔ جو قانون پیشہ ہیں ۔ اور جن میں آپ بھی شامل ہیں ۔ آپ لوگ ہمت اور مدد کریں گے ۔ تو بہت کچھ ہوگا +

زیادہ کیا لکھوں ۔ اپنی اہلیہ صاحبہ کی خدمت میں میرا سلام کہہ دیجئے ۔ والسلام

ادبیات

تبرکاتِ آزاد

از علامہ فضل حق آزاد عظیم آبادی

محبت کے کرشمے ہیں بھلائی ہے برائی بھی
ادا ہے کچھ ادائی بھی وفا ہے بے وفائی بھی

خدا کی شان دیکھی اور کیا اس کے سوا دیکھا
وہی شانِ خدا ہے ان بتوں کی خودنمائی بھی

بتوں ہی سے خدا کی راہ پائی اس کے بندوں نے
خدا شاہد خلیل اللہ بھی ساری خدائی بھی

وہ دل کیونکر خدا کا گھر ہوا ے زاہد کوئی کہہ دے
جہاں یادِ خدا ہو اور کافر ماجرائی بھی

اسی اک پردۂ دل میں ہے کیا کیا کچھ کوئی دیکھے
خدا بھی خود پرستی بھی خودی بھی خودنمائی بھی

خدا والوں کے ہوتے کیوں نہ ہوں دونوں جہاں وش ت
انھیں کے ہات میں ہے بندگی بھی کبریائی بھی

بہاتِ دو عالم سے کھلا یہ عقدۂ مشکل
جہاں ہے کوئی مشکل ہے وہیں مشکل کشائی بھی

فروغِ عقل نے انسان کی آنکھیں بھی کھولی تھیں
اسی نے پھیر دی پھر سب کی آنکھوں میں سلائی بھی

طلسمِ حیرت افزا ہیں سوانح زندگانی کے
یہی دنیا میں لائی لے گئی بھی پھیر لائی بھی

بری الزام سے نکلی جو دل سے آرزو نکلی
لگائی بھی اسی نے پھر لگی دل کی بجھائی بھی

عدو کے ساتھ میں بھی انکے غصے میں نہ پڑ جاؤں
مرے ہی سر نہ آجائے کہیں دشمن کی آئی بھی

نصیحت چپکے پی لینے کی اے ناصح غنیمت ہے
اگر ہے اس میں گمراہی تو ہے کچھ رہنمائی بھی

زمیں زیر نگیں ہے زیر فرماں ہے فلک یارب
خراجِ ہفت کشور ہے ترے در کی گدائی بھی

مقدر کھینچ لایا آتے آتے ہم بھی آپہونچے
نصیبوں میں نہ تھی لیکن مقدر آزمائی بھی

وہ طوفاں اور وہ موجیں یہ ساحل یہ سبکساری
خدا کی ہے خدائی اے خضر یہ ناخدائی بھی

اگر ہے پارسائی زیورِ حسنِ حوالی ہے ٹر
بڑھاپے میں نماز و وضو ہے پارسائی بھی

نہیں چلنی اگر بے آبِ زر اخلاص کی کشتی
تو بے روغن نہیں جلتا چراغِ آشنائی بھی

ابھی سے ڈر رہی ہے وصل کی شب دھمکیاں ہم کو
ہمارے ساتھ ہے تا داں غمِ روزِ جدائی بھی

سرودِ سازِ وحدت سے چراغاں ہے جہاں سارا
اسی کی گونج سے سرشار ہیں نئے اور نائی بھی

نہیں اک نغمۂ داؤد سے شمعِ حرم روشن
نوا پرداز ہے اک خوش نوا کی ہمنوائی بھی

نہیں آزاد ہی اک خوشہ چینِ خرمنِ حکمت
اسی کے دانہ کش ہیں سب ثنائی و سنائی بھی

حسن ثنائی شاعر حلیم

موج طوفان

از ناخدائے سخن تاج الشعرا فصیح العصر حضرت نوح ناروی

فصل گل ہے شراب خانہ ہے
یہ زمانہ بھی کیا زمانہ ہے

اب نہ ہم ہیں نہ وہ زمانہ ہے
دو ہی جملوں کا یہ فسانہ ہے

آگئے ہو تو اب چلے بھی چلو
دو قدم پر غریب خانہ ہے

وہ زمانہ عجب زمانہ تھا
یہ زمانہ عجب زمانہ ہے

دل کو لوٹے نہ کیوں نگاہ تری
درد و غم کا یہی خزانہ ہے

قیس کا عشق اور میرا عشق
یہ حقیقت ہے وہ فسانہ ہے

نقش الفت بھی داغ حسرت بھی
خانۂ دل نگار خانہ ہے

عشق میں لطف زندگی کیسا
عشق تو موت کا بہانہ ہے

ناصح کہنہ سال چپ بھی رہے
یہ سمجھ لے نیا زمانہ ہے

دل نہیں دل میں وہ نگاہ نہیں
تیر ہے تیر کا نشانہ ہے

اہل مصرف ہی اس کو جانتے ہیں
عشق میں حسن کا خزانہ ہے

آگئی جان زار ہونٹوں تک
اب کوئی دم میں یہ روانہ ہے

دوستوں ہی سے مجھکو انس نہیں
دشمنوں سے بھی دوستانہ ہے

جو نہ کہنا تھا کہہ گئے وہ ہمیں
وقت ہے بخت ہے زمانہ ہے

خرمن دہر میں یہ پھوٹ پڑی
منتشر ایک ایک دانہ ہے

کیا کہوں شیوہ ہائے حسن و عشق
یہ جدا سب سے کارخانہ ہے

تم جدھر پھیر دو ادھر پھر جائے
حکم کا منتظر زمانہ ہے

جس میں سرمایۂ نشاط نہیں
وہ ہمارا غریب خانہ ہے

موج طوفان اشک سے لب زیر
حضرت نوحؔ کا فسانہ ہے

زمزمۂ تازہ

از

بلبل بہار حضرت سریر کابری مینائی گیاوی

حضرت سریر کی یہ غزل ماہ ستمبر میں ٹاٹا نگر جمشید پور میں پڑھی گئی۔ جہاں یوپی، سی پی، بنگال، اور اڑیسہ، مختلف صوبوں کے مشاہیر جمع ہوئے۔ کارکنان مشاعرہ کا بیان ہے کہ حضرت سریر کی یہ غزل حاصل مشاعرہ تھی۔

نالہ جب نکلا تڑپتے دل کی حالت دیکھکر — آسماں چلا کے بول اٹھا مری چھت دیکھکر

جوشش گریہ سے نہ دیوار عناصر گر پڑے — دل دھڑکتا ہے مرا اپنی عمارت دیکھکر

حسن پتھر کے جگر میں بھی بنا لیتا ہے گھر — ان کو بھی سکتا ہے آئینے کی حیرت دیکھکر

بات بھی کھوؤں تجھے کہکر زباں سے سنگدل — کون سمجھے گا ستمگر تیری صورت دیکھکر

ٹھوکروں سے ہو چکا گور غریباں پائمال — دیکھکر ظالم کسی بیکس کی تربت دیکھکر

میری حیرانی نے آئینہ بنایا ہے مجھے — اپنی صورت دیکھ لو تم میری صورت دیکھکر

روح مضطر ہے کہ میرا خون چھپ سکتا نہیں — سب لگا لیں گے پتہ قاتل کی صورت دیکھکر

لب پہ ہے کس شد و مد سے ذکر حوران جناں — جیسے تو واعظ ابھی آیا ہے جنت دیکھکر

آہ نکلی سینۂ سوزاں سے گھبرائی ہوئی — اشک آنکھوں میں نہ ٹھہرے دل کی حالت دیکھکر

یوں کوئی کب کود پڑتا ہے پرائی آگ میں — شمع سر دھنتی ہے پروانوں کی ہمت دیکھکر

مجرموں کو انفعال جرم و عصیاں بھی نہیں — حشر کے دن وسعت دامان رحمت دیکھکر

جب قدم رکھتا ہوں میں راہ محبت میں سریر
دل یہ چپکے چپکے کہتا ہے کہ حضرت دیکھکر

مری مطربہ چھیڑ دے پھر ترانہ

از حضرت صبا رشیدی ایم اے

مرا مختصر بس یہی ہے فسانہ
امیدوں کو ناکامیوں کا بہانہ

محبت کا آغاز اک خواب رنگیں
محبت کا انجام خونیں فسانہ

وہ بلبل ہوں جس نے چمن تک نہ دیکھا
رہا بجلیوں میں مرا آشیانہ

خوش آں روز دل جنت آرزو تھا
نہ وہ اپنے دن ہیں نہ اپنا زمانہ

رباب شکستہ کی ٹوٹی سی لے ہوں
خیالوں میں بھولا ہوا سا زمانہ

جبین نیاز اب بھی ہے وقف سجدہ
مگر دور ہے حسن کا آستانہ

مری داستاں سن کے کیا کیجئے گا
ادھوری کہانی، ادھورا فسانہ

مرے تار دل کاش پھر مرتعش ہوں
مری مطربہ چھیڑ دے پھر ترانہ

صبا ہے وہی آپ کا ہے تصور
وہی اب بھی ہے شورش والہانہ

کلامِ نجم

از جناب نجم ندوی بی اے مترجم پٹنہ ہائیکورٹ

الجھا ہوا معاملۂ دل میں رہ گیا
میں عمر بھر بس ایک ہی مشکل میں رہ گیا

کچھ دیر جل کے شمع تو ٹھنڈی ہی ہو گئی
سوز و گداز شمع مرے دل میں رہ گیا

تا عمر میں کسی کو نہ اپنا بنا سکا
ارماں کسی کے دل کا مرے دل میں رہ گیا

کیا شمع جاں گداز تھی پروانہ ساز بھی
جو آگیا وہ لوٹ کے محفل میں رہ گیا

بسمل شہید ابروئے خمدار ہو گیا
خنجر کھنچا ہوا کفِ قاتل میں رہ گیا

لیلیٰ اتر کے قیس کے پہلو میں آگئی
اک اضطراب پردۂ محمل میں رہ گیا

ساحل تک آتے آتے سفینہ ہوا تباہ
صد جوشِ تہنیت دلِ ساحل میں رہ گیا

آوارگانِ شوق تو منزل سے جا لگے
میں جستجوئے مرشدِ کامل میں رہ گیا

دل سے یہ بات طے نہ ہوئی اُسنے کیا کہوں
غلطاں تمام عمر اسی مشکل میں رہ گیا

سعیٔ سفر علائقِ ہستی سو لاکھ کی
لیکن الجھ الجھ کے سلاسل میں رہ گیا

کھائی یہ منہ کی نجم ملا کر کسی سے منہ
اک داغ حلیۂ مہ کامل میں رہ گیا

تقریظ و انتقاد

بہار نمبر[1] کو دیکھکر

از بلبل بہار حضرت سریر کابری مینائی

بہار نمبر ندیم نکلا تو کس لطافت کے ساتھ نکلا
لیا سر آنکھوں پہ قدردانوں نے ملک میں ہاتھوں ہاتھ نکلا

اس ایک نمبر پہ صدقے کرنے کو ہیں میسر ہزار نمبر
ہے مختلف رنگ کے گلوں کی بہار گویا بہار نمبر

وطن کو بھی ساتھ لیکے غربت میں یہ مسافر وطن سے نکلا
یہ پھول وہ پھول ہی جو لیکر چمن کو صحنِ چمن سے نکلا

ملا مضامین کا یہ ذخیرہ ہمیں پس انتظار بے حد
ہوا یہ مضمون آشکارا کہ دیر آید درست آید

زمانہ ممکن نہیں کہ بھولے کبھی اڈیٹر کا کارنامہ
وفور عشرت سے کوئی ٹوپی اچھالتا ہی کوئی عمامہ

ہوا ہے ہر گوشہ ملک کا خدمت ریاست علی سے واقف
وہ کون ہے آج جو نہیں حضرت ریاست علی سے واقف

جو نثر ہے اس میں دلکشا ہی جو نظم ہی اسمیں دلربا ہی
رسالہ کیا ہے اک انبساط دماغ عالم کا آئینہ ہے

کہیں فسانے کہیں مقالے غرض جو مضمون ہے انکا ہی ہی
ہے صفحے صفحے پہ سحر سازی تو نقطے نقطے میں ساحری ہے

نکل رہا ہے بہار نمبر تو اور بھی بے شمار نکلے
ابھی تو ہے تین بار نکلا خدا کرے لاکھ بار نکلے

سریر یہ مشعل صحافت رہے گیا میں مدام روشن
ندیم جبتک رہیگا باقی رہے گا صوبہ کا نام روشن

[1] ضخامت تقریباً پانچ سو صفحات مع ۸۴ رنگین اور ہاف ٹون بلاک، قیمت صرف دو روپے، محصولڈاک ۵ر

نئی کتابیں

رحمتِ عالم — از مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہٗ، ۵۰ صفحے تقطیع ۲۲×۱۸ کاغذ اچھا، لکھائی چھپائی پاکیزہ۔ قیمت غیر مجلد ۸ر مجلد ۱۰ر، پتہ:- منیجر صاحب دارالمصنفین۔ اعظم گڑھ

مرتب رحمتِ عالم کا ارشاد گرامی ہے:-

"اسلام کا گلدستہ جس دھاگے سے بندھا ہے، وہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مبارک ہے! اسلئے ضرورت ہے کہ اس وجود پاک کے سوانح کا ایک ایک حرف ہر مسلمان کے کان تک پہنچ جائے۔ تاکہ یہ رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جائے۔ اس کی مناسب صورت یہ ہے کہ ہر چھوٹے بڑے تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام، کام اور پیغام کو پہنچا دیا جائے۔ ایک زمانہ سے دوستوں کا اصرار تھا کہ چھوٹے لڑکوں اور معمولی لکھے پڑھے لوگوں کے لئے سیرت کی ایک ایسی چھوٹی سی کتاب لکھوں جس کا پڑھنا اور سمجھنا سب کیلئے آسان ہو۔ اور پھر اس میں کوئی اہم بات چھوٹنے بھی نہ پائے۔"

دوستوں کی اسی فرمائش کی تعمیل میں یہ مختصر سی سیرت لکھنے کی عزت حاصل ہوئی ہے۔ اس میں عبارت کی سادگی، طرز ادا کی سہولت اور واقعات کے سلجھاؤ کا خاص خیال رکھا گیا ہے تاکہ چھوٹی عمر کے بچے اور معمولی سمجھ کے لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں، اور سکولوں اور مدرسوں کے کورسوں میں رکھی جا سکے۔"

رحمتِ عالم کے دیباچہ کی عبارت مذکورہ بالا سے اس رسالہ کی تالیف کی ضرورت اور اس کے افادی پہلو پوری طرح آشکارا ہیں، اردو زبان کی یہ خوش نصیبی ہے کہ اسمیں سیرت پاک کی ایسی جلدیں تالیف پائی ہیں، جو اپنی تمام حیثیات کے لحاظ سے عدیم المثال ہیں۔ اور دوسری اسلامی زبانوں فارسی، ترکی اور یہانتک کہ عربی میں اس کے ترجمے کئے جا رہے ہیں۔ سیرت النبی کی ان جلدوں کو سامنے رکھکر اسوقت تک اردو میں سیکڑوں چھوٹی بڑی کتابیں سیرت پاک پر تالیف ہو چکی ہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ وہ جامعیت و اختصار جو خود مرتب سیرت کے قلم سے ممکن تھا، کسی اور سے ممکن نہ تھا! اسکولوں کے طلبہ اور عام پڑھے لکھے مسلمان لائق مبارکباد ہیں کہ ان کی تعلیمی سلسلہ کی سب سے اہم ضرورت اس "رحمتِ عالم" کے ذریعہ پوری ہوئی امید ہے کہ ہاتھوں ہاتھ لیجائیگی۔

اس کتاب کی اشاعت کا دوسرا ضروری پہلو بھی لائق ذکر ہے، اس کو مولانا مسعود علی صاحب ندوی منیجر دارالمصنفین اعظم گڑھ کی زبان سے سنئے:-

"یہ کتاب چھوٹے بچوں اور طالب علموں کیلئے لکھی گئی ہے۔ اسلئے مصنف نے یہ طے کیا ہے کہ اس کا منافع دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں چھوٹے بچوں کے دارالاقامہ کی تعمیر میں خرچ کیا جائے۔ اور اسی مناسبت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی نسبت سے اس دارالاقامہ کا نام محمدیہ تجویز ہوا ہے۔ امید ہے کہ باحساس مسلمان کثرت سے اس کتاب کے نسخے خریدیں گے، تاکہ دوہرے ثواب کے مستحق ہوں۔"

یہ رمضان المبارک خیر و برکت کا مہینہ ہے۔ کیا بہتر ہو کہ اسی ماہ مبارک میں اس کے نسخے خرید کر دینی برکتیں حاصل کیجائیں۔ رسالہ کی قیمت ۸ر ہے۔ جو اہل خیر زیادہ تعداد میں خرید کر مسلمانوں میں دینی تعلیم کے پھیلانے کے لئے تقسیم کرنا چاہیں تو بیس نسخوں کے خریدار سے ایک روپیہ فی کے حساب سے لیا جائے گا۔

حیدر علی از جناب محمود خاں صاحب محمود مصنف تاریخ سلطنت خداداد میسور - حجم ۱۰۲ صفحہ - تقطیع چھوٹی قیمت فی جلد ۔ ملنے کا پتہ :- محمد سراج الدین ۶ ڈکنس روڈ - بنگلور

یہ کتاب ایک تاریخی ناول ہے، جس میں نواب حیدر علی کے دور کے واقعات کا ذکر آیا ہے - اس کے مصنف جناب محمود خاں صاحب تاریخ سلطنت خداداد میسور کے کامیاب مصنف کی حیثیت سے علمی و ادبی دنیا میں روشناس ہیں، موصوف عموماً جنوبی ہند اور خصوصاً حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی دور کی تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں اس دور کی سیاسی، علمی، معاشرتی اور مذہبی زندگی سے بخوبی واقف ہیں۔ اس ناول میں ریاستِ بدنور پر حملہ حیدری کے تفصیلات بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ وہاں کی پچھلی حکمران مہارانی کے اخلاق سوز جرائم اور اس عہد میں جنوبی ہند کے مندروں میں دیو داسیوں کے نام پر جو حرکات سرزد ہوتے تھے، ان کی تفصیلات بیان کی گئی ہے - طرز بیان شگفتہ ہے - اس ناول کے مطالعہ سے اس عہد کا ایک اجمالی خاکہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے - امید ہے کہ یہ کتاب دلچسپی سے پڑھی جائے گی -

" ر "

اطلاع

کلکتہ میں ندیم کے نمائندہ جناب جی - آر قیس شیخپوری (نمبر ۳۰ ہارن باری لین) کلکتہ ہیں -
کلکتہ میں بہار نمبر اور ہر ماہ کا ندیم ہاکروں سے طلب کریں -
پٹنہ میں بہار نمبر اور ہر ماہ کا ندیم اقبال بکڈپو، مہندر پٹنہ سے مل سکتا ہے -

آئینِ ندیم

۱۔ ندیم ہر ماہ کے آخیر ہفتہ میں شائع ہوتا ہے۔

۲۔ اگر کسی خریدار کے پاس ڈاکخانہ کی غفلت سے کسی مہینہ کا پرچہ نہ پہنچے تو اسکی اطلاع دوسرے مہینے کی دس تاریخ تک دفتر میں بھیج دینی چاہیئے۔ ورنہ رسالہ بقیمت روانہ ہوگا۔

۳۔ ندیم کا سالانہ زرچندہ مبلغ چار روپئے اور ششماہی دو روپئے چار آنے ہے۔

۴۔ ندیم میں ہر ماہ ۶۴ صفحے مضامین کیلئے وقف ہوتے ہیں۔ اشتہاروں کے صفحوں کا شمار علیحدہ ہے۔

۵۔ ندیم کے ۶۴ صفحے معنوی طور پر تقریباً چار حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ ایک حصہ میں بصیرت افروز علمی و تحقیقی نئے عنوان و مباحث سے لبریز مضامین ہوتے ہیں۔ اور ایک حصہ میں تاریخی و ادبی آثار دلچسپ منظومات و غزلیات اور ذہن میں جلا پیدا کرنے والی تنقیدیں چھپتی ہیں بقیہ دو حصے یعنی ہر ماہ کے نصف پرچہ میں افسانے ہی افسانے رہتے ہیں۔ جن میں گل و بلبل کی دلچسپ داستانیں، حسن و عشق کی وارداتیں انوکھے اور موہ لینے والے انداز میں بیان کی جاتی ہیں لطیف احساسات و جذبات کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ تعلیمی معاشرتی، اصلاحی اور سیاسی خیالات و نظریات دلچسپ پیرایہ اور رنگین انداز بیان میں پیش کئے جاتے ہیں۔

۶۔ نمونہ کے پرچہ کے لئے پانچ آنے کے ٹکٹ روانہ کئے جائیں ورنہ تعمیل ارشاد معاف۔

۷۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ روانہ کریں ورنہ جواب کا ہرگز انتظار نہ فرمائیں۔

منیجر ندیم گیا



ندیم کے اُن ارکانِ دوامی کی خدمت میں

جن کا

زرچندہ رکنیت ابھی تک تمام وکمال بیباق نہیں ہوا

جناب والا! گذارش ہے کہ ۳۱ دسمبر ۱۹۴۰ء زرچندہ کی ادائی کی آخری تاریخ ہے براہ نوازش اس اثناء میں اگر مجموعی رقم واجب الادا ہو تو سب ورنہ جو جزئی رقم واجب الادا رہ گئی ہو وہ روانہ فرمادیں۔ ورنہ اطلاعاً عرض ہے کہ

۱۔ جن ارباب ذوق کا زرِ رکنیت اتفاقاً اسوقت تک ادا نہیں ہوسکا ہے اگر ۳۱ دسمبر ۱۹۴۰ء تک رقم دفتر میں موصول نہ ہوگئی تو انکے اسما فہرست رکنیت دوامی سے قلمزد کردیئے جائینگے۔

۲۔ جن ارباب ذوق کے ذمے کوئی جزئی رقم باقی رہ گئی ہو وہ اگر ۳۱ دسمبر ۱۹۴۰ء تک دفتر میں موصول نہیں ہوگئی تو انکی پہلی موصولہ رقم بطور سالانہ زرچندہ رجسٹر میں درج کیجائے گی۔ اور اس کا حساب تیار کرلیا جائے گا۔ یہ رعایتی حقوق صرف تھوڑی مدت کیلئے دیئے گئے تھے جو پوری ہوچکی۔ اب اس سلسلہ میں کوئی مزید خط وکتابت یا گفتگو لاحاصل ہوگی۔

مبلغ پچیس روپے یکمشت ادا کرنے کی یہ آسانی بھی ۳۱ دسمبر ۱۹۴۰ء کو ختم ہوجائے گی ——— یکم جنوری ۱۹۴۱ء سے رکنیت دوامی کا یہ زرچندہ باقی نہیں رہیگا۔ اسکو محض وقتی بنیادی ضرورتوں کیلئے رکھا گیا تھا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اتنی غیر معمولی رعایت کا کسی دوسری جگہ ممکن نہیں۔ اور یکم جنوری ۱۹۴۱ء سے دفتر ندیم میں بھی اسکا سلسلہ منقطع کردیا جائے گا۔

یکم جنوری ۱۹۴۱ء سے دوامی رکنیت کے قبول کرنے کے شرائط کیا ہونگے۔ ان کا اعلان جنوری ۱۹۴۱ء کے پرچہ میں کیا جائے گا۔ ——— والسلام

سید علی مظفر امام۔ منیجر رسالہ ندیم گیا

"آئینِ ندیم"

۱۔ ندیم ہر ماہ کے اخیر ہفتہ میں شائع ہوتا ہے۔

۲۔ اگر کسی خریدار کے پاس ڈاک کی غفلت سے کسی مہینہ کا پرچہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع دوسرے مہینے کی دس تاریخ تک دفتر میں بھیج دینی چاہئے۔ ورنہ رسالہ بقیمت روانہ ہوگا۔

۳۔ ندیم کا سالانہ چندہ مبلغ چار روپے اور ششماہی دو روپے چار آنے ہیں۔

۴۔ ندیم میں ہر ماہ ۶۴ صفحے مضامین کے لئے وقف ہوتے ہیں۔ اشتہارات کے صفحوں کا شمار علیحدہ ہے۔

۵۔ نمونہ کے پرچہ کے لئے پانچ آنے کے ٹکٹ روانہ کئے جائیں، ورنہ تعمیل ارشاد معاف۔

۶۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ روانہ کریں ورنہ جواب کا ہرگز انتظار نہ فرمائیں۔

منیجر ندیم گیا

امریکن سائنسدانوں نے آبِ حیات ڈھونڈھ نکالا!



سدا جوان رہنے کا آسان طریقہ
موڈرن سائنس کا معجزہ

ہر ملک اور دنیا سے دریافت کرنے کے بعد بھی سائنس دائمی جوانی کا کوئی کامیاب طریقہ دریافت نہ کر سکی۔ لیکن اب دنیا کو ڈاکٹر ہرشفیلڈ ایم ڈی کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے نتانی جدوجہد اور ریسرچ کے بعد افریقہ کے ایک درخت سے ایسا الیکا منڈ دریافت کیا ہے جو انسان میں ہمیشہ جوانی قائم رکھ سکتا ہے۔ اس کے تجربات سیکشول سائنس انسٹی ٹیوٹ دت برلن امریکہ اور یورپ کے دیگر ممالک میں کئے گئے جن سے شاندار اور حیرت انگیز کامیابی حاصل ہوئی۔

اس جادو اثر آب حیات کا نام اوٹون "Otone" ہے جو سلور ڈراپ (SILVER DROPS) میں پیش کیا گیا ہے۔

اوٹون کے سلور ڈراپ کھانے کے بعد آپ اپنے جسم میں ایک خوشگوار اور دل خوش کن تبدیلی محسوس کریں گے۔ چہرے کی جھریاں غائب ہو جائیں گی۔ بدن کی جلد پر شباب کی تر و تازگی اور ملائمت آ جائیگی۔ رخسارے گوشت و خون سے بھر کر کشمیری سیب کی طرح دمکنے لگیں گے چہرے پر حسن و جوانی کی شادابی اور نورانیت اپنی پوری رعنائیوں سے ظہور پذیر ہو جائیگی۔ اور آپ اپنی عمر سے بہت کم عمر کے نظر آنے لگیں گے۔ مثلاً آپ پچاس سال کے ہیں تو بیس سال کے معلوم ہوں گے

اوٹون کے سلور ڈراپ مندرجہ ذیل شکایتوں کا قطعی علاج ہیں۔

خون کی کمی۔ دماغی و جسمانی کمزوری۔ سر کا چکرانا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آنا چڑچڑاپن دل کی دھڑکن۔ بے تحاشا موٹاپا۔ ذیابیطس۔ دمہ۔ بینائی کمزور ہو جانا۔ بھوک نہ لگنا ہاضمہ خراب ہو جانا دائمی قبض۔ سانس کا پھولنا۔ بالوں کا قبل از وقت سفید ہونا یا گرنا۔ کمر کا درد۔ جریان و سیلان۔ ضعف باہ۔ ضعف اعضائے رئیسہ۔ ضعف گردہ و مثانہ۔ عورتوں کی پوشیدہ بیماری مثلاً (لیکوریا) سیلان الرحم۔ اور دیگر رحمی شکایتوں کو آناً فاناً دور کر دیتے ہیں۔

اوٹون کی آب حیات تاثیرات کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ اپنا صحیح وزن کرائیں۔ اور ایک فوٹو کھنچوائیں ایک ہفتہ استعمال کے بعد پھر اپنا وزن کریں اور فوٹو لیں اس سے آپ کو اس دوا کی حیرت انگیز تاثیرات کا اندازہ ہوگا۔

اوٹون کے سلور ڈراپ عورتیں بچے بوڑھے ہر موسم میں استعمال کر سکتے ہیں اس کے لئے کسی موسم یا عمر کی قید نہیں ہے۔

Otone *An Ideal and Unique Preparation for Rejuvination*

The Elixir of Life

SILVER DROPS

15,000 روپیہ کا نقد انعام

اوٹون ریسرچ لیبارٹری اس امر کا اعلان کرتی ہے کہ اگر کوئی فرد یا ادارہ یہ ثابت کر دے کہ اوٹون کی آب حیات تاثیرات کسی حیواتی ہرمون یا دھات کی موجودگی کا باعث ہیں تو ہم اسے مبلغ ۔۔۔ ۱۵ ہزار روپیہ کا انعام دیں گے۔

اوٹون کے سلور ڈراپ کی اصلی قیمت ممالک غیر میں بارہ روپیہ ہے۔ لیکن ہم نے اسے ہندوستان میں رائج کرنے کے لئے اس کی قیمت کچھ مدت کے لئے تین روپیہ آٹھ آنہ رکھی ہے

سول ڈسٹری بیوٹرز

میسرز گرانڈ فارمیسی (پوسٹ بکس ۱۲۳ کلکتہ)

تار کا پتہ "اوٹون" کلکتہ۔ ٹیلیفون ۔۔۔

Solo Distributor

عورتوں کی پرسوت کی بیماری اور سفید رطوبت

دور کرنے کی زود اثر اور لاثانی دوا

نسوانی

رجسٹرڈ

قیمت فی شیشی ایک روپیہ



آجکل ہر گھر میں بیاہی ہوئی اور جوان عورتوں کو سفید سفید رطوبت آنے کی شکایت رہتی ہے جسکی وجہ سے اُن کے بدن میں کمزوری بڑھتی جا رہی ہے اور بہت تھوڑی عمر میں چہرے کی چمک اور بدن کی پھرتی غائب ہو جاتی ہے۔ یہ رطوبت جسکو پرسوت کی بیماری بھی کہتے ہیں مثل پانی کے سفید سفید قطرہ نکلتا رہتا ہے اور اکثر میلے رنگ کی گاڑھی گاڑھی سفید رطوبت برابر نکلا کرتی ہے اور کپڑے پر دھبہ آجاتا ہے۔ اِسکی وجہ سے تھوڑے دِن میں بدن پیلا پڑکے سوکھنے لگتا ہے (۱) ٹانگ میں درد (۲) آنکھ تلے اندھیرا (۳) اُٹھتے بیٹھتے سر چکرانے لگتا ہے (۴) کوئی چیز کھانے کو جی نہیں چاہتا (۵) ہاتھ پیر کا تلوہ جلتا رہتا ہے (۶) کمر میں درد (۷) طبیعت میں سُستی (۸) بھوک نہ لگنا (۹) مرد کی صحبت سے جی گھبرانا (۱۰) حمل نہ رہنا (۱۱) یا حمل گرجانا (۱۲) یا اولاد کمزور پیدا ہونا (۱۳) اولاد پیدا ہوکر زندہ نہ رہنا۔ غرضکہ اِن سب بیماریوں کے لئے اگر آپ ہمارے یہاں کی لاجواب دوا نسوانی استعمال کرائیں گے تو خدا چاہے تو عورت کی جملہ مندرجہ بالا شکایتیں جاتی رہینگی۔ عورت کی کمزوری سستی لاغری دور ہوکر بدن میں پھرتی ہاتھ پیر میں طاقت۔ چہرہ پہ رونق۔ اور دل میں جوانی کی اُمنگ آجائیگی۔ صرف تین شیشی نسوانی پلانے سے رطوبت کا آنا بند ہو جائیگا۔ قیمت فی شیشی۔ ایک روپیہ۔ تین شیشی کی قیمت۔ دو روپیہ بارہ آنہ۔ محصول علاوہ

قدرتِ خدا کا تماشہ دیکھئے۔ بانجھ عورت کو حمل قرار پا گیا۔

جناب محمد اسحاق صاحب۔ ضلع سلطان پور سے تحریر فرماتے ہیں۔ کہ میں نے چھ شیشی نسوانی منگا کر استعمال کیا۔ حالانکہ عورتیں بالکل بانجھ تھیں۔ اب خدا کے فضل و کرم سے دونوں عورتیں حاملہ ہیں۔ میں تہہ دل سے آپ کا مشکور ہوں۔ لہذا تین شیشی نسوانی اور روانہ فرمائیے۔ (فرمائش لکھتے وقت ندیم کا حوالہ دیجئے)

ملنے کا پتہ ایس۔ کے۔ ڈی بخش کمپنی۔ گھڑی والی کوٹھی نمبر ۲۱ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ

ضروری اطلاع لاکھوں نے برتی ہے سب کا بھلا ہوگا

صاحبان! میں نہ اشتہاری حکیم ہوں نہ ڈاکٹر بلکہ ایک معمولی آدمی ہوں۔ بدقسمتی سے مجھے اپنے ہاتھوں اپنی جوانی کا ستیاناس کرنے والی عادت پڑ گئی تھی جس کے نتیجہ بد سے میں بالکل بے خبر تھا۔ اچانک عرصہ ڈیڑھ سال کے بعد مجھے نامردی کا نامبارک مرض لاحق ہو گیا۔ سرعت، جریان، احتلام وغیرہ کی ... شکایتوں کے سبب میرا چہرہ دن بدن لاغر اور زرد ہوتا جاتا تھا۔ دیگر دل ہر وقت دھڑکتا رہتا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آتا۔ گھبراہٹ سستی اور اداسی چھائی رہتی تھی۔ دوست احباب میری پژمردگی کا سبب پوچھتے تھے مگر میں کسی کو اپنی حالت سے آگاہ کرنا مناسب نہ سمجھتا تھا مگر در پردہ مشہور شہروں کے بڑے بڑے ... اور حکیموں سے جن کے لمبے چوڑے اشتہاروں کی کوئی حد نہ تھی ادویات منگا کر استعمال کرتا رہا لیکن مجھے بالکل خاک بھی فائدہ نہ ہوا بلکہ علاوہ خرچ کے کئی ... کر کے بھی مایوس ہی رہنا پڑا۔ اس مایوسی کی حالت میں زندہ درگور ہونے کو ترجیح دیتا تھا۔ اتفاقاً خوش قسمتی سے مجھے ملازمت کے ایک سلسلہ میں پشاور جانا پڑا ... ٹھہرا۔ وہاں ایک فقیر خضر صورت جو کہ پہلے سے وہاں مقیم تھے۔ مجھ سے پوچھنے لگے کہ تم اداس اور تمہاری صورت مریضوں کی سی کیوں ہے ... خضر صورت اور کامل سنیاسی سے اپنا سارا دکھ درد کہہ ڈالنے کی ہدایت کی۔ چنانچہ میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ اب میں زندگی سے تنگ آ کر خودکشی کرنے ... اس فقیر صاحب کمال نے از راہ شفقت میرے حال زار پر رحم فرما کر ایک نسخہ کھانے کیلئے مقوی گولیوں کا اور دوسرا نسخہ رگوں اور پٹھوں کی ... کا بتایا۔ چنانچہ میں نے حسب ارشاد اس صاحب کمال کے لاتعداد جنگلی جڑی بوٹیاں اور کئی ادویات بازار سے خرید کر مرد و جوہر کیا اور رو برو اس صاحب کمال کے ... کرکے استعمال کرنا شروع کیا۔ **ناظرین! میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر سچ کہتا ہوں** کہ ... روز ہی میری ... ہونی شروع ہو گئیں اور میں اپنے آپ کو قابل فخر مرد کہنے کا مستحق ہو گیا۔ اگرچہ مجھے چند ہی روز کے استعمال سے ضبط کرنا دشوار ہو گیا۔ مگر بموجب ارشاد اپنے محسن خضر صورت کامل سنیاسی کے **اکیس روز** تک پرہیز اور علاج جاری رکھنا پڑا۔ میں ہر روز تین سیر ساڑھے تین سیر دودھ بآسانی ہضم کر لیتا تھا۔ میرا چہرہ بارونق۔ بدن مضبوط۔ بینائی طاقتور ہو گئی۔ اب میں ایسا قابل فخر مرد بن گیا ہوں کہ جس کے بیان کرنے کی تہذیب اجازت نہیں دیتی ... آخر باقیماندہ دوائی کا نامردی کے مایوس مریضوں پر تجربہ کیا تو ہر قسم کی نامردی سستی۔ جریان۔ احتلام۔ سرعت وغیرہ کے لئے اکسیر سے بڑھ کر پایا۔ ... کئی ایک دور اندیش احباب کے اصرار اور عوام کے فائدہ کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ اشتہار بغرض رفاہ عام دیا جاتا ہے کہ جو صاحب اس شرمناک اور قبیح عادت کے شکار بن کر حظوظ انسانیت سے محروم ہو بیٹھے ہوں اور سینکڑوں روپیہ علاج معالجہ پر صرف کر کے مایوس ہو چکے ہوں وہ اس قلیل القیمت اور سریع الاثر دوائی کو استعمال کر کے صحت یاب ہو جائیں۔ ... قیمت صرف لاگت ادویات اور خرچ اشتہار پر مشکل اکتفا کرتی ہے۔ فائدہ بہت کم مد نظر ہے۔

قیمت مقوی گولیاں فی شیشی جس میں ۱۲ روز کی ۲۴ خوراک موجود ہے صرف دو روپیہ۔
قیمت روغن مالش طلاء جو ۱۲ روز تک رگوں اور پٹھوں کیلئے کافی ہے فی شیشی دو روپے آٹھ آنے۔

... یہ گولیاں ازحد مفید ہیں۔ مادرزاد نامردی کے سوائے خواہ کسی قسم کی نامردی کا مریض کیوں نہ ہو اکسیر ہے۔ روغن مالش طلاء سے کسی قسم کی پھنسی یا آبلہ ہرگز نمودار نہ ہوگا۔

اس دوائی میں کشتہ وغیرہ کی آمیزش نہیں ہے ... جوان اور بوڑھا آسانی بغیر لحاظ موسم کے ان گولیوں کا استعمال کر سکتا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس دوائی کے استعمال کے بعد دوبارہ کسی دوائی کی ضرورت نہ رہے گی۔ آخر میں یہ بھی ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اشتہار کے نکالنے سے میری کوئی ذاتی غرض نہیں ہے اور نہ ہی میرا مدعا مثل اشتہار بازوں کے پبلک سے روپیہ کمانے کا ہے بلکہ ہر خاص و عام کا فائدہ مد نظر رکھ کر احباب کے اصرار پر اشتہار شائع کیا جا رہا ہے۔ تندرست اور شوقین اصحاب بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ کیونکہ اس کے استعمال سے سست سے سست اور چست سے طاقتور بن جاتے ہیں۔ اگر بڑھاپے میں بھی لطف جوانی اٹھانا چاہتے ہیں۔ تو ان گولیوں اور روغن مالش طلاء کا استعمال کریں کیونکہ اس کے استعمال سے بدن میں خون صالح پیدا ہو جاتا ہے۔ الغرض جب تمام چرخا ڈھیلا ہو گیا ہو تو ان کا استعمال کریں اور فائدہ اٹھائیں۔ مخفی ... کہ تمام دنیا کی دواؤں سے عجیب و غریب پاتے ہیں۔

نیز عورتوں کی جوانی قائم رکھنے کے لئے۔ جو عورتیں مردوں کی طرح جریان الرحم یا اخراج رطوبت یعنی لیکوریا جیسے خطرناک امراض میں مبتلا ہوں۔ ان کے لئے مقوی گولیاں ازحد مفید ہیں۔ ضرورت مند اصحاب تجربہ کریں۔ مکمل پرچہ ترکیب ہمراہ دوا ہوگا۔ محصول ڈاک ... علاوہ۔ تمام خط و کتابت پوشیدہ رکھی جاتی ہے۔

خاص نوٹ! دو اصحاب ... سے دوائی منگا کر استعمال کریں۔ اخبار کا حوالہ ضرور دیں۔ کیونکہ کئی اصحاب نے پیشہ اختیار کر رکھا ہے کہ ... دوائی منگا کر زیادہ قیمت پر فروخت کر دیتے ہیں۔ لہٰذا فقیر خضر صورت سنیاسی کے قول کے مطابق اس کی کمائی کھانا گناہ ہے۔ یہ گورنمنٹ آف انڈیا سے رجسٹرڈ ہیں۔ آرڈر دیتے وقت اپنا پتہ صاف اور خوشخط لکھیں۔

غیر ممالک سے قیمت پیشگی۔

ضروری اطلاع

یاد رہے کہ میری دوائی صرف نامردی سستی، جریان، احتلام، سرعت، کمزوری اور لاغری اور ... کے لئے ... [illegible]

شرطیہ علاج اور شرطیہ عدہ

[illegible]

ڈاکٹر جگدان سنگھ از امرتسر یہ دوائی احتلام و سرعت انزال کیلئے اکسیر ہے۔

حکیم رام چندر از رنگون یہ دوائی رگوں اور پٹھوں کیلئے مفید ہے۔

حکیم چونی لال از لاہور یہ دوائی اولاد پیدا کرنے کیلئے ...

آغا ... صاحب ... پشاور ...

خاکسار ... کمال ...



کیا آپ کے پاس چار آنے ہیں؟

آج ہی اُنہیں کاروبار میں لگا دیجئے

اس آسان، محفوظ اور نفع بخش طریقہ سے



اپنے قریبی پوسٹ آفس میں جائیے۔ اور وہاں سے ایک ڈیفنس
سیونگ سرٹیفکٹس کارڈ مانگیے۔ یہ آپ کو بالکل مفت دیا جائیگا۔ آپ
سے جتنے ہو سکیں اُتنے چار آنے، آٹھ آنے یا ایک روپیہ والے
ڈیفنس سیونگ اسٹامپ خرید لیجئے۔ اور انہیں کارڈ پر چپکاتے جائیے جب آپ کے کارڈ
میں دس روپے کے ڈیفنس سیونگ اسٹامپ جمع ہو جائیں۔ تب آپ کا کارڈ مکمل ہوگا۔ یہ کارڈ
یہ کارڈ کسی بنک میں بھی پیش کیجئے وہاں سے آپ کو دس روپے کی قیمت کا ایک
ڈیفنس سیونگ سرٹیفکٹ مل جائے گا۔ جو چند سال میں تیرہ روپیہ نو آنہ کی
قیمت کا ہو جائے گا اس پر کوئی
انکم ٹیکس عائد نہ ہوگا جب بھی آپ
اپنا روپیہ واپس لینا چاہیں
مع سود کے آپ کو ادا کر دیا جائیگا
بھلا اس سے آسان اور محفوظ
طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے۔



ڈیفنس سیونگ سرٹیفکٹس خریدیئے۔

یہ سرمایہ لگانے کا نہایت محفوظ طریقہ ہے۔

ندیم کا بہار نمبر

انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالہ اردو کی نظر میں

آجکل کہ کاغذ اور طبع کی سب ضروری چیزیں بہت مہنگی ہوگئی ہیں سید ریاست علی اور ان کے شرکائے کار کا یہ ساڑھے چار سو صفحوں سے زیادہ ضخامت کا خاص نمبر نکالنا ان کی ہمت اور ادب دوستی کو تحسین سے مستغنی کرتا ہے۔ اس ضخیم کتاب میں پینتالیس ۴۵ تصویریں۔ تیس سے کچھ اوپر عالمانہ اور محققانہ مقالے بیس کے قریب افسانچے اور اور اتنی ہی نظمیں ہیں غزلیں اور بہار کے مشاہیر اور دوسرے مضامین علاوہ ہیں۔ لکھائی چھپائی۔ صاف ستھری ہے۔ سید سلیمان ندوی اور حضرات وصی احمد بلگرامی۔ سید ابو ظفر۔ سید علی حیدر۔ حمید عظیم آبادی۔ مولانا عبدالماجد دریا۔ بادی۔ سید عبدالرؤف ندوی وغیرہ اصحاب کے مقالے وقیع اور محققانہ ہیں۔ اور حضرات مبارک۔ صبا۔ وغیرہم کی نظمیں نہایت عمدہ اور قابل داد ہیں۔ ایک امتیازی بات اس نمبر میں یہ بھی ہے کہ بعض مشاہیر کی خود اپنی قلم کی تحریریں بھی حاصل کر کے شائع کر دی ہیں۔ ان چند مثالوں پر کیا منحصر ہے۔ اس خاص نمبر میں بہت چیزیں دلچسپ اور معلومات کا مخزن ہیں ہم کارکنان ندیم کو اس خاص بہار نمبر کے لئے مخلصانہ مبارک باد دیتے ہیں یہ نمبر صوبہ بہار کی ادبی اور صحافتی تاریخ میں یادگار رہے گا سب باتوں پر نظر رکھتے ہوئے اس نمبر کی قیمت دو روپیہ کچھ بھی نہیں۔ (اردو دہلی بابتہ ماہ اکتوبر ۱۹۴۱ء مرتبہ ا۔ مولانا عبدالحق)

تقریباً پانچ سو صفحے۔ متعدد تصویریں۔ قیمت دو روپیہ۔ اڈیٹر اور ناشر سید ریاست علی ندوی۔ گیا

صوبہ بہار

صوبہ بہار کے اسکولوں اور کالجوں میں ۱۹۳۱ء سے منظور شدہ

رسالہ ندیم گیا

قیمت سالانہ للعہ
قیمت فی پرچہ ۵/
ششماہی ۶/۴

مرتبہ:- سید ریاست علی ندوی

جلد ۱۴	ماہ شوال المعظم ۱۳۵۹ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۴۰ء	نمبر ۵

	عنوان	مضمون نگار	صفحہ
	آہ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمۃ	سید ریاست علی ندوی	۲۵۹ – ۲۶۱
مقالات	نواب اعتماد الدولہ کامگار خاں	جناب حکیم محمد تقی صاحب بسوی	۲۶۲ – ۲۶۶
	انگریزی شاعری اور رومان	جناب خواجہ عبدالقیوم صاحب ایم اے	۲۶۸ – ۲۷۲
	سید ضمیر الحق قیس آروی اور جذبات قیس	جناب سید غلام ربانی صاحب عظیم آبادی	۲۷۳ – ۲۷۷
افسانہ و محاضرات	انقلاب کی چنگاری	جناب بساون پرشاد ورما صاحب	۲۷۸ – ۲۸۳
	سراغ	جناب نصرت آروی	۲۸۴ – ۲۸۶
	رفیق زندگی	مولانا ابواحمد سید عبدالوہاب صاحب شفق پرسانوی ایم اے وکیل	۲۸۷ – ۲۹۵
	محبت اور فرض	جناب مظہر رمضان پوری ایم اے	۲۹۶ – ۳۰۳
	"من کی چاہ"	جناب سعید الحق صاحب عاشق دسنوی ایم اے	۳۰۴ – ۳۱۰
لسانیات	اصلاح زبان		۳۱۱
	فرق زبان		۳۱۲
سلسلۂ نظر باالمراۃ والمناظرہ	کچھ مضمون "بیگمات اودھ" کے متعلق	جناب سید حیات حسین صاحب وفا حسین آبادی	۳۱۳ – ۳۱۴
اخبار علمیہ ادبیہ	جشن عید میں چند ادبی تقریبیں		۳۱۵ – ۳۱۶
ادبیات	جذبات مبارک	حضرت مبارک عظیم آبادی	۳۱۷
	برسات کی رباعیات	حضرت رسا ہمدانی ایم اے	۳۱۸
	حسن تغزل	جناب اختر سہسرامی ایم اے	۳۱۹
	جمالیات صبر	جناب سید بدرالدین احمد صاحب صبر رضوی مخدوم آبادی	۳۲۰
	مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رح	حضرت ستر کاپری	۳۲۲
	"والدہ مرحومہ کی یاد"	جناب جی آر قیس شیخپوری	۳۲۳
	دنیائے کاروبار	م	۳۲۴

سید ریاست علی ندوی اڈیٹر پرنٹر پبلشر نے ندیم پریس گیا میں چھپوا کر دفتر ندیم سے شائع کیا

علمائے ہند کو جگانے والا آغوش لحد میں سو گیا

آہ! مولانا ابو المحاسن محمد سجاد مرحوم!!

یہ جانکاہ خبر پورے ہندوستان میں بجلی کی طرح دوڑ چکی ہے کہ علمائے ہند کی جماعت میں زندگی و عمل کی روح پھونکنے والے ذی اقتدار عالم دین مولانا ابو المحاسن محمد سجاد نے مختصر علالت کے بعد ۱۸ نومبر ۱۹۴۰ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانائے مرحوم کے غم میں صرف صوبہ بہار غمگین نہیں۔ ہندوستان کا پایہ تخت دہلی بھی ماتم کناں ہے اور حق ہے کہ ان کے ماتم میں ملت اسلام سوگوار ہو کہ ان کی زندگی ملت اسلام ہی کی خدمت کے لئے وقف ہو چکی تھی۔

مولانائے مرحوم قصبہ بہار کے اطراف میں سے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی تعلیم قصبہ بہار میں حاصل کی۔ پھر علم کی طلب میں الہ آباد پہنچے۔ اور اُس عہد کے مشہور فقیہ، محدث و واعظ مولانا عبد الکافی علیہ الرحمۃ کے حلقۂ درس میں جو مدرسہ سبحانیہ میں قائم تھا زانوئے تلمذ تہ کیا۔ تحصیل علم کے بعد مدرسہ اسلامیہ بہار میں مدرس ہوئے۔ پھر استاذ کی یاد فرمائی پر دوبارہ الہ آباد تشریف لے گئے اور مدرسہ سبحانیہ میں مسند درس بچھائی۔ جہاں تلامذہ پروانہ وار ارد گرد جمع ہو گئے۔

لیکن مولانائے مرحوم میں فکر و عمل کی جو صلاحیتیں ودیعت تھیں وہ انھیں کسی مدرسے کے گوشہ میں تنہا درس و تدریس کی خدمت انجام دینے پر قانع نہ رکھ سکیں اسوقت ندوۃ العلماء کی تحریک کی صدائے بازگشت موجود تھی۔ مرحوم نے اپنے دائرہ عمل کیلئے ایک ایسے شہر کو منتخب کیا جہاں کسی معقول اسلامی درسگاہ کی ضرورت باقی تھی۔ چنانچہ آپ ہمارے شہر گیا میں تشریف لائے۔ اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے وزن پر انوار العلوم کے نام سے ایک مذہبی درسگاہ کی بنیاد ڈالی۔ اور اس کو ندوۃ العلماء سے ملحق کرنیکا اعلان فرمایا۔ ندوۃ العلماء نے بھی سند الحاق عطا کی۔ یہ واقعہ ۱۳۳۲ھ کا ہے۔ مولانائے مرحوم نے اپنی جد و جہد سے بہت تھوڑی مدت میں اس دینی درسگاہ کو ترقی کے عروج پر پہنچایا۔ ایک مخیر دیندار خاتون نے اپنا وسیع باغ اور مکان اسی کیلئے وقف کر دیا اور یہ مدرسہ ایک مستحکم بنیاد پر جاری ہو گیا۔

اسی اثنا میں پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ کیساتھ ہندوستان میں تحریک خلافت کا طوفان اوٹھا۔ اور مولانائے مرحوم درس و تدریس کے اس خموش گوشہ کو بھی خیر باد کہنے پر مجبور ہوئے۔ مدرسہ کو اپنے ایک ممتاز شاگرد رشید مولانا سیّد عبد الحکیم صاحب کے سپرد کیا۔ اور خود اسلامی و ملی جد و جہد کے ایسے میدان میں آ گئے جس کی سرحد ملکی تحریک سے ملی جلی ہوئی تھی۔

اسی زمانہ میں علماء کی جماعت میں غیر محسوس طریقہ سے جنبش پیدا ہوئی ہے۔ مولانائے مرحوم کی دور رس نگاہوں نے اس کو تاڑ لیا۔ علماء کو

بیدار کرنے کے لئے آگے بڑھے۔ جمعیۃ علمائے ہند کے بنیاد ڈالنے والوں کے رفیق کار ہوئے ——— جمعیۃ علمائے ہند نے ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے امارت شرعیہ کا نظام عمل پیش کیا۔ مولانائے مرحوم نے سبقت کی۔ اور امیر ہند کے انتخاب کا انتظار کئے بغیر "امارت شرعیہ صوبہ بہار واڑیسہ" کی داغ بیل ڈالدی، حضرت مولانا سید شاہ بدرالدین پھلواری رح امیر شریعت اور مولانائے مرحوم نائب امیر شریعت منتخب کئے گئے۔ رفتہ رفتہ امارت شرعیہ صوبہ بہار کا محکمہ ایسے وسیع پیمانہ پر آگیا کہ ایسا اس صوبہ میں کوئی دوسرا مذہبی ادارہ موجود نہیں۔ ہمارے صوبہ میں امارت شرعیہ کے ادارہ نے جو غیرفانی جلیل القدر خدمات انجام دیئے ان کا تذکرہ کرنا تحصیل حاصل ہے۔ وہ تمام کے تمام خدمات مولانائے مرحوم کی مجاہدانہ زندگی کے پائیدار نقوش ہیں

سیاسیات میں مولانائے مرحوم اپنے چند خاص زاویہ ہائے نگاہ رکھتے تھے:۔

۱۔ وہ ملکی تحریک میں ہندوستان کی آزادی کے طلبگاروں کی صف اول میں تھے۔

۲۔ وہ اس مقصد کے حصول کیلئے اسلامیت کی انفرادیت کو برقرار رکھ کر برادران وطن کی وطنی جدوجہد میں شریک ہوتے تھے

۳۔ اسلام، اسلامی آبادیوں یا مسلم طبقوں کے خلاف اگر کسی جانب سے جارحانہ حملے کئے جاتے تو ان کی مدافعت میں پیش پیش رہنا فرض اولیں جانتے تھے۔

۴۔ وہ مرکزی وصوبہ وار مجالس قانون ساز میں شریک ہوکر اسلامی حقوق ومفاد کی نگرانی رکھنا ضروری سمجھتے تھے

۵۔ مسلمان اراکین قانون ساز سے اس مفاہمت کے طلبگار رہتے کہ

الف۔ جو قوانین غالب حیثیت سے سیاسی نوعیت کے ہوں، انمیں مسلمان اراکین مجالس اپنی مناسب راہ جو بھی چاہیں اختیار کریں، لیکن وہ اصولی حیثیت سے ملکی مفاد اور وطنی تحریک کے مخالف نہ ہو۔

ب۔ جن قوانین کی غالب نوعیت مذہبی ہو یا جن کے مابعد اثرات اجتماعی یا انفرادی حیثیت سے مسلمانوں کی مذہبی زندگی یا دینی مراسم واعمال پر پہنچیں انمیں مسلمان اراکین مجالس، جماعت علماء کی اقتداء قبول کریں

پچھلے الکشن کے موقع پر تقریباً اسی مفاہمت کے مطابق مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی کا وجود عمل میں آیا۔ الکشن کی گرماگرمی میں مولانائے مرحوم کی عملی شرکت ان کے بہت سے مخلصوں کی رائے کے مطابق نہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس وادی پرخار میں گئے۔ انٹرم منسٹری کی تشکیل ان کے مخلصوں کی نظر میں ان کی دوسری غیر صحیح روش تھی ——— لیکن بہرحال اسوقت وہ صوبہ کی اسلامی سیاسیات کی کشتی کے ناخدا تھے، کسی کشتی کا سمندر کے مدوجزر اور حوادث کے تھپیڑوں سے دوچار ہونا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ حق کی حمایت میں آواز بلند کرنے میں کبھی وہ پیچھے نہیں رہے۔ ابھی ہندوستان کے پچھلے دور حکومت میں واردھا اسکیم کے خلاف صوبہ میں سب سے پہلی آواز انہی نے اٹھائی اور واردھا اسکیم کی برائیاں سب سے پہلے انہی نے آشکار کیں۔ صوبہ کے مختلف گوشوں میں ستم رسیدہ مسلمانوں کی پکار انہوں نے سنی۔ اور ان کی حمایت میں دوڑ کر انکے پاس پہنچے۔ ان کے یہ خدمات فراموش کئے جانے کے لائق نہیں۔

مولانائے مرحوم میں دو اوصاف بیک وقت شان امتیازی کے ساتھ جمع تھے۔ ایک طرف وہ اپنی اعلیٰ دماغی صلاحیتوں سے اسلامی ہند کے بہترین صاحب نظر مفکر تھے۔ اور دوسری طرف وہ اپنی جانفشاں جدوجہد میں ایسے معروف تھے کہ کسی لمحہ وہ خالی نہیں رہتے تھے۔ مولانائے مرحوم . . . .

. . . . ہندوستان میں اسلامی محکمہ قضا کے قیام کے سبب سے بڑے داعی تھے ۔ اسکیمیں سوچنا اور لائحہ عمل بنانا ان کی زندگی کا محبوب مشغلہ تھا ۔ گیا کانگریس کے موقع پر "حریم شریعت" میں کئے عمل کے حسن وجمال کے جو شاہد ہیں وہ اس کی یاد کو کبھی فراموش نہ کریں گے ۔ وہ ان دونوں جمعیۃ العلماء ہند کے ناظم اعلیٰ تھے معلوم نہیں کتنی مفید اسکیمیں ان کے ذہن سے نکلیں، اور کس کس شکل میں ہوکر وہ کامیابی سے ہمکنار ہوئیں ۔ ان خدمات کی تفصیلات میں جانے کیلئے ایک دفتر درکار ہے ۔ خصوصاً مرکزی اسمبلی اور صوبہ کی مجلس قانون ساز میں جن مباحث اور بل کا تعلق اسلامیات سے ہوتا ۔ ان کی تشکیل پر نقد و نظر، اور ان کے حسن و قبح کو پرکھنے کی مستقل خدمات انجام دیتے تھے اور ان کی فکر و نظر سے مفید نتائج برآمد ہوئے تھے

مولانا مرحوم سے راقم سطور کے مراسم دیرینہ تھے ۔ جب ملتے تو غیر معمولی محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے ۔ میری محبت کیساتھ انہیں ندیم سے بھی انس تھا ۔ اور جب گیا آنے کا اتفاق ہوتا تو دفتر میں ضرور تشریف لاتے ۔ ندیم کی ترقی و توسیع کیلئے خود معلوم نہیں کتنی مرتبہ فرمایا ۔ لیکن ندیم کی محرومی کہ کبھی اس کو ان کے فیوض سے بہرہ اندوز ہونے کا اتفاق پیش نہ آیا ۔

مرحوم حسن عمل اور صدق نیت کے مجسمہ تھے ۔ ذاتی اخلاق، مروت، حلم، بردباری، تواضع و انکسار ان کے گرانمایہ اوصاف تھے ان کا سیاسی مطالعہ وسیع تھا ۔ اسلامی ممالک کے حالات سے باخبر رہتے تھے ۔ کسی یورپی زبان پر کامل قدرت نہ رکھنے کے باوجود یورپ کے دستوری نظام حکومت کی تفصیلات پر حیرت انگیز عبور رکھتے تھے ۔ سیاسیات کے مطالعہ کے لحاظ سے عام جماعت علماء میں اب کوئی ایسا دوسرا صاحب فضل موجود نہیں ۔ ان کی غیر متوقع موت نہ صرف صوبہ بہار بلکہ اسلامی ہند کیلئے ایک عظیم سانحہ ہے ۔ جس سے نہ صرف ہندوستان کے بیدار مغز علماء میں سے ایک رکن کی کمی ہوئی ۔ بلکہ اسلامی ہند کی اصلاحی تحریک کو ایسا سخت صدمہ پہنچا کہ بظاہر اس کی تلافی کا سر دست کوئی امکان نہیں ——— ہم بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہیں کہ وہ ہمیں ان کا نعم البدل عطا فرمائے ۔ جو ان کی جانشینی کرے اور ان کے ادھورے کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے ۔ ہماری دلی تعزیت ملت اسلامی کی خدمت میں پیش ہے کہ مرحوم کا رشتہ پوری ملت اسلامی سے وابستہ تھا خداوندا مرحوم کے اعمال حسنہ قبول فرما لغزشوں کو بخش دے ۔ اور اپنی رحمت و شفقت سے درجات اعلیٰ سے سرفراز فرما ۔ آمین

کاپی پریس میں جا چکی تھی کہ جناب سید حسن امام صاحب وارثی رئیس گیا سے زبانی یہ افسوسناک خبر ملی کہ اردو ادب کا ایک درخشندہ ستارہ ۲۲ر نومبر سنہ ۴۰ء کو غروب ہو گیا ۔ یعنی جناب سید محمد احمد صاحب بیخود موہانی ایم اے سابق پروفیسر شیعہ کالج لکھنؤ نے اس دار فانی کو الوداع کہا ۔ مرحوم اردو کے کہنہ مشق ادیب و شاعر اور ممتاز انشا پرداز تھے ۔ غالب کے پرستار دل تیں تھے ۔ "گنجینۂ تحقیق" کے نام سے غالب پر مرحوم کے تاریخ تحقیقی مضامین کا ضخیم مجموعہ شائع ہو چکا ہے ۔ جو اہل علم میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے ۔ دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے ۔ اور پسماندوں کو صبر جمیل عطا فرمائے ——— جناب سید حسن امام صاحب موصوف نے اثنائے گفتگو میں برجستہ فرمایا "بیخود موہانی شہید لکھنؤ" اور اسی سے تاریخ نکل آتی ہے ۔ خدا کرے کہ یہ مرحوم کے حق میں تفاول نیک ہو ۔

۱۳۵۹ھ

مقالہ

نواب اعتماد الدولہ کامگار خاں

سنہ ۱۷۱۹ء ۔ سنہ ۱۷۷۲ء

از جناب حکیم محمد نقی صاحب ہسوی

(۲)

میر قاسم کی مدد پر

جب میر قاسم سنہ ۱۷۶۴ء میں انگریزوں کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا تو اُس کو ایسے لوگوں کی تلاش ہوئی جو انگریزوں کے خلاف لڑ چکے تھے، میر قاسم نے اس کام کے لئے کامگار کو چنا، مگر اس وقت کامگار میر قاسم سے کبیدہ تھا، کیونکہ ایک بار اس نے کامگار کے خلاف کچھ سخت حکم جاری کیا تھا، مگر اس پر عمل نہ کر سکا تھا۔ اب میر قاسم نے علی ابراہیم کی کوشش سے کامگار کو بہ ہزار خوشامد شرکتِ جنگ پر رضامند کیا۔

آخر پھر بھی کامگار ایک بہت بڑی فوج لیکر انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر جب محاذ جنگ پر پہنچا تو اس کو نقشۂ جنگ پسند نہیں آیا۔ اس نے ترمیم کرنی چاہی، آخر تُو تُو میں میں بڑھی، کامگار بول اٹھا کہ تم نے ابھی میدان جنگ نہیں دیکھا ہے[1] اس پر کچھ لوگوں نے جو در پردہ میر قاسم کے دشمن تھے کہنے لگے کہ کامگار دوست نہیں ہو سکتا۔ یہ موقع کی تاک میں ہے، قابو پا کر میر قاسم اور اس کی فوج کو غارت کریگا۔ میر قاسم اس خبر سے اندیشہ ناک ہوا۔ آخر اس نے کامگار کو بلوا کر کہا کہ تمہاری سب سے بڑی مدد یہ ہوگی کہ تم بیر بھوم جا کر انگریزوں کا

---

[1] ترجمہ سیر المتاخرین جلد دوم ۔ صفحہ ۴۲۴

راستہ روک دو کہ بنگالہ کی فوج بہار نہ پہونچ سکے - کامگار نے اس بڑی خدمت کو اپنے ذمہ لے لیا اور اسی وقت بیر بھوم کی طرف چل کھڑا ہوا - اور دھاوا کرتا ہوا بیر بھوم پہنچا - اور مناسب موقع دیکھ کر اپنا پڑاؤ ڈال دیا - وہاں اُس کو خالص انگریزوں کی فوج سے مقابلہ کرنا پڑا - کامگار کو جب یہ خبر پہنچی کہ میر قاسم کو بہار میں شکست ہوگئی، جب بھی یہ بہادر اسی طرح راستہ روکے کھڑا رہا - جب انگریزوں نے بہت سمجھایا کہ تم کیوں ناحق اپنی فوج کو کٹواتے ہو بہتر ہے کہ تم واپس جاؤ - اُس وقت کامگار اپنی غلطیوں پر نادم ہوا - اب اس نے اچھی طرح سے سمجھ لیا کہ ہندوستان کے واحد مالک اب صرف انگریز ہیں، مگر اب کیا ہوتا ہے، اس کی ریاست کو انگریزوں نے تاک لیا تھا - صرف موقع کے منتظر تھے -

ریاست کامگار خاں کا حشر کامگار کی زندگی میں تو کسی کو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ پڑی - کچھ تو اس وجہ سے کہ شاہ عالم اس کا طرفدار تھا اور دوسرے خود اس کی اپنی قوت کافی تھی - شاہ عالم چلتے چلتے ایک فرمان اس کی ریاست کے تحفظ کے خیال سے لکھ گیا تھا جس میں اس کی ریاست کو الگ الگ علاقہ قرار دے کر حکومت بہار سے بے نیاز کر دیا تھا - اور مزید فتوحات کی اجازت بھی اس میں درج تھی - اور اس کی وفاداریوں کا کافی تذکرہ بھی تھا، وہ فرمان تاحال اس کے خاندان میں موجود تھا - جس کو ناچیز نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے - اب نہ معلوم وہ کس کے پاس ہے - کامگار سیاست داں تو نہ تھا، مگر دور اندیش ضرور تھا - اس نے اپنے جان نثاروں کی قوت پر ریاست کو محفوظ رکھا تھا

مگر اس کا بیٹا اقبال علی بڑا نالایق نکلا، یہ تند مزاج اور عیش پرست تھا - جب کامگار کے انتقال کے بعد اس کے قبضے میں حکومت کی باگ آئی تو یہ اُن خاندانی جان نثاروں کو جن کی کامگار سرپرستی کرتا تھا عزت کی نظر سے نہ دیکھ سکا، اس وجہ سے سب نے اس کی رفاقت چھوڑ دی گورنمنٹ کو موقع ملا، اس نے ان سب چھوٹے چھوٹے جاگیرداروں کو ڈرا دھمکا کر اپنا ہم خیال بنا لیا، یہاں تک کہ اس کی ریاست کا وزیر اعظم جانباز خاں جس کے حسن لیاقت پر کامگار کو بڑا ناز تھا، جس کی کارگذاریوں کو دیکھ کر شاہ عالم نے کامگار سے اس کی آرزو کی تھی، تو کامگار نے بادشاہ سے عرض کیا تھا کہ جہاں پناہ برساعد خود جز ایں شہبازے نہ دارم -

بادشاہ مُسکرا کر خاموش ہو گیا تھا - یہ بھی اقبال علی سے بد دل ہو کر اپنی جاگیر باقری برانان[1] جو کثرت استعمال سے بگری براون ہو گیا ہے چلا آیا -

جانباز خاں کے چلے آنے سے گویا اس کی ریاست کی جان نکل گئی - اب گورنمنٹ کے مطالبات شروع ہوئے - سب سے پہلے رسلے اور فوج کے برطرف کر دینے کا حکم ہوا، جس کو اقبال علی نے منظور کر لیا - اب کیا تھا میدان صاف ہو گیا، اس کے بعد خراج کا مطالبہ شروع ہوا، اب اقبال کی آنکھ کھلی، اس نے عذر کیا کہ یہ علاقہ ہمیشہ سے لاخراج چلا آتا ہے، مگر کچھ شنوائی نہیں ہوئی، اب اقبال علی نے اس حکم کے خلاف ورزی میں طرح طرح کی ریشہ دوانیاں شروع کیں، یہاں تک کہ دہلی وغیرہ کی خاک چھانی - انگریزوں کا غصہ اور بڑھتا گیا، یہاں تک کہ ایک دن وہ بھی آیا کہ

---

[1] لوگ بیان کرتے ہیں کہ جانباز خاں اور اس کے خاندانی بزرگ امام باقرؑ کی اولاد سے تھے، اس وجہ کر کامگار ان کو باقری برانان کہا کرتا تھا - اسی طرح خانخاناں کا خطاب اس کے سالار فوج قادرداد خاں عرف کالے خاں کو تھا، اس وجہ سے خانخاناں پور کے نام سے اس کی جاگیر مشہور ہوئی - واللہ اعلم

ان کو حکم سنا دیا گیا کہ تم سے ریاست کا انتظام چل نہیں سکتا، اس لئے تمہارا علاقہ ضبط کیا جاتا ہے۔ اقبال علی نے لاکھ سر پٹکا اور باب خراج کے لئے بھی آمادہ ہوا، مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ اسی غم میں تھوڑے ہی دنوں کے بعد اقبال علی واصل بحق ہوا۔

اس کے مرنے کے بعد گورنمنٹ نے بڑی کوششوں کے بعد بائیس ۲۲ مواضعات اس کے وارثوں کی جاگیر میں اور پانچ سو روپیہ کامگار کی بیوہ کو جو اس وقت تک زندہ تھیں اور تین سو روپیہ اقبال علی کے خورد سال بچے کے نام وظیفہ ماہ بماہ دینا منظور کیا، جو ایک مدت تک ملتا رہا۔ اسوقت کامگار کا مقبرہ قابل توجہ ہے، آثار قدیمہ کے چند افسران اس مقبرہ کو ایک بار دیکھ بھی گئے ہیں۔ مگر کچھ اثر ظاہر نہ ہوا۔

کامگار خاں اور تاریخ سیر المتاخرین | کامگار خاں کو تاریخ سیر المتاخرین میں کس لباس اور انداز میں پیش کیا گیا ہے، اس کا اندازہ لگانے کے لئے ذیل کی سطروں پر نگاہ ڈالیں:۔ غلام حسین مصنف سیر المتاخرین اور ان کے پدر بزرگوار نواب ہدایت یہ دونوں باپ بیٹے اس جنگ میں جو شاہ عالم کامگار کی امداد سے انگریزوں اور حکومت بہار سے لڑا، کامگار کے خلاف حریف جنگ بنا کر کھڑے کئے گئے تھے۔ غلام حسین تو بہ نفس نفیس خود شریک جنگ تھے، وہ خود لکھتے ہیں کہ میرے پاس اس جنگ میں سامان اور آلات حرب تک نہیں تھے، مگر میجر کارنک نے سب کچھ مہیا کر دیا تھا۔[1]

ان کے شریک جنگ رہنے کی غرض یہ تھی کہ ان کی جاگیر جو مونگیر اور حسین آباد میں تھی اس وجہ سے ضبط کر لی گئی تھی کہ ان کے پدر بزرگوار بادشاہ کے ساتھ شریک جنگ تھے، انہوں نے حسب ایما گورنمنٹ انگلشیہ اپنے پدر بزرگوار کو بادشاہ کی رفاقت چھوڑ دینے پر مجبور کیا تھا اور کہا تھا کہ اب اس نادار بادشاہ سے آپ کے اخراجات پورے[2] نہیں ہو سکتے جو خود کامگار کا دست نگر ہے۔ اب آپ انگریزوں کا دامن پکڑیئے۔

نواب ہدایت علی کی بہت بڑی شخصیت تھی۔ اگر ان کو بادشاہ گر کہا جائے تو بیجا نہیں ہے۔ ان کے پورے القاب یہ تھے بخشی الملک نصیر الدولہ نواب سید ہدایت علی خاں اسد جنگ بہادر جنہوں نے بادشاہ کو بہار اور بنگال کی تسخیر پر آمادہ کیا تھا، یہ ہمیشہ دہلی میں رہتے تھے روانگی کے وقت جنہوں نے بادشاہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر بادشاہ کی ماں زینت محل کے سامنے بادشاہ کی امداد اور محافظت کا ذمہ لیا تھا[3]، ایسے باا ثر شخص کا سفر کی مصیبت میں یک بیک اپنے قدیم ولی نعمت کی رفاقت سے منہ موڑ لینا کس قدر قلق انگیز ہے۔ کاش اگر کامگار بادشاہ کے ساتھ نہ ہوتا تو بادشاہ کا کہاں ٹھکانا تھا۔

تاریخ کے مطالعے سے صاف پتہ لگتا ہے کہ نواب ہدایت علی کو بہار کی صوبہ داری کا سبز باغ دکھا کر بادشاہ کی رفاقت سے روکا گیا تھا ورنہ یہ دونوں باپ بیٹے اس کے لئے کوشاں تھے، اسی وجہ کر رام نرائن اور میر قاسم کی نظر میں بھی ان کی وقعت[4] نہیں تھی۔ جس وقت انگریز بادشاہ سے صلح کر رہے تھے، میر قاسم نے اسی ڈر سے نواب ہدایت علی کو اس جلسہ میں آنے سے[5] روک دیا کہ کہیں ان کو انگریزوں

[1] ترجمہ سیر المتاخرین جلد دوم صفحہ ۳۸۴۔ [2] سیر المتاخرین جلد دوم صفحہ ۳۴۴۔ [3] سیر المتاخرین صفحہ ۳۲۶ و صفحہ ۳۶۲ و صفحہ ۳۸۳۔ [4] ایضاً صفحہ ۳۸۴۔ [5] ایضاً صفحہ ۳۸۸ و صفحہ ۳۸۹۔

کی طرف سے بہار کی صوبہ داری کا پروانہ نہ مل جائے۔ جب تک بادشاہ کا قیام قلعہ میں رہا، ان کو اس کے گرد بھٹکنے کی بھی اجازت نہیں ملی۔

ایک بار غلام حسین انگریزوں کے سب سے بڑے افسر سے رام نراین کی شکایت کرتے ہوئے یوں فرمانے لگے کہ رام نراین ہمارے والد کو آپ کی خدمت میں آنے سے اس خیال سے روکتا ہے کہ بہار کی صوبہ داری نہ آپ ان کے حوالہ کر دیں[1]۔

ان کارگذاریوں کے صلے میں جاگیریں تو ان کی واگذاشت ہو گئیں، مگر صوبہ داری کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔

کامگار سے نواب ہدایت علی کی ذاتی مخاصمت ایک بار بادشاہ نے نواب ہدایت علی کو مصلحتاً اپنے حضور میں طلب کیا مگر یہ انگریزوں کے خوف سے اپنی جاگیر حسین آباد سے نہ نکلے اور صاف انکار کر دیا کہ تا رفاقت کامگار میری شرکت کی امید نہ رکھیں۔ بادشاہ کو ان کی اس طوطا چشمی پر سخت حیرت ہوئی۔ کامگار اس ذلت کو کب گوارہ کر سکتا تھا، اس نے بادشاہ سے اجازت لیکر ان کی سرکوبی کے لئے، ان کی جاگیر پر یورش کرا دی۔ جب تاخت و تاراج شروع ہوئی تو انگریزوں سے اجازت لیکر دربار شاہی میں حاضر ہو کر معافی مانگی، اور اپنی چکنی چپڑی باتوں سے بادشاہ کو خوش کر لیا۔ بادشاہ بھی ان کو مصلحتاً کبیدہ کرنا نہیں چاہتا تھا، جب یہ رخصت ہونے لگے تو اسی نادار بادشاہ نے کئی ہزار روپے[2] کامگار سے پوشیدہ ان کے ہمراہ کر دئے۔ بادشاہ کی سیر چشمی اور ان کی یہ طوطا چشمی قابل داد ہے۔

کامگار اور خاندان صاحب سیر المتاخرین میں اس قسم کی شکر رنجی موجود تھی۔ اس کی نمایاں جھلک کتاب سیر المتاخرین میں بھی جا بجا نظر آتی ہے، چنانچہ مصنف سیر المتاخرین نے رقابت اور ذاتی مخاصمت کی بنا پر کامگار کے واقعات کی غلط ترجمانی کر کے حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ کامگار کی خوبیوں کو چھپایا ہے اور عیوب کو ظاہر کیا ہے۔ مگر پھر بھی دوررس نظرین ان ہی واقعات سے کامگار کی بلند شخصیت کا اندازہ لگا سکتی ہیں۔

غلام حسین تحریر فرماتے ہیں کہ کامگار خاں بہار کا ایک معمولی زمیندار تھا۔ ان کے نزدیک بہار میں سب سے بڑا زمیندار اس وقت پہلوان سنگھ[3] تھا، جس کے پاس بے حساب خزانہ اور لشکر تھا۔ اس کے بعد اگر کسی زمیندار کا درجہ تھا تو وہ بنیاد سنگھ متمنی سندر سنگھ کا تھا۔ مگر خود غلام حسین فرماتے ہیں کہ جب پہلوان سنگھ نے بادشاہ کی مدد کرنی چاہی تو بادشاہ نے اس کے پیشہ زمینداری کا خیال کر کے منظور نہیں کیا[4]۔ حالانکہ خود غلام حسین جیسا معتبر آدمی بادشاہ کے پاس پہلوان سنگھ کا پیغام لیکر گیا تھا۔

اسی طرح بنیاد سنگھ[5] اپنی فتنہ پردازیوں کی وجہ کر جب عتاب شاہی میں گرفتار ہوا تو وہ اپنی رہائی اور رسوخ کے خیال سے شاہی امداد کا وعدہ کرنے لگا، جس کی بادشاہ نے کچھ وقعت نہ کی۔

اب قابل غور امر یہ ہے کہ جب کامگار ان زمینداروں سے بھی کمتر درجہ کا تھا تو بادشاہ نے ایسے شخص کی رفاقت کیوں منظور کی۔

---

[1] ترجمہ سیر المتاخرین جلد دوم صفحہ ۲۶۴ - [2] ایضاً صفحہ ۳۷۵ - [3] ایضاً صفحہ ۴۴۲ - [4] ایضاً صفحہ ۴۴۴ - [5] ایضاً صفحہ ۳۷۴

دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ کامگار خاں کے منصب ہشت ہزاری اور اس کے خطابات کا ذکر سیر المتاخرین میں میری نظر سے نہیں گذرا، وہ تو بھلا کرے جناب سید حسن عسکری صاحب پروفیسر تاریخ پٹنہ یونیورسٹی کا جن کے مضمون سے پہلی مرتبہ اس کے خطابات شایع ہوئے اور اس سے اخذ کر کے جناب سید رضا قاسم صاحب مختار نے اردو میں منتقل کیا۔

جو لوگ شاہی منصب ہشت ہزاری کی اہمیت سے واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ منصب ہشت ہزاری کن لوگوں کو دیا جاتا تھا۔ معمولی زمیندار اور راجہ اس کا اہل نہیں سمجھا جاتا تھا۔

یہی وہ منصب ہشت ہزاری ہے کہ جس کو میر قاسم نے اسی شاہ عالم سے ہزاروں ہزار خرچ کرنے کے بعد حاصل کیا تھا اس کا تذکرہ سیر المتاخرین میں میر قاسم کے خطاب پانے کے باب میں موجود ہے۔ تیسرے یہ کہ بیچارے پہلوان سنگھ[۱] پر فقط اس جرم میں کہ اس نے شاہی رفاقت کا صرف خیال ظاہر کیا تھا، اس کی سرکوبی کے لئے فوج کشی کی گئی تھی۔ مگر کامگار نے اتنا بڑا جرم کیا، مگر پھر بھی اس کی طرف انگلی بھی اٹھائی نہیں گئی۔ ان واقعات کے ہوتے ہوئے پھر بھی کامگار کو معمولی زمیندار لکھنا کس قدر حقیقت پر پردہ ڈالنا ہے۔

اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ اس پر رکیک حملے تک کئے گئے ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "ایک روز کامگار اپنے خیمہ میں دن کے وقت عریاں خواب میں پڑا ہوا تھا"[۲] اس قسم کے حملے ایک مورخ کو کب شایان شان ہے۔

چند کامگار خانی آثار و عمارات کامگار خاں کے قلعے اور محل کے چند کھنڈروں کی منقش دیواریں اور برجیاں تا حال موجود تھیں، مگر اب ایک تودۂ خاک کے سوا کچھ نہیں۔

غدر کے بعد سے ایک مرد بھی اس خاندان کا ہسوہ میں نہیں رہا۔ جو ان کھنڈروں کی نگاہ داشت کرتا۔ جس نے چاہا بیدریغ کھنڈروں کے اینٹ اور پتھر سے مصرف لیا۔ عام طریق سے عمارت کے اینٹ اور پتھر کھد کھد کر بازار میں آتے اور بکتے۔ آج بھی جس کو ضرورت ہوتی ہے، اینٹ اور روڑے چنوا کر یا کھدوا کر بلا تکلف لے جایا کرتا ہے۔ خاصکر یہاں کے زمینداروں نے اس کا خوب خوب مصرف لیا۔

غدر کے بعد اس کے تمام افراد خاندان باغی قرار دے دئے گئے تھے، اور ان پر گرفتاری کا وارنٹ جاری تھا، یہ بیچارے خوف کے مارے بے سروسامان گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔ اور ایک عرصے تک جنگل اور پہاڑوں میں جان گنواتے اور منہ چھپاتے پھرے۔ جو جہاں گرفتار ہوتا پھانسی پر لٹکا دیا جاتا۔ سچ ہے مصیبت تنہا نہیں آتی۔

اسی زمانے میں ایک انگریز پادری اس علاقے میں تبلیغ مذہب کے لئے آیا ہوا تھا۔ ایک رات اس کو اور اس کے ساتھیوں کو کسی نے قتل کر ڈالا۔ یہ الزام بھی انہیں بیچاروں کے سر تھوپا گیا، حالانکہ یہ لوگ دونوں الزاموں میں محض بے قصور تھے۔ ان پر

---

[۱] ترجمہ سیر المتاخرین جلد دوم صفحہ ۳۵۲۔ [۲] ایضاً صفحہ ۳۵۳۔

الزام لگانے میں وہی زمیندار پیش پیش تھے جن کے ساتھ کامگار کا علاقہ بندوبست کیا گیا تھا - ان پر یہ انتہائے مصیبت کا زمانہ تھا ، اپنے بیگانے ہو رہے تھے - جن کے در پر پناہ کے خیال سے جاتے ، وہی ان کو حکومت کے حوالے کر دیتا - آخر اللہ نے کلکتہ کے ایک مشہور بنگالی پلیڈر کو ان پر مہربان کر دیا ، اُس نے بڑی کوششوں کے بعد ان کی جان بخشی کرائی - مگر پنشن سے ہاتھ دھونا پڑا - یہ تو تھا جملہ معترضہ ، اب رہے چند آثار اور عمارات ،

عام لوگوں میں کمدار کھانی کے الفاظ زبان زد ہیں ، جیسے کمدار کھانی راج ، کمدار کھانی گڈھ ، کمدار کھانی مسجد ، کمدار کھانی جاگیر وغیرہ وغیرہ

ہسوہ میں اس کی یادگار دو عمارتیں اب بھی موجود ہیں - ان میں سے ایک جامع مسجد ہے - جس میں چار پانچ ہزار آدمی بہ یک وقت نماز ادا کر سکتے ہیں - مسجد اب بھی اپنی پوری شان اور شوکت کے ساتھ موجود ہے ، مگر مسجد کا دروازہ بجلی کے صدمہ سے جس پر اس کے نام کا کتبہ لگا ہوا تھا گر گیا ، اب لوگوں نے ایک چھوٹا دروازہ اُسی اینٹ سے بنوا دیا ہے ، جو مسجد کی حیثیت سے بالکل بدنما ہے - مسجد کے صحن میں ایک بہت بڑا اور گہرا پانی کا حوض بنا ہوا ہے - اور اس میں فوّارے کے نشان بھی پائے جاتے ہیں مسجد کے بغل میں ایک بہت بڑا کنواں ہے ، جس سے نہ معلوم کس طرح حوض میں پانی حاصل کیا جاتا ہوگا ، کیونکہ حوض اتنا گہرا ہے کہ آدمیوں کے ذریعہ سے حوض کو برابر پُر رکھنا دشوار معلوم ہوتا ہے - مسجد کے حاشیہ میں چاروں طرف حجرے بنے ہوئے ہیں - نہ معلوم ان حجروں سے کون سا مصرف لیا جاتا ہوگا - مسجد کے متصل ایک افتادہ گڈھ بھی ہے - جس محلہ میں یہ مسجد واقع ہے اُس کو اُردو محلہ کہتے ہیں - جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں فوجی چھاؤنی ہوگی - اس محلے اور دوسرے محلّے کے درمیان ایک نالہ حائل ہے ، جس پر ایک پُل شکستہ حالت میں پایا جاتا ہے - جس کی تین محرابیں موجود ہیں ، اور دو شاید ٹوٹ گئی ہیں - اس مسجد کے اخراجات کے لئے ایک بہت بڑی جاگیر وقف تھی جو اب تلف ہو گئی - اس مسجد کی امامت اور تولیت اُس وقت سے آج تک ایک خاص خاندان کے ساتھ نسلاً بعد نسلٍ چلی آتی ہے - شاہ سبحان صاحب جو ہسوہ کی ایک مقتدر اور باا‌ثر ہستی ہیں ، انہیں کے مورثِ اعلےٰ ہمیشہ سے اس مسجد کے متولی اور پیش امام رہے ، اور آج بھی انہیں کی بدولت اس مسجد میں رونق رہتی ہے - آپ کا مکان مسجد کے متصل ہی ہے -

دوسری یادگار ہسوہ میں کامگار خاں کا مقبرہ ہے ، جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے - کامگار خاں کی دوسری مسجد نامدار گنج میں ہے جو ہسوہ کی مسجد سے کسی قدر چھوٹی ہے ، مگر اس کے مشابہ ہے - نامدار خاں کامگار کے بڑے بھائی کا نام تھا - نامدار گنج انہیں کے نام سے بسایا گیا ہے ، اور خود بھی شاید زیادہ تر وہیں رہتے تھے ، یہ دونوں مسجدیں شاید اس صوبہ میں اپنا جواب نہیں رکھتی ہیں - تیسری مسجد گیا بشن پد کے احاطہ میں ہے ، جس کا ذکر گذر چکا ہے -

اس علاقے میں بہت سے افتادہ گڈھ بھی پائے جاتے ہیں ، جس میں سے کچھ تو کامدار خانی کہلاتے ہیں ، اور کچھ دوسرے راجاؤں کے ہیں - کامدار خانی گڈھوں کی خاص علامت یہ ہے کہ اس میں سے چھوٹی چھوٹی شاہی گڈھیا اینٹیں برآمد ہوتی ہیں ، اور ہندو راجاؤں کے گڈھ کر بڑی بڑی موٹی اینٹیں برآمد ہوتی ہیں - و اللہ اعلم - اس خاندان کی زندہ یادگار میں اس وقت جناب راجہ عبد الحفیظ خانصاحب آنتی ، اد

انگریزی شاعری اور رومان

از جناب خواجہ عبدالقیوم ایم - اے، آنرس

آسمان کے چمکتے ہوئے ستاروں کی شعاع، آبشاروں کا میٹھا نغمہ، پہاڑوں کی خاموش فضا، خاموش دریا کے پانی کا ترنم، قدرت کی رنگینیوں کی بہار، ماہتاب کی سکون آمیز روشنی، ــــــ ان تمام چیزوں سے کون متاثر نہیں ہوتا؟ کون ایسا خاکی جسم ہے، جس کے اندر مناظر قدرت کا حسن سرایت نہیں کرتا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ انسانی زندگانی میں سب سے زیادہ حساس عمر، جوانی کی ہوتی ہے اور اسی وقت انسانی کیفیات پر فطرت کا رومان زیادہ رنگینی کے ساتھ منعکس ہوتی ہے۔ اور جذبات کی اندرونی تڑپ اور فطرت کی بیرونی کیفیات کا امتزاج اچھی طرح پیدا ہوتا ہے۔ تاہم اگر غائرانہ نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ احساس انسانی زندگی میں آغاز سے لیکر انتہا تک موجود رہتا ہے۔ ظاہری حسن اور اندرونی تخیل کے ملاپ ہی پر شاعری کی بنا ہوتی ہے، عالم آفرینش سے انسانی قلب میں خواہشات اور جذبات ہمیشہ پیدا ہوتے رہے۔ مٹی کے پتلے کو جس وقت سے اس کے آسمانی گھر سے نکال دیا گیا۔ اسی وقت سے آسمانی خیالات اس کے اندر ابلنا شروع ہوئے۔ دنیا میں مادی مصائب و آلام سے بچنے کے لئے انسان اپنے شاعرانہ خیالات میں پناہ لیتا رہا۔ انسانی دماغ اس دنیا کی تنگ اور محدود مادیت میں نہ رہ سکا۔ اور وہ ایسی جگہ جا بسا جہاں کی تمام چیزیں اس کی نظر میں مسرت اور حسن میں رنگی ہوئی تھیں، جہاں انبساط کی حکومت تھی اور حزن وملال کا نشان تک موجود نہ تھا۔ یعنی دوسرے لفظوں میں شاعری کی سرزمین پر پہنچنے کے بعد انسان کی تمام مشکلات دور ہو گئیں۔ انسان کو شاعری کے تخیل میں سکون کیوں نصیب ہوا۔ یہ اس رومان کا نتیجہ ہے جس کا عنصر کچھ نہ کچھ مقدار میں ہر شاعر میں پایا جاتا ہے، اور ہمیں وہی شاعری زیادہ مرغوب ہوتی ہے جس میں اس کا سب سے زیادہ حصہ موجود ہے۔ رومان کا کچھ نہ کچھ حصہ انگریزی ادب میں سنہ ۵۰۰ عیسوی سے لیکر اب تک ہمیشہ رہا ہے۔ لیکن ہمیں اسوقت انگریزی ادب کی اس عمر سے بحث ہے جس میں رومان صرف کلی ہی نہیں رہا، بلکہ کھل کر ایک حسین پھول بن گیا۔

انگریزی شاعری کا عروج تقریباً سنہ ۱۷۸۰ء سے لیکر سنہ ۱۸۵۰ء تک قایم رہا۔ یہی وہ زمانہ تھا جس میں رومان کی نشوونما ہوئی، جس نے اپنی ارتقا کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب کو بھی ترقی دی، اٹھارویں صدی نثر کی ترقی و ترویج کیلئے گویا وقف تھی۔ یہ عمر انگریزی ادب میں Augustan Age کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ ڈرائیڈن (Dryden) پوپ (Pope) اور جونسن (Johnson) شاعری کے قواعد و قوانین میں محدود تھے۔ شاعرانہ جذبہ ان پر اس قدر غالب نہ تھا جتنا کہ اسے ظاہر کرنے کی زبان۔ ان میں ایلزبتھ (Elizabeth) کے وقت کا ادبی جوش و خروش مفقود

تھا۔ شیکسپیر کے ادبی کمال کی جھلک تک ان میں دکھائی نہ دیتی تھی، وہ صرف اپنے خیالات کو خواہ وہ کتنے ہی فرسودہ اور پرانے کیوں نہ ہوں، اچھے رنگ میں رنگنا چاہتے تھے۔ انہیں جسم کی بنسبت کپڑے کا زیادہ خیال تھا، ۱۷۱۶ء میں ٹامس گرے (T. Gray) پیدا ہوا اور اس نے اپنی Elegy دنیا کے سامنے پیش کی، اسی زمانہ کے لگ بھگ رومانی شاعری نے اپنا جنم لیا اور انگریزی ادب میں ایک انقلاب پیدا ہوا۔ رومانی شعراء قوانین کے تنگ دائرہ کو چھوڑ کر تخیل کی لامحدود فضا میں داخل ہوئے۔ اُن کی نظر میں شاعرانہ خیالات کو چند قوانین میں جکڑ دینا شاعری کو بیڑیاں دینے کے برابر ہے۔ اُن کا دماغ پہلے تو شہری زندگی اور اس کے لوازم سے جکڑا ہوا تھا۔ اب اُن کے سامنے فطرت کی کشادہ وادی تھی جس نے رفتہ رفتہ ان کے خیالات کو اپنے حسن میں مرکوز کر لیا۔ اٹھارویں صدی کی شاعری کے سامنے ایک خاص اصول تھا، جس کی پیروی کرنا ہر شاعر کا فرض تھا لیکن اب انفرادیت کا دور آیا اور ہر شاعر نے اپنے خیالات کو آزادانہ طور پر اپنے رنگ میں پیش کرنا شروع کیا۔ چنانچہ انواع و اقسام کی شاعری پیدا ہو گئی۔ پہلے کی طرح اب ایک ہی ڈھانچہ نہ تھا۔ بلکہ مختلف دماغوں نے شاعری میں مختلف شکلیں پیدا کیں زمانہ کی رفتار نے اب ہر شاعر کے ہاتھ میں ایک مختلف قسم کا پیمانہ رکھ دیا اور وہ اپنی شراب کو اپنی انداز طبیعت کے موافق پینے لگا۔

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است اینجا
قسمتِ بادہ باندازۂ جام است اینجا (اقبال)

چنانچہ انگریزی شاعری کو ایک کافی وسعت حاصل ہو گئی جو اسے اٹھارھویں صدی میں نصیب نہ تھی۔

رومان کا مفہوم کیا ہے، اور اُس کے کون کون سے پہلو ہیں، یہ سوال انگریزی ادب میں ایک ضروری اہمیت رکھتا ہے۔

بیدار، احساسات اور تیز تخیلاتی جذبات کی ادبی الفاظ میں ترجمہ کرنے کا نام رومان ہے، تعجب اور جذبۂ حسن کا امتزاج رومان کا ایک ضروری عنصر ہے۔ پیٹر (Pater) کا خیال ہے کہ "حسن کی خواہش ہر ادبی محکمہ میں ہونا ضروری ہے، اس کے ساتھ جب تعجب کے عنصر کا اضافہ ہوتا ہے تو رومان جنم لیتا ہے۔ رومان کے اس جذبہ کے ماتحت شاعر انسانی تجربات کو نئی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اصلیت اُس کی نظروں میں ایک جداگانہ رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ رومان اصلیت کے خلاف نہیں، بلکہ یہ اصلیت کے ساتھ تخیلات اور احساسات کو ملا کر اسے ایک حسین چیز بنا دیتا ہے اور حقیقت ایک روحانی جامہ پہنے ہوئی معلوم ہوتی ہے، معمولی سے معمولی چیزیں شاعر کے اعلیٰ دماغ کے زیر اثر ایک نیا رنگ اختیار کر لیتی ہیں۔ بوڈلیر (Baudelaire) کا خیال ہے کہ نوع کے بعض غیر معمولی لمحات میں زندگی کی گہرائیاں تمام چیزوں میں معلوم ہوتی ہیں خواہ وہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہوں" فطرت کے معمولی سے معمولی مناظر کو حسین بنا دینا یہ صرف رومان ہی کا حصہ ہے۔ رومانی شاعر قوت کی تمام کیفیات کو اپنے اندر جذب ہونے دیتا ہے، اور اس کے بعد وہ اسی چیز کو ایک نغمہ کی طور پر باہر نکالتا ہے، تھوڑی دیر کے لئے اُسے اپنے خودی کے احساس کو چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ کیونکہ اُس کے دل میں فطرت کے سرایت ہونے میں یہ ایک زبردست

رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔

رومان کا صحیح مفہوم سمجھنے کیلئے ضروری یہ ہے کہ چند مدبر خیالات کو سامنے رکھ کر نتیجہ پر پہنچا جائے۔ ایم ۔ ڈی سٹیٹ (M. de stait) کا خیال ہے کہ رومان خود بینی کی ایک عادت کا نام ہے جسے عیسائیت نے پیدا کیا تھا۔ یہ دنیاوی چیزوں کو ایک غیر فطری روشنی میں ظاہر کرتا ہے اور اس کی رُو سے دنیا کو ایک گہرے ذاتی جذبہ کے ماتحت دیکھا جاتا ہے۔"

شلیگل (Schlegel) کے نکتۂ نظر سے رومانی شاعری لامحدودیت کو ارتسام کے ذریعہ ظاہر کرتی ہے، اس کا خمیر گہرے جذبہ اور غیر محدود خواہشات سے بنا ہے۔ اور اس سے تمام چیزیں ایک دھندلے اور تحیر کن طریقہ پر پیش کیجاتی ہیں"

برنتیر (Brunetiere) کے زاویۂ نگاہ میں رومانی خودی کی آزادی کا نام ہے جس میں روسیو (Rosseaue) اور فیکٹ (Fichte) کے خیالات ملے ہوئے ہیں۔

ہیوگو (Hugo) رومان کو ادب میں آزادی کی ایک لہر تسلیم کرتا ہے۔

ہین (Heine) رومانی ادب کو زمانۂ قدیم کے ساتھ منسلک کرتا ہے، اس کی نظر میں رومان ایک غیر محدود فضا اور روح کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس طرح اس میں ارتسام (Symbols) کی موجودگی ضروری ہے جن کی وجہ سے اس میں تصوف اور تحیر آمیز پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس ادب کی رُو سے رُوح کو مادیت پر فوقیت حاصل ہے۔

ٹی۔ ڈبلیو ڈنٹن (T.W. Duntun) رومان کو تحیر کا Renaissance یعنی نشأۃ الثانیہ خیال کرتا ہے۔ ان تمام خیالات کا صحیح تجزیہ کرنے سے ہم رومان کا صحیح مفہوم سمجھ سکتے ہیں۔

رومان نے انگریزی شاعری میں جذبات کی گہرائی اور وجدانہ سرور پیدا کیا جو بلیک (Blake) کالرج (Coleridge) ورڈسورتھ (Wordsworth) اور شیلے (Shelley) میں پایا جاتا ہے۔ اس جذبہ کے زیر اثر تمام معمولی چیزوں کو حسین، اکمل اور سکون آمیز قرار دیا گیا۔ منجمد قوانین اور آزاد شدہ خودی کے تصادم سے جو نئے خیالات پیدا ہوئے وہ انہی رومان کے مرہون منت ہیں۔ رومان نے انسان کے سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کیا۔ اور مصنوعی اصول کو پس پشت ڈال دیا۔ نئے روشنی کے متوالے شاعروں نے بہت جلد ہی پرانی وضع کو چھوڑ کر اس کا خیر مقدم کیا، اور اسے اپنے خیالات کا سرچشمہ تسلیم کر لیا۔ انسانی رُوح پہلے قدرت کی چیزوں کے ساتھ اتنا ہمدردانہ سلوک نہ رکھتی تھی، جتنا اُس نے اب رکھنا شروع کیا۔ شاعر کا دماغ قدرت کی ظاہری اہلیت جائزہ کر لینے سے ہی مطمئن نہ ہوا۔ بلکہ اس نے اس کی تہ تک پہونچنے کی کوشش کی، رومان کی اس نئی روشنی نے ایک روحانی رجحان اختیار کر لیا، جس کی وجہ سے شاعر نے یہ سمجھنا شروع کیا کہ اس مادی دنیا کا مفہوم مادی نہیں بلکہ روحانی ہے، اور دنیاوی مادیت کے باوجود ایک غیر محدود روح یہاں موجود ہے۔

اٹھارویں صدی میں فطرت کا مناظر صرف بیان کر دیئے جاتے تھے۔ شاعر انہیں اچھا سا اچھا لباس پہنانا جانتے تھے، مگر اس روحانی جذبہ کے ماتحت شاعروں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور صرف قدرت کی عکاسی ہی نہیں کی بلکہ انہوں نے قدرت کی

اندرونی طاقتوں کو بھی ظاہر کرنا شروع کیا۔ مناظر فطرت کی صحیح صحیح ترجمانی کی جگہ اب ایک حقیقت بیں مصوری نے لے لی۔ شاعروں کے دماغ اب ایک خیالی حسن کی تلاش کرنے لگے، اُن کے کلام میں فلسفیانہ انداز، انفرادیت اور ایک تخیلاتی دنیا کی تلاش پائی جانے لگی، رومانی شعرا ر مصوری، جذباتی جوش، خیالات اور حسیات کی زیادتی میں منہمک رہنے لگے۔

اس عہد میں جتنے بھی شعراء ہوئے، اُن سب کے کلام کو پڑھنے کے بعد جو اثر ہمارے دماغ پر حاوی ہوتا ہے، وہ اُس دُھند کی مانند ہے جو چمک رہی ہو یا اُس چمکتی ہوئی شعاع کی طرح ہے جس پر ایک دھند چھائی ہو۔

تخیلات اور جذبات کا امتزاج ایک ایسی عجیب دنیا پیدا کر دیتا ہے جو ہماری دنیا سے بہت مختلف ہے۔ بلیک، شیلے اور کیٹس کی شاعری کو پڑھنے کے بعد ہماری نظروں میں ایک مختلف دنیا کی کیفیات رقص کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ شیلے ایک تخیلاتی محبت کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہا۔ اُس کا تخیل دوسرے شعراء سے بہت انوکھا ہے۔ اُس کی نظر میں شاعری اُن غیر فانی خیالات کی مظہر ہے جو ایک ایسی رنگ برنگ اور بار بار اُٹھنے والی نقاب کے در پردہ چھپے ہوئے ہیں جسے ہم اصلیت یا زندگی کے نام سے ملوث کرتے ہیں۔

کیٹس (Keats) نے ایک تخیلاتی حسن کی تلاش کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دے دیا تھا۔ اُس کے خیال میں شاعری حسن، صداقت اور دائمی راحت کا مجموعہ ہے۔ ورڈسورتھ نے فطرت کے تمام مناظر کو اپنے اندر اچھی طرح جذب کر لینے کا قصد کر لیا تھا۔ اس کی زندگی کا لب لباب ایک ایسی شاعری کی روح تھی، جس میں راحت و انبساط، اطمینان قلب، خیالی خوشی اور فطرتی پاکیزگی پائی جاتی ہو۔ اُس کے نقطۂ نظر میں شاعری ہی علم کی روحِ رواں ہے، اور نہ مٹنے والے خیالات کا اظہار صرف شاعری ہی کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے۔ گویا ہر شاعر نے اپنی ایک الگ دنیا بسائی تھی، اور وہ اسی میں مگن تھا۔ اٹھارویں صدی کے شعراء کی طرح اُن کی ایک دنیا نہ تھی۔ وہ خیال کے ایک دائرے میں مقیّد نہ تھے، بلکہ انہوں نے اپنی شاعری کے مختلف دائرے مقرر کر لئے تھے۔ اُن کے تخیلات مختلف آئینوں سے گذر کر مختلف رنگ میں رنگے جاتے تھے، شکسپیر (Shakespeare) پھولوں اور آبشاروں کو وہی خیال کرتا تھا جو ایک عام انسان سمجھتا ہے۔

ٹینیسن (Tennyson) کے مصورانہ خیال میں قدرت کے مناظر اُس پردہ کے مانند تھے جس کے سامنے انسانی جذبات کھیلا کرتے ہیں۔ انسانی حیات اُس کی نظر میں ایک ایسی تصویر کے مانند تھے جس کا پس منظر قدرت کا ظاہری نظارہ ہو۔ مگر رومانی شعراء اس سے بھی آگے بڑھے، ورڈسورتھ نے اگر قدرت کے دل میں ایک سکون آمیز خیال اور ایک استغراقی کیفیت پائی تو شیلے کے خیال میں فطرت ایک جوش بھری محبت کی بستی ہے جس کی تمام چیزیں محبت کے ایک ایسے رشتہ کے ساتھ منسلک ہوں جس سے یہ کبھی الگ نہیں کی جا سکتیں۔ اسی طرح ہر شاعر نے قدرت کو ایک مختلف شکل میں دیکھنا شروع کیا۔

یہ کہنا غلط ہے کہ شکسپیر اور ٹینیسن کو فطرت سے اتنی محبت نہ تھی جتنی کہ رومانی شعراء نے ظاہر کی۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ فطرت کو جس زاویۂ نگاہ سے شکسپیر نے ملکہ ایلزبتھ کے زمانہ میں دیکھا اور جس نگاہ سے ٹینیسن نے ملکہ وکٹوریہ کے زمانہ میں اسے ملاحظہ کیا وہ شیلے، کیٹس اور ورڈسورتھ کے زاویۂ نگاہ سے بہت مختلف تھا، بعد الذکر نے فطرت کے نظارہ کے ساتھ تعجب کا عنصر کچھ اسی طرح ملایا کہ وہ ایک عجیب دنیا کی چیز بن کر ہماری

انھوں کے سامنے آئی اور ہمیں ایک ہلکا سا احساس ہوا کہ ہم کوئی غیر معمولی چیز کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ فطرت کی اس نئی چیز نے جو رفتہ رفتہ ارتقا حاصل کیا، وہ ہمیں اُسی وقت صحیح طور پر درجہ بدرجہ معلوم ہو سکتا ہے۔ جب ہم ٹامسن (Thomson) کے "Seasons" کو پڑھنے کے بعد بلیک کی تصوف بھری فطرت نگاری کو دیکھیں۔ اُس وقت ہمیں انگریزی ادب میں ایک معرکۃ الآرا تبدیلی کا احساس ہوگا۔ پہلے صرف فطرت کے حسن کو اکیڈمی وشاعرانہ انداز سے بیان کر دیا جاتا تھا۔ مگر اب رومان کی آمد سے شاعر فطرت سے بالکل مسحور معلوم ہوتے تھے۔ اور یہ سحر اُن کی رگ رگ میں سرایت کر گیا تھا۔ صرف فطرت نگاری ہی میں رومان نے ایک تغیر برپا نہیں کیا، بلکہ عمرانی مسئلوں میں بھی زندگی کو پاکیزہ بنانے کی کوشش کی گئی، اور انسان کی روحانی طاقت کو فضیلت دی گئی۔ روسیو (Rousseau) کی تصانیف اس بات کی شاہد ہیں، اُن سے ہمیں رومان کے اس پہلو کا کافی ثبوت مل جاتا ہے۔

زندگی کی جز و بین اور سادگی کی محبت اسی رومان کی پیداوار ہیں جو اُس زمانہ میں پائی جاتی ہیں۔ شعرا اور نثر نگار، دونوں نے تہذیب کی گتھیوں اور شہری پیچیدگیوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اور سادہ زندگی اور اس کے بکار لوازم کو چھوڑ کر شعرا فطرت کے حسین لمحات کی طرف متوجہ ہوئے۔ چنانچہ بلیک اور ورڈسورتھ نے بچپن کو ایک تخیلاتی رنگ میں پیش کیا۔ ورڈسورتھ، برنس (Burns) اور کالرج نے فطرت کی سادگی کو ہی اپنی شاعری کی کسوٹی تسلیم کیا۔ رومانی شعرا فطرت کے معمولی سے معمولی نظارہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ بلبل کا نغمہ، پہاڑوں کی سیر، شفق کا نظارہ، ایک دیہاتی لڑکی، مغربی ہوا، انہیں تمام مناظر کا نتیجہ تھا کہ انگریزی ادب میں ورڈسورتھ، کالرج، شیلے، کیٹس، اور بائرن جیسی ہستیاں پیدا ہوئیں، جنھوں نے فطرت کے نقش و نگار کو ایک بولتی ہوئی تصویر میں تبدیل کر دیا۔ بقول سیمونائڈس (Simonides) کے جس کی نظر میں شاعری ایک بولتی ہوئی تصویر ہے اور مصوری ایک خاموش شاعری۔

انگریزی شاعری کا یہ شباب وکٹوریہ کے تخت پر بیٹھتے ہی ختم ہو گیا۔ اور اُس کے بعد شاعری میں وہ جوش و خروش باقی نہ رہا۔ ٹینیسن اور براؤننگ (Browning) کے باوجود انگریزی شاعری کو وہ عروج حاصل نہ ہو سکا جو اُسے رومان کی وجہ سے دستیاب ہوا تھا اور اس ریگستان میں بھی اب ایک ایسا ہیرا انگلستان پیدا نہ ہو سکا جو رومان نے اٹھارویں صدی کے بنجر زمین سے پیدا کیا تھا۔

ملکہ وکٹوریہ کا ادبی دور کچھ ایسا دور تھا، جہاں سے ہمیں ورڈسورتھ کی دیہاتی لڑکی (The Solitary Reaper) کے نغمے کی دھیمی سی دھیمی آواز بھی سنائی نہ دیتی ہو۔ قدرت کی جس آواز کو شیلے، کیٹس اور بائرن نے اپنے اندر جذب کر لیا تھا، وہ اب مدھم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گئی تھی، بربط موجود تھا، مگر اس کے تاروں کو وجدانہ سرور میں چھیڑنے کے لئے اب کوئی نظر نہ آتا تھا۔

سید ضمیر الحق قیسؔ آروی

اور جذباتِ قیس

جناب سید غلام ربانی صاحب عظیم آبادی

سید ضمیر الحق قیسؔ آروی ایک جید عالم جید طبیب حاذق شاعر کامل تھے۔ حضرت شمشاد لکھنوی سے انہیں شرف تلمذ حاصل تھا۔ وہ یکم مارچ ۱۸۶۴ء ۱۲۸۰ھ کو پیدا ہوئے ان کے جدی مورث اعلیٰ سید یوسف سدلیپوری (سید یوسف پوری) تھے جو سادات بہار میں ممتاز درجہ رکھتے تھے اور حضرت خواجہ معین الدین سنجری چشتیؒ سے ننہیالی رشتہ ملتا ہے۔ تعلیم و تربیت محلہ کے مکتب میں ہوئی۔ فارسی کی درسیات کی تکمیل اپنے والد جد کی۔ فارسی کی تکمیل کے بعد یکسو ہوکر عربی کی طرف توجہ کی۔ ۱۸۸۱ء میں مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور میں جو اس زمانہ میں علوم مشرقی کا بہت بڑا مرکز تھا داخل ہوئے۔ غازی پور اُن دنوں حضرت علامہ عبدالاحد شمشاد فرنگی محلی کے وجہ سے "رشک اودھ" ہو رہا تھا ہر طرف شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ مولنا عبدالرحمٰن بقاؔ غازی پوری و مولانا ظہیر احسن شوق نیموی بھی اسی مدرسہ میں پڑھتے تھے۔ اور یہ دونوں حضرت قیسؔ کے ہم سبق تھے۔ حضرت قیسؔ کو درسیات کے ساتھ شعر و سخن سے بھی شغف رہا۔ غازی پور سے مولانا ابوالحسنات عبدالحی فرنگی محلی کے یہاں بغرض تحصیل چلے آئے اور فلکیات و ملا حسن کامل کی تکمیل کی۔ اور مولانا فضل الرحمٰن فرنگی محلی سے رسالہ میر زاہد جلال پڑھی۔ چند وجوہات کی وجہ سے پھر مدرسہ چشمۂ رحمت میں داخل ہوئے اور مولانا عبداللہ غازی پوری سے درس نظامیہ کی تکمیل کی۔ ۱۸۸۵ء میں مدرسہ سے فارغ التحصیل ہوکر اسی سنہ میں حضرت مولانا سید نذیر حسن دہلوی کے حلقہ درس میں شامل ہوگئے۔ ۱۸۸۶ء میں بعد حصول سند و اجازۃ آرہ چلے آئے۔ رئیس الاطبا حکیم عبدالسلام دہلوی سے فن طب حاصل کیا بعد فراغت وحصول سند آپ برابر آرہ ہی میں مطب و تدریس احادیث و طب میں مصروف رہے۔

آپ کو بچپن ہی سے شعر و سخن سے ذوق تھا اور طبیعت بھی اچھی پائی تھی جب مجلس مشاعرہ میں شریک ہوتے تو اپنے کلام سے سامعین کو متاثر کئے بغیر نہ رہتے پڑھنے کا انداز بھی بہت اچھا تھا اور طبیعت بھی اچھی پائی تھی لیکن حد درجہ منکسر المزاج تھے ہمیشہ نام و نمود شان و شوکت سے نفرت رہی اپنے کلام کے استحفاظ کا مطلق خیال نہ رکھا دو چار غزلیں اس بیاض پر ہیں تو پانچ سات اس سفینہ پر کچھ غزلیں ردی کی ٹوکریوں میں پڑی ہیں تو کچھ مختلف طور پر مختلف کتابوں کے اندر۔ آپ کے احباب و اُستاذ علامہ شمشادؔ ترتیب دیوان کے لئے اصرار کرتے رہے لیکن آپ برابر ٹالتے رہے علامہ شمشادؔ

نے ایک گرامی نامہ میں فرماتے ہیں

.......تم نہایت کاہل الوجود ہو اپنے کلام کی قدر نہیں کرتے میرے بہت سے نومشق شاگردان صاحب دیوان ہو گئے۔ جن کے دیوانوں میں شاید ہی پانچ پانچ سات سات اچھی غزلیں ملیں تو ملیں اور تم کہنہ مشق بلکہ استادی کے درجہ پر پہونچ کے بھی اپنا کلام شائع نہیں کرتے۔ اگر شائع کرتے تو تم کو معلوم ہو جاتا کہ تمہارا کلام کس قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

۱۳۵۰ھ میں آپ کے سفر حجاز کا سامان ہونے لگا تو آپ کے احباب وغیرہ نے بہت تقاضا کیا کہ ترتیب دیوان کے جائیں۔ بدقت تمام راضی ہوئے بہت سی غزلیں ضائع ہو چکی تھیں۔ بعض ایسی بوسیدہ حالت میں ملیں جن کا پڑھا غیر ممکن تھا۔ جو ملیں اسکو اپنی نگرانی میں ترتیب دلوانا شروع کیا۔ ترتیب کا تھوڑا کام باقی رہ گیا تھا کہ سفر حجاز کی انکی کا وقت آگیا۔ آپ نے فرمایا اگر خیریت سے آگیا تو ترتیب پوری کر دوں گا۔ ورنہ مسالہ تیار ہے ترتیب دلوا کر آرزو پوری کر لینا۔ ۱۳۵۱ھ محرم میں مکان آگئے اور باقی ماندہ ترتیب کو پورا کیا۔

توسط اگست ۱۹۳۵ء میں دیوان زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ افسوس کے ایک ماہ بعد یعنی ۲۹ ستمبر ۱۹۳۵ء آپ کا وصال ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰهِ اِنَّا عَلَیْهِ رَاجِعُوْنَ

اس دیوان کا تاریخی نام "بہارستان خلد" معروف بہ "جذبات قیس" ہے کتابت طباعت دیدہ زیب کاغذ سفید ۲۸ پونڈ سر ورق نہایت خوبصورت تقطیع ۲۲x۲۰/۸ ضخامت تقریباً سوا چار سو صفحات سنار ا ہند پریس منیا لورلین نمبر ۲۵ کلکتہ میں طبع ہوا ہے۔

شروع میں مولانا عبدالرؤف عشرت لکھنوی کا مبسوط مقدمہ ہے جس میں حضرت عشرت نے اردو زبان کی تخلیق اور اس کی ارتقائی حالت، دہلی کے بعد لکھنؤ کا مرکز اردو قرار پانا اور اس کے عروج و زوال کی داستان اور کلام قیس پر تبصرہ جو معلومات سے پر اور قابل دید ہے۔

اس کے بعد اپنے استاذی شمس العلماء مولانا سید نظیر حسن دہلویؒ کی شان میں قصائد تحریر فرمائے تھے درج ہیں۔ اسی حصہ میں کچھ عرض حال و مناجات ہیں

دیوان زیادہ تر غزلوں پر مشتمل ہے۔ رباعیاں خمسے اور قطعات بھی ہیں

کلام قیس کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کلام قیس میں تشبیہ و استعارے محاکمات شکل طرحوں میں ردیف کو چمکانا اور حلاوت سخن، نزاکت تخیل کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے آپ اپنے استاد کے مسلک کے موافق رشک و منیر کے قواعد سے وابستہ ہیں اور تمام متروکات کے تارک ہیں۔ دیوان کی پہلی غزل میں حمد کا مطلع کیا خوب ہے

ہے جلوہ تیرا طور ہی پر نہیں تو توقف ‌‌نظارا تیرا   چشم بینا ہو تو ہر شے میں

کعبہ تیرا ہے تیرا دیر کلیسا تیرا   تیری راتیں ہیں تیرے دن ہیں زمانہ تیرا

چند اشعار حلاوت سخن کے ملاحظہ ہوں۔

یاس کہتی ہے کہ غم سے رہائی دشوار۔   آس کہتی ہے نصیب آب تجھے راحت ہوگی

آپ نازاں ہے اپنی صورت پر۔   خود صنم خود ہی وہ برہمن ہے

پھوڑتے ہیں دشت غربت میں پھپھولے خار سے   یاد آتا ہے مزا جب نشتر فصاد کا

نوک مژگاں نے کھٹک لی ہے سنان و تیر سے   تیغ ابرو میں ہے عالم خنجر فولاد کا

خوشبو نکل رہی ہے مرے دل کے داغ سے   شاید یہ پھول ہے تیرے پھول کے ہار کا

قفس میں کہتی ہے رو رو کے یوں بلبل   دکھا دے باغ میں چل کر مرے اجڑے نشیمن کو

نہ دیتے دل اگر تم کو تو کیوں پھنستے مصیبت میں   یہ سچ ہے آدمی برباد ہوتا ہے مروت میں

محبت کیا بلا ہے عاشقی کس شئے کو کہتے ہیں   یہ آگے چل کے سمجھوگے ابھی عالم ہے بچپن کا

نزاکت تخیل ملاحظہ ہو۔

پہونچا سرے نیاز جھکاتے ہی عرش پر   اللہ رے عروج تیرے خاکسار کا

وصل میں چپیں بہ جبیں مجھ سے نہ ہوتا کوئی۔   منہ سے منہ پیار سے ہنس ہنس کے ملاتا کوئی

کاش مجھ کو بھی خداوند دکھاتا وہ دن   قسمیں دے دے کے مئے ناب پلاتا کوئی

بار گیسو سے بل نہ آجائے   دیکھ طاقت تیری کمر میں نہیں

ہنگامۂ محشر میں تیری ناز کی حیا لیں۔   کب ان سے زمانا تہ و بالا نہیں ہوتا

تم لاکھ چھپو ہم سے مگر چھپ نہیں سکتے   پہونچے گی نظر چاند کے دیوار بھی در بھی

کھینچنا چاہیں اگر تصویر میرے یار کی   رنگ مانی کا اڑے ٹوٹے قلم بہزاد کا

معشوق کے دانتوں کو دیکھکر گوہر پانی پانی ہوگیا تشبیہ ملاحظہ ہو۔

جب تیرے دانتوں کی آب و تاب کی دیکھی چمک   پانی پانی شرم سے اے یار گوہر ہوگیا

دانتوں کی تعریف میں دوسرا شعر کیا خوب ہے۔

صفائی دُر دنداں جاناں سنے دم خندہ   غرق بحر خجلت کردیا ہیرے کی معدن کو

تیرے دانتوں سے کیا مقابل ہوں۔   یہ صفائی در و گہر میں نہیں

معشوق کو مٹی کی مورت سے یوں تشبیہ دی۔

ہر ایک کو کھینچ لیتا ہے وہ شوخ اپنی محبت میں   خدا کی شان یہ تخسیر مٹی کی مورت میں

معشوق کے خط و خال کی تعریف میں ایک اور شعر ملاحظہ کیجئے۔

چہرا ہے چاند ابرو ہے باریک موج حسن
ہر ناخن بریدہ تمہارا ہلال ہے

فراق و وصال کے تاثرات عجب انداز سے بیان فرمائے ہیں۔

ہم نے کیوں مفت محبت میں سر اپنا پھوڑا
ہائے اس بت کا تو ماتھا بھی نہ ٹھنکا ہوگا

اُٹھا ہیں بزم یار سے دل کو تھام کر
اغیار نے بھی دیکھ کے آنسو بہا دیا

کس طرح بیخودی میں نہ ہو فاش راز دل
ممکن نہیں کہ درد اُٹھے آنکھ تر نہ ہو۔

میرے صبر کا حال مجنوں نے سنکر
کہا عشق میں مرد کامل یہی ہے۔

ہائے یہ وصل میں رہ رہ کے کسی کا کہنا
صبح ہوتی ہے تیری موت چلی آتی ہے

دیکھو اسے شوق نہ رہ جائے تمنا دل میں
شرم ہی میں یہ شبِ وصل کٹی جاتی ہے

انداز محاکمہ ملاحظہ کیجئے

ابروؤں میں بل ڈال کر مجھسے برہم کیوں ہوئے
رشتۂ الفت نہ کاٹو دم شمشیر سے

وہ سن کر میرے نالے یوں تنک کر غیر سے بولے
ذرا پوچھو تو یہ کمبخت کیوں فریاد کرتا ہے

میں نے بلائیں لیں تو جھٹک کر وہ بول اُٹھے
ٹوٹیں تمہارے ہاتھ ہیں یہ کس بلا کے ہاتھ

واعظ سے چھیڑ چھاڑ بطور طنز

قاضی سے دخت رز ہوئی سرگرم اختلاط
جنت کی حور بن کے پڑی پارسا کے ہاتھ

میرے نیک و بد سے اے واعظ نہ کر تو چھیڑ چھاڑ
مسلک آزادانہ ہے مذہب میرا رندانہ ہے

شوخی کلام ملاحظہ کیجئے۔

انگیا مسک گئی ہے تو ڈرتے ہو کس لئے
آنچل گرا لو جسمیں کسی کو خبر نہ ہو

فلک کج رفتار سے شکوہ

نہ چشم وفا رکھ تو لے دل کسی سے
نہیں کوئی دنیا میں یاور کسی کا

چند رباعیاں بھی ملاحظہ فرمائیں۔

حسن مہ و مہر پر ضیا کو دیکھا
نقش و نگار خوشنما کو دیکھا
مصنوع میں صانع کی تجلی ہے ضرور
پھر کیوں نہ کہیں ہم کہ خدا کو دیکھا

کامل ہے وہ بیشک جو سلامت دیکھے
قابل ہے یقیناً جو متانت دیکھے

اکمل ہے وہی جو بے تعصب ہے اے قیس — ہر رنگ میں شاعر کی طبیعت دیکھے
دنیا میں اگرچہ عیش و عشرت ہے لذیذ — خواب و خور و دور جام صحت ہے لذیذ
عشاق کے حق میں سب سے بڑھ کر لیکن — افسانۂ شورش محبت ہے لذیذ
کیونکر نہ دکھاؤں رنگ و روی ایجاد — ہوں آئینۂ جمال فیض..... استاد
اے قیس میری نظم میں جو کچھ ہے ضیا — ہے نور افادات جناب شمشاد
دنیا سے جب اٹھ گئے جناب شمشاد — رو رو کے کہا قیس نے ہے استاد
گل زار سخن کو اب خزاں نے لوٹا — ہر تختۂ گل کی ہو گئی مٹی برباد

کچھ مخمسات بھی ہیں جو مرزا اصغر علی نسیم دہلوی۔ خواجہ حیدر علی آتش۔ خواجہ وزیر علی وزیر لکھنوی۔ داغ دہلوی کی غزل پر ہیں جو بہت طویل ہیں۔ اس لئے نظر انداز کرتا ہوں حضرت قیس نے کچھ قطعات تواریخ بھی وقتاً فوقتاً رقم فرمایا تھا۔ درست ہیں یہ بھی بہت طویل ہیں۔

جذبات قیس پر دیار و امصار کے جن شعرا و علما نے تقریظ و تاریخ لکھی ہے ان کے نام نامی حسب ذیل ہیں۔ مولانا فضل حق آزاد عظیم آبادی۔ مولوی سید علی احسن مارہروی، شاہ اسد اللہ اسد منیری۔ مولوی فضل الرحمٰن باقی غازیپوری مولوی محمد یعقوب برق بہاپوری۔ میر عبد الغنی برق شیرپوری۔ محمد ابوالحسن تسمل جالپوری۔ مولانا تمنا عمادی۔ مولوی مرزا ذاکر حسین ثاقب لکھنوی۔ حافظ عبد اللہ حافظ مشکی پوری۔ مولوی سلطان حسین شفا غازی پوری۔ حکیم ظہور صاحب ضیا آروی مولوی عبد الرؤف عشرت لکھنوی۔ جناب ابن الحسن فکر ایم اے مولوی صدرالدین کیفی غازی پوری۔ جناب ولی حیدر گہر آروی۔ مولوی نوح صاحب ناروی۔ جناب نور الحسن نور آروی۔ مولوی مرزا واجد حسین واقف لکھنوی۔ مولوی رضا علی وحشت کلکتہ۔ مولوی علی عظیم نبوی اور نواب فصاحت جنگ بہادر۔ حضرت جلیل جانشین امیر مینائی وغیرہ موخر الذکر حضرت جلیل فرماتے ہیں۔

جو ہیں متوالے سخن کے آئیں دیکھیں آج کلام — معنیِ پُر کیف ہے یا دور میں پیمانہ ہے
طبع کی تاریخ بولی ہے وجد کے قابل جلیل — ہر سخنداں قیس کے دیوان کا دیوانہ ہے
۱۳۵۲ھ

آخر میں حضرت عشرت کی زبان قلم سے سن لیجئے۔

"آپ پورا دیوان نگاہ تعمق سے دیکھیں گے۔ تو زیادہ لطف اٹھائیں گے۔ نظم میں کہیں الجھاؤ کا نام نہیں سہل الممتنع سارا کلام عالم متبحر ہوکر اشعار کی زبان پر غور کریں۔ تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہندوستان کا طوطی چہک رہا ہے۔ کہیں حسینوں کی چھیڑ چھاڑ ہے کہیں عاشقانہ رمز کہیں عارفانہ معرفت تمام دیوان مرتع معانی ہے نظر انصاف چاہیئے۔"

افسانے و محاضرات

انقلاب کی چنگاری

از

جناب بساون پرشاد ورما

وہ ایک خوبصورت، تندرست اور شائستہ مزاج کا نوجوان تھا، ساتھ ہی اس میں جوانی کا الھڑپن اور بدمستی چھلک رہی تھی، بولتا تو امرت برستا، اور ہنستا تو پھول جھڑتے۔ اس کی آنکھوں میں نور اور پیشانی پر ایک عجب رونق تھی، پڑھنے لکھنے میں بھی اپنے درجہ میں اول آتا تھا، الہ باد میں وہ بی۔اے۔ میں پڑھ رہا تھا، خوش مزاج ہونے کی وجہ سے وہ اپنے ساتھ کے پڑھنے والوں اور دوستوں کے درمیان ایک قیمتی جواہر تھا، کسی کو اپنی طرف مائل کرنے اور اس پر اپنی چھاپ ڈالنے کے اوصاف اسے خدا داد تھے۔

چھٹیوں میں اکثر وہ اپنے دوست رجنی کانت کے گھر جایا کرتا تھا، رجنی کا گھر غازی پور کے پاس ہی مدھو پور نامی ایک گاؤں میں تھا، رجنی کے والد بابو شیاما چرن ایک عزت ور نامی زمیندار تھے۔ آس پاس کے کئی گاؤں میں انکا رعب و داب تھا، اور اچھی چلتی تھی لوگ کہتے تھے کہ بھوت ان کے ہل جوتتے ہیں،

رجنی جب اپنے اس نوجوان دوست کے ساتھ گھر پہنچتا تو اس کے سارے کنبے میں خوشی و بشاشت چھا جاتی تھی، خاص کر دلاری جب سن پاتی کہ بھیا کے ساتھ مدن بابو بھی آئے ہیں تو وہ پھولی نہ سماتی، زمین پر اس کے پاؤں نہ پڑتے، اسے پر لگ جاتے، دوڑ دوڑ کر ان کیلئے ناشتہ کا انتظام کرتی، ملکر خیریت پوچھتی، بھابی کے ساتھ خود طرح طرح کی کھانے کی چیزیں بنانے میں مشغول ہو جاتی، بھابی اسے چڑھانے کے لئے اس پر طرح طرح کی طعنہ زنی کی بوچھار کرنے لگتی۔ "کہو دلاری دیدی! کبھی اور کسی کیلئے کھانا بنانے میں اتنی دلچسپی لیتی ہو؟ ایسا ہی ہوا کرتا ہے دیدی!" دلاری مسکراہٹ ملے ہوئے غصے میں بھابی سے کہہ اٹھتی۔ "میں تم سے کچھ بولنا نہیں چاہتی"۔

بھابی پھر چھیڑ دیتی۔ "دیکھو دیدی، چولہے کے پاس ذرا سنبھل کر بیٹھو، نہیں آگ کی لپٹ لگ جائے گی جھلس جاؤگی، آگ کی لپٹ مدن بابو کا آغوش نہیں ہے جو آرام وہ معلوم ہوگی!" "تم بڑی شوخ ہو بھابی!" کہتی ہوئی دلاری بھابی کے گالوں پر ایک ہلکی سی چپت جڑ دیتی، دونوں آنکھوں میں ہنس دیتی۔

ایک دفعہ ہولی کے تہوار کے موقعہ پر رجنی کے بہت تقاضا کرنے پر مدن مدھو پور آیا تھا، ہولی کے دن دوپہر کو کھانا کھا کر مدن ایک کمرے میں لیٹ رہا تھا، رجنی کہیں باہر چلا گیا تھا، شیاما بابو باہر کے کمرہ میں گپیں لڑا رہے تھے۔

جب کبھی مدن تنہائی میں پڑ جاتا تھا تو اس کے سامنے دنیا کی نابرابری کا مسئلہ ناچنے لگتا، آج بھی اس کی آنکھوں میں نیند نہ تھی، بلکہ وہ پڑے پڑے اسی سوال پر من ہی من سوچ بچار کر رہا تھا۔ اُف، کیسی دکھ کی بات ہے! سب ہی ایک خدا کی اولاد ہیں، قدرت نے اپنی سبھی چیزوں پر سب کو برابر حق دیا ہے، لیکن سماج کے سرمایہ داروں نے خودغرضی کے پتلوں نے، دنیا میں کیسی نابرابری پیدا کر دی ہے! کوئی

فلک بوس اٹاریوں میں عیش و آرام میں مشغول ہے، تو کوئی ٹوٹی ہوئی اور ٹپ ٹپ چوتی ہوئی جھونپڑیوں میں، برسات کی راتیں تھر تھر کانپتے۔ ۔ ۔ پرمیشور، یا خدا کرتے گزار دیتا ہے۔ کوئی چھپن طرح کی غذائیں چابھتا ہے۔ تو کوئی دانے کو محتاج ہو رہا ہے، ایسا کیوں ہے؟ ایشور نے یا خدا نے ایسا کیوں کیا ہے؟ غریبوں کے ستانے میں اسے کیا مزا ملتا ہے؟ نہیں بھگوان کا، یا خدا کا قصور نہیں ۔ ۔ وس کا کرتا دھرتا وہی بھگوان ہے، وہی خدا ہے تبھی وہاں تو یہ نا برابری نہیں ہے، وہاں تو کوئی کھاتے کھاتے اور کوئی کھانے بغیر نہیں مرتا، تو پھر سماج میں خود غرض سرمایہ دار ہی تو اس ساری نا برابری کی وجہ ہیں، دیکھو نہ، ابھی آج ہی کی بات ہے، سکھو چمار اسی دروازے پر پورے تین گھنٹے ناک رگڑتے ہوئے بیٹھا رہا، وہ کتنا گڑگڑایا کہ بابو آج ہولی ہے، گھر میں ایک پیسہ بھی نہیں، ہم دونوں باپ بیٹے کی پرسوں اور کل کی مزدوری دیدیتے تو کچھ کھانے پینے کا انتظام کرتا، لیکن، اے بھگوان شیاما بابو کا کلیجہ ذرا بھی نہ پگھلا، بلکہ وہ گرج کر بولے "ہٹو یہاں سے، کل تم لوگ وقت سے گھنٹا بھر پہلے ہی کام چھوڑ کر چلے گئے، کل کی مزدوری مانگنے کا تو تمہیں کوئی حق ہی نہیں ہے، اور پرسوں کی تم لوگوں کی مزدوری کل کی شرارت کے لئے جرمانہ میں کاٹ لی جاتی ہے۔" بے چارہ سکھو پر پتھر پڑ گیا، وہ آہ بھرتے ہوئے گھر لوٹ گیا۔ اے بھگوان، کیا اس نا برابری کو دور کرنے کی کوئی تدبیر ہے؟

سکھو کی غریبی اور لاچاری کی بات سوچکر مدن کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔ ساتھ ہی، شیاما بابو کے ظلم اور انکے غریبوں کو چوسنے کے طریقے کی باتیں سوچ کر اس کی آنکھوں سے خون اتر آیا تھا۔ "کل کی مزدوری مانگنے کا تو تمہیں کوئی حق نہیں ہے، اور پرسوں کی مزدوری جرمانے میں کاٹ لیجاتی ہے۔" واہ، ایسی زیادتی!

وہ اٹھکر شیاما بابو سے اس بارے میں نہ جانے کیا کیا باتیں کرنا ہی چاہتا تھا کہ کسی نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے اس پر ایک پچکاری رنگ چھوڑ دیا، وہ چونک اٹھا، سامنے کا نظارہ دیکھکر اس کا کلیجہ دہلنے لگا، سامنے ایک سولہ سال کی دوشیزہ ہاتھ میں پچکاری لئے کھڑی تھی، چاند جیسا اس کا چہرہ تھا، بید جیسا لچیلا جسم، سونے کی جیسی رونق، جوانی کی خوشنمائی چہرہ پر ہنس رہی تھی، مدن اس دوشیزہ کو، اس خوبصورتی کی مجسمہ کو دیکھکر حیرت میں رہ گیا اگر دلاری اس سے خوب ہلمل کر باتیں کرتی تھی، گھنٹوں اسکے ساتھ تاش کھیلتی، گہرے مسئلوں پر بات چیت کرتی لیکن اس وقت ایسی مدماتی مورت اس نے آج ہی دیکھی تھی، دلاری کو مدن اس صورت میں دیکھکر نہایت حیرت میں ڈوب گیا، پھر سنبھل کر بولا، دلاری، تم پاگل ہو گئی ہو گیا ؟ کیا تم مجھے رجنی سے علیحدہ سمجھتی ہو؟ اس کے جواب میں دلاری نے صرف مسکرا دیا اور منہ پر گلال ملنے کے لئے لپکی، مدن کو یہ باتیں نامناسب جانپڑیں اس نے اسے ایسا کرنے سے روکنے کیلئے اسکا ہاتھ پکڑ لیا۔

اسی بیچ میں شیاما بابو سنگھنی لینے کیلئے کمرہ میں داخل ہوئے کمرہ کا نظارہ دیکھتے ہی ان کے پیر کی زمین کھسک گئی غصے سے ان کا چہرہ لال ہو آیا، دلاری حویلی کے اپنے کمرہ میں چلی گئی، شیاما بابو دلاری کے کمرہ کے سامنے دھڑ دھڑاتے ہوئے جا پہنچے اور گرج کر بولے، "دلاری! میرے منہ کالکھ پوتنے کے لئے تم ہی پیدا ہوئی ہے؟ تجھ سے ایسی امید نہیں تھی۔ تو میری پگڑی اونچی نہیں رہنے دیگی"

اسی درمیاں میں دلاری کی ماں وہاں پہنچ گئیں۔ د

سب باتیں جان کر شوہر ہی کو قصور وار ٹھہرانے لگیں، "اب کالکھ لگنے کا کیا ڈر ہے؟ میری باتوں کا تو کوئی خیال ہی نہیں کرتا، سبھی سوچتے ہیں کتے کی طرح بھونکتی ہیں بھونکنے دو، ایک نہیں ہزار دفعہ کہہ چکی کہ لڑکی سیانی ہو گئی، کہیں گھر بر دیکھ کر اس سے فرصت پا جاؤ، پیدا کرنے کا پاپ چھڑا دو، لیکن سنتا کون ہے! ابھی آگے آگے منہ پر سیاہی پتے گی،

اپنے لوگوں کی بھول کی بار دشمن کی تلوار سے گہری چوٹ کرتی ہے، اور باتوں کا زخم تلوار کے زخم سے بھی خوفناک ہوتا ہے، اس دن سے دلاری ہمیشہ غم میں مبتلا رہتی ہے، اسکا دل کسی بھی کام میں نہیں لگتا، وہ سوچتی ہے" میں نے مدن بابو پر ڈورا ڈال کر کونسا گناہ کیا ہے؟ اس سے والد کے منہ پر کالکھ کیسے پوت ڈالا؟ اس کی بھابھی اسے لاکھ سمجھانے کی کوشش کرتی لیکن اس کا دل ٹھکانے نہیں آتا،

ادھر شیاما بابو اس کی شادی کی فکر میں لگے۔ ایک دولتمند تعلقہ دار صاحب کی عمر چالیس سے زیادہ تھی، ادھر دلاری میٹرک پاس کر چکی تھی، اور ادھر تعلقہ دار صاحب کیلئے سیاہ حرف بھینس برابر تھے۔ یہ شادی نہیں، دلاری کی بربادی ہونے جا رہی تھی،

رجنی نے اس شادی کی سخت مخالفت کی، دلاری تو پہلے سے ہی مدن کو دل دے چکی تھی، اس نے کسی اور سے شادی کرنے سے صاف صاف انکار کر دیا، شیاما بابو سر پیٹ کر رہ گئے، ان کی بیوی نے دلاری کو الگ کوسنا شروع کیا "کیا تجھے کتے نے کاٹ کھایا ہے؟ تمھیں معلوم ہے کہ مدن ایک غریب کسان کا لڑکا ہے، تجھے اس کے یہاں کوئی آرام نہیں ملے گا اور سماج میں ہمارا سر بھی نیچا ہوگا، پھر تم کیوں پاگلپن کیوں کرتی ہے،

آخر رجنی اور دلاری کی مخالفت اور دلیلوں کے آگے شیاما بابو اور ان کی بیوی صاحبہ کو جھکنا پڑا۔

رجنی مدن کے گھر پپا پور، جو مدھو پور سے دس بارہ میل کے فاصلے پر تھا، پہنچا، مدن اب بی اے پاس کر کے گھر پر ہی رہ رہا تھا، رجنی نے اس سے اپنی تجویز پیش کی" بھائی مدن میں جنک دلاری کو تمھیں سونپنا چاہتا ہوں، میں تمھارا بہت شکرگذار رہوں گا اگر تم میری آرزو قبول کر لو۔" مدن کو اس کی یہ باتیں سنکر نہایت تعجب ہوا، بولا" بھائی، تم کیسی باتیں کہتے ہو؟ کہاں تم اور کہاں میں؟ تم مجھ غریب کو اسے سونپ کر اس کے ساتھ غیر انصافی کروگے"

رجنی ـــ" دیکھو مدن، تم سے ایسی باتیں سننے کی میں امید نہیں رکھتا تھا، کیونکہ تم تو سماج کی نابرابری کو دور کرنے کے ہمیشہ حمایتی رہے ہو، مجھے تو یقین ہے کہ اس طرح کا رشتہ اس نابرابری کو دور کرنے میں بہت کچھ معاون ہوگا، اب تم میری التجا ٹھکرا کر میرے ساتھ غیر انصافی مت کرو"

مدن اور دلاری تسلی بخش اور نمونے کی شادی شدہ زندگی گزار رہے تھے، دلاری سے شادی کرتے وقت مدن کو ڈر رہا ہوا تھا کہ آم کے باغوں میں پلی ہوئی کوئل ببول کے جنگل میں کس طرح آرام پا سکے گی، اپنے باپ کے یہاں جیسی دولت اور آرام و آسائش کی چیزیں میرے یہاں نہ پاکر بیچاری دلاری زندگی بھر پریشان رہے گی۔ لیکن اس کا یہ خیال غلط تھا، دلاری کوئی ایسی ویسی عورت نہیں تھی، جو حالات کے مطابق سانچے میں

اپنے کو ڈھالنے کی طاقت نہ رکھتی ہو، دھن دولت کی قیمت اس کے آگے دھول کے برابر تھی، لیکن، اس کے پاس ایک بیش قیمت جواہر تھا جس کی قیمت کی برابری اس کی نظروں میں دنیا کی کوئی چیز نہیں کر سکتی تھی، وہ مدن تھا۔ اور مدن دلاری کو پاکر اپنے کو قسمت ور سمجھتا تھا، گھر میں معمولی ہی چیزیں تھیں لیکن دلاری ان اس ڈھنگ سے سجا اور سنبھال کر رکھتی تھی کہ دیکھنے والے کی طبیعت خوش ہو جاتی تھی، سادہ اور روکھا ہی کھانا وہ تیار کرتی، لیکن شیاما بابو کے گھر کی غذاؤں سے اس میں زیادہ ذائقہ محسوس کرتی تھی، حقیقت میں دلاری گھر کی ایک لچھمی تھی، گھر میں وہ مدن کی معشوقہ، ہمدم، بیوی اور کنیز تھی اور باہر؟ باہر ایک نایاب معاون،

بی، اے پاس کرنے کے بعد سے مدن پبلک زندگی گزار رہا تھا، غریبوں کو سرمایہ داروں کے پنجے سے چھڑانے تکلیف پانے والوں کی تکلیف دینے والوں سے حفاظت کرنے اور ظلم کے شکار لوگوں کو ظالموں سے نجات دلانے کا قصد کر لیا تھا، ان مسئلوں میں وہ انقلاب پیدا کر دینا چاہتا تھا، آج کہیں کسی زمیندار کے بیگار لینے کے ظلم کو روکنے کی کوشش کرتا، تو کل کہیں ساہوکار اور قرضدار کے جھگڑوں میں الجھا پایا جاتا اور پرسوں کہیں مالک سے مزدوروں کی مناسب مزدوری کی مانگ پیش کرنے کی دھن میں لگا رہتا تھا، یہ کام آسان نہیں تھے، ان میں اس کو بڑی بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا، کبھی کبھی تو جان پر کھیلنے تک کی نوبت آ پہنچتی، لیکن مدن تھا دھن کا پکا، فرض کی ادائی کا مجسمہ، اپنی دھن میں برابر لگا رہتا، حالانکہ کامیابی کبھی کبھی ہی نصیب ہوتی تھی، لیکن سماج اور حکومت کے غیر موزوں رواجوں اور کڑے مسئلوں کا دھیان کرکے اسے تھوڑی کامیابی پر بھی بہت زیادہ تشفی اور خوشی ہوتی تھی کیونکہ اسے یقین تھا کہ اس سمت میں وہ جو انقلاب کی چنگاری پیدا کر رہا ہے وہ ایک دن سماج کے سبھی ظلموں اور تکلیفوں کو جلا کر خاک کر دیگی۔

دلاری کو پاکر مدن کا حوصلہ اور دوبالا ہو گیا، اس میں ایک نیا جوش اور زندگی آ گئی، دلاری اس کام میں اس کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چلتی،

کچھ ہی دنوں میں عام جنتا کی پوری ہمدردی مدن اور دلاری کے ساتھ ہو گئی،

قدرت کی چال بڑی بے ڈھنگی ہوتی ہے، اس سے مدن اور دلاری کی شادی شدہ زندگی دیکھی نہیں گئی ابھی دونوں کی شادی ہوئے پورا ایک سال بھی نہیں ہوا تھا، کہ بدقسمت دلاری کے سر کا سیندور ایک دن اچانک دھل گیا، دل کی دھڑکن بند ہو جانے سے مدن کی اچانک موت ہو گئی، دلاری پچھاڑ کھا کر گر پڑی، ذرا ہوش آنے پر بلک بلک کر اور پھوٹ پھوٹ کر روئی، روئی اور خوب روئی، اس کے رونے سے چرند و پرند رو رہے تھے، سمتوں میں غم سا چھا گیا تھا، عام جنتا کا دل ٹوٹ ٹوٹ ہو رہا تھا، یہی نہیں سر....... کی آنکھوں سے بھی بربس آنسو آ جاتے تھے،

حالانکہ ان کی خودغرضی کہہ رہی تھی کہ اچھا ہوا، ایک آفت ٹلی، دلاری اور مدن کے تعلق سے شیاما بابو اور انکی بیوی کی، سماج میں ناک کٹ گئی تھی، وہ لوگ دلاری کو اس دن سے پھوٹی آنکھوں نہیں دیکھنا چاہتے تھے، ان کے یہاں دلاری کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی، لیکن، آخر ان کے پاس

بھی ماں باپ کا دل تھا۔ بیٹی پر آفت ناگہانی کا حال معلوم کرکے ان پر بجلی گر گئی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اولاد کی محبت نے زور مارا۔ شاما بابو نے فوراً افسا دلاری کے یہاں بلاوا بھیج دیا۔

لیکن، دلاری تو کوئی معمولی عورت تھی نہیں۔ وہ سمجھتی تھی کہ دوسروں کو چوس کر دولت مند بننے والے باپ کے گھر میں آرام سے نہیں رہ سکتی۔ اپنے فرض کو ادا نہیں کر سکتی۔ ان کی روح میرے گمراہ ہونے سے سورگ (بہشت) میں شرم سے کٹ جائے گی۔ میں خود بھی ظالموں کا ظلم برداشت نہیں کر سکتی۔ بھگوان نے میرے سر پر سہاگ کا سیندور نہیں رہنے دیا تو کیا ہوا؟ ان کا سایہ نہیں رہا تو کیا ہوا!! سارے مظلوم میرے بھائی بہن ہیں۔ میں انہیں کے ساتھ ہو کر اپنا فرض ادا کرونگی۔ انہیں کی ٹھکری پر بھوک کی آگ کو مٹاؤں گی۔

مدن بابو کے انتقال کئے ہوئے آج دو سال گزر چکے، اب دلاری دیوی کا نام بہت مشہور ہو چکا ہے۔ کم از کم غازیپور کے آس پاس کے چار پانچ ضلعوں میں تو دلاری دیوی کا نام بچہ بچہ جانتا ہے۔ بمپاپور میں دلاری دیوی نے ایک انجمن قائم کر رکھی ہے، جس کا نام ہے "انجمن امداد مظلومین"۔ کمیٹی کے ممبر کافی ہو گئے ہیں۔ اور مظلوم اور بیکس کمیٹی کیلئے جی جان سے تیار رہتے ہیں۔

ابھی حال ہی کی بات ہے، ابھی ابھی یو۔پی کا نیا کاشتکاری قانون پاس ہوا ہے۔ اس میں ایک دفعہ ہے کہ زمیندار کی اس سیر زمین پر موروثی حق ہو جائے گا، جسے وہ لگاتار پانچ سال سے جوتتا آتا ہو۔ لیکن دولت اور طاقت کے مغرور، خود غرضی کے اندھے ظلم کے پتلے زمیندار اور سرمایہ دار قانون کی کب پرواہ کرتے ہیں؟ قانون تو بیکسوں کو کسنے کے لئے ہی ہوتا ہے۔ جوں ہی قانون پاس ہوا کہ زمینداروں کا ظلم اور بڑھ گیا۔ وہ اپنی اپنی سیر زمین کسانوں سے زبردستی لیکر جوتنے بونے لگے۔ اگر یہ نہ ہو سکا تو یوں ہی پڑتی زمین چھوڑنے لگے، لیکن کسانوں کو نزدیک بھی پھٹکنے نہیں دیتے۔ قانون کے حسب خواہ رہنے پر بھی کسان اپنی کمزوری سے لاچار ہو گئے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کی کہاوت لاگو ہونے لگی۔

یہی ظلم مدھوپور کے بابو شیاما مہرن نے بھی شروع کیا کتنے کسان جوت کی زمین چھین جانے ۔۔۔ مصیبت میں پڑ گئے ان کے بال بچوں کے بھوکوں مرنے کی نوبت دکھائی دینے لگی کسانوں میں ہاہا کار مچ گیا۔

ایک دن دلاری دیوی اپنی کمیٹی کے آفس میں بیٹھ کر اخبار پڑھ رہی تھی۔ اس میں شیاما بابو کے اس ظلم کا بھی ذکر تھا۔ اس پر اس کی نگاہیں جم گئیں تھیں۔ "اوہ ایسا ظلم، اس طرح غریبوں اور لاچاروں کو چوسنا، یہ وحشیانہ برتاؤ" میں اسے نہیں برداشت کر سکتی۔ اسے اپنے باپ سے سخت نفرت سی ہو گئی۔ اس کا خون کھول اٹھا۔ آخر کار اس نے فیصلہ کیا کہ میں اس کی مخالفت کرونگی۔

عین اسی وقت، سکھو چار آکر اس کے آگے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ "بہن جی! میں لٹ گیا۔ شیاما بابو نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ میرے بال بچوں کی حفاظت کیجئے۔ انہیں بھوکوں مرنے سے بچائیے۔"

دلاری ساری بات سمجھ گئی۔ وہ فوراً کمیٹی کے دو آدمیوں کو شامل لیکر مدھوپور پہونچی۔

سُکھو چار کے کھیت پر شیاما بابو نے ہل چڑھوا دیا تھا۔ سکھو نے ملکی بولی تھی۔ شیاما بابو اسے الٹو کر باجرا چھنٹوا رہے تھے، کھیت پر انہوں نے چار پانچ لٹھیوں کو بٹھا دیا تھا۔ کسی کے کھیت میں گھسنے پر ان کا کیا فرض ہوگا۔ لٹھیتوں کو انہوں نے بخوبی سمجھا

بُجھا دیا تھا، آپ گھر پر آرام کر رہے تھے۔

دلاری دیوی نے کھیت میں جا کر ہلواہوں سے کہا۔

"بھیا! تھوڑی دیر کے لئے میری آرزو مان لو۔ میں بابوجی سے کچھ باتیں کرا آتی ہوں۔ تب تک ایک غریب کا بویا کھیت اُلٹنا بند کر دو۔ میں تمہیں ہاتھ جوڑتی ہوں۔" لیکن کون کس کی سُنتا ہے؟ سبھی لٹھیت سکھّو پر ٹوٹ پڑے۔ مارتے مارتے اس کی کھوپڑی نکال دی۔ وہ اس کی جان ہی لینے پر آمادہ تھے لیکن دلاری نے بیچ میں پڑ کر روکنے کی کوشش کی۔ لیکن یا بھگوان یہ کیا ہوا! ایک لٹھیت کی لاٹھی اس کو آ کر زوروں سے لگی۔ سر پھٹ گیا۔ خون کا فوارہ چھوٹنے لگا۔ بیہوش ہو کر وہ زمین پر گر پڑی۔

یہ خبر بجلی کی طرح شیاما بابو کے یہاں پہنچی۔ وہ دوڑے ہوئے آئے۔ کاٹو تو ان کے جسم میں خون نہیں۔ "ہائے بھگوان! تم نے مجھے یہ کیسی کڑی سزا دی۔ اپنی اولاد کے ستیاناس کرنے کی میں ہی وجہ بنا۔ اگر میں ایسا ظلم نہیں کرتا تو میری بیٹی میری مخالفت کرنے نہیں آتی۔ اور میں خود اپنی اولاد کو مارنیوالا نہیں بنتا۔ بھگوان! میں تو لٹ گیا۔"

دلاری اُٹھا کر شیاما بابو کے گھر پہنچائی گئی۔ چوٹ گہری تھی، ابتدائی علاج کر لینے کے بعد شہر کے بڑے اسپتال میں لے جانے کا انتظام ہو رہا تھا۔ شیاما بابو کے سارے کُنبے میں غم چھا گیا تھا۔

تھوڑی دیر میں دلاری کو کچھ ہوش ہوا۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "پتاجی! آپ اپنی اس ابھاگنی بچی کا آخری پرنام منظور کریں۔ مجھے مرتے وقت اپنی جان کا ذرا بھی افسوس نہیں ہے۔ مجھے دُکھ ہے تو یہ ہی کہ میں نے جو عہد کیا تھا، جو انقلاب لانا چاہتی تھی، اُس کو پورا نہ کر سکی، سماج کی نابرابری کو دُور نہ کر سکی۔ ظلموں کی جڑ نہ اُکھاڑ سکی۔ اس کے لئے ایک وارث چھوڑے جاتی ہوں۔ وہ ہے میری معصوم بچی ——— لیکن وہ ابھی نری بچی ہے۔ ایسا کوئی آدمی نظر نہیں آتا کہ جس کی گود میں اپنی اس بچی کو سونپ کر تشفّی سے مر سکوں۔"

شیاما بابو کا کلیجہ مُنہ کو آ رہا تھا۔ انہوں نے سسکتے ہوئے کہا ——— "بیٹی! آج سے تمہاری بچی کی پرورش کا بھار تمہارے بوڑھے باپ لیتے ہیں۔ تم نے جو انقلاب کی چنگاری پیدا کی ہے وہ بجھنے نہیں پائے گی۔ میری دلاری! تم نے میرے خاندان میں پیدا ہو کر اس کی عزت بڑھائی۔"

دُلاری نے کہا۔ "بولئے انقلاب زندہ باد ......"

مجمع کی بھیڑ سے بڑے زوروں کی آواز آنے لگی۔ "انقلاب زندہ باد! انقلاب زندہ باد! ——— انقلاب زندہ باد!"

شیاما بابو بھی سسکتے ہوئے یہی بولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس درمیان میں لوگوں نے دیکھا کہ دلاری کا دم ٹوٹ گیا ہے طائرِ روح پرواز کر گیا ہے۔ شیاما بابو اور ان کے کنبے کے لوگ چیخ اٹھے۔ مجمع میں غم کا دریا اُمنڈ آیا۔

دوسرے روز شیاما بابو نے اپنی تمام زمینداری اپنے کاشتکاروں میں برابر تقسیم کر دی۔ اور بینک میں جمع ایک لاکھ روپیہ "انجمن امداد مظلومین" کے نام کر دئے۔ زمینداری کے حصہ داروں میں رتن کانت اور سکھّو بھی تھے ان کی زمینداری میں اب جور و ظلم کا نام بھی نہیں تھا۔

شیاما بابو اب انجمن امداد مظلومین کی تحریک کو آگے بڑھانے میں مشغول ہو گئے ہیں۔

دیکھیں انقلاب کی وہ چنگاری کب تک اپنی خوفناک لپٹوں کے ساتھ ساتھ

سُراغ

از جناب نصرت آروی

امریکہ کی خفیہ پولیس کے کامیاب کارنامے کے متعلق اخباروں میں نہایت شدومد کے ساتھ یہ خبر شائع ہوئی۔ کہ محکمہ سراغرسانی نے ایک نہایت چالاک چوروں کی جماعت کامیابی کے ساتھ گرفتار کر لی ہے۔ یہ ٹولی متفرق بنکوں سے مختلف اوقات میں تیس یا چالیس لاکھ ڈالروں کی رقم جعلی دستاویزوں کے ذریعہ اڑا چکی تھی

...... اس جماعت کے افراد بڑے بڑے رئیسوں اور نوابوں کا بھیس کامیابی کے ساتھ بدل کر پیرس، میامی، نائس اور دیگر مقامات پر کافی دھاک جمائے ہوئے تھے سب سے زیادہ عجیب بات تو یہ تھی کہ دھوکے کچھ اس صفائی سے دیئے گئے تھے کہ خود بنک کے منیجروں اور افسروں کو بھی صحیح رقم کا حساب لگانا ناممکن تھا...... چنانچہ اس عجیب واقعہ کی تفصیل کچھ ایسی دلچسپ اور رومان انگیز ہے جو بجائے واقعہ کے ایک حسین افسانہ معلوم ہوتی ہے

واقعہ

ایک دن صبح کے وقت محکمہ خفیہ پولیس کے انسپکٹر ہنری اوسوالڈ کو جو بنکوں کی چوریوں کی سراغرسانی میں ماہر سمجھا جاتا تھا ٹیلیفون پر کسی نے طلب کیا۔ یہ پکارنے والی آواز کسی عورت کی تھی۔ جو نہایت مطمئن لہجہ میں بول رہی تھی اس نے کہا "ہلو! کیا آپ انسپکٹر ہنری اوسوالڈ ہیں؟" اور جب ادھر سے جواب اثبات میں دیا گیا تو پھر اس نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے لکھنا شروع کیا "تو کیا آپ ایسے چالاک چوروں کی ٹولی کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں جس نے مختلف بنکوں سے تقریباً تیس چالیس لاکھ ڈالروں کی رقم اینٹھ لی ہے؟"

انسپکٹر اس قدر متوحش ہوا اور اس غیر متوقع خبر نے اس کے حواس اس قدر منتشر کر دیئے کہ ایک لمحہ تک وہ ساکت ہو گیا اور قبل اس کے کہ وہ اپنی لامعلوم محسنہ کا شکریہ ادا کرے یا اس کا نام و مقام دریافت کرے سلسلہ کاٹ دیا گیا اور خاتون کی آواز رک گئی۔

> تین ہزار میل کے فاصلہ سے مخبر
> پولیس کے افسر نے ٹیلیفون پر ایک زنانہ
> آواز سنی "اگر تمہیں تیس لاکھ ڈالروں
> کی چوری کرنے والوں گرفتار
> کرنا ہو تو فوراً فرانس
> پہونچ جاؤ......"

انسپکٹر نے فوراً اپنے افسر بالا مسٹر اڈگر ہوور کو اس واقعہ کی اطلاع پہونچائی۔ اس جہاں دیدہ افسر نے انسپکٹر کو اطمینان دلایا کہ یقینی وہ خاتون دوبارہ اپنے سوال کو دھرائے گی اس لئے خاموشی سے منتظر رہو اور واقعہ بھی

کچھ یہی ہوا کیونکہ ٹھیک اسی وقت دوسرے روز ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور ایک زنانہ آواز نے اسی سوال کو دوبارہ پیش کیا اور پوچھا "تو کیا آپ اُن چوروں کی گرفتاری سے دلچسپی رکھتے ہیں؟" "یقینی" انسپکٹر نے جواب دیا " اگر آپ اس ٹولی کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو فوراً یا جس قدر جلدی ممکن ہو فرانس کے صدر مقام پیرس میں پہونچ جانا چاہئے اس حالت میں بہت ممکن ہے کہ مسروقہ رقم میں سے ایک بڑی رقم بھی برآمد ہو جائے۔

"خبر"

لا معلوم مخبرہ نے اپنا نام اور پتہ بتانے میں کوئی پس و پیش نہ کیا۔ اس نے بتایا کہ وہ اٹلی کی ایک لکھپتی نواب کی بیوہ ہے اگرچہ اصل باشندہ امریکہ کی ہے۔ مگر اب ایک بہت کثیر دولت کی مالک اور متعدد ایوانات و محلات کی وارث ہے دولت فراواں اس کے قدم چومتی ہے خود امریکہ میں اس کے چند ایوان صدر مقام نیویارک میں موجود ہیں۔ یوں تو یورپ کے ہر سیرگاہ پر اس کے ایک یا دو بنگلے بنے ہوئے ہیں اس نے اپنے بیانات کی تصدیق اور ضمانت میں نیویارک کے بڑے بڑے سیٹھوں کا نام پیش کیا۔

دوران گفتگو میں مسٹر اڈگر ہوور بھی طلب کر لئے گئے تھے

چنانچہ انہوں نے اس اہم معاملہ کی مزید تصریح کو اس طرح ٹیلیفون پر بیان ہونا خطرناک بتایا اور بیگم صاحبہ سے استدعا کی کہ وہ نیویارک تک تکلیف گوارا فرما کر مشکور فرمائیں اور جس قدر جلد ممکن ہو سکے وہ روانہ ہو جائیں۔ امریکہ کی بندرگاہ تک پہونچنے سے پہلے ہی اس محکمہ کے سپاہی اس کی حفاظت پر معمور کر دیئے جائیں گے اور امریکہ میں جب تک آن کا قیام رہے گا ان کی جان و مال کی حفاظت کی ضامن گورنمنٹ رہیگی کیونکہ معاملہ بہت نازک تھا۔ اور ہمیشہ ان کی جان کا خطرہ ہو سکتا تھا۔

اس طرح مطمئن ہو کر بیگم نے اپنی روانگی کا پروگرام مرتب کیا۔ مگر روانگی سے قبل اس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ امریکہ کی پولیس فوراً فرانس کی پولیس کو اس بات پر معمور کر دے کہ وہ ایک خاص مقام پر خاص بینک میں خاص وقت پر دو اشخاص ــــ اور ــــ کو جو زیکوسلواکیہ کے باشندے ہیں جعلی دستاویز داخل کرتے ہوئے گرفتار کر لے۔

یہی موقعہ تھا کہ بیگم کے بیان کی صداقت کا امتحان ہو جائے چنانچہ واشنگٹن اور پیرس کی پولیس کے مابین تاربرقی کا سلسلہ کھڑکنے لگا اور ٹھیک وقت مقررہ پر دو اشخاص بیگم موصوف کے بتائے ہوئے پتہ پر پکڑ لئے گئے

"معاملہ"

بیگم کی اس مخبری کی اصل وجہ کیا ہو سکتی تھی کیونکہ اس کو زر کا طمع ہونا خلاف فطرت بات تھی وہ خود لاانتہا دولت کی مالک تھی اور پولیس سے اسے کونسی بڑی رقم ملتی۔ محکمہ کے افسروں میں اس معاملہ پر دیر تک مباحثہ رہا اور وہ آخرش اس نتیجہ پر پہونچے کہ اس معاملہ کی تہ میں حضرت عشق ضرور کارفرما ہیں۔۔۔ بیگم امریکہ میں پہونچنے کے بعد سیدھے محکمہ سراغرسانی کے چیف مسٹر اڈگر ہوور کی مہمان ہوئی یہ ایک خوشرو و خوش قامت اور حسین عورت تھی اس کے چہرے کی متانت اس کے مالدار ہونے کی دلیل تھی۔ چنانچہ اس نے بدمعاشوں کی ایک مکمل فہرست معہ پتہ

اور نشان کے مرتب کرادی اسی فہرست کے مطابق پولیس نے بیک وقت امریکہ کے متفرق شہروں میں چھاپہ مار کر ۱۱ اشخاص گرفتار کئے۔

بیگم کی نہایت ہی لجاجت آمیز استدعا پر اس جماعت کا ایک خوشرو نوجوان دراز قامت ممبر مسمٰی انٹونیو ڈی پال جو اٹلی کا باشندہ تھا آزاد چھوڑ دیا گیا۔ ہوور نے اسے خاتون کی مخبری کا ذریعہ ٹھہرایا مگر افسوس ہے کہ یہ آزادی زیادہ دیر پا نہ رہ سکی کیونکہ اسی شب کو کسی نامعلوم شخص نے اس غریب کو قتل کر دیا اور دوسری صبح کو اس کی لاش ہوٹل میں پائی گئی غالباً اس گرفتار شدہ ٹولی کے آزاد ممبروں نے اس کو مخبری کی سزا دیدی

ہوور کا خیال صحیح نکلا کیونکہ بیگم نے عدالت میں جو بیان دیا۔ اس میں اپنے عشق کا پورا واقعہ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ کس طرح مقتول سے اس کی ملاقات دوران سفر میں ہوئی اور پھر کس طرح مانٹی کارلو کی دلفریب سیرگاہ میں یہ ملاقات رفتہ رفتہ عشق کا رنگ اختیار کر گئی۔ پھر مقتول نے کسی طرح اس سے شادی کی درخواست پیش کی جسے اس نے منظور بھی کر لیا۔ . . . . مگر مقتول نے اپنی کمزوری کا حال بتاتے ہوئے خاتون سے کہا کہ وہ ایک خطرناک جال میں پھنس گیا ہے اور ایک جعلساز ٹولی کا ممبر بننے پر مجبور ہے چنانچہ اسی نوجوان کی محبت نے اس خاتون کو مجبور کیا کہ وہ ان بدمعاشوں کو گرفتار کرا دے اور اپنے دوست کو آزاد کرانے کے بعد شادی کر سکے . . . . مگر آہ فلک کج رفتار کو کب منظور تھا . . . . . . خاتون زیادہ بیان نہ کر سکی اور رقت سے اسکی آواز گھٹنے لگی۔

چنانچہ اس گروہ کے دس ممبر تو جیلوں میں پہونچ چکے ہیں مگر ایک لیڈر آزادی کی سانس لے رہا ہے اور چند نامعلوم ممبر جو انٹونیو کے خون کے مجرم ہیں ابھی تک ہاتھ نہیں لگ سکے ہیں حالانکہ پولیس پوری سرگرمی سے تلاش کر رہی ہے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ اس جماعت کے لیڈر کا نام میر فیرمنلیس ہے اور یہ شخص مع اپنی زوجہ کے پیرس کے اس پاس کسی دیہات میں روپوش ہے اور ہنوز اس کے قبضہ میں کافی رقم موجود ہے۔

رفیق زندگی

از جناب مولانا ابو احمد سید عبد الوہاب صاحب شفق ریانوی ایم۔ اے۔ بی۔ ال۔ وکیل سابق پروفیسر ڈھاکہ یونیورسٹی

ماحول اور تعلیم و تربیت کے اثر کو انسانی طبیعت اور اخلاق کی ساخت میں ایسا ہی دخل ہے کہ بعض فلاسفہ نے طبع انسانی کو "ایجاد ماحول" قرار دیا ہے اور ان کے خیال میں جس چیز کو "افتاد طبیعت" کہتے ہیں وہ دراصل اثرات ماحول کا نتیجہ ہے اور یہ بات کچھ لگتی ہوئی بھی معلوم ہوتی ہے کیونکہ انسانی زندگی کے مختلف دوروں میں اُس کے خیالات اطوار چال چلن پر ماحول کا اثر بیّن طور پر ہوتا ہے۔ اور بسا اوقات اس اثر سے ایسے انقلابات پیدا ہوتے ہیں جن کا خیال اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔

گو سماج کے زبردست ہاتھوں نے جمیل اور نجمہ کو عقد ازدواج کے مضبوط ڈورے سے باندھ کر زندگی کی آسان اور دشوار منزلیں طے کرنے کے لئے ایک دوسرے کا رفیق حیات بنا دیا تھا مگر دونوں کے خیالات اور افتاد طبیعت میں بعد المشرقین تھا۔ اسی وجہ سے کنبے میں بہتروں کا خیال تھا کہ شاید ان دونوں میاں بیوی میں بناؤ نہ رہے گا اور کسی دن جدائی ہو کر رہے گی مگر یہ خیال صحیح نہ تھا انہوں نے یا تو نجمہ کے حسن و صورت کو غور سے نہیں دیکھا تھا یا اُس کے حسن سیرت کا صحیح اندازہ نہیں کیا تھا۔ نجمہ کو قدرت نے نہ صرف وہ دلفریب موہنی صورت بخشی تھی جو اعضا کے تناسب سے تعلق رکھتی ہے اور نوجوانی کی دلکش ادائیں اس کو چار چاند لگا دیتی ہیں۔ بلکہ اس کے چاند سے چہرے کو وہ قدرتی سادگی اور معصومیت عطا کی تھی جس کی بنا پر وہ حور شمائل کہی جا سکتی تھی۔ پھر جمیل جیسے عیاش طبع اور حسن پرست انسان سے یہ توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اس زہرہ پرور اور دلکش حسن کی بے روک کشش سے متاثر نہ ہوگا۔ یا اپنی لاابالی حرکات کے سلسلے میں اس بے بہا نعمت ادبیا انمول جواہر کو دیدہ و دانستہ کھو بیٹھے گا۔ اس لئے جدائی کا سوال تو پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ اور سچ پوچھئے تو جمیل نے گو نجمہ کو شادی سے پہلے جوانی میں نہیں دیکھا۔ مگر لڑکپن کی دیکھی ہوئی قرابت کی لڑکی تھی۔ شادی کچھ بے جانے بوجھے نہیں ہوئی تھی۔ نجمہ کس طرز و انداز کی لڑکی ہے، اس کے خیالات کس قسم کے ہیں اور افتاد طبیعت کیسی ہے۔ یہ ساری باتیں جمیل کو پہلے سے معلوم تھیں۔ پھر یہی نہ تھا کہ منسوب اور شادی دفعتہً ہو گئی ہو۔ دو سال تک منسوب رہ چکی تھی اس عرصہ میں جمیل کو یہ باتیں روزانہ معلوم ہوتی تھیں کہ نجمہ صوم و صلوٰۃ کی سخت پابند ہے۔ شرعی منہیات اور لہو و لعب سے نفرت رکھتی ہے، سنیما، تھیٹر وغیرہ کو برا جانتی ہے گھر کے ضروری کاموں سے جو وقت بچتا ہے وہ یا تو زردوزی

نسیدہ کاری وغیرہ میں صرف کرتی ہے یا مذہبی اور اخلاقی کتابوں اور مفید اخلاقی رسالوں کے پڑھنے میں گذارتی ہے گویا ساری باتیں جمیل کی افتادِ طبیعت کے مخالف تھیں۔ مگر وہ یہ سمجھتا کہ عورت موم کی ناک اور سادہ کپڑا ہے جس کو مرد حسب منشا موڑ سکتا اور ہر رنگ میں رنگ سکتا ہے جس چیز کی کشش سے جمیل مجبور تھا وہ نجمہ کا دلفریب حسن تھا اور اسی نعمت کی طلب میں وہ اختلاف طبیعت اور مبتا ین اخلاق کو بھول جاتا تھا۔

دوسری طرف اگر نجمہ کے والد مولوی ضیاء الحسن زندہ ہوتے تو شاید ان کی اکلوتی لڑکی جمیل جیسے متمول اور ہارونہ کار مگر عیاش اور لا مذہب گریجویٹ کے گھر نہ آتی کیونکہ مولوی صاحب موصوف گو مشرقی اور مغربی دونوں علوم کے ماہر تھے مگر مذہبی تعلیم کا کچھ ایسا گہرا اثر تھا کہ وہ آخر وقت تک سیدھے سادے سچے مسلمان اور مذہب کے پابند رہے ان کے علمی تبحر کے ساتھ مذہب اور تصدق و صفا کا ایسا پختہ رنگ ملا ہوا تھا کہ ایسی جامعیت کے مسلمان کم دیکھے جاتے ہیں حالاتِ حاضرہ اور ہندوستانی سیاست پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ مگر حرص و ہوس سے دور تھے اور جلسوں، تقریروں اور مضمون نویسی کے دلدادہ نہ تھے اور نام و نمود اور خود فروشی کی نمائشوں سے بھاگتے تھے مگر کبھی کبھی احباب کے اصرار یا جذبات صدق کے جوش سے کچھ لکھتے اور بعض مذہبی یا سیاسی جلسوں میں تقریر کرتے آج بھی ان کے جو مضامین یا تقریریں اخبارات اور رسالوں میں دیکھی جاتی ہیں ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کسی ملکی قومی مذہبی سیاسی یا معاشرتی مسئلہ پر ان کے خیالات صحیح ہوں یا غلط مگر جو کچھ وہ لکھتے صدق نیت سے لکھتے تھے اور جب کبھی بولتے دل سے بولتے اور خدا لگی کہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ تو وہ جماعت بندی پسند کرتے تھے۔ نہ اُن کے حوارین کی کوئی جماعت تھی مگر حق و راستی کی جو صدا ان کے مُنہ سے نکلتی وہ مخالفین کے دلوں پر بھی اثر کئے بغیر نہ رہتی تھی۔

مولوی ضیاء الحسن کی وفات سے چند سال پہلے اُن کے ساہو کار لڑکا جمیل وکیل ہوا تھا۔ خود ساہو صاحب معمولی بُود و باش کے آدمی تھے۔ پیدائشی دولتمند تو نہ تھے۔ مگر ایک لاولد چچا کا ترکہ پا کر سرمایہ دار ہو گئے تھے۔ لڑکے کو کچھ اردو فارسی پڑھانے کے بعد اسکول میں داخل کر دیا اور ادھر لڑکے کو انگریزی کی ہوا لگی اُدھر باپ پر انگریزیت چھا گئی۔ مکان کو سجا کر کوٹھی صاحب کا بنگلہ بنا دیا۔ میز کرسی فوٹو اور پردوں پر ایک کافی رقم صرف کر دی، لباس میں بھی بہت کچھ تبدیلی آگئی۔ شاید انگریزی نہ جاننے کے وجہ سے سوٹ پہننے میں شرماتے ہوں، مگر بسا اوقات انگلش کوٹ اور پتلون بھی پہن لیتے تھے غرضیکہ رضا صاحب "اپ ٹو ڈیٹ" نکلے۔ مگر اس صاحبیت کے دور میں بھی ایامِ جاہلیت کی بعض عادتیں نہ چھوٹی تھیں کہ "شراب مدام" جاری رہی اور غضب یہ تھا کہ کبھی کبھی ان جاہلانہ جلسوں میں کمسن جمیل کو بھی شریک کرتے اور دو چار گلاس باصرار پلا دیتے۔

ظاہر ہے کہ جمیل کے علمی دائرے کی وسعت اسکول اور اس کے بعد کالج کی تعلیم تک محدود تھی۔ اُن کو سوسائٹی بھی کچھ ایسی ملی کہ زمانۂ تعلیم میں سینما تھیٹر وغیرہ کا شوق بہت زیادہ ہو گیا۔ گھر میں بھی جو ماحول تھا اس میں دیانتداری تقویٰ

صدق و صفا کے سوا سب کچھ تھا۔ ہاں کالج کی زندگی میں ایک خاص چیز جو جمیل نے بالآخر حاصل کی وہ نام و نمود کی ہوس اور خودستائی کی تقریریں تھیں۔ چنانچہ یونیورسٹی کی ڈگری لے کر اور پیشہ میں داخل ہونے کے بعد اس نے ایک طرف تو پارٹی بندی وغیرہ کی آبائی سنت جاری رکھی، دوسری طرف اپنے اوباش دوستوں کی مدد سے فرقہ بندی شروع کی اور موقع بے موقع جلسے کرکے خودستائی میں تقریریں کرتا۔ جماعتوں میں ریشہ دوانی اور افترا پردازی کے ذریعہ پھوٹ ڈالتا اور اپنے ہم خیالوں کی تعداد بڑھاتا۔

جمیل کے جلسوں میں اس کے والد تو برابر شریک ہوتے تھے ایک جلسے میں ان کے اصرار پر مولوی ضیاءالحسن بھی شریک ہوئے تھے۔ جمیل نے جو تقریر کی اس کی ابتدا خودستائی سے تھی اور ساری داستان اپنی کارگذاریوں کی تھی در خاتمہ میں سامعین کو یہ بتایا گیا کہ سارے متحد ہو کر ایک ہی رہنما کو مانو۔ جلسہ کے اختتام پر باپ بیٹا مل کر مولوی صاحب سے داد کے طالب ہوئے مولوی صاحب نے مسکرا کر کہا "ہاں جیسی طاقت زبان میں ہے کاش ویسی ہی راستی دل میں اور قوت ایمان میں ہوتی"۔ جمیل نے ان الفاظ کو طنز پر محمول کیا اور دوسرے جلسے میں مولوی صاحب کے غائبانہ ان کی مذمت اور توہین کی جس سے بعض حاضرین برافروختہ بھی ہوئے مگر جب مولوی ضیاءالحسن کو ان باتوں کی خبر ہوئی وہ مسکرا کر بولے "گمرہوں کو خدا ہدایت دے"۔

نجمہ کو اردو، فارسی، عربی انگریزی کی تعلیم مولوی ضیاءالحسن نے خود ہی دی تھی اور جس طرح خدا نے اس کے جسم کو نور کے سانچے میں ڈھالا تھا اسی طرح شفیق استاد اور دل سے چاہنے والے باپ نے اس کے دماغ کو علمی تبحر اور دل کو حق اور ایمان کی روشنی سے بھر دیا تھا وہ لڑکپن ہی سے باپ کے نقش قدم پر چلتی تھی۔ رضا صاحب نے چند بار جمیل کی منسوبی کا پیغام دیا مگر مولوی صاحب ہر بار مسکرا کر ٹال دیتے۔ در اصل نجمہ کے لئے انھیں کسی ایسے تعلیمیافتہ نوجوان کی تلاش تھی جو پابند مذہب اور سچا مسلمان ہو۔

ادھر مولوی ضیاءالحسن کا انتقال ہوا ادھر رضا صاحب کی یورش شروع ہوئی۔ منسوبی کا پیغام تابڑ توڑ آنے لگا اور شادی کے لئے شدید تقاضا ہونے لگا نجمہ کی ماں نہ صرف اپنے شوہر کی ہم خیال تھیں بلکہ یہ بھی جانتی تھیں کہ نجمہ کی شادی کے متعلق ان کا خیال کیا تھا مگر بچاری آخر عورت ذات تھیں۔ کچھ تو رضا صاحب کے سرمایہ کا اثر ہوا اور کچھ اس مشکل نے مجبور کیا جو مولوی صاحب کی وفات نے بر کی تلاش اور کد و کاوش میں پیش کر دی۔ آخر وہ راضی ہو گئیں۔ اور نجمہ کی منسوبی جمیل سے پختہ دپر ہو گئی۔

نجمہ کا کچھ لڑکپن تو تھا نہیں۔ اچھی خاصی اٹھارہ سال کی جوان لڑکی تھی۔ اس پر ٹھوس تعلیم اور مولوی ضیا جیسے عالم و عاقل باپ کا فیض صحبت اس کی عقل و دانشمندی کا کیا کہنا تھا۔ اسلئے یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ اس ہونے والے رشتے کے حسن و قبح پر اس نے غور نہ کیا ہوگا۔ بیشک اس نے غور کیا اور بارہا غور کیا اور ڈوب ڈوب کر غور کیا۔

سچ تو یہ ہے کہ جس وقت گھر والوں کی گفتگو سے نجمہ کو یہ ہوا کہ اس کا "رفیق زندگی" اور بھلے بُرے کا مالک جمیل سا انسان ہونے والا ہے، وہ سکتے میں آگئی۔ گھبراہٹ سے قوت فیصلہ جاتی رہی۔ سوچنا چاہا تو سر چکرانے لگا۔ بستر پر لیٹ گئی

نکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور روتے روتے سو گئی،
نج بجے کے قریب آنکھیں کھلیں اس وقت جی ہلکا تھا۔
ٹھ کر منہ ہاتھ دھویا وضو کیا اور عصر کی نماز پڑھی۔ دعا
کے وقت اس منسوب کا خیال آیا۔ جی چاہا کہ بارگاہ ایزدی
یں گریہ وزاری کے ساتھ دعا کرے کہ خدا ایسے ناموافق
شتے سے بچالے۔ مگر وہ اپنے مذہب کی تعلیم سے مجبور تھی
ور حسب معمول یہ دعا کی "اے میرے نیک و بد کے جاننے والے
فا! اس کنیز کو وہ نعمت عطا کر جو اس کے لئے بہتر ہو اور اُس
فت سے اسے بچا جو اس کے حق میں بُری"

نماز سے فارغ ہوکر غانہ باغ کی طرف چلی گئی۔ وہاں
ی یہ خیال آیا کہ آخر اگر جمیل سے شادی ہوگئی تو ایسے عیاش
لون طبع اور ملحد انسان کے ساتھ زندگی کس طرح بسر کرونگی؟
ن خیال کے ساتھ ہی دماغ کو پریشانی شروع ہوئی۔ مگر نجمہ
ی عقل اس کے جذبات پر غالب آئی۔ دل نے کہا "اے نجمہ! تو
یکار پریشان ہوتی ہے، شرع نے تجھے اس معاملہ میں مجبور نہیں
یا ہے، نکاح کوئی شخص زبردستی نہیں کر سکتا۔ قبول کرنے
ا نہ کرنے کا تجھے پورا اختیار ہے۔ بیش ازیں نیست کہ قبول نہ کرنے
ے کچھ بدنامی ہوگی۔ لیکن دنیا داروں کو راضی کرنے کے لئے
ین کو کھونا جائز نہیں ہے اور خدا و رسول کی رضا جوئی میں
نسان کی ملامت سے ڈرنا ایمانی کمزوری ہے"

ان خیالات نے نجمہ کے دل کو تقویت بخشی اور اسے
وری سکون ہوگیا۔ روش پر ٹہلنے لگی۔ اس وقت ڈوبتے
ہوئے آفتاب کی ہلکی ہلکی زرد کرنیں اس کے گلابی رخسار وں
ور سیمیں پیشانی پر اس انداز سے پڑ رہی تھیں کہ اس کا حسن
دوبالا ہو رہا تھا اور اگر غانہ باغ میں کوئی حسن شناس

نگاہ موجود ہوتی تو شاید اسے اعتراف کرنا پڑتا کہ قدرتی
گلاب کے پھول ادھر اُدھر مختلف رنگ روپ کے باغ
میں نظر آرہے تھے اُنھیں وہ دلفریب صباحت اور
دلکش ملاحت نصیب نہ تھی جو اس حسن کے پتلے جو رشمائل
انسان کو قدرت نے بخشی تھی۔ مگر خود نجمہ کو ان باتوں کا کچھ
بھی احساس نہ تھا کیونکہ اس کا دل ایک صاف آئینہ تھا
جس میں ہر شئی کی خوبی نظر آسکتی تھی۔ مگر اپنی خوبیاں پوشیدہ
تھیں، اُس کا حسن ایک کرشمۂ قدرت تھا جو صرف دو سرے دل
کی آنکھوں کو ٹھنڈک اور دلوں کو سرور بخشتا۔ وہ پھولوں
کے رنگ روپ دیکھنے میں کچھ ایسی محو تھی کہ دنیا مافیہا سے
غافل نظر آرہی تھی۔ اسی محویت کے عالم میں گلاب کا ایک
پھول توڑ لیا اور اس کو بغور دیکھنے لگی۔

"کیسی نازک اور خوشرنگ پنکھڑیاں ہیں! یہ بھینی
بھینی خوشبو کہاں سے آتی ہے؟ ان پتیوں کی ساخت
میں ہے؟ کیا اس دلفریب رنگ میں ہے؟ نہیں نہیں اگر
یہ پنکھڑیاں مسل دیجائیں تو نہ ساخت باقی رہے نہ رنگ بو
کا پتہ دے۔ دراصل جس طرح خود پنکھڑیاں دست قدرت
کا کرشمہ ہیں۔ اسی طرح یہ بھی فیضان الٰہی ہے۔ ہر شخص جانتا
ہے کہ صورت کی شناخت میں انسان کو کچھ بھی دخل نہیں
پھر بھی بہتیرے انسان خوبصورتی پر اتراتے ہیں۔ حصول
سیرت البتہ انسان کے بس کی بات معلوم ہوتی ہے مگر
غور کیجئے تو یہ بھی نفس کا دھوکہ ہے۔ درحقیقت سیرت بھی
توفیق حق اور فیض قدرت پر موقوف ہے وہ مقلوب القلوب
بُرے سے بُرے انسان کو آن واحد میں اچھا بنا دیتا ہے
اور خیر الدنیا والآخرۃ کر دیتا ہے مگر ان خوبصورت پنکھڑیوں

کے ساتھ ان کانٹوں کا کیا محل ہے؟ ہاں ہاں! یہ اجتماع بھی نامناسب نہیں بلکہ نظام قدرت کے زریں اصول کے مطابق ہے یہ کانٹے پنکھڑیوں کے محافظ ہیں۔ اگر یہ جدا کر دیئے جائیں تو آناً فاناً مرجھا کر سوکھ جائیں۔“......

خیالات کا سلسلہ اس حد تک پہنچا کہ نجمہ کو پھر اپنا معاملہ یاد آگیا اور وہ رک گئی۔ فلسیانہ آزاد اخلاقی تفکر نے اس کے دماغ کو نہ صرف سوچنے بلکہ فیصلہ کرنے کیلئے بھی تیار کر دیا تھا اس نے برجستہ یہ فیصلہ کر لیا کہ دراصل انسان کو خیر اصلی اور شر واقعی کی تمیز نہیں ہے! ارشاد ربانی ہے کہ ”بسا اوقات تم ایسی چیز کو بری سمجھتے ہو جس میں خدا نے بہتیری بھلائیاں بنائی ہیں“ یہ سمجھنا کہ جمیل میں برائیاں ہیں سخت غلطی ہے۔ ان برائیوں میں بہت بڑا دخل ماحول کو ہے۔ ابتک وہ جیسے ماحول میں رہا ہے ویسے اخلاق و عادات سیکھے ہیں، خدا مقلب القلوب ہے کیا عجب کہ اس کے ماحول بدل جائیں اور اخلاق و عادات کی اصلاح ہو جائے اس کے اطوار سے ڈرنا بزدلی ہے“ ”میں اپنا معاملہ خدا پر سونپتی ہوں وہ بندوں کا حال دیکھتا ہے“

شادی کے بعد چند مہینوں تک تو نجمہ کو ایسا معلوم ہوا کہ جو امید اس نے توکل بخدا کی تھی وہ پوری ہو گئی میاں جمیل اس پری جمال بیوی کے حسن میں کچھ ایسے محو تھے کہ ہر وقت اس کی دلجوئی پر کمربستہ رہتے اس کی ہر ادا پر پسندیدگی کا اظہار کرتے اور اس سے جدا ہونا گوارا نہ کرتے۔ اکثر یہ ہوا کہ ہفتوں احباب اور پڑوسیوں نے ان کی صورت نہ دیکھی اور لوگ یہ سمجھنے لگے کہ اب وہ جمیل ہی نہیں رہے۔

دراصل جمیل کی طبیعت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے عیش طلب دل و دماغ پر نجمہ کے غیر معمولی حسن صورت نے قبضہ کر لیا تھا اور اس پر ایک نشہ کی کیفیت طاری تھی جس کے سرور میں لہو و لعب، نفسیات اور منشیات کے دوسرے نشوں کو بھولا ہوا تھا مگر جس طرح کوئی نشہ ہمیشہ نہیں رہتا اسی طرح کوئی لذت بھی ہمیشہ تازہ نہیں رہتی۔ خوبصورت بیوی کے دوشیزہ حسن کی بہار سے گونہ سیری ہو چلی تھی اور اس کے متشرع طرز معاشرت کو تو بہرحال ناپسند کرتا تھا۔ شدہ شدہ نشہ کم ہونے لگی۔ اور رفتہ رفتہ معتاد بدعنوانیوں کی طرف رغبت بڑھنے لگی۔

زرین نامی ایک لاوارث لڑکی کو نجمہ کی ماں نے لڑکپن سے پالا تھا وہ نجمہ کے پاس ...... رہتی تھی شادی کے بعد بھی نجمہ نے اس کو اپنے شامل سسرال لا یا تاک نقشہ کی اچھی تھی اور چودھواں پندرھواں سال تھا میاں جمیل کی پرانی وحشت تازہ ہوئی تو گھر ہی میں شکار کا موقع نظر آیا۔ اس لڑکی سے آنکھیں لڑانے لگے۔ نجمہ نے ان کی حرکات کو دیکھا اور ارادے کو تاڑ گئی، مگر چشم پوشی سے کام لیتی رہی کیونکہ جھگڑنا تو کہاں تک جائز رکھتی وہ شوہر کی دلشکنی بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔ ایک روز زرین منہ بنائے ہوئے نجمہ کے پاس آئی اور کہنے لگی ”بی بی! دیکھیے دولہا میاں میری عزت بگاڑنا چاہتے ہیں“ نجمہ نے تیور بدل کر کہا ”نالائق! اگر تجھے اپنی آبرو پیاری ہوتی تو آج اس شکایت کی نوبت ہی نہیں آتی میں تیرے اطوار دیکھ چکی ہوں۔ تجھے اپنی عزت کا پاس نہیں ہے بلکہ تو دولہا میاں کو

کرنا چاہتی ہے" دوسرے وقت میاں جمیل نے
سے کہا "اجی! یہ چھوکری زینبؔ بڑی شریر ہے۔ شاید وہ
یری کچھ شکایت کر رہی تھی" نجمہ نے مسکرا کر جواب دیا۔
دلیوں کو سُننا لگانا مناسب نہیں ہے۔ میں تو سوچ رہی
اس کو امّی جان کے پاس بھیجدوں" جمیل دکچھ گھبراہٹ
"نہیں نہیں ایسی غلطی نہ کرنا۔ آگے کی وہی ایک آدمی ہے
، جانے سے تمھیں بڑی تکلیف ہوگی" نجمہ خاموش ہو رہی،

چند مہینوں کے بعد نجمہ نے یہ دیکھا کہ زینبؔ اکثر متلائی ہو
ست رہتی ہے، اور بہت زیادہ سویا کرتی ہے۔ اس
نجمہ نے سمجھا اور اسے ایک گونہ تردد پیدا ہوا۔ مگر خاموش
یل کے چہرے سے بھی پریشانی ظاہر ہوتی تھی، مگر نجمہ نے
سب سمجھا، ایک روز خلاف معمول وہ شام ہی سے نجمہ
ے میں آکر لیٹ گئے۔ کچھ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد
، "زینبؔ کی شادی کیوں نہیں کر دیتی ہو؟ تم نے خیال
آجکل وہ بہت سُست رہتی ہے" نجمہ "شادی تو ہونی ہی
کیونکہ جوان ہے۔ مگر میں عورت ذات کیا کر سکتی ہوں، تم ہی
نوہر تلاش کرو" جمیل "ہمارے محلہ میں ایک شخص
ہے۔ کلکتہ میں نوکری کرتا ہے۔ آجکل اپنے گھر آیا ہوا ہے، اس
ب کی تلاش ہے، اگر کہو تو میں اُس سے زینبؔ کا تذکرہ
" نجمہ "تذکرہ کیسا! میں تو کہتی ہوں اس کو راضی کرکے
ہی کر دو۔ غریب بے مادر و پدر لڑکی ہے۔ اس کا رخیر کا ثواب

تو ثواب ملے گا" الغرض زینبؔ کا عقد نکاح رستمؔ سے ہو گیا،
شادی کے چند ہی دنوں کے بعد وہ نوکری پر کلکتہ چلا گیا۔
کے بعد کلکتہ ہی میں اس کو خبر ملی کہ زینبؔ حاملہ ہے۔ اور ٹھیک
ساتویں ہی مہینے اس کی ماں نے خط بھیجکر خبر دی کہ الحمدللہ تمہارے
گھر میں فرزند ارجمند پیدا ہوا ہے، گو ستماسہ ہونے کی وجہ سے
کمزور بچہ ہے مگر ہر طرح سے اچھا ہے۔

اس واقعہ کو شاید دو مہینے گذرے ہونگے کہ رستمؔ کلکتہ
سے آیا۔ اور کچھ سوغات لیکر زینبؔ نجمہ کے پاس حاضر ہوئی۔ نجمہ نے
خوشی سے قبول کیا۔ اس کے تیسرے دن نجمہ جیسے ہی نماز عشا
سے فارغ ہوئی تھی، زینبؔ پہونچی اور آبدیدہ ہو کر کہنے لگی "بی بی
میرا کُناہ قصور معاف کرنا، صبح میں کلکتہ جا رہی ہوں، خدا جانے پھر
کب آنا ہو۔ مجھے یاد کیجئے گا" نجمہ "کیوں کیوں؟ ابھی تو تمہارے
میاں کو آئے ہوئے دو ہی دن ہوئے ہیں۔ ایسی جلدی کیوں کی
اور پھر تمہیں ساتھ کیوں لیجاتے ہیں؟"

زینبؔ "بی بی کیا بتاؤں، یہ مرد بڑا ہی بدمزاج ہے، کیا
آج کا واقعہ آپ کو نہیں معلوم؟" "کیسا واقعہ" نجمہ نے کہا۔
زینبؔ "صبح نو بجے میں آپ کے پاس آ رہی تھی، دولہ میاں
جیسے ہنس مکھ آدمی ہیں، مجھے انہوں نے اپنے کمرے کی طرف
بلا لیا، گھر کا حال چال پوچھ رہے تھے۔ خدا جانے کس طرح اس
پاپی مرد کو بھنک مل گئی، بے تحاشا کمرے میں گھس گیا۔ پہلے تو
ڈنڈا لئے ہوئے دولہ میاں پر جھپٹا۔ اُف غضب ہو جاتا۔ خیر ہوئی
کہ وہ اُٹھ کر بھاگے اور پچھلے دروازے سے ڈیوڑھی کی طرف
نکل گئے۔ پھر اس موئے نے سیکڑوں گالیاں دولہ میاں کو سُنائیں
پھر مجھے دو چار طمانچے لگا کر کھینچتا ہوا گھر لے گیا اور اسی وقت فیصلہ
کر دیا کہ صبح مجھکو لیکر کلکتہ چلا جائے گا" زینبؔ یہ باتیں کر رہی تھی،

اور نجمہ ندامت سے عرق عرق ہو رہی تھی، ایک سکتہ کے عالم میں تھی۔ آخر جذبۂ خجالت کو دبا کر متانت کے ساتھ بولی۔ "ہاں زین! شوہر کا حکم تو ماننا ہی چاہیے۔ خیر جاؤ۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ کبھی کبھی اپنی خیر صلاح لکھنا۔"

میاں جمیل اپنی رسوائی کا حال بیوی سے کیوں کہتے بلکہ وہ تو سمجھتے تھے کہ بیوی کے فرشتہ کو بھی ان واقعات کی خبر نہیں ہے۔ مگر زین کی روانگی کے بعد کچھ دنوں تک پریشان اور افسردہ خاطر سے اور اس مدت میں ان کی آرامگاہ زیادہ تر نجمہ کا کمرہ رہی۔

مقامی اخبارات میں نجمہ نے بھی یہ خبر پڑھی تھی کہ بمبئی کی ایک مشہور تھیٹریکل کمپنی آنے والی ہے۔ ایک دن پانچ بجے شام کو جمیل صاحب خوش خوش باہر سے آئے اور کہنے لگے "تم نے کچھ سنا؟ بمبئی کی شہرۂ آفاق رائل تھیٹریکل کمپنی آئی ہوئی ہے آج اس کا بہترین کھیل "وینس کا سوداگر" دکھایا جائے گا۔ اس میں پورشیا کا پارٹ مشہور و معروف پارسی ایکٹریس مس فیروزہ کھیلے گی جو بمبئی کی سب سے زیادہ حسین اور بہترین گانے والی طوائف ہے۔ میں چاہتا ہوں آج میرے شامل تم بھی چلو! ایسا تماشا ہر روز دیکھنے میں تھوڑا ہی آتا ہے۔ زنانہ درجہ میں بیٹھ کر پردہ سے تماشا دیکھنا۔"

"حسین مس فیروزہ" کے نام سے تو نجمہ کا ماتھا ٹھنکا مگر اس نے شوہر کے ذاتی معاملات میں دخل نہ دینے کا عہد کر رکھا تھا۔ کہنے لگی "مجھے تو معاف رکھو۔ مجھے نہ تماشا کا شوق ہے، نہ خود فروش حسینوں کی صورت کی تمنا۔ مگر ہاں۔ تم ان دنوں بہت اداس رہتے ہو۔ تھیٹر سے دل بہل جائیگا۔"

غرض کہ میاں جمیل تنہا تھیٹر تشریف لے گئے۔ اور جب دس بجے شب کو واپس آئے تو اپنی بکواس سے گھنٹوں غریب بیوی کی نیند خراب کی اور اس گفتگو میں کھیل کی تعریف تو معمولی سی تھی۔ مگر مس فیروزہ کے حسن و جمال، گانے اور پارٹ کھیلنے کی ایک داستان تھی۔

اس دن سے جمیل کا معمول ہو گیا کہ پیشہ کے کاموں سے سویرے فراغت کر کے نو بجے شب کو کھانا کھاتے اور تھیٹر چلے جاتے۔ [illegible] نجمہ سے ملاقات نہ ہوتی۔ اسی طرح تقریباً دو مہینے گذر گئے بیوی یہ سمجھتی رہی کہ روزانہ تھیٹر ہی جاتے ہیں۔

ایک دن صبح کا وقت تھا، جمیل کچہری جا چکا تھا۔ مقامی اخبار انگریزی باہر سے منگوا کر حسب معمول نجمہ پڑھنے لگی۔ ناگاہ دیدۂ [illegible] نظر آئی "جمیل وکیل پر قاتلانہ حملہ"۔ نجمہ پر گویا بجلی گر گئی۔ تھرتھر کانپنے لگی، آنکھوں تلے اندھیرا ہو گیا، اخبار ہاتھ سے گر گیا۔ پھر دل کو سنبھالا اخبار اٹھایا۔ غور سے پڑھا۔ لکھا تھا "کل ۱۱ بجے شب کو جب کہ مسٹر جمیل مس فیروزہ ایکٹرس کی فرودگاہ پر تھے، دو بدمعاش نمودار ہوئے ایک نے انہیں پکڑ کر زدوکوب کی، وہ کسی طرح چھوٹ کر بھاگ چلے تو دوسرے بدمعاش نے چھرا چلایا۔ گر ہاتھ اوچھا پڑا۔ پشت پر زخم لگا مگر زخم گہرا نہیں ہے۔ مجروح اسپتال پہنچایا گیا، جہاں زخم کو دھو کر پٹی باندھ دی گئی ہے۔ بدمعاشوں کا کچھ پتہ نہیں کہ کون تھے، کہا جاتا ہے کہ اس واقعہ کو عشق و محبت سے تعلق ہے۔ مس فیروزہ تھیٹریکل کمپنی کی ایکٹرس ہے۔ اس کے کسی چاہنے والے نے رقابت کے جوش میں اس فعل شنیع پر اقدام کیا۔ آج وہ کمپنی بمبئی جا رہی ہے"

نجمہ کے دل کی کیفیت قابل بیان نہ تھی، گھبراہٹ تو کچھ کم ہو گئی تھی، مگر اس کے ساتھ افسوس اور خجالت مل کر ایک عجیب کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ دل میں کہنے لگی "جمیل! تم نے وہ راستہ اختیار کیا ہے جو خطرے سے بھرا ہوا ہے۔ آہ! اگر دشمنوں کو کاری زخم لگتا میرا کیا حال ہوتا؟ جمیل! کاش تمہیں معلوم ہو جاتا کہ تمہاری جان [illegible]

اپنی جان سے بڑھ کر عزیز ہے۔ کاش تم سمجھتے کہ ایک چاہنے والی بیوی ہزاروں خود فروش حسینوں سے بہتر ہے۔ خدایا! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے اس ناچیز گنہگار بندی پر فضل کیا اور اپنے بہکے ہوئے اور بھٹکے ہوئے بندے کی جان بچالی۔ خدایا اتنا اور رحم کر، اس بندے کو ہدایت اور توفیق خیر عطا کر۔"

اس واقعہ کے بعد جو روش جمیل کی دیکھنے میں آئی، اس سے معلوم ہوتا تھا کہ خدا نے نجمہ کی دعا قبول کرلی، کیونکہ "زن طلبی" کے مرض سے اس کو نجات ہوگئی تھی، اور فعل شنیع اور "دلفروشی" سے اس نے توبہ کرلی تھی، اب اس کی عیاشیوں میں صرف "تاڑی نوشی" کی لت باقی رہ گئی تھی، اور کبھی کبھی تفریح طبع کی غرض سے وہ سینما چلا جاتا تھا۔ یہ دونوں باتیں بھی یوں چھوٹیں کہ عید کے روز بعد نماز جمیل کے اوباش طبع احباب ملنے کے لئے آئے۔ تاڑی کا جلسہ ہوا۔ شام تک دور چلا اسمیں جمیل کو نشہ ہوگیا۔ جلسہ برخاست کر کے گھر میں آیا۔ نجمہ وضو کر کے نماز مغرب کے لئے تیار ہو رہی تھی، جمیل نے کہا "آج تمہیں سینما چلنا ہوگا" نجمہ مسکراتی ہوئی مصلے پر چلی گئی اور نماز میں مشغول ہوگئی۔ جیوں ہی نماز سے فارغ ہوئی جمیل نے ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ اشارہ سے کہتی رہی کہ کچھ ضروری وظیفہ پڑھنا ہے۔ مگر جمیل نے کچھ نہ سنا ہاتھ کو زور سے پکڑ کر اٹھانا چاہا۔ اس میں کئی چوڑیاں ٹوٹ گئیں، اور چوڑی کا ایک ٹکڑا رگ میں گڑ گیا۔ ادھر نجمہ نے "اُف" کی، ادھر خون کا فوارہ چھوٹنے لگا۔ جمیل گھبرا گیا۔ جیب سے رومال نکال کر زخم کو دبایا مگر رومال خون سے تر ابور ہوگیا۔ اب تو اس کی پریشانی اور بھی بڑھی۔ ماں کو پکارا۔ گھر کی ساری عورتیں دوڑ پڑیں۔ خون روکنے کی ہزار تدبیریں ہونے لگیں، مگر وہ کسی طرح نہ رکا۔ نجمہ کی حالت رفتہ رفتہ بگڑنے لگی، ڈاکٹر بلایا گیا۔ جس وقت ڈاکٹر پہنچا۔ نجمہ غشی کے عالم میں تھی۔ ڈاکٹر نے کچھ دوا لگا کر خون کو روکا اور زخم پر پٹی باندھ دی، طاقت کے لئے ایک انجکشن دیدیا اور کہدیا کہ اب خطرہ نہیں ہے۔ بیہوشی صرف کمزوری کی وجہ سے ہے۔ چند گھنٹوں کے سکون سے ہوش آجائیگا۔

جمیل کا نشہ تو خون دیکھتے ہی ہوا ہوگیا تھا، اب تو تردد کے مارے اس کا خون پانی ہو رہا تھا۔ سامنے نجمہ بے حس و حرکت جسد بیجان کی طرح پڑی تھی، صرف سانس چلتی تھی جس سے حیات کا پتہ چلتا تھا۔ اس کے گلابی رخسارے زرد پڑ گئی تھی، اور اس کا معصوم چہرہ کچھ ایسی دلکش ادا پیدا کر رہا تھا کہ جمیل اس کو دیکھ دیکھ کر حسرت و افسوس کے آنسو بہا رہا تھا۔ درحقیقت آج اس کو پہلے پہل یہ معلوم ہوا کہ اس فرشتہ صفت حور شمائل بیوی کی محبت اس کے دل میں اس قدر گہری ہے کہ اس کے بغیر زندگی وبال ہوجائے۔ وہ اپنے دل میں پچتاتا اور اپنی نشہ خواری اور شوق تماشا پر ہزاروں لعنتیں کر رہا تھا۔

آدھی رات گذری ہوگی کہ نجمہ کی آنکھ کھلی اور منہ سے صدا "توبہ" نکلی۔ جمیل چونک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ اور بے اختیار یہ الفاظ اس کی زبان پر آئے "پیاری نجمہ! کیسی طبیعت ہے؟" نجمہ نے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ اور بولی "کیا تم یہیں بیٹھے ہو؟ الحمد للہ میں اچھی ہوں۔ اب تم جاکر سو رہو" جمیل اپنے دل کی کیفیت کا اظہار زبان سے نہ کرسکا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ نجمہ نے ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسو پونچھے اور کہنے لگی "ہیں ہیں! مرد ہوکر دل ایسا کمزور! میں تو ہر طرح سے اچھی ہوں" جمیل (ہاتھ باندھ کر) "پیاری نجمہ! میری خطا معاف کرو" نجمہ نے ہاتھ پکڑ لئے اور کہنے لگی "پیارے جمیل! تم مجھے کانٹوں میں نہ گھسیٹو۔ میں تمہارے تلووں کی خاک ہوں، ہاتھ جوڑ کر مجھے گنہگار نہ بناؤ۔ تم نے میری کچھ خطا نہیں کی ہے بالفرض اگر تم سے کوئی غلطی ہوئی بھی تو اس کا ذکر ہی کیا۔ تم حاکم میں محکوم، تم آقا میں کنیز" جمیل "میں صرف تمہارا ہی نہیں بلکہ خدا کا بھی سخت گنہگار ہوں۔ تمہیں میری سیاہ کاریوں کی خبر نہیں ہے"

نجمہ ۔ "اگر تمہارے خیال میں میری معافی کی ضرورت ہو تو میں صدق دل سے معاف کرتی ہوں - اور دعا کرتی ہوں کہ خدا معاف کرے"۔ جمیل :"اس وقت تو تم بہت کمزور ہو - میں تم سے بہت سی باتیں کرنا اور اپنے واقعات سُنانا چاہتا تھا" نجمہ ۔ اب مجھکو ضعف نہیں ہے - ذرا بدھنا بڑھا دو تو وضو کر کے عشا نماز پڑھ لوں پھر جس قدر چاہوگے باتیں کروں گی ۔ جمیل نے بدھنا اُٹھا کر دیدیا ۔ نجمہ نے وضو کر کے نمازیں پڑھ لیں ، اور پھر شوہر کی طرف متوجہ ہوئی ۔ "جمیل! خدا ستار العیوب ہے ۔ مجھے اپنا کوئی واقعہ نہ سُناؤ ۔ صرف یہ بتاؤ کہ اب کیا ارادہ ہے ۔" جمیل "نجمہ! تم گواہ رہو کہ میں نے اپنے سارے گناہوں سے توبہ کی ۔ اب میں صدق دل سے نمازیں پڑھوں گا ۔ کار نیک کی کوشش کرونگا اور بُری باتوں سے پرہیز کرونگا ۔ خدا میری نیت میں برکت دے" "آمین"، نجمہ نے کہا "نمازیں تو یوں بھی تم کبھی کبھی پڑھ لیا کرتے تھے" جمیل ۔"ان نمازوں کو میں نماز نہیں سمجھتا کیونکہ میرا دل کہتا ہے کہ وہ ریا کی نمازیں تھیں"

نجمہ ۔ خدا کا شکر ہے کہ تم ان باتوں کو محسوس کرتے ہو مجھے اپنی قسمت پر ناز ہے ۔ میں کہہ نہیں سکتی کہ اس وقت مجھے کیسی خوشی ہو رہی ہے ۔ خدایا! بیشک تو مقلب القلوب ہے ۔ لاریب تو ارحم الراحمین ہے ۔ تُو نے اس ناچیز لونڈی پر رحم کیا اور اس کے رفیق زندگانی کے دل میں ہدایت کا نور بھر دیا" جمیل "اگر تمہاری رائے ہو تو اب جلسوں جلوسوں کی شرکت اور لکچر بازی بھی چھوڑ دوں ۔ کیونکہ میں نے محسوس کیا ہے کہ یہ چیزیں صرف نام و نمود کی غرض سے کیجاتی ہیں ۔ للّٰہیت کا ان میں نام نہیں ۔ جماعت ، فرقہ اور قوم کے نام پر انسان اپنی ترقی اور تحصیل جاہ کا زینہ بناتا ہے" نجمہ :"تمہارا یہ خیال ایک حد تک صحیح ہے ۔ لیکن نہ سارے جلسے ایسے ہوتے ہیں ۔ نہ ہر شخص کی تقریر کا مقصد ذاتی نفع ہوتا ہے ۔ میرے ابا جان مرحوم کی تقریروں اور تحریروں کو پڑھو، پھر ان کے حالات زندگی پر غور کرو تمہیں معلوم ہو جائیگا کہ وہ جلسوں میں بہت کم شریک ہوتے تھے ۔ مگر جہاں کہیں ضرورت دیکھتے اور یہ سمجھتے کہ ان کی تقریر سے دوسروں کا بھلا ہوگا ، ایسے موقع پر وہ شریک ہو کر تقریر کرتے تھے ۔ الحمد للہ کہ تمہارے دلمیں صدق و صفا کا نور پیدا ہو چکا ہے ۔ اب موقع اور بے موقع کا امتیاز خود تمہارا دل بتائے گا"

ان باتوں میں صبح ہو گئی ، میاں بیوی نے صدق دل سے نمازیں پڑھیں اسکے بعد ان کے تعلقات کیسے رہے ؟ تفصیل کی ضرورت نہیں سمجھنا چاہیے کہ سچے دیندار اور محبت والے میاں بیوی میں جو تعلقات ہو سکتے ہیں وہ جمیل و نجمہ میں تھے جمیل کی زندگی

محبت اور فرض

از جناب منظہر رمضان پوری ام - اے - (گولڈ مڈلسٹ)

نرملا نے مسکراتے ہوئے کہا ــــــ کشور! بتاؤ تو تمہاری ٹائی کیا ہوئی؟ کشور جو پاس ہی کھڑا اس کے حسین اور دلفریب چہرہ کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا بولا۔ دیکھ لیا ہے، مسکراتے ہوئے کہا ــــــ شاید آج پھر تمہارے سر میں درد ہے۔ نرملا کچھ نہ بولی، اس کے لب پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ کشور بولا۔ نرملا ممکن ہے تمہارے سر میں درد ہو لیکن مجھے اپنی ٹائی پر سچ مچ رشک آ رہا ہے، دیکھو تمہارے سر سے کس طرح لپٹی ہوئی ہے۔ نرملا درخت کی ایک شاخ پر بیٹھی، پاؤں کو دلفریب انداز سے ہلاتی ہوئی بولی ــــــ خوب! سر کے درد کی بھی ایک ہی کہی، تم سمجھتے ہوگے کہ میں نے تمہاری ٹائی پر ڈاکہ ڈالنے کے لیے سر کے درد کا ڈھونگ کیا ہے۔ واہ کیا کہنے ہیں، بڑی دُور کی سُوجھی۔ کشور ہنستا ہوا بولا۔ نہیں! نہیں!! میرے کہنے کی ہرگز یہ غرض نہیں، میں اور تم پر چوری کا الزام؟ وہ بھی تمہارے سامنے، لیکن معاف کرنا، تم ہو بڑی ــــــ نٹ کھٹ۔ نرملا اور کشور میں اسی طرح دیر تک چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی۔ آفتاب غروب ہونے لگا، فضا پر تاریکی پھیلنے لگی، نرملا بولی کشور! اب کافی سیر ہو چکی، چلو اب گھر چلیں، کیا تم تھوڑی دُور تک میرا ساتھ دوگے؟ - کشور کچھ نہ بولا۔ ساتھ ہو لیا، کچھ دُور جا کر بولا ــــــ نرملا! اب مجھے معاف رکھو، دُور جانا ہے، اگر دیر ہو گئی تو پرنسپل صاحب کیفیت طلب کرینگے، ان دنوں ہوسٹل میں بڑی سختی برتی جا رہی ہے، تمہیں بھی تو دیر ہو رہی ہے۔ ساتھ ساتھ چلنے سے خواہ مخواہ دیر ہوگی، تمہارے پتا جی بھی تو ــــــ کشور نے جملہ ختم نہ کیا تھا کہ نرملا بول اٹھی۔ میری بات چھوڑو، تم اپنی خبر لو جانا چاہتے ہو تو جاؤ، میں نے تمہارا راستہ نہیں روک رکھا، تمہیں تو برابر پرنسپل صاحب کا ڈر لگا رہتا ہے۔ کشور خاموش رہا۔ نرملا مسکرائی، بولی جاؤ نہ، تم نہیں جاتے؟ نہ جاؤ میری بلا سے۔ دیکھنا مجھے پھر کچھ نہ کہنا۔ دونوں ہنس پڑے۔ ہنسی میں عجب راز تھا، دونوں نے اپنی اپنی راہ لی۔

نرملا گھر آئی، دیکھا رنجیت بڑی بے چینی کے ساتھ برآمدہ میں پاؤں پٹک پٹک کر ٹہل رہا ہے۔ وہ دھیمے سروں میں گاتی ہوئی نہایت بے پرواہی سے اندر جانے لگی، رنجیت یہ انداز دیکھ کر پیچ و تاب کھا گیا، بگڑ کر بولا۔ تم اتنی دیر تک کہاں تھیں؟ نرملا رک گئی، کمر پر ہاتھ رکھ کر ایک عجیب انداز سے بولی، کیوں! تمہیں اس سے کیا؟ آج میں نے کوئی نئی بات نہیں کی، ہر روز اسی وقت آیا کرتی ہوں۔ لیکن ــــــ میں تمہارے اس طرح کے سوال کا مطلب بالکل نہ سمجھی، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ صاف صاف کہو۔ رنجیت غصہ سے کانپتا ہوا بولا ــــــ جانتا ہوں، تم ہر روز اسی وقت آیا کرتی ہو۔ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ کہاں اور کس کے ساتھ رہتی ہو۔ اسی لئے تو پوچھ رہا ہوں۔ نرملا! کشور سے ملنا نہ چھوڑوگی؟ دیکھو ــــــ رنجیت آگے بولنا ہی

چاہتا تھا کہ نرملا نے زمین پر پاؤں پٹک کر کہا ـــــ خاموش!
تمہیں ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اس جواب سے رنجیت
کے مزاج کا پارہ اور چڑھ گیا، گرج کر بولا ـــ تعلق کیوں نہیں؟
جانتی ہو چند ہی دنوں میں تم میری بیوی بننے والی ہو۔ کشور
سے تمہارا اس طرح ملنا جلنا میں کسی قیمت پر برداشت نہیں
کرسکتا ہوں، سمجھیں! نرملا تن کر بولی میں اب سمجھی۔ لیکن
رنجیت! تم بھی اپنے کان کے پردوں کو اچھی طرح کھول کر سُنو!
میں تمہیں دھوکہ میں رکھنا نہیں چاہتی ـــــ میں تم سے
شادی نہیں کر سکتی، میں تمہاری بن کر کبھی سُکھی نہیں رہ
سکتی۔ رنجیت اس جواب سے سناٹے میں آگیا، بگڑ کر
بولا ـــ تم بھی اپنے کو نہ بھولو، جانتی ہو؟ آج نہیں برسوں
پہلے اس کا فیصلہ ہو چکا ہے، کرنل صاحب نے زبان دیدی ہے۔
میں جانتا ہوں، تم نے کالج میں تعلیم پائی ہے۔ آزادی کا سبق
پڑھا ہے، راہ چلتے انسان سے پریم کرنا سیکھا ہے۔ آزاد تتریوں
کی مانند پرواز کرنا شروع کیا ہے۔ لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہئے
کہ یہ بھارت ورش ہے۔ تم اسی سرزمین کی اولاد ہو، تم اسی
فضا میں پیدا ہوئیں، پلیں اور بڑھیں، اس کے بنائے ہوئے
قانون کو ـــ سماج کو تم کبھی ٹھکرا نہیں سکتیں۔ تمہارا
خیال، تمہارا ارادہ، تمہارا فیصلہ، تمہارا اقدام، کوئی قیمت
نہیں رکھتا، نرملا! ہوش کے ناخن لو۔ اگر اب تک نہ سمجھ
سکیں تو سمجھو اور غور کرو۔ کیا کرنل صاحب کشور جیسے پردیسی سے
تمہاری شادی کرکے اپنے خاندان کو محض تمہاری خوشی کی
خاطر داغ لگا سکیں گے؟ ـ نرملا گردن ٹیڑھی کرتی ہوئی
بولی ـــ تمہاری یہ مجال کہ مجھ پر الزام دھرو، میری تعلیم
میری آزادی، اور میرے ارادہ کی توہین کرو، رنجیت! تمہیں مجھ

سے معافی مانگنی پڑیگی، اور پھر اسی پردیسی نے جسے تم اپنی غلط
اور بدقسمتی سے پردیسی سمجھ رہے ہو ایک بار نہیں دو دو بار تم
اور میری، دونوں کی جانیں بچائی ہیں، وہ پردیسی ضرور تھا۔ لیکن
اس نے ہمارے لئے اپنی جان کو جان نہ سمجھا۔ اپنی زندگی کی کو
قیمت نہ لگائی۔ اُس وقت تم بھی تو کھڑے تھے۔ پھر ـــ
تم نے ـــــ؟

دونوں میں نوک جھونک ہو رہی تھی کہ کرنل صاحب آ
نرملا خاموش ہوگئی۔ رنجیت نے بھی سر جھکا لیا۔ کرنل صاحب
قریب آکر بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے ـــ شا
تم دونوں میں زوروں پر بحث ہو رہی تھی، ہے نا؟ اچھا اب آ
اندر چلیں۔ اتنی سردی میں یہاں دیر تک رہنا ٹھیک نہیں
تم دونوں ایک دوسرے کا ذرا بھی خیال نہیں کرتے۔ شاید شا
کے بعد تم دونوں کے آپس کا یہ جھگڑا ختم ہو جائے گا۔ پرماتما
ایسا ہی ہو، ورنہ یہ شادی صحیح معنوں میں شادی نہ ہوگی،
عذاب جان۔ "پتا جی!" نرملا نے بیقراری کے عالم میں
اور بیہوش ہوکر زمین پر گر پڑی۔ رنجیت نے اس کے نازک جسم
کو گود میں اٹھا کر پلنگ پر ڈال دیا۔ کرنل صاحب پر سکتہ طاری
نرملا کی بیہوشی دیکھ کر بہت زیادہ گھبرا اٹھے، ان کے ہاتھ پا
پھول گئے۔ رنجیت نے فوراً ڈاکٹر کو ٹیلیفون کیا۔ ڈاکٹر آیا
ہوش میں لانیکی تدبیریں کیں۔ دیر کے بعد ہوش آیا۔ ڈاکٹر
حالات کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا ـــــ معلوم ہوتا
اس کے دل کو کوئی سخت صدمہ پہونچا ہے۔ گھبرانے کی بات
نہیں ہے۔ لیکن اس کو ہر وقت خوش رکھنا بہت ضروری
نرملا اور رنجیت بچپن سے ایک ساتھ رہتے تھے، رنجیت
نرملا پر دل و جان سے فریفتہ تھا، غلط نہ ہوگا اگر کہا جائے

وہ صرف اس کی محبت کے سہارے جیتا تھا، لیکن نرملا بھی اس کی محبت کا دم بھرتی تھی، یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کشور اور نرملا کی محبت کا علم رنجیت کو ضرور تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ باوجود انتہائی دوستی کے کشور کے ساتھ در پردہ رقیبانہ سلوک کرتا تھا۔ اس نے اپنے طور پر فیصلہ کر لیا تھا کہ نرملا کو ہر ممکن طریقے سے اس سے ملنے جلنے سے باز رکھے گا۔ لیکن اس روک تھام کا جو نتیجہ نکلا وہ اس کے پیش نظر تھا۔

کشور ہر اتوار کو نرملا سے ملاقات کی غرض سے آیا کرتا تھا۔ رنجیت دیکھتا لیکن خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا۔ نرملا جان بوجھ کر اس کے چڑانے کا سامان مہیا کرتی۔ رنجیت چشم پوشی کر لیا کرتا۔ آخر اس کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اکثر نرملا اور کشور اس کے سامنے سے قہقہہ لگاتے ہنسی مذاق کی باتیں کرتے گذر جاتے۔ صبر کرتے کرتے رنجیت کا سینہ چھلنی ہو گیا۔ اس نے کشور کے قتل کا تہیہ کر لیا۔ کئی دفعہ اس کو مواقع ہاتھ آئے، لیکن صرف اسی خیال سے باز رہا —— ممکن ہے نرملا بھی خودکشی کر بیٹھے۔ وہ نرملا کی موت کے سوا سب کچھ برداشت کر سکتا تھا۔ دل ہی دل میں اپنے آپ کو سمجھاتا —— رنجیت! اگر تجھے نرملا سے سچ مچ محبت ہے تو اس کی بیوفائیوں کو بھی برداشت کر، اگر تو نہیں کر سکتا تو تجھے اس سے محبت کرنے کا کوئی حق نہیں، سچا پریمی پریم کی خاطر سب کچھ برداشت کرتا ہے، وہ کشور سے پریم کرتی ہے —— کرنے دے، لیکن —— نہیں! وہی نرملا پہلے کہا کرتی تھی —— رنجیت! جب تم کہیں چلے جاتے ہو تو مجھے اپنا جیون تک سونا معلوم ہوتا ہے۔ اف! —— کیسی بیوفا ہوتی ہیں استریاں؟ ان کے سینہ میں کیسا زہر چھپا رہتا ہے سچ ہے بڑے سے بڑا عقلمند آدمی بھی ان کے راز کی تہہ نہیں پہونچ سکتا۔ لیکن نہیں! نرملا نردوش ہے بیقصور ہے اس کا کوئی اپرادھ نہیں۔ اپرادھ میں نے کیا ہے اپرادھی میں ہوں، میں نے شروع میں روک تھام نہ کی۔ ورنہ آج یہ دن دیکھنے نصیب نہ ہوتے اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا —— پھر اس سے چھٹکارے کی صورت؟ —— کشور کا قتل۔

رات کے بارہ بجے تھے چاندنی ہر چہار طرف پھیلی ہوئی تھی، ہوا مستانہ وار چل رہی تھی، ارد گرد کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں چاندنی رات میں عجیب دلکش منظر پیش کر رہی تھیں۔ نرملا ابتک جاگ رہی تھی، سونے کی ہر ممکن کوششیں بیکار ثابت ہوئیں آخر بستر چھوڑ، کھڑکی سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا دل بے چین تھا چاندنی رات کے دلفریب مناظر سے دل بہلانے لگی۔ کشور آج یہیں سویا تھا۔ باتیں کرتے کرتے رات زیادہ آچکی تھی۔ نرملا نے اسے جانے نہ دیا تھا۔ نیچے والے کمرہ میں اسکے سونے کا انتظام کر دیا تھا۔ وہ خیالات کی دنیا میں کھو گئی، دفعتاً اس نے دیکھا —— رنجیت آہستہ آہستہ قدم اٹھائے۔ کشور کے کمرہ کی طرف بڑھا چلا جا رہا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی یہ دیکھ کر کانپ اٹھی وہ معاملہ کی تہہ تک فوراً پہونچ گئی، اس کا دل نفرت اور غصہ سے بھر گیا۔ اس نے بھی دیوار سے لٹکتی ہوئی تلوار سنبھالی اور

تیزی کے ساتھ نیچے چلی آئی۔ رنجیت کشور کے کمرہ میں داخل ہو چکا تھا۔ کشور گہری نیند میں تھا۔ رنجیت نے وار کرنا چاہا۔ پیچھے سے کسی نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ مڑ کر دیکھا۔ نرملا کھڑی کانپ رہی ہے وہ سناٹے میں آگیا، اس کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ نرملا کا بازو حسین چہرہ آنسوؤں سے شرابور تھا۔ اس نے اشارہ کیا رنجیت برآمدہ میں آگیا، نرملا بھرائی ہوئی آواز میں بولی ـــــ رنجیت! تم اتنے بزدل ہو مجھے اس کا وہم وگمان بھی نہ تھا سوئے ہوئے کشور کو قتل کرنا چاہتے تھے؟ چھی! میں تمہیں اتنا گرا ہوا نہ سمجھتی تھی۔ رقابت کی آگ نے تمہیں اندھا کر دیا ہے، ورنہ تم! ـــــ ایسی ذلیل حرکت۔ خبردار! اب ایسی ناپاک کوشش نہ کرنا ـــــ ورنہ یاد رکھو! تمہاری زندگی کا ٹمٹماتا ہوا چراغ نرملا کے ہاتھوں گل ہوگا۔ جاؤ، میری نظروں کے سامنے سے دور ہو جاؤ۔ جاؤ۔ میری طرف کیا دیکھ رہے ہو؟ شرم سے کٹ مرو ـــــ اپنی بزدلی پر۔

رنجیت اب نرملا کی محبت کی طرف سے بالکل مایوس ہوگیا۔ اس کو اس بات کا سخت صدمہ تھا روز بروز اس کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی، وہ اکثر اپنے دل میں سوچتا ـــ نرملا اب تک معصوم ہے اس کا کوئی قصور نہیں میری ہی طرف سے پے در پے زیادتیاں ہوئیں۔ سچ ہے اس روز میں کتنی ذلیل حرکت پر آمادہ تھا۔ میں نرملا کے ہرگز لائق نہیں۔ واقعی میں ذلیل ہوں، اس کا مجھے ٹھکرانا درست ہے۔

(۳)

ایک روز نرملا گھاٹ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی کشور پاس ہی بیٹھا اونچے سروں میں گا رہا تھا۔ دور سے آواز صاف سنائی دے رہی تھی ـــــ پپیہا! پیا کے کس اور؟ رنجیت اتفاقیہ طور پر ادھر سے گذرا، اس نے گانے کی آواز سنی اور آنکھوں سے سب کچھ دیکھا۔ لیکن سر جھکائے قریب سے گذر گیا۔ آج نرملا نے رنجیت کو ایک عرصہ کے بعد دیکھا تھا، اس کی صحت بگڑ چکی تھی، صد درجہ دبلا معلوم ہو گیا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ کسی مہلک مرض میں مبتلا تھا۔ اب نرملا کا دل گھاٹ پر نہ لگا۔ وہ اداس ہوئی۔ کشور سے معافی چاہی۔ اور فوراً گھر لوٹ آئی کمرہ میں آکر صوفے پر بیٹھی تھی سوچنے لگی۔ آخر کشور کی محبت کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ آہ! اس پردیسی نے میرے دل پر اچھی طرح قبضہ جما رکھا ہے ـ میں کیا کروں؟ ـ کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ کیا پتا جی گوارا کریں گے کہ میری شادی کشور سے ہو۔ نہیں ہرگز نہیں۔ اور کشور ہی کب ـــ؟ ـ اس کی تو شادی ہو چکی ہے۔ پھر میں اس طرح رنجیت کی جان کیوں لے رہی ہوں؟ یہ میں جانتی ہوں کہ کشور سے "علیحدگی" کا دوسرا نام "موت" ہے لیکن نہیں۔ عورتوں میں تو قوت برداشت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ ان پر مصیبتیں آتی ہیں، وہ نہایت آسانی کے ساتھ برداشت کر لیتی ہیں۔ انہیں قربانی کا خاص جذبہ ہوتا ہے۔ پھر میں کیا عورت نہیں ہوں؟ کیا رنجیت کی خاطر اپنی محبت اپنی تمناؤں اور اپنے جذبات کی قربانی نہیں کر سکتی ہوں؟ ـ اف! رنجیت میری بے اعتنائیوں کے ہاتھوں موت کی گھاٹ سے قریب ہوتا جا رہا ہے اور میں ـــــ وہ رونے لگی۔ کچھ دیر بعد ہاتھ منہ دھو، بال سنوار اور کپڑے بدل ڈرائنگ روم میں آئی

دائی سے پوچھا، چمپا! بابو نہیں آئے ؟ - ابتک نہیں آئے، دائی نے جواب دیا۔ وہ رنجیت کے کمرہ کی طرف گئی ۔ آہستہ سے دروازہ کھول کر جھانکا، دیکھا - رنجیت سینہ پر دونوں ہاتھوں کو رکھے، چھت کو دیکھ رہا ہے - اس کا چہرہ مرجھایا ہوا ہے، گالوں پر آنسوؤں کی بڑی بڑی بوندیں لڑھک کر تکیہ پر گر رہی ہیں - بال بکھرے، پریشان حال ہے - بار بار کراہ اٹھتا ہے - معلوم ہوتا تھا، کسی تکلیف سے بیچین ہے - نرملا سے یہ سماں نہ دیکھا گیا، فوراً کمرہ میں داخل ہوگئی، اس کے سامنے گھٹنے کو ٹیک کر بولی ------ رنجیت! تمہیں ہو کیا گیا ہے ؟ - تم نے اپنی کیا حالت بنا لی ہے - آہ! تم رو رہے ہو - رنجیت نے فوراً آنسو پوچھ، مسکراتے ہوئے کہا - آج میرے سر میں بلا کا درد ہے، نرملا! اور تو کوئی ایسی خاص بات نہیں، یہ تم کیا کر رہی ہو! اٹھو! ---- یہاں بیٹھو، تم پریشان نہ ہو، پرماتما کو یہی منظور تھا اس میں تمہارا کیا دوش ہے ؟ - مجھسے پوچھو، تم میری نگاہ میں نردوش ہو - یہ سب بھاگ کے چکر ہیں، نرملا! تم ناحق فکر کرتی ہو، ایں تم رونے لگیں ؟ - پرماتما کیلئے نہ رو، نہیں تو ڈاکٹر صاحب نے برابر خوش رہنے کیلئے کہا ہے - نرملا کی آنکھوں سے آنسو جاری تھا، رنجیت کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر بولی ------ رنجیت! مجھ سے نہ چھپاؤ، میں سب کچھ جانتی ہوں، میری ہی وجہ سے تمہاری یہ حالت ہوئی ہے - لیکن ----- کیا تم اپنی نرملا کو ----- معاف نہیں کر سکتے ؟ میں پرتگیا کرتی ہوں، قسم کھاتی ہوں، پھر کبھی تم سے بیرخی نہ برتوں گی - پرماتما کیلئے مجھے معاف کردو، معاف کردو ----- بولو --- کیا تم نے معاف کردیا، کہتی کہتی نرملا بیہوش ہوگئی، رنجیت بولا ---- ڈاکٹر کو فوراً فون کرو، پتاجی کو خبر کرو، چمپا کو ادھر بھیجو، اُف! کیا کروں ؟ - غضب ہوگیا ---- رنجیت نے نرملا کو پلنگ پر لٹا دیا، پانی کی چھینٹیں مار کر ہوش میں لانے کی کوششیں کیں، لیکن بیسود ---- ڈاکٹر آیا، دیکھا ---- نرملا کا دل پہلے سے بھی زیادہ کمزور ہوگیا ہے - لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں، اچھی ہوجائیگی، رنجیت سے مخاطب ہو کر بولا ---- رنجیت! تمہاری محبت کا مجھے علم ہے، میں سوچتا ہوں تم کتنے تندرست تھے، لیکن اب تمہاری یہ حالت! وہ کچھ نہ بولا، ڈاکٹر نے پھر کہا، سنتے ہو! فکر نہ کرو، اچھی ہوجائے گی - اس نے دوا دی، نرملا کو ہوش آگیا - چند ہدایتیں دیکر رخصت ہوگیا -

(۴)

نرملا نے نہایت عاجزی کیساتھ سوال کیا ---- کشور! کیا تم مجھسے شادی نہیں کرسکتے ؟ وہ اس سوال سے گھبرا اٹھا، اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ کبھی نرملا اس سے اس قسم کا سوال کریگی وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اس کیلئے نرملا سے شادی کرنا مشکل نہیں بلکہ غیر ممکن ہے - نرملا کو معلوم تھا کہ کشور کی شادی ہوچکی ہے، اب اس واقفیت کے ہوتے ہوئے اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا جواب دے - بیقرار ہو کر بولا ---- نرملا! کیا کہہ رہی ہو ؟ شادی اور پھر تمہارے ساتھ! کیا میرا اور تمہارا ملاپ ممکن ہے ؟ کیوں اپنی

زندگی تباہ کرنی چاہتی ہو! نرملا کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اسکی طرف سے منہ پھیر لیا، بولی ــــ "میرا اور تمہارا ملاپ" بات تو تم نے سچ ہی کہی ہے۔ پھر اس سلسلہ کا خاتمہ ہی کر ڈالنا چاہئے۔ ہے نہ! کشور!۔ کشور نے سر جھکا لیا، اس کا چہرہ پسینہ سے تر تھا۔ "ایسا مت کہو نرملا!" نرملا بولی ــــ ہمیں ایکدوسرے کی بھلائی کی خاطر ایسا ہی کرنا چاہئے کشور! پھر ذرا مغموم ہو کر بولی ــــ تم ہمارے گھر آ جا سکتے ہو، ہم دونوں کی برابر ملاقاتیں ہوا کریں گی لیکن ــــ اب دوسرے طریقہ پر۔

اس واقعہ کے بعد سے نرملا نسبتاً زیادہ خوش نظر آنے لگی، دریائے محبت کا بہاؤ اب رنجیت کی طرف بہہ نکلا۔ رنجیت پھولا نہ سماتا تھا، اس کی صحت روز بروز اچھی ہونے لگی، وہ کبھی تنہائی میں سوچا کرتا ــــ اف! کیسا بھیانک خواب تھا؟۔ اس عرصہ میں متعدد اتوار آئے لیکن کشور نے ادھر کا رخ نہ کیا۔ نرملا دل ہی دل اس کی شکایتیں کرتی، اس کو ملزم ٹھہراتی، بیوفا کے نام سے پکارتی ــــ دیکھو! کشور کتنا خود غرض انسان تھا جب اسے معلوم ہوا کہ نرملا اب اگلی سی گرمجوشی کے ساتھ نہیں مل سکتی تو اس نے آنا تک بند کر دیا، کیا گذری ہوئی محبت کی باتیں اتنی جلد بھول گیا، کیا میری یاد اسے ستاتی، اف! مجھے بالکل بھول بیٹھا؟۔ ان باتوں کو سوچ کر کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ متوحش ہو جاتی لیکن رنجیت پر اس حقیقت کو آشکارا نہ ہونے دیا، وہ اس کے سامنے اپنے کو اس طرح پیش کرتی گویا کشور کو بالکل بھول چکی ہے۔ کرنل صاحب بیٹی سے کشور کی اس طویل غیر حاضری کے متعلق اکثر سوال کرتے لیکن وہ یہ کہکر ٹال دیتی ــــ "انکا امتحان قریب ہے، تیاری میں مشغول ہیں" ــــ

(۵)

ایک روز کشور نے اخبار میں پڑھا ــــ "اتوار کی شام کو کماری نرملا دیوی کی شادی کنور رنجیت سنگھ کے ساتھ بخیر و خوبی بڑے تزک و احتشام کیساتھ انجام پا گئی، شہر کے تقریباً تمام سربرآوردہ حضرات اس تقریب میں شریک تھے"۔ اس خبر کے پڑھتے ہی اس کا چہرہ زرد پڑ گیا، آنکھوں سے بے اختیارانہ آنسو بہ نکلے۔ پھر آپ ہی آپ بولا، نرملا! تم حقیقت میں دیوی ہو، پرماتما تمھیں سکھی رکھے، جہاں رکھو خوش رہو، لیکن کشور کو اس جیون میں شاید سچا سکھ نہ مل سکیگا۔

کشور کا امتحان ختم ہو گیا، وہ گھر لوٹ آیا، یہاں ہر طرح کا سامان عیش موجود رہنے پر بھی اُس کا دل ہر وقت اداس رہتا تھا، نیروپما، اس کی بیوی بہت زیادہ حسین تھی، گندمی رنگ، چھریرا جسم، بڑی بڑی زلفیں، دو سیاہ آنکھیں مست و مدہوش کر ڈالنے کیلئے کافی تھیں ایک دن اس نے بیوی سے پوچھا ــــ میکہ میں تمہیں کس نام سے پکارا جاتا ہے؟۔ نیروپما مخصوص انداز میں بولی ــــ "نیرو" کشور مسکرایا، بولا، صرف "نیرو" نیروپما حیرت سے تکتی ہوئی بولی ــــ آپ تو جانتے ہی ہیں میرا پورا نام نیروپما ہے، لیکن گھر والے لاڈ سے "نیرو" ہی کہکر پکارتے ہیں۔ کشور محبت بھرے انداز میں بولا، تمہارا نام نیروپما ہے، گھر والے پیار سے "نیرا

کہکر پکارتے ہیں، کیا میں تمہیں محبت سے نرملا کہکر بلا سکتا ہوں ؟۔ کہو! تمہیں یہ نام پسند ہے ؟۔ اس نے جواب دیا، آپ میرے پتی دیو ہیں، آپ کی خوشی میں میری خوشی ہے، اگر آپ کو نرملا سے عشق ہے تو میں نرملا بننا پسند کرتی ہوں، آپ شوق سے نرملا کہکر بلائیں، نرملا ہے تو بڑا پیارا نام !۔ کشور کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں، نرملا کہتا ہوا آگے بڑھا اور بیوی کو سینہ سے لگا لیا۔

امتحان کا نتیجہ شائع ہوا، کشور نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ لوگوں کی صلاح سے آئی پی، ایس کے امتحان میں شریک ہوا، قدرت نے ساتھ دیا، مقابلہ میں آگیا۔ اسسٹنٹ سپرانٹنڈنٹ آف پولیس کی حیثیت سے تقرری ہوئی، اب کیا تھا عیش کیسا تھ زندگی بسر ہونے لگی۔ نرملا سے ملے ہوئے ڈھائی سال کا عرصہ ہوگیا۔ اتفاقاً سرکاری کام سے اُدھر جانا ہوا، دل میں آیا کہ چلو نرملا کو دیکھ آؤں۔ عرصہ سے اس کی کوئی خبر نہیں ملی ہے۔ وہ نرملا کے مکان کے پاس آکر کھڑا ہوگیا، سوچا، مجھ سے ملنا پسند بھی کرے گی یا نہیں۔ پھر بھی آزمائش کی خاطر دروازہ کھٹکھٹایا، ملازم آیا، اس نے اپنا کارڈ اندر بھجوا دیا — کارڈ ملتے ہی رنجیت بھاگا ہوا آیا کشور کے سینہ چمٹ گیا۔ محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا۔ دونوں میں گفتگو ہونے لگی۔ باتوں ہی باتوں میں کشور کو معلوم ہوا کہ کرنل صاحب کو مرے دو سال ہوگئے، اس نے حد درجہ افسوس ظاہر کیا۔ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک نرس دو بچوں کو لیکر ڈرائینگ روم میں داخل ہوئی کشور نے انہیں فوراً پہچان لیا۔ آگے بڑھکر دونوں کو پیار کیا رنجیت سے مخاطب ہوکر بولا۔ حیرت ہے بھائی رنجیت یہ دونوں کے دونوں نرملا سے بالکل مشابہت رکھتے ہیں۔ ذرا بھی فرق نہیں، یقین مانو، میں نے انہیں دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ تمہارے بچے ہیں۔ وہ دیر تک بچوں سے کھیلتا رہا، لیکن نگاہیں جس کو ڈھونڈھ رہی تھیں اسکا پتہ نہ تھا، دل ہی دل میں اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا نرملا اُس سے ملنا تک پسند نہیں کرتی ہے اس نے آکر سخت حماقت کی۔ اس خیال کے آتے ہی گھبراہٹ میں اٹھ کھڑا ہوا، بولا۔ بھائی رنجیت ! اب کافی دیر ہوچکی، جاتا ہوں، پھر اِدھر آنا ہوا تو ضرور حاضر ہونگا۔ نرملا تک میرا سلام پہونچا دینا۔ رنجیت کی آنکھوں میں آنسو بھر آیا، بچوں کی طرح بلکتا ہوا بولا۔ نرملا تک تمہارا سلام پہونچا دیتا لیکن وہاں تک میری رسائی کہاں ؟ — آسمان کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا — آج چھ مہینے ہوئے ہیں وہ ہم سب کو چھوڑ کر ہمیشہ کیلئے چلی گئی ہے۔ اِن بچوں کی دیکھ بھال کیلئے مجھے زندہ رہنے کا حکم دے گئی ہے۔ رنجیت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کشور نے سگے بھائی کی طرح اس کو سینہ سے لگا لیا، اس کی آنکھوں سے موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ آنسوؤں کو ضبط کرتا ہوا بولا —— رنجیت! صبر سے کام لو، بچہ نہ بنو، چھ ہی مہینہ میں تم نے اپنی یہ حالت کر ڈالی۔ اپنے لئے نہیں۔ اِن معصوم بچوں کے لئے تو تمہیں زندہ رہنا پڑیگا۔ نرملا کے سوگ میں رونا اور رو رو کر جان دینا —— یہ تمہارا فرض نہیں بلکہ سب سے بڑا فرض ان بچوں کی پرورش ہے۔ اپنے کو سنبھالو اور فرض کو ادا کرو۔ نرملا کی بیقرار روح کو سکھ ...

شانتی پہونچاؤ'۔ رنجیت کو ایسا معلوم ہوا ـــــ نرملا کھڑی ہے اور کشور کا روپ بدل کر فرض کی عدم آدائے گی پر تنبیہ کر رہی ہے۔

(۶)

آج کون کہہ سکتا ہے کہ کشور اور رنجیت میں کبھی رقابت تھی۔ کبھی دشمنی تھی۔ دونوں بچے کشور کے گھر بڑے ناز و نعم سے پل رہے ہیں۔ ان نیرو پما کو ماں سمجھتے ہیں۔ نیرو پما جب تنہائی میں انہیں سینہ سے چمٹا لیتی ہے تو فرط خوشی سے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ معصوم بچے نیرو پما کے دھڑکتے ہوئے دل پر اپنے چاند سے منھ رکھکر ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھنے لگتے ہیں۔ نیرو پما کو اس سے سچا سکھ ملتا اور انہیں کو اپنی زندگی کا سرمایہ سمجھتی اور محبت کا ماحصل ہے۔

سکسپیر کی شہرۂ آفاق تمثیل "AS YOU LIK EIT" کا ترجمہ

"مُن کی چاہ"

مترجمہ جناب سعید الحق صاحب دسنوی بی اے (آنرز)

—— (۴) ——

اورلینڈو:- تم نے کسی مریض کو اچھا کیا ہے؟

روزلینڈ:- بیشک! ایک شخص کو میں نے اس مرض سے نجات دی ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ مجکو محبوبہ تصور کرلے اور وہ میرے پاس آکر دعوی عشق کرتا تھا اور اپنے فغان نیم شب کی داستان سناتا تھا اور میں نے اپنے آپ کو متلون مزاج بنالیا۔ کبھی اس سے محبت کرتا اور کبھی اس سے نفرت کبھی اس کو ہنساتا تھا اور کبھی اسیر لعنتیں بھیجتا تھا۔ کبھی روتا تھا اور کبھی اس پر تھوک پھینکتا تھا۔ غرضکہ میری ان سب حرکتوں سے وہ اس جنون سے خود تنگ آگیا اور دنیا سے الگ ایک گوشہ میں زندگی بسر کرنے لگا۔ اور میں تمہارے جگر کو بھی عشق کے تمام داغوں سے صاف کردونگا۔

اورلینڈو:- میرا مرض قابل شفا نہیں ہے۔

روزلینڈ:- اگر تم مجکو روزلینڈ کہہ کر پکارا کرو اور میری جھونپڑی میں آکر اپنا افسانۂ الفت کہو تو تم کو بہت جلد شفا ہو جائے گی۔

اورلینڈو:- بہت خوب! مجکو دل وجاں سے پسند ہے۔

تیسرا سین

جنگل کا دوسرا حصّہ

(ژراک پیچھے کھڑا ہوا ہے)

ٹچ اسٹون:- آڈری، آؤ میں تمہاری بکریوں کو لے آؤنگا۔ آڈری تم کو میرا سادہ چہرہ بشرہ پسند ہے۔

آوڈری:- چہرہ بشرہ۔ یہ کیا؟

ٹچ اسٹون:- میں تمہاری بکریوں کی نگہبانی کرونگا۔ کاش خدا تم کو شاعرانہ تخیل بخشتا۔

اوڈری:- میں نہیں جانتی کہ شاعرانہ کس بلا کا نام ہے۔ کیا اس کے معنی سچائی اور عصمت کے ہیں؟

ٹچ اسٹون:- شاعری ریاکاری کا نام ہے۔

اوڈری:- چونکہ میں حسین نہیں ہوں۔ میں خدا سے دعا کرتی ہوں کہ وہ مجکو باعصمت بنائے۔

ٹچ اسٹون:- خدا کا شکر ہے کہ اس نے تم کو ناپاک بنایا۔ بدظنی بعد کو آئے گی۔ کچھ بھی ہو میں تجھ سے بیاہ کرونگا۔ اور اسی غرض سے میں سر اولیور مارٹکسٹ

(Sir Oliver martext) سے
جو نزدیک کے دیہات کا پادری ہے مل چکا ہوں
اس نے وعدہ کیا ہے کہ اس جنگل میں آکر وہ ہم دونوں کو
بیاہ دیگا۔

ژاک :۔ (جی میں) میں بخوشی اس تماشہ کو دیکھونگا۔

اوڈری :۔ خدا ہم لوگوں کو خوشیوں کی دولت
سے سرفراز کرے۔

ٹچ اسٹون :۔ یہاں نہ کوئی کلیسا ہے اور نہ کوئی
مجمع ہوگا۔ اگر کچھ تماشائی ہیں تو وہ سینگ دار چوپائے
ہیں بہرکیف جس طرح شہر بیاہ والا شہر ایک قریہ سے
زیادہ معزز ہوتا ہے اسی طرح بیاہے آدمی کی پیشانی
بن بیاہے کی پیشانی سے زیادہ معزز ہوتی ہے یہ دیکھو
سر اولیور آگئے

(سر اولیور مارٹکسٹ داخل ہوتا ہے)

خوش آمدید' سر اولیور مارٹکسٹ' نہیں اس درخت
کے نیچے شادی کی رسم ادا ہوگی۔ یا آپ کے عبادت
خانہ میں۔؟

سر اولیور :۔ کون شخص اس عورت کو دان کریگا؟

ٹچ اسٹون :۔ میں اس عورت کو کسی سے بطور تحفہ
نہیں لونگا۔

سر اولیور :۔ نہیں کسی شخص کو دان کرنیوالے
کی حیثیت سے رہنا چاہئے۔ نہیں تو بیاہ حرام ہوگا۔

ژاک (آگے آکر) اچھا میں دان کرونگا۔

ٹچ اسٹون :۔ خوب خوب! میں تم کو دیکھکر بہت
خوش ہوا۔

ژاک :۔ کیا تم بیاہ کرنا چاہتے ہو؟

ٹچ اسٹون :۔ جس طرح بیل کیلئے بَل کا ہونا
ضروری ہے' اور گھوڑے کیلئے لگام کا' شاہین
کیلئے گھنٹی کا اسی طرح انسان کیلئے خواہشات کا
ہونا ضروری ہے۔

ژاک :۔ کیا تمہارے رتبہ کا آدمی' اس جھاڑی کے
نیچے ایک بھیک منگے کی طرح بیاہ کریگا؟ کسی گرجا میں
جاؤ اور کسی اچھے پادری کے پاس جاؤ جو تم کو
مسئلہ ازدواج سے آگاہ کرسکتا ہو۔

ٹچ اسٹون :۔ (جی میں) بہتر ہوتا اگر یہی پادری
اس کام کو انجام دیتا۔ اس لئے کہ شادی صحیح اصول
پر نہ ہوگی تو جب چاہونگا بیوی کو چھوڑ دونگا۔

ژاک :۔ میرے ساتھ آؤ میں مشورہ دونگا۔

ٹچ اسٹون :۔ پیاری اوڈری آؤ یا تو بیاہ ہوگا
یا نہیں تو حرامکاری کے ہاتھ بک جائینگے۔ سر اولیور
الوداع۔ آپ تشریف لے جائیں۔

(ژاک اوڈری اسٹون چلے جاتے ہیں)

چوتھا سین

جنگل کا دوسرا حصہ

روزلینڈ۔ مجھ سے باتیں نہ کرو۔ رونے کا جی چاہتا ہے

سیلیا۔ رو لو۔ جی کھول کر رو لو۔ مگر یہ خیال ہے
کہ تم مرد کے لباس میں ہو اور آنسو مردوں کو زیبا نہیں معلوم
ہوتے

روزیلنڈ:۔ اس کے بال بیوفاؤں کے بال کے ہم رنگ ہیں

سیلیا:۔ ہاں جوڈاز Judas کے بال سے کچھ زیادہ سرخ ہیں اس کے بوسے جوڈاز کے بوسوں سے کم نہیں۔

روزیلنڈ۔ اس کے بوسوں میں ہوس کا مطلق شائبہ نہیں بلکہ ان کی خمیر میں پاکی ہے ۔

سیلیا۔ اس کے ہونٹ تقدس کے مجسمے ہیں ایک راہبہ کے بوسوں کی طرح پاک اور مقدس ہیں۔ گویا ان بوسوں میں عفت اور تقدس کی برف ہے

روزیلنڈ:۔ اس نے سوگند کھائی تھی کہ آؤں گا۔ مگر وہ آیا نہیں ۔

سیلیا:۔ عاشقوں اور رندوں کی سوگن پر اعتبار کرنا حماقت ہے

روزیلنڈ:۔ کل مجھ سے ڈیوک سے ملاقات ہوئی تھی اور بہت کچھ گفتگو رہی ۔ اس نے میرے خاندان کا پتہ پوچھا۔ تو میں نے کہا کہ میں بھی اسی کی طرح شریف النسب ہوں۔

(کورن داخل ہوتا ہے)

کورن:۔ اگر آپ عشق کی نیرنگی کا تماشہ دیکھنا چاہتی ہیں تو آئیے اور اس چرواہے کو دیکھئے ۔ جو میرے ساتھ گھاس پر بیٹھا تھا ۔ اس کے چہرہ پر زردی ہے اور اس کی محبوبہ کے چہرہ سے نخوت و تکبر کے آثار نمایاں ہیں۔

روزیلنڈ:۔ ہم لوگ چلیں اور یہ تماشہ دیکھیں ۔

پانچواں سین

جنگل کا دوسرا حصہ

(سلویس اور فی بی داخل ہوتا ہے)

سلویس:۔ میری پیاری فی بی ۔ میری حسین فی بی ۔ مجکو ذلیل مت سمجھو ۔ اگر تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ تم کو مجھ سے محبت نہیں ہے ۔ تو کہو مگر تلخی سے نہ کہو ۔ جلاد جو موت دیکھتے دیکھتے سنگدل ہو جاتا ہے وہ بھی قتل کرنے سے پہلے مجرم سے معافی مانگ لیتا ہے ۔ کیا تم اس سے بھی زیادہ بیرحم ہو جس کا پیشہ ہی خونریزی ہے ۔ ؟

(روزیلنڈ۔ سیلیا۔ کورن ۔ پیچھے سے داخل ہوتے ہیں)

فی بی:۔ میں تیری جلاد نہ بنوں گی ۔ میں تیرے پاس سے چلی جاتی ہوں ۔ میں تجکو ضرر پہونچانا نہیں چاہتی ۔ تو کہتا ہے کہ میری آنکھیں قاتل ہیں ۔ کیا غضب ہے کہ آنکھیں تو اتنی نازک اور نرم ہوتی ہیں کہ گرد سے بھی خائف ہو جاتی ہیں ۔ ان کو قاتل اور جلاد کے نام سے پکارا جاتا ہے میں تجھ پر آنکھ نکالتی ہوں ۔ اگر وہ جلاد ہیں تو دیکھنا یہ ہے کہ تو مرتا ہے یا بچتا ہے کیوں نہیں بیہوش ہو کر گر جاتا ۔ ذرا دیکھوں میری آنکھوں نے تجکو کیونکر زخمی کیا ہے ۔

سلویس:۔ پیاری فی بی ۔ کاش تو کسی کے رخسارِ گلگوں پر دارفتہ ہوتی ۔ تاکہ پیکانِ عشق اور زخمہائے دل سے

Judas جوڈاز حضرت عیسےٰ کے بارہ چیلوں (حواریں) میں سے تھا اس نے حضرت عیسےٰ سے غداری کی اور یہودیوں کی حراست میں حضرت مسیح اسی شخص کی غداری سے آئے ۔ اس نے یہودیوں سے رشوت لی اور کہا کہ میں جس شخص کے رخسار پر بوسہ دوں وہی حضرت عیسےٰ ہیں ۔ چنانچہ اس نے یہی کیا یہودیوں نے عیسےٰ کو گرفتار کر لیا اور صلیب پر چڑھا دیا ۔

واقف ہوتی

فی بی:۔ خیر وہ وقت آئیگا تب آئیگا۔ تب آکر مجھکو برا بھلا کہہ لینا۔

روزلینڈ (آگے بڑھکر) تم کس ماں کی لڑکی ہو جو اپنے بدنصیب عاشق پر آنکھیں لال پیلی کر رہی ہو۔ تم تو حسین بھی نہیں ہو۔ تب پھر کیوں ایسی مغرور اور بے رحم ہو۔ مجکو کیوں تاک رہی ہو۔ تم سے اور حسن سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔ کیا تم مجکو اپنے دام میں گرفتار کرنا چاہتی ہو اس کی امید مت رکھو۔ میں تمہارے کالے ابرو۔ کالے ریشمی بال۔ تمہاری آنکھوں یا تمہارے دودھ کی بالائی کے مانند گالوں پر شیفتہ نہیں ہوں۔ بیوقوف چرواہے تو کیوں اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ تو اس سے ہزار گونہ زیادہ حسین ہے تیرے ہی ایسے احمق دنیا کو بدصورت بچوں سے بھر دیتے ہیں۔ اس کی خود بینی کا سامان اس کے آئینہ میں نہیں ہے۔ بلکہ تو اس کی نخوت کا باعث ہے لیکن لے غرور کی پتلی زمین پر جھک جاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو جس نے تمکو ایک شریف آدمی کے عشق کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔ میں دوستانہ طور تمہارے کان میں کہہ دیتا ہوں۔ کہ تم ہر بازار کے لائق نہیں۔ اسلئے اپنے عاشق سے محبت کرو

فی بی۔ حسین نوجوان۔ میں درخواست کرتی ہوں کہ ایک سال یونہی مجھے برا بھلا کہتے رہو۔ تمہارا سب وشتم اس شخص کے مقالۂ الفت سے زیادہ شیریں معلوم ہوتا ہے۔

روزلینڈ۔ وہ تمہاری بدصورتی پر عاشق ہے۔ اور تم میرے غصہ سے محبت کرتی ہو۔ مجکو گھورتی کیوں ہو؟

فی بی:۔ میں دشمنی کی بنا پر نہیں تاکتی ہوں۔

روزلینڈ:۔ میں تم کو کہہ دیتا ہوں کہ مجھ سے محبت نہ کرو اس لئے کہ میں بڑا بیوفا ہوں۔ یہاں تک کہ میرے وعدے رندوں کے معاہدوں سے زیادہ جھوٹے ہوتے ہیں اسکے علاوہ تم مجکو پسند بھی نہیں ہو۔ میرا مکان زیتون کے درختوں کے پاس ہے۔ دیکھ غرور نہ کر۔ اور اپنے عاشق کے ساتھ لطف وکرم سے پیش آؤ

(سیلیا۔ روزلینڈ اور کورن چلے جاتے ہیں)

فی بی:۔ اے مردہ چرواہے۔ اب میں تیری کہاوت کی حقیقت سے واقف ہوئی۔ وہ عاشق عاشق نہیں جو پہلی ہی نگاہ سے گھائل نہ ہوا ہو۔

سلویس۔ پیاری فی بی مجھ پر رحم کرو۔

فی بی:۔ سلویس۔ ایک زمانہ تھا کہ میں تجھ سے نفرت کرتی تھی۔ اب بھی مجکو تجھ سے محبت نہیں لیکن تو عشق ومحبت کا تذکرہ اس حسن وخوبی سے کرتا ہے کہ تیری محبت جو پہلے میری خاطر پر گراں گذرتی تھی۔ اب عزیز معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ کی امید نہ کر۔

سلویس:۔ میرے لئے یہی فردوس بریں ہے۔ تمہارا تبسم میری حیات کیلئے بیش بہا سرمایہ ہے۔

فی بی:۔ تم اس نوجوان کو جانتے ہو۔ جو مجھ سے باتیں کر رہا تھا؟

سلویس۔ میں اچھی طرح سے اس کو نہیں جانتا ہوں لیکن اکثر اس کو دیکھا ہے۔ اور اس نے بوڑھے زمیندار کے مکان کو خرید لیا ہے۔

فی بی: - یہ نہ سمجھو کہ مجکو اس سے کوئی عشق ہے - وہ ترش مزاج ہے - لیکن وہ بولتا ہے مزے سے وہ ایک حسین شخص ہے - گو کوئی اتنا حسین نہیں - لیکن وہ بڑا ہی مغرور ہے - لیکن اس کا غرور اس کو زیب دیتا ہے - وہ ایک حسین شخص ہے - خاصکر اس کا چہرہ خوب ہی ہے - اور جیوں جیوں اس کی زبان زخم پیدا کر رہی تھی - اس کی آنکھ مرہم کا کام کر رہی تھی - وہ بہت لمبا نہیں ہے - مگر اپنی عمر کے لحاظ سے لمبا ہے - اُس کے پاؤں کچھ یونہی سے ہیں - لیکن اس کے لبوں میں ایک خاص سرخی تھی اور گالوں میں بھی سرخی تھی - دونوں میں گلاب کا رنگ تھا - اگر کوئی دوسری عورت اس پر ایسی تنقیدی نگاہ ڈالتی تو یقیناً دام محبت کی اسیر بنجاتی لیکن میں نہ اس سے محبت کرتی ہوں اور نہ اس سے نفرت کرتی ہوں - بلکہ اس سے نفرت کرنے کی وجہ بھی ہے - اس نے مجکو بھلا برا کیوں کہا؟ اس نے کہا کہ میری آنکھیں سیاہ ہیں اور زلف بھی سیاہ ہے اور ابھی یاد آتا ہے کہ ملامت بھی کی - تعجب ہے کہ میں نے جواب کیوں نہیں دیا - خیر کچھ پروا نہیں - میں ابھی اس کو ایک طعنہ آمیز خط لکھتی ہوں اور تم اس کو لیجاؤ - سلویس تم خط لیجاؤگے؟

سلویس: - بسر و چشم -

فی بی: - میں ابھی لکھتی ہوں - بات میرے دل و دماغ میں ہے - میں ایک مختصر خط لکھونگی اور ملامتوں سے اس کو بھر دوں گی - سلویس میرے ساتھ آؤ

(دونوں چلے جاتے ہیں)

چوتھا ایکٹ

سین اوّل

آرڈن کا جنگل

(روزیلنڈ - سیلیا - اور ژاک داخل ہوتے ہیں)

ژاک: - نوجوان شخص، میں تجھ کو بہتر جانتا ہوں -

روزیلنڈ: - لوگ کہتے ہیں کہ تم افسردہ خاطر رہتے ہو

ژاک: - واقعہ یہی ہے - میں حزن و ملال کو خندہ و خرمی پر ترجیح دیتا ہوں -

روزیلنڈ دونوں کی زبان خراب ہے - اور قابل تعزیر

ژاک: - افسردہ خاطر اور خاموش رہنا بہتر ہے -

روزیلنڈ: - تو ایک ستون ہونا بھی بہتر ہے -

ژاک: - میری افسردگی کسی علامہ کی افسردگی نہیں جو حوصلہ مندی کے ہمدوش ہوتی ہے - نہ کسی مغنی کی افسردگی ہے جو متلون مزاجی کے مشابہ ہے - نہ کسی درباری کی افسردگی ہے جو نخوت کے ہمرنگ ہوتی ہے - نہ تو جنگجو سپاہی کی ہے جو حوصلہ مندی کے مترادف ہے - نہ تو قانون پیشہ حضرات کی ہے جو شاطرانہ چال کے ہم معنی ہے - نہ تو کسی عورت کی افسردگی ہے جو سامان آرایش کی وجہ سے ہوتی ہے - اور نہ کسی عاشق کا حزن و ملال ہے جو ان تمام افسردگیوں کا مجموعہ ہوتا ہے بلکہ میری افسردگی ایک خاص افسردگی ہے اور کئی مفردوں سے اس کی ترکیب ہوئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر اپنے مختلف سفروں کے متعلق سوچتا رہتا ہوں -

روزیلنڈ: - تمہارے حزن و ملال کی یہی وجہ ہے تمنے

دوسری قوموں اور ملکوں کے دیکھنے کیلئے اپنی جائداد
بیچ ڈالی ۔
ژاک :۔ مگر میں نے تجربہ حاصل کیا ۔
روزلینڈ :۔ یہ تجربہ تمہاری افسردگی خاطر کا سبب ہے ۔
(اورلینڈو داخل ہوتا ہے)
اورلینڈو :۔ خدا سلامت میری پیاری روزلینڈ ۔
ژاک :۔ خدا تم کو سلامت رکھے ۔ اب تم جذب و کیف
سے ڈوبے ہوئے فقرے بولوگے ۔
(ژاک چلا جاتا ہے)
روزلینڈ :۔ اورلینڈو ! تم اتنی دیر سے کہاں تھے ۔ اس
پر تم عشق کا دعوی کرتے ہو اگر پھر ایسی حرکت سرزد ہوئی تو
میں اپنے پاس آنے نہ دوں گی ۔
اورلینڈو :۔ میں وقت موعود کے صرف ایک گھنٹہ بعد آیا
ہوں ۔
روزلینڈ :۔ عشق میں ایک گھنٹہ کی دیر قابل معافی
نہیں ۔ اگر ایک منٹ کو ہزار حصوں میں منقسم کیا جائے اور
اگر کوئی عاشق ایک حصہ کی بھی دیر کرے تو وہ کیوپڈ کے
دربار میں وارفتگی کے طغرائے امتیاز سے محروم رہیگا ۔
اورلینڈو :۔ پیاری روزلینڈ ! معاف کرو ۔
روزلینڈ :۔ آؤ اور میرے ساتھ عشق کرو ——
اور محبت کا دم بھرو ۔ اس وقت میں خوش ہوں اور
تمہارے عشق کا صلہ دینے کو راضی ہو سکتی ہوں ——
اگر میں فی الواقعہ تمہاری روزلینڈ ہوتی تو تم کیا کہتے ۔
اورلینڈو :۔ تو اپنے مقالۂ عشق کی تمہید بوسہ سے کرتا ۔
روزلینڈ :۔ تم کو چاہئے تھا کہ بولتے جاتے اور بیچ
بیچ میں جب کچھ بھول جاتے تو بوسہ بازی شروع کردیتے ۔
اچھے اچھے مقرر جب کبھی کچھ بھولتے ہیں تو تھوک پھینکنے لگتے
ہیں اور عاشقوں کیلئے ایسی حالت میں بوسے سے بڑھکر
کوئی چیز نہیں ۔
اورلینڈو :۔ اور محبوبہ اگر بوسہ دینے سے انکار کرے ۔
روزلینڈ :۔ تو عاشق التجا کرے ...... کیا میں تمہاری
روزلینڈ نہیں ہوں ؟
اورلینڈو :۔ مجھکو یہ کہتے ہوئے خوشی معلوم ہوتی ہے کہ
تم ہی روزلینڈ ہو
روزلینڈ :۔ فرض کرلو میں روزلینڈ ہوں ۔ میں تمہارے
دعوئ عشق کو قبول نکرونگی :—
اورلینڈو :۔ تب میں مرنے کیلئے تیار رہوں ۔
روزلینڈ :۔ دنیا چھ ہزار برس پرانی ہوچکی مگر آج تک
کسی نے عشق کی وجہ سے جان نہیں دی ہے ۔
ٹروائلس[1] Troilus کا مغز سر ایک یونانی ڈنڈے
کیوجہ سے باہر نکل آیا تھا ۔ اور وہ عشق کی ایک مشہور
مثال ہے ۔ اگرچہ ہیرو[2] Hero راہبہ بھی ہو جاتی تب
بھی لی اینڈر Leander برسوں زندہ رہتا ۔
مگر گرمی کی ایک رات وہ ہلسپونٹ Hellespont
میں نہانے گیا اور وہاں اس کو گٹھیا ہوگئی اور ڈوب گیا
اور اس زمانہ کے احمقوں نے یہ مشہور کر دیا کہ ہیرو
Hero اس کی موت کا سبب ہے ۔ یہ سب بالکل
جھوٹ ہے ۔ کبھی بھی کسی نے عشق میں جان نہیں دی ہے
اورلینڈو :۔ میری اصلی روزلینڈ اس مزاج کی نہ ہوگی ۔
روزلینڈ :۔ اچھا میں تمہاری بہتر مزاج کی روزلینڈ

ن جاتی ہوں - مجھ سے کچھ مانگو - میں دیدوں گی -
اورلینڈو :- تو مجکو پیار کرو - میری روزلینڈ -
روزلینڈ :- اچھا تو میں ایسا ہی کروں گی - ہفتہ کا
کوئی دن بغیر میرے پیار کے نہ گزریگا -
اورلینڈو :- مجکو پسند کروں گی ؟
روزلینڈ :- بیشک . - اچھا بہن سیلیا - تم پادری
کا کام انجام دو - اور ہم لوگوں کو بیاہ دو - اورلینڈو
مجکو اپنا ہاتھ دو - بہن کیا کہتی ہو -
اورلینڈو - مہربانی کرکے ہم لوگوں کو بیاہ دو
سیلیا :- اورلینڈو تم اس روزلیند کو اپنی بیوی بناؤگے
اورلینڈو - ضرور بالضرور
روزلینڈ - تو پھر کب ؟
اورلینڈو - بس فوراً - جہانتک جلد ممکن ہو -
روزلینڈ :- تب یہ کہو کہ روزلینڈ میں تجکو اپنی بیوی بناتا ہوں -
اورلینڈو :- روزلینڈ میں تجکو بیوی بناتا ہوں -
روزلینڈ :- میں بھی تجکو اپنا شوہر تسلیم کرتی ہوں ..... اچھا یہ
بتاؤ کہ اپنی روزلیند کو قبضہ میں لانیکے بعد تم کبتک محبت کا دم بھرتے رہوگے
اورلینڈو :- ہمیشہ -
روزلینڈ :- یہ غلط ہے - بیاہ کے پہلے مردوں کے عشق کی گرمی
ماہ اپریل کی گرمی کیطرح ہوتی ہے اور بیاہ کے بعد انکا جوش
ماہ دسمبر کے مانند سرد ہو جاتا ہے - جبتک عورتیں دوشیزہ رہتی ہیں
وہ ماہ مئی کے مانند ہیں - لیکن جب وہ بیویاں ہو جاتی ہیں تو
آسمان بدل جاتا ہے - جتنا ایک مرغ مرغی کو اپنا لینا چاہتا ہے
میں اس سے زیادہ تکو اپنانے کی کوشش کرونگی - جتنا ایک طوطا بارش
کو دیکھکر شور و غل کرتا ہے میں اس سے زیادہ شور و غل کرونگی
طوطے سے زیادہ متلون مزاج رہونگی - میں بلاوجہ روؤنگی اور
وہ بھی اس وقت جب تم خوش رہوگے - جب تکو نیند آئیگی تو
لکڑبگھے (Hyena) سے بھی زیادہ ہنسونگی -
اورلینڈو :- لیکن کیا میری روزلینڈ ایسا کریگی -
روزلینڈ :- میری جان کی قسم وہ ایسا کریگی -
اورلینڈو :- لیکن وہ دانا ہے
روزلینڈ :- دانا نہ ہوتی تو یہ سب کیونکر کرسکتی ؟ جتنی ہی دانا
ہوگی اتنی ہی شوخ اور خود رائے ہوگی - اور عجب نہیں کہ وہ
شوخ عورت ہمسایہ کے بستر پر جاتی ہوئی پائی جائے -
اورلینڈو - اور اگر وہ دیکھ لی جائے تو عذر کسطرح بنائیگی -
روزلینڈ - وہ کہہ دیگی کہ تکو وہاں تلاش کرنے آئی تھی جبتک
اس کے منہ میں زبان ہوگی - اسکو جواب کی کمی نہیں ہوسکتی
لعنت ہے اس عورت پر جو اپنا قصور اپنے شوہر کے سر نہ چپکائے
ایسی عورت اپنے بچے کو احمق بنادیگی -
اورلینڈو :- روزلینڈ میں دو گھنٹہ کیلئے تکو چھوڑ کر چلا جاؤنگا
روزلینڈ :- پیارے مجھ میں تاب صبر نہیں
اورلینڈو :- مجکو ڈیوک کے ہاں کھانے کے وقت پہونچ جانا
چاہیئے - دو بجے تک میں تمہارے پاس چلا آؤنگا -
روزلینڈ :- اچھا جاؤ میں تمہاری بیوفائی کا حال جانتی تھی تمہاری
زبان کی ساحری نے مجکو مسخر کر لیا - تم دو بجے آؤگے نا ؟
اورلینڈو - ہاں پیاری روزلینڈ -
روزلینڈ :- اگر تم ایک لحظ بھی دیر کروگے تو میں پیمان شکن اور بیوفا
عاشق سمجھونگی - وعدہ خلافی نہ کرو -
اورلینڈو :- میں تکو اصلی روزلینڈ سمجھتا ہوں - اور ہرگز وعدہ خلافی نہ کرونگا
روزلینڈ :- دیکھنا یہ ہے کہ تم اس امتحان میں کامیاب ہوتے ہو یا نہیں -
(اورلینڈو چلا جاتا ہے) باقی

اصلاح زبان

غلط	صحیح
وہ کہیں، وہ دیں، وہ لیں، وہ کہیں، وہ دیں، وہ لیں،	اُس نے کہا، اُس نے دیا، اس نے لیا، انہوں نے کہا انہوں نے دیا، انہوں نے لیا،

کہیں، دیں، لیں، کہیں، دیں، لیں، کا بولنا اب سے سَو، ڈیڑھ سَو برس پہلے صحیح تھا۔ اب غلط ہے مگر پورب والے بڑے پرانے خیال کے لوگ ہیں۔ وہ اپنی پرانی باتوں کو جلد چھوڑنے کیلئے تیار نہیں ہوتے۔ زمانہ گذرا کہ دِلّی کی اس پرانی زبان کو لکھنؤ میں تراش، خراش کر درست کیا گیا۔ اس کا علم پورب والوں کو بھی ہوا۔ پڑھے لکھوں نے تو اسے تسلیم کرلی لیکن عام بول چال میں یہ تراش خراش قبول نہیں کی گئی لیکن اس کا قبول نہ کرنا زیادتی ہے۔ اس سے زبان کی ہمواری یکسانی، سلاست اور روانی میں فرق آتا ہے۔ اسلئے پورب والوں سے ندیم کی استدعا ہے کہ وہ اپنی عام بول چال کو درست کریں۔ غلط زبان کے بجائے اسی طرح صحیح بولیں بھی جیسے وہ لکھتے ہیں کہ "اسنے کہا، اسنے دیا، اسنے لیا، انہوں نے کہا، انہوں نے دیا۔ انہوں نے لیا۔

غلط	صحیح
میری تکیہ، ، بخار آئی، بڑی درد ہے	میرا تکیہ، بخار آیا، بڑا درد ہے

پچھم اور پورب دونوں جگہوں کے زبان والوں کے نزدیک "تکیہ" بخار اور درد مؤنث کے بجائے مذکر ہیں۔ اس لئے پورب والوں کو چاہئے کہ وہ اپنی عام بول چال میں یوں صحیح بولیں۔ میرا تکیہ، انکا تکیہ، بخار آیا، بخار چڑھا، بڑا درد ہے، درد اٹھا۔

فرقِ زبان

پورب کی بولی	پچھم کی بولی
ڈِبّہ، بَٹّی	ڈبیا
گلوری، کھِلّی	گلوری

بنے ہوئے پان یا لگے ہوئے پان کے ظرف دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک کو خاصدان کہتے ہیں۔ پورب میں بھی اور پچھم میں بھی۔ اور دوسرے کو پچھم میں ڈبیا، اور پورب میں اس کے دو لفظ ہیں۔ ڈِبّہ، اور بَٹّی،

پان کی گلوری کو، پورب میں گلوری، اور کھِلّی، دونوں کہتے ہیں۔ آخر الذکر لفظ بار عام بولا جاتا ہے،" ایک کھِلّی پان لاؤ"۔ پچھم والے سُن لیں جو زبان کی غلطیاں چُننے کے عادی ہیں کہ پورب والے فیصلہ کر چکے ہیں کہ وہ پان کی گلوری کو کھِلّی اور ڈبیا کو ڈِبّہ اور بٹّی، جیسے اب تک بولتے رہے ہیں۔ اب لکھنے بھی لگے ہیں۔ مگر پورب والے

پچھم والوں سے زیادہ روادار

ہیں، وہ ڈبہ بٹّی، اور کھلّی کیساتھ ڈبیا،

اور گلوری بھی بولینگے تاکہ زبان

محدود ہونیکے بجائے وسیع ہو۔

باب المراسلہ والمناظرہ

کچھ مضمون "بیگمات اودھ" کے متعلق

از ڈالٹین گنج
مورخہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۲ء

مخدوم و مکرم زاد عنایتہٗ - تسلیم

مزاج گرامی! ندیم ماہ اکتوبر ۱۹۴۲ء میرے پیش نظر ہے - رسالہ ہذا میں "بیگمات اودھ" کے عنوان سے جو وقیع مقالہ پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی کا اشاعت پذیر ہوا ہے، وہ بہت ہی خوب ہے - کوئی شخص فاضل مضمون نگار کے مخصوص و دلکش طرزِ تحریر سے انکار نہیں کرسکتا مگر ساتھ ہی ساتھ ارباب ذوق کی نظروں سے یہ بھی کسی طرح پوشیدہ نہیں کہ اس مضمون میں ایک حد تک تعصب و تنگ نظری اور خیال آرائیوں سے کام لیا گیا ہے جس کا ثبوت خود فاضل مقالہ نگار کی مندرجہ ذیل عبارت (صفحہ ۲۰۷) سے ملتا ہے: -

"چنانچہ بادشاہ بیگم کی مذہبی سرگرمی نے مذہب شیعہ میں نئی نئی بدعتیں ایجاد کیں جن کی وجہ سے بادشاہوں اور امرا میں طرح طرح کی طفلانہ مزاجیاں پیدا ہوگئیں سب سے پہلے بیگم صاحبہ نے امام صاحب عصر کی چھٹی کی رسم قرار دی - اس رسم میں امام ممدوح کے حالات بیان کرکے ثواب حاصل کرنیکی کوشش نہیں کی جاتی تھی بلکہ ہوتا یہ تھا کہ ہندوؤں کے جنم اشٹمی کے تہوار کے موافق پورا زچہ خانہ مرتب کیا جاتا تھا اس کے بعد یہ ترقی ہوئی کہ صحیح النسب سیدوں کی خوبصورت لڑکیاں لے کے ائمہ اثنا عشری کی بیبیاں قرار دی گئیں جن کا نام "اچھوتیاں" رکھا گیا اور جب وہ اماموں کی بیویاں تھیں تو اُن کے وہاں اماموں کی ولادت بھی ہوتی اور بارہ اماموں کی ولادت کی تقریبیں بڑے کر و فر سے منائی جانے لگیں"

جہاں تک مندرجۂ بالا عبارت کا تعلق ہے بلاخوف تردید علی الاعلان کہا جاسکتا ہے کہ یہ پوری عبارت صداقت سے کوسوں دور اور قطعی قیاس آرائیوں اور غلط بیانوں پر مبنی ہے - ناچیز کے علم میں کسی کتاب میں یہ واقعات نہیں ملتے اور شیعی اعتقاد رکھنے والا کوئی اُس کی صداقت قبول نہیں کرسکتا - کوئی وجہ نہیں ہوسکتی کہ محض یورپین لیڈیوں کے اقوال (جیسا کہ خود مضمون نگار نے اسی سلسلہ میں صفحہ ۲۰۳ پر لکھا ہے) جو زبان اردو اور ہندوستانی رسم و رواج سے ایک بڑی حد تک یقیناً نابلد و ناآشنا تھیں آج تقریباً سو برس بعد صحیح مان لئے جائیں - آخر یہ رسمیں بیگمات اودھ میں پائی جاتی تھیں تو اُن کا ... پرانی مستند کتابوں میں ذکر کیوں نہیں پایا جاتا یا کسی شاعر نے اِسے کیوں نظم نہیں کیا - ؟ ؟ تقریب میلاد سالہا سال ہوتی رہتی ہونگی آخر شعراء یا ادبائے زمانہ کیوں خاموش رہے ؟ سُنی سنائی باتیں کہاں تک

قابل وزن ہو سکتی ہیں دنیا پر خوب روشن ہے۔ فاضل مضمون نگار تک ان واقعات کے پہونچنے کا آخر کون سا ذریعہ ہو سکتا ہے؟ کیا فاضل مقالہ نگار اس کے لئے کسی مستند کتاب کا حوالہ سپرد قلم کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے؟؟

فاضل مضمون نگار کو ایسی بے بنیاد اور لغو باتیں حوالۂ قلم کرتے وقت نہایت احتیاط و دانائی سے کام لینے کی ضرورت تھی کیونکہ یہ ایسے واقعات ہیں جو ایک قوم و فرقے کے جذبات سے تعلق رکھتے ہیں اور اُس فرقے کی انتہائی دل آزاری و دلشکنی کا باعث بن سکتے ہیں بفرض اُن واقعات کو چند ساعت کیلئے صحیح بھی مان لیا جائے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ رسم آج شیعی دنیا میں کیوں نہیں منائی جاتی (اگر اطراف و جوانب میں نہ سہی تو شہر لکھنؤ میں تو اُس کا وجود یقینی ہوتا) جب کہ عشرۂ محرم دار بعین کے موقعوں پر قریب قریب وہ کل مذہبی مراسم (مثلاً انعقادِ مجلس عزا۔ ضریح۔ تابوت۔ علم۔ دلدل نوحہ و مرثیہ خوانی وغیرہ وغیرہ) آج بھی کم و بیش اپنی اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ اس "چھٹی" کے رسم کا نہ ہونا اور "اچھوتیاں" کا کوئی سراغ نہ ملنا کیا معنے رکھتا ہے۔ اگر اس کا کوئی وجود ہوتا تو آج بھی موجودہ رسموں کے پہلو بہ پہلو یہ رسم بھی کم و بیش تغیر و تبدل کے ساتھ نظر آتی مگر برخلاف اس کے کوئی شکل آج بلاد ہند تو کیا ممالک عراق و عجم میں بھی چراغ لیکر ڈھونڈھنے سے نہیں مل سکتی ہے۔ کیا یہ رسم بھی بیگمات اودھ ہی کیساتھ ساتھ پیوند خاک ہو گئی؟ جبکہ ان کے وقت کی مروجہ اور رسمیں آج بھی ملتی ہیں؟

یہ ہیں وہ واقعات جو ایک سنجیدہ مزاج اور تعلیم یافتہ انسان کو یہ کہنے پر مجبور کرتے ہیں کہ فاضل مضمون نگار نے نفس خیال آرائیوں اور بدگمانیوں کو اپنی تحریر کا مرکز قرار دے کر یہ لغو، بے بنیاد اور مضحکہ خیز باتیں کیوں حوالۂ قلم کی ہیں!

براہ نوازش آپ اس میرے خط کو ندیم کی ماہ نومبر کی اشاعت میں شائع فرما دیں۔ تاکہ فاضل مقالہ نگار مندرجہ بالا واقعات کی صحیح صحیح سندیں دے کر اپنی پوزیشن صاف کر سکیں یا اپنی تحریر کے زیر بحث حصے کی خود تردید کریں اور آئندہ کسی دل آزار واقعات کو محض خیال آرائیوں سے کام لیکر بلا تحقیق و تفتیش لکھنے سے اجتناب کریں سے دعویٰ بلا دلیل قبول خرد نہیں۔

فقط

نیاز کیش :- سید حیات حسین وفا حسین آبادی رہلاموں

ندیم :- ہمیں امید ہے کہ لائق مقالہ نگار جناب پیارے لال شاکر میرٹھی اس مراسلہ پر توجہ فرمائیں گے اور اپنے معلومات اور بیانات کے ماخذ کے حوالوں تک اور ان کی صحت و عدم پر اپنا نقطۂ نظر پیش فرمائیں گے لیکن جملہ معترضہ کے طور پر بعض اشارات کر دینے ضروری ہیں۔ جناب پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی اردو کے مشہور کہنہ مشق اہل قلم ہیں وہ مذہبا عیسائی ہیں۔ ان کے مذہب میں کسی کی دل آزاری روا نہیں۔ اور اس عبارت میں بھی ان کے کہنہ مشق قلم کی احتیاط موجود ہے۔ انہوں نے ان مراسم سے مذہب شیعی کو بری کرنے کے بعد ان کو حوالۂ قلم کیا ہے۔ اس لئے انہوں نے لکھا کہ "مذہب شیعی میں یہ نئی بدعتیں ایجاد کیں" اس لئے اگر یہ واقعات صحیح بھی ہیں تو ان کی ذمہ داری انہوں نے نہ مذہب شیعی پر رکھی نہ جماعت شیعی پر بلکہ ان کے بیان کے مطابق یہ خاص فعل بادشاہ بیگم کا تھا۔ اور ان ہی پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ نہ ایک شخص کے فعل کو تمام جماعت کا فعل کہہ سکتے ہیں۔ اور نہ ہر وقت نئی بدعتیں جو ایجاد ہوتی جائیں ان کی ذمہ داری کسی مذہب پر آ سکتی ہے۔ اگر کسی مضمون سے کسی مذہب کے ماننے والوں کی دل آزاری کا امکان ہوتا تو اس کی اشاعت ندیم میں ہرگز نہیں ہوتی۔ بہرحال اس موضوع پر افہام و تفہیم کا حق حضرت شاکر کو ہے۔ اور وہی اپنا نقطۂ نظر صحیح طور پر پیش کر سکتے ہیں۔

اخبار علمیہ ادبیہ

جشن عید حیدری میں ادبی تقریبیں

آرہ میں عید مشاعرہ اور شعر و سخن کی چند مجلسیں

شہر آرہ کے ادب نواز جناب نصرت آروی عید کے موقع پر ہر سال عید مشاعرہ کے نام سے شعر و سخن کی مجلس ترتیب دیتے ہیں امسال یہ تقریب ۱۶ر نومبر سنہ ۴۲ء کو انجام پائی مقامی شعراء کے علاوہ گیا سے بلبل بہار حضرت سریر کابری مع اپنے معزز تلامذہ حضرت تبر خندہ آبادی و جناب قائم انڈھوسی مدعو تھے۔ داناپور سے جناب نور شاگرد حضرت نوح ناروی تشریف لائے تھے۔ میر مشاعرہ نے مشاعرہ کا انتظام نہایت فراخ دلی اور بلند ہمتی سے کیا۔ حسن اتفاق سے عنایت احمد صاحب لگر بلگرامی ڈپٹی مجسٹریٹ نبیرہ حضرت صفیر بلگرامی بھی تشریف لائے ہوئے تھے موصوف بھی شریک مشاعرہ ہوئے موصوف نے غیر طرح کلام پڑھکر جلسہ کو نہایت محظوظ فرمایا آپ اپنے رنگ میں بہت خوب فرماتے ہیں مقامی شعراء میں ولی حیدر صاحب گہر اگلوں کے دیکھنے والے اور پرانی صحبتوں کی یادگار ہیں آپکے کلام کا کیا کہنا ہے۔ بابو شنکر دیال صاحب فتنہ وکیل آرہ کا کلام نہایت پاکیزہ اور دلکش تھا۔ صوبہ بہار کے ہندو شعراء میں فتنہ صاحب کی ذات نہایت مغتنم ہے۔ امیر احمد صاحب اکبر آروی بھی ماشاء اللہ بہت پھولے پھلے۔ مہمانوں میں جناب نور صاحب کی غزل اچھی تھی۔ جناب قائم صاحب انڈھوسی کی طرحی غزل کے ایک شعر پر کما حقہٗ داد ملی محل کا قافیہ ان کا حصہ رہا۔ حضرت صبر خندہ دم آبادی نے رباعیوں کے بعد ایک غیر طرحی اور ایک طرحی غزل پڑھی دونوں غزلیں اپنی آپ نظیر تھیں۔ سخن سنجوں نے تہ دل سے داد دی۔ آخر میں بلبل بہار حضرت سریر کابری مینائی نے اپنے طرحی اور غیر طرحی کلام سے جلسہ کو سرفراز فرمایا موصوف سے باصرار متعدد غزلیں پڑھوائی گئیں۔ باایں ہمہ مشتاقان سخن کی تشنگی باقی رہی اور مشاعرہ بخیر و خوبی ختم ہوا۔ پھر دوسرے دن بھی بدولتکدہ جناب حافظ محمد حنیف صاحب جہاں موصوف مقیم تھے عمائد شہر کا ایک خاص مجمع ہوگیا اور بہت سی نظمیں پڑھی گئیں پھر دوبجے دن کو ملکی محلہ میں بدولتکدہ جناب سحر صاحب آروی ایک تیسری غیر طرحی بزم سخن ترتیب دی گئی اور خوب خوب کلام پڑھے گئے جس سے صاف پتہ چل گیا کہ آرہ میں حضرت صفیر بلگرامی اور حضرت بدر آروی کے بعد جو مذاق سخن قریب قریب مٹ رہا تھا از سر نو تازہ ہوگیا۔ اس کے لئے دیگر ارباب ذوق کیساتھ جناب منصرف صاحب خاص طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ بلبل بہار حضرت سریر کابری نے بھی اپنی ایک رباعی میں اس کا اظہار فرمایا ہے جو ذیل میں ہدیہ ناظرین کیجاتی ہے

آرہ کشش الفت نصرت لائی ؛ احباب سخن رس کی محبت لائی
آتا نہ کبھی ضعف علالت سے سریر ؛ لیکن ہوس چشم بصیرت لائی

نامہ نگار: حافظ محمد حنیف آروی

ہاشمی اسکول کا جلسۂ "عید ملاقات"

شہر گیا میں انگریزی تعلیم کی واحد اسلامی درسگاہ ہادی ہاشمی اسکول کے ہمدردوں کے حلقہ میں یہ خبر بڑی مسرت سے سُنی جائے گی کہ اس درسگاہ کی عمارت کیلئے چند بیگہ اراضی خرید لی گئی ہے۔ امسال عید کے موقعہ پر پانچ بجے شام کو شہر کے معززین شرفا کو اس قطعہ اراضی پر مدعو کیا گیا۔ تاکہ لوگ ایک دوسرے سے ایک ہی جگہ عید مل لیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک مختصر جلسہ بھی جناب حاجی عبد الشکور صاحب ریٹائرڈ جج کی صدارت میں ترتیب دیا گیا۔ جس میں اس درسگاہ کے حالات پر روشنی ڈالی گئی، آخر میں جناب حافظ محمد امین صاحب ایم اے بی ٹی ہڈ ماسٹر ہادی ہاشمی اسکول نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا، مجمع میں جناب آنریبل سید حسین امام صاحب، جناب شفیق الرحمن صاحب، جناب انجم صاحب اور ہاشمی اسکول کے دیگر ارکان و اساتذہ شریک تھے

راقم

سید ناظر امام ندوی

مسلم انسٹی ٹیوٹ گیا میں جلسہ "عید ملاقات"

مسلم انسٹی ٹیوٹ گیا کے سکریٹری حافظ محمد نوذر اور رکن رکین ظفر عالم صاحب اور دوسرے ارکان کی مساعی سے امسال "عید ملاقات" کا مختصر جلسہ مسلم انسٹی ٹیوٹ کچہری روڈ گیا میں بھی عید کے دن بعد نماز مغرب منعقد ہوا۔ جناب حسین قادر صاحب ڈپٹی مجسٹریٹ، جناب خواجہ جلال الدین صاحب وکیل، جناب شفیق الرحمن صاحب وکیل، جناب آنریبل حسین امام صاحب، مولانا نور محمد انجم صاحب بانپوری جناب ڈاکٹر محمد عنایت اللہ صاحب ام، آر، سی، ایس، ال آر سی پی (لندن) جناب ڈاکٹر ظفر التوحید صاحب، جناب ڈاکٹر سید عبد … جناب خواجہ عزم احمد صاحب بی اے ال بی جناب سید ابو الخیر صاحب ریٹائرڈ ڈی اس پی جناب عبد الغفار صاحب انسپکٹر پولیس جناب ضیاء الرحمن صاحب انسپکٹر ریلوے پولیس وغیرہ شریک جلسہ تھے۔ جلسہ کی روداد اپنی جگہ پر اسقدر دلچسپ ہے کہ اسکو مختصر تحریر میں بیان کرنا اسکے لطف کو کھونا ہے اسوقت کے شرکا کی تجویز کیمطابق یہ صحبت ہر سال عید کے دن کیلئے لازمی قرار پائی ہے۔ اگر آئندہ اس صحبت میں شریک ہونیکا اتفاق ہوا تو انشاء اللہ جلسہ کی کیفیات دلچسپ مصوری کی جائیگی۔ یاندہ صحبت باقیست

سید علی مظفر امام

طنزیات یاس یگانہ پوری

کی

بہت تھوڑی سی جلدیں باقی رہگئی ہیں۔ شایقین طلب فرمائیں قیمت ۱۲؍ طنزیات کی دوسری جلد کے آخری صفحات ندیم پریس میں چھپ رہے ہیں۔ توقع ہے کہ ایک مہینہ میں یہ جلد بھی شائع ہو جائے گی۔

منیجر "ندیم" گیا

ادبیات

جذباتِ مبارک

از فخر بہار یادگار داغ حضرت مبارک عظیم آبادی

نہ زندگی ہے، یہ جینا ہے، کوئی جینے میں — نہ ساز بازکسی سے، نہ سوز سینے میں
اچھوتا جام، اچھوتی ہمارے مینے میں — ہمیں نے نام اُچھالا شراب پینے میں
لگا دے سوزِ محبت، پھر آگ سینے میں — مزا پھر آنے لگے دل جلوں کو جینے میں
بخیر گذریں یہ دو دن بہار کے یارب — کہ روک ٹوک بہت ہو رہی ہے پینے میں
ترے نثار وہ چوکھی پلا دے اے ساقی — لگا دے آگ جو دل میں جگر میں سینے میں
چمک رہی ہے یہ بجلی گرے گی توبہ پر — جھلک رہی ہے مئے لالہ فام مینے میں
اسے بھی گورِ غریباں سے کیجئے تعبیر — کہ حسرتوں کے بہت ہیں مزار سینے میں
یہ کیوں ہیں دل کو کلیجے سے سب لگائے ہوئے — یہ کس کے نام کا ہے نقش اس نگینے میں
خدا بچائے اسے احتساب والوں سے — مئے طہور بھری ہے ہمارے مینے میں

یہ خاص وقتوں کے کچھ نالہ ہائے موزوں ہیں
ہمارے شعر مبارک نہیں، سفینے میں

برسات کی رباعیات

از حضرت رسا ہمدانی ایم.اے

برسات نئی شان سے امسال آئی
تو یہ کو یہ کرتی ہوئی پامال آئی
یہ کالی گھٹا اور یہ بجلی کی چمک
ہنستی ہوئی بکھرائے ہوئے بال آئی

برسات گھٹاؤں کو ہے لانیوالی
بجلی سے یہ ہنس کہ ہے ہنسانے والی
یہ دامن ابر اور یہ ہلکی بوندیں
ہے موتیوں کا ہار لٹانے والی

اک شور ہے گلشن میں کہ برسات آئی
لو، ساعت الطاف و عنایات آئی
جھولوں پہ حسیں اور یہ عشاق کی بھیڑ
دن آئے خوشی کے عیش کی رات آئی

سرسبز ہے کہسار، کہ ساون آیا
شاداب ہے گلزار، کہ ساون آیا
پھیلا دیا سبزے نے بھی دامن اپنا
ہے ابر گہر بار، کہ ساون آیا

ہر سمت ہے اک شور کہ ساون آیا
رقصاں ہوئے ہیں مور کہ ساون آیا
قبلے کی طرف کالی گھٹا کو دیکھو
اٹھی ہے وہ گھنگھور کہ ساون آیا

گلزار میں گل پھولے ہیں ساون آیا
میخوار الم بھولے ہیں ساون آیا
ہاتھوں میں لئے ہار حسیں گاتے ہیں
باغوں میں پڑے جھولے ہیں ساون آیا

حسن تغزل

از جناب اختر سہسرامی، ایم اے

دمک اس روئے زیبا کی سواد زلف پیچاں میں
عجب مشعل ہے راہ امتیاز کفر و ایماں کی

بڑھی شان تجرد اس جنون فتنہ ساماں میں
نہیں اک تار بھی باقی مرے جیب و گریباں کی

مزہ ایسا ہے ناوک میں نہ یہ لذت ہے پیکاں میں
حلاوت کیا کہوں کیسی ہے تیری نوک مژگاں میں

مری خونابہ افشانی بھی کیا کیا رنگ لاتی ہے
چمن ہر سمت پھولے ہیں بہار آئی بیاباں میں

ترے دامن سے دھبے خوں کے قاتل چھوٹ نہیں سکتے
کہ غالب ہے بہت رنگ وفا خون شہیداں میں

ہوا ہے خاک اڑانے کیلئے شبنم ہے رونے کو
وگرنہ کون ماتم دار ہے گور غریباں میں

ترے وحشی کی دنیا اور ہے گھر کیا وطن کیسا
وہی گھر ہے جہاں پر بیٹھ جاتا ہے بیاباں میں

تری مژگاں کی سفاکی کوئی پوچھے مرے دل سے
اتر جاتے ہیں گویا سیکڑوں نشتر رگ جاں میں

بہت جوش جنوں میں خاک چھانی دشت کی اختر
سکوں حاصل ہوا آخر جو پہنچا کوئے جاناں میں

جمالیاتِ صبر

از جناب سید بدرالدین احمد صبر رضوی سربری مخدوم آبادی

تمھارے در پہ ہم با گریہ جوش و خروش آئے
تم آئے بھی تو شرماتے ہوئے پنبہ بگوش آئے

کوئی ساغر بدست آئے کوئی خم بدوش آئے
جو آئے میکدہ میں مست شغل ناؤ نوش آئے

مجھی پر منحصر کچھ موسم گل میں نہیں ساقی
جو نکلے ابر کے آئے وہ میخانہ بدوش آئے

بایں بے خانمانی پھر بھی اس کوچہ میں آیا ہوں
اڑاتا خاک کوئی جس طرح خانہ بدوش آئے

پڑا ہوں غش میں میں اور سر رکھا ہے انکے زانو پر
الٰہی اور دم بھر کیلئے مجھکو نہ ہوش آئے

سنی آواز ہی اس کی نہ دیکھی شکل ہی اسکی
مرے کام اس گلی میں کب کسی دن چشم و گوش آئے

وہ پردے میں چھپے ہیں اسمیں بھی اک بات ہے ورنہ
نقاب اٹھے تو پھر موسیٰ کی طرح پھر کسکو ہوش آئے

سر محشر ہمارے جرم و عصیاں کی حقیقت کیا
جہنم کو بجھا ڈالے اگر رحمت کو جوش آئے

گیا سے صبر ہم ٹاٹا نگر لپک کے آ پہونچے
سوئے میخانہ جیسے کوئی رند بادہ نوش آئے

احتساب ماضی

از جناب زکی اورنگ آبادی

وہ عہد گذشتہ کا دلکش فسانہ گیا چھوٹ ہم سے وہ رنگیں زمانہ
امنگیں جوانی کی وہ والہانہ کسی شوخ کا ہائے وہ آنا جانا
شراب محبت پلانا کسی کا
وہ ہنس ہنس کے باتیں بنانا کسی کا

وہ چھپ چھپ کے گلشن میں آنا کسی کا وہ پر شوق نظروں سے جانا کسی کا
بگڑ کر وہ آنکھیں دکھانا کسی کا شرارت سے مجھکو گرانا کسی کا
کبھی روٹھ جانا کبھی من بھی جانا
کبھی منہ چڑانا کبھی مسکرانا

وہ مخمور آنکھیں وہ حسن جوانی ٹپکتی ہو جن سے مے ارغوانی
وہ دلکش نگاہیں وشیریں بیانی وہ لطف مسلسل شب شادمانی
وہ پر لطف صحبت وہ پر کیف نغمے
ابلتے تھے جن سے مسرت کے چشمے

وہ سینے سے مجھکو لگانا کسی کا شرارت سے وہ گدگدانا کسی کا
وہ غصہ کی صورت بنانا کسی کا وہ منہ پھیر کر مسکرانا کسی کا
شب ماہ میں ہائے وہ دور ساغر
وہ ساقی کا رنگیں جمال منور

وہ ترچھی نگاہیں وہ رنگیں ادائیں کہ بدمست ہو جائیں جن سے فضائیں
وہ ابر محبت کی خوش کن صدائیں زکی اب کہاں عہد رنگیں وہ پائیں
نہ وہ عہد رنگیں نہ وہ جام رنگیں
نہ وہ صبح رنگیں نہ وہ شام رنگیں

نہ وہ صحبتیں ہیں نہ وہ یار باقی فقط رہ گیا اک دل زار باقی
نہ گلچیں رہا وہ نہ گلزار باقی نہ ساقی رہا وہ نہ دلدار باقی
انیس اپنا فرقت میں کوئی نہیں ہے
مگر ایک ہمدم دل حزیں ہے

آہ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاری علیہ الرحمۃ

از بلبل بہار حضرت سریر کابری گیاوی بنائی

آہ اے علامۂ سجاد فخر روزگار	تیرے ماتم میں نہ کیوں ہو ساری دنیا اشکبار
ہوگیا افسوس علم و فضل سے خالی بہار	بزمِ ملت تیرے اٹھنے سے ہوئی تاریک و تار
مغتنم ذاتِ گرامی تھی خدائی کے لئے
تجھ کو بھیجا تھا خدا نے رہنمائی کے لئے

ایسی حالت میں کہ دنیا بھر میں ہے قحط الرجال	ڈھونڈھنے سے بھی کہیں ملتے نہیں اہل کمال
ہوگیا دستِ اجل سے باغ ملت پائمال	پتہ پتہ ہے چمن کا وقف اندوہ و ملال
یوں تو اکثر تو نے کھولے ملک میں دار العلوم
ہے مگر اک یادگار خاص انوار العلوم

عہدِ حاضر میں پرانی عظمتوں کی یادگار	کارناموں کو ترے ہرگز نہ بھولے گا بہار
تو نے صوبے میں کیا اونچا شریعت کا وقار	ہوگئی قائم امارت کی بنائے استوار
کس قدر آزادیِ مسلم کا ارماں دل میں تھا
جذبۂ حبِّ وطن کا جوش طوفاں دل میں تھا

تیری دور اندیشیوں پر دنگ تھے اہلِ وطن	حق تو یہ ہے آئینۂ رحمت تھا تیرا ہر سخن
تھی ضیا بار حقایق ہر طرف شمع لگن	ہو رہی تھی فیضیاب نور باطن انجمن
آہ کیا اس کی خبر تھی تو جدا ہو جائے گا
دفعتاً یوں راہیِ ملکِ بقا ہو جائے گا

موجِ طوفاں میں گھری ہے کشتیِ دینِ متیں	دور سے بھی اب کہیں ساحل نظر آتا نہیں
ناخدا بہرِ خدا طوفانِ دریا را ببیں	اس تلاطم میں بھی کوئی چھوڑ جاتا ہے کہیں
صد درود از من بروحِ پاکِ دلبر جانِ تو باد
رحمتِ حق بر مزارِ نور افشانِ تو باد

والدہ مرحومہ کی یاد

از جناب جی۔ آر قیس شیخوپوری

جناب جی آر قیس شیخوپوری روشناس افسانہ نگار اور شاعر ہیں۔ ان کی نثر و نظم سے ناظرین وقتاً فوقتاً لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ندیم سے انہیں دلی انس ہے۔ وہ کلکتہ میں قیام فرما ہیں۔ اور وہاں ندیم کے اعزازی نمائندے اور واحد ترجمان ہیں۔ اس کی توسیع اشاعت میں حصہ لینا اور اس کی ترقی و اشاعت کیلئے تدبیریں سوچنا اور ان پر عمل پیرا ہونا ان کی زندگی کا محبوب مشغلہ ہے اور اس میں وہ اس حد تک مستغرق کہ خود دفتر ندیم کو ان کی مستعدی و تندہی پر بھی حیرت ہوتی ہے۔ افسوس کہ اس ماہ میں انہیں ایک حادثہ سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کی مہربان ماں کا سایہ شفقت ان کے سر سے جدا ہو گیا۔ مرحومہ نے یوم پنجشنبہ ۶ نومبر ۱۹۴۱ء کو وفات پائی۔ خداوند تعالیٰ مرحومہ کو غریق رحمت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ نوجوان ادیب اپنی ماں کے غم میں سوگوار ہے۔ اسکی یاد میں چند قطرات اشک صفحہ قرطاس پر آئے ہیں۔ ندیم اس غم میں اس کا شریک ہے۔ اور ان تاثرات کو اپنے ناظرین کے سامنے بھی پیش کرتا ہے۔

"سید ریاست علی ندوی"

دیکھتی ہیں میری آنکھیں آج یہ کیسا سماں — ایک جان زار پر اتنے ستم اے آسماں
اُٹھ سکے کیونکر بیسیرے مرگ مادر کا الم — بار غم کا کسطرح حامل ہو مور ناتواں
کون اب صدقے کریگا جاں مری تکلیف پر — فکر آسایش مری رکھیگی کسکو نیجاں
کون اب پوری کریگا جا و بیجا ضد مری — کون تقصیروں پہ بھی مجھپر رہیگا مہرباں
میری راحت کیلئے ہردم پریشاں ہوگا کون — میری تکلیفوں پہ پیہم کون ہوگا جانفشاں
کون مجکو دیکھکر نزدیک خوش ہوگا مدام — کسکو رکھیگی جدائی میری پہردل نیجاں
کون اب مجکو کہیگا "میرے پیارے لال" آہ — پیار میں آکر کہونگا جس گھڑی میں "پیاری ماں"

آپ تو اے والدہ جاکر ہوئیں جنت مکاں
ہو رہا ہوں میں یہاں فرط الم سے نیجاں

آہ! اے دست اجل یہ کیا قیامت تو نے کی — نظم صبر و ضبط میں پھیلادی کیسی برہمی
کیا خبر تھی ایکدن تو مجھسے لے گا انتقام — آہ! اے ظالم تجھے کب کی تھی مجھسے دشمنی
کچھ تجھے میری تباہی کا نہیں آیا خیال — موم تجکو کرسکی ظالم نہ میری بے کسی
اب کہیں آرام کی منزل نظر آتی نہیں — مضطرب رکھتی ہے دل کو یاد انکی ہر گھڑی
کاٹے کھاتے ہیں در و دیوار تنہائی میں آہ! — گھر کی ہر اک شے پہ ہے افسردگی چھائی ہوئی
اے خدا کبتک رہونگا یوں اسیر صد الم — تابکے اس خستہ حالی سے بسر ہوگی مری

چھوڑکر اماں تم اپنے قیس کو تنہا گئیں۔
لے گئیں آرام میرا تم یہاں سے کیا گئیں

دُنیائے کاروبار

ہینمن ہومیو ہوم، بانکی پور، پٹنہ: پچھلے مہینہ بانکی پور جانے کا اتفاق ہوا ہم جناب ڈاکٹر سید اختر احسن ایم اے ...... کا شکرگذار ہیں کہ موصوف نے ازراہ نوازش ہمیں صوبہ بہار میں ہومیوپیتھی دواؤں کے سب سے بڑے ذخیرہ کی سیر کرائی یہ دواخانہ محلہ باقرگنج میں شاہراہ عام پر واقع ہے شیشہ کی حسین اور سبک بنی ہوئی درجنوں الماریوں میں دوائیں نہایت سلیقہ سے آراستہ ہیں ہومیوپیتھک دواؤں کا اتنا بڑا ذخیرہ آج تک نگاہوں سے نہیں گذرا تھا۔ معلوم ہوا اسی مخزن سے صوبہ کے بڑے حصوں میں دوائیں ارسال کی جاتی ہیں ۔

موصوف نے ہمیں ازراہ کرم عنایت ایک پمفلٹ بھی عنایت فرمایا اس میں سے موصوف کی فنی استعداد و علمی قابلیت پر اور دواخانہ کے حسن و انتظام پر ہومیوپیتھی ماہرین فن اور معززین کی رائیں معلوم ہوئیں۔ مثلاً (۱) ڈاکٹر اوسکر ولز (میڈواس اینڈ کمپنی جرمنی) کہتے ہیں: ہندوستان کا ذکر کیا پورے یورپ میں ایسی چند فارمیسیاں ہیں جو کہ ہینمن ہومیو ہوم پٹنہ کا مقابلہ کرسکتی ہیں۔" (۲) کے ایس فضل حسین ڈپٹی کمشنر پٹنہ فرماتے ہیں۔ "ہینمن ہومیو ہوم پٹنہ نے ایک بڑی کمی دور کردی حسن انتظام کیساتھ ساتھ اصلی و بہترین دواؤں کا ذخیرہ اس قدر یہاں موجود ہے کہ مشکل سے کسی دوسری جگہ جانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔" (۳) ڈاکٹر کوہلی (ہومیوپیتھک) پٹنہ کہتے ہیں "میں پورے اعتماد کیساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہینمن ہومیو ہوم پٹنہ کی دوائیں قابل اعتماد ہیں۔" ہمیں امید ہے کہ صوبہ میں ہومیوپیتھی طریقہ علاج کی روزافزوں مقبولیت کیساتھ اس دواخانہ کی ہردلعزیزی بڑھتی جائے گی۔ کہ دواؤں کا اتنا بڑا اسٹاک ایسے ماہرفن کی نگرانی میں صوبہ کے کسی دوسرے حصہ میں موجود نہیں۔ امید کہ ہومیوپیتھی طریقہ علاج اختیار کرنیوالے جناب موصوف اور اس دواخانہ کی طرف رجوع کرکے مستفید ہونگے ۔

پائیریا کا حکمی علاج :- ماہ جون میں ندیم کے بہار نمبر کی تصویروں کی طباعت کے سلسلہ میں کلکتہ جانے کا اتفاق ہوا تھا، روزانہ ہند کے دفتر میں قیام تھا۔ اتفاق کی بات روزانہ ہند کے پرنٹر اور پبلشر جناب سید قمرالدین صاحب سیدآبادی پائریا کے مرض میں مبتلا تھے اور ایک مقامی معالج جناب سید مشتاق علی صاحب کے زیر علاج تھے یہ بات ہمارے علم میں پہلی مرتبہ آئی کہ پائریا کا حکمی علاج بغیر دانت اکھاڑے ہوئے بھی واقعی ہوسکتا ہے معالج موصوف نے جناب سید قمرالدین صاحب موصوف کا علاج کیا اور بیس دنوں کے اندر یہ مرض جڑسے جاتا رہا۔ ابھی کچھ دن ہوئے جناب سید قمرالدین صاحب گیا تشریف لائے تھے، اب خدا کے فضل سے بالکل تندرست ہیں اور اس درجہ معترف کہ پائیریا کے ہر مریض سے وہ اپنے ذاتی تجربہ کی بناپر یہ پُرزور درخواست کرتے ہیں کہ وہ معالج موصوف کی طرف رجوع کرے انشاءاللہ اس کو فائدہ ہوگا خط و کتابت کیلئے

سید مشتاق علی (ماہر معالج پائیریا) ڈنٹل ہال ۲۰ لوور چیت پور روڈ سنڈیکیٹ کلکتہ

کے پتہ سے خط و کتابت کی جائے

"م"

نئی کتابیں

شاہجہاں :- محمد رفیق خاور ایم اے ایل ایل - بی - اردو کا بہترین ڈرامہ
مغلیہ دربار کے جاہ و جلال اور شاہی حرم کی اندرونی زندگی کا ایک دلفریب مرقع ہے - اسمیں شاہجہاں کی سطوت و حشم
شاہزادوں کی تخت و تاج کے حصول کیلئے سیاسی چالیں ، چنچل کنیزوں کے قہقہے ، بذلہ سنجیاں اور نکتہ آفرینیاں
سینکڑوں رنگوں میں نظر آتی ہیں - ایک باپ کی شفقت پدری اور ایک بادشاہ کی سیاسی مصلحتیں ایک دو
سے دست و گریباں دکھائی دیتی ہیں - لکھائی چھپائی دیدہ زیب بہترین سفید کاغذ ، مجلد قیمت صرف 1/4/-

---

دھرتی ماتا :- مشہور امریکن مصنف پرل بک کی شہرہ آفاق کتاب (Good Earth) کا اردو ترجمہ - اس کتاب پر مصنف نوبل پرائز مل چکا ہے - 1/8/-

تمہتے علیکم :- ایم ایم اسلم کے تازہ افسانے 1/8/-

مشاہیر عالم کی داستان غم :- 1/-

فلم ایکٹریسوں کی آپ بیتیاں 1/-

مہر و ماہ :- احسان علی شاہ بی اے (افسانے) 1/8/-

موپساں کے افسانے 1/-

دوشیزہ صحرا :- صادق الخیری ایم اے (ناول) 1/4/-

لالہ رخ :- لطیف احمد (ناول) 2/8/-

داستان :- دنیا کی رنگین کتاب الف لیلہ کا ترجمہ 2/-

قلوپطرہ :- سرزمین مصر کا زبردست تاریخی رومان 2/8/-

مصر کی رقاصہ :- احمد شاہ بخاری پطرس ایم اے کا تازہ شاہکار

افادات سلیم :- مولانا وحید الدین سلیم کے ادبی مضامین کا مجموعہ

خندان :- رشید احمد صدیقی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ -/8

پھول اور کلیاں :- سر رابندر ناتھ ٹیگور کے افسانوں کا مجموعہ -/8

انصاف :- گالزوردی کے ڈرامہ کا ترجمہ -

معمار اعظم :- ابسن کے مشہور ڈرامہ کا ترجمہ -/6

اضافیت :- ڈاکٹر رضی الدین -/4

مبادی سیاسیات :- محمد ہارون شروانی -/

واچی اور دیگر افسانے :- اوپندر ناتھ اشک -/8

صدائے جرس اور دیگر افسانے :- مسز عبد القادر -/4

بھوک اور دیگر افسانے :- پروفیسر حمید الدین ایم اے -

ہاشمی بکڈپو انارکلی لاہور

تحفۂ ربیع الاول

(اسلام کی حقیقت)

مصنفہ جناب ابوظفر محمد بدرالدین خاں بی اے آنرز سب رجسٹرار

اس کتاب میں بعثت نبی صلعم کی حالت۔ آپ کی حالات زندگی، وصال، معراج، معجزات، اسلامی تمدن، انفرادی اور اجتماعی زندگی، اسلام اور جمہوریت، سرمایہ اور مزدور کا ملاپ، پیغام عمل و حیات، مادہ و روح کا رابطہ، تعداد ازدواج کی تاریخی اہمیت، وحدانیت کا مفہوم، توحید، ہجرت کے فلسفے، ہند کی جھلک، شانِ اسلام کا یورپ میں اثر، وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے بہت سے مضامین پر اس کتاب میں روشنی ڈالی گئی ہے نیز مضامین نہایت عام فہم طور پر درج کئے گئے ہیں۔
چند رائیں جو ابھی تک موصول ہوئی ہیں۔ یہ ہیں:

ہمارا وحدت والایمان کی رائے (تاریخ ۱۱ر ۱۳ اگست)
مصنف نے اس مختصر کتاب میں پیغمبر اسلام کی حیات طیبہ پر روشنی ڈالتے ہوئے اسلام کی حقیقت اس کی افادیت اور اہمیت کو بخوبی واضح کردیا ہے۔ اہم اسلامی مسائل کو دلنشین پیرایہ میں بیان کرکے نہایت آسانی طریقہ پر سمجھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہ کتاب ہماری رائے میں ہر ایک مسلمان کے گھر میں رکھنے کے قابل ہے۔

پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کی رائے:۔
کتاب مصنف اسم بامسمیٰ ہے۔ آپ کی خواہش کے مطابق اگر اس کتاب کو مجلس میلاد میں پڑھا جائے تو عوام اس سے بہت زیادہ منتفع ہونگے اور اس سے بہت کچھ۔۔۔ ہوجائے گی۔ خدائے پاک آپ کو اس مفید خدمت کے لئے جزائے خیر عطا فرمائے۔"
۔۔۔ تاکہ یہ کتب عام مسلمانوں تک۔۔۔ گذارش حضرات اور کارخانے ایجنسی کے لئے درخواست کریں اور کمیشن بھی خط و کتابت کے ذریعہ طے کریں۔
۔۔۔ اس کی قیمت میں تخفیف کردی گئی اور اب اس کی قیمت صرف دس آنہ ہے

ملنے کا پتہ:۔ مسز بدرالدین خان کیر آف بدرالدین خاں سب رجسٹرار دسنگسرائے دربھنگہ

رجسٹرڈ نمبر پی ۲۹۴

کلکتہ نیشنل بینک لیمٹیڈ

ھڈ آفس :- کلایو روڈ کلکتہ ــــ گیا برانچ :- کچہری روڈ گیا فون نمبر ۳۷

ایک شیڈولڈ بینک

منظور شدہ سرمایہ ۲۰۰۰۰۰۰ (بیس لاکھ)

ادا شدہ سرمایہ ۱۰۰۰۰۰۰ (دس لاکھ)

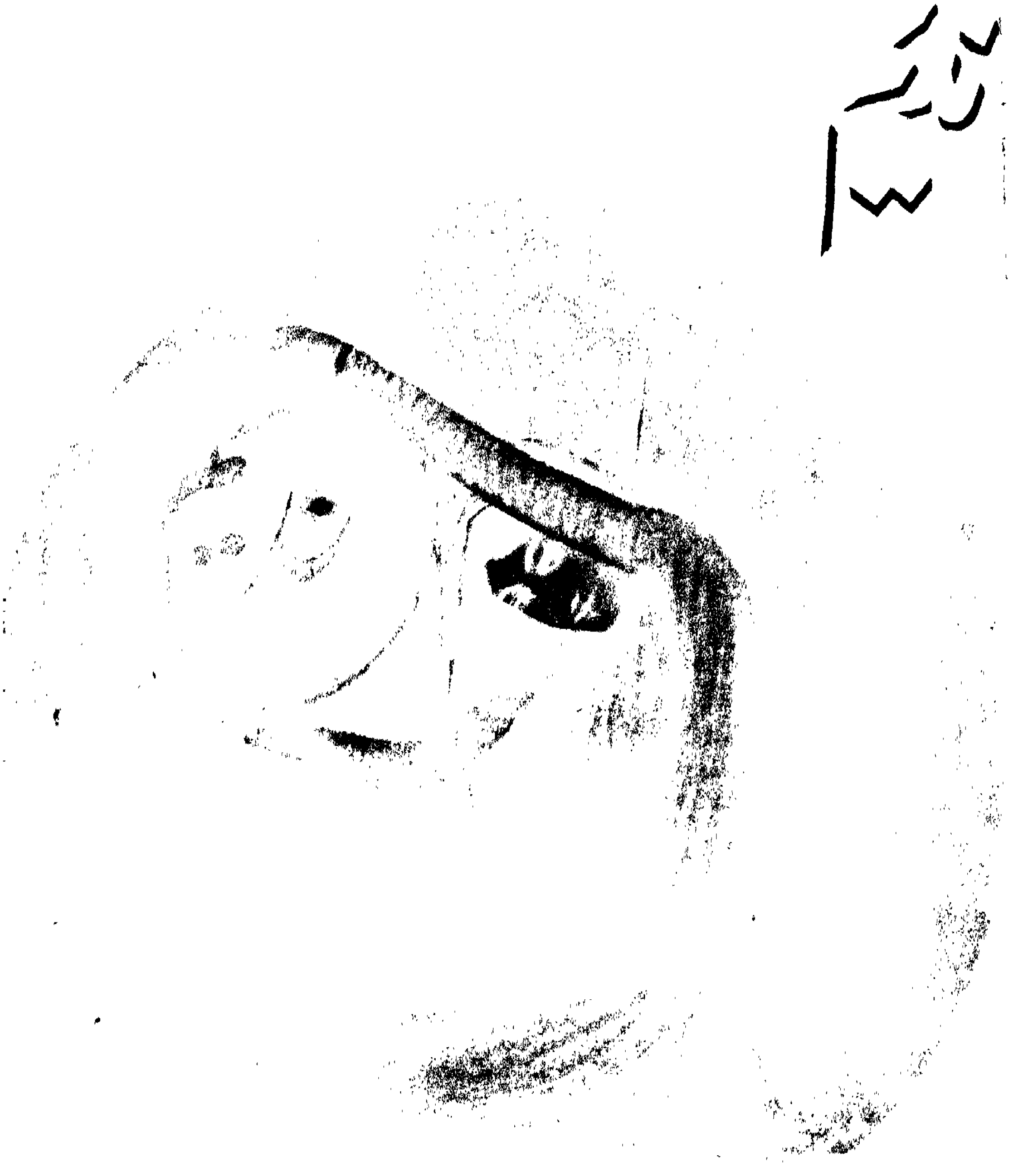
سیونگ بینک کا سود ۲ ½ فیصدی ــــ فکس ڈپازٹ کا سالانہ سود ۴ ½ فی صدی

ہر قسم کے بینک سے کاروبار

دوسری شاخیں :-

خضر پور۔ بھوانی پور۔ پارک سرکس۔ شام بازار۔ سرام پور۔ سیورا پھلی۔ ڈھاکہ۔ نرائن گنج۔ بھائرب بازار۔ کشور گنج۔ میمن سنگھ۔ چٹاگانگ۔ سلہٹ۔ پٹنہ۔ الہ آباد۔ ناگ پور۔ بنارس۔ رائے پور۔ جبل پور۔

(نوٹ) نامی گرامی بڑی بڑی کمپنیوں اور فرموں کے حساب اسی بینک میں ہیں۔ کاروبار میں بینک سے سہولت حاصل کیجئے۔ ذاتی سرمائے اکٹھا کیجئے۔ روپیہ جمع کرنے اور لگانے کے طریقوں میں غیر معمولی آسانیاں رکھی گئی ہیں۔ کاروبار کی ایسی سہولتیں دوسری جگہ آپ کو مشکل سے ملیں گی۔



زرِ رکنیت دوامی کی بیباقی کیلئے ایک ماہ کی مزید مہلت

پچھلے مہینے میں اعلان کیا گیا تھا کہ ۳۱ دسمبر ۱۹۴۰ء تک جن ارکان دوامی کا زرِ رکنیت بیباق نہ ہو جائیگا۔ ان کے اسمائے گرامی قلمزد کر دیئے جائیں گے۔

متعدد خطوط موصول ہوئے جنمیں تھوڑی مہلت کا مطالبہ اور کیا گیا ہے۔ اسلئے اعلان کیا جاتا ہے کہ آخری تاریخ ۳۱ر دسمبر ۱۹۴۰ء کے بجائے ۳۱ر جنوری ۱۹۴۱ء مقرر کر دی گئی ہے۔

ارکان دوامی کیلئے یہ سب آخری موقع ہے ۳۱ر جنوری کے گذر جانے کے بعد پھر مزید مہلت ہرگز نہ دیجائیگی اور جن لوگوں کی جزئی رقم وصول ہو چکی ان کے اسماء ارکان دوامی کی فہرست سے نکالکر خریداری کے رجسٹر میں درج کئے جائینگے۔ یہ پرچہ آج ۳۱ر دسمبر کو شائع کیا جا رہا ہے۔ آج سے ۳۱ر جنوری ۱۹۴۱ء تک پوری ایک مہینے کی مزید مہلت دیدی گئی ہے۔ یہ آخری قطعی اور ناقابل رد و بدل ہے۔ امید ہے کہ ارکان دوامی اس سے فائدہ اٹھائینگے، ورنہ وہ اپنے نقصان کے خود ذمہ دار ہونگے۔ دفتر کے اوپر کسی قسم کی جوابدہی عائد نہ ہوگی۔ پوری وضاحت کے ساتھ یہ اعلان شائع کر دیا جاتا ہے تاکہ آئندہ کسی مزید گفتگو و بحث و مباحثہ کا امکان باقی نہ رہے۔ والسلام

نیازمند سید علی مظفر امام، منیجر "ندیم" گیا۔ ۳۱ر دسمبر ۱۹۴۰ء

آئین "ندیم"

۱۔ ندیم ہر ماہ کے اخیر ہفتہ میں شائع ہوتا ہے۔

۲۔ اگر کسی خریدار کے پاس ڈاک کی غفلت سے کسی مہینہ کا پرچہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع دوسرے مہینہ کی دس تاریخ تک دفتر میں بھیج دینی چاہیئے۔ ورنہ رسالہ بقیمت روانہ ہوگا۔

۳۔ ندیم کا سالانہ چندہ مبلغ چار روپے اور ششماہی دو روپے چار آنے ہیں۔

۴۔ ندیم میں ہر ماہ ۶۴ صفحے مضامین کیلئے وقف ہوتے ہیں۔ اشتہاروں کے صفحوں کا شمار علیحدہ ہے

۵۔ نمونہ کے پرچہ کیلئے پانچ آنے کے ٹکٹ روانہ کئے جائیں۔ ورنہ تعمیل ارشاد معاف۔

۶۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ روانہ کریں ورنہ جواب کا ہرگز انتظار نہ فرمائیں۔

منیجر ندیم گیا

امریکہ نے سند لوں آب حیات ڈھونڈھ نکالا!

سدا جوان رہنے کا آسان طریقہ

موڈرن سائنس کا معجزہ



ہر من اور دنیا سے دریافت کرنے کے بعد بھی سائنس دائمی جوانی کا کوئی کامیاب طریقہ دریافت نہ کر سکی۔ لیکن اب دنیا کو ڈاکٹر ہرشفیلڈ ایم ڈی کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے متانی جد و جہد اور ریسرچ کے بعد افریقہ کے ایک درخت سے ایسا ایکلا مڈر دریافت کیا ہے کہ انسان میں ہمیشہ جوانی قائم رکھ سکتا ہے۔ اس کے تجربات سیکسولوجی سائنس انسٹی ٹیوٹ برلن امریکہ اور یورپ کے دیگر ممالک میں کئے گئے جس سے شاندار اور حیرت انگیز کامیابی حاصل ہوئی۔

اس جادو اثر آب حیات کا نام اوٹون "Otone" ہے جسے سلور ڈراپ (SILVER DROPS) میں پیش کیا گیا ہے۔

اوٹون کے سلور ڈراپ کھانے کے بعد آپ اپنے جسم میں ایک خوشگوار اور دل خوش کن تبدیلی محسوس کریں گے۔ چہرے کی جھریاں غائب ہو جائیں گی۔ بدن کی جلد پر شباب کی تر و تازگی اور ملائمیت آجائیگی۔ رخسار سے گوشت دوڑنے سے بھر کر کشمیری سیب کی طرح دکھنے لگیں گے۔ چہرہ حسن و جوانی کی شادابی اور نورانیت اپنی پوری رعنائیوں سے ظہور پذیر ہو جائیگی۔ اور آپ اپنی اصلی عمر سے بہت کم عمر کے نظر آنے لگیں گے۔ مثلاً آپ چالیس سال کے ہیں تو بیس سال کے معلوم ہوں گے۔

اوٹون کے سلور ڈراپ مندرجہ ذیل شکایتوں کا قطعی علاج ہیں۔

خون کی کمی۔ دماغی و جسمانی کمزوری۔ سر چکرانا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آنا۔ چڑچڑاپن۔ دل کی دھڑکن۔ بے ہنگم موٹاپا۔ ذیابیطس۔ دمہ۔ نابینائی۔ بھوک نہ لگنا۔ معدہ کا جلنا۔ دائمی قبض۔ سانس کا پھولنا۔ بالوں کا قبل از وقت سفید ہو جانا یا گرنا۔ کمر کا درد۔ جریان و سیلان۔ ضعف باہ۔ ضعف اعضائے رئیسہ۔ ضعف گردہ و مثانہ۔ عورتوں کی پر سوت کی بیماری۔ شریا (لیکوریا) سیلان الرحم۔ اور دیگر رحمی شکایتوں کو آناً فاناً دور کر دیتے ہیں۔

اوٹون کی آب حیات تاثیرات کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ اپنا صحیح وزن کرائیں۔ اور ایک ڈوز کھانے کے بعد استعمال کے بعد پھر اپنا وزن کریں اور فوٹو لیں اس سے آپ کو اس دوا کی حیرت انگیز طاقت کا اندازہ ہوگا۔

اوٹون کے سلور ڈراپ عورتیں بچے بوڑھے ہر موسم میں استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے کسی موسم یا عمر کی قید نہیں ہے۔

15,000 روپیہ کا نقد انعام

اوٹون ریسرچ لیبارٹری اس امر کا اعلان کرتی ہے کہ اگر کوئی فرد یا ادارہ یہ ثابت کرے کہ اوٹون کی آب حیات تاثیرات کسی حیاتی ہرمون یا ہارمون کی موجودگی سے ہیں تو ہم اسے پندرہ ہزار روپیہ کا انعام دیں گے۔

اوٹون کے سلور ڈراپ کی اصلی قیمت مختلف ممالک میں سو روپیہ ہے۔ لیکن ہم نے اسے ہندوستان میں رائج کرنے کے لئے اس کی قیمت کچھ مدت کے لئے تین روپیہ مقرر کی ہے۔ نہیں کہہ سکتے کہ اوٹون لیبارٹری کب اس کی قیمت میں اضافہ کر دے۔

Otone An Ideal and Unique Preparation for Rejuvination

The Elixir of Life

SILVER DROPS

سول ڈسٹری بیوٹرز

میسرز گراند فارمیسی (پوسٹ بکس نمبر ۲۶۲۳ کلکتہ)

تار کا پتہ "اوٹون" کلکتہ - ٹیلیفون - بڑا بازار ۵۰۰۵

Solo Distributor

...D PHARMACY (...

...O. 7627) CALCUTT...

ندیم کا بہار نمبر

[illegible] ←

یوں تو صوبہ بہار سے بھی متعدد اردو پرچے شائع ہونے لگے ہیں لیکن ان میں جو خصوصیت شہر گیا کے ماہوار اردو رسالہ "ندیم" کو حاصل ہے وہ دوسروں کو نہیں ہے بعض دوسرے پرچوں کی طرح رسالہ "ندیم" بھی خاص نمبر نکالا کرتا ہے۔ چنانچہ امسال اس نے "بہار نمبر" کے نام سے جو خاص پرچہ شائع کیا ہے وہ ایک سو چھبیس اعلیٰ پایہ مضامین نظم و نثر کا ایک بیش بہا مجموعہ ہے۔ تقریباً تمام مضامین اچھے اچھے انشاپردازوں اور شاعروں کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ مضامین میں بہترین مضمون پاکیزگی زبان اور دل نشیں ترکیبوں کے اعتبار سے سیّد وصی احمد صاحب بلگرامی ڈپٹی کلکٹر مونگیر کا "سپاہی کی بنی" ہے۔ جس میں فاضل مصنف نے بہت ہی خوبصورت پیرایہ میں فارسی اور اردو کی رام کہانی بیان کی ہے۔ اس کے علاوہ مولانا سلیمان ندوی کا "مولانا شبلی اردو شاعر کے لباس میں" جناب حمید عظیم آبادی کا "بہار میں اردو" پروفیسر طاہر رضوی ایم اے کا "فردوسی دقیقی" گلاب چاند صاحب بی اے کا "شاد کا امتیازی رنگ" وغیرہ بھی بہت فاضلانہ مضامین ہیں۔ حضرت صوفی منیری کا پانچ شعروں کا قطعہ تاریخ فن تاریخ گوئی کی حیثیت سے ایک شاہکار ہے جس کے نقطوں اور مصرعوں کے اعداد کو مختلف طریقوں سے ترتیب دیکر ساٹھ تیس (۲۳۰) تاریخیں نکلتی ہیں۔ اس نمبر میں مختلف قسم کی پینتالیس رنگین و فوٹو بلاک تصویریں ہیں اور پٹنہ آرٹ کی ایک رنگین تصویر بھی ہے۔ بہرحال یہ نمبر بہ حیثیت مجموعی بہت دلچسپ اور قابل قدر ہے۔ اس کی ضخامت ساڑھے چار سو صفحوں سے زیادہ ہے قیمت ڈیڑھ روپیہ

قیمت عہ دو روپیہ ملنے کا پتہ مینجر صاحب رسالہ ندیم گیا

صوبہ بہار کے سب اسکولوں و کالجوں میں سنہ ۱۹۳۱ء سے منظور شدہ

رسالہ ندیم گیا

یعنی

صوبہ بہار میں علم، ادب، تعلیم اور زبان کا ترجمان

قیمت سالانہ :- للعہ

قیمت ششماہی عہ

مرتبہ: سید ریاست علی ندوی

جلد ۱۴	ماہ ذیقعدہ سنہ ۱۳۵۹ھ مطابق ماہ دسمبر سنہ ۱۹۴۰ء	نمبر ۶

عنوان	مضمون نگار	صفحہ
نظرات	سید ریاست علی ندوی	۳۲۶ - ۳۲۸
مقالات - مشہور عرب شاعر ابوالعتاہیہ اور اس کی شاعری	جناب مولانا حافظ سید عبدالرؤف صاحب ندوی	۳۲۹ - ۳۳۶
کلام شاد کے متعلق چند در چند غلط فہمیوں کا ازالہ	جناب حمید عظیم آبادی	۳۳۷ - ۳۴۶
افسانے و محاضرات - کالج گرل	جناب سید ظہیر الدین حسن صاحب ایم اے عثمانیہ	۳۴۷ - ۳۵۳
من کی چاہ (آخری قسط)	جناب سید اسحق صاحب عاشق دسنوی ایم اے	۳۵۴ - ۳۶۱
قوت فیصلہ	جناب کاشف ایم اے	۳۶۲ - ۳۶۵
بھول گئی	جناب سید ابوسہیل صاحب عظیم آبادی	۳۶۶ - ۳۶۹
دماغ کی فتح	جناب سہیل عظیم آبادی	۳۷۰ - ۳۷۲
مزدور کی زندگی	جناب سید حبیب احمد صاحب نیر گیاوی	۳۷۳ - ۳۷۵
غم یا خوشی	جناب عزیز احمد صاحب ارکوی	۳۷۶ -
ادبیات - کچھ نہ چاہیے	حضرت نوح ناروی	۳۷۷
زمزمہ تغزل	حضرت سریر کابری	۳۷۸
کلام کشتہ	جناب اودھ کشور پرشاد صاحب کشتہ وکیل گیا	۳۷۹
شاما دیوی کے نام	جناب جی آر قیس شیخپوروی	۳۸۰ - ۳۸۱
کلام روشن	جناب سید وحید الدین صاحب روشن مخدوم آبادی	۳۸۱
تاریخ - عربی صحافت کی اجمالی تاریخ	جناب وحید احمد صاحب گیاوی	۳۸۲ - ۳۸۴
لسانیات - اصلاح زبان		۳۸۵
المراسلہ والمناظرہ - کیا شورش کا تذکرہ اردو زبان میں ہے؟	جناب قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر	۳۸۶
نقد و تبصرہ	" "	۳۸۸

سید ریاست علی ندوی اڈیٹر پرنٹر پبلشر نے ندیم پریس گیا سے چھپوا کر دفتر ندیم سے شائع کیا

نظرات

حکومت صوبہ بہار نے جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب سابق وزیر تعلیم کی تجویز کے مطابق ۲۸ جنوری ۱۹۳۹ء کو ایک تعلیمی کمیٹی مقرر کی تھی، تاکہ وہ صوبہ کی تعلیمی ضروریات کا جائزہ لیکر اپنی سفارشات حکومت کے سامنے پیش کرے۔ اس کمیٹی کے صدر جناب پروفیسر کے ٹی شاہ اور ارکان میں جناب ڈاکٹر راجندر پرشاد، ڈاکٹر سچدانند سنہا، ڈاکٹر ذاکر حسین اور جناب سید غلام السیدین صاحب تھے۔ اس کمیٹی نے اپنی سفارشات مکمل کرلیں اور اب اس کی مفصل رپورٹ منظر عام پر آئی ہے۔

اس رپورٹ میں تعلیمات کے تمام گوشوں پر مبصرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ اور موجودہ دور میں جو ناقص نظام تعلیم رائج ہے اسکی خامیوں پر نگاہ رکھ کر مناسب مشورے دیئے گئے ہیں۔ لیکن اس کی مختلف سفارشات کی قابل تحسین خوبیوں کے اعتراف کے باوجود افسوس ہے۔ کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ان سفارشات میں بھی وہ بنیادی خامی موجود ہے، جو واردھا اسکیم کے تعلیمی نظام میں تھی۔ اور جس کے خلاف ہندوستان کے تمام اسلامی پریس اپنی پوری طاقت کے ساتھ متفقہ آواز بلند کر چکے تھے — نیز ہمیں یہ بھی یاد ہے کہ پچھلے موقع پر جناب آنریبل ڈاکٹر سید محمود نے اپنے ایک مکتوب میں اور پھر ایک پبلک بیان میں اطمینان دلایا تھا کہ اس صوبہ میں کسی نئے تعلیمی نظام کے رائج کرتے وقت مسلمانوں کے مذہبی احساسات کا پورا لحاظ رکھا جائے گا۔ اسلئے خیال تھا کہ واردھا کی تعلیمی اسکیم کے مصنف جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی اس کمیٹی میں شمولیت کے باوجود کم سے کم مسلمانوں کے اس مطالبہ کا لحاظ رکھا جائیگا کہ مذہبی تعلیم، ابتدائی مدارس کے نصاب سے خارج نہ کی جائیگی۔ لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ جو مصیبت ان کے ہاتھوں اسلامی ہند کے تعلیمی حلقہ کے سر پر عمومیت کے ساتھ منڈلا رہی تھی وہ مسلمانان بہار کے سر پر سب سے پہلے مسلط ہوتی نظر آئیگی۔ ہم جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب موصوف کی اعلیٰ صلاحیتوں کے مداح ہیں، انکی اعلیٰ تعلیمی خدمات ہماری نگاہوں میں وقعت رکھتی ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ بچوں کی مذہبی تعلیم کے متعلق ان کا جو نقطۂ نظر قائم ہو گیا ہے اس سے وہ ہٹنے کیلئے تیار نہیں، حالانکہ انھیں بخوبی معلوم ہے کہ پورا اسلامی پریس اور ہندوستان کے تمام قابل ذکر مسلمان مفکرین اس مسئلہ میں ان کی مخالفت میں ہمزبان ہیں۔ اور وہ آج تک کسی مختصر سے مختصر تحریر کے ذریعہ بھی اس مسئلہ میں لوگوں کو مطمئن نہ کر سکے

ہم حکومت بہار کو پوری ذمہ داری کیساتھ متنبہ کر دینا چاہتے ہیں کہ مسلمانان بہار کیلئے کوئی ایسا تعلیمی نظام قابل قبول نہ ہوگا جس میں بچوں کی مذہبی تعلیم کا انتظام نہ ہوگا۔ مسلمانان بہار نہ اس کیلئے تیار ہیں کہ جبریہ تعلیم کے قانون کے افادی پہلوؤں سے صوبہ کے مسلمان بچوں کو محروم رکھیں اور نہ کسی ایسی درسگاہ میں جبریہ تعلیم کیلئے اپنے بچوں کو بھیجنے کیلئے تیار ہونگے جسمیں مذہبی تعلیم کا انتظام نہ ہو۔ اسلئے حکومت کیلئے بجز اس کے کوئی چارہ کار نہ ہوگا کہ وہ جبریہ تعلیم

کیلئے جو ابتدائی مدارس کھولے، ان میں مسلمان بچوں کی مذہبی تعلیم کا انتظام بھی موجود رکھے۔

حکومت کیلئے اس سلسلہ میں سب سے بہتر راہ عمل یہ ہے کہ اسوقت ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپلٹیوں کی نگرانی میں جو مکاتب و پاٹ شالے جداگانہ طور پر قائم ہیں، اسی سلسلہ کو اصلاحات کے ساتھ وسعت دی۔ ان میں ۷ سے ۱۰ سال کی عمر تک کے بچوں کیلئے تبر یہ تعلیم کا انتظام ہو اور بچوں کی مذہبی تعلیم کا خاص طور پر نظم کیا جائے۔ نیز ان ابتدائی درسگاہوں میں مسلمان بچوں کو ہندی رسم خط اور پاٹ شالوں میں ہندو بچوں کو اردو رسم خط سے بھی روشناس کر دیا جائے۔ اس کے بعد ان دونوں درسگاہوں کے بچے ضروری ابتدائی مذہبی معلومات حاصل کر لینے کے بعد وسطانی درسگاہوں میں مخلوط تعلیم حاصل کریں۔ اور اپنے مذہب کی بنیادی تعلیمات سے باخبر ہو کر ان مخلوط وسطانی درسگاہوں میں وطنی و ملکی حیثیت سے اچھے جذبات کیساتھ مل جل کر پڑھیں اور باہم شیر و شکر رہیں۔

بہرحال ہم حکومت کو پرزور طریقہ پر آگاہ کرتے ہیں کہ وشنا کمیٹی کی سفارشات پر سردست کوئی قدم آگے نہ بڑھائے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی مقرر کردہ کمال یار جنگ کمیٹی بھی ملک کا دورہ کر رہی ہے، وہ مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کا جائزہ لے رہی ہے، اس کی سفارشات بھی عنقریب منظر عام پر آجائینگی۔ اسوقت حکومت بہار کو موقع حاصل ہوگا کہ وہ صوبہ کے مسلمان باشندوں کی تعلیمی ضروریات کا لحاظ کرنے کیلئے کمال یار جنگ کمیٹی کی رپوٹ سے فائدہ اٹھائے۔ اور صوبہ کے تعلیمی نظام میں انقلاب پیدا کرنے کے وقت ایسا جچا تلا اقدام اٹھائے کہ جس سے مسلمانان بہار کو کسی شکایت کا موقع باقی نہ رہ جائے۔

ان دنوں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ آنریبل سید فضل حق کی صدارت میں پونہ میں منعقد ہو رہا ہے۔ ممکن ہے اس اجلاس کے سلسلہ میں کمال یار جنگ کمیٹی کی پچھلی کارگذاریوں اور آئندہ منصوبوں کے حالات بھی کچھ روشنی میں آجائیں۔

۲۵، ۲۶ر دسمبر کو آل انڈیا اردو کانفرنس کا دوسرا سالانہ جلسہ منعقد ہوا۔ بیگم اعجاز رسول خاں ایم۔ ایل۔ اے صدر استقبالیہ تھیں، جناب شیخ عبدالقادر بالقابہ نے اجلاس کی صدارت کی اور جناب گنگا دھرناتھ صاحب فرحت استقبالیہ کمیٹی کے جنرل سکریٹری تھے۔ مجلس استقبالیہ کے ارکان میں ہندو اور مسلمان دونوں طبقوں کے اہل علم دوش بدوش تھے۔ خطبہ استقبالیہ اور خطبہ صدارت، دونوں میں یہ صحیح طور پر کہا گیا کہ ہندوستان کی لنگوا فرنکا کی حیثیت اردو زبان ہی کو حاصل ہے۔ یہ ہندو اور مسلمان دونوں کی مشترکہ تاریخ اور دونوں کی کوششوں سے پروان چڑھی ہے۔ ایسے ہی خیالات سر تیج بہادر سپرو نے بھی اپنے پیغام میں ظاہر کئے ہیں۔

امسال اس اجلاس میں اردو مخطوطات یعنی اردو کی نادر قلمی کتابوں کی نمائش کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ یہ دیکھکر خوشی ہوئی کہ ملک کی زندہ اردو ریاست حیدرآباد دکن، رام پور اور بھوپال نے اپنے قیمتی قلمی جواہر بھی اس کی نمائش گاہ میں پیش کئے۔

کل ہند اردو کانفرنس کا پہلا جلسہ گذشتہ سال دہلی میں منعقد ہوا تھا۔ دوسرا امسال کانپور میں ہوا۔ جس طرح اجلاس نے اپنے مقام کیلئے پورب کا سفر اختیار کیا، اچھا ہو کہ اسکی تیسری منزل صوبہ بہار قرار پائے۔ کیا انجمن ترقی اردو صوبہ بہار، حوصلہ سے کام لیکر آئندہ سال اسکو اپنے صوبہ میں بلانے کی ہمت نہیں کر سکتی؟

یہ خوشی کی بات ہے کہ صوبہ بہار کے اہل علم میں اردو زبان کی خدمت کا جذبہ روز بروز ترقی پارہا ہے، اسکی تازہ شہادت پٹنہ یونیورسٹی کے اساتذہ کی ایک نئی کروٹ ہے۔ چنانچہ اردو زبان کو نئے ادب سے مالامال کرنے کیلئے ہمارے صوبہ کے مشہور صاحب فضل جناب ڈاکٹر سید عظیم الدین صاحب عظیم (سابق صدر شعبہ عربی پٹنہ یونیورسٹی) کی نگرانی میں "دائرہ ادب" کے نام سے ایک علمی مجلس کی تشکیل عمل میں آئی ہے۔ اس کے ارکان میں بیشتر تعداد یونیورسٹی اور کالجوں کے اساتذہ کی ہے۔ اور اس مجلس کے ترجمان کے طور پر "معاصر" کے نام سے ایک ماہنامہ جاری ہوا ہے، ہم کارکنان "دائرہ ادب" کے نیک مقاصد کا پرتپاک خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور اپنے حقیر تعاون کو اگر وہ کچھ کام آسکے ان کی خدمات میں پیش کرتے ہیں۔ "معاصر" کے دو پرچے نظر سے گذرے ان میں بیشتر مضامین یونیورسٹی اور مختلف کالجوں کے اساتذہ کے ہیں۔ اس رسالہ پر مفصل تبصرہ کسی آیندہ مہینہ میں نظر عالی سے گذرے گا۔

برادران وطن کے ایک طبقہ میں ویدک دور کے تمدن کے زندہ کرنے کے جو تخیلات پرورش پارہے ہیں، اس کے اثرات مختلف شکلوں میں ہمارے سامنے ہیں۔ مگر اب یہ دیکھکر خوشی ہوئی کہ برادران وطن کے خوش خیال طبقہ کے درمیان اس تحریک کی مضرتیں آشکارا ہو رہی ہیں۔ اور اب انھوں نے اس تحریک کا مقابلہ کرنے کی ہمت باندھ لی ہے، چنانچہ انہی مقاصد کے ساتھ الہ آباد سے غیر معمولی اہتمام کے ساتھ ایک ہندی ماہنامہ "وشو وانی" کے نام سے جناب بشمبر ناتھ کی ادارت میں جاری ہونیوالا ہے، جناب موصوف اپنے والا نامہ میں تحریر فرماتے ہیں :-

" اس خط کیساتھ جناب کی خدمت میں رسالہ "وشو وانی" کا ایک پمفلٹ بھیج رہے ہیں۔ جسے ہم جنوری ۱۹۴۱ء سے الہ آباد سے نکالنا چاہتے ہیں۔ اس پمفلٹ میں رسالے کے اجراء کے اغراض و مقاصد وضاحت کیساتھ بیان کردیئے گئے ہیں۔ امید ہے کہ آپ اپنی مصروفیتوں سے تھوڑا وقت نکالکر اس پر ایک نظر ڈالیں گے۔ اس رسالے کے نام کیلئے ہم نے شاعر اعظم ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور سے درخواست کی تھی چنانچہ یہ نام انہی کی تجویز کا نتیجہ ہے۔ اور ہمیں توقع ہے کہ شاعر اعظم کا یہ تعلق اس رسالے کیلئے مبارک ثابت ہوگا۔ یہاں یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ اس رسالے کے مضامین اسکی پالیسی اور ترتیب تمامتر ملک کے مشہور مورخ پنڈت سندرلال کی ہدایت و نگرانی میں چلے گی، کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسوقت ملک میں پنڈت جی سے بڑھکر ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار دوسرا کوئی موجود نہیں۔

ہم آپ کو خاصکر پمفلٹ کے اس حصہ کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں، جہاں ہم نے ایک متحدہ ہندستانی تمدن کا ذکر کیا ہے، ہمارا خیال ہے کہ یہ مشترک کلچر خاصکر عہد مغلیہ اور اس سے قبل کی چند صدیوں میں نشو ونما پایا، لیکن افسوس ہے کہ ان دنوں ملک میں کچھ ایسی رجعت پسند طاقتیں پیدا ہوگئی ہیں جن سے ہماری اس متحدہ کلچر کی ترتیب و تدوین رک گئی ہے اور تاریخ کے قدرتی فیصلوں کے خلاف قدم پیچھے ہٹانے کی کوشش کی جارہی ہے — اس صورت حال میں ہم چاہتے ہیں کہ اس رسالہ کے ذریعہ ہندی پڑھنے والوں کے سامنے مسلم تاریخ کے تمام روشن پہلو کو صحیح روشنی میں پیش کریں اور مذہب اسلام اور اسلامی ادب میں جو خوبیاں ہیں انھیں نمایاں کریں ہم اس امر پر خاص طور پر زور دینا چاہتے ہیں کہ اسلامی اثرات، ہندوستان کی زندگی اور اسکے تمدن پر کس طرح اثر انداز ہوئے اور ایک نیا تمدن پیدا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔

ہمیں احساس ہے کہ یہ ایک وسیع و سخت موضوع ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ ہمیں یقین ہے کہ اس سلسلہ میں ہمیں مسالے کی کوئی کمی نہ ہوگی۔ اور جو چیزیں شائع کیجائینگی وہ خاصکر ہندی پڑھنے والوں کیلئے آنکھ کھولنے والی ہونگی — غرضکہ اسطرح ہم مسلم دور کی تاریخ کو پیش کرکے ان رجعت پسند قوتوں کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں جو ملک میں احیاء (   ) کی کوشش کررہی ہیں۔ اور اس طرح ہم مشترک کلچر کی ترتیب و ترقی کو مدنظر رکھتے ہوئے دماغوں کو تنگ نظری سے بچانا اور ہمیں ربط و ارتباط کی گرہیں ڈالنا چاہتے ہیں۔ توقع ہے کہ اس مقصد میں ہمیں آپکا پورا پورا اشتراک عمل حاصل ہوگا..."

ہم اس عزیز معاصر کا پرجوش خیر مقدم کرتے ہیں اور اسکی کامیابی کیلئے دل سے دعاگو ہیں۔

یہ سال کا آخری پرچہ ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ ۱۹۴۱ء میں ہم ندیم کا ایک سالنامہ پیش کرسکیں گے۔ لیکن وہ کب کس مہینہ میں، اور کس نوعیت کا ہوگا؟ تو یہ تفصیلات آیندہ عرض ہونگی، ناظرین ندیم سال نو کی مبارکباد قبول فرمائیں۔

مقالات

مشہور عرب شاعر ابوُالعتاہیہ

اور

اس کی شاعری

ازمولانا حافظ سید عبد الرؤف صاحب ندوی اورنگ آبادی

ابو العتاہیہ دور عباسیہ کا باکمال اور ممتاز شاعر ہے۔ ہمعصر شعرا نے اسکو "اشعر الانس والجن" کا خطاب دیا ہے۔ محقق مبرد کہتا ہے کہ ابو العتاہیہ ایسا بلند پایہ فصیح و بلیغ شاعر ہے کہ کلام موزوں اور اشعار شیریں اس کے کام و دہن سے اس بے تکلفی سے نکلتے ہیں جیسے سانس۔ فرا اور علی جعفر بن یحییٰ جیسے نقادان فن کی رائے ہے کہ وہ دور حاضر کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ اس کے اشعار انقلاب و ہر بوقلمونی روزگار، بے ثباتی عالم، مبدؤ و معاد موت و ہول قیامت، زہد و تقویٰ، موعظت و حکمت، پند و نصائح میں بے نظیر ہیں، اس کے کلام کے مطالعہ سے اگر ایک طرف دنیا کی بے ثباتی اور موت و قیامت کے عام مناظر آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں تو دوسری طرف قلب و دماغ پر زاہدانہ کیفیت طاری ہوجاتی ہے، شعرائے عرب میں تو کوئی معلوم شاعر ایسا نہیں ہے جس کے کلام کا ہر حصہ زاہدانہ رنگ میں ہو، اور جس کی شاعری کا موضوع زہد و تقویٰ ہو۔ اس اعتبار سے وہ فصحائے عرب میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے،

اس کے پورے کلام کو آجتک کوئی مدون و مرتب نہ کرسکا، اشعار کا جو مجموعہ شائقین کے ہاتھوں میں ہے، وہ صرف پانچ ہزار اشعار کا ایک مرتبہ دیوان ہے جو بیروت اور ہندوستان میں طبع ہوکر متداول ہے۔ اب سے کچھ پہلے اس کا کلام صوفیہ اور ادبا کے حلقۂ خاص میں روشناس تھا۔ مگر اب عربی مدارس اور انگریزی کالجوں کی ادب نوازی اور علم نوازی اور علم پروری کے سبب روشناس خاص و عام ہے، باینہمہ شاعر مذکور کی کوئی کامل سوانح حیات اردو میں موجود نہیں لہذا بندہ ہیچمدان نے باوجود نااہلی و کم علمی ۱۳۵۰ھ میں جبکہ دیوان ابو العتاہیہ کے درس دینے کا مبارک موقعہ حاصل تھا، اسکی مختصر سوانح کو مرتب کرچکا تھا، مگر نامساعدت زمانہ کے سبب شائع نہ ہوسکے تھے اب ادیب و فاضل مدیر ندیم سلمہ اللہ تعالیٰ کے ذوق علمی کے باعث ہدیہ ناظرین ہیں۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء۔

نام و کنیت و سلسلۂ نسب، مقام ولادت و سنہ ولادت اسماعیل نام، ابو اسحاق کنیت، مگر ابوالعتاہیہ کے لقب سے مشہور ہوا، اسماعیل بن قاسم بن سوید بن کیسان بن عنزی سلسلۂ نسب ہے۔ ملک حجاز میں عین التمر کے نامی قصبہ عین التمر میں ۱۳۰ھ مطابق ۷۴۷ء میں پیدا ہوا۔

ابوالعتاہیہ کی وجہ تسمیہ خلیفہ مہدی نے کسی روز اس کے تکبر یا حمق پر طنز کرتے ہوئے عتاہیہ کہہ کر پکارا۔ جس طرح ایک دراز قامت شخص کو عرب شناحیہ کہتے ہیں اسی طرح متکبر اور احمق کو عتاہیہ کہتے ہیں۔ مہدی کا اس کو اس لقب سے پکارنا تھا کہ زبان زد خلائق ہوا، اور اس کا یہی نام شہرت پا گیا۔ چنانچہ وہیب بن اُنجاب نے اس کی ایک ہجو میں اس واقعہ کی طرف یوں اشارہ کیا ہے۔

كان فينا يكنى ابا اسحاق　　وبها الركب سار في الآفاق
فتكنى معتوها بعتاه　　يا لها كنية اتت باتفاق

"ہم لوگوں میں ابو اسحاق کنیت کا ایک شخص ہے جس کے ہمراہ سواران شتر ہیں، جنہوں نے اقطاع عالم کی سیر کی ہے۔ اس کی کنیت عتاۃ تکبر اور حماقت کے سبب یا محض اتفاقی طور پر ہو گئی ہے۔"

خاندان اس کا آبائی تعلق قبیلہ عنزہ سے ہے، اس کا پردادا عین التمر میں مقیم تھا، جس وقت حضرت خالد بن ولید نے عین التمر پر فوج کشی کی اس وقت کیسان یتیم اور بہت کمسن تھا اور قبیلۂ مذکور میں کسی قرابتمند کی کفالت میں تربیت پاتا تھا حضرت خالدؓ عین التمر کے قیدیوں کو ہمراہ لیکر بارگاہ خلافت میں خلیفہ اعظم کے حضور میں پہنچے تو بچوں کی جماعت میں ابوالعتاہیہ کا پردادا کیسان بھی تھا، اس موقعہ پر بارگاہ خلافت میں عباد بن رفاعہ عنزی بھی موجود تھا، حضرت ابوبکرؓ بچوں سے نسب کے متعلق سوال کرتے جاتے اور بچے اپنے مبلغ علم کے مطابق جواب دیتے اور نسب نامے کو بیان کرتے تھے، جب کیسان کی باری آئی تو اس نے اپنا سلسلہ قبیلہ عنزہ سے بتایا۔ عباد بن رفاعہ کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے خلیفہ اعظم سے خواہش ظاہر کی کہ وہ بچہ اسے عطا کر دیا جائے، چنانچہ آپ نے حسب خواہش عباد بن رفاعہ کو وہ بچہ دے دیا۔ عباد نے اس کو آزاد کر کے اس کی سرپرستی و نگرانی اپنے ذمے لی، اس طرح پر وہ بچہ عباد کے دامن شفقت میں پرورش پانے لگا۔

اس کی قومیت اور پیشہ ابوالعتاہیہ کا باپ قاسم حجام اور مقام ورجہ کا باشندہ تھا، اسی باعث اس نے ذیل کے بیت میں ان ہمعصر شعرا کا جواب دیا ہے جنہوں نے اس کی قومیت پر رکیک حملے کئے تھے،

الا انما التقوى هو العز والكرم　　وحبك للدنيا هو الفقر والعدم
وليس على عبد تقي نقيصة　　اذا صحح التقوى وان حاك او حجم

"تقوی اور پرہیزگاری کے سوا دوسری کوئی چیز قابل عزت اور لایق احترام نہیں ہے، تمہارے فقر و ناداری کا سبب دنیا کی محبت ہے، کسی پرہیزگار شخص کے لئے کپڑا بننا اور حجام ہونا کوئی ننگ و عار نہیں ہے۔"

ابوالعتاہیہ اور اس کے بھائی زید کے پاس چند سوڈانی غلام تھے جو مٹی کے برتن بنا کر آوے میں تیار کیا کرتے تھے، برتن جب ڈھیر ہو جاتے تو ابو عباد یزیدی نامی جو طارق کا باشندہ اور شہر کوفہ میں برتنوں کا تاجر تھا، اس کے حوالہ کر دیئے جاتے۔ وہ برتنوں کو فروخت کر کے قیمت لا کر چکا دیا کرتا تھا، کہا جاتا ہے کہ کمہاری کا کام ابوالعتاہیہ نہیں اس کا بھائی زید کیا کرتا تھا، کیونکہ اس پیشہ کے انتساب سے اس کو سخت انکار تھا، اور لوگوں کے جواب میں وہ اپنے کو جرار القوافی یعنی شاعر اور اپنے بھائی کو جرار التجارۃ" کمہار کہا کرتا تھا۔ مگر ایسا نہیں ہے کیونکہ معاصرین میں ایک شخص راوی ہے کہ میں نے بچشم خود دیکھا ہے کہ ابوالعتاہیہ برتن بناتا ہوتا اور اکثر نوعمر شائقین ادب ہو کر اس کے کلام سے لطف اٹھاتے اور ان اشعار کو اسی جگہ ٹھکروں پر لکھ لیا کرتے تھے۔

شاعری اور قادر الکلامی

شعرائے عرب میں تین شخص بڑے طباع گذرے، اول بشار، دوسرے سید الحمیری، تیسرے خود ابوالعتاہیہ۔ ان میں سے ابوالعتاہیہ اس قدر قادر الکلام تھا کہ شعر میں گفتگو کرنے اور ہر صنف انسان سے شعر ہی میں خطاب کرنے پر قدرت تامہ رکھتا تھا۔

شاعرانہ خصوصیت

کثیر البحر، برجستہ گو، سہل پسند، پاکیزہ خیال، نازک ادا، خوش بیان، شیریں کلام اور نیز خوش سرا تھا۔ اس کے تنوع کلام کی بابت اصمعی کا خیال ہے کہ ابوالعتاہیہ کا کلام قصر سلطانی کا صحن شاہانہ ہے جس میں جواہرات، پارہائے زریں، خزف ریزے خس و خاشاک اور کھجور کی گٹھلیاں تک ہیں، لہذا اس کا کلام ابتذال سے خالی نہیں ہے۔ تاہم اس کے کلام کا بیشتر حصہ ربہ اثر و حکم قرآنی، وعظ و نصائح نبوی اور سلف صالحین کے سیر سے مستفاد و ماخوذ ہے، بنابریں جملہ اشعار زہد و تقویٰ، نزع ارواح عذاب قبر، نشور و بعث، ہول قیامت، سزا و جزا میں ہیں۔

شعرائے ہمعصر کی سوءظنی اور اس کی حقیقت

اس کی مقبولیت عام اور شاہانہ قدر دانیوں کے سبب ہمعصر شعرا میں سے بعض عیب جوئی اور قبح نمائی پر اتر آئے تھے، اور اس کو زندیق و منافق کے لفظوں سے یاد کیا کرتے تھے، اور نیز فلاسفہ کے اس طائفہ باطلہ کی جانب منسوب کرتے جو حشر و نشر کا قائل نہیں، اور اس انتساب پر یہ حجت پیش کرتے کہ اس کے اشعار میں موت و فنا عالم کے تذکرے تو ضرور ہیں مگر نشور اور بعث بعد الموت اور حساب و کتاب کا ذکر کہیں مذکور نہیں ہے۔ مگر یہ اعتراض ان کا بے حقیقت اور واقعہ کے خلاف ہے، کیونکہ اس کے کلام میں موت ہی نہیں بلکہ توحید و رسالت، موت و حیات بعد الممات، حشر و نشر، جنت و نار، وعدہ و وعید، سزا و جزا ہر ایک امر کا ذکر ہے، اعتنا اور تفحص کی ضرورت ہے۔ مثلاً کہتا ہے

فما مات الاحیاء الا لیبعثوا   والا لتجزی کل نفس بما سعت

"زندوں کو موت اس لئے ہوتی ہے کہ وہ اٹھائے جائیں اور ان کے سعی و عمل کی جزا دی جائے"

حقیقت حال یہ ہے کہ شاعران رند شاہد باز جن کا میلان تعشق اور بوالہوسی کی طرف تھا، وہ بدیں وجہ ابوالعتاہیہ سے غم و غصہ کا اظہار کرتے تھے کہ شاعروں کی ضلالت اور گمراہیوں کو نمایاں کرتے ہوئے اور دنیا و مافیہا سے قطع تعلق کرتے ہوئے زاہدانہ روش اختیار کر لیا تھا اور شعرائے مجان یعنی شاہد باز بوالہوس شعرا کے زمرہ سے نکل کر زہاد و عباد، علماء فضلا کے حلقہ میں جا بیٹھا تھا۔

جس کا اثر اس کی کردار اور گفتار سے نمایاں ہونے لگا، چنانچہ جب اس نے روش زاہدانہ اختیار کی تو شاہراہ عام پر بیٹھ کر بنیت حصول ثواب فقراء و مساکین کی اصلاح و حجامت بناتا تھا، اسی حالت میں کسی نے اس سے سوال کیا کہ اس قلندرانہ روش سے آپ کا مقصد کیا ہے، تو جواب ملتا ہے کہ ذلت نفس، کسر نفس یعنی نفس پرغرور سے غرور ہائے باطل کو دور کرنا چاہتا ہوں جو حاجت دنیا کے باعث مجھ میں پیدا ہو گیا ہے، بایں ہمہ بعض اصحاب کا خیال تھا کہ زہد و پارسائی ظاہر کرتا ہے اور تہ دامن زندقیت پوشیدہ رکھتا ہے اسی مضمون کو ابراہیم بن مہدی نے اس شعر میں یوں ادا کیا ہے،

انی رایتک مظهر الزهادة　　　تحتاج منك لها الی اشہاد

ابوالعتاہیہ! تجھے زہد و پارسائی نمایاں کرتے دیکھتا ہوں، مگر اظہار پارسائی کیلئے اشہاد و نظام علامات و امثال کی ضرورت ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اسی دور میں ابوالعتاہیہ اور ابونواس کا کسی مقام پر اجتماع ہوا تو ابوالعتاہیہ نے ابونواس کو غنا اور ارباب غنا کی مجالست و مصاحبت پر ملامت کی تو ابونواس نے برجستہ جواب دیا کہ ۔

اترانی یا عتاهی تارکا تلك الملاهی　　　اترانی مفسدا بالنسك عند القوم جاهی

اے احمق! کیا تو مجھے اسباب نشاط و شادمانی کا تارک خیال کرتا ہے، اور باوقار منصبدار قوم کی صحبت کو نفسد زہد اور مخل عبادت خیال کرتا ہے۔ کیوں؟

ابونواس کی اس برجستہ گوئی اور شوخی کلامی پر ابوالعتاہیہ اچھل پڑا اور لا بارك الله علیك بے ساختہ اس کی زبان سے نکل گیا۔ اور ابونواس بھی ہنس پڑا ۔

اعتقاد و مذہب | صولی کے بیان کے مطابق ابوالعتاہیہ اقرار توحید کے ساتھ اس امر کا بھی قائل تھا کہ خدا نے مستقل بالذات دو متضاد جواہر پیدا کئے ہیں اور انھیں جوہروں سے تمام عالم کو اس فطرة و خلقت پر اس نے قائم کیا ہے ، اور نیز عالم بعینہ و بصنعتہ حادث ہے ، اور اس کا محدث و موجد خود خدائے قیوم ہے ، اور اس کا یہ بھی خیال تھا کہ فنائے اعیان کے قبل ہر شئے انھیں دو متضاد جوہر کی جانب بحکم خدا عود کرے گی ، اور نیز معارف کا حصول و وقوع فکر استدلال اور بحث و تمحیص کے مطابق ہوا کرتا ہے۔ وہ جبریہ مسلک رکھتا تھا ، اور نواہی و مذہب زیدیہ تبریہ کا شریک اور طرفدار تھا ، بایں ہمہ سلطان اسلام پر خروج و غلبہ کو ہرگز جائز نہیں رکھتا

دار الخلافہ بغداد میں پہنچا | جب شاعرانہ کمال اور قادر الکلامی میں پختگی آئی تو ابراہیم موصلی کے ہمراہ بغداد کا رخ کیا لیکن اثنائے راہ میں دونوں رفیق ایک دوسرے سے جدا ہو گئے ، ابوالعتاہیہ مقام حیرہ میں فروکش ہوا ، یہاں اس کی شاعری کا چرچا گھر گھر ہونے لگا ، اور اس کی شہرت بڑھتے بڑھتے خلیفۂ وقت مہدی کے کانوں تک جب پہنچی تو اس نے ابوالعتاہیہ کو بغداد طلب کیا ، بارگاہ خلافت میں پہنچکر خلیفہ کی شان میں اس نے پرزور قصائد پڑھے ، خلیفہ بہت خوش ہوا اور صلہ و بخشش سے اسکو سرفراز کیا ، اور نیز اسکو مصاحبوں میں جگہ دی ، اس طرح پر وہ خلیفہ کی صحبتوں میں رہتا اور خسروانہ بخششوں سے بہرہ اندوز ہوتا رہتا ۔ ہادی ، رشید ، مامون اس کے اشعار شیریں پر شیدا تھے ، ان میں سے ہر ایک کے ساتھ بہتیرے لطیفے اور حکایات ہیں ، جنکا اعادہ باعث طوالت ہے ۔

خلیفہ کی جاریہ پر عاشق ہونا اور قید ہو کر آزاد ہونا | خلیفۂ عہد کی حور وش کنیز پر وہ فریفتہ اور عاشق ہو گیا اور ملامت عشق میں مشہور عام ہو کر

اس دلربا کنیز کا ذکر اپنے اشعار میں کرنے لگا۔ اس حرکت نازیبا پر خلیفہ سخت غضبناک ہوا اور اس کو قید میں بند رکھنے کا حکم دے دیا۔ اس نے قید خانہ سے چند اشعار خلیفہ کے حضور میں ارسال کئے جن میں مراحم خسروانہ کی درخواست تھی۔ کہتا ہے :۔

الا یا ایھا الملک المرجیٰ ... علیہ نواھض الدنیا تحوم

اقلنی زلۃ لم اجرمثلھا ... الی یوم ولا مثلی ملوم

وخلصنی تخلص یوم بعث ... اذا للناس برزت الجحیم

اے شاہ امیدگاہ خلائق! منافع دنیا گرد تیرے چکر لگاتے ہیں، اور ہماری ساری امیدیں تجھ سے وابستہ ہیں اور فلاح دنیا تیرے ہاتھوں میں ہے۔ بس ایک لغزش پر تو مجھ سے رنجیدہ اور ناخوش ہوگیا۔ اب وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ اس نازیبا حرکت کا قصد تک نہ کرونگا۔ اسوقت میرے جتنا کوئی رسوائے خلائق نہیں ہے۔ مجھے اس روز جزا جیسی رستگاری عنایت فرما جس روز لوگوں کے روبرو جہنم لائی جائے گی۔

قیدخانہ میں آنکھ کا خراب ہونا | ابوحنیفہ محمد راوی ہے کہ قید خانۂ مہدی سے نکلنے کے بعد ابو العتاہیہ کو میں نے دیکھا کہ ہمارے دوخانہ پر جو کہ ال مبھتا تھا اسکے یہاں برابر آنکھوں میں سرمہ لگانے آیا کرتا تھا۔ اس پر کسی نے اس سے دریافت کیا کہ تیری آنکھوں میں درد بڑھ گیا ہے تو اس نے برجستہ یہ شعر پڑھے

ایا ویح نفسی ویحھا ثم ویحھا ... اما من خلاص من شباک الحبائل

ایا ویح عینی قد اضربھا البکاء ... فلم یغن عنھا طب ما فی المکاحل

آہ آہ ثم آہ کیا عروق بدن کے جال سے رستگاری نہیں، افسوس گریہ و بکا نے آنکھوں کو اس قدر ضرر پہنچایا ہے کہ اب سرمہ بھی کچھ مفید نہیں ہوتا ہے۔

ہادی اور ہارون اور ابو العتاہیہ | مہدی کے بعد ہادی جب تخت خلافت پر متمکن ہوا اور بیعت خلافت لی جانے لگی تو ابو العتاہیہ خوف سے روپوش ہوگیا۔ ہادی کی ناخوشی کا سبب بس اسقدر تھا کہ ابو العتاہیہ اس کے برادر ہارون کی مصاحبت میں رہا کرتا تھا لہذا اس نے معذرت نامہ ہادی کی خدمت میں ارسال کیا جس میں یہ بیت مسطور تھے

الا شافع عند الخلیفۃ یشفع ... فیدفع عنا شر ما نتوقع

یروعنی موسیٰ علی غیر عثرۃ ... وما لی اری موسیٰ من العفو اوسع

کیا خلیفہ وقت کے حضور میں کوئی شفارش کرنیوالا ہے کہ وہ ہم سے اس شرو مصیبت کو دور کردے جس سے ہم خوف زدہ ہورہے ہیں، بلا کسی قصور و لغزش کے موسیٰ مجھے دھمکاتا ہے۔ معلوم نہیں کیوں موسیٰ عفو نہیں کرسکتا۔

ہادی نے اس پر نظر ترحم ڈالی اور فرمان امان عطا کیا اور نیز صلہ و انعام کا حکم صادر فرمایا اس کے بعد سے خلیفہ نے تاحیات عزاز تمام اپنے ہمراہ رکھا۔

اس کے بعد جب ہارون الرشید سریرآرائے سلطنت ہوا تو ابو العتاہیہ نے اس کے حضور میں حاضر ہو کر قصائد پڑھے، ہارون تو اسے پہلے سے بہت عزیز رکھتا تھا، سفر و حضر میں ہمیشہ ہمراہ رکھتا تھا، ہنگامی صلہ و بخشش کے علاوہ پچاس ہزار درہم سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔

آہستہ آہستہ ابو العتاہیہ کی طبیعت میں انقلاب ہوا۔ اس کی طبیعت کا رجحان زہد و تصوف کی طرف تھا، ایک مرتبہ کسی ضرورت سے ہارون الرشید مقام رقہ گیا ہوا تھا، جب واپس ہوا تو ابو العتاہیہ کو صوفیانہ لباس اور زاہدانہ رنگ میں ملبوس دیکھا۔ اس کے ساتھ اس نے شعر و سخن کا مذاق بھی چھوڑ دیا۔ درباری شاعر شیریں مقال کی یہ متصوفانہ روش ہارون رشید کو پسند نہ آئی، پہلے شعر و سخن کی طرف مائل کیا، لیکن جب عدول حکمی دیکھی تو برافروختہ ہو کر قید خانہ میں ڈالدیا، اور شرط کر دی کہ بغیر مشق شعر و سخن اس سے نجات ممکن نہیں۔ آخر کچھ دنوں کے بعد اس رنج و محن سے گلو خلاصی ہوئی۔

اخلاق و عادات اس کی متصوفانہ طبیعت کا اثر اس کے اخلاق و سیر پر بھی پڑا، بلکہ اس کے ہمعصر شعراء اور معاصرین نے اس کی طبیعت کے متصوفانہ رجحانات سے مملو واقعات کو غلط فہمی پیدا کرنے والی رنگ آمیزی کے ساتھ بیان کیا ہے، مثلاً ابو ثمامہ کہتا ہے، کہ "میں ایک روز ابو العتاہیہ کے پاس پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہ روکھی پھیکی روٹی کھا رہا ہے، اس پر کسی نے ابو ثمامہ سے دریافت کیا کہ کیا صرف روٹی ہی کھاتے دیکھا، تو اس نے کہا نہیں، اس کو سالن کے ساتھ اسطور پر روٹی کھاتے دیکھا کہ لقمہ میں سالن کی ذرا آمیزش نہیں، لوگوں نے ازراہ تعجب دریافت کیا کہ ایسا کیونکر ہو سکتا ہے، تو اس کی صورت یہ بتائی کہ اس کے آگے خشک اور تنک روٹی تھی اور دودھ کا پیالہ تھا، روٹی کا ٹکڑا لیتا اور دودھ میں ڈبو کر اس طرح نکالتا کہ دودھ کی آمیزش نہ ہوتی، یہ صورت دیکھکر میں نے ابو العتاہیہ سے کہا شاید بغیر سالن کے سالن کھانے کی تو خواہش رکھتا ہے، حالانکہ میں نے کبھی کسی کو ایسا کرتے نہیں دیکھا۔"

اسی طرح عیسیٰ بن خزیمی ناقل ہے کہ ابو العتاہیہ کے پڑوس میں ایک ضعیف العمر اور پریشان روزگار شخص تھا، کھجور کی گٹھلیاں ادھر ادھر سے چن کر جمع کرتا تھا، مگر باینہمہ قانع اور صابر اور بظاہر صاف ستھرا رہا کرتا تھا، ابو العتاہیہ کے سامنے سے جب وہ گزرتا تو وہ اس کے حق میں صرف دعا کرتا کہ "خدایا اس کے مصائب و افلاس کو دور کر، اور اس کو غنی کر دے، گرچہ یہ بوڑھا اور کمزور اور ہر طرح بدحال ہے، مگر صابر و قانع ہے، الہٰا اس پر رحم و کرم فرما" وہ غریب پڑوسی اسی بدحالی اور پریشانی میں مدتوں رہ کر مر گیا، مگر افسوس بجز دعا کے ابو العتاہیہ نے کبھی نقد و جنس سے کوئی مدد نہ کی، کسی دن میں نے ابو العتاہیہ سے کہا کہ اس کا سبب کیا ہے کہ اس ضعیف فقیر کے لئے تو بار بار دعا کرتا ہے، مگر باوجود واقفیت کہ وہ محتاج اور پریشان حال ہے، صدقہ و خیرات سے کبھی اس کے ساتھ سلوک نہیں کرتا ہے۔ تو اس نے جواب دیا کہ میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ وہ کہیں صدقہ خوری اور گداگری کا خوگر نہ بن جائے، صدقہ بندہ کا آخری کسب ہے، اور دعا میں خیر کثیر ہے۔

حلیہ و وضع قطع ابو العتاہیہ گورے چٹے رنگ کا وجیہ اور خوبرو شخص تھا، سر پر سیاہ گھونگر والے بال تھے۔ ابتداءً مخنثانہ وضع اور مخنثوں کی صحبت رکھتا تھا، کسی نے اس سے دریافت کیا کہ اس وضع اور صحبت سے مقصود کیا ہے، اس نے جواب دیا کہ مخنثوں کے کلام کو یاد کرنا اور ان کی زبان کو محفوظ کرنا ہے، اور بس۔

عروض سے بے پروائی

ابن ابوالعتاہیہ محمد ناقل ہے کہ کسی نے والد سے دریافت کیا کہ فن عروض سے بھی تجھے کچھ واقفیت ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ انا اکبر من العروض، میری ہستی عروض سے بالاتر ہے، یعنی میں ضوابط عروض کا پابند نہیں ہوں۔ اسی باعث ان کے اشعار ان بحور اور اوزان میں بھی ہیں جن کا فن عروض میں نام و نشان تک نہیں ہے۔

مرض موت اور آخری آرزو

ابوالعتاہیہ عہد مامون تک زندہ اور بارگاہ خلافت سے وابستہ رہا، چنانچہ مامون کی شان میں اس کے قصائد وغیرہ بکثرت موجود ہیں، اس عہد میں اس پر زہد و تصوف کا غیر معمولی اثر ہوا، اور دنیا سے دوں سے اس طرح پر بے رخ ہوا کہ اپنے تمام رفقاء دراحباب قطع تعلق کرکے گوشہ گیر ہو رہا، تا آنکہ وہ مرض موت میں مبتلا ہوا، اسی حالت میں بشر بن ولید اس کی عیادت کو آتا ہے تو وہ دریافت کرتا ہے کہ ابوالعتاہیہ بتا کہ تیری آخری تمنا کیا ہے، تو اس نے کہا کہ میری دلی خواہش تھی کہ مغنی خاص مخارق آئے اور کان پر منہ رکھکر یہ گانا سنائے۔ اس کے بعد اس نے اپنے یہ دو اشعار پڑھے،

سیعرض عن ذکری وتنسی مودتی　　ویحدث بعدی للخلیل خلیل
اذا ما انقضت عنی من الدھر لیلۃ　　فان غناء الباکیات قلیل

بس اب میری یاد سے روگردانی کی جائے گی اور میری محبت و دوستی بھلا دیجائے گی، میرے تذکرے دنیا سے اٹھ جائیں گے اور ہم نہ ہوں گے تو میرے دوستوں کے دوسرے دوست پیدا ہو جائیں گے۔ اور زمانہ سے ایک ہی شب گذرنے پر رونے والیوں کا رونا کم ہو جائے گا۔

کیفیت موت اور وصیت

موت کے آثار جب اس پر نمایاں ہوئے تو وہ اپنے ذیل کے ان اشعار کو بار بار پڑھتا تھا اور انہی کو پڑھتے پڑھتے اس کی روح جسد عنصری سے پرواز کر گئی۔

الٰھی لا تعذبنی فانی　　مقر بالذی قد کان منی
فما لی حیلۃ الا رجائی　　لعفوک ان عفوت وحسن ظنی
وکم من زلۃ لی فی الخطایا　　وانت علی ذو فضل ومن
اذا فکرت فی ندمی علیھا　　عضضت انامنی وقرعت سنی

خداوندا مجھے عذاب میں مبتلا نہ کرنا، میں اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہوں جن کا میں مرتکب رہا ہوں، میرے پاس کوئی عذر بجز امید اور تیرے عفو و کرم کے نہیں ہے، اگر تو میرے گناہوں کو معاف کر دے، میں نے کس قدر لغزشیں کی ہیں، اور گناہوں کا ارتکاب کیا ہے، مگر تو صاحب فضل و کرم ہے، جب کبھی میں اس کو سوچتا ہوں تو مارے ندامت کے اپنی انگلیاں چباتا ہوں اور دانت پیستا ہوں۔"

ان اشعار سے اس کی دین داری اور نیز اعتقادات صاف ظاہر ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اس نے مرض موت میں اپنی بیٹی رقیہ سے کہا کہ بیٹیا! ا۔ اور ان اشعار کے ساتھ اپنے باپ کی مرثیہ خوانی کر، چنانچہ اشعار ذیل پڑھکر گریہ و بکا کیا۔

لعب البلی بمعالمی ورسومی　　وقبرت حیا تحت ردم ھمومی

نوم البلی جسمی فاوھن قوتی ان البلی الموکل بلن ومی

رنج ومحن نے میرے نام ونشان کو مٹا دیا۔ اور تختۂ غم کے نیچے زندہ درگور کر دیا گیا، رنج ومحن نے جسم میں پیوست ہو کر میری قوت کو توڑ دیا، بے شبہہ رنج وغم میرے ساتھ لازم وملزوم کر دیا گیا ہے،

سنہ وفات ومدفن اور لوح مزار | عہد مامون میں اور خاص بغداد میں نوّے سال کی عمر میں اس نے وفات پائی ہے، سنہ وفات میں اختلاف ہے، اس کے فرزند ابوالعتاہیہ محمد کے بیان کے مطابق اس نے سنہ ۲۱۱ھ مطابق ۸۲۶ء میں وفات پائی ہے، ابوالعتاہیہ کا مدفن خاص بغداد میں جانب غربی زیاتین کے پل کے پاس ہے، اور حسب وصیت اس کے اشعار ذیل لوح مزار پر کندہ کئے گئے۔

اذن حی تسمعی " اسمعی ثم عی وعی
انا رھن بمصرعی " فاحذری مثل مصرعی
عشت تسعین حجۃ " اسلمتنی لمضجعی
کم تری الحی ثابتا " فی دیار التزعزع
لیس زاد سوی التقی " فخذی منہ او دعی

زندوں کے کان! تمھیں کان لگانے اور سننے کی اجازت عام ہے، بس کان لگاؤ اور سنو! اور خوب یاد کر لو کہ میں قبر میں رہین اور محبوس ہوں، میری جیسی قبر سے ڈرتے رہو، نوّے برس تک میں دنیا میں زندہ رہا، بالآخر درازئ حیات نے خوابگاہ دائمی کی سیر بھی کرا دی، کتنے زندوں کو تم دیکھتے ہو کہ دنیائے فانی اور دار محن میں موجود ہیں مگر بجز زہد وتقویٰ کے کوئی دوسرا توشۂ راہ نہیں ہے، اور اس توشۂ راہ کے لے لینے اور چھوڑ دینے میں تمھیں اختیار ہے۔

لوح مزار کے اشعار سے ظاہر ہے کہ وہ نوّے سال زندہ رہا، اور باایں ہمہ درازئ حیات اس کو اپنی بے عملی پر نہایت حسرت وافسوس ہے۔

محمد کی مرثیہ خوانی | فرزند ابوالعتاہیہ محمد نے ابیات ذیل میں اپنے پدر مہربان کی مرثیہ خوانی کی ہے،

یا ابی ضمک الثری وطوی الموت اجمعک
لیتنی یوم مت صر ت الی حفرۃ معک
رحم اللہ مصرعک برد اللہ مضجعک

پدر من! قبر کی مٹی نے تجھے کھینچ لیا، اور موت نے تجھے بالکل فنا کر دیا، کاش روز مرگ قبر میں میں بھی تیرے ساتھ ہوتا، خدا کی رحمت تیری قبر پر ہو اور خنکی رحمت کی بارش تیری خوابگاہ پر ہو۔

محمد کے چند اشعار | نامور باپ کا بیٹا بھی شاعر تھا، اور اپنے دور کا باکمال شاعر تھا جس کے چند اشعار نمونہ کے طور پر درج ذیل ہیں

قد فلح السالم الصموت " کلام راعی الکلام قوت " ما کل نطق لہ جواب " جواب ما یکرہ السکوت
یا عجبا لامرئ ظلوم مستیقن انہ یموت

جو سالم اور خاموش رہا وہ اپنی من مانی مراد کو پہنچ گیا، رعایت اور توجہ کرنیوالے کا کلام پر زور ہوتا ہے، کونسی بات ہے جس کا جواب نہیں، مگر مکروہ اور ناپسندیدہ بات کا جواب خاموشی ہے

کلامِ شادؔ کے متعلق چند در چند غلط فہمیوں کا ازالہ

از جناب حمیدؔ عظیم آبادی

چند ماہ گذرے "انتقادِ شادؔ" کے نام سے جناب نصیح الدین صاحب فصیح بلخی کا ایک رسالہ شائع ہوا ہے۔ جواب میں جناب حمیدؔ عظیم آبادی نے ایک مضمون دفتر میں بھیجنا چاہا۔ اُس وقت موصوف کو اطلاع دی گئی کہ وہ رسالہ "انتقادِ شادؔ" اب آپ کی نظروں سے گذرا ہے۔ یہاں دفتر میں تقریباً ایک سال پیشتر سے بصورتِ مضمون آچکا تھا۔ لیکن اس کی اشاعت ندیمؔ میں نہ ہوسکی تو وہ رسالہ کی صورت میں شائع کیا گیا۔ اب اگر اس کے جواب کو شائع کیا جائے تو اخلاقاً وہ مضمون بھی چھاپا جائے جو دفتر میں پہلے سے آیا ہوا موجود ہے اور جسے مرتب نے اب رسالہ کی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ ندیمؔ سرے سے اس سلسلۂ بحث کے جاری کرنے کا ہموا نہیں۔ اور اسی نقطۂ نظر سے اوّلاً اس مضمون کی اشاعت عمل میں نہ آئی۔ بہرحال اس جواب کے بعد جناب حمیدؔ نے اپنا مضمون بھی رسالہ ہی کی شکل میں چھپوایا۔ اور ندیمؔ کا دامن اس سلسلۂ بحث سے آلودہ ہونے سے محفوظ رہا اور اسی سبب سے اس سلسلہ کے اور چند مضمونوں کی اشاعت بھی عمل میں نہ آئی جو موافق و مخالف دونوں گروہوں کی طرف سے دفتر میں موصول ہوئے۔

لیکن جناب حمیدؔ کا یہ ذیل کا مضمون اپنی جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ یہ گرچہ "انتقادِ شادؔ" کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا۔ لیکن اس میں روئے سخن مرتب "انتقادِ شادؔ" کی طرف ہونے کی بجائے مولوی ظفرالملک صاحب اڈیٹر الناظر لکھنؤ کی طرف ہے۔ جنہوں نے "کلامِ شادؔ" پر چند اعتراضات کئے تھے۔ الناظر کا وہ مضمون راقم سطور کی نظروں سے گذرا تھا۔ یاد نہیں آتا کہ اس کا کوئی جواب اب تک شائع ہوا ہے یا نہیں۔ بہرحال اس مضمون میں چند در چند مختلف مسائل ایسے آگئے ہیں۔ جنہیں نگاہوں کے سامنے آجانا چاہئے۔ اور اسی نقطۂ نظر سے اسے ندیمؔ میں شائع کیا جاتا ہے۔ ورنہ "انتقادِ شادؔ" اور اس کی موافقت یا مخالفت سے اسے کوئی بھی علاقہ نہیں ہے۔

ایسے مسائل پر جداگانہ رسائل ہی چھپتے رہیں تو زیادہ مناسب ہے۔ رسالوں کے دامن ان سے محفوظ رہیں تو بہتر ہے —— ہندوستان کے اہلِ کمال نے شادؔ مرحوم کو "دورِ حاضر کا میر" مانا ہے ہمیں ان کی آبرو عزیز ہے۔ ہمارے لئے اگر ان کی غلطیاں ہیں تو وہ بھی باعثِ فخر ہیں۔ اس لئے "دورِ حاضر کے میر" کے معترضوں کے جواب میں میر ہی کی زبان میں صرف یہی کہا جائے کہ:۔ "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" تو شاید سب سے زیادہ مختصر اور صحیح جواب ہو۔ "ندیم"

کسی کے دامن شہرت کو چاک چاک کرو کمال کا یہی ثمرہ ہے کیا؟ وطن والو!

غالبًا اس سلسلہ میں یہ میری آخری تحریر ہوگی۔ کیوں؟ اس کا جواب شاید مجھ سے بہتر میرے تلمیذ رشید دسعید جناب ہمزا و دنا طی نبیرۂ شاد دے سکیں۔ بہرکیف! ۱۹۲۷ء کی جنوری کو وہ آفتابِ فضل و کمال موت کے اُفق میں غروب ہو کر دنیائے ادب کو تاریک کر گیا اور اُس وقت سے لیکر اِس وقت تک یہ خاک پائے شاد استاد مرحوم کی جو خدمتیں قلمے سخنے قدمے درمے کرتا رہا وہ محتاج بیان نہیں۔ بہت سے حضرات اگر نہ جانتے ہوں تو نہ جانیں کیونکہ وہ خدمتیں مخلصًا کی گئی تھیں اور روحی تعلق اس کا محرک تھا۔ اس لئے اُن کا اعادہ فضول ہے۔ میرے بعض احباب کا یہ بھی خیال تھا کہ شاد مرحوم کے متعلق اب میں خاموش ہو جاؤں لیکن دل نے کہا کہ نہیں "اگر یہ بعض کے واقعات منظر عام پر نہ لائے گئے تو بہت سے حضرات غلط فہمیوں میں مبتلا رہ جائیں گے۔ میری مراد اہل عظیم آبادی سے نہیں بلکہ میرے صحیح مخاطب دوسرے صوبوں کے اہل کمال اور نکتہ رس حضرات ہیں۔ "کلام شاد" استاد مرحوم کی زندگی ہی میں شائع ہوا لیکن کس طرح اس کا بیان خود شاد مرحوم کے قلم کی زبانی سنئے! کلام شاد کے پہلے ہی صفحے پر جناب شاد مرحوم کے دستِ خاص کی لکھی ہوئی عبارت میرے پاس موجود ہے، اس جگہ اُس کا نقل کر دینا ضروری ہے، ورنہ خدا معلوم میرے بعد ان چیزوں کا بتانے والا اور دیکھنے والا کوئی رہے گا بھی یا نہیں:۔

> دھوکا:۔ تماشا یہ ہے کہ صفحہ ۱۴۱ تک ردیف الف .... ردیف (ت) پھر صفحہ ۱۴۵ سے ردیف الف شروع کی۔ ردیف ب ٹ ث ج ح خ د ذ ندارد۔ ردیف شین کی ایک غزل ضمیمہ میں اور منسوخ مصرع اور شعروں کو کہاں تک دیکھا جائے۔ کوئی صفحہ ایسا نہیں کہ لگاتار چار غلطیاں لفظوں کی اُس میں نہ ہوں۔ تماشا ہے کہ اُسی ذخیرہ میں درست کئے ہوئے بھی مصرعے اور شعر موجود ہیں لیکن ملاحظہ کرنے کی تکلیف نہ برداشت کی بیچر اصلی مسودہ میں قلم زد مصرعوں پر لیکن حرف (ن) کہیں (ص) وغیرہ لکھا تھا مگر نہ مجھ سے پوچھا نہ دریافت کیا علیٰ حالہ درج کر دیا۔"

اس بیان کی تائید مولانا سید سلیمان صاحب مدظلہ کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو مقدمہ کلام شاد صفحہ ۴:۔

مدیر "الناظر" لکھنؤ نے اگست ۱۹۲۳ء میں "کلام شاد" پر تنقید کی تھی۔ میری نظروں سے بھی وہ تنقید گذری تھی لیکن اتنے دنوں کی باتیں کہاں تک یاد رہتیں! بہرکیف! اِس طرف اُن ہی اعتراضوں کی بنیاد پر ایک نیا ہوائی قلعہ قائم کیا گیا ہے۔ میں نے معترض صاحب کے اعتراضوں کا جواب تو رسالے ہی کی صورت میں پیش کیا ہے اور اُنھیں "کھلا چیلنج" بھی دیا ہے لیکن

لے "کھلا چیلنج" میرے جوابی رسالے کا نام ہے اور اس سلسلہ میں بھی یہ آخری تحریر ہے کیونکہ سوال و جواب سے کوئی فائدہ نہیں۔ یا چیلنج قبول کیجئے اور علمی مناظرے کے میدان میں آئیے۔ یا خاموشی اختیار کیجئے بحث بیکار ہے اور میں ہر زید و بکر کو اپنا مخاطب بنانا پسند بھی نہیں کرتا اگر اور کوئی صاحب دیں گے تو میں خاموش رہونگا۔"

"مدیر الناظر" کے اعتراضوں کے جوابات "ندیم" کے ذریعہ عرض کرتا ہوں - اس جگہ میں اپنا مسلک بھی عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں - علمی مباحث یا تنقیدوں کے جوابات جو میں عرض کروں گا ان کا مقصد ادبی اور علمی تحقیق ہے اور بس - میں علمی مباحث میں رکیک اور طنزیہ حملوں کو علمی خدمت کے قطعی منافی سمجھتا ہوں - میں ذیل کی سطروں میں جو کچھ عرض کروں گا اس میں میرا مطمح نظر یہی ہوگا - رسالہ "الناظر" میرے پیش نظر نہیں لہذا میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں وہ رسالہ "انشاد شاد" کے حوالے سے "انشاد شاد" صہ؟ "بقول جناب فصیح مدیر الناظر لکھتے ہیں کہ" ردیف شعر کی جان ہے اور اگر ردیف شعر میں دست و گریباں اور پوری طرح چسپاں نہ ہو تو مضمون کتنا ہی عالی ہو شعر مہمل اور لغو سمجھا جائے گا - ہم کو تعجب ہے کہ ایسے مشاق اور کہنہ مشق شاعر کے ہاں بعض مقامات پر ردیف کمزور ہے یا چسپاں نہیں ہے "

الجواب :- ظفر الملک صاحب کا فرمانا بالکل صحیح ہے کہ "ردیف شعر کی جان ہے" لیکن میں بہ ادب اُن سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ "اگر ردیف شعر میں دست و گریباں اور پوری طرح چسپاں نہ ہو" یہ لکھنا صحیح ہے یا لکھنا کہ اگر ردیف قافیوں سے دست و گریباں نہ ہو - دست و گریباں کیساتھ میں لکھنا فصیح ہے یا سے ؟ جس طرح آپ کو شاد کے ہاں ردیف کے رہ جانے پر تعجب ہے - اُسی طرح مجھے بھی آپ کے اس شعر میں لکھنے پر نہایت ہی استعجاب اور بہت ہی حیرت ہے بقول مدیر الناظر کہ "بعض مقامات پر ردیف کمزور ہے" اردو کا کون سا شاعر ہے کہ جس کے مطبوعہ دیوان میں ردیفیں کمزور نہیں ؟ اگر بعض مقام پر شاد کے ہاں بھی ردیف کا کمزور رہنا تسلیم کر لیا جائے تو آپ کو تعجب کیوں ہے ؟ آپ لکھتے ہیں کہ "بعض مقامات پر ردیف کمزور ہے" بعض مقامات لکھنے کے بعد ردیف لکھنا مزید حیرت کا باعث ہے - کیا مختلف مقاموں پر ایک ہی ردیف رہتی ہے ؟ اگر بعض مقامات پر ردیفیں کمزور تھیں تو آپ نے ردیف بصورت واحد کس قاعدے کے مطابق تحریر فرمایا ہے ؟ میں کسی ایسے ویسے سے کیا تحریری مناظرہ کروں اگر مولانا ظفر الملک مدظلہ جواب لکھیں تو خیر کچھ لکھنؤ اور عظیم آباد کی صلاحیتوں کا پتہ چل جائے اور دنیا والے دیکھیں کہ بہار کی سرزمین ایسی بنجر نہیں جیسی سمجھی جاتی ہے یہاں کی سرزمین ہمیشہ مردم خیز رہی لیکن ہاں ناقدری ارباب فضل و کمال ہمارے وطن والوں کا قدیم شیوہ ہے میں اور حضرات کی طرح لکھنؤ یا دہلی کے نام سے متاثر ہونے والا نہیں - میں صرف کھرے اور کھوٹے سکوں کو جانتا ہوں اب وہ سکے خواہ خزانۂ عامرہ ہی کی ملک کیوں نہ ہوں - کلام شاد صفحہ ۰ میں وہ شعر ہے جس کی ردیف پر اعتراض کیا گیا ہے - وہ شعر یہ ہے - چلے جب شاد ہم سوئے عدم دنیا پکار اٹھی : ہمارے پاس سے پھر بھی اگر بے مرد ہوتا جا " کلام شاد میں چار شعر شائع کئے گئے ہیں - اصل دیوان میں پانچ شعر ہیں لیکن اُستاد مرحوم نے اس غزل پر بھی نقط بنا دی تھی - اسی لئے میرے انتخاب میں اس غزل کا جو ایک مطلع آیا تھا وہ بھی "میخانۂ الہام" میں درج نہ کیا جا سکا - وہ مطلع ملاحظہ ہو سے سراپا یاس ہوتا جا ، سراپا درد ہوتا جا : جہاں تک بن پڑے اے جسم لاغر زرد ہوتا جا " کلام شاد میں دوسرے شعر کا دوسرا مصرع بھی غلط چھپ گیا ہے یعنی " جو اے ارمان نکلنا ہے تو آہ سرد ہوتا جا " نکلنا کی جگہ نکلتا

چھپ گیا ہے۔ یہی چیزیں تھیں کہ جن کی طرف جناب شاؔد نے مولانا سید سلیمان صاحب مدظلہ کی توجہ مبذول کرائی تھی۔ شاعر کہنے کو تو ہزاروں اور لاکھوں شعر اپنے جذبات کے زیر اثر کہہ جاتا ہے لیکن وہ تمام اشعار اس غرض سے نہیں کہتا کہ وہ شائع بھی کئے جائیں۔ یہ کلام کے طبع کرنے والوں کا فرض ہے کہ وہ ان باتوں کو دیکھیں۔ کیا جناب داؔغ نے یہ شعر اس لئے کہا تھا کہ شائع کیا جائے، اور اس طرح کے اشعار شائع کرکے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ان کی شاعری کے دامن پر بدنما دھبے لگا رکھے جائیں؟ ؎ حوروں کا انتظار کرے کون حشر تک :: مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں :: میں جناب داؔغ کو نہیں بلکہ ناشر کلام کو ملزم سمجھتا ہوں۔ "انشادِ شاد" ص۴ بہ حوالہ "تنقید الناظر" ؎ اب یہ چھیڑ کہ بستر اٹھا گئی سِدمیری: مجھی پہ غیظ و غضب وہ نکال دیتے ہیں :: غصہ نکالنا تو مستعمل ہے۔ غیظ و غضب نکالنا نظر سے نہیں گذرا اور اگر ہو بھی تو نکال دیتے ہیں اچھا نہیں معلوم ہوتا ہے اور ردیف چسپاں نہیں ہے۔

الجواب :۔ شاؔد مرحوم کی جس غزل کا یہ شعر ہے، اُس غزل کے سات اشعار کلام شاؔد میں شائع کئے گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو کلام شاد ص۵۴:۵۵ اور میخانۂ الہام میں پانچ اشعار ہیں۔ اصل مسودے میں پندرہ اشعار ہیں۔ اور شعروں سے مجھے بحث نہیں۔ کلام شاؔد میں جو اشعار درج کئے گئے ہیں اور جن شعروں میں شعر زیر بحث بھی ہے، اُن کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ "نکال" بہ صورت قافیہ دو شعروں میں نظم ہوا ہے۔ مرتب کو کم از کم اتنا تو دیکھ لینا تھا کہ ایک ہی قافیہ کے شعروں کو مکرر شائع کرنے کا کوئی حاصل ہے یا نہیں؟ ؎ زبان حال خطِ شوق سے زیادہ ہے :: یہ بات قاصد کے کان میں ڈال دیتے ہیں: دیوان ہذا میں مصرعۂ اولیٰ یوں ہے ؎ بیانِ حال زبانی خطوں سے بہتر ہے :: .... "زیادہ ہے" اور "بہتر ہے" کا فرق ارباب نظر سے مخفی نہیں! نکال کا قافیہ دو شعروں میں ایک ساتھ کلام شاؔد میں شائع کیا گیا ہے، گرچہ اصل مسودے میں یہ قافیہ ایک اور بھی شعر میں نظم ہوا ہے۔ یوں تو انسان کا کلام ہے غلطیوں سے بالکل مبرا ہونا کیونکر ممکن ہے لیکن مرتب کا یہ کام نہیں کہ ہر برے اور اچھے شعر کو شائع کرکے مصنف کو رسوا کرے!! ناقدین کا یہ مطمح نظر کس قدر ہمت شکن اور زبان کی ترقی کی راہ مسدود کرنے والا ہے کہ "فلاں ترکیب نظر سے نہیں گذری"! اگر کوئی ترکیب نظر سے نہیں گذری تو کیا اب اُس کا لکھنا یا نظم کرنا جرم ہے؟ میں اس اصول کا قطعی حامی نہیں! اگر ایک استاد فن اور کہنہ مشق اس طرح مجبور کر دیا جائے تو پھر زبان کی ترقی کا خدا حافظ!!

"انشادِ شاد ص۴ بہ حوالہ تنقید الناظر"

صدق دل سے شاؔد کی تصدیق کر ایمان لا فرق کر اے مدعی جادو سے اور اعجاز سے

ایسے موقع پر "سے" نہیں اچھا معلوم ہوتا ہے "قاعدے سے جادو میں اور اعجاز میں ہونا چاہیئے"۔

الجواب :۔ کلام شاد ص۵۸ و ۵۹ میں وہ غزل ہے جس کا یہ مقطع ہے۔ "یا" کی ردیف کی اکثر غزلیں میخانۂ الہام میں مجبوراً درج نہ کی جا سکیں۔ اکثر غزلیں اور اشعار شائع ہونے کے لائق تھے لیکن اُس بحث سے یہاں کوئی

سرو کار نہیں۔ اُن ہی غزلوں میں یہ غزل بھی ہے یقینی "ہیں" کی جگہ ہے لیکن ردیف کی مجبوری تھی اردو شاعری میں قافیوں اور ردیفوں کی پابندیاں طرح طرح کی رکاوٹیں عائد کرنے کی وجہ سے دشوار سمجھی جاتی ہیں جناب شاد کا ذہن اس طرف نہیں گیا۔ یہ بشریت تھی لیکن مرتب کے سر بھی کچھ ذمہ داریاں ضرور ہیں! جس کے ہاں ہزاروں ہزار اشعار ہیں، اگر دس بیس اشعار کمزور بھی ہیں تو وہ قابل اعتنا نہیں۔ مرتب بلا تکلف اُن اشعار کو قلم زد کر سکتا ہے ہاں جس کا کلام مختصر ہے اُس کے ہاں اس طرح کی دقت ہو تو ہو لیکن شاد کے ہاں تو اس کا سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ مرتب کے دیکھنے کی یہ بھی چیز ہے کہ شاعر کبھی کبھی ایک ہی خیال کو مختلف غزلوں میں نظم کرتا ہے، پھر کیا ضرورت ہے کہ جس شعر میں وہ خیال کمزور طریقہ پر نظم ہو گیا ہے اُس کو بھی شائع کر ہی چھوڑے۔ جامع اور مرتب کے لئے بھی بہت سی پابندیاں ہیں۔ کسی باکمال کا کلام ردّی سے شائع نہیں کرنا چاہئے۔ ع "کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری" آپ کے پاس اگر اتنا وقت نہیں کہ آپ اُس کے کلام کو بغور پڑھ سکیں یا اُس کے تحریری اشارات پر عمل ہو سکیں تو کیا ضرورت پڑی ہے کہ اس سرسری طور پر کسی کا کلام شائع فرما کر اس کو بدنام کریں۔ جس مقطع کو مدیر انسافر نے پیش کیا ہے، اُسی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔ کلام شاد صفحہ ۸۹

برملا کہنے لگے ہیں مست میخانے کا راز ॥ ہم نہ کہتے تھے پلا ساقی انھیں انداز سے

مصرعۂ اولیٰ میں لفظ "ہیں" حشو ہے۔ مصرع کی نثر یہ ہوتی ہے کہ "مست میخانے کا راز برملا کہنے لگے" ہیں کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے۔ چنانچہ جناب شاد نے اس "ہیں" کو خود نکالا تھا۔ ملاحظہ ہو دیوان شاد قلمی نمبر ۳

برملا کہنے لگا ہر مست میخانہ کا راز ॥ ہم نہ کہتے تھے پلا ساقی انھیں انداز سے

ارباب نظر انصاف کریں کہ ان چیزوں کی ذمہ داری میری بے توجہی ہے یا جناب شاد! اس شعر کے بعد ہی کا ایک شعر اور بھی ملاحظہ ہو:۔ صفحہ ۸۹ (ک۔ش) سے

چھوٹے موسیٰ سے کہتے ہم جو ہوتے طور پر ॥ کون اس پردے میں ہے پہچان لو آواز سے

دوسرے مصرع میں "پہچان لو" کا ٹکڑا یوں بدلا گیا تھا۔ ع کون اس پردے میں ہے پہچانئے آواز سے۔ دیوان شاد قلمی نمبر ۵ = "پہچان لو" اور "پہچانئے" کا فرق دیکھئے! اس "پہچانئے" سے حضرت موسیٰ کا احترام بھی اور مصرع کی شان بھی قائم رہتی ہے! یہی چیزیں تھیں جن کی طرف حضرت شاد نے مذکورالصدر تحریر میں اشارہ کیا ہے۔

انشاد شاد صفحہ ۴ بحوالہ تنقید انسافر:۔

بے وضو ساقی سے نہ پائے گا مے ॥ کہہ دو میکش اپنے منہ کو دھو رہے

سورہے اور کھورہے میں "دھورہے" فرمایا ہے۔ ردیف رہے غلط ہے۔ ایسے موقع پر ہماری زبان میں دھو کے بولا جاتا ہے۔

الجواب :۔ کلام شاد ص۱۲۰ میں اس غزل کے (جس کا یہ شعر ہے) نو شعر درج کئے گئے ہیں۔ اصل دیوان میں دس شعر ہیں۔ میرے انتخاب میں پانچ شعر آئے تھے لیکن مجبوراً متفرقات کے ضمن میں صرف دو شعر دیئے گئے۔ ملاحظہ ہو "میخانۂ الہام" ص۲۹۷ لیکن وہ دو اشعار غزل کی جان ہیں۔ دیکھنے کی یہ بات ہے کہ ہزاروں شعروں میں اناظر کے مدیر کے سے نظر رکھنے والے کو بھی صرف چار شعروں میں ردیفیں کمزور یا خلاف محاورہ نظر آئیں اور وہ بھی اس دیوان میں جو زوا ردی اور سرسری طور پر شائع کیا گیا تھا۔

انتقادِ شاد ص۵۱۴ بحوالہ تنقید الناظر :۔

"مقدمہ نگار مولوی سید سلیمان صاحب نے شاد صاحب کی بلند نظری اور خوش مذاقی کی بہت تعریف کی ہے لیکن اشعار ذیل کے عامیانہ اور سوقیانہ انداز بیان سے تمام تر پاک ہونے کا فیصلہ ہم انہیں پر چھوڑتے ہیں۔

(۱) گرا جو ہاتھ سے شیشہ معاف کر ساقی کسی نے زور سے پنجہ مرا مڑد دیا
(۲) کسے لحاظ ہے تحت الحنک کا قاتل کے رگوں میں دیر سے کھولا ہوا لہو ہوگا
(۳) کیا اس معاملہ کے خریدار ہم نہیں کیا اور بھی ہے کوئی خریدار آپ کا"

الجواب :۔ زیر بحث تین شعروں میں آخر الذکر دو شعر میرے انتخاب میں نہیں آئے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ پنجہ مڑد دینے میں کیا سوقیانہ پن ہے۔ اگر مولانا ظفر الملک اپنے اس اعتراض کی وضاحت فرمائیں گے تو میں بالتشریح جواب عرض کروں گا اور یہ بھی بتاؤں گا کہ اس شعر کا کیا مطلب ہے اور شیشہ و ساقی وغیرہ سے شاد کے ہاں کیا استعارہ مقصود ہے۔ تحت الحنک عربی ترکیب تھی اس لئے یہ شعر انتخاب میں نہیں آیا۔ دوسرے لہو کا قافیہ اس سے بہتر نظم ہو چکا تھا۔ تاہم میں نہیں سمجھا کہ "تحت الحنک" میں کیا ابتذال ہے! اعتراض وضاحت کا محتاج ہے! تیسرے شعر میں مولانا نے غلط تصرف کیا ہے۔ ملاحظہ ہو کلام شاد ص۳۶۔ مصرعۂ اولیٰ میں خریدار کی جگہ سزاوار ہے۔ اس لفظ سے وہ پہلی بات باقی نہیں رہتی لیکن "معاملہ" کا لفظ یقینی قابل لحاظ ہے۔ میرے انتخاب میں تو یہ شعر یقینی نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو میخانۂ الہام ص۶۹۔ استاد مرحوم کے ہاں بھی اس شعر پر (ن) نظر کی ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی کسی شعر کو داخل دیوان کر کے شائع کر دے شاد کا مذاقِ سخن قطعی اس کا ذمہ دار نہیں!! چنانچہ خود استاد مرحوم بھی اپنے گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ ملاحظہ ہو "مکتوبات شاد" مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) مطبوعہ ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد دکن ص۱۵۵

مسودہ دیکھا تو سر پیٹ لیا یعنی منسوخ اشعار اور خام اشعار تک اپنی تجویز سے چھپنے کو بھیج دیئے۔۔۔۔۔"

ص۱۵۶ "ایک تو کم بخت کلام بے ترتیب اور منسوخ اور وہ بھی صرف دس جزو وہاں چھپ رہا ہے میری تو ناک کٹ جائے گی۔۔۔۔۔۔" (۱۵ فروری سنہ ۲۳ء)

انشاد شاد صفحہ ۵ بحوالہ تنقید الناظر:۔ "بعض اشعار میں تو حیدرآباد کی پرانی اردو کا لطف مل جاتا ہے

(۱) غم فراق پہ اے آسماں نہیں موقوف　　وہ جو سہائیں غریبوں کو ہر طرح سہنا

(۲) شاد کے آگے بھلا کیا ذکر یار　　نام ادھر آیا کہ اس نے رو دیا

"وہ جو سہائیں غریبوں کو ہر طرح سہنا اور رو دیا" پر بے اختیار سید سجاد حیدر کے خیالستان کے نواب غیاث الدولہ آف حیدرآباد دکن یاد آ گئے"

الجواب:۔ شاد مرحوم زبان کے مسئلہ میں نہ دہلی کے مقلد تھے نہ لکھنؤ کے بلکہ وہ صوبہ بہار کے شرفا کی زبان لکھتے اور بولتے تھے۔ لکھنؤ کی زبان البتہ دہلی کے زیر اثر رہی اور دہلی کی زبان خود فارسی سے بہت زیادہ متاثر تھی لیکن عظیم آباد کی اردو، پراکرت اور بھاکا کی گود میں پلی اور پروان چڑھی، اس لئے ہر جگہ فارسی کی تقلید یہاں نہیں ملے گی اور نہ ہر جگہ دہلی یا لکھنؤ کے فصحا کی تقلید یہاں والے لازمی سمجھتے ہیں نواب خیال مرحوم ہی کی زبان کو لیجئے! وہی نتھری اور گنگا جل کی دھلی ہوئی صاف اردو تھی۔ سہائیں پر آپ کو اعتراض ہے۔ سہانا، سہنا کا متعدی بنایا گیا ہے یہ لفظ میری نظر دں سے بھی نہیں گذرا لیکن ممکن ہے کہ یہ شاد مرحوم کا تصرف ہو۔ سہائیں یعنی وہ جو سہنے پر مجبور کریں۔ مان لیجئے کہ ایک فعل متعدی شاد نے استعمال کیا اگر یہ مستحسن نہیں تو خود شعرا و فصحاء اس کے استعمال سے پرہیز کریں گے لیکن کسی نے اگر کوئی لفظ یا محاورہ ایجاد کیا تو ہمیں اس قدر چراغ پا ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا صرف لکھنؤ اور دہلی کے شعرا اور فصحا ہر طرح کی ایجاد کے مجاز ہیں اور ہم میں ایسی تقلید اور صوبائی تعصب کے آگے سر تسلیم خم کرنے والا نہیں۔ یہاں کے فصحا بہت سے ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ جو دہلی یا لکھنؤ میں مستعمل نہیں، تو کیا وہ غلط ہیں؟ ہرگز نہیں!! خیال مرحوم کے ہاں بھی ایسے الفاظ اور فقرے ملیں گے لیکن یہاں اس طولانی بحث کی ضرورت نہیں، سہنے کا فعل متعدی آپ کیا بنائیں گے؟ یہ استاد مرحوم کا تصرف سمجھئے اور ہر استاد وقت اس کا مجاز ہے۔ مستحسن اور غیر مستحسن یہ دوسری شئے ہے۔ میں خود بھی اس سہائیں کو مستحسن نہیں سمجھتا اور نہ لکھتا ہوں!

انشاد شاد صفحہ ۶ بحوالہ تنقید الناظر:۔ "اپنے ایک پوربی دوست کا نام ہم لوگوں نے شامل بدھنا رکھ دیا اور شامل سے خاص لطف اٹھایا کرتے تھے یہی لطف بعض جگہ اس دیوان میں بھی مل جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

جھلک کچھ کچھ نظر آئیگی گو پردوں پہ پردے ہیں　　ہوس گر ہے تو آئیں میرے شامل دیکھنے والے"

الجواب:۔ میرے ایک دوست ہیں جنھیں میں "بے ٹونٹی کا بدھنا" کہتا ہوں یعنی جدھر کا وزن بھاری پڑا ادھر لنڈھک گئے۔ دیکھا کہ ایک مولانا اور اس پر بھی لکھنوی جب لکھتا ہے تو مجھے اس کی تقلید میں کیوں تکلف ہو۔ آؤ میں بھی اپنے دل کی بھڑاس نکال لوں، مولانائے موصوف شامل کے لفظ میں کیا قباحت سمجھتے ہیں! شامل بہ معنی ہمراہ یہاں تمام فصحا بولتے اور لکھتے ہیں لیکن بھلا کوئی لکھنوی عظیم آبادی کی بات کیوں تسلیم کرنے لگا۔ لیجئے میں آپ کو حضرت امیر مینائی مرحوم کا ایک شعر سناتا ہوں۔

سنئے! مراۃ الغیب صفحہ ۲۹ ؎ ساتھ اغیار کے جب یار کرے بادہ کشی　خونِ دل کیوں نہ یہاں اشک کے شامل آئے
لیجئے فصیح العصر جناب داغ بھی لکھتے ہیں دیکھئے اِن پر بھی وہ بدھنا والی مثل صادق آتی ہے یا نہیں ؟ گلزارِ داغ صفحہ ۹۵

؎ آگیا مفت کے چکر میں ازل سے ناحق　اے فلک تو میری تقدیر کے شامل ہو کر

؎ قدرداں کوئی نہیں اہلِ سخن کا اے داغ　کیا کریں آہ کسی کام میں شامل ہو کر

(ابھی مولانا ظفر الملک سے قدرداں بحمد اللہ زندہ ہیں)

گلزارِ داغ صفحہ ۲۰۵ ؎ اے غمِ یار کوئی اپنا ٹھکانا کر لے　دِل تو پُر درد ہے تو درد کے کیوں شامل ہے؟

شاد مرحوم کا زیرِ بحث شعر میرے انتخاب میں نہیں آیا تھا اور اس لئے میخانۂ الہام میں درج نہیں کیا گیا۔ ملاحظہ ہو میخانۂ الہام صفحہ ۲۷۴، ۲۷۵ اگر مجھے اِس اعتراض کا خیال ہوتا تو میں بالقصد اِس شعر کو ضرور رکھتا۔ میں کسی کی غلط بات کسی سے مرعوب ہو کر اوروں کی طرح ماننے والا نہیں !!

انتقادِ شاد صفحہ ۵ بحوالۂ تنقید الناظر :۔ "شترگربہ اور ضمائر کی عدم مطابقت فاورالکلامی کے کس قدر خلاف ہے؟ عجب ہے کہ شاد صاحب فرماتے ہیں ؎ چلے جائیں گے ہم جو محفل سے تیری : کوئی اور میری جگہ آرہے گا "ہم اور میری کیا ؟

الجواب :۔ اُستاد مرحوم میر انیس مغفور کی طرح شترگربہ کو عیب نہیں سمجھتے تھے۔ میر انیس مرحوم کے ہاں یہ چیزیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ مولانا میر انیس کے مراثی پڑھنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ فصیح صاحب نے جو شترگربہ پر مولانا کی تقلید میں اعتراضات کئے ہیں، اُس سلسلہ میں میر انیس مغفور کے اشعار پیش کر چکا ہوں، ملاحظہ ہو "کھلا چیلنج" صفحہ ۱۹"۔ میں نے میخانۂ الہام میں "چلے جائیں گے ہم" کو "چلا جاؤں گا میں" سے بدل دیا ہے" کیونکہ اس سے شعر میں کوئی تغیر نہیں ہوتا شاد مرحوم اس کو نہیں مانتے تھے اور اپنی ضد میں اُسی طرح لکھتے تھے۔ میں سمجھتا اور جانتا تھا کہ یہ محض ضد کی بات تھی، اس لئے میں نے اُس کو بدل دیا۔ ملاحظہ ہو میخانۂ الہام صفحہ ۴۹"۔ استاد مرحوم نے ہم ہی لکھا تھا، یہ میری جسارت تھی کہ میں نے اس کو بدل دیا اور اس جسارت بیجا کا مجھے اعتراف ہے !!

انتقادِ شاد صفحہ ۵ بحوالۂ تنقید الناظر :۔ "حشو و زوائد کا خیال رکھنا اور شعر میں ایک حرف بھی ایسا نہ رکھنا جس کا حذف کر دینا مطلب میں خلل نہ ڈالے ہنر بلکہ شاعر کیلئے ضروری ہے، اشعار ذیل میں نشان دادہ الفاظ ظاہر نظر ہیں حشو نظر آتے ہیں"

مرثیہ میر انیس جلد چہارم صفحہ ۵ بند ۳۴ ؎ یا سبطِ نبی تن سے چلی روح ہماری : اک لحظہ ٹھہر جائیے میں آپ کی واری

بند ۳۹ ؎ نیزہ علی اکبرؑ کو مرے سامنے مارا : پانی کو ترستا ہوا دنیا سے سدھارا
ہیں دشمنِ اولادِ علیؑ وہ ستم آرا : اِس کو بھی کریں قتل تو کیا زور ہمارا

؎ بظاہر مٹ چکا ہے عشق کا آزار لیکن پھر طبیعت ہر گھڑی رہ رہ کے کیوں غمگین ہوتی ہے

؎ یوں تو تھے مد نظر لاکھوں حسیں آخر آخر ہم انہیں کے ہو رہے"

الجواب:- ظاہر نظر میں حشو نظر آتے ہیں' یا بظاہر حشو معلوم ہوتے ہیں' ظاہر نظر میں' کیا فصیح اردو ہے۔ پہلے شعر میں بھر حشو نہیں ہے شعر کی نثر یہ ہوتی ہے کہ 'عشق کا آزار بظاہر مٹ چکا ہے لیکن پھر طبیعت ہر گھڑی رہ رہ کے کیوں غمگین ہوتی ہے؟ ایسا ہونے کا بعد پھر ایسا کیوں ہے۔ میں نے آپ کو روٹ بھی بھیجدئے لیکن پھر آپ کیوں نہ آئے' آپکو اس جملے میں کیا تکلف ہے؟ دوسرا شعر میرے انتخاب میں نہیں آیا ہے۔ ملاحظہ ہو میخانۂ الہام صـ۲۹۶ اس غزل میں دس اشعار ہیں۔ کلام شادؔ میں ۹ چھپے ہیں لیکن میرے انتخاب میں صرف پانچ شعر آئے تھے لیکن مجبوراً وہی درج کئے جاسکے۔ آخر آخر کی تکرار سے کلام میں زور پیدا کرنا مقصود ہے۔ "آخر آخر وقت تک وہ میرا ساتھ دیتے رہے" زیادہ سے زیادہ آپ یہی کہیں گے کہ 'وقت' کا لفظ یہاں نہیں ہے اور صرف ایک آخر سے بھی مطلب پورا ہو جاتا ہے' تو ایسے حشو و زوائد سے کسی شاعر کا کلام مبرا نہیں۔ آپ اساتذہ میں سے کسی کا نام لیں' میں اُس کے کلام سے حشو و زوائد کی مثالیں پیش کر سکتا ہوں۔

انشاد شاد صـ بحوالہ تنقید الناظر:-

بعض محاورات وہ نظم ہوئے ہیں جو لکھنؤ اور دہلی میں بھی شاید مستعمل نہیں ممکن ہے کہ صوبہ بہار کے ساتھ مخصوص ہیں" دل لے گیا کلام فصیحانہ آپ کا" کلام فصیحانہ کی جگہ پر کلام فصیح ہونا چاہئے تھا۔

الجواب:- لکھنؤ' دلی اور عظیم آباد پر موقوف نہیں۔ ہم لوگ ہرگز فصیحانہ نہیں بولتے۔ حکیمانہ کی جگہ 'فصیحانہ' قلم سے نکل گیا اور شادؔ مرحوم نے اُس کا خیال نہیں کیا۔ یقینی کلام فصیح لکھتے ہیں اور یہی درست ہے ملاحظہ ہو میخانۂ الہام صـ۴۴

؎ تاثیر نہ ہو شادؔ تو دینا ہمیں الزام کچھ دیر تو سُن وعظ حکیمانہ ہمارا۔

آپ لکھتے ہیں کہ "کلام فصیحانہ کی جگہ پر کلام فصیح ہونا چاہئے تھا" کیا لکھنؤ کو اسی 'پر' پر ناز ہے؟ اس پر کی بھی ایک ہی رہی: کوئی عظیم آبادی ہوتا تو اس جگہ یوں لکھتا "کلام فصیحانہ کی جگہ کلام فصیح ہونا چاہئے تھا"

انشاد شاد صـ۶ بحوالہ تنقید الناظر:- "پیغام آرہے ہیں تواتر وصال کے ؛ ہر ہر نفس فراق میں قاصد ہے یار کا۔

تواتر غلط ہے علی التواتر بولا جاتا ہے"

الجواب:- حضرت جلالؔ تلمیذ حضرت دردؔ فرماتے ہیں ؎

نہ دل کو اشک تواتر نہ آہ سرد پسند ہم اہل درد ہیں' ہم کو فقط ہے درد پسند

المیزان' مولفۂ عالی جناب چودھری سید نظیر الحسن صاحب فوقؔ رضوی رئیس مہابن ضلع متھرا۔ صـ۱۵۰ تواتر بمعنی تواتر۔ میر ضمیرؔ ع اتنے میں تواتر یہ خبر لائے خبردار $\frac{1}{۲۷۲}$ " اُستاد مرحوم نے بالقصد یہ لفظ استعمال کیا تھا تاکہ زبان کا دائرہ محدود نہ ہو جائے اور الفاظ ترک ہوتے نہ چلے جائیں' ورنہ کیا سامنے کا لفظ 'پیا پے' ان کے پیش نظر نہ تھا؟

وہ زبان کے مسئلے میں تنگ خیالی کو زبان کی ترقی کیلئے مضر سمجھتے تھے۔ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے لیکن اس جگہ یہ طولانی بحث طوالت کا باعث ہے، اس لئے مندرجۂ بالا مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں ۔

انتقاد شاد ص ۶ بحوالۂ تنقید الناظر: ۔ " نہ آئی مرے بادہ خانہ میں عید ؛ محرم کا بارہ مہینا رہا

دوسرے مصرعہ کی زبان کچھ سمجھ میں نہ آئی "

الجواب :۔ جس غزل کا یہ شعر ہے اُس کے تین اشعار پر نظر تھی اور اُن اشعار میں ایک یہ شعر بھی ہے، اس لئے میرے انتخاب میں بھی یہ شعر نہیں آیا۔ ملاحظہ ہو میخانۂ الہام ص ۱۱۶، ۱۱۷۔

انتقاد شاد ص ۶ بحوالۂ تنقید الناظر: ۔

" مقتل میں حقیقت کیوں کھلتی اس میری شہادت ہونیکی ؛ آپ اپنی خطا ہے قاتل کی پہچانا گیا شرمانے سے

اس میری شہادت ہونا بہت بھونڈا ہے ایسے موقع پر شہید ہونا فصیح ہے " " اسی طرح کی بعض اور خامیاں ہیں جو خدا کرے مظلوم کاتب کی ہوں اور ہمارے نامور شاعر کا دامن ان سے پاک ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

الجواب :۔ یہ شعر میرے انتخاب میں نہیں آیا ہے لیکن 'پانے' کی جگہ 'ہونے' چھپ گیا ہے۔ یہ کتابت کی غلطی ہے مولانا کاش اسی غزل کا مطلع اُسی کلام شاد میں پڑھ لیتے تو ایسا بھونڈا اعتراض نہ کرتے۔ ملاحظہ ہو کلام شاد ص ۱۰

ے اعضائے بدن سب مضطر ہیں اس دل کے شہادت پانے سے ؛ لشکر میں تلاطم برپا ہے سردار کے مارے جانے سے

غالباً اس مطلع کے پڑھنے کے بعد مولانا کو ضرور یقین ہو جائے گا کہ کتابت کی غلطی ہے، اور اہل عظیم آباد شہادت پانا اور شہید ہونا ہی بولتے ہیں۔ یقینی اس طرح کی خامیاں 'مظلوم کاتب' کی نہیں بلکہ ظالم کاتب کی ہیں۔ اور آپ بھی اگر شاعر ہیں تو ان ظالموں کے دست برد سے نہ بچے ہوں گے۔ میں کلام شاد ہی سے سرسری طور پر چند اور کتابت کی غلطیاں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ کو اور شاد کے عظیم آبادی مسترشدوں کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ الناظر کی تنقید کو دیکھ کر تصحیح کر لی گئی ہے۔ میں یہ عرض کرتا ہوں کہ برسوں اُدھر کی باتیں مجھے ذرا بھی یاد نہ تھیں۔ ہاں صرف ایک فیضی نہ مجھے ضرور یاد تھا اور بس ۔ ے راست می گویم و یزداں نہ پسندد جز راست ؛ حرف ناراست سر دوں رُتش ہرزہ

ملاحظہ ہو کلام شاد :۔ ص ۲ پسر بجائے بستر۔ ص ۷ مصالح۔ بجائے مسالا۔ ص ۸ نکلتا بجائے نکلنا۔ ص ۲۲ حوصلہ بجائے حوصلہ۔ ص ۱۶ گا بجائے سہے گا۔ ص ۴۷ کی۔ بجائے کے۔ ص ۴۷ اپنے بجائے اپنی۔ ص ۵۴ جب۔ بجائے چُپ ص ۵۵ دنیا۔ بجائے مینا ص ۶۶ رچا بجائے رچا بچا۔ ص ۶۷ بھلا۔ بجائے بجھا۔ ص ۸۷ چوکی۔ بجائے چوکے، ص ۹۲ اسی۔ بجائے سہی۔ ص ۹۵ کہے۔ بجائے کسے۔ ص ۹۶ باقی بجائے باقی ص ۹۶ چشم بجائے جسم۔ ص ۹۸ جھولے بجائے جھولا ص ۱۰۱ یہ بجائے یہ ص ۱۰۱ مجکو بجائے تجکو ص ۱۰۲ بھی کی بجائے کبھی ص ۱۰۲ ہونا بجائے مرنا ص ۱۰۲ ساقی بجائے زاہد ص ۱۰۴۔ گھٹ بجائے بٹ ص ۱۰۴ دعا بجائے دوا ص ۱۰۵ امت ہی تو بجائے زینت ص ۱۱۱ نگاہ بجائے نقاب ص ۱۲۶ سانس بجائے جان ص ۱۲۹ توقف بجائے توقف نہ کر ص ۱۳۳ پھیرنا بجائے پھیرنا ص ۱۳۸ ہو بجائے ہوں ص ۱۴۰ اچھا بجائے اچھو ص ۱۴۴ سلگ بجائے مہک ص ۱۴۴ تن بجائے دل ص ۱۴۴ احسان بجائے ارمان

افسانہ و محاضرات

کالج گرل

از

جناب سید ظہیر الدین حسن صاحب ایم، اے (عثمانیہ)

ہم اور خلیل سرِراہ دو ایسے گھروں میں رہتے تھے جو ایک درمیان کی دیوار کے ذریعہ ایک دوسرے سے جدا تھے، آمد و رفت کیلئے دونوں کے دروازے اگرچہ الگ الگ تھے مگر دونوں بالکل متصل۔ دو دن پہلے خلیل کے گھر میں میری ملاقات غفار سے ہوئی اور وہ بھی خلیل ہی کے توسط سے۔ ایک روز مغرب کے بعد جبکہ میں اپنے دیوان خانہ میں سگریٹ پیتا ہوا کچھ لکھ رہا تھا خلیل آئے اور کہنے لگے۔

وہ میرے دوست غفار صاحب پرسوں آئے تھے، آج پھر آئے تھے۔

کیوں پھر کیوں آئے تھے، میں نے پوچھا۔

وہ تو کچھ عجیب معمہ ہے۔

معمہ کیا ہے تمھیں تو ہر بات معمہ ہی معلوم ہوتی ہے۔

معمہ یہ کہ انکی دوستی ایک کالج گرل سے ہے۔

کالج گرل سے۔ میں نے ذرا زیادہ توجہ اور دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

ہاں، کالج گرل سے۔ اور انکی دوستی اس سے کئی سال سے چلی جا رہی ہے اور میں اسی کے متعلق کچھ باتیں کرنی چاہتا ہوں خلیل نے کہا۔

کیا باتیں میں نے پوری دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

بات یہ ہے کہ غفار صاحب آئے انھوں نے میرا گھر دیکھا انھوں نے بھی گذشتہ سال ہی میرے ساتھ میڈیکل کالج سے پاس کیا ہے۔ کئی بار اسپتال میں ملے۔ مکان کا پتہ پوچھا۔ گھر آئے، اور آج جب کہ وہ پھر ملے تو انھوں نے اس عجیب و غریب خواہش کا اظہار کیا، کہ وہ کسی دن اسے میرے گھر لا کر تمام وقت یہیں دونوں ٹھہرنا چاہتے ہیں، اور شام کے چار بجے جس وقت میں اسپتال سے واپس ہوتا ہوں اسوقت وہ دونوں بھی واپس ہو جائیں گے۔

میں نے کہا کیوں؟ کیا ملاقات کے لئے انھیں کوئی اور مقام نہ مل سکا۔

نہیں یہ بات نہیں ہے بلکہ وہ اسے کسی ہوٹل وغیرہ میں لیجانا نہیں چاہتے ہیں۔ میرے گھر آنا چاہتے ہیں تاکہ تمام دن اطمینان سے باتیں ہو سکیں۔

خلیل نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا اس کا منشا صرف یہ تھا کہ اس معاملہ میں میری رائے کیا ہے۔ کچھ تو اس لئے کہ ایسی رومان پیدا کرنے والی باتوں کو دیکھنے اور سننے کا ہر شخص میں ایک فطری شوق ہوتا ہے اور کچھ اس لئے بھی کہ مجھے جستجو ہوئی کہ دیکھیں یہ کالج گرل کون اور کیسی ہے، اور دونوں میں کیا کیا باتیں ہوتی ہیں۔ راز کے جاننے کے اسی شوق کے جذبہ کے ماتحت میں نے خلیل سے کہا۔

اس میں مضائقہ کیا حرج ہے، وہ اول تو دن میں آئیں گے

دوسرے تمہارے آنے سے قبل ہی واپس بھی ہو جائیں گے، گھر کی کنجی نوکر کو دے جاؤ، یا اگر مناسب سمجھو تو مجھے۔ میری اس تجویز کو خلیل نے سنکر ہاتھ میں بندھی ہوئی گھڑی کی کنجی کو الٹے پھراتے ہوئے کہا۔

نہیں میں نے تمہارا تذکرہ کیا تھا، غفار صاحب نے خواہش ظاہر کی ہے کہ یہ بات میں تم کو بھی سمجھا دوں۔ غفار صاحب دراصل دو سال سے اس کی کوشش میں ہیں کہ ان کی شادی اس سے ہو جائے دونوں میں پاک محبت ہے، ہاں لیکن کنجی دینے کی کیا ضرورت نوکر تو رہے گا، اور پھر وہ لوگ میرے سامنے ہی آئیں گے اور شاید میرے سامنے ہی میرے آنے کے بعد جائیں۔

بس تو ٹھیک ہے، کہدو کہ جس دن وہ چاہیں بخوشی آئیں میں نے کہا۔

دوسرے دن آٹھ بجے کے قریب خلیل کپڑے پہنکر ہسپتال جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

میں اپنے دیوان خانہ میں آرام کرسی پر بیٹھا اور ایک دوسری بید کی چھوٹی کرسی پر پیر پھیلائے ایک کتاب پڑھ رہا تھا کہ خلیل کے دروازے کے سامنے ایک تانگہ آکر رکا اور اس کے پیچھے ہی ایک دوسرا تانگہ تھا جس پر پردہ پڑا ہوا تھا، میرے دروازہ پہ چلمن تھی، اسی چلمن کی آڑ سے میں دیکھتا رہا، غفار صاحب ننگے سر تھے اور ذرا پریشان حال، انھوں نے آگے بڑھ کر تانگے کا پردا اٹھایا، اور اس کو اتار کر خلیل کے دیوان خانہ میں لے کر چلے گئے، جو بالکل میرے دیوان خانہ کے مقابل تھا۔ وہ نیلے رنگ کی ساری اور سفید سلک کا قمیض نما بلوز پہنے ہوئے تھی، بغل میں چند کتابیں اور ہاتھ میں کروشیا بنانیکا فریم تھا جس کے کپڑے پر سبز و سرخ پھول بنے ہوئے تھے،

تھوڑی دیر میں دونوں تانگے کمپونڈ سے نکل گئے، پہیوں کی سرسراہٹ اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سڑک پر سے آرہی تھی۔

میں چلمن کے اندر ہی سے بیٹھا بیٹھا کبھی سڑک پر دور جاتے ہوئے تانگہ کو دیکھتا اور کبھی خلیل کے دیوان خانہ کو، سامنے کے کمرہ میں تینوں کھڑے تھے۔

غفار صاحب نے کہا، آپ جناب ڈاکٹر خلیل صاحب ہیں آپ جناب ذکیہ صاحبہ ہیں۔ بی اے میں زنانہ کالج میں پڑھتی ہیں۔

خوب بڑی خوشی ہوئی، خلیل صاحب نے کہا۔

ذکیہ نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا، خلیل نے ذرا جھک کر مصافحہ کیا اور صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تشریف رکھئے. اور پھر غفار صاحب کی طرف مخاطب ہو کر کہا، بیٹھو۔ سب لوگ بیٹھ گئے، غفار صاحب نے کہا بھائی یہ مکان بڑا خوبصورت ہے۔

خلیل نے کہا، خوبصورت کیا ہے بس یہ تین کمرے ہیں یہ سب کے سب سرکاری کوارٹرس ہیں، جو ایک ہی وضع کے پوری لائن میں یہاں سے وہاں تک گیارہ چھوٹے چھوٹے بنگلے ہیں اور جن کو ہم جیسے غریبوں کے لئے سرکار نے بنائے ہیں۔

اور اس میں آپکے دوست رہتے ہیں۔ غفار صاحب نے میرے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

جی ہاں، وہ جن سے آپ پرسوں ملے تھے، اس میں بھی بس ایسے ہی تین کمرے ہیں۔ یہ دونوں مکان ایک ہی قسم کے ہیں۔ بس درمیان میں ایک چھوٹی سی دیوار نے ایک کو دوسرے سے جدا کر دیا ہے۔

اور وہ بھی اکیلے ہی رہتے ہیں، ذکیہ نے میرے دیوان خانہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

جی ہاں وہ بھی تنہا ہیں۔ لیکن گویا میرے ساتھ۔

خوب غفار صاحب نے کہا، آپ دونوں کو چھوٹے چھوٹے دو مکانات پاس ہی پاس اچھے مل گئے ہیں۔

ہاں ہم لوگوں نے بڑی کوشش اور سفارشوں کے بعد
دونوں بنگلوں کو حاصل کیا۔ خلیل نے جواب دیا۔
کرایہ سرکار ہی دیتی ہے۔ ذکیہ نے پورے گھر کا جائزہ
ہوئے پوچھا۔

جی ہاں۔ یہ سرکاری مکانات ہیں۔ صرف نل کا
س اور بجلی کے اخراجات ہم کو ادا کرنے پڑتے ہیں۔ ذکیہ کے
ال کا خلیل نے جواب دیا۔ چار پانچ منٹ تک کمرہ میں
وشی سی رہی۔ پھر خلیل نے گھڑی دیکھتے ہوئے غفار صاحب سے کہا۔

اچھا بھائی اب اجازت ہے۔

ضرور آپکا وقت ہو رہا ہے غفار صاحب بولے۔
ہاتھ ملاتے ہوئے کہا بہت بہت شکریہ بھئی بہت بہت شکریہ۔

ذکیہ اپنی ساری کا آنچل درست کرتے ہوئے کھڑی
لی، مسکراتے ہوئے اس نے بھی ایک خاص انداز دلربائی
خلیل سے ہاتھ ملایا، اور پھر صوفہ پر بیٹھ گئی۔ میں آرام کرسی پر
ی طرح بیٹھا رہا۔ کتاب میں نے بند کردی۔ نہ معلوم کیوں
ل یک بیک اچاٹ سا ہوگیا۔ اور خاموشی سے بیٹھا سامنے
کے کمرے کو برابر تاکتا رہا۔ یا جب کبھی موٹر کی آواز
ک پر آتی اسے دیکھنے لگتا۔ تھوڑی دیر بعد غفار صاحب نے
ی منگوائی، جسے وہ شاید پہلے ہی سے کہہ چکے تھے۔ پھر ذکیہ
ر غفار صاحب دونوں موٹر میں بیٹھ کر بازار میں کچھ خرید و
وخت کیلئے چلے گئے۔ میں نے چند لقمے دن کے کھانے کے
ائے اور پھر اسی آرام کرسی پر دراز ہوگیا، تین بجے دونوں
اپس آئے۔ ذکیہ کے لئے ایک بادامی رنگ کی ریشمی پھولدار
اری خریدی گئی تھی، رشوت سمجھئے یا اجرت خلیل کے لئے جان کمپنی
سے ایک ڈبہ کیک اور پیسٹری کا آیا، خلیل بھی شام کو واپس آگئے

چھوکرے سے چائے بنوائی۔ سب نے چائے پی۔ کیک کھائے۔
خلیل نے تھوڑے سے کیک میرے لئے بھی رکھ دیئے تھے جس کو
رات میں انھوں نے کھانے کے وقت میرے یہاں بھجوا دیا۔
ایک نے دوسرے سے ہاتھ ملایا، آپس میں چند رسمی باتیں ہوئیں
خلیل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دونوں پھر موٹر میں سوار ہوکر روانہ
ہوگئے۔ کیونکہ کالج کے بند ہونے کا وقت قریب ہو چکا تھا میں
اپنے کمرے ہی سے چلمن کے اندر سے بیٹھا سب کچھ دیکھتا رہا۔
موٹر کمپونڈ سے نکل گئی اور پیچھے صرف خاک اڑ رہی تھی۔ کمپونڈ
کے باہر سڑک پر دو ایک بار موٹر کے ہارن کی آواز سنائی دی۔
اور موٹر غائب ہوگئی۔

(۲)

دوسرے دن خلیل کو ذکیہ کا ایک رقعہ ملا جس میں شکریہ
تھا اور دوشنبہ کے دن شام میں چائے کی دعوت۔ خلیل بہت
خوش تھے۔ خوشی میں انھوں نے ذکیہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا خوشبو دار
خط مجھے بھی دکھایا۔ خلیل ذکیہ کے حسن و دلکشی سے پہلی ہی ملاقات
میں بہت متاثر تھے۔ اور اب اپنی قسمت کے طالع پر بہت
شاداں کہ اس نے خود یاد کیا ہے۔ لیکن مجھے نہ معلوم کیوں ایک
ہلکا سا رنج ہو رہا تھا۔ شاید رشک سے۔ میں ایک دن پہلے تقریباً
تمام دن ذکیہ ہی کی صورت کو بیٹھا تاکتا رہا۔ یہاں تک کہ رات
میں بھی اسی کی دلربا شکل آنکھوں میں پھرتی رہی۔ اس کے ہاتھ
کھلے اور گلے کا نچلا حصہ نیم برہنہ۔ نیلی ساری کے نیچے ریشم کا سفید قمیص
بلوز اسے بیحد زیب دیتا تھا۔ بلوز بہت تنگ تھا۔ اور ویسٹ کے
پاس آکر ایسا چست ہوگیا تھا کہ بدن میں کپڑا بالکل کس کر
اس میں شکنیں آگئی تھیں۔ پیٹھ پر سے بھی جہاں سے اس کا آنچل
ذرا گرا اور ہٹا ہوا تھا، بلوز بالکل ایسا کسا ہوا تھا کہ شاید اگر ریشمی

تجویز کامیاب ہوئی۔ ایک طرف لیلا اور غفار صاحب میں بے حد رابطہ بڑھ گئے، اور ایسے کہ پھر انھوں نے الٹ کر کبھی ذکیہ کی طرف نہ دیکھا، دوسری طرف خلیل اور ذکیہ میں لیلیٰ مجنوں کا کھیل ہوتا رہا، اور تماشا دیکھنے والا میں، دو ماہ ہوگئے نہ یہ ڈرامہ ختم ہو رہا تھا اور نہ مجھے سکون۔

مجھے ہر وقت ذکیہ ہی کا خیال رہنے لگا۔ گھر سے لیکر دفتر اور دفتر سے لیکر گھر تک تمام راستہ میں بھی مجھے ہر وقت اس کی تصویر نظر آتی تھی، دل یہی چاہتا تھا کہ بس فرصت کے رات دن ہوں اور جیسے بقول غالب ؎ بیٹھا رہوں تصور جاناں کئے ہوئے۔

اس دو ماہ میں ذکیہ سے میری سرسری کئی ملاقاتیں ہوئیں، اور ہر ملاقات کے بعد ہم زیادہ متاثر ہوتے گئے۔ ہم دونوں نے محسوس کیا کہ ہر بار ہم ایک دوسرے سے ذرا زیادہ قریب اور نزدیک ہوتے جا رہے ہیں، اور خلیل دور اور غفار سے تو بہت دور۔ امید کی ایک بہت ہلکی سی روشنی جو آج سے دو ماہ قبل بہت مدھم سی معلوم ہو رہی تھی اب ذرا زیادہ صاف نظر آنے لگی، ایک دن پانچ بجے کے قریب اچانک میری ملاقات ذکیہ سے ہوگئی۔ ہم دونوں ساتھ ہی رہے۔ "جاں ہوٹل" میں ہمیں معلوم تھا کہ غفار صاحب اور خلیل اکثر آتے ہیں۔ ہم چائے پینے "ڈیکا جی" گئے۔ چائے پینے کے بعد ہوٹل ہی میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ذکیہ میری بات بات پر کھل کھلا رہی تھیں، اور منہ سے پھول جھڑ رہے تھے۔ برہنہ ہاتھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سنگ مرمر کا ہے، بار بار یہ مرمریں ہاتھ میرے ہاتھ میں آیا اور پھر ہاتھ سے جاتا رہا، مغرب کا وقت ہو چکا تھا، ذکیہ نے آسمان پر پھیلتی ہوئی سیاہی اور غائب ہوتے ہوئے شفق پر سرخ بادلوں کو دیکھتے ہوئے کہا

چلئے اب چلیں۔

چلو۔ ہم نے بالکل بے تکلفی سے چلنے کے لئے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ اور پھر فوراً ہی پوچھا۔ اب پھر کب ملاقات ہوگی؟

ذکیہ میرے اس سوال سے کچھ سوچنے لگی۔ اسی طرح کہ گویا بہت زمانہ کی گذری ہوئی کسی بھولی ہوئی بات کو یاد کر رہی ہے۔ اس کی آنکھ دیوار پر آویزاں ایک اشتہار کی تصویر پر تھی اور پیشانی پر ہلکی ہلکی دو شکنیں۔ میں نے پھر کہا

کل چھٹی ہے۔

کل چھٹی ہے؟ ذکیہ نے ذرا تعجب انگیز لہجہ سے پوچھا۔

ہاں سالگرہ کی عام تعطیل ہے۔

افوہ! ٹھیک ٹھیک! مجھے بھی یاد آگیا کل سالگرہ کی چھٹی ہے اور میرے کالج میں لیڈی پوپ کی صدارت میں دن میں جلسہ ہے اور شام میں پارٹی۔

اور اس پارٹی میں تمھارا رہنا بے حد ضروری؟

نہیں ضروری تو نہیں ـــ لیکن ـــ

پھر اگر ضروری نہیں، میں نے بات کاٹ کر کہا تو کل ہم تم گولکنڈہ کی سیر کو چلیں۔

کس وقت؟

صبح ۹ بجے چلیں۔

یعنی ٹھیک اسی وقت جبکہ ہمارے اسکول میں جلسہ شروع ہو رہا ہوگا۔ ذکیہ نے شوخی کی ایک خاص ادا سے کمر کو بل دیتے ہوئے کہا۔

اور پانچ بجے تک واپس آجائیں گے، میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بات پوری کر دی۔

یعنی ٹھیک اسی وقت جبکہ پارٹی ختم ہو رہی ہو۔ ذکیہ نے پھر شوخی کے اسی انداز سے جواب دیا۔

دوسرے دن ۹ بجے ہم جانے کیلئے تیار ہوئے، خلیل اپنے کمرہ ہی میں تھے، گا رہے تھے اور جھوم رہے تھے۔ جھوم رہے تھے اور گا رہے تھے:۔ "پیا ملن کو جانا"

"پیا ملن کو جانا" ہمارے لئے ایک قسم کا فال نیک تھا۔

ذکیہ اور ہم دس بجے کے قریب گولکنڈہ پہنچ گئے۔ قلعہ کی دیوار کے نیچے سے ہم نے کچھ سنگترے اور انجیر خریدے، تھوڑی دور قلعہ کے اوپر جاکر ذکیہ بہت تھک گئی۔ ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے ہم تھوڑی دور اور آگے بڑھے، قلعہ کے اندر ہم "رنگین محل" تک پہنچ چکے تھے۔ رنگین محل کے سفید شفاف سنگ مرمر کے فرش کو دیکھتے ہوئے ہم نے کہا یہاں ہی کیوں نہ بیٹھکر ان پھلوں کو کھالیں، ہم دونوں بارہ دری میں بیٹھ گئے۔ قلعہ کے اوپر کی بلندی سے نیچے کے مکانات اور سب چیزیں بالکل چھوٹی چھوٹی معلوم ہو رہی تھیں۔ آنکھوں کے سامنے ہی قلعہ کے نیچے فصیل کے اندر بڑے بڑے ان صاحبان عزم بادشاہوں کے مقبرے تھے، جو اپنی آخری خوابگاہ میں اپنی آخری نیند سو رہے تھے، یہ سبکے سب اپنے زمانہ میں بڑے بڑے فاتح ہوگئے، جن کی تلوار کی دھار کے سامنے بڑے بڑے باجبروت سرکش باغی جھک کر رہ جاتے ہوں گے۔ جن کے خزانے زر و جواہر سے پُر، درباروں کی شان و شوکت اور فوجوں کی جاہ و حشم سے فلک تک دبدبہ، اور زمین و آسمان کی تمام مسرتیں ان کے ایک اشارہ گوشہ چشم کی منتظر ہوں گی لیکن مجھے آج یہ تمام سلاطین حقیر سے معلوم ہو رہے تھے، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ دنیا کا آج میں ہی تنہا مالک ہوں، اور اس کی اس حکمرانی کا تاج میرے سر پر جگمگا رہا ہے ہیچ نالیت مقبروں میں سوئے ہوئے سب سلاطین بے مقدار تھے، ان کے خزانوں کی تمام دولت آج میرے قدموں کے نیچے نثار ہو رہی ہے

ذکیہ میرے پہلو کے بالکل قریب تھی اور اتنی قریب کہ میں اس کی سانس اور وہ میرے دل کی دھڑکنوں کو سن رہی تھی۔ ہوا تیز چل رہی تھی اور اس کی آواز بارہ دری میں ایسی معلوم ہو رہی تھی، کہ گویا فضا میں پھیلے ہوئے مسرت و کامرانی کے نغمے ہیں جو میرے لئے گائے جا رہے ہیں۔

پانچ ماہ گذر گئے، ذکیہ وہی تھی اور وہی اس کے حسن و جوانی کا نکھار، کھلا ہوا باغ جوانی کا پھول مرجھایا نہیں تھا، لیکن اس کی خوشبو ضرور کم ہوتی جا رہی تھی۔ ذکیہ اب بھی پھول تھی مگر ولایتی، جس کی پنکھڑیوں میں تازگی کی کوئی جاذبیت نہ تھی، پھر اگر اس پھول کو سونگھنے کا شوق کم ہو چکا تھا، تو کونسی تعجب کی بات ہے۔

ایک دن صبح ناشتہ کے بعد ہم اور خلیل بیٹھے تھے نوکر نے ہم دونوں کے ناموں کے دو علیحدہ علیحدہ لال دعوتی رقعے لاکر دیئے۔

۲۳ ربیع الثانی کو غفار صاحب کا عقد ذکیہ سے ہو رہا تھا، یعنی کل ہی ہم نے خلیل کو اور خلیل نے ہم کو معنی خیز نظروں سے دیکھا، آخر شش تعلیم جدید کے گلستاں کی وہ گل تازہ جو پہلے کلی تھی۔ اور جب کالج میں پھول بنی تو اسکی خوشبو دور دور تک پھیلی۔ آج وہ ہمیشہ کے لئے غفار صاحب کے گلے کا ہار ہو گئی۔

شکسپیر کی شہرہ آفاق تمثیل ← AS YOU LIKE IT کا ترجمہ

من کی چاہ

مترجمہ جناب سعید الحق صاحب دسنوی بی اے (آنرز)

(۵)

سیلیا۔ تم نے اپنے لطیف جنس کے گوہر نایاب کو گرد آلود کیا ہے،

روزیلنڈ۔ نہیں نہیں میری پیاری بہن میں عشق کے عمیق قعر میں پڑا ہوا ہوں۔ اس کی گہرائی خلیج پرتگال کی گہرائی سے کم نہیں، اس کی پیمائش ممکن نہیں۔

سیلیا۔ یا یوں کہو کہ بے اندازہ ہے۔

روزیلنڈ۔ میں وینس (Venus) (زہرہ) کے حرامزادہ شریر لڑکے کو اپنا شاہد بناتی ہوں۔ وہ اندھا شریر لڑکا جو دوسروں کی آنکھوں میں گرد پھینکتا ہے میری وارفتگی و شوق کا حال کہہ سکتا ہے۔ میں اورلینڈو کے فراق کو برداشت نہیں کر سکتی ہوں

دوسرا سین

جنگل کا دوسرا حصہ

ژاک، امرا اور جنگل کے رہنے والے داخل ہوتے ہیں

ژاک۔ ہرن کو کس نے شکار کیا۔

پہلا امیر۔ میں نے

ژاک۔ بہتر یہ ہے کہ ہم لوگ تم کو ایک رومن فاتح کی شان میں ڈیوک کے سامنے لے چلیں۔ اور تمہارے سر پر اس کی سینگیں فتح کے جھنڈے کے طور پر رکھی جائیں۔

تیسرا سین

جنگل کا دوسرا حصہ

روزیلنڈ اور سیلیا داخل ہوتی ہے

روزیلنڈ۔ کیا ابھی تک دو نہیں بجے؟ ابھی تک اورلینڈو کا پتہ نہیں ہے۔

سیلیا۔ میں تم کو یقین دلاتی ہوں۔ کہ ترکش اور کمان لے کر وہ کہیں جا کر سو گیا ہے۔ وہ دیکھو کون آ رہا ہے۔

سلویس داخل ہوتا ہے

سلویس۔ حسین نوجوان میں تمہارے پاس پیغام لیکر آیا ہوں۔ میری پیاری فی بی نے یہ خط بھیجا ہے، (ایک خط دیتا ہے) میں مضمون سے واقف نہیں ہوں۔ لیکن اس کے غضبناک چہرے اور خشم آلود نگاہوں سے میں نے قیاس کیا کہ یہ خفگی اور غصہ کا خط ہے۔

لیکن میں معافی کا خواستگار ہوں، میں صرف قاصد ہوں۔ اور خط سے مجھکو کوئی واسطہ نہیں۔

روزیلنڈ۔ عنبر کا مجسمہ بھی اس خط کو دیکھکر متعجب ہو جائے وہ کہتی ہے کہ میں حسین نہیں ہوں۔ میں خوش اطوار نہیں ہوں۔ اس نے ایسا خط کیوں لکھا۔ ہو نہ ہو تمہاری ہی کرتوت ہے۔

سلویس۔ واللہ۔ میں تو مضمون سے بھی آگاہ نہیں تھا۔ فی بی نے یہ خط لکھا ہے۔

روزیلنڈ۔ عشق نے تجھکو احمق بنا دیا ہے۔ یہ ہرگز اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط نہیں ہے ہو نہ ہو یہ کسی مرد کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

سلویس۔ نہیں۔ یہ فی بی کا لکھا ہوا ہے۔

روزیلنڈ۔ اچھا سن وہ کیا لکھتی ہے۔ (پڑھتی ہے)

"کیا تم چرواہے کی شکل میں کوئی دیوتا ہو۔ ایک عورت تمہارے لئے دل سوختہ ہو رہی ہے"۔

مجھکو کیسی کیسی گالیاں دیتی ہے؟

سلویس۔ کیا تم اس کو سب و شتم کہتے ہو۔

روزیلنڈ۔ (پڑھتا ہے) "تم کیوں ایک عورت کے دل کو زخمی کرتے ہو"۔ کبھی تو نے ایسی گالی سنی ہے۔ "کسی انسان کی آنکھوں نے مجھکو اتنا مجروح نہیں کیا"۔ غرضکہ میں چوپایہ جانور ہوں۔ "اگر تمہاری خشم آلود آنکھوں میں یہ جادو ہے، تو پھر تمہاری نرمی اور خوش خلقی میں کیا سحر ہوگا؟ تم مجھکو ملامت کرتے تھے اور میں تم کو دل میں پیار کرتی تھی۔ یہ قاصد میرے عشق سے واقف نہیں ہے۔ اس کی معرفت خط کا جواب روانہ کرو۔ اور اپنے ارادہ سے آگاہ کرو۔ تم میرے شوق و وفا کو قبول کرتے ہو یا نہیں؟ اگر تم انکار کرتے ہو تو پھر میں بھی مرنے کیلئے تیار ہو جاؤں گی۔

سلویس۔ اس کو تم سب و شتم کہتے ہو

روزیلنڈ۔ تو کیوں ایسی عورت پر جان دیتا ہے۔ لیکن عشق نے تجھکو اندھا کر دیا ہے۔ جا اور اس سے کہدے کہ اگر وہ مجھ سے محبت کرتی ہے، تو وہ تجھ سے محبت کرے۔ اگر وہ تجھ سے محبت نہیں کرے گی تو میں بھی اس سے اس وقت تک محبت نہ کرونگا جبتک تو اس کی خاطر مجھسے درخواست نہ کرے۔ اور اگر تو اس کا سچا عاشق ہے تو جا

اولیور داخل ہوتا ہے

اولیور۔ خدا سلامت، میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ مکان کہاں ہے جو زیتون کے درختوں سے گھرا ہوا ہے۔

سیلیا۔ یہاں سے پچھم اس چشمہ کے پاس۔ مگر اس وقت گھر خالی ہے۔

اولیور۔ کیا میں جان سکتا ہوں کہ آپ لوگ کون ہیں؟" لڑکا حسین ہے اور چہرے پر نسائی دلبری ہے۔ عورت نیچے قد کی ہے۔ مگر بھائی کا رنگ زیادہ صاف ہے "کیا آپ ہی اس مکان کے مالک ہیں؟

سیلیا۔ بلا تکبر کہا جا سکتا ہے کہ ہم ہی لوگ مالک ہیں۔

اولیور۔ اورلینڈو تم دونوں کو اپنا سلام بھیجتا ہے۔ اور اس نوجوان کو جس کا نام روزیلنڈ ہے وہ خون آلود رومال بھیجتا ہے۔

روزیلنڈ۔ اس کا کیا مطلب ہے!

اولیور۔ میری ندامت کی داستان

سیلیا مہربانی کر کے ہم لوگوں کو اس قصہ سے آگاہ کرو۔

اولیور۔ جب اورلینڈو تم سے جدا ہوا تو اس نے وعدہ کیا تھا کہ ایک گھنٹہ کے اندر واپس چلا آئے گا۔ اور وہ جنگل میں اپنے خیالات میں محو جا رہا تھا۔ تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک پرانے فرسودہ درخت کے نیچے جس کی شاخوں میں کائی بھی تھی اور جس کی

چوٹی خشک ہوچکی تھی۔ ایک خستہ حال شخص جس کے بال بڑھے ہوئے تھے، پیٹھ کے بل سویا ہوا ہے۔ اس کے گلے میں ایک سبز اور سنہرے رنگ کا سانپ لپٹا ہوا اور پیچ و تاب کھا کر اس کے منہ پر حملہ کیا چاہتا ہے، لیکن فوراً اورلینڈ کو دیکھ کر وہ سانپ گلے سے علیحدہ ہو کر ایک جھاڑی میں نکل بھاگا۔ اور اس جھاڑی کے سایہ میں ایک شیرنی جس کے تھن سوکھے ہوئے تھے بیٹھی ہوئی ہے۔ اور اس تاک میں لگی ہوئی ہے کہ کب وہ سویا ہوا آدمی جاگے، اسلئے کہ اس جانور کی خاص عادت ہے کہ کسی ایسی چیز پر جو بیجان معلوم ہوتی ہو حملہ نہیں کرتا ہے۔ یہ دیکھ کر اورلینڈو نزدیک پہنچا اور اس نے دیکھا کہ وہ شخص تو اس کا بڑا بھائی ہے

سیلیا۔ ہاں وہ اکثر اپنے اس بھائی کا تذکرہ کرتا تھا۔ اور اسکے ساتھ اس کے بھائی کا سلوک نہایت بے رحمی کا سلوک تھا۔

اولیور۔ یہ صحیح ہے کہ میرا سلوک اس کے ساتھ بہت ہی شقاوت اور بے رحمی کا تھا۔

روزلینڈ۔ تو کیا اورلینڈو نے اپنے بھائی کو وہیں چھوڑ دیا کہ وہ شیرنی کے لئے لقمہ تر ہو جائے؟

اولیور۔ دوبارہ اس نے پیٹھ پھیر لی اور اس کا ارادہ کیا، لیکن اس کی رحمدلی نے جذبہ انتقام پر استیلا پایا اور اپنی برادرانہ محبت سے مجبور ہو کر اس نے شیرنی سے نبرد آزمائی کی، شیرنی فوراً وہیں مر گئی، اور شور و غل کی وجہ سے میں جاگ اٹھا۔

سیلیا۔ تم ہی اس کے بھائی ہو؟

روزلینڈ۔ تمہاری ہی جان اس نے بچائی؟

سیلیا تم ہی اس کی جان کے گاہک تھے؟

اولیور۔ ہاں میں ہی تھا، مگر اب نہیں ہوں، میں عرق انفعال میں ڈوبا جاتا ہوں۔

روزلینڈ۔ لیکن اس خون آلود رومال کا کیا واقعہ ہے؟

اولیور۔ ہم دونوں بھائی ملکر خوب روئے اور آنسوؤں کا دریا بہا دیا۔ اس کے بعد وہ مجھکو شریف ڈیوک کے پاس لے گیا۔ جس نے مجھے کپڑا اور کھانا دیا۔ اور مجھکو برادرانہ محبت کے سپرد کیا۔ میرا بھائی مجھکو اپنے غار میں لے گیا، اور یہاں اس نے ہاتھ کھولکر دکھایا کہ شیرنی نے اس کے گوشت میں پنجہ مارا تھا اور ہاتھ خون سے شرابور ہو رہا تھا۔ اور وہ بیہوش ہو گیا۔ اور اسی حالت میں روزلینڈ کا نام پکار اٹھا۔ کچھ دیر بعد جب ہوش آیا تو مجھکو یہاں بھیجا کہ اگر اس کے پیمان شکستہ کی معافی مانگوں۔ اور یہ خون آلود رومال اس نے اس شخص کو بھیجا ہے جس کو وہ مذاق سے روزلینڈ کہکر پکارتا ہے۔

سیلیا۔ (روزلینڈ بیہوش ہو جاتی ہے) کیوں گینی میڈ و میرے اچھے گینی میڈو

اولیور۔ خون دیکھکر بہت لوگ بیہوش ہو جائیں گے۔

سیلیا۔ واقعہ کچھ اور ہی ہے بھائی گینی میڈ!

اولیور۔ دیکھو وہ ہوش میں آرہا ہے۔

روزلینڈ۔ کاش میں گھر پر ہوتا۔

سیلیا۔ ہم لوگ تم کو وہیں لے چلتے ہیں۔ ذرا ہاتھ تو پکڑ لو۔

اولیور۔ ہمت اور ڈھارس سے کام لو۔ مرد ہو کر مرد کا دل نہیں رکھتے۔

روزلینڈ۔ یہ ٹھیک ہے مگر اپنے بھائی سے کہنا کہ میں نے خوب ہی بہانہ کیا۔

اولیور۔ یہ بہانہ نہ تھا، یہ دلی جذبہ تھا۔

روزلینڈ۔ میں سچ کہتا ہوں کہ یہ بہانہ تھا۔

اولیور۔ اچھا ہمت مردانہ سے کام لو۔

روزیلنڈ۔ کاش میں عورت ہوتی۔

سیلیا۔ تم زرد معلوم ہو رہے۔ گھر کی طرف چلو۔

اولیور۔ میں چلوں گا اس لئے کہ مجھکو جواب بھی لیجانا ہے۔

روزیلنڈ۔ مگر میرے اس بہانہ کی خبر پہنچا دینا۔ (سب چلے جاتے ہیں)

پانچواں ایکٹ

پہلا سین۔ ارڈن کا جنگل

ٹچ اسٹون اور اوڈری داخل ہوتے ہیں۔

ٹچ اسٹون۔ اوڈری صبر کرو۔ وقت آئیگا۔

اوڈری۔ وہ پادری تو کوئی خراب نہ تھا۔

ٹچ اسٹون۔ وہ نہایت ہی بدمعاش شخص تھا۔ خیر اس جنگل میں ایک شخص ہے جو تمھاری محبت کا دم بھرتا ہے۔

اوڈری۔ میں اس کو جانتی ہوں دیکھو وہ آرہا ہے۔

ولیم William داخل ہوتا ہے

ٹچ اسٹون۔ کسی احمق کو دیکھکر طبیعت خوش ہوجاتی ہے۔

ولیم۔ اوڈری خدا سلامت

اوڈری۔ خدا سلامت، ولیم

ولیم۔ اور خدا تم کو بھی صحیح سالم رکھے۔

ٹچ اسٹون۔ خدا سلامت، میرے دوست، سر چھپا لو۔ سر چھپا لو۔ دوست تمھاری عمر کیا ہے؟

ولیم۔ پچیس ۲۵ سال۔

ٹچ اسٹون۔ تمھارا نام ولیم ہے نا؟

ولیم۔ ہاں ولیم ہے۔

ٹچ اسٹون۔ اچھا نام ہے تم جنگل ہی میں پیدا ہوئے تھے؟

ولیم۔ خدا کا شکر ہے۔ یہیں پیدا ہوا تھا۔

ٹچ اسٹون۔ "خدا کا شکر ہے" جواب بھی اچھا ہی ہے، امیر بھی ہو؟

ولیم۔ نہ امیر ہوں نہ غریب ہوں۔ بس خوش ہوں۔

ٹچ اسٹون۔ خوب عقلمند بھی ہو؟

ولیم۔ ہاں میری سمجھ بھی اچھی ہے۔

ٹچ اسٹون۔ خوب ایک کہاوت یاد آئی، احمق سمجھتا ہے کہ وہ عقلمند ہے لیکن عقلمند آدمی ایسا نہیں سمجھتا ہے۔ تم اس عورت پر فریفتہ ہو؟

ولیم۔ ہاں!

ٹچ اسٹون۔ اچھا تو سنو۔ تم اس عورت کے عشق سے باز آؤ۔ تم اس کے پاس نہ آیا کرو۔ نہیں تو اپنی جان سے ہاتھ دھو لو۔ میں تم کو مار ڈالوں گا۔ تمھاری حیات کو موت سے بدل دوں گا۔ اور تمھاری روح کو قفس عنصری سے باہر نکالکر آزاد کر دوں گا۔ زہر دیکر مار ڈالوں گا۔ بید سے۔ لوہے کی سیخ سے ماروں گا۔ کسی نہ کسی صورت سے تمھاری جان لے لونگا۔ اس لئے بہتر ہے کہ یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔

اوڈری۔ اچھے ولیم چلے جاؤ۔

ولیم۔ خدا تم لوگوں کو خوش وخرم رکھے۔ (چلا جاتا ہے)

کورن داخل ہوتا ہے

کورن۔ میرے آقا تم کو بلا رہے ہیں۔

ٹچ اسٹون۔ اوڈری آؤ۔

دوسرا سین

جنگل کا دوسرا حصہ

اورلینڈو اور اولیور داخل ہوتے ہیں

اورلینڈو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اتنی تھوڑی سی ملاقات میں آپ اس پر فریفتہ ہوگئے ہیں۔ اور اس کے دام عشق میں گرفتار ہوگئے ہیں۔ اور وہ بھی آپ سے محبت کرنیکے لئے راضی ہے۔

الیور۔ اسمیں ذرا شبہ نہیں ہے کہ میں ایلنا Alina پر عاشق ہوں، اور وہ مجھپر، خدا کرے ہم دونوں ایک دوسرے سے لطف اندوز ہوں۔ یہ تمھارے لئے بھی مفید ہوگا۔ اس لئے والد کا مکان اور کل زمینیں میں تم کو دیدونگا۔ اور میں یہیں رہکر ایک چرواہے کی زندگی گزار دونگا۔

اورلینڈو۔ تو میری بھی رضامندی ہے۔ کل آپکا بیاہ ہو جائے اور اس موقع پر ڈیوک اور اس کے ہم جلیسوں کو بھی دعوت دونگا۔ جایئے اور ایلینا کو تیار کیجئے۔ دیکھئے میری روزیلنڈ آرہی ہے

روزیلنڈ داخل ہوتی ہے

روزیلنڈ۔ بھائی خدا سلامت۔

اولیور بہن، اللہ تم کو بھی سلامت رکھے۔

روزیلنڈ۔ پیارے اورلینڈو میں سمجھی کہ شیرنی کے پنجوں سے تمھارا دل مجروح ہوا ہے

اورلینڈ۔ دل مجروح تو ضرور ہے مگر کسی عورت کی آنکھوں سے۔

روزیلنڈ۔ کیا تمھارے بھائی نے تم سے یہ کہا تھا کہ میں نے بیہوشی کا بہانہ کیا تھا۔

اورلینڈو۔ ہاں اور بھی تعجب کی باتیں کہیں۔

روزیلنڈ۔ ہاں جیوں ہی تمھارے بھائی اور میری بہن نے ایک دوسرے کو دیکھا، دونوں نشۂ محبت میں سرشار ہوگئے۔ اور دونوں کے دل صہبائے محبت سے لبریز ہوگئے۔ اور دونوں نے بیاہ کا فیصلہ کرلیا ہے، وہ دونوں عشق کی آگ میں جل رہے ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت ان دونوں کو علٰحدہ نہیں کرسکتی۔

اورلنڈو۔ کل دونوں بیاہے جائیں گے۔ اور میں ڈیوک کو اس تقریب میں بلاؤں گا۔ مگر دوسرے کی آنکھوں سے خوشی کو دیکھنا کتنا تلخ ہے۔ کل جتنا میرا بھائی خوش ہوگا۔ اتنا ہی میرا دل پژمردہ رہے گا۔

روزیلنڈ۔ تو کل میں تمھاری روزیلنڈ ہونگی۔

اورلنڈو۔ صرف وہم و گمان پر زندہ رہنا مشکل ہے۔

روزیلنڈ۔ اچھا سنو، میں سحر جانتی ہوں۔ تین ہی برس کے سن سے میری اور ایک ساحر کی ملاقات رہی ہے۔ وہ ساحر اپنے فن میں پختہ کار تھا۔ اگر تم کو اپنی روزیلنڈ سے سچی محبت ہے، تو کل ٹھیک اسی وقت جب تمھارے بھائی کا بیاہ ایلینا سے ہوگا تم بھی روزیلنڈ سے بیاہ کرو گے۔ میں جانتی ہوں کہ وہ بدنصیبی کے لطمۂ موج میں گرفتار ہے مگر میرے لئے یہ ناممکن نہیں ہے کہ کل اس کو تمھارے سامنے حاضر کردوں۔

اورلنڈو۔ کیا تم سنجیدہ باتیں بول رہے ہو۔ کیا یہ واقعہ ہے

روزیلنڈ۔ قسم ہے اپنی زبان کی۔ میں سچ بول رہا ہوں اپنا بہترین لباس کل پہن لینا، دوستوں کو دعوت دینا اگر تمھاری خواہش یہ ہے کہ کل تمھارا بیاہ ہو تو ایسا ہی ہوگا۔

اور روزیلنڈ ہی سے ہوگا، وہ دیکھو یہ کون لوگ آ رہے ہیں۔

سلویس اور فی بی داخل ہوتے ہیں

فی بی۔ نوجوان، تم نے یہ کیا ستم ظریفی کی کہ میں نے جو خط لکھا تھا وہ تم نے اس کو دکھا دیا۔

روزیلنڈ۔ مجھے اس کی پروا نہیں ہے تم کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں، ایک باوفا عاشق تمہارا پیچھا کر رہا ہے اس کو دیکھو پیار کرو اور اس کی پرستش کرو۔

فی بی۔ اے چرواہے۔ اس نوجوان سے کہدے کہ عشق کیا چیز ہے۔

سلویس۔ یہ اشک و آہ کا مجموعہ ہے۔ اور اس لئے میں فی بی کے لئے ہوں۔

فی بی۔ اور میں گینی میڈ کے لئے۔

اورلینڈو۔ اور میں روزیلنڈ کے لئے۔

روزیلنڈ۔ اور میں کسی عورت کے لئے نہیں ہوں۔

سلویس۔ یہ وفا اور خدمت کا مجموعہ ہے، اور اس لئے میں فی بی کے لئے ہوں۔

فی بی۔ اور میں گینی میڈ کے لئے۔

اورلینڈو۔ اور میں روزیلنڈ کے لئے۔

روزیلنڈ۔ اور میں کسی عورت کے لئے نہیں ہوں۔

سلویس۔ یہ تخیل کی سحرکاری ہے، سراپا کیفیت ہے، اس کی ترکیب خواہشات سے ہوتی ہے۔ یہ پرستش وفاشعاری خاکساری صبر اور بے صبری، خلوص و امتحان، اور تسلیم و رضا کے یکجا ہونے کا نام ہے، اس لئے میں فی بی کے لئے ہوں۔

فی بی۔ اور میں گینی میڈ کے لئے ہوں۔

اورلینڈو۔ اور میں روزیلنڈ کے لئے ہوں۔

اور میں کسی عورت کے لئے نہیں ہوں۔

فی بی۔ (روزیلنڈ سے) تو پھر تم مجھکو کیوں ملامت کرتی ہو۔

روزیلنڈ۔ (سلویس سے) میری طاقت میں جہاں تک ممکن ہے تمہاری مدد کرونگا (فی بی سے) اگر ممکن ہو تو میں تجھ سے عشق کرونگا تم سب لوگ کل آؤ۔ (فی بی سے) اگر میں کسی عورت سے بیاہ کرونگا تو تم ہی سے بیاہ کرونگا، اور کل میرا بیاہ ہوگا۔ (اورلینڈو سے) میں نے تم سے جو وعدہ کیا ہے اس کی بھی تکمیل ہوگی۔ اور کل تمہارا بیاہ ہوگا۔ (سلویس سے) تمہاری خواہش بھی کل پوری ہو جائے گی۔ (اورلینڈو) اگر تم کو روزیلنڈ سے محبت ہو تو آؤ۔ (سلویس سے) اگر تم کو فی بی سے محبت ہے تو آؤ۔ اور چونکہ میں کسی عورت سے محبت نہیں کرتا اس لئے میں بھی آؤں گا۔ خدا سلامت۔ کل تم سب میرے حکم کے مطابق کام کرو۔

سلویس۔ میں حکم کی تعمیل کرونگا۔

فی بی۔ میں بھی تعمیل حکم کرونگی۔

اورلینڈو۔ اور میں بھی تعمیل حکم کرونگا۔

تیسرا سین

جنگل کا دوسرا حصہ

(ٹچ اسٹون اور اوڈری داخل ہوتے ہیں۔)

ٹچ اسٹون۔ کل ہم لوگوں کی خوشی کا دن ہے۔ اوڈری کل ہم دونوں کا بیاہ ہوگا۔

اوڈری۔ یہ میری دلی خواہش ہے۔ یہ کوئی بری خواہش نہیں کہ میں کتخدائی کی زندگی بسر کروں۔

چوتھا سین

جنگل کا دوسرا حصہ

ڈیوک سینیر، امینس، ژاک، اورلینڈ، اولیور، اور سیلیا داخل ہوتے ہیں

ڈیوک سینیر۔ اورلینڈو! کیا تم کو یقین ہے کہ جو کچھ اس لڑکے نے وعدہ کیا ہے وہ اس کو انجام دے سکے گا۔

اورلینڈو۔ کبھی مجھکو یقین ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا ہے۔ گویا بیم و امید کی درمیانی منزل میں ہوں۔

(روزلینڈ، سلویس، اور فی بی داخل ہوتے ہیں)

روزلینڈ۔ (ڈیوک سے) اگر میں آپ کی روزلینڈ کو آپ کے سامنے لاکر پیش کردوں تو آپ اس کو اورلینڈ کے حوالہ کردیجئے؟

ڈیوک سینیر۔ ضرور۔ اگر مملکت ہوتی تو وہ بھی اس کے حوالہ کرتا۔

روزلینڈ۔ اور تم اس کا وعدہ کرو، کہ تم اس کو قبول کروگے۔

اورلینڈو۔ اگر میں دنیا کی تمام مملکتوں کا بادشاہ بھی ہوتا، تب بھی اس کو قبول کرتا۔

روزلینڈ۔ (فی بی سے) تم وعدہ کرو کہ اگر میں راضی ہوجاؤں تو تم مجھ سے بیاہ کروگی۔

فی بی۔ اگر میری زندگی کا ایک گھنٹہ بھی باقی رہ گیا ہے تب بھی میں ضرور بیاہ کروں گی،

روزلینڈ۔ اگر تم مجھ سے بیاہ کرنے سے انکار کروگے تو تم اپنے کو اس وفاکیش چرواہے کے سپرد کروگی۔

فی بی۔ ضرور یہی شرط ہے۔

روزلینڈ۔ (سلویس سے) تم وعدہ کرو کہ اگر فی بی تمہاری خواہش کرے تو تم اس کو قبول کروگے۔

سلویس۔ بسر و چشم، اگر میری موت اسی وقت ہو جائے تب بھی۔

روزلینڈ۔ آپ لوگ سب اپنے اپنے معاہدوں پر قائم ہیں۔ اب میں جاتا ہوں۔

(روزلینڈ، اور سلویس چلی جاتی ہے۔)

ڈیوک سینیر۔ اس لڑکے کی شکل میں میری لڑکی کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔

اورلینڈو۔ حضور عالی! پہلی دفعہ جب میں نے اس کو دیکھا، میں سمجھا کہ یہ آپ کا لڑکا ہے۔ لیکن یہ لڑکا جنگل ہی میں پیدا ہوا ہے۔ اور اس کے چچا نے اس کو بہت سے فنون کی تعلیم دی ہے، اس کا بیان ہے کہ اس کا چچا ایک بڑا ساحر تھا۔ ......

(ہائمن Hymen (بیاہ کا دیوتا) داخل ہوتا ہے)

روزلینڈ عورت کے لباس میں داخل ہوتی ہے اور سیلیا بھی اس کے ساتھ ہے۔

ہائمن۔ جب دنیا میں خوشی ہوتی ہے تو آسمانوں میں بھی خوشی رہتی ہے، اچھے ڈیوک! اپنی لڑکی کو قبول کرو۔ ہائمن اس کو آسمانوں سے تمہارے لئے لایا ہے تاکہ تم اس کو اس شخص سے بیاہ دو جس کی نگاہوں نے اس کو مجروح کیا ہے۔

روزلینڈ۔ (ڈیوک سے) میں اپنے آپ کو آپ کے سپرد کرتی ہوں، اس لئے کہ میں آپ کی ہوں۔ (اورلینڈو سے) میں اپنی ذات کو تمہارے سپرد کرتی ہوں، اس لئے کہ میں تمہاری ہوں۔

ڈیوک سینیر۔ اگر میری نگاہ خطا نہیں کرتی ہے تو تم میری لڑکی ہو۔

اورلینڈو۔ اگر نظر کی خطاکاری نہیں ہے تو تم میری روزلینڈ ہو۔

فی بی۔ اگر یہ واقعہ ہے جو میں بھی اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہی ہوں، تو اے میری محبت رخصت۔

ہائمن - میں چاہتا ہوں کہ ان تمام عجیب و غریب واقعات کا خاتمہ بخیر ہو جائے۔ آٹھ شخص بیاہ کی خوشی سے لذت اندوز ہوں گے۔

(اورلینڈو اور روزلینڈ سے) تم دونوں رشتۂ الفت میں منسلک رہو۔

(اولیور اور سیلیا سے) تم دونوں پیمان وفا کر لو۔

(فی بی سے) تم اپنے عاشق سے بیاہ کر لو۔ نہیں تو ایک عورت سے بیاہ کرو۔

(ٹچ اسٹون اور اوڈری سے) اور تم دونوں بھی بیاہ کے رشتہ میں بندھ جاؤ۔

بیاہ دیوتاؤں کے دیوتا جوپٹر کا تاج ہے۔

یہ نان دستر کا رابطہ ہے۔

ہائمن کی وجہ سے تمام شہروں کی آبادی ہے۔

ہائمن جو ہر شہر کا دیوتا ہے اس کے نام کی جے ہو۔

ڈیوک سینیر - میری پیاری بھتیجی میں تجکو خوش آمدید کہتا ہوں اور اور بیٹی تجکو بھی خوش آمدید کہتا ہوں۔

فی بی - (سلویس سے) میں وعدہ خلافی نہ کرونگی۔ تم اب میرے ہو گئے تمھاری وفا شعاری کا انعام ملنا چاہیے۔

ژاک ڈی بوئز داخل ہوتا ہے

ژاک ڈی بوائز - میں تھوڑی دیر آپ کی سمع خراشی کرونگا میں سر رولینڈ ڈی بوائز کا منجھلا لڑکا ہوں اور میں اس مجمع کیلئے ایک خبر لایا ہوں۔ جب ڈیوک فریڈریک نے یہ خبر سنی کہ اچھے اچھے امرا جنگل کا رخ کر رہے ہیں تو اس نے یہ حکم دیا کہ بالجبر اس کے بھائی کو واپس لایا جائے اور تہ تیغ کر دیا جائے۔ جب وہ اس جنگل کے دامن میں پہنچا تو ایک بوڑھے سادھو سے ملاقات ہو گئی۔ اور اس سے کچھ سوال و جواب کے بعد وہ اپنے ارادہ سے باز آیا۔ اور دنیا سے بھی عاجز آگیا۔ اپنا تاج اپنے اس بھائی کے نام چھوڑا جو جلا وطنی میں ہے۔ اور وہ لوگ جو اس کے بھائی کے ساتھ جنگل کو آئے تھے ان کی زمینیں بھی واپس کر دی جائیں گی۔ قسم ہے میری جان کی اس میں ذرہ برابر جھوٹ نہیں ہے۔

ڈیوک سینیر - خوش آمدید اے نوجوان! اپنے بھائی کی شادی میں تم بھی آگئے۔ تمھارے بھائی کو اس کی جائداد ملے گی۔ اور مجھکو میری مملکت واپس مل جائے گی۔ تمام وہ لوگ جو میری مصیبت کے شریک رہ چکے ہیں میری مملکت میں ان سبھوں کا درجہ بدرجہ حصہ ہوگا۔ مگر ذرا نغمہ و سرود کا سامان ہو اور دولہوں اور دلہنوں سے میں کہتا ہوں کہ وہ مصروف رقص ہوں۔

ژاک - اگر میں نے سننے میں خطا نہیں کی تو ڈیوک نے ایک سادھو کی زندگی اختیار کر لی اور دربار کی شان و شوکت کو خیرباد کہا۔

ژاک ڈی بوائز - بالکل صحیح ہے۔

ژاک - میں اسی کے پاس جاؤں گا۔ ایسے ایسے تائبوں کی زندگی آئینۂ عبرت ہوتی ہے۔

ڈیوک سینیر - ژاک۔ ٹھہرو ٹھہرو۔

ژاک - اب میں لہو و لعب کے لئے نہیں ٹھہر سکتا۔

تمام شد

رفیقۂ حیات مرحومہ کی یاد میں

مشغول تھے سب عید کی تیاری میں
گل چینی و گل ریزی و گل کاری میں
یاد غم ماضی سے مری آنکھیں بھی
تھیں محو سحر ہی سے گہرباری میں

نجم نکہوی

قوتِ فیصلہ

از

جناب کاشف ایم اے

بات یہ ہے کہ خدا نہ کرے کہ کسی کی طبیعت فلسفیانہ رجحان لئے ہوئے ہو۔ اور اُس وقت تو آپ سر ہی پیٹ لیں گے جب میں یہ کہوں گا کہ یہ سبق میں نے خود اپنی ہی زندگی سے حاصل کیا ہے۔ اِس میں سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ کہنے والے اور سننے والے میں اس قدر فرق مراتب ہوتا ہے کہ فریقین میں کوئی قابل وثوق اُستوار رشتہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی میں نے ایک بات کہی اور آپ نے بھی اُس کو سُنا۔ مگر یہ بات پہلے ہی سے میرے ذہن میں ہوتی ہے کہ جن وسیع معنوں میں یہ فقرہ کہا گیا ہے اُتنے وسیع معنوں میں آپ کے ذہن میں نہیں۔ اور جب کہنے سے پہلے ہی مجھے اسکا علم ہو تو پھر ظاہر ہے کہ وہ اطمینان جو کسی بات کے کہہ دینے سے حاصل ہوتا ہے کہاں نصیب۔ یعنی کہنے سے پہلے جو ایک بار سا دل پر تھا وہ اُسی طرح قائم رہا۔ بوجھ ہلکا تو کیا ہوتا اس غم کا اضافہ .... ہو جاتا ہے کہ مفت میں صلاحیتیں برباد ہوئیں یعنی میں بیسیوں کچھ کہتا رہا اور آپ بیکار کچھ سنتے رہے۔ اتنا وقت اگر ذکر اذکار ہی میں گذرتا تو عاقبت بنتی یا کم از کم اخبار ہی پڑھتے کہ دنیا سُدھرتی۔

اتنا تسلیم کر لینے کے بعد اگر آپ کا یہ تقاضا ہو کہ بحالات موجودہ مجھے کچھ کہنے کے بجائے خاموش ہی رہنا چاہیئے تو دیکھئے بحیثیت سُننے والے کے آپ پھر اُسی روایتی غلطی کے مرتکب ہوں گے۔ یعنی میرے کہنے کا ہرگز یہ مدعا نہیں ہے اور اگر آپ کی فہم میں یہی بات آئی ہے تو یقیناً وہ بات نہیں ہے جو میں نے ابھی کہی ہے۔ الجھے ہوئے خیالات خود میری سمجھ میں نہیں آتے اسی لئے میں کہتا ہوں کہ کم از کم میری باتوں کے سمجھنے میں تو آپ اتنی دُور نہ جا پڑیں۔ آخر گوش سماعت کی دیانت کا واسطہ دیتے ہوئے اگر میں نے یہ کہا کہ جتنی اہمیت اور معنویت کے ساتھ میں ایک بات کہتا ہوں آپ بھی اتنی ہی اہمیت اور معنویت کیساتھ اُسے سمجھیں تو فرمائیے کونسی بیجا بات کہی۔

"قوت فیصلہ" کو سر مضمون دیکھکر آپ کا قیاس ہوگا کہ نفسیات کی کوئی دقیق بحث ہوگی یا اُس کے کسی نازک پہلو پر نئے زاویۂ نگاہ سے روشنی ڈالی جائے گی۔ تو اس کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ آپ اس بکھیڑے کے لئے سر دست تیار نہ ہوں گے اور مجھے بھی سچ پوچھئے تو اسی میں آسانی معلوم ہوتی ہے کہ صاف صاف کہہ دوں کہ یہ میرا موضوعِ بحث نہیں۔

بات صرف اسی قدر ہے کہ ایک روز شام کے وقت ٹہلتا ہوا پارک میں جا نکلا۔ حسب عادت ایک گوشہ میں چلا گیا۔ تنہائی تھی اس لئے چٹکیاں بجا رہا تھا اور ٹہل رہا تھا۔ ایک صاحب آدھمکے اور جھٹکے سے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہنے لگے

کیوں صاحب تخلص کیا انتخاب کیا ہے؟ میں سمجھ گیا دیکھتا ہوں تو شیروانی کے بونام لگاتے وقت پہلا کاج مجھ سے نظرانداز ہوگیا ہے، اور شیروانی کا دامن بے ترتیبی سے ایک اوپر اور ایک نیچے ہے۔ اگرچہ خفت مٹانے کے خیال سے میں نے لاحول پڑھی تھی مگر نہ جانے ان کی کیا سمجھ میں آگئی کہ بے کہے سنے وہاں سے چل دیئے۔ حالانکہ ان کی اس حرکت سے جہانتک ثبوت ہی بہم پہنچا مگر بندۂ خدا کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔

ایسی بے قاعدگیاں اور بے اصولیاں میری ہر رفتار و گفتار، اور نشست و برخاست میں ہمیشہ سے رہی ہیں۔ غلط نہ ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ اس نے میرے کردار کے ایک رُکن کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں وطن گیا ہوا تھا۔ گانوں کا واسطہ۔ عزیزوں نے روپے بھیجے تھے۔ گھر کے بچوں کے نام الگ الگ منی آرڈر آئے تھے۔ روپے معہ کوپن کے تو لے آیا۔ گھر والوں نے جب پوچھا کہ کسی کے کتنے روپے ہیں؟ تو حافظہ کام نہیں کرتا۔ میں نے کہا کوپن میں تو لکھا ہی ہوگا۔ مگر بھیجنے والوں کی لاپرواہی کہوں یا اپنی شامت اعمال کہ انہیں کہیں اس کا ذکر نہ تھا۔ اب مشکل تھی کہ آخر روپے کس طرح تقسیم ہوں۔ خیر گھر کی بات تھی گھر میں رہی حسن ظن کی اور بات ہے ورنہ آپ اسے لغزش کبھی نہیں کہہ سکتے۔ زندگی کے اوراق الٹ کے جو کبھی دیکھتا ہوں تو ایسے حادثے بیشمار نظر آتے ہیں آپ کی نظروں میں اپنے اعتبار کے کھونے کا خوف نہ ہوتا تو آج بیٹھے بیٹھے اِن ہی قصوں کو دہرا دیتا کہ آپ تجربہ حاصل کرتے اور اس راہ سے کچھ نہیں تو خدمت خلق تو ہو جاتی۔

خیر صاحب بات کہاں سے کہاں جا پڑی۔ تو اُس شیروانی والے واقعہ کے بعد سے ہمیں زبردست احساس ہوا کہ یہ تمام بے اصولیاں محض اپنی طبیعت کی سہل پسندی اور کمزوری پر مبنی ہیں۔ زندگی میرے تابع فرمان نہیں بلکہ جدھر چاہتی ہے مجھے بہالے جاتی ہے۔ میں ڈھیل دے رہا ہوں اور اس کا بے راہروی پر عمل ہے۔ میں چشم پوشی سے کام لے رہا ہوں اور یہ جائز اور ناجائز کی حدود تک توڑ چکی ہے۔ ضبط، نظم، استقلال، عزم اور ارادے سب اسی سیلاب میں بہتے چلے جارہے ہیں۔ طبیعت داری اور وضعداری ساری خوبیاں اسی کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ دوسروں کا اعتبار کیا خود اپنی نظروں میں گر گیا ہوں۔ غرض طبیعت میں ایک زبردست ردعمل کا دور شروع ہوا۔ کہاں وہ سہل پسندی، سست روی، سردمزاجی اور بے اصولی کا عالم تھا اور کہاں اب یہ کایا پلٹ ہوئی کہ قوت ارادی، قوت فیصلہ، عزم راسخ ضبط نفس اور تادیب نفس قسم کے موضوع آٹھ پہر دماغ میں چکر کھاتے رہتے یا میں چکر کھاتا رہتا۔ اپنی اصلاح کے لئے سب سے پہلے میں نے اپنی ساری زندگی پر غور کیا تاکہ اپنے تمام معائب اور خامیاں سامنے آجائیں۔ سب سے پہلی چیز جو میری نگاہوں میں کھٹکی وہ مجھ میں قوت فیصلہ کی کمی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اسی نے ساری کشتی کو ڈبو یا تھا۔ یہ نہیں ہے کہ میں نے اپنی اصلاح کی طرف پہلے کبھی توجہ نہ کی ہو۔ فیصلے کئے اور پختہ ارادہ دل کیسا تھ فیصلے کئے مگر قوت فیصلہ کی کمی کہیئے کہ باندھتے ہوئے سامنے عہد و پیمان کمزور دھاگوں کی طرح ٹوٹ گئے۔ کچھ روز سستی اور

شدت برتی پھر اس پر اسی طرح کا عمل رہا اور اس کے بعد جہاں سے چلے تھے وہیں پہنچ گئے۔ اب نبض کا اندازہ مل گیا تھا مرض کی صحیح تشخیص ہوگئی تھی مناسب علاج کی ضرورت تھی اور اس میں پوری سرگرمی دکھلائی۔ پہلے تو یہ طے کیا کہ قوت فیصلہ کے حاصل کرنے کیلئے یہ کوئی ضروری نہیں کہ یونیورسٹی کے فلسفہ کے پروفیسروں سے مستفید ہوں یا کسی کامل کی طرف رجوع کروں۔ یہ میں اپنے تجربوں کی روشنی میں کہہ رہا ہوں خدا کرے کہ اس خیال میں مجھے آپ کی تائید حاصل ہو ایک جگہ تقریریں اکثر موضوع بحث سے ہٹ کر شروع بھی ہوتی ہیں اور ختم بھی ہو جاتی ہیں اور دوسری جگہ پند و نصائح میں ٹیپ کا بند کیا ہوتا ہے میں کہنا نہیں چاہتا سب کو معلوم ہے کسی کا قول ——— ابتدا و نہی انتہا یہ ہے ——— یہیں سمجھ میں آتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ خیال بھی تھا کہ پہلے چھوٹی چھوٹی باتوں سے اسے شروع کیا جائے آخر زینہ بزینہ چڑھتے ہی منزلیں طے ہوتی ہیں۔ ذہن میں یہ بات آئی کہ پہلے پانوں کا مسئلہ لو۔ اکثر کپڑے داغدار ہوئے، بارہا غلاف اور چادریں بدرنگ ہوئیں۔ دوسروں کو چھینٹیں پڑیں اور اپنی آنکھیں جھک گئیں کبھی بار بار تقاضوں سے صاف شفاف پیشانیاں چڑھ گئیں۔ یہ سارا عذاب صرف ایک پان خوری کی برکت ہے۔ لو آج سارا قصہ یکسو کئے دیتے ہیں، اب پان نہ کھانے کی دل میں ٹھان لی۔ شدت کیساتھ اس پر عمل ہے۔ کھانے سے فراغت پائی اور خلال کلی اور غرارے کئے چلو چھٹی ہوئی، اب دوسرے کاموں میں بھی کسی حد تک باقاعدگی ہے دوست احباب سب کو معلوم ہے کہ اب میں پان نہیں کھاتا۔ مگر چھیڑ چھاڑ ہو ہی جاتی ہے۔ اور یہ سب اس لئے کہ مجھ سے قوت فیصلہ رخصت ہو جائے۔

ایک رفیق قدیم بہار شریف سے تشریف لائے۔ میں بھی ملنے گیا۔ بے تکلف دوستوں کی جھگٹ ہے۔ "برگ سبز است تحفۂ درویش" کہتے ہوئے انہوں نے اخلاقاً ڈبہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے معافی مانگی۔ کہنے لگے "ارے میاں نگی پان ہیں، یوں کفران نعمت کا عذاب سر پر نہ لو"۔ میں نے کہا "قبلہ و کعبہ میں نے ترک کر دیا ہے، اب ہاتھ تک نہیں لگا سکتا"۔ تبسم زیر لب ہو کے کہنے لگے "خیر یہ آپ کی سعادتمندی ہے مگر یہ کن کے سخت حکم کی تعمیل ہے جو مجال انکار نہیں" اس پر قہقہہ لگا۔ ایک صاحب بول اٹھے کہ "آخر کتنے کڑے تیور اور تنی ہوئی بھویں تھیں جو تم اس لرزہ خیز عالم کو ایک لحظہ کیلئے بھی نہیں بھولتے"۔ میں نے کہا "عجیب بیہودگی ہے۔ بھئی میں نے فیصلہ کیا ہے کہ پان نہ کھاؤنگا اور مجھے اس فیصلہ پر قائم رہنے دو، کہہ تو دیا ہے کہ پہاڑ ٹل جائیں مگر میں ہل نہیں سکتا۔ قوت فیصلہ بھی تو آخر کوئی چیز ہے" سب ایک آواز ہو کے کہنے لگے "اچھا! تو آپ کو اب یہ خبط سوار ہوا ہے۔ تو مرحوم خدا کوئی بڑی چیز پیش نظر ہوتی کہ اس پر اڑتے تو کچھ لے ہی مرتے۔ ملک کی آزادی کا مسئلہ تھا، غربت، مفلسی، جہالت اور بیماری کے مسائل تھے آزادی نسواں ہی کا مسئلہ کم از کم ایک چیز تھا۔ ان باتوں کے لئے کچھ عہد کرتے اور جو کسی سے نہ ہوا کر دکھاتے۔ یہ پان نہ کھانے کا کیا محل سوال تم نے اٹھایا اور قوت فیصلہ کی آڑ میں اس پرستش بھی شروع کر دی"۔ میں نے کہا کہ "سب سے بڑی مصیبت تو یہی ہے کہ میں جس چیز

کو جس بصیرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں تم سب کے سب اس سے محروم ہو۔ اسی لئے میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ تم کہیں ہو اور میں کہیں ہوں، تم جہاں ہو میں وہاں نہیں ہوں۔ اور کوفت یہ ہے کہ یہ تفاوت راہ تم کو چشموں کے دیکھنے کی چیز نہیں۔ میں حقیقت حال کہتا ہوں اور تم اسے فلسفیانہ دماغ کے آخری نتیجے بتلاتے ہو"۔

باتوں کی تہ میں کیا نکتے ہیں ان کا سمجھنا تو درکنار یاروں نے الٹا الجھنا شروع کردیا۔ بدمذاقوں سے پالا پڑ جانے کے بعد کسی نازک خیال شاعر کی بھی ایسی گت نہ بن جاتی ہوگی۔ ابتدا میں میں نے جتنی باتیں کہیں ان حالات کے سامنے کہئے کیا غلط کہیں یعنی میرا یہ کہنا کہ میں یہاں نہیں کھاتا جتنے وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے ظاہر ہے اور احباب نے اس کو جتنے محدود معنوں میں سنا اور سمجھا وہ بھی پوشیدہ نہیں۔ اور ایک بات ہی کیا ہے ایسی صورت حال تقریباً ہر موقع پر پیش آتی ہے۔ آپ اسے صرف فرق کہیں گے میں اسکو زمان و مکان اور سیاہ و سفید کا فرق کہونگا۔ میں اس معاملے میں اتنا سخت اس لئے ہوں کہ یہی چیزیں کبھی کبھی خطرناک نتیجوں میں رونما ہوتی ہیں یہ دوسری بات ہے کہ ان خطرناک صورتوں کو بعض زیادہ گہری نظر والے تعمیر کا راز ہی بتلائیں۔ میں کچھ کہوں اور آپ کچھ سمجھیں تو ماحول کی یہ اجنبیت آخر کتنے دنوں قابل برداشت ہوگی۔ ایک دن یہی ہوگا کہ گریباں چاک ہوگا اور سارا جہاں بازیچۂ اطفال معلوم ہوگا۔

کھیلنے لگے، نیند کے مارے آنکھیں بند ہوتی جاتی تھیں۔
ہم دونوں تکیے بادیگرے سو گئے۔

آدھ گھنٹہ بھی مشکل سے سویا تھا کہ گرمی کے مارے آنکھ کھل گئی۔ بادل بدستور دوڑے پھر رہے تھے۔ سامنے کے کوٹھے سے تین چار لڑکیوں کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔

ایک بولی " ساون رت آئی آؤ سکھی جھولا جھولیں"

دوسری بولی۔ " میں تو نہیں جھولتی"

"کیوں"؟ ایک حسین آواز میں تیسری بولی۔

دوسری بولی۔ " جو یہ لڑکے کہیں دیکھ لیں تو"

وہی حسین آواز والی بولی " ہم لوگ کوئی لڈو تو ہیں نہیں جو نگل جائیں گے۔

اس پر کئی ملی جلی ہنسی کی آواز آئی اور تینوں جھولا ڈال جھولا جھولنے لگیں۔

ہوا میں کسی کا سرخ آنچل اڑتا اور پھر غائب ہوجاتا۔ دل نہ مانا۔ میں نے اپنے کمرہ کی کھڑکی کو آہستہ سے بند کردیا۔ اور درازوں میں سے جھانکنے لگا۔ ایک لڑکی بیچ میں بیٹھی تھی اور آمنے سامنے دو لڑکیاں کھڑی پینگ دے رہی تھیں۔ تینوں حسین تھیں۔ لیکن جھانکنے والی زہرا کی طرح حسین تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ لمبے لمبے بال، غرض وہ حسن نسوانی کا حسین ترین نمونہ تھی۔ یہی دل چاہتا تھا بس اسے دیکھا کریں۔ تینوں احساس جوانی سے نا واقف اپنے قدرِ عنا اور موہنی آنکھوں کے تیر سے ناآشنا جھولے جا رہی تھیں۔ اتنے میں بیٹھی ہوئی لڑکی نے جھانکنے والی لڑکی کو مخاطب کرکے کہا:-

"شانتی ذرا ہوئے ہوئے گاؤ" دونوں لڑکیوں کے بال حسین ناگن کی طرح ہوا میں لہرا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اودے اودے آسمان پر کالی کالی گھٹائیں تیر رہی ہیں۔ اتنے میں حشمت نے کروٹ لی۔ میں نے بھی فوراً لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔ تھوڑی دیر بعد پھر اٹھا اور جھانکنے لگا۔ تینوں جھولے پر بیٹھی تھیں اور جھولا دھیرے دھیرے چل رہا تھا۔ چار یا پانچ منٹ بعد کھڑکی بند ہوگئی اور میں بھی پڑ رہا۔

(۲)

چھٹیوں میں میں گھر چلا گیا۔ اور حشمت علی گڈھ ہی میں رہ گیا۔ جب ایم اے کا نتیجہ نکلا تو یہ دیکھکر خوشی ہوئی کہ ہم دونوں پاس ہوگئے۔ حشمت کے خط سے معلوم ہوا کہ وہ علیگڈھ ہی میں ایک اسکول میں ملازم ہوگیا ہے۔ میری خوش قسمتی سے انھیں دنوں یونیورسٹی میں انگریزی کے لکچرار کی جگہ خالی ہوئی چونکہ میں ایم اے میں فرسٹ آیا تھا اس لئے میری تقرری اس جگہ پر ہوگئی۔

باوجودیکہ مجھے محلہ والوں سے یہ معلوم ہوگیا تھا کہ شانتی بچپن ہی میں بیوہ ہوگئی تھی اور میں سماج کی اٹھتی ہوئی انگلیوں سے بھی ڈرتا تھا مگر دل چاہتا تھا کہ اگر شادی نہ کرسکوں تو کم سے کم یونہی میں اسے پیار کرسکتا۔ آخر وہ عورت تھی...... جوان...... پیدا ہی اس لئے ہوئی تھی کہ اس سے کھیلا جائے۔ مجھے علی گڈھ پہنچنے اور شانتی سے ملنے کی تڑپ تھی۔ آخر دو چار دنوں بعد علی گڈھ چلا آیا۔

محبت بھی عجیب بلا ہے۔ پیچھے پڑتی ہے تو دامن چھڑانا مشکل ہوجاتا ہے۔ میں نے شانتی کے گھر کے کئی پھیرے کئے لیکن اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ میں اس کی یاد میں کچھ کھویا کھویا سا رہنے لگا ایک دن طبیعت سخت پریشان اور مکدر تھی، اس لئے شام کو

"بھول گئی"

از جناب سید ابو سہیل صاحب عظیم آبادی

کیوں حشمت تم نے کبھی کسی کا یہ قول سنا ہے کہ "عورت محبت کر ہی نہیں سکتی" ہاں ہاں سنا تو ہے ہارڈی کا قول ہے۔ میں نے پوچھا "تمھیں اس سے اتفاق ہے" "میں ایسا بد مذاق نہیں ہوں"۔ اتنے میں سامنے کے کوٹھے سے کسی کے گھونگھرو کی چھم سے آواز آئی۔ سامنے دیکھا تو ایسا معلوم ہوا جیسے شاہزادی نیلوفر ہو۔ وہ مسکرائی اور ایک بجلی سی آنکھوں کے سامنے کوند گئی۔ میں یہ سمجھا کہ وہ مجھے دیکھکر مسکرائی۔ اور حشمت سمجھے کہ انھیں۔ جب وہ غائب ہو گئی تو ہم دونوں کی نظریں ملگئیں اور ہم نے اپنے اپنے جذبات ایکدوسرے سے چھپانیکی کوشش کی۔

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے رہے۔ میں اس کی محبت میں دل بدل چکا تھا۔ محبت کے دیوتا کا تیر میرے دل کو گھائل کر چکا تھا۔ برہا کی آگ مجھے جلائے ڈالتی تھی۔ میں اسے حاصل کرنے کے لئے عزت، دولت دوستی، اور تعلیم سب کچھ قربان کر دینا چاہتا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ اسے بھی مجھسے محبت ہے یا نہیں ....

باتوں ہی باتوں میں میں نے ایک دن حشمت سے پوچھا "کیوں یار سامنے والی کے متعلق کیا خیال ہے؟" "کوئی خاص بات تو نہیں ہے" حشمت نے جواب دیا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ ایک دن جو میں کالج سے پہلے واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میاں حشمت سامنے کوٹھے کی طرف تاک رہے ہیں۔ میں نے چپکے سے جاکر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھدیا۔ وہ چونک پڑا۔ میں نے کہا:۔

"کیوں یار بڑے چھپے رستم نکلے"۔

"میں نے کیا کیا" حشمت نے گھبراکر پوچھا۔ پھر کہنے لگا۔ "ذرا گرمی تھی اس لئے میں کھڑکی کھول رہا تھا" اور ہنسی مذاق میں بات ٹالدی ....

اسی تاک جھانک میں ایک سال کی طویل مدت گذر گئی۔ لیکن یہ راز کسی طرح فاش نہ ہو سکا۔ "اسے" بھی ہم دونوں میں سے کسی سے محبت ہے یا نہیں۔ اور ہم دونوں ایک دلچسپ مغالطہ میں مبتلا رہے۔

حشمت اور مجھ میں بچپن سے دوستی تھی۔ اور ہم ایک دوسرے کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ہم دونوں نے اس درد محبت کو ایک خطرناک راز کی طرح چھپائے رکھا۔ کیوں؟ یہ خود میں جانتا تھا

دوپہر کا وقت۔ سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ میں اور حشمت امتحان کی تیاری میں منہمک تھے۔ ... کے قریب گرمی اور بڑھ گئی۔ بادل کے آوارہ ٹکڑے ... پیال

سینما چلا گیا۔ جیسے ہی ہال میں قدم رکھا، حشمت پر نظر پڑی میں اس کی طرف لپکا اور ہم دونوں نے ہاتھ ملایا۔

حشمت نے پوچھا "تم یہاں کہاں"؟

میں نے کہا "یہیں کالج میں لکچرار ہو گیا ہوں"۔

اس کے پاس ہی ایک لڑکی نیم برقعہ میں ملبوس بیٹھی تھی۔ میں نے پوچھا "یہ کون ہے" حشمت نے میری طرف حیرت سے دیکھا اور کہا "ارے یار معاف کرنا۔ میں تمھیں ملانا بھول گیا۔ یہ میری نومسلم بیگم نورجہاں ہیں" میں نے تعجب اور بناوٹ سے اسکی طرف دیکھا اور کہا "نومسلم" اس نے آہستہ سے میرے کان میں کہا "ارے ہاں وہی جو سامنے کے مکان سے جھانکا کرتی تھی"۔ اس کے بعد ہم دونوں کو ملایا۔ میں نے نورجہاں سے ہاتھ ملایا۔ وہ حسین ساحرہ مسکرائے جا رہی تھی اور میں!؟......

سینما کے بعد ہم لوگ اپنے اپنے گھر لوٹ آئے۔ اس کے بعد اکثر میں حشمت کے یہاں جانے لگا۔ کیا حشمت کی دوستی مجھے کھینچتی تھی؟..........

ایک دن میں حشمت کے یہاں گیا تو وہ تو تھا نہیں لیکن نورجہاں بیٹھی ہوئی کوئی پرچہ پڑھ رہی تھی۔ اس میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہی کنول جیسی آنکھیں، وہی انگارے کی طرح دہکتے ہوئے ہونٹ، صناعِ ازل کی بہترین تخلیق، بلور کی چاندی سی چمکتی ہوئی بانہیں۔ مجھے دیکھ کر کھڑی ہو گئی اور اپنی پر از ترنم آواز میں کہا:-

"سروپ بابو تشریف لایئے"۔

میں نے طنزاً کہا "مذہب بدل کر خوش تو ہیں"۔

"ہوں" گردن کو ہلاتے ہوئے بولی۔

شانتی تم نے ہندو مذہب میں کلنک کا ٹیکہ لگا دیا۔

تم نے ہمارے سماج اور سوسائٹی پر بدترین داغ لگا دیا۔ میں نے کہا۔

ذرا جوش میں آکر شانتی نے کہا "سروپ بابو آپ کس سوسائٹی اور سماج کے بارے میں کہہ رہے ہیں.... کیا آپ اس سائٹی کے بارے میں کہہ رہے ہیں جس میں میں نے بیوگی کے دس برس گذار دیئے...... کسی کو شکنجے میں کسا جائے اور اف نہ کرے.......... کسی کو اٹھتے بیٹھتے طعن دیجئے لیکن آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ نکلے..... کسی کے بدن پر انگارے رکھ دیجئے اور آبلے نہ پڑیں...... کیوں آپکا سماج یہی تو چاہتا ہے۔ اگر کوئی غریب بچپن میں بیوہ ہو جائے تو آپ کا سماج اس پر عرصۂ حیات تنگ کر دے۔

"بس بس شانتی زیادہ تیز نہ ہو۔ اگر سماج کے دامن پر کوئی دھبہ ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس پر ایک دھبہ کا اور اضافہ کیا جائے"۔ وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی:-

"میں نے دھبہ لگایا؟...... اگر لگایا تو کیوں؟......

میں سمندر کے بھنور میں پھنس گئی تھی.... نکلنا چاہتی تھی.... لیکن کوئی بھی اپنے کو خطرے میں ڈالنے کیلئے تیار نہ ہوا۔ آپ نے مجھے پریم پتر لکھا.......... میں نے آپ سے کہا کہ شادی کر لیجئے....... آپ سماج سے ڈر گئے...... مجھے گرداب زیادہ تیز چکر دینے لگا۔ آپ اور حشمت صاحب دونوں دوڑے۔ راستہ میں جب آپ کو یہ خیال آیا کہ میں بیوہ ہوں تو آپ ڈر گئے اور رک گئے لیکن حشمت صاحب بڑھتے ہی چلے گئے۔ بس آپ یہ سمجھ لیجئے کہ شانتی مر گئی اور دوسرے جنم میں نورجہاں کے روپ میں آئی ہے۔

میں نے کہا "شانتی جذباتی نہ بنو۔ تم نے سورج دیوتا کی پوجا چھوڑ کر ایک ان دیکھی چیز کی پوجا شروع کر دی۔ تمھاری جیسی پڑھی لکھی عورت سے یہ امید نہ تھی"۔

"سورج دیوتا...... میں خدا کی پوجا کرتی ہوں۔ وہ جس نے سورج، چاند، ستارے پیدا کیے۔"

"لیکن شانتی میں تم سے پریم کرتا ہوں"

"پریم ــــ!! اور ہنس دی۔ میں کھسیا سا گیا۔ وہ ہنسی تو ایسا معلوم ہوا جیسے انار کے دانے بکھر پڑے ہوں، میں نے پلو پکڑ لیا اور چاہتا تھا کہ اس کے لبوں پر مہر محبت ثبت کر دوں۔ وہ شاید میرا اشارہ بھانپ گئی۔ بھرائی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ مجھے اس کی اس حرکت پر بڑا غصہ آیا۔ اور میں نے بدلہ لینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

(۴)

حشمت مجھے ابھی تک اپنا سچا دوست سمجھتا تھا جمنی جو کہ حشمت کی بہت وفادار نوکرنی تھی اسے اس بات پر تیار کر لیا کہ وہ حشمت کے سامنے نورجہاں کے خلاف میں جو کچھ کہوں وہ دہرا دے۔ جمنی ابھی کمسن تھی۔ دس گیارہ برس کی عمر ہوگی۔ پہلے تو ڈری لیکن جب میں نے روپیہ پیسے کی لالچ دی تو تیار ہو گئی اور پوچھنے لگی "لیکن کیا کہوں گی"۔ میں نے کہا "کچھ نہیں صرف اسقدر کہ کل بیگم صاحبہ ڈاکٹر عاصم جو کہ سامنے کے بنگلے میں رہتے ہیں ان کے ساتھ ٹہلنے گئی تھیں اور واپس آکر انھوں نے اس کا ذکر کرنے کو منع کیا تھا۔" بڑی بڑی مشکلوں سے راضی ہوئی۔

دو چار دن بعد میں حشمت کے یہاں گیا۔ وہ کمرے میں تنہا تھا۔ پہلے تو میں یہ ڈرا کہ کہیں شانتی نے سب کچھ کہہ نہ دیا ہو لیکن تھوڑی دیر باتیں کرنے پر معلوم ہو گیا کہ اس نے کچھ نہیں کہا۔ اس کے بعد میں نے کہا:۔

"کیوں بھائی حشمت آج کل بھابی صاحبہ کے تعلقات ڈاکٹر عاصم سے بہت بڑھ رہے ہیں۔ یہ کیا بات ہے۔"

ایسا معلوم ہوا جیسے بم پھٹ پڑا۔ وہ ایکدم اچھلتے ہوئے بولا۔

"کیا کیا"؟؟.......

میں نے کہا "وہی جو تم نے سنا۔ اور اس کا ثبوت تو تمھارے گھر والے بھی دینگے۔ ابھی کل ہی جمنی بھابی کے متعلق عجیب بات کہہ رہی تھی۔" اتنا سنتے ہی حشمت کے بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ اور نورجہاں (شانتی) کو بلا کر کہنے لگا:۔

"کیوں جی تم آج کل ڈاکٹر عاصم سے بھی ملتی ہو۔"

اس نے کہا "نہیں تو"........

"بھابی جھوٹ نہ بولئے کل آپ ڈاکٹر کے ساتھ موڑ میں اروِن پارک نہیں گئی تھیں۔"

"سروپ بابو!!...... آپ کیا کہہ رہے ہیں...."

دو بڑی اور مستانہ وار آنکھیں آنسوؤں سے جھل تھل تھیں۔

حشمت کا غصہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اور میرا بال بال مسکرا رہا تھا اس نے جمنی کو پکارا۔ جمنی اس سے ڈرتی بہت تھی۔ اس نے ڈانٹ کر اس سے پوچھا:

"جمنی سچ سچ بتا کہ کل بیگم صاحبہ ڈاکٹر کے ساتھ گئی تھیں۔"

جمنی نے رک رک کر کہنا شروع کیا "ہاں...کل...کل بے.... بے... گم"۔

حشمت نے پھر ڈانٹ کر کہا "جلدی بتا کیا ہوا" وہ گھبرا گئی اور سب کچھ بھول گئی۔ میری طرف دیکھ کر کہنے لگی:۔

"سروپ بابو اس کے بعد آپنے کیا کہنے کو کہا تھا۔ میں بھول گئی"۔!!

میں نے!... میرا منہ کئی مرتبہ کھلا اور بند ہوا۔...!!

دور کہیں ریڈیو بج رہا تھا جس پر کوئی گا رہا تھا ؎

جس کو میں پتھر سمجھتا تھا وہ ہیرا نکلا
جس کو میں ہیرا سمجھتا تھا وہ پتھر نکلا

دماغ کی فتح

از جناب سہیل عظیم آبادی

انتساب :- برادر گرامی پروفیسر شبلی ابراہیمی کے نام جنھوں نے ندیم کے بہار نمبر میں اپنا افسانہ "دماغ کی شکست" شائع کرایا۔

جب تاجو تین سال کی سخت قید کی سزا بھگت کر
واپس آیا تو نئی مصیبتوں میں پھنس گیا ۔ قید کی تکلیف اس کے
مقابلہ میں اس کو آسان تھی ۔ وہاں تکلیف تھی ۔ لیکن اس کی
روح کو سکون تھا ۔ کبھی کبھی ایک خلش جو جیل کی کوٹھری میں دل
میں چٹکیاں لیتی تھی ۔ اب کانٹوں کی ایک شکل میں اسکی نگاہ
کے سامنے تھی ——— وہ گھر میں پاؤں نہیں رکھ سکا ۔

جیسے ہی وہ ریل گاڑی سے اترا ۔ اس کے ایک ساتھی
نے بتایا کہ ممدّ گرفتار ہو گیا ۔ وہ حوالات میں ہے ، اور مقدمہ چل
رہا ہے اور رجیا اس کے گھر میں ہے ۔

تاجو کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی ۔ وہی رجیا جس
کے لئے وہ تین سال کی سخت قید بھگت کر واپس آیا تھا ، اس
کے گھر میں ہے اور ممدّ کی بیوی ہے ۔ لیکن تاجو مرد کی طرح سنبھلا
جس طرح ہر مصیبت اور خطرے کے وقت سنبھلنے کا عادی تھا ۔
اس کے گھر میں یہ خبر پہنچ گئی کہ تاجو واپس آگیا ہے ، بیوہ بہن نے
خوشیاں منائیں ۔ لیکن تاجو گھر واپس نہ آیا ۔

وہ سب سے پہلے وکیل کے گھر گیا ، جو ممدّ کے مقدمے
کی پیروی کر رہا تھا ۔ پھر حوالات میں ممدّ سے ملاقات کرنے چلا گیا ۔
ممدّ نے ملتے ہی سلام کے بعد معافی مانگی ۔ اس نے بے خبری کی وجہ سے

رجیا سے بیاہ کر لیا ۔ وہ اب بھی اس کو طلاق دیکر علیحدہ کرنے
پر آمادہ تھا ۔ لیکن تاجو اس قسم کی بات کیوں پسند کرتا ۔ یہ بات
اس کی شان کے خلاف تھی ۔

جب تاجو رجیا کو بھگا لے گیا تھا ، تو ممدّ اسی کے حکم
سے دوسرے شہر سے کوکین لانے کو گیا تھا ۔ یہی تاجو اور
اس کی ٹولی کا پیشہ تھا ۔ کوکین ، بھنگ ، گانجا ، افیون اور
دوسرے ناجائز اور قانونی ممنوعات کی خفیہ تجارت ، جوا
اور آوارہ گردی ـــ اور ممدّ اس کا دایاں ہاتھ تھا ۔

اسی آوارہ گردی کے سلسلہ میں تاجو کی نظر ایک دن رجیا
پر پڑ گئی ۔ رجیا کا باپ یکہ ہانکا کرتا تھا ۔ تاجو برابر اس کا یکہ کرایہ پر لیا
کرتا ۔ آتے جاتے دونوں میں راہ رسم بڑھ گئی ۔ اور ایک دن وہ
رجیا کو لیکر روانہ ہو گیا ۔

لیکن رجیا کے باپ نے جلد ہی کارروائی کی اور چھ سات
گھنٹے کے اندر ہی اندر دونوں گرفتار کر لئے گئے ۔ رجیا بھاگی تو
خوشی سے تھی ۔ لیکن قانونی طور پر نابالغ تھی ۔ دوسرے گرفتاری
کے بعد وہ بھی پلٹ گئی ۔ کچھ ماں باپ کی محبت میں اور کچھ ڈر
سے ۔ اس نے کہہ دیا کہ زبردستی بھگا کر لے جائی گئی تھی ۔ تاجو کو
تین سال قید بامشقت کی سزا ہوئی ۔ ان دنوں ممدّ تاجو سے بہت

دور تھا۔

جب ممد اپنے کاموں کو ختم کرنے کے بعد واپس آرہا تھا، تو ایک دوسرے شہر میں ٹھہرا۔ اسی سلسلے میں رجیا کے باپ سے ملاقات ہوگئی۔ وہ مقدمہ کے بعد ڈر سے شہر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ممد کو رجیا بڑی بھلی معلوم ہوئی۔ اس نے شادی کا پیغام دیا۔ اور شادی ہوگئی۔

ممد نے واپس آکر اپنے دوستوں کو یہ تو بتلا دیا کہ اس نے بیاہ کر لیا ہے، مگر کہاں؟ کس سے؟ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ فرصت پاتا تو دو چار دنوں کے لئے چلا جاتا اور واپس آجاتا تھا۔ لیکن جب جب وہ رجیا کو لے کر آیا اور ساتھیوں نے پہچانا تو اسے سخت افسوس ہوا۔ وہ اتنا جان ہی چکا تھا کہ تاجو کو سزا ایک لڑکی کو بھگا لے جانے کے جرم میں ہوئی ہے۔

اب تاجو اور ممد ایک دوسرے کے سامنے تھے۔

ممد مجرم کی طرح اس کے سامنے چپ تھا۔ تاجو الگ بدحواس کہ اب کیا ہوگا؟ آخر تاجو اٹھ کر چلا آیا اور کوئی بات نہ ہوسکی۔

تاجو کچھ دیر تو ادھر ادھر دوستوں سے ملتا جلتا رہا۔ اس بیچ میں بعض باتیں اس کے کانوں میں پڑیں۔ ایک پان والے کو اس نے کہتے سنا۔ جس عورت کے لئے تاجو جیل گیا تھا۔ وہ اب اس کے گھر میں ہے۔ تاجو کے کان میں جیسے کسی نے گرم تیل ڈال دیا۔ مگر وہ چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔

اب وہ جس قدر اپنے دل و دماغ کو سکون دینا چاہتا تھا، وہ اتنا ہی بھٹکتا جا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں بات نہیں آرہی تھی کہ کیا کرے۔ سب سے بڑی بات جو پہاڑ سے زیادہ بڑی تھی، وہ یہ کہ رجیا اس کے گھر میں تھی۔ جب وہ جائے گا اور رجیا اسے دیکھے گی تو کیا سمجھے گی۔ وہ ڈر جائے گی کہ اب جان کی خیر نہیں، ہول سے اس کا زندہ رہنا محال ہو جائیگا ـــ پھر اس کی چند دنوں کی محبت بھری باتیں یاد آئیں۔ جو اس نے بھاگنے اور پکڑے جانے کے دوران میں کہی تھیں۔ اف وہ خوشی اور خوف سے ملی ہوئی گھڑیاں!

وہ بہت دیر گئے گھر پہنچا۔ بارہ بجنے کے بعد۔ گھر جانا ضروری تھا۔ ایک بیوہ بہن تھی۔ جو ساری دنیا میں اس کی اپنی تھی۔ اس غریب نے پیچھے میں کتنی دعائیں کی ہوں گی۔ تاجو اس کو اپنی ماں کی جگہ سمجھتا تھا۔ ماں کے مرنے کے بعد اسی نے پالا۔

اس نے جب دروازے میں قدم رکھا تو اسے یقین تھا کہ رجیا سو چکی ہوگی۔ لیکن وہ زیادہ انتظار کر رہی تھی۔ اسے تو معلوم تھا کہ ممد اور اس کے سارے ساتھی، اس کے اپنے پرانے سب ایسے ہی ہیں، جن کا ایک گھر جیل بھی ہے۔ ممد کا بڑا بھائی کئی سال کے بعد جیل سے چھوٹ کر آنیوالا تھا۔ ممد کے پکڑے جانے پر وہ اسی کے گھر میں آکر رہی تھی۔ سو کیا جاتی۔

تاجو نے جیسے ہی گھر میں قدم رکھا، اس کی بہن کھڑی تھی اور اس کے پہلو میں رجیا ـــ ہاتھ میں لالٹین لئے ہوئے ایک نے دوسرے کو دیکھا۔ دونوں کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ تاجو بہن کو سلام بھی نہ کر سکا۔

رجیا ڈری ـــ بھاگی تو خوشی سے تھی، لیکن گرفتاری کے بعد لوگوں کے بتانے اور سمجھانے پر اس نے سارا بیان جھوٹا دیا تھا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ تاجو بڑا بدمعاش ہے۔ وہ ضرور سخت بدلہ لے گا۔

تاجو دوسرے عذاب میں مبتلا تھا۔ رجیا ـــ وہی تھی بلکہ اس کا حسن اور شباب، جس نے اس کو بھگا لے جانے پر اکسایا تھا۔ اور بھی تیز اور تیکھا ہوگیا تھا۔ جسے دیکھ کر زاہدوں کے

ہاتھ سے تسبیح چھوٹ کر گر پڑے۔ لیکن اب وہ ممد کی بیوی تھی۔ اُس کے چھوٹے بھائی کی۔

رجیا کے ہاتھ سے لالٹین چھوٹ کر گر پڑی۔ اور تاجو چکر کھا کر گرتے گرتے بچا۔ رجیا سامنے سے ہٹ گئی اور تاجو دوسری طرف ہٹ گیا۔ اس کی بہن آکر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ بہت سی باتیں پوچھنے کا فیصلہ کرکے بیٹھی تھی۔ اور یہ تاجو کے دل و دماغ میں کھینچ تان جاری تھی۔ اس نے کہا:-

"ذرا تیل تو سر میں دیدو، درد بہت زیادہ ہے۔"

بہن تیل لائی، اور سر دابنے لگی۔ تاجو نے آنکھیں بند کرلیں، جیسے وہ سونے کی کوشش کر رہا ہو۔ لیکن اس کا دل اس کا دماغ سب کچھ جاگ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا ——

—— رجیا کا پھر ساتھ ہوا۔ اب کیا ہوگا۔ یہ غیر ممکن ہے کہ وہ مجھے بھول گئی ہو۔ میں بھی اسے دل سے بھلا نہیں سکا۔ جیل میں تین سال کاٹے۔ لیکن برابر ایک ہی خیال رہا۔ موقع ملا تو پھر رجیا کو حاصل کیا جائے گا۔ رجیا اب میری حفاظت میں ہے۔ میرے پاس ہے۔ روز اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا ایک ساتھ۔ کیا اس کو پھر اپنا لیا جائے؟؟؟! —— کوشش کی جائے تو ممد جانے اور نہ کوئی دوسرا۔

یہ سوال بار بار اس کے دماغ میں چکر لگاتا رہا۔

یکایک اس کو پان والے کی بات یاد آئی۔ رجیا گھر میں ہے وہی عورت جس کے لئے اس نے جیل کی سزا بھگتی ——

لیکن نہیں یہ سراسر کمینگی ہے۔ اب رجیا، وہ رجیا نہیں رہی ممد کی بیوی ہے۔ ممد کی جو مجھے بڑا بھائی کہتا اور سمجھتا ہے۔ اگر وہ ساری باتوں کو جانتا تو بیاہ ہی نہیں کرتا۔ اور اگر اب بھی اشارہ کر دوں تو وہ طلاق دیدے ——

لیکن بڑے بھائی کا کام یہ نہیں کہ چھوٹے بھائی کی چیز لے لے۔ یہ سراسر کمینہ پن ہے۔

لیکن ایک دوسرا سوال پھر اس کے دماغ میں گونجنے لگا۔ ایک ساتھ رہ کر پھر وہ آگ بھڑک نہ اٹھے، جو ایک زمانے سے دبی تھی۔ اور جس میں سوئی ہوئی چنگاریاں جاگنے لگی ہیں —— اس طرح کتنے دن کٹیں گے۔ ممد گرفتار ہوا ہے۔ تو اسے سزا بھی ہوگی ضرور۔ کتنے دنوں کی کون جانے۔؟ اس بیچ میں کیا ہوگا۔ میں بھی آدمی ہوں۔ رجیا بھی آدمی ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے مل چکے ہیں۔ اپنا اپنا دل دکھا چکے ہیں۔ شیطان بہکایا ضرور ہی کرتا ہے۔ مگر پھر کیا کیا جائے۔ آخر اس کو کہاں چلا دیا جائے۔ جو میری نگاہ اس پہ نہ پڑے ——؟

یہ دوسرا سوال تھا۔ پھر تیسرا اور چوتھا۔ اس کے دماغ میں سوالوں کا ایک سلسلہ بندھ گیا ——

وہ اٹھکر ایک دوست کے گھر چلا گیا۔

دوسرے ہی دن ممد کو چھ مہینہ کی سزا ہو گئی

تاجو کو کیا کرنا چاہئے۔؟ وہ فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ گھر آیا اس نے رجیا اور اپنی بہن کو بلا کر خبر کر دی اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ وہ بھی چھ مہینے کے لئے ایک ضرورت سے شہر سے باہر جا رہا ہے ——

مزدور کی زندگی

از جناب حبیب احمد صاحب نیر گیاوی

میرے پڑوس میں ادھیڑ عمر کا ایک شخص ایک شکستہ حال مکان میں سکونت پذیر تھا۔ اُس کا اصلی نام تو سبحان تھا لیکن محلے والوں میں سبحوا کے نام سے مشہور تھا۔ وہ مقامی جوٹ مِل میں تین روپے ہفتہ پر ملازم تھا۔ کام نہایت تندہی اور وفاداری سے کرتا تھا۔

ایک دن اس کو ہفتہ بھر کی اُجرت مبلغ تین روپے کارخانے سے ملی۔ شام کو خوشی خوشی جب گھر واپس آیا تو اس نے خلاف توقع اپنی بیوی حمیدن کو ایک ٹوٹے ہوئے چھپرکھٹ پر نیم بیہوشی کے عالم میں پایا۔ اُس کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دیکھا تو تیز بخار چڑھا ہوا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔

سبحوا۔ (پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) کیسی طبیعت ہے رسولن کی ماں؟

حمیدن نے شوہر کا پیار بھرا ہاتھ پیشانی سے مَس ہوتا ہوا محسوس کر کے آنکھیں کھول دیں اور نحیف آواز میں بولی "اے تم آ گئے"

سبحوا۔ آخر تمھیں بخار کب سے آیا ہوا ہے؟۔

حمیدن۔ کوئی ایک بجے سے۔

سبحوا۔ (تسلی دیتے ہوئے) گھبراؤ نہیں بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی۔ ہم ابھی ڈاکٹر صاحب کے پاس سے دوا لیکر آتے ہیں

حمیدن۔ ابھی رہنے دو۔ رات بھر دیکھ لو کہ طبیعت کیسی رہتی ہے اگر بخار اتر گیا تو خیر ورنہ صبح دیکھا جائے گا۔

سبحوا خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد مریضہ کے پاس سے اُٹھ کر چولھا سلگایا۔ جلد جلد روٹی دال تیار کر کے بچوں کو کھلا کر سُلا دیا۔ اور خود بھی تھوڑا سا حلق کے نیچے فرو کر کے بیوی کی پلنگڑی کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

جیسے جیسے رات گذرتی گئی بخار اور سر کا درد زور پکڑتا گیا۔ سبحوا بڑے انہماک سے تیمارداری میں مصروف تھا، کبھی کپڑوں کی پٹی ٹھنڈے پانی میں بھگو کر اُس کی پیشانی پر رکھتا۔ اسی حالت میں صبح ہو گئی لیکن بخار ایک لمحہ کیلئے بھی نہ اُترا۔

سبحوا صبح سویرے شیشی لیکر واٹس بابو ڈاکٹر کے دواخانہ میں پہنچا۔ ڈاکٹر صاحب ساڑھے سات بجے ڈسپنسری میں آئے۔ سبحوا نے بیوی کی کیفیت بیان کی اور دوا مانگی۔ ڈاکٹر صاحب نے نسخہ لکھا اور کمپونڈر نے دوا تیار کر دی جس کی قیمت ۸ر تھی۔ سبحوا دوا لیکر گھر لوٹا اور ایک خوراک اُس نے اپنے ہاتھ سے مریضہ کو پلائی اس کے بعد چولھا پھونک کر جلد جلد دال روٹی پکائی۔ پہلے بچوں کو بھر پیٹ کھلایا پھر تھوڑا خود

کھایا اور بچا کھچا کھانا اس خیال سے رکھ دیا کہ جب دوپہر کو بچوں کو بھوک لگے گی تو کھا سکیں گے۔ یہ انتظام کرکے وہ پھر بیوی کی طرف متوجہ ہوا اور اُسے دوپہر کے وقت دوا کھا لینے کی ہدایت کرکے تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا کارخانہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس روز وہ کارخانہ دیر سے پہنچا۔ حاضری ہو چکی تھی سارے مزدور اپنے اپنے کام پر جا چکے تھے۔ کام تو سبو کو مل گیا لیکن حاضری نہ بن سکی۔

شام کو جب وہ گھر واپس آیا تو مریضہ کا بخار موجود تھا۔ دوسرے دن بھی اس نے ڈاکٹر صاحب کے ہاں سے ۸ ر کی دوا خریدی اور چار دن تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس طرح تین روپے میں سے دو روپے کم و بیش دوا پر خرچ ہو چکے تھے اب صرف ایک روپیہ باقی رہ گیا تھا جس میں سبو کو بچوں اور ایک بیمار بیوی کیساتھ گذارا کرنا تھا۔

بیوی کی بیماری کی وجہ سے سبو چند دنوں تک کارخانہ کچھ دیر سے پہنچتا رہا جس کی رپوٹیں روزانہ مالک کے پاس پہونچائی جاتی تھیں۔ کارخانہ کا مالک بھی سبو کو کام سے الگ کرنیکا ارادہ کرچکا تھا

ہفتہ ختم ہونے پر کارخانہ کے تمام مزدوروں کیساتھ سبو کو بھی اجرت کی رقم ملی مگر اس دفعہ اس کی توقع کے بالکل خلاف تین روپے کی بجائے فقط ایک روپیہ آٹھ آنے ملے۔ باقی ڈیڑھ روپے اس جرم میں کٹ گئے کہ وہ کئی دنوں تک روزانہ دیر کرکے کام پر آتا رہا تھا جس کی وجہ کر مالک کے کام کو سخت نقصان پہنچا۔

سبو نے اس بے انصافی کی اپیل بنفس نفیس مالک کے پاس پہنچکر کرنی چاہی اور وہ اس غرض سے سرکار میں حاضر ہو کر اپنی عرضداشت پیش کی۔

مالک نے ترش رو ہو کر جواب دیا۔ سبو تم کو یاد ہے کہ جب تم پہلی بار آئے تھے تو تم وقت کے کتنے پابند تھے۔ لیکن اب میں برابر کئی دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تم روزانہ دیر سے آتے ہو اور کچھ سویرے کام چھوڑ کر گھر کو سدھار جایا کرتے ہو۔ تم نے میرے کام کو بیگاری کا کام سمجھا ہے۔ تم مزدور بھی کتنے خود غرض ہوتے ہو۔ مالک کے نفع و نقصان کی رتی بھر پروا نہیں کرتے ہو۔ تم لوگوں کی خواہش ہوتی ہے کہ گھر بیٹھے ہی مزدوری مل جایا کرے۔

سبو نے ہاتھ جوڑ کر کہا "نہیں سرکار" بات یہ ہے کہ میری بیوی بہت بیمار تھی اور گھر میں کوئی دوسرا آدمی تیمارداری کیلئے موجود نہ تھا اس وجہ سے کچھ دیر ہو جاتی تھی اب سرکار کی دعا سے وہ اچھی ہے اس لئے اب سے دیر نہ ہوگی۔

مالک۔ تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ نوکری کرکے بیوی کی تیمارداری نہیں کر سکتے۔ دونوں کام بیک وقت کرنے سے ایک کام میں ضرور ہرج ہوگا۔ مالک کا پیسہ حرام کا نہیں ہوتا ہے پیسہ حاصل کرنے کیلئے یکسو ہو کر جی توڑ کر محنت کرنی پڑتی ہے۔

سبو۔ سچ ہے مالک۔ بڑی مجبوری تھی خیر اب سے دیر ہرگز نہ ہوگی!

(جواب نہ پاکر کچھ دیر کے بعد) کیا حکم ہوتا ہے سرکار؟

مالک۔ سنو کل سے تم کام پر نہ آنا۔ تمھیں نوکری سے برطرف کیا جاتا ہے تاکہ تم اچھی طرح اپنی بیوی کی تیمارداری اور دوا درمن کر سکو (رجسٹر منگوا کر مزدوروں کی فہرست سے اس کا نام کاٹ دیتا ہے)

سبو۔ خیر جیسی سرکار کی مرضی۔ مگر اجرت کے متعلق کیا حکم ہوتا ہے

مالک۔ کس بات کی اجرت چاہتے ہو میں کئی دنوں سے برابر تمہارے کاموں کی نگرانی کر رہا ہوں۔ جاؤ اب ایک پیسہ نہیں ملے گا۔

سبوا - (حیرت سے) کیا آپ میری کمائی ہوئی اجرت بھی نہیں دینا چاہتے ؟

مالک - ہاں نہیں دیتے ؟

سبوا - مالک کا پاؤں پکڑ کر، سرکار۔ مجھے بیک وقت دُہری سزا تو نہ دیجئے میرے بال بچے بن آئی مرجائیں گے۔ اتنی رقم تو راستہ ہی میں باقی دار وصول کرلیں گے۔ میں خالی ہاتھ لیکر کیا منہ دکھانے گھر جاؤں گا میں اب تو یہیں جان دیدوں گا

مالک - غصہ سے چلا کر......رامو......رامو (اس کا خانساماں)

رامو - جی سرکار :-

مالک - اس پاجی کو یہاں سے نکال دو......رامو

سبوا سے کمزور تھا اس لئے اس کو ہاتھ لگانے کی ہمت نہ پڑی مالک نے چلا کر اور نوکروں کو بلایا اور چار پانچ آدمیوں نے مالک کے اشارے پر بیچارے سبوا کی لات اور گھونسے سے تواضع کی اور آخیر میں اس کو دھکا دیکر باہر نکال دیا۔ غریب سبوا مار کھا کر اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ منہ سے کچھ گنگناہٹ کی آواز آرہی تھی۔ غالباً یہ شعر اس کے وردِ زباں ہوگا۔

؎ لہو اور پسینہ کی ساری کمائی　　لٹا کر یہاں سے چلا جا رہا ہوں

سبوا گھر کے دروازہ پر دیر تک کھڑا ہوا اپنی غربت بے بسی نیز بچوں کی بھوک اور غریب حمیدن کی بیچارگی پر غور کر رہا تھا کہ اتنے میں سامنے سے حمیدن آتی ہوئی دکھائی دی۔

حمیدن نے نزدیک آکر پوچھا۔ کیا کھڑے سوچ رہے ہو؟

سبوا نے دھیمی آواز میں کہا۔ ہفتہ بھر کی اجرت صرف ڈیڑھ روپے ملے ہیں باقی اس قصور پر کاٹ لئے گئے کہ تمہاری بیماری کے زمانہ میں کچھ ذرا دیر سے کارخانہ پہنچتا رہا۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ مالک نے نوکری سے بھی الگ کر دیا ہے۔ افسوس!

حمیدن پر یہ سنتے ہی جیسے بجلی گر پڑی۔ سارا گھر اس کی نظروں میں گھومنے لگا۔

"تو اب کیا ہوگا" حمیدن نے گھبرا کر پوچھا۔

سبوا - تم گھبراؤ نہیں۔ خدا نے رزق کا وعدہ کیا ہے۔ کچھ نہ کچھ سامان ہو ہی جائے گا۔ کل سویرے نوکری کی تلاش میں نکلوں گا۔

--- ۳ ---

سبوا کو بہت تیز بخار چڑھا تھا۔ حمیدن شوہر کی خدمت میں ہمہ تن مصروف تھی۔ علاج کہاں سے ہوتا۔ مفلسی اور تنگدستی مانع تھی۔ بغیر دوا کے کئی دن گذر گئے۔ مرض بڑھتا گیا یہاں تک کہ بخار نے ترقی کرکے ٹائیفائڈ کی صورت اختیار کرلی۔ حمیدن اور اس کے بچوں نے بہت دعائیں مانگیں لیکن موت کے معین وقت کو کوئی نہ ٹال سکا۔ یہاں تک کہ ایک رات سبوا نے تکلیف سے کراہتے ہوئے کہا کہ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں اپنی زندگی میں سکھ اور آرام نہ پہنچا سکا۔ دنیا غریب مزدوروں کو کبھی سکھ چین سے رہنے نہیں دیتی۔ یہ دنیا صرف سرمایہ داروں کیلئے ہے جو غریب مزدوروں کا خون چوس کر دولت اکٹھا کرتے ہیں۔ افسوس! میرے بعد تم لوگوں کا کیا حال ہوگا

حمیدن نے ضبط کرتے ہوئے کہا ایسی باتیں نہ کرو تم اچھے ہو جاؤگے۔ سبوا نے نحیف و دھیمی آواز میں کہا۔ ”نہیں“ غریب حمیدن جو سرہانے بیٹھی تھی پر ساکت کھڑی رہی تھی بولی کیا تکلیف زیادہ ہے ؟ ہو ہو......

سبوا آخری بار حمیدن کے چہرے پر نظر ڈالی۔ آنسوؤں کے دو قطرے اس کے رخسار پر ڈھلک گئے سسکی کی آواز نکلی پھر ہچکی آئی اور اسکا دم نکل گیا۔ تا صبح ......۴ صبح کو سبوا کا خاندان ایک ہولناک مصیبت اور تباہی میں گرفتار تھا۔ چند دنوں کے بعد حمیدن اور اسکے بچے سڑکوں پر بھیک مانگتے ہوئے نظر آئے۔ یہ ہے مزدور کی زندگی کا انجام“ (یہ ایک حقیقت ہے جو افسانے کے رنگ میں پیش کیا گیا ہے)

خوشی یا غم

از جناب عزیز احمد صاحب (ارکوی)

(جگہ:- باغ- وقت:- رات- منظر:- گلاب کے پھول سرگوشیوں میں مصروف ہیں- سوسن کے نازک، جاذب نظر اور سفید پھول کھلے ہوئے ہیں!!)

سوسن:- جب شام ختم ہو جاتی ہے اور آسمان پر تارے نکل آتے ہیں اس وقت شاخوں پر رہنا کتنا اچھا معلوم ہوتا ہے- گلچیں کا خوف پاس تک نہیں پھٹکتا!!

سفید گلاب:- کاش میں سرخ ہوتا!!

سرخ گلاب:- کاش میں سفید ہوتا! ہوا بالکل بند ہے! وہ بھی سورج کے ساتھ دفن ہوگئی ہے! مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ہمیشہ یہیں رہیں گے ـــ ٹہنیوں پر ـــ حالانکہ ہر روز ایک نیا سورج پیدا ہوتا ہے اور پھر فنا ہو جاتا ہے!!

سوسن:- سورج فنا نہیں ہوتا! وہ اس وقت سو رہا ہے! یہ روز صبح کو جاگ اٹھتا ہے لیکن جب ستارے پہرہ دینے کیلئے نکل آتے ہیں تو پھر یہ آرام کرنے کیلئے چلا جاتا ہے!!

گلاب کے پھول:- (آپس میں گلے مل کر) یہ سوسن کے پھول کتنے عقلمند ہیں!! انہوں نے ضرور سورج کو ستاروں سے باتیں کرتے سنا ہوگا!!

سفید گلاب:- سوسن کے پھولو! کیا تم بتا سکتے ہو کہ جب رات کے وقت باغ پر خاموشی چھا جاتی ہے اور جب چاروں طرف چاند سے زرد روشنی کا چشمہ ابل پڑتا ہے! اس وقت ہوا کہاں چلی جاتی ہے؟؟

سوسن کے پھول:- (آپس میں مل کر) گلاب کے پھول بظاہر کس قدر عقلمند معلوم ہوتے ہیں! وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں سب کچھ معلوم ہے لیکن حقیقت میں یہ ایک خواب ہوتا ہے!!

سفید گلاب:- توڑے ہوئے پھولوں پر کیا گذرتی ہے؟؟

سرخ گلاب:- بھلا یہ کون بتا سکتا ہے! کوئی ایک لمحہ کے لئے یہ بات بتانے کے لئے واپس نہیں آسکتا کہ توڑے جانے کے بعد اس کی کیا حالت ہوتی ہے ـــ اچھی یا بری ـــ کاش میں کسی توڑے ہوئے پھول سے مل کر پوچھ سکتا کہ گلچیں کے دامن میں اسے کیا کیا عجیب واقعات پیش آئے!!

سفید گلاب:- خاموش! خاموش! ہوا جاگ رہی! کیا یہ آوازیں اس کی نہیں؟ الوداع! میری پتیاں کانپ رہی ہیں! مجھے توڑ لیا گیا ہے- اب مجھے معلوم ہو جائے گا کہ توڑے ہوئے پھولوں کی قسمت میں کیا ہے ـــ **خوشی یا غم**

(ترجمہ بتصرف)

ادبیات

کچھ نہ چاہیے

از

ناخدائے سخن تاج الشعرا حضرت نوح ناروی

مجھ کو نباہنے کے سوا کچھ نہ چاہیے
دنیا میں چاہنے کے سوا کچھ نہ چاہیے

یہ بھی ہے ایک صورتِ اظہارِ آرزو
دل کو کراہنے کے سوا کچھ نہ چاہیے

مشکل ہے چار روز بھی ان سے نباہنا
لیکن نباہنے کے سوا کچھ نہ چاہیے

کیسا گلہ کسی ستمِ بار بار کا
ہر دم سراہنے کے سوا کچھ نہ چاہیے

مجھ کو تو چاہنے کے سوا چاہیے نہ کچھ
ان کو نہ چاہنے کے سوا کچھ نہ چاہیے

اہلِ نظر کو دردِ جگر کی تلاش ہے
یعنی کراہنے کے سوا کچھ نہ چاہیے

وعدہ وہ کر کے پوچھتے ہیں چاہیے کچھ اور
وعدہ نباہنے کے سوا کچھ نہ چاہیے

ہاں ہاں ترے ستم کی برائی بری بری
ہاں ہاں سراہنے کے سوا کچھ نہ چاہیے

پوچھیں گے وہ کبھی جو مرے دل کا مدعا
کہہ دونگا چاہنے کے سوا کچھ نہ چاہیے

شاید یہی سبب ہو تری التفات کا
مجھ کو کراہنے کے سوا کچھ نہ چاہیے

دنیا میں خوب چیز ہے آپس کا اتفاق
باہم نباہنے کے سوا کچھ نہ چاہیے

مانا سراہنے سے وہ ہوتے ہیں بدگماں
پھر بھی سراہنے کے سوا کچھ نہ چاہیے

پوچھے ہمارے دل سے کوئی چاہ کا مزا
دن رات چاہنے کے سوا کچھ نہ چاہیے

ہر وقت اٹھتے بیٹھتے مجھکو کراہنا
گویا کراہنے کے سوا کچھ نہ چاہیے

اے نوحؔ عشقِ یار میں طوفاں کا ذکر کیا
بس تم کو چاہنے کے سوا کچھ نہ چاہیے

زمزمۂ تغزل

از بلبلِ بہار حضرت سریرؔ کابری گیاوی مینائی

یہ دردِ دل نہیں ملتا یہ سوزِ دل نہیں ملتا — تو پھر کچھ ہم کو اپنی زیست کا حاصل نہیں ملتا

لپٹ کر تیغِ قاتل سے گلے بسمل نہیں ملتا — اگر بسمل سے جھک کر خنجرِ قاتل نہیں ملتا

اگر فکرِ دو عالم کیلئے ہوتا یہ اے واعظ — تو دو دل ملتے پہلو میں کبھی اک دل نہیں ملتا

فروغِ شمع جواب ہے رہیگا صبحِ محشر تک — مگر پروانہ کوئی اب سرِ محفل نہیں ملتا

جو کردے وقف پیاسوں کیلئے تلوار کا پانی — ہمیں ایسا تو قاتل کوئی دریا دل نہیں ملتا

کوئی ناقدری اہلِ وفا کی انتہا بھی ہے — ہتھیلی پر لئے پھرتا ہوں سر قاتل نہیں ملتا

ہمیں فیضِ سلف سے ہر جگہ محروم رہتے ہیں — کہاں ماضی سے ورنہ درسِ مستقبل نہیں ملتا

تڑپ کر مر نہ جاتے ہم محبت میں تو کیا کرتے — اگر ذوقِ طبیعت خوگرِ مشکل نہیں ملتا

ہوا باندھی ہے بحرِ عشق میں آوارہ بختی نے — اُدھر جاتی ہے کشتی جسطرف ساحل نہیں ملتا

یہی کمبخت رشتہ جوڑ دیتی ہے محبت کا — نظر جبتک نہیں ملتی ہے دل سے دل نہیں ملتا

سریرؔ اس دور میں بزمِ سخن کا رنگ بدلا ہے
مغنی رہ گئے ہیں شاعرِ کامل نہیں ملتا

کلامِ کشتہ

از

جناب اودھ کشور پرشاد صاحب کشتہ بی ایل گیاوی

اسی سے تو اسے میں عشق کے قابل سمجھتا ہوں
وہ کہتے ہیں تمھارے دل کو اپنا دل سمجھتا ہوں

کوئی پیش آئے مشکل کب اسے مشکل سمجھتا ہوں
کہ اکثر قعرِ دریا کو بھی میں ساحل سمجھتا ہوں

جو جیتے جی نہ سمجھے موت کیا ہے زندگی کیا ہے
اسے دنیا و مافیہا سے میں غافل سمجھتا ہوں

بگولا جب اٹھا تو بول اٹھا یہ دشت میں مجنوں
کوئی کچھ بھی کہے میں پردۂ محمل سمجھتا ہوں

جو اک ناز پر قربان ہو جائے تڑپ اٹھے
اسی کو میں ترا کشتہ ترا بسمل سمجھتا ہوں

دلِ بے تاب کو وہ اور تڑپاتے ہیں یہ کہہ کر
اسے دنیائے حسرت میں اسی قابل سمجھتا ہوں

مصیبت سہتے سہتے اب یہ صورت ہو گئی میری
کہ مشکل سے کسی مشکل کو میں مشکل سمجھتا ہوں

قیامت تک پسٹ کر کیوں نہ سوؤں اپنے مرقد سے
اسی گز بھر زمیں کو زیست کا حاصل سمجھتا ہوں

یہی شانِ محبت ہے یہی اعجازِ حسرت ہے
ترے ہر تیر کو میں ہمنشینِ دل سمجھتا ہوں

اسی نے مار ڈالا مجھکو ہر صورت سے الفت میں
اسی سے آپ اپنے دل کو میں قاتل سمجھتا ہوں

کہا کرتے ہیں کشتہ جیتے جی وہ بھی مجھے کشتہ
میں اپنے کو فدائے خنجرِ قاتل سمجھتا ہوں

شاما دیوی ـــــــ کے نام

از
جناب جی، آر قیس شیخوپوروی

مجھے تم سے محبت ہے، مجھے تم سے محبت ہے

سنو گر تم، تو میں اپنی تمنائیں بیاں کر دوں   لب خاموش سے رازِ دلی تم پر عیاں کر دوں
تقاضا ہے دلِ شیدا کا صدقے تم پہ جاں کر دوں   تمھاری ذات میں اپنی بھی ہستی کو نہاں کر دوں
ارادہ ہے کہ پھر اپنے ارادوں کو جواں کر دوں   مصیبت کوہ بنکر بھی جو آئے تو اٹھا لونگا

نہ ہوں گا پست ہمت میں. مجھے تم سے محبت ہے

مرا حالِ پریشاں کیا ہے گویا درسِ عبرت ہے   فغانِ بیتاب بھر بے نقابی حقیقت ہے
اشاروں ہی سے بتلا دو جو تم کو مجھ سے الفت ہو   میں دنیا بھر سے کہدوں کھل کے مجھکو تم سی نسبت ہے
چھپاؤں کس طرح اس کو حقیقت پھر حقیقت ہے   کہ خورشید درخشاں ابر میں بھی چھپ نہیں سکتا

اجازت دو تو کہہ ڈالوں مجھے تم سے محبت ہے

شبِ تنہائی ہے میں ہوں، نہ مونس ہے نہ ہمدم ہے   دلِ حسرت زدہ وقفِ خیالِ حسن برہم ہے
قیامت ہے کہ ہر دیوار و در معمورۂ غم ہے   یہ تنہائی کی راتیں جس قدر ڈھائیں ستم کم ہے
تمنائے دلی بایاس و حسرت صرفِ ماتم ہے   کسی الفت زدہ کے دل میں محشر کیوں نہ ہو برپا

اسے تم سے محبت ہے، اسے تم سے محبت ہے

قسم ہے اختر و پروین کی تم تاروں کی زینت ہو   قسم ہے دیدۂ تر کی تم آنکھوں کی بصارت ہو
قسم ہے باغ قدرت کی عروسِ باغِ فطرت ہو   تماشا گاہ عالم ہو چراغ بزمِ عشرت ہو
شمیم باغ عالم ہو سر آرائے نکہت ہو   حسیں ہو، نازنیں ہو، دلربا ہو اور اے شاما

مجھے تم سے محبت ہے، مجھے تم سے محبت ہے

ہے یہ دل قریۂ ویراں اسے آکر بسا جاؤ   مری بے نور آنکھوں میں نظر بنکر سما جاؤ
یہاں آؤ، یہاں آؤ، نہ گھبراؤ، نہ شرماؤ   دلِ فرقت زدہ کو اپنی نزدیکی سے بہلاؤ

لب لعلیں کے بوسوں سے جسم و جاں کو گرماؤ　　نہ روکو، چپ رہو کیوں، جرم ہے کوئی محبت کیا
میں کہتا ہی رہوں گا مجھکو بھی تم سے محبت ہے

زمین و آسماں پھر جائے دشمن اک زمانہ ہو　　سمندر درمیاں ہو، یا بیاباں ہو کہ صحرا ہو
سلاسل پاؤں میں زنجیرِ غم میں جسم جکڑا ہو　　تہی دستی ستم ڈہائے، مصیبت رُوح فرسا ہو
بدن پھنکتا ہو جی جلتا ہو، یا کہ دم نکلتا ہو　　مگر میں تیری الفت سے نہ ہرگز باز آؤں گا
زمانے کو میں اپنے عشق سے درسِ وفا دوں گا
مجھے تم سے محبت ہے، مجھے تم سے محبت ہے

کلام روشن

از

جناب سید وحید الدین صاحب روشن سریری مخدوم آبادی

جو آئے ہیں تو کچھ لیکر ہی اٹھیں گے ترے در سے　　فقیروں کو بڑی امید ہوتی ہے تونگر سے
مرے دل کی لگی ساقی بجھا دے آتشِ تر سے　　گھٹا چھائی ہوئی ہے بادۂ گلگوں کا مینہ برسے
نگاہ شوق کو کچھ تاب نظارہ نہیں باقی　　نقاب اب آپ الٹیں یا نہ الٹیں رُخِ انور سے
خرام ناز سے زندہ ہوئی شان مسیحائی　　کہ اس نے سیکڑوں مردے جلائے ایک ٹھوکر سے
سر محفل ہنسی کیا کیا اڑی راز محبت کی　　چھلک آئے جو قطرے آنسوؤں کے دیدۂ تر سے
لنڈھا دے ساقیا تو آج میخانہ کا میخانہ　　کہ نیت بھر نہیں سکتی مری دو چار ساغر سے
مجھی سے پوچھئے میں ہی بتا سکتا ہوں وہ نقشہ　　نکلوایا گیا ہوں جس طرح میں کوئے دلبر سے
بسر کرنا ہے جس کو زندگی عزت کی دنیا میں　　وہ اپنے پاؤں کیوں باہر نکالے اپنی چادر سے
ترنم سے جما لو رنگ تم اوروں پہ اے روشن
سخنور ہی کو لیکن داد ملتی ہے سخنور سے

تلخیصات

عربی صحافت کی اجمالی تاریخ

از جناب وحید احمد صاحب مسعود نجابی

کچھ دن گذرے مشہور اسلامی مفکر علامہ شکیب ارسلان نے المجمع العلمی العربی (دمشق) کے ہال میں "عرب کی علمی ترقی" پر ایک مضمون پڑھا تھا۔ جو مجلہ المجمع العلمی العربی میں شائع ہوا ہے۔ ذیل میں اس کی تلخیص پیش ہے:۔

عربی صحافت کی ابتدا "الوقائع المصریہ" سے ہوتی ہے' یہ پہلا عربی اخبار ہے جو محمد علی پاشا کے عہد میں مصر سے نکلا' اس وقت ممالک عربیہ کے کسی شہر سے کوئی اخبار یا رسالہ نہیں نکلتا تھا۔ الوقائع المصریہ کے بعد بیروت سے مختلف اخبارات نکلے' سب سے پہلا اخبار' حدیقۃ الاخبار کے نام سے لبنان کے مشہور شاعر وادیب' خلیل الخوری نے ۱۸۶۰ء میں نکالا پھر ایک ہفتہ وار اخبار الجنۃ کے نام سے پھر ایک روزانہ اخبار الجنینہ اور پھر ایک ماہوار رسالہ الجنان کے نام سے نکالا - پھر مشہور پادری لویس نے "النحل" کے نام سے نکالا'

اسی زمانہ میں بیروت ہی سے "النجاح" نکلا' نیز امریکن لوگوں نے جو بیروت میں مقیم تھے' "النشرۃ الاسبوعیہ" کے نام سے اپنا الگ اخبار نکالا۔

یہ سارے اخبارات جن کی فہرست اوپر پیش کی گئی ان میں سے کوئی بھی مسلمانوں کا نہیں اس کے بعد مسلمانوں میں حرکت پیدا ہوئی اور "ثمرات الفنون" کے نام سے ایک اخبار نکالا جس کے مینجر شیخ عبدالقادر قبانی' اور ایڈیٹر علامہ اسیر مقرر ہوئے ان کے بعد علامہ ابراہیم احدب طرابلسی ایڈیٹر ہوئے یہ مذکورہ بالا صحافتی ترقی ۱۸۶۰ء سے لیکر ۱۸۸۰ء تک کے دوران میں ہوئی استنبول سے جنگ کریمیا کے دوران میں "اخبار مرآۃ الاحوال" دولت عثمانیہ کے ایما سے نکلا جس کے ایڈیٹر "ادیب کبیر رزق اللہ حسون مقرر ہوئے' اس میں جنگ کریمیا کے حالات و واقعات شائع ہوتے تھے' چند سال تک بڑی آب وتاب سے نکلتا رہا اس کے بعد رزق اللہ کو غبن کے الزام میں استنبول چھوڑنا پڑا' اس زمانے میں احمد فارس شدیاق پیرس میں مقیم تھے' وہاں سے استنبول آئے اور اپنا مشہور اخبار "الجوائب" نکالا یہ اپنے وقت کا دنیا میں سب سے زیادہ وقیع عربی اخبار تھا' دنیا کا کوئی اسلامی ملک ایسا نہ تھا جہاں اس کے خریدار نہ ہوں' اسی زمانے میں یا اس کے کچھ دنوں بعد "تیونس سے "الرائد التونسی" اور مصر سے وادی النیل نکلے اور ممکن ہے مصر سے اور بہت سے اخبار نکلے ہوں اور ہمیں انکا علم نہ ہو یہ تحریک ۱۸۸۰ء تک شام کے شہر بیروت تک محدود تھی۔

اس وقت تک دمشق سے صرف ایک سرکاری اخبار "سوریہ" نکل رہا تھا، اس کے بہت بعد "مصطفےٰ واصف" نے "الشام" اور پھر "مجمع علمی" کے سابق صدر استاذ کرد علی نے المقتبس نکالا، نیز حلب سے الفرات اور بغداد سے الزوراء نکلے، یہ دونوں اخبار بھی "سوریہ" کی طرح سرکاری تھے "سوریہ اور الفرات" نصف عربی اور نصف ترکی میں شائع ہوتے تھے، اور صرف سرکاری خبروں کے لئے وقف تھے،

اس دوران میں بیروت کی صحافت روز افزوں ترقی پر تھی، مذکورۃ الصدر اخبارات کے علاوہ "لسان الحال" "التقدم" اور "المصباح" نکلے، اس کے بعد ڈاکٹر یعقوب صروف اور فارس نمر کی ادارت میں مشہور رسالہ "المقتطف" نکلا جس میں علمی فنی تاریخی اور لغوی مقالات اور مباحث شائع ہوتے تھے، اس کے بعد ۱۸۸۶ء میں علی ناصر الدین نے ایک ہفتہ وار رسالہ الصفاء کے نام سے نکالا جو کچھ دنوں کے بعد روزانہ ہوگیا، آج تک یہ پرچہ قوم وملت کی بیش بہا خدمات انجام دے رہا ہے فی الحال اس کے ایڈیٹر لبنان کے مشہور لغوی ادیب وشاعر امین ناصر الدین ہیں اس کے بعد عبد القادر قبانی نے بیروت کے نام سے ایک اخبار نکالا جس کے مضمون نگاروں کی فہرست میں سید مرتضیٰ جزائری کا نام ملتا ہے، جو مجاہد اعظم امیر عبد القادر جزائری کے حقیقی بھائی تھے

الجزائر سے تقریباً پچاس سال سے صرف ایک سرکاری اخبار "المبشر" نکل رہا تھا، لیکن ادھر پندرہ برس کے اندر متعدد قومی اخبار نکلے، جن میں سے "البلاغ" اور وادی تراب ممتاز تھے اس وقت بھی مختلف اخبارات و رسالے نکل رہے ہیں جن میں جریدہ البصائر اور رسالہ الشہاب بڑی وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں

مغرب اقصیٰ (مراکش) کا افسانہ اس لحاظ سے بہت المناک اور دردانگیز ہے غیر ملکی اقتدار کے خلاف نہ کوئی اخبار نکالا جا سکتا ہے، ستم بالائے ستم یہ کہ مصر و شام کے عربی اخبارات کا داخلہ بالکل بند ہے، اگر کوئی منگاتا ہے تو اس پر قانونی کاروائی عمل میں لائی جاتی ہے، لیکن جب باشندوں نے اس سخت گیر پالیسی پر سخت احتجاج کیا تو چند سال ہوئے، ایک خاص علمی پرچہ "المغرب" کے نام سے رباط سے نکالنے کی اجازت ملی، آخر وہاں کی سیاسی انجمن "الحزب الوطنی" نے مجبور ہو کر شہر پیرس سے فرنچ زبان میں "مغرب" ہی کے نام سے سیاسی رسالہ نکالا جس میں فرانسیسی حکومت کے خلاف سنجیدہ علمی وسیاسی مضامین شائع ہوتے تھے، بالآخر حکومت نے اس کا مغرب اقصیٰ میں داخلہ بند کر دیا، کئی سال تک اس "زبان بندی" اور "سخت گیر" پالیسی پر احتجاج کرتے کرتے وہاں کی نیشنل کانگرس کامیاب ہوئی اور قومی وزارت کے ہاتھ میں داخلی انتظام آیا تو بہت بحث ومباحثہ کے بعد ایک عربی اخبار "الاطلس" کے نام سے دوسرا "لواء" کے نام سے نکلے، اسی طرح تطوان سے جس پر ہسپانیہ کا قبضہ ہے، دو اخبار "السلام" اور "الحیاۃ" نکل رہے ہیں،

طرابلس الغرب سے حکومت عثمانیہ کے عہد میں الولایہ، الترقی، المرصاد، الرقیب، العصر الجدید اور ابو قتادہ اور ایک رسالہ مجلۃ الفنون کے نام سے نکلتے تھے، اور اطالوی قبضہ کے بعد العدل، الرقیب

العتید، اور النکری نکلے،

بنغازی سے ایک مصور رسالہ لیبیا المصورۃ اور ایک اخبار "بریدبرقہ" کے نام سے نکل رہا ہے یہ ایک اجمالی اور سرسری خاکہ ہے عربی صحافت کا صحیح اعداد و شمار کا استقصاء مدنظر نہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اخباری پابندیاں صحافتی ترقی کی راہ میں سنگ گراں ہیں، یہی وجہ ہے کہ عربی صحافت کو خاطر خواہ ترقی نہ ہوئی، لیکن جب نیا دستور عثمانی نافذ ہوا، اور اخبارات سے پابندیاں اٹھائی گئیں تو صحافت کی رفتار بہت تیز ہو گئی یہاں تک کہ جنگ عظیم کے دوران میں شام اور فلسطین سے سو سے زیادہ اخبار و رسائل نکل رہے تھے۔

عربی انقلاب (سنہ ۱۸۸۲) کے دوران میں مصر سے صرف چند اخبار الاھرام، اللطائف، المفید، وغیرہ نکل رہے تھے، اس بعد یہ تعداد بہت زیادہ ہو گئی، یہاں تک کہ بعض روزانہ اخبار آٹھ اور بعض سولہ صفحوں پر شائع ہوتے تھے۔ اور تیس سے لیکر چالیس ہزار تک کی تعداد میں چھپتے تھے، بعض یورپین اخبار نویسوں کا بیان ہے کہ الاھرام اپنی کثرت اشاعت، اپنی عمدگی وصفائی اور قیمتی معلومات و مباحث کے لحاظ سے پیرس کے مشہور اخباروں سے کسی طرح کم نہیں،

المؤید چالیس ہزار تک کی تعداد میں شائع ہوتا ہے اس وقت تک عربی صحافت صرف شام و مصر تک محدود تھی۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ سارے عربی ممالک میں پھیل گئی، شریف حسین کے زمانہ میں حجاز سے القبلہ نکلا، ابن سعود کے زمانہ میں نام تبدیل کرکے ام القریٰ، صوت الحجاز نکلا، ام القریٰ حکومت کا اخبار ہے جس میں صرف سرکاری خبریں شائع ہوتی ہیں اور صوت الحجاز نیم سرکاری اخبار ہے صنعا (یمن) سے الایمان نام کا سرکاری اخبار نکلا، جاوا سے جریدہ حضرموت نکل رہا ہے، ہندوستان سے ایک علمی ادبی پرچہ "الضیاء" مولانا مسعود عالم ندوی نے نکالا۔ جنوبی اور شمالی امریکہ کے غیور عرب مہاجرین تیس سے زائد اخبار و رسالے نکال رہے ہیں شمالی افریقہ سے بجز الرائد التونسی (ٹیونس) کے اور کوئی اخبار نہیں نکلتا تھا یہ واضح رہے کہ الرائد آج سے ساٹھ برس پہلے نکلتا تھا، اس وقت، فرانسیسی استقلال کی بلا ٹیونس پر نہیں آئی تھی، فرانسیسی استقلال کے بعد بھی وہاں سے بہت سے اخبارات نکلے اس وقت بھی وہاں سے بہت مختلف عربی اخبار و رسالے نکل رہے ہیں جن میں سے الزھرۃ، النہضۃ، الصواب، اور المجلۃ الزیتونیہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں

بچی مرحومہ کی یاد

اک آگ کلیجے میں لگا کرتی ہے اک شمع مرے دل میں جلا کرتی ہے
وہ چاند چھپا ابر عدم میں جب سے اک برق نگاہوں میں پھرا کرتی ہے

نجم ندوی

لسانیات

اصلاح زبان

غلط	صحیح
"ایسے مضامین کی اشاعت کو روکنی پڑتی ہے"	"ایسے مضامین کی اشاعت کو روکنا پڑتا ہے۔" یا "ایسے مضامین کی اشاعت × روکنی پڑتی ہے۔"

کیوں ————————— ؟

اس لئے کہ "کو" علامت مفعول ہے۔ جب یہ لفظ جملہ میں آجائیگا تو فعل اس کی رعایت سے مذکر لایا جائے گا۔

مذکر مونث

"مذکیر و تانیث کیلئے چند خاص قاعدے مقرر ہیں۔ ہر زبان کے دستور کے مطابق ہیں اردو زبان میں بھی انکی پیروی کرنی لازم ہے۔ یہ جواب صحیح نہیں کہ بہار میں سکو یونہی بولتے ہیں۔ مستند اہل زبان نے زبان کی صحت کے معیار کیلئے دو مرکزوں کو بنیادی طور پر تسلیم کرلیا ہے۔ دہلی اور لکھنو۔ ہمیں تذکیر و تانیث میں ان مرکزوں کی پیروی کرنی پڑیگی۔ ہاں جو الفاظ ہمارے یہاں خاص طور پر بولے جاتے ہیں یا جو مقامی محاورے اور ضرب الامثال ہمارے یہاں استعمال کئے جاتے ہیں ہمیں ان کے باقی رکھنے کا اختیار ہے اور ہم انکو اس پر چھوڑنے کیلئے تیار نہیں کہ وہ پچھم کی بولیوں میں موجود نہیں ہیں لیکن تذکیر و تانیث کے جو قواعد ہیں وہ اپنی جگہ مسلم ہیں عام ازیں کہ ان مرکزوں کے اطراف میں بھی انکی پابندی نہ کیجاتی ہو مثلاً۔ "تکیہ" ———— بہ اتفاق اہل زبان مذکر ہے مگر لکھنو کے اطراف میں اسکو مونث بولتے ہیں۔ صوبہ بہار میں بھی یہ لفظ مونث ہی بولا جاتا ہے۔ مگر لکھنو کے اطراف والے ہوں یا صوبہ بہار والے دونوں برسر غلط ہیں۔ بلکہ اگر اب خاص لکھنو میں بھی اسکو مونث بولیں تو سمجھا جائیگا کہ اطراف کی بولی کا خراب اثر وہاں پہنچ گیا ہے۔ "تکیہ" ———— بہر صورت مونث کے بجائے مذکر ہی رہیگا ———— اس لئے ———— بہار والوں کو چاہئے کہ اسکو ہمیشہ مذکر بولیں۔ مونث بولنا کسی حال میں صحیح نہیں ———— **مذکر و مونث سماعی** ———— چند الفاظ سماعی طور پر مذکر و مونث ہیں۔ یعنی مثلاً یہ علامت تانیث ہونے کے باوجود مونث کے بجائے مذکر ہیں ———— جیسے دہی، موتی وغیرہ ———— بہار والے عموماً گھروں میں "کھٹا یا میٹھا دہی" کے بجائے "کھٹی دہی، میٹھی دہی" بولتے ہیں۔ اسی طرح سچا موتی کی جگہ "سچی موتی" کہتے ہیں یہ دونوں غلط ہیں ———— اور اکثر لوگ لفظ دہی کو مذکر ہیں۔ جیسے ———— لفظ "پانی" ———— فرض کیجئے کوئی کہے "میٹھی پانی" یہ سنتے ہی آپکے کانوں کو کسقدر تکلیف ہوگی؟ یہ سب بہ اتفاق "میٹھا پانی" بولتے ہیں ———— ویسے ہی سمجھئے کہ ایک زبان داں کے سامنے اگر آپ "سچی موتی" یا "میٹھی دہی" بولینگے تو اس کے کانوں کو بھی اسی قدر تکلیف پہنچے گی جیسے آپ کو "میٹھی پانی" سے ———— اس لئے ———— چھوڑ دیجئے "میری تکیہ" "سچی موتی" "میٹھی دہی" بولنا۔ "
اختیار کیجئے "میرا تکیہ" "سچا موتی" "میٹھا دہی" کہنا

باب المراسلہ والمناظرہ

شورش کا تذکرہ اُردو زبان میں ہے
کیا اس تذکرہ اُردو زبان میں ہے؟

۱۲ ـــ ۴۰

ھنوز پوکھر بانکی پور

مکرم و مہربان بندہ ۔ تسلیم۔

میں پانچویں دسمبر کو بھوالی سے واپس آیا ۔ ندیم کے بہار نمبر کا بہت بہت شکریہ ۔ اس زمانے میں جب کاغذ اور سامان طباعت کی گرانی روزافزوں ہے، اس ضخامت کا خاص نمبر نکالنا بڑی ہمت کا کام ہے ۔ اس وقت تک جو مضامین میں نے پڑھے ہیں، ان میں سید حسن عسکری صاحب، سید وصی احمد بلگرامی صاحب، اور شاہ ولی الرحمٰن صاحب کے مضامین مجھے بہت پسند آئے ۔ سید حسن عسکری صاحب نے حسب عادت مضمون بڑی تحقیق سے لکھا ہے ۔ آپ انھیں آمادہ کریں کہ وہ مہاراجا کلیان سنگھ کی ادبی تصانیف پر بھی ایک مضمون تحریر کریں ۔ کلیان سنگھ نے اپنے آخری زمانے میں کم و بیش دو ہزار اشعار کی ایک اردو مثنوی سحر البیان کی تقلید میں لکھی ہے ۔ اس کی ایک نقل میرے پاس ہے ۔ بلگرامی صاحب کا مضمون ان کی مخصوص طرز انشا کا عمدہ نمونہ ہے، لیکن افسوس ہے کہ مختصر ہے ۔ شاہ ولی الرحمٰن صاحب کا مضمون ان کی دقت نظر اور انصاف پسندی پر مشعر ہے ۔

کیا آپ مہربانی فرما کر بتا سکتے ہیں کہ عبدالباقی صاحب کا مضمون کس انگریزی رسالے کے مضمون پر مبنی ہے؟ جناب حمید عظیم آبادی کا مضمون حیرت انگیز بیانات سے مملو ہے ۔ شورش کے تذکرے کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ ۱۱۶۵ھ کے لگ بھگ زبان اردو میں لکھا گیا ہے ۔ یہ تذکرہ میری نظر سے گزرا ہے اور اس کے بعض اجزا کی نقل بھی میرے پاس ہے ۔ اس کی زبان ہے فارسی اور زمانۂ تصنیف ۱۱۹۰ھ کے لگ بھگ ہے ۔ اور اسی بنا پر تذکرہ کا ذکر کتب خانۂ آکسفورڈ کے فارسی مخطوطات کی فہرست میں موجود ہے ۔ سید محمد اسلمیٰ ضمیر کی زبان و شاعری کس پائے کی تھی اس کا اندازہ ذیل کی نظم سے ہو سکتا ہے جو قدرت اللہ شوق کے تذکرے میں پائی جاتی ہے :-

۱- ایک دن سررشتۂ الفت کیساتھ ۔ دیکھ کر چکی کو میں دلبر کے ہاتھ
۲ ۔ از رہِ حسرت کہا کیا ہے تجھے ۔ کیوں آتی ہے جو تو سچ کہہ تو مجھے
۳- تب کہا چکی نے رو کر زار زار ۔ کیا کروں میرا نہیں کچھ اختیار
۴ ۔ "رشتۂ در گردنم افگندہ دوست ۔ می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست"
۵- میں کہا چکی سے مت کر سینہ چاک ۔ اس قدر کس واسطے ہو دردناک
۶ ۔ ہاتھ سے دلبر کے سرگرداں ہے تو ۔ بے طرح پھیرے ہی تجھ کو بہ کو
۷- چھوٹتا ہاتھ سے جلد اونستاب ۔ تب کہا چکی نے کھا کر پیچ و تاب
۸ ۔ "رشتۂ در گردنم افگندہ دوست ۔ می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست"

مجھے افسوس ہے کہ خرابی صحت کی وجہ سے باوجود وعدہ میں بہار نمبر کے لئے کچھ نہ لکھ سکا ۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا ۔

نیاز مند (قاضی) عبدالودود (بیرسٹر)

ندیم ۔ امید ہے حضرت حمید عظیم آبادی اس مراسلہ پر توجہ فرمائیں ۔ اور جناب سید حسن عسکری براہ مہربانی قاضی صاحب کی فرمایش کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے ۔ جناب عبدالباقی صاحب بی اے جامعی کی موجودگی ہی میں ان کا قیام راقم سطور کے علم میں نہیں ۔ انہوں نے اپنے کسی پچھلے مکتوب میں اس رسالے کا تذکرہ فرمایا تھا ۔ افسوس ہے کہ اس وقت اس کا نام ذہن سے فراموش ہو گیا ۔ اگر موصوف کی نظر سے یہ سطریں گذریں تو وہ جواب سے مطلع فرمائیں ۔ امید ہے حضرت حمید اس مراسلہ پر خاص طور سے توجہ فرمائیں گے ۔ "ر"

نقد و تبصرہ

جدید جغرافیہ پنجاب از حضرت سند باد جہازی ناشر اردو اکیڈیمی پنجاب، لوہاری گیٹ، لاہور حجم ۱۴۲ صفحے تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ لکھائی چھپائی اچھی قیمت عہ

جناب چراغ حسن صاحب حسرت، مزاحیہ نویسی کے میدان میں "سند باد جہازی" کے نام سے مشہور ہیں۔ وہ پنجاب کے ذی علم اہل قلم میں ہیں "شیرازہ" نام سے خوش مذاقی کیساتھ ایک سنجیدہ مزاحیہ ہفتہ وار ان کی ادارت میں جاری ہے۔ انہوں نے مزاحیہ نویسی میں بھی ایک نئی شاہراہ اختیار کی ہے جو "جدید جغرافیہ پنجاب" کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ اس میں پنجاب کی سیاسی جماعتوں، طبقوں، اور پنجاب میں پرورش پانیوالے مختلف سیاسی افکار و خیالات، اور مختلف موسمی و غیر موسمی تحریکوں پر اچھوتے انداز میں ایک دل آویز تبصرہ کیا گیا ہے کتاب کے مباحث کا صحیح اندازہ اس کے کسی حصہ کے اقتباس سے ممکن ہے۔ لیکن افسوس کہ اس کا موقع نہیں۔ لیکن فہرست مضامین سے بھی ایک سرسری انداز ہو سکتا ہے۔ کتاب سات بابوں میں تقسیم ہے "پہلا باب" "محل وقوع و قدرتی تقسیم" کے بیان میں ہے قدرتی تقسیم کا نمونہ ملاحظہ ہو "اتحادی سطح مرتفع" "کانگریسی سلسلہ کوہ" "اشتراکی جوالا مکھی" "احراری کوہستان" "اکالی جنگلات" "وادیٔ لیگ" "ہندو سبھائی ترائی" دوسرا باب "آب و ہوا اور بارش" بیان میں ہے مثلاً "انتخابات کی بہار" "لیڈری کی فصل" "سول نافرمانی کی گرمی" "حقوق کی برسات" "سرکار پرستی کی پت جھڑ" "آئین پسندی کا جاڑا" اگلے تیسرے باب میں پہاڑ دریا اور نہروں کو دکھایا گیا ہے مثلاً "سکندر رونت" "ہنو ہر پربت" "کوہ خضر" "مجیٹھہ پہاڑ" "میاں کا ٹیلہ" "کوہ چھوٹو رام" "درہ دولتانہ" "دریائے ظفر علیخاں" "دریائے مہر" "دریائے سالک" "دریائے زمیندار" "کانگریسی ندی نالے" چوتھے باب میں پیداوار دکھائی گئی ہے جس میں قدرتی تقسیم کی علیحدہ علیحدہ پیداوار کو روشناس کیا گیا ہے پھر اسی انداز میں صنعت حرفت تجارت ذرائع آمد و رفت اور مختلف شہروں کے حالات ہیں۔

کتاب کے طرز تحریر میں جو ندرتیں ہیں انھیں نظر انداز بھی کر دیا جائے تو اصل مباحث پر جس اعلیٰ بصیرت سے نظر ڈالی گئی ہے۔ وہ لائق صد ستایش ہے ان دنوں ملک میں مزاحیہ کتابوں کی مانگ بڑھ رہی ہے اس سلسلہ میں اس کتاب سے اردو میں ایک مفید تصنیف کا اضافہ ہوا ہے امید ہے کہ قدردانوں کے حلقہ میں ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔

نورمبین :- از مولوی ابو البرکات سید شاہ مصطفیٰ حسن صاحب آبرزیدی حجم ۳۲ صفحے تقطیع $\frac{20 \times 26}{8}$ مصنف سے دیوان خانقاہ تکیہ قدسیہ بہار شریف ضلع پٹنہ کے پتہ سے طلب کریں۔

یہ رسالہ مجلس میلاد میں پڑھنے کیلئے لکھا گیا ہے۔ روایتیں ایسی ہیں دلکش ہیں جیسی عام طور پر مجلس میلاد میں بیان کی جاتی ہیں۔ آنحضرت صلعم کی "بشریت" پر گفتگو ذرا تفصیل سے آئی ہے جس میں فرقہ ضالہ کے خیالات کی ترجمانی کی گئی ہے۔

رجسٹرڈ جرپ ۲۱

کلکتہ نیشنل بینک لمیٹڈ

ہیڈ آفس :- کلایو روڈ کلکتہ ــــــ گیا برانچ: کچہری روڈ گیا فون نمبر ۳۷

ایک شیڈولڈ بینک

منظور شدہ سرمایہ ۲۰۰۰۰۰۰ (بیس لاکھ)

اداشدہ سرمایہ ۱۰۰۰۰۰۰ (دس لاکھ)

سیونگ بینک کا سود ۲ ½ فیصدی ــــــ فکس ڈپازٹ کا سالانہ سود ۴ ¼ فی صدی

ہر قسم کے بینک سے کاروبار

دوسری شاخیں :-

خضر پور- بھوانی پور- پارک سرکس- شام بازار- سرام پور- سیوراپھلی- ڈھاکہ- نرائن گنج- بھائرب بازار- کشور گنج- میمن سنگھ- چٹاگانگ- سلہٹ- پٹنہ- الہ آباد- ناگ پور- بنارس- رائے پور- جبل پور-

---

(نوٹ) نامی گرامی بڑی بڑی کمپنیوں اور فرموں کے حساب اسی بینک میں ہیں- کاروبار میں بینک سے سہولت حاصل کیجئے- ذاتی سرمائے اکٹھا کیجئے- روپیہ جمع کرنے اور لگانے کے طریقوں میں غیر معمولی آسانیاں رکھی گئی ہیں- کاروبار کی ایسی سہولتیں دوسری جگہ آپ کو مشکل سے ملیں گی -